

حق طبع محفوظ ہے

اِقْلَامِ بَرُّونِ الْقُرْآنِ اَمَّا قُلُوبُكُمْ فَاَلَمْ

الاے آنکہ از غفلت ز قرآن بفرمانندی : ہر علمت با علم رسمیاں بگذشت تا دانی
علوم رسمیاں با علم قرآن تا چہ می ارزد : کہیں حیرت بفرزاید و نہاں فلان بانی
چہ جائے علم رسمی پیش علم احمد مرسل : خستہ خروار جو خواہد کیے خوان بوریانی
بخوشید و خستال کر یک شب تاب بانی : تفویہ و دانشت اے ناسرور او اسلامیانی
میخیزد از حریف تن اگر ضایعست اگر خستل : خوشنیش نگ جانے کہ پوشش کس و روانی

نسخہ تبرک

مافی الاسلام

جلد اول

مؤلفہ خاکسار اصغر علی قومی معلم دیانات ادبیات اسلامیہ کالج لاہور

۱۳۵۰ھ ہجری قمری صابہا التحتیہ باہتمام علمہ منظر عام لائبریری و مطبعہ الطباع
قیمت فی جلد ۵ روپے

فہرست مضامین مافی الاسلام جلد اول

نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
۳۷	استدلال بروجود ذات	ط	مناجات بہ درگاہ حق جل و جلا
۳۸	حقیقت مادہ کے متعلق جدید تحقیقات	ی	قصیدہ عربیہ فی نعت ابنی صلی اللہ علیہ وسلم
۴۲	الوسائلط والاسباب	۱	قصیدہ فارسیہ
۴۶	تجربہ و مشاہدہ	۹	دیباچہ
۵۲	واقعات کا علم اور عقل		اخلاص نیت
۵۷	غایتہ العقل	۳۳	در باب اول
۵۹	دہریت	۱۲	مادہ کی حقیقت نامعلوم ہے
۶۸	نیچریت	۱۵	مادہ کسی چیز کی علت نہیں ہو سکتا
۶۸	افراط و تفریط	۱۵	تمام اشیائے مادیہ متحداً اصل ہیں
۶۹	ہماری فطری مغزوری		سلسلہ نظام عالم ایک قانون کلی کے
۷۰	اس مغزوری کا معیار	۱۶	زیر اثر چل رہے ہیں
۷۰	وحی آسمانی ہیں اس باب میں کیا تعلیم	۱۷	اشیائے کائنات سب کی سب حادث ہیں
	دیتی ہے	۱۸	ہر ایک حادث فانی ہے
	عقل جزئی کے محدود ہونے کی	۱۸	سلسلہ کائنات لامتناہی نہیں ہو سکتا
۷۲	مثال اس میں بھی موجود ہے	۱۹	تمام اشیاء معدوم سے وجود پذیر ہوئی ہیں
۷۳	متخالف عقل و ما فوق العقل	۲۰	خواص اشیاء کا حصر ناممکن ہے
	حکیم ارفع علی مسکو یہ التوفی سلسلہ	۲۱	رابط سبب و مسبب
۷۳	کی رائے	۲۳	حقائق غیر مادیہ یا مادیہ
		۳۰	نمبر ۲

نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
۱۳۹	العقوبات والذیارات	۴۷	نیاجہ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتے چلے آئے ہیں
۱۵۱	الاسلام والاستدلال	۴۸	نیچریت ادبار قومی کا اصلی سبب ہے
۱۵۹	معباری حق و باطل	۴۷	علت اور سبب میں امتیاز
۱۶۰	الراسخون فی العلم	۴۹	{باب دوم}
۱۶۳	ضرورت نبوت و مذہب	۱۱۰	
۱۶۴	ضرورت نبوت	۴۹	صانع عالم کا اثبات
۱۶۶	نبوت امر وہی ہے نہ کسی	۸۰	حکما اور انبیاء علیہم السلام کا اتفاق وجود صانع پر
۱۶۸	ضرورت شریعت	۸۱	حدوث عالم پر مزید بحث
۱۸۰	نفی صلیت شریعت	۸۶	توحید ذات باری عزاسمہ
۱۸۱	نبی اور متنبی میں فرق	۹۰	مسئلہ صفات پر بحث
۱۸۲	ادیان عرب قبل از اسلام	۱۰۴	مسئلہ تنزیہ و تشبیہ
۱۸۴	خدا پرست	۱۰۷	مسئلہ رؤیت ذات باری عزاسمہ
۱۸۴	نبوت پرستی کا آغاز کجوتکر ہوٹا	۱۱۱	{باب سوم}
۱۸۶	لائذہبی	۱۱۱	
۱۸۶	صابئین	۱۱۳	کیا انسان طبعاً آزاد ہے
۱۸۷	یہود	۱۱۴	انسان اشرف الکائنات ہے
۱۸۷	عیسائی	۱۲۱	انسان کا وجود کسی غایت مقصودہ پر دل ہے
۱۸۸	تقویہ	۱۲۱	انسان ابتداءً انسان پیدا ہوا ہے
۱۸۹	مجوس	۱۳۱	{باب چہارم}
۱۹۰	ختم نبوت	۳۱۶	
		۱۳۰	العقل والنقل

نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
۲۹۰	روح علیہ السلام . . .	۱۹۱	ولایت تابع ثبوت ہے . . .
۲۹۰	ابراہیم علیہ السلام . .	۱۹۳	الوحی والاہام . . .
۲۹۶	لوط علیہ السلام . .	۲۳۸	الوحی والفسفہ . . .
۲۹۷	یوسف علیہ السلام . .	۲۴۶	مکاشفہ . . .
۳۰۱	موسیٰ علیہ السلام . .	۲۶۴	حقیقت الرؤیا . . .
۳۰۴	یونس علیہ السلام . .	۲۶۴	حقیقت رؤیا سے انکار نہیں ہو سکتا
۳۰۶	داؤد علیہ السلام . .	۲۶۵	رؤیا کے اقسام . . .
۳۰۸	سلیمان علیہ السلام . .	۲۶۵	اقسام مذکورہ بالا میں وجہ امتیاز
۳۰۹	جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم	۲۶۶	رؤیا صحیحہ کے مختلف اقسام
۳۱۷	باب پنجم		رؤیا صحیحہ اور کاذبہ کی وجہ احادیث
۳۱۸			سے . . .
۳۱۷	قوانین فطرت و رموزات . .	۲۶۷	ارواح کا باہم ملنا . .
۳۱۷	قانون فطرت کیا چیز ہے ؟ . .	۲۶۸	اصناعات احلام . .
۳۱۷	قوانین فطرت سے صانع مطلق	۲۶۹	رؤیا کے متعلق چند واقعات
۳۱۷	کی ہستی کا ثبوت . .	۲۷۰	عصمت انبیاء علیہم السلام
۳۱۸	قوانین فطرت کی فوقیت . .	۲۷۱	اختلاف مدارج انبیاء علیہم السلام
۳۱۸	فطرت معلم اول ہے . .	۲۷۳	ثبوت کمال فطری ہے یا کسی یا وہی ؟
۳۱۸	کیا فطرت میں کسی قسم کی غلطی	۲۷۴	انبیاء علیہم السلام اور عامہ الناس میں
۳۱۸	داخل ہو سکتی ہے . .	۲۷۴	امیر الامتیار . . .
۳۲۰	انسان صرف قانون فطرت کی پیروی	۲۸۸	حضرت ابو البشر علیہ السلام
۳۲۰	میں کمال حقیقی کو پاسکتا ہے . .		
۳۲۰	قوانین فطرت لاثنا ہی ہیں		

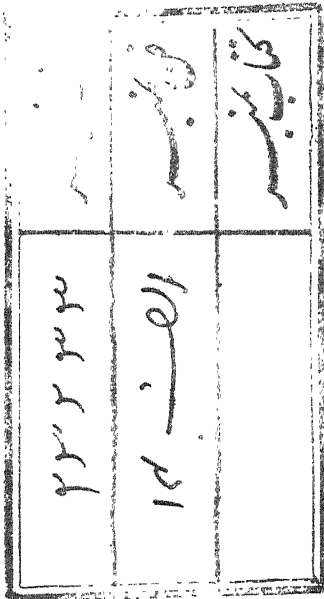
نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
	منکرین کا خیال ہے کہ خدا نے اپنے تئیں قوانین فطرت کا پابند کیا ہے	۳۳۱	قوانین فطرت میں تضاد حقیقی ممکن نہیں
۳۳۸	منکرین آئیہ ولن یجد لسنة الله تبدیلا سے بھی تمسک کیا کرتے ہیں	۳۳۱	جو لوگ حقیقت فطرت سے آگاہ ہوتے ہیں انہیں تعلیم انبیاء کے قبول کر لینے میں کچھ دقت پیش نہیں آتی
۳۳۸	معجزات کی تقسیم حسی اور عقلی میں کیا صرف عقلی معجزات نبوت کے لئے کافی حجت نہیں	۳۳۲	اسلام میں فطرۃ اللہ ہے قانون فطرت کے مفہوم کی توضیح
۳۳۸	معجزات حسی کے لئے کم امور کا تسلیم کرنا ضروری ہے	۳۳۳	قانون فطرت کے رُوسے لفظ آیت کا استعمال قرآن مجید میں تین طرح پر ہوا ہے
۳۳۸	معجزات اقتراحیہ وغیرہ اقتراحیہ منکرین پر منطقی طور پر اتمام حجت	۳۳۸	کیا معجزہ جزء نبوت ہے یا لازم نبوت یا غیر لازم نبوت
۳۳۸	اس مضمون کی دوسرے نقطوں میں توضیح	۳۳۸	کس طرح معجزہ منصب نبوت سے دلیل و مدلول کا تعلق رکھتا ہے
۳۳۹	بعض فلسفیوں نے خرقِ عادت کو اصولی تجربہ و مشاہدہ کے ذیل میں لانے کی کوشش کی ہے	۳۳۹	کیا معجزات قوانین فطرت کی حد سے خارج ہیں
۳۴۰	سید صاحب نے ایسا کیوں کیا	۳۴۰	کیا معجزہ انقلابِ ماہیت پر مبنی ہے

نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
۳۷۹	امور کا اظہار خرق عادات سے مشابہ	۳۵۳	علوم جدیدہ کیوں خرق عادات کا رد کرتے ہیں
۳۸۰	سراج نبوی	۳۵۷	کیا ان ہر دو امور کا رد ممکن ہے
۳۸۵	باب ششم	۳۵۸	مسئلہ خرق عادات کے متعلق ایک
۳۸۵	ایمان بالملائکہ و اثبات نوع جن	۳۵۵	فاضل کی رائے
۳۸۵	سائل میں اختلاف کا انسداد	۳۵۹	اہل باطن کے طریق پر ثبوت خرق عادات
۳۸۶	اور عقیدہ میں نسبتاً اختلاف زیادہ ہوتا ہے	۳۶۳	اہل باطن کے استدلال کی بنا کس
۳۸۷	انکار حق کے دو طریق ہیں	۳۶۴	امر پر موقوف ہے؟
۳۸۸	اصول معتقدات میں عدم تقلید	۳۶۵	خرق عادات کے طالب کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں
۳۹۰	معتقدات کی بابت شدت احتیاط	۳۶۶	منکرین خرق عادات کا آیات قرآنیہ سے ضعف استدلال
۳۹۰	تحقیق لفظ ملائکہ	۳۶۷	خرق عادات انبیاء و اولیاء میں کیا فرق ہے
۳۹۲	حقیقت ملائکہ میں اختلاف	۳۶۸	یہ صاحب کی ایک فاش غلطی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے متعلق
۳۹۳	انکار ملائکہ کا اثر	۳۶۹	شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے متعلق
۳۹۴	منکرین حقیقت ملائکہ پر سوال	۳۷۰	میتد صاحب کا ایک غلط خیال
۳۹۵	ملائکہ کا جسام ہوا یا مادہ و صوابی لکھنا	۳۷۱	علم سمیع و علم یاری وغیرہ
۳۹۸	حقیقت روح انسانی پر غور کرنے سے ملائکہ کا ثبوت		
۳۹۹	ملائکہ کو اور فطریہ کا نام نہیں		
۴۰۱	ایسے وسائط کا ثبوت		

نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
۴۶۳	المقادیر . . .		آیات قرآن مجید سے ملائکہ کے قوی
۴۶۳	التقدیر الاول . . .	۴۰۲	فطریہ ہونے کا رد . . .
۴۶۷	تقدیر ثانی . . .	۴۰۲	اس مذہب پر اصولاً اعتراض
۴۷۰	احتجاج آدم و موسیٰ علیہما السلام	۴۰۹	کتیب سماویہ سابقہ سے ملائکہ کا ثبوت
۴۶۳	تقدیر ثالث . . .	۴۰۹	احادیث صحیحہ سے ملائکہ کا ثبوت
۴۷۶	تقدیر رابع . . .	۴۱۰	اہل تصوف کے طریق پر ملائکہ کا ثبوت
۴۷۶	تقدیر خامس . . .	۴۱۶	مذہب متکلمین . . .
۴۷۸	نتیجہ . . .	۴۱۸	یہ صاحب کے بعض فقرات پر سرسری نظر
۴۷۸	مراتب القضاء والقدر	۴۳۳	جناب امیر المومنین علیؑ کے کلام سے دو شہادتیں
۴۷۹	علم . . .	۴۳۳	الیان بین الجبر والقدر . . .
۴۸۱	کتابت . . .	۴۷۱	مشئلہ جبر و اختیار . . .
۴۸۳	مشیت . . .	۴۷۹	مفہوم قدرۃ . . .
۴۸۸	خلق . . .	۴۵۰	مفہوم حکمت . . .
۴۹۱	ایمان بالبعث بعد الموت	۴۵۱	تلازم قدرت و حکمت
۵۰۳	مسئلہ خیر و شر . . .	۴۵۲	ایک اعتراض کا جواب
۵۰۵	عبادت و شقاوت . . .		مسئلہ صفات میں غلط فہمی کی وجہ سے پیدا
۵۰۷	حکمت بہبوط حضرت ابوالبقرہ آدمؑ	۴۵۲	مختلف العقائد فرقے پیدا ہو گئے . . .
۵۲۰	موت انسان کے لئے موجب کمال ہے	۴۵۶	اثبات مذہب اہل حق
۵۲۱	آیات ہفتم	۴۵۸	عبادت و شقاوت کا ازل میں مقدمہ
۵۲۲	معاد . . .	۴۵۸	ترک عمل اور ترک عبادت کا مستند نہیں
		۴۶۰	الکسب والجمہر . . .

نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
	کیا ایصالِ ثواب کے لئے تلفظ ضروری ہے	۵۳۵	حقیقت روح
۶۱۶	ہر یہ یا یہ کے لئے کونسا عمل افضل ہے	۵۴۰	روح انسانی ہر ایک قسم کی موجودات کا ادراک کر سکتی ہے
۶۱۷	ہر یہ ثواب بحضور جناب پیغمبر علیہ السلام	۵۴۳	روح فانی نہیں
۶۱۷	استجاب دعا	۵۴۵	روح کی حالت بعد الموت
۶۱۸	اسباب کی اہمیت	۵۴۸	سوال قبر
۶۱۹	دعا کی ضرورت	۵۴۹	سوال قبر روح اور بدن ہر دو سے بڑگا
۶۲۰	شرط استجاب دعا	۵۵۰	سماعِ مثبت
۶۲۲	دعا اور اسباب	۵۵۳	عامہ مومنین اور شہداء
۶۲۳	استجاب کی مختلف صورتیں	۵۵۶	غذاب قبر
۶۲۵	دعا کی فضیلت اور اس کی ترتیب	۵۷۶	تناسخ الارواح
۶۲۶	آداب دعا	۵۸۰	جہانات کا قتل و ذبح
۶۲۸	آسیب نظر حق ہے	۵۸۳	عالم برزخ
۶۳۱	جنت و جہنم	۵۸۶	ایصالِ ثواب
۶۳۹	میزان	۵۹۷	مسئلہ مذکورہ بالا کی مزید تحقیق
۶۴۷	صراط	۵۹۷	ایصالِ ثواب کی دو صورتیں ہیں
۶۴۸	اسلامی توبہ و عفو	۵۹۹	ایصالِ ثواب صدقہ
۶۵۲	مسئلہ شفاعت	۶۰۰	ایصالِ ثواب صوم و حج
		۶۰۲	عیادت مالی و بدنی
		۶۰۲	مانعین وصولِ ثواب کے دلائل

نمبر صفحہ	نام مضمون	نمبر صفحہ	نام مضمون
۷۰۶	آپ کا عرصہ قیام اور وفات	۶۵۷	علامات قرب قیامت
۷۰۷	خروج یا جُحج و ما جُحج		بیان اشراط الساعة میں
۷۰۸	یہ لوگ کون ہونگے ؟	۶۵۷	حکمت
۷۰۸	اس قوم کی صورت اور سیرت	۶۵۹	امارات صغریٰ
	نزول مسیح پر بعض ضروری	۶۶۶	امارات متوسط
۷۱۰	امور	۶۸۴	امارات کبریٰ
			نہایتی سوخو کا نسب و
		۶۸۵	ولادت وغیرہ
		۶۸۶	امام مہدی کیا کچھ کریں گے ؟
		۶۸۷	علامات و امارات ظہور مہدی
			شیخ اکبر صاحب فتوحات کی
		۶۸۹	تحقیق در بارہ خروج مہدی
		۶۹۲	ایک ظن فاسدہ کا رفع
		۶۹۴	لا مہدی الا عیسیٰ ابن مریم
		۶۹۷	فقہ دجال
		۶۹۸	دجال کون ہے ؟
		۷۰۲	نزول مسیح علیہ السلام
		۷۰۵	عیسیٰ کا خلیہ اور سیرت
			آپ کے نزول کا وقت
		۷۰۵	اور محل



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مناجات به درگاه حق جل و علا

به هنگام مصیبت چاره سازا
سر افتادگی بر آستان
تسلی دل امید وارا
شرارے پنبہ زارم را بکارست
مجلای کن ز زنگ آئینه ام را
وزاں دبستگی دل خستگی ده
کند آئینه دل را چو انگشت
بخورشیدی بر آ آئینه من
نگوں سار و پریشان روزگاریم
کرامت را هنوز امیدواریم
هوائے غیر کن از خاطر دم دور
نمیدانم که مستقبل چگونه است
درست افتد بها نقش شفاعت
حمد را شفاعت خواه ماکرد

محیط رحمتا بے کس تو ازا
به امید کرم ما بندگانت
توئی آرام جان بیقراران
بشت استخوانم خار خار است
منور کن حدیج سینه ام را
بدر خود مرا دبستگی ده
بجز درد تو گریه است و گریه زشت
ز دل گرمی بچوشتان سینه من
خداوند از پنداریکه داریم
الهی گریه ما صذرشت کاریم
خداوند البته در سینه ام نور
تلق شد ماضی و عالم زبون است
کرامت گرستی توفیق طاعت
خدا چوں مصیبت برافشا کرد

زیادش روحی از بند فروب
بکام دشمنش بردار یا رب

فِي نَعْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بِنَفْسِي أَنْتَ لَيْسَ لَكَ الْوَفَاءُ
رَحَلْتَ وَمَا رَحِيلُكَ عَنْ تَرْضٍ
كَبَّرَ قِيَّ خُلَّبٍ وَعَدُوٍّ وَوَصْلُ
يُسْنَانٍ مِنْ قَتَائِكَ فَارْتَجَبْنَا
لَقَدْ نَادَى بِفِرْقَتِنَا غَرَابُ
كَانَ الْقَلْبُ مَتَى يَوْمَ بَانَتْ
دَعَا ذِكْرُ الشَّيَابِ إِلَى التَّهَابِ
يَبَابُ هَالِ نَفْسِي دُوشُجُونِ
وَمَا فِي الدَّهْرِ أَشْكَى مِنْ كَثِيبِ
وَمَا فِي الْعَيْشِ خَيْرٌ تَرْجِيهِ
سَلْتُ الدَّهْرَ عَمَّا أَرْجِيهِ
تُرِيدُ الْحَقْضَ فِي عَيْشٍ هَنِئِي
طَوَيْتُ الْكُشْمَ عَنْ خِلِّ مَكَاكِجِ

إِلَى مَا ذَا التَّجَاوِي وَالْجَفَاءِ
وَلَكِنْ مَلْنَا مِنْكَ الثَّوَاءَ
كَبَّرَ قِيَّ قَلْبٍ حُسْنٍ وَمَاءِ
مَوَاعِدِكَ الَّتِي تَعْدُ الْبَسَاءِ
قَرَاعَ الْقَلْبِ بِالْبَيْنِ النَّجَاءِ
كَرَيْشَاتٍ تَطِيرُ بِهَا الْخَلَاءِ
وَهَلْ عِنْدَ الصُّبْحِ إِلَى الْمَسَاءِ
وَكَلَّتْ نَاقَتِي وَوَهِيَ السِّقَاءِ
أَرَادَ الصُّحُوكَ حُمَّ لَهُ الْبُكَاءِ
وَلَا فِيهَا الْكُتُسُ بَتَ لَكَ الْبَقَاءِ
فَقَالَ إِلَيْكَ مَا هَذَا الْهَرَاءِ
فَلَمْ فِي النَّاسِ مَنْ يُعِيهِ دَاءِ
يُدَارِي حِينَ يُحَوِّجُهُ الْفَقَاءِ

وَيَفِي كُلُّ حُبٍّ فِيهِ غَشٌّ
 فَدَعِ حُبَّ الْغَوَانِي وَهُوَ غِيٌّ
 وَلَكِنْ حُبُّ نَجْلِهَا شَيْءٌ
 عَطَا يَا لَا يَنْبُهَا عَلَيْنَا
 أَتَيْتَ بِمَا يَحَارُ الْفِكْرُ فِيهِ
 كِتَابٌ نَاطِقٌ بِأَلْوَحْيٍ حَقًّا
 بِالْفَاطِطَاتِ وَبِهَا الْمَعَانِي
 كِتَابٌ لَا يَدَّ اخِلُهُ أَرْتِيَابُ
 كِتَابٌ قَدْ يَدُ شَمْسًا وَبَدْرًا
 تَأْمَلُ فِي الْغَوَامِضِ وَالْمَزَايَا
 صَمَوْتَ إِلَى الْمَكَارِمِ وَالْمَعَالِي
 وَقَدْ كُنْتَ أَتَدَيْتَ بِهِمْ جَمِيعًا
 وَعَيْنُ مَاءٍ هَارَتْ وَطِينُ
 بَلَغْتَ مَكَانَهُ مَا لَمْ تَرْمَهَا
 وَمَنْ فِي النَّاسِ أَفْصَحُ مِنْكَ لَفْظًا
 شَمَائِلُ تَسْتَمِيلُ بِهَا قُلُوبًا

وَيَفِي مَا يُجَاهِرُهُ الصَّفَاءُ
 وَدَاءُ الْغَوِي يَجْدُهُ الدَّوَاءُ
 أُتِمَّ لَهُ مِنَ الرَّبِّ الشَّاءُ
 فَتَشْكُرُ مَنْ لَهُ عَنْهُ الْغِنَاءُ
 لَهُ فِي الْإِبْتِلَاءِ لَهُ انْتِهَاءُ
 يَا يَاتِ فَهَنْ لَنَا الشِّقَاءُ
 عَجَائِبُهَا فَلَيْسَ لَهَا الْقَضَاءُ
 وَلَا فِي جِذْمٍ مَعْنَاهُ الرُّتِيَاءُ
 تَجَلَّى مِنْهُ نُورٌ أَوْ ضِيَاءُ
 تَجِدُهَا فَوْقَ مَا يَلْغُ الْعِلَاءُ
 سَبَقَتْ وَقَدْ تَلَاكَ الْأَنْبِيَاءُ
 فَتَسْبِقُهُمْ جَمِيعًا لَا حِرَاءُ
 وَعَيْنُكَ لَا تُشْرَقُّهَا الدَّلَاءُ
 مَلَائِكَةُ السَّمَاءِ الْأَصْفِيَاءُ
 وَأَبْلَغُ مِنْكَ مَعْنَى يَسْتَضَاءُ
 قَتَانُ بِالْخَطَابِ فَمَا تُفَاءُ

يَا لَهْفَ الْوَدَى يَا مَرْتَجَانَا
 وَاتَّبَعْنَا الذُّتُوبَ فَلَا بُنَالِي
 قَضِينَا مَا تَوَيَّنَا مِنْ مَنَا نَا
 أَلَوْتُ وَلَوْ عَلَى كُرْهِ قَانِي
 أَلَمْ يَبِ الطَّوَارِقُ لَوْ أَلَمْتُ
 وَنَائِبَةُ رَجِوتُ النَّاسِ فِيهَا
 تَفْسَدَتِ النَّفُوسُ فَلَا تَبَالِي
 تَفَرَّدَ كُلُّ دِيٍّ بِرَأْيِي
 وَلَا يَأْتُونَ خَيْرًا مَّا اسْتَطَاعُوا
 أَهْيَلُ الْعَصْرِ اتَّبَعُوا هَوَاهُمْ
 فَجَلَّ الْقَوْمُ أَجْلَافَ طَعَامٍ
 إِذَا مِنْ نَاسٍ لَمْ يَأْلُوا فِسَادًا
 أَهْ مَا ذَا التَّسَبُّتِ فَقُلْ وَرَبِّي
 مَا دَهَى مَا دَهَانَ مِنْ دَوَاهٍ

لَدَى الْعَرَصَاتِ إِذْ عَظُمَ الْبَلَاءُ
 فَإِنَّ اللَّهَ يَمْحُو مَا يَشَاءُ
 فَبُحِّلَ حُطُوطُنَا مِنْهَا الشَّقَاءُ
 احَا طِبِّي الظَّلَامُ فَلَا الضِّيَاءُ
 بِصَمَاءٍ لَعَادَ لَهَا الْهَبَاءُ
 بَلَوْتُهُمْ فَخَابَ لِي الرِّجَاءُ
 كِتَابُ اللَّهِ تَحُلُّ أَمْرَ الْكَلَاءِ
 وَإِنَّ السَّرَّاءِ فِي الدِّينِ الْغِنَاءُ
 وَلَا يَأْلُونَ شَرًّا مَّا أَسَاءُوا
 وَإِنَّ الدِّينَ عِنْدَ هُمْ رِيَاءُ
 فَخَيَّرَ النَّاسَ فِيهِمْ خُنْفَاءُ
 فَعَامِلُهُمْ وَجَاهِلُهُمْ سَوَاءُ
 لَسَوْفَ تَرَى إِذَا انْكَشَفَ الْغُضَاءُ
 أَمَا لُ الْمَرْءِ يَسْتُرُهُ الْخَفَاءُ

مَضَعْتُ الشَّيْمَ وَالْقَيْصُومَ لَكِنْ
 بَعَيْنِي حَاسِدِي شِعْرِي قَدَاءُ

قصیدہ دو مطلعین

مطلع اول در وصف قرآن حکیم

طیبت مارا کہ از قرآن فخر ساختند
خلعتِ زیبائے سنتِ رحمت در بر داشتند

نستے دارد بقراں سنتِ خیر البشر
اے کتاب اللہ اے کز آفتابِ حجت
سفلہ طہجانِ زباں را بیں کہ از راہ غور
داد اے دور فلک کیوں بے فروغانِ خرد
کاروانِ حکمت از ملکِ قدمِ شبگیر کرد
و خصوصیتِ گاہِ کثرتِ چوں حقِ کردی نژول
تا تو در میدانِ استدلالِ پافشاری
رمزِ اجمالِ تو آمد جانِ پاکِ مصطفیٰ
لفظِ مثنوی ہر دورا کا سدا دھا قافہ اند
معنیِ انسان کہ رفرے بود از علمِ قدیم
شانِ تو چون چرخِ اعظمِ منجدِ محیطِ عالمی
گر ترابے دولتوں نشا خستند از گریہی
تا فتنی چوں یر درو بامِ جہانِ آب و گل

زبانِ میانِ ہر دور بطیر و شکر ساختند
ظلمتِ آبادِ جہانِ جاں منور ساختند
حجتِ تشریلِ افسانہ باور ساختند
برقی خرمنِ سوز را خورشیدِ نور ساختند
منزلِ خوش منظرِ جانش مقرر ساختند
حجتِ باطلِ پستیاں را مزور ساختند
عرصہ گیتی بمرآتِ مسخر ساختند
نقشِ تفصیلِ زمین تا چرخِ خضر ساختند
تشنہ گان را از زلالِ کام و لب تر ساختند
در حجابِ لفظِ تشریلتِ مستر ساختند
ہفت منزلِ رایسانِ ہفت اختر ساختند
اہلِ ایمان مرزا با جاں برابر ساختند
مشرقِ خورشیدِ جاں را رشکِ خاور ساختند

مرحباے کشف و کشف که از لطف ازل
 لے پناه بے پناہاں ہادیے گم گشتگان
 عقل جزئی در نیاید کنتہ اعجاز ترا
 اے فحک ہا بر حروف تو تکلف بر طرف
 لے سخن لایزال بر دہدہ دلہا را ز دست
 تو عیاں تر از عیانی و نہاں تر از نہاں
 شکل از ہر شکل و آساں ز ہر آساں و فلے
 آنچہ از فیض ازل با انبیا رنجیدہ اند
 نشنہ مکر چشمتہ ما رمعیں یا بد نشان
 بگذر از رد و قبول مجتہد ناسوتیاں
 خرگس طبعان کہ خطہ نیست شان از عالم حق
 وائے بر تیرہ در و ناں کہ سر جہل و غرور
 فلسفہ گر بہت خواہی فل سفہ باشند از انک
 تو چہ دانی صیت قرآن - لے ز معنی بے خبر
 پیچ دانی صیت قرآن - جبت دین متنبیں
 خود پرستان محرف ہیچ احبار یہود
 ایکہ آگہ نیستی از سبأ ہستی ہنوز
 حق بجزیل ابی داد - او یا حمہ او بما
 عقل جزئی بر نہ تا بد روز میرجا صولنت
 از شکر فیہائے تو حیراں ملائک بر فلک

عاصیان ت حرز ہول روز محشر ساختند
 عاقلان ت سوئے منزگاہ رہبر ساختند
 عقل کل را با دراکش مصور ساختند
 در نظر دیدہ و راں را مشک و عنبر ساختند
 چون تو طرفہ نازنین را تا چہ دلبر ساختند
 اہل دل این صدف بہت بہ داور ساختند
 در وضوح و در خفا بر تر ز بر تر ساختند
 بیگماں در سحر منزلیش مقدار ساختند
 گوہر پاک است از شمر باراکمدر ساختند
 کیں دغل بازاں غیش اندر دہ پی زر ساختند
 فلسفہ را بر مثال وحی از بر ساختند
 کہ مک شب تاب را ہمہ پر تو خور ساختند
 اہل نش خوشی ت را بر تر از شہر ساختند
 ستر این معنی بجان پاک مضمحل ساختند
 کہ بر لے محو باطل شکل خنجر ساختند
 امر را بمعروف حق را نہی منک ساختند
 بر معادت از کجا مرد ضرور ساختند
 جہذا اسناد کہ جرح مطہر ساختند
 گوی از شمشیر بارانش مخدر ساختند
 خود کجا لا تنقضی را غیر در فور ساختند

لے فل در زبان الکلیز بمعنی تمام و کمال و سفہ مصدر عربی بمعنی حماقت ۱۲ من ۱۱ حدیث ترمذی در وصف
 قرآن لا تنقضی عجائب ۱۲ منہ

تو عرو سے دامن خرد از دودمان آگهی
بر نہ تا بد کوه آثنا بر شکوہیت لے عجب

کش ز شمع مسطفی اهر سفت وزیر ساختند
قلب پور آئینه را تا چه مظهر ساختند

مطلع دوم در نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

آنکہ چوں تو قیج جاہ او مجبر ساختند
مژده اتمام نعمت تا دہد با عالمی
سطوت او چوں بمیدان جہاد آورد
احمد مرسل کہ ختم رحمت نیر دامن بدست
آنچہ از تو برگرفتند از رے عقل و تمیز
کودن دُوں ہستے گرفت مر از دگہمت
خانق ما بر صراط وادی ما بر صراط
جملہ گیتی از انزل تا حد پایان اید
آن یکے بر طور و آل دیگر سچ و تو بعرض
لے بر نگب محض وحدت در لباس اہل ننگ
امی و قرآن تعالی اللہ کہ مرغ عقل را
قرنہا بر دودمان نسل آدم رفتہ بود
آن یکے جلوه طراز و دامن دگر عشوہ فروش
رشتہ فیض ترا لے ایرتیبسان گرم
غازیانت دشمن دیں را بمیدان و غا

در عطا و منج احسانش مخیر ساختند
امی از آل ہاشم را پیبر ساختند
کسہ کوہ پیکش اللہ اکبر ساختند
راز ہستی را بذات او معبر ساختند
بحر را با قطرہ یاراں مفسر ساختند
عالمان علویش پا مال ہر د ساختند
گوشتہ را زیں چنین راز خفی کر ساختند
چوں کر آمد کش از قلب تو محور ساختند
دیگرت را تا نہ پندارند ہمسر ساختند
چائے گنج راز تو در کام اثر در ساختند
در ہوائے قہم آن بے بال و بے پر ساختند
کز تو بد تو جہانے را مبشر ساختند
لے کہ از عکس رخ تو ورد و غیر ساختند
از دل عارف صدف کردند و گوہر ساختند
چوں پر کاہے بر ٹے باو سر ساختند

لے کہہ یعنی گرز ۱۲۰۰۰ اشارہ بآیہ ان ذی علی صراط مستقیم ۱۲۰۰۰
سہ اشارہ بآیہ انک لمن المرسلین علی صراط مستقیم ۱۲۰۰۰

تیغِ نثار و دستِ سقرانِ یزیدیاں دیوانِ خدا
 آپے وقعِ فسادِ ناسرِ ایانِ جہود
 دانشِ قسّیہ چار و پیشِ حکمتہائے تو
 شورِ بختِ گزندار و بہرہ از انعامِ گو
 یادِ کندے کہ جو شید از رحمِ عرفانِ حق
 نعتِ احمد و صفِ قرآنِ ہر دو معنی یکے
 روحی لبِ تشنہ را دریا بے ابرِ کرم
 سوز و آسِ سوختن و بگرہ بند چارہ
 پائے پوسِ قوطع وار و پروز و اسپیں

حق پرستوں میں چسپاں دیں رہنمائی
حیدر کرار را رخسارِ خیر ساختند
نہد سچیاں درین رقعہ نشین ساختند
اسود و احمر ز جودت جاگزی ساختند
ساقیانِ محفل تو وقفِ ساعر ساختند
از پئے اجمالِ یک تفصیل دیگر ساختند
اے کہ از فیضِ بہت تسنیم و کوثر ساختند
زانکہ داغِ عشقت آتشِ دل نہد ساختند
اے کہ با پرست سکونِ قلب مضطر ساختند

در حیات من چو تشناستم از راه حسد
تا چه از دم گریس از من رشکِ هو مر ساختند

فادرہیں مٹولف

ز دیں دارم بخود کلاں شد مرا بس : پاوازِ دہل گویم بہر کس
کتاب و سنت و اجماع امت : قیاس مجتہد و رچار ملت
فروع شمعِ حُبِّ ال و اصحاب : کزو غیرت پر و مہر جہاں تاب
دیں راہ گامزن شو بے خطر باش : زغلاں در رہ دیں پر حذر باش
کے گر منکرے را ککتسب شد
خداوندش بحشر محاسب شد

له رجا ز رجز خواں - اہل عرب در معرکہ حرب رجز خوانی می کردند و حضرت امیر المومنین در جنگ خضر
 رجز خوانی کردہ اند ۱۳۱۳ قس بن ساعدہ یکے از حکمائے عرب ۱۳۱۴ھ طیفیہ خوار ۱۳۱۵ھ اشارہ بحديث
 حضرت ام المومنین کما خلقه القرات - ۱۳۱۶ھ

دیس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِهِ الْإِنَّمَا
وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ وَمَنْ اتَّبَعَهُ مِنْ أَهْلِ الْيَقِينِ

مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں جو بے اعتدالیاں ایک عرصہ سے نظر آ رہی
ہیں ان کی نوعیت موجودہ زمانہ کے علوم و ادب کی ان غیر معمولی ترقیات کا نتیجہ ہے
جو ایک سیلابِ عظیم کی صورت میں رونے لگی ہیں کے ایک کثیر حصہ پر پھیل کر مختلف
اقوام کی مذہبی عمارت کی بنیاد کو بودا کر رہی ہیں۔ انکشافاتِ جدیدہ نے جو یوں مافیہ
وہ بے ہمتی ہیں دنیا بھر کے عقلمندوں کو درپٹہ حیرت میں ڈال رکھا ہے اور وہ
آئینہٴ استقبال میں اپنی خستہ بصیرت سے آنے والے واقعات کو ایک خطرناک
صورت میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اعتبار کا تو کیا ذکر ہم پہلے اپنے بھائیوں کی
حالتِ مذہبی کا موازنہ کرتے ہیں کہ وہ صحیح معنی میں کہاں تک مسلم کے معزز لقب
کے ساتھ متصف ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اس موازنہ کی حقیقت کا انکشاف
صرف اس امر پر موقوف ہے کہ کوئی صاحبِ فہم و فراست قرونِ اولیٰ حضرات
صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے عقائد اور علی حالت کا بغیر تعقید مطالعہ کرنے
کے بعد موجودہ مسلمانوں کے عقائد اور علی حالت کا صحیح صحیح نقشہ اپنے سامنے
رکھے۔ ان ہر دو طبقہ کے مسلمانوں کے مذہبی حالات کا مقابلہ کرنے

سے اُسے معلوم ہو جائیگا کہ ع

یہ ہیں تفاوتِ راء از کجاست تا بہ کجا

موجودہ حالات میں مسلمانوں کی مذہبی حالت سخت ناگفتہ بہ ہے۔ سوائے ایک قلیل التعداد جماعت کے مختلف اطرافِ ممالک میں عقائد و احکامِ اسلام کی پابندی نہایت کم ہو چکی ہے۔ نالی اللہ المشتکی۔ قوم میں مختلف طبقات کے لوگ نظر آتے ہیں مگر یہ سب کے سب مرکزِ اسلام سے بہت دُور جاڑے ہیں۔ پہلا طبقہ تو قوم کے امرا و اعیانہ ہیں جن کی نسبت یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ ان کے خیال میں مذہب کی ضرورت صرف عوامِ الناس کے لئے ہے لہذا ماشاء اللہ اگر اس کی تصدیق کرنا منظور ہو تو فرضیہ نماز کی پابندی کا حال مساجد میں دیکھ لینا کافی ہے گو یا قوم میں امارت و ثروت کی بڑی علامت یہ ہے کہ ایسے اصحابِ مساجد سے علیحدہ رہا کریں کیونکہ ان کی وسعتِ دہی اور آرامِ طلبی اور مشاغلِ دنیویہ انہیں اجازت نہیں دیتے کہ وہ عامۂ الناس کے ساتھ مسجدوں میں دوپٹے بدویش کھڑے نظر آئیں۔ ہاں شاید وہ اس طبقہ کے بعض اصحاب ایسے بھی ہیں جو اپنے گھر پر فرضیہ نماز ادا کر لیا کرتے ہیں مگر ان میں اکثر اصحاب ایسے ہیں جو شب و روز ترقیِ جاہ و منصب کی اوجھڑ میں لگے رہتے ہیں اور بس۔ دوسرا طبقہ مروجہ تعلیم کے فارغ التحصیل نوجوانوں کا ہے جن کی حالت ایک شتر بے ہمار کی سی ہے۔ ان میں بعض تو مذہب اور اہل مذہب کو نہایت ذلت اور خواریت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور باوجود پابندیِ احکام سے سبکدوش رہنے کے اصول و احکامِ مذہب پر نکتہ چینی اور اعتراض ان کا دستورِ اصل ہے اور وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اپنے تئیں مذہب کی ضرورت سے مستغنی خیال کرتے ہیں اور بعض کسی حد تک مذہب کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور گاہ و بیگاہ کسی حکم کو بخلا بجا لاتے ہوئے بھی دیکھے جاتے ہیں مگر ایک غیر منظم اور مخالفِ سنت طریق

پر۔ گویا ان کے خیال میں پابندی احکام ایک امر اختیار ہی ہے۔ ان لوگوں میں اکثر
 اصحاب ایسے ملینے جو دیگر تجارتی موضوعات مغرب کی طرح یورپین پائے میں چلے ہو، اسلام کو دلا دہ میں مگر انہیں
 یہ معلوم نہیں کہ جس سادہ اور بے لگ اسلام کی جیسے سالنامہ علیہ السلام زامت موجودہ مقلین فرما تھی اسکی دیکھ کر کیا
 والی تعلیم کو مقابلہ میں مضمونی اسلام نہیں نیا و آخرت میں جو خرم ان زبان کو کچھ فائدہ نہیں دیتا بلکہ طبقہ حضرت علما
 اکرام کا ہر گز اس طبقہ میں بھی مختلف قسم کے اصحاب نظر آتے ہیں۔ بعض وہ لوگ ہیں جو
 داغ خانہ رنگ میں قصص موضوعہ اپنے غلطوں میں بیان کر کے اپنی شکم پروری کرتے
 ہیں۔ ان میں سے بعض کے اندرونی حالات نہایت قابل شرم ہیں اور ان کا وجود
 قوم کے لئے سخت مضر ہے۔ ہاں اس طبقہ میں بعض اصحاب اہل علم بھی ہیں مگر وہ
 راست گوئی کی توفیق نہیں رکھتے۔ مقتضائے وقت کے مطابق حاضرین کے
 میلان خاطر کو ملحوظ رکھ کر آیات و احادیث سے وہی امر ثابت کر دکھاتے ہیں
 جو ان کے مستفیدین کو خوش کر سکے۔ کیونکہ حق گوئی کی صورت میں انہیں ہر دغ و زری
 کے درجہ سے گر جانے کا خیال و امنگ ہو تا ہے اور بعض بزرگواران (وقلیل ماہم)
 ایسے بھی ہیں جو اخلاص فی الدین کی توفیق تو رکھتے ہیں مگر باوجود ہر ایک قسم کی خرابی
 کا علم رکھتے ہوئے خاموش بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی اصحاب کے بارہ میں کسی بزرگوار

کا یہ قول ہے ۛ ۛ
 عُلَمَاءُ نَامَنَّا بِرُؤْنِ عَجَائِبٍ - وَهُمْ عَلَى مَا يُبْصِرُونَ سَكُوتُ

الغرض امر بالمعروف و نہی عن المنکر جو انہی بزرگواران کا فرض تھا مگر وہ کمال
 ہو گئے ہیں۔ جو تھا طبقہ حضرت متصوفہ کرام کا ہے جن میں خال خال مستیع کتاب
 و سنت نظر آتے ہیں اور ان کا وجود عامہ اہل اسلام کے لئے باعث صلاح و
 فلاح ہے مگر انہی حضرات کے رنگ میں اکثر ایسے نظر آئیں گے جنہوں نے پیری و
 مریدی کو محض جلب منفعت اور حصول معاش کا ذریعہ ٹھہرا رکھا ہے اور بسا اوقات

ان میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو منوعاتِ شرعیہ کا کھٹے بندوں ارتکاب کرتے اور
 ملاہنی و لاعب میں مستغرق نظر آتے ہیں۔ پانچواں طبقہ عوام کا الانعام کا ہے۔ ان لوگوں
 میں بعض ایسے ہیں جو تقلید سی طور پر اپنے اباؤ و اجداد کی قدیم روٹ پر قائم ہیں مگر
 اکثر ایسے بھی نظر آتے ہیں جنہیں عقائد و احکام مذہب کی ضرورت کا کچھ بھیجوتے سے
 خیال تک بھی نہیں آیا۔ وہیات میں اس کی مثالیں بہ کثرت ملینگی۔

مسلمانوں کے مذکورہ بالا طبقات کی نسبت جو کچھ مجملہ لکھا گیا ہے وہ ایک
 حقیقتِ نفس الامری ہے اور کسی شخص کو اس کے تسلیم کرنے میں انکار نہیں ہو سکتا
 اس لئے ایک صحیح عقل آدمی مسلمانوں کی مذہبی حالت کا نہایت آسانی کے ساتھ
 موازنہ کر سکتا ہے مگر گفتگو یہ ہے کہ ایسے ناگوار حالات میں اصلاح کی کیا صورت
 منظور ہو سکتی ہے؟ چونکہ قوم کی مذہبی حالت کے فاسد ہو جانے پر ان کے
 اخلاقی اور تمدنی حالات میں بھی ایک نمایاں فرق عائد ہو گیا ہے۔ اس لئے
 جب تک ان کے خیالات کی تصحیح اور عقائد باطلہ کا ازالہ نہ کیا جائے ناممکن ہے
 کہ اسلامی انجمنیں یا قومی لیجرار یا جراند و اخبارات ان خرابیوں کا الشد و کر سکیں
 کیونکہ ان ذرائع اور وسائل سے آج تک مفاسدِ شرعیہ کی اصلاح میں کوئی
 کامیابی نظر نہیں آئی اور نہ آئندہ کوئی صورتِ کامیابی کی نظر آتی ہے اور اصلاح
 ہو بھی تو کیونکر ہو کیونکہ قوم کے لفظ کا استعمال آجکل غلط معنی میں کیا جاتا ہے
 قرآن مجید میں حضراتِ انبیاء کی زبان پر یہ لفظ جاری ہوا ہے اس لئے قوم کو
 من حیث المجموع عقائد و احکامِ شرعیہ کے تسلیم کرنے پر خطاب کیا گیا مگر مذکورہ
 بالا اصلاحی تجاویز میں عقائد و احکامِ شرعی کا کوئی جزو بھی شامل نہیں اور جو لوگ
 ان تجاویز کو پیش کرنے کے متکفل ہیں ان میں اکثر اصحاب ایسے نظر آتے ہیں
 جو خود عقائد و احکام کی پابندی میں عوام الناس سے بھی زیادہ گہرے ہوئے ہیں

خونکہ احکام کی پابندی عقائد صحیحہ کا نتیجہ ہے اس لئے سب سے اہم و اقدم تصحیح عقائد کا مسئلہ ہے سو جب تک مسلمانوں کو عقائد صحیحہ سے آگاہ ہونے کا موقع نہیں مل سکتا پابندی احکام کی قطعاً کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ امرا چونکہ اس ضرورت کے سمجھتے ہیں نسبتاً زیادہ قاصر اور غافل ہیں اس لئے اس طبقہ کے اصحاب نہ صرف اپنی ذاتی کوتاہی کے خدا کے حضور میں جوابدہ ہیں بلکہ عوام الناس کی گوتہی کی جوابدہی کا الزام بھی اکثر حالات میں انہی کی طرف عائد ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے اکابر مجرمین کے الفاظ سے میرے اس خیال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کی دنیوی و جاہلیت ایک آن کے لئے بھی یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ کبر و نخوت کے دام سے رہائی پا کر علمائے راسخین سے مسائل شرعیہ کا استفادہ کر سکیں اس لئے یقینی امر ہے کہ اس طبقہ کے اصحاب کا وجود قوم من حیث القوم کے لئے کچھ بھی مفید نہیں۔ رہا حضرات علماء کا معاملہ۔ سو ان میں اکثر اصحاب ایسے نظر آتے ہیں جو فروعی مسائل میں تفسیح اوقات کر کے تفریق بین المسلمین کے سوا اور کچھ کام نہیں کرتے اور وہ اسی کو اپنے خیال میں تبلیغ شریعت سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان لوگوں سے اصلاح ملت کی توقع رکھنا ایک بے معنی خیال ہے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مجالس عامہ میں لکچرار اور واعظین سلف صالحین کے علمی اور مذہبی کارناموں پر مورخہء حیثیت سے بحث کیا کرتے ہیں۔ اور سامعین کو ان کی سی روش پر چلنے کے لئے متوجہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے مگر حق یہ ہے کہ یہ کوشش صرف گفت و شنید کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتی یعنی علمی طور پر اس کا کوئی مستند بہ نتیجہ مترتب نہیں ہوتا کیونکہ سلف کے کارناموں کو تاریخی حیثیت میں جان لینے سے مشکل زیر بحث کا حل ہونا دشوار

ہے بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جب قوم پر ایہ عمل سے عاری ہو چکی ہے تو اس طریق سے غیروں کے سامنے جھگھنسائی کرنا ہے۔ ع۔

عالم ہمہ افانہ ما دارو و ما بیچ

علمی حالت اعتقادی حالت کے تابع ہے مگر جب ہم اعتقادی حالت کی ٹوہ لگاتے ہیں تو ناخواندہ افراد کو چھوڑ کر خواندہ اصحاب بہ استثنائے افرادِ مخصوصہ سخت گہمی ہوئی حالت میں نظر آتے ہیں۔ وجودِ ذاتِ باری اور اس کے صفاتِ کاملہ اور اس حقیقتِ توحید سے جس کی تعلیم قرآن پاک نے دی ہے محض نا آشنا پائے جاتے ہیں حالانکہ یہی ایک مسئلہ مذہب کا اصل اصول ہے حقیقتِ نبوت کو فطری سلامتِ رومی کے مفہوم سے زیادہ کچھ وقعت نہیں دی جاتی اور نبی اللہ کو ایک رفیعہ درجے سے جو بمقتضائے ضرورتِ زمانہ قوم کی مناسب اصلاح کا متکفل ہو کچھ زیادہ امتیاز نہیں دیا گیا۔ وحی کو قوتِ متحدہ کے اس عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے جو تشبیہ و استعارہ کے رنگ میں بصورتِ الفاظ عامہٴ ناس کے سامنے لایا جاتا ہے۔ خرقِ عادات (معجزہ یا کرامت) کا مفہوم محض ایک خوش اعتقادی تک محدود رکھا جاتا ہے۔ حالانکہ قوائے فطریہ کا نام ہے۔ ثواب و عقاب اور عالمِ اخروی کے دیگر حقائق محض عامہٴ خلائق کو تحذیر کے لئے سنائے جاتے ہیں۔ بشرِ حیوانی کا مسئلہ علوم و فنونِ جدیدہ نے باطل ثابت کر دیا ہے۔ احکامِ شریعت کی پابندی عوامِ الناس کے لئے محض ایک مصلحتِ وقتی پر محمول کی جاتی ہے اور اس کی ضرورت کو پیش کرنے والے پر تنگ خیالی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ کتاب اللہ اور سنت نے جو معیارِ اخلاق قائم کیا ہے موجودہ تمدن اور معاشرت کی بنیاد پر اب اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی یہ اعتقادی حالت

ایک امر واقع ہے جس کو میں اپنے سالہا سال کے ذاتی تجربہ سے قلمبند کر رہا ہوں۔ ایسے حالات میں کوئی توقع نہیں ہو سکتی کہ کوئی ایسی مقدس ہستی جو منجانب اللہ مؤید ہو کر خالصاً وجہ اللہ احیائے سنت کا فرض اہم بجالائے اور جس کی آواز پر قوم لبیک کہنے پر تیار ہو اصلاح ملت کی تکفل ہو سکے۔

خزاں رسید و گلستان با آن چال نماد - صدائے بلبیل بیدل برقت و حال نماد
 نشان لالہ ایں باغ از کہ مے پرسی - برو کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماد
 میں خیال کرتا ہوں کہ میں جو کچھ کہ رہا ہوں یہ بھی محض ایک قسم کی میری ہوسناکی ہے یا یوں کہو کہ میری غیرت ایمانی کا نتیجہ ہے ورنہ مجھے ہرگز یہ امید نہیں رکھنا چاہئے کہ میری اس کتاب ”مافی الاسلام“ کی اشاعت سے قوم کی بے گام ہستیاں راہِ راست پر آجائیں گی کیونکہ ابتدائے طفولیت سے سن رشد و تمیز تک جن دلوں میں الحاد و زندقہ کی ریشہ و وائیاں اپنا کام کر چکی ہیں۔ انہیں میں تو کیا دنیا میں کوئی بُرے سے بڑا علم و فضل کا مسلم الاستعداد و افضل بھی راستی کے مرکز پر لائے ہیں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یاں یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر انہیں یہ علم ضرور ہو جائیگا کہ مقدس اسلام نے دنیا کے سامنے کیا عقائد پیش کئے اور کس راستہ کی طرف توجہ دلائی اور ہم کیا سمجھے بیٹھے ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں۔ جن عنوانات پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے وہ موجودہ حالات میں میرے نزدیک نہایت اہم سمجھے گئے ہیں ورنہ بعض دیگر مسائل ضروری بھی اس کتاب کے مقاصد میں داخل تھے جو اس کتاب کے معمول سے زیادہ طویل ہو جانے کی وجہ سے نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ میں نے اثنائے عبارات میں کہیں کہیں ایسے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے جو ممکن ہے کہ بعض طبائع پر شاق گذریں مگر میرا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ میں نے سختی و توسع حق کوئی اور غیرت ایمانی

کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا معٰذ اللہ ایسے الفاظ کے مخاطب اور مورد ہی لوگ ہیں جو بسا اوقات اپنی بدعتیگی کی وجہ سے مذہب اور اہل مذہب کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کے علاوہ ہتک آمیز کلمات بھی اپنے منہ سے نکال پھینکا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں بعض دیگر اہل علم کے قلم سے نکلے ہوئے بھی عبارات ایک اقل مقدار میں موجود ہیں۔ طرز تحریر سے ناظرین کو خود ان کا پتہ چل جائیگا۔ بالآخر میں اپنے برادران اسلام سے قوی امید رکھتا ہوں کہ وہ اس کتاب کے مطالعہ میں اس امر کو مد نظر رکھیں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا وہ صرف فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت کے عقاید پر مبنی ہے اگر دیگر فرق اسلامی کے اصحاب اپنے عقائد کے برخلاف کوئی امر یا میں تو خاکسار کو عرضہ طعن قرار نہ دیں دنیا میں ایسا کوئی شخص نہیں جو تمام افراد انسانی کے خیالات کے ساتھ اپنے خیالات کو مطابقت دے سکے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب *

تایخ طباعت کتاب ”مافی الاسلام“ از خاکسار مولف (کان اللہ لہ)

بحمد اللہ کہ ایں فرخندہ مجموعہ - بہ آئین ترین گردید مطبوع
 خرد و مسلک حق باز جوید - چو دریابد رہ باطل نہ پوید
 کسے گرد از سر حق بر نہ خیزد - نہ ہر باطل کہ پیش آید گریزد
 بیڑاں گر ہوس داری تقرب - بیفشان و امن از گرد تعصب
 گہر ہائے کہ سقم یا مشقت - ز فقر بحر قرآن است و سنت
 بسال طبع ایں دلکش طرازے - شنیدم صبحدم از پاکبانے
 کہ میموی مصرعم در خاطر آمد - بہار بوستان شرع احمد



اخلاص نیت

اتِّخَاذُ الْأَعْمَالِ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ أَمْرٍ مَأْوًى..... الخ

عنوان کی حدیث صحیح کا مطلب یہ ہے کہ اعمال کی صحت اخلاص نیت پر موقوف ہے۔ اور ہر ایک نے ہی اپنے عمل سے اسی نتیجہ کا متعلق ہوتا ہے جس کی اُس نے نیت کی جو حضور علیہ السلام کا مذکورہ بالا عجازی کلام بہت حقائق و معارف پر مشتمل ہے۔ یوں سمجھو کہ ہمارے تمام اعمال جو بندہ اپنے اعضا ہم سے سرزد ہوتے ہیں اس عام حکم کے ذیل میں داخل ہیں کیونکہ یہ ضرور ہے کہ خارجی طور پر ہم کسی امر کا ارتکاب نہیں کرتے جب تک ہمارا ارادہ اور قصد پہلے متعلق ہو تو یہاں کچھ ضرورت نہیں کہ ارادہ اور قصد کے متعلق ان مختلف اقوال کا ذکر کیا جائے جو ان ہر دو میں تفاوت ظاہر کرتے ہیں کیونکہ احکام شرعیہ کے بیان میں صرف لفظ نیت کا اعتبار کیا گیا ہے اسی لئے فقہانے بھی غرض بہولت اسے لفظ ارادہ کا مترادف تسلیم کر لیا ہے۔ اور یہ کافی ہے۔ ہاں اس قدر بیان کر دینا ضروری ہے کہ شراح حدیث نے لفظ بالنیات کے حرف باء سے مصاحبت یا سبب کا مفہوم اختیار کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ صورت اول میں نیت عمل کا جزو سمجھی جائیگی اور دوسری صورت میں نیت عمل سے خارج ہوگی کیونکہ جب نیت سبب ہے تو عمل اُس کا مسبب ہے گا اور سبب مسبب ایک نہیں ہو سکتے چونکہ ہمارے تمام اعمال میں نیت مختیر ہے اسلئے ہمارا غرض ہے کہ ہم اخلاص نیت حاصل کرنے کی کوشش کریں ورنہ بدوں اس کے ہمارے اعمال خدا کے ہاں ہرگز موجب ثواب نہیں ہو سکتے غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اخلاص نیت نہایت مشکل کام ہے اور نفس کو قابو کئے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہوئے نفس ایک ایسا اندرونی رہزن ہے کہ کوئی بھی اس کے قابو سے یا بہرہ نبرد حاصل نہ کر سکے۔ اَلَا مَشَاءُ اللہ۔

خود کو کہ جب ایک پیر اپنی نسبت و ما ابرق نفسی ان النفس لا ماسق بالسوء کہ رہا ہے تو کسی دوسرے شخص کا کیا جھکا تا ہے بعض اوقات الزام کو اپنی جگہ لگتے ہیں یہ جانتے ہیں کہ وہ ریا نہیں کرتا مگر حق یہ ہے کہ ریا کی رفتار انسانی طبع میں ایسی غیر محسوس ہے کہ ہر ایک شخص کو اس کا پتہ لگنا بھی مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ ریا کی نسبت لکھا ہے۔
ازن السرایع اختفی من دہیبت الحملۃ السوداء فی اللیلۃ الظلمۃ علی الصخرۃ الصماء۔

یہ صورت ریا اور اخلاص ایک دل میں ہرگز جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ ہر بار اعلیٰ محض اللہ کی نیت پر پورا ہوا اور اس میں کسی قسم کا غم و غرض نہ ہو۔ دباؤ یا کوئی اور فائدہ بالواسطہ یا بلا واسطہ مد نظر نہ ہو۔ جب اعلیٰ اس ضروری شرط یعنی اخلاص نیت کیساتھ پورا کیا جاتا ہے تو اس کی استعداد عزت و وقت بنایا برسی میں کی جاتی ہے کہ کوئی شخص اسکا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام اخلاص نیت کے بارے میں فرمیں ارشاد فرماتے ہیں:- لو اخلص من اجل اسرہین یوما لخرجت یتابع الحکمۃ من قلبہ علی لسانہ۔

پھر ایک دوسرے موقع پر اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔ نیت المؤمن خیر من علمہ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ کیونکہ نیت اعلیٰ کیلئے بہتر علم ہے اور علمت کو معلول پر چوتھ ہو تا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ ممکن ہے کہ نیت کے مدارج مختلف تعلیم کئے جائیں چنانچہ یہ مدارج تین قسم سے باہر نہیں جاسکتے:-

اول خالص اللہ یعنی وہ نیت جس میں کسی قسم کی آمیزش کو دخل نہیں ہو سکتا ایسی نیت محض کامل ایمان آدمی سے مخصوص ہے جو مخلصین لہ الدین کی جماعت میں داخل ہے +

دوہم لوجه اللہ ولخیوہ یعنی جس میں عبادت خدائے خیال کے ساتھ کوئی دوسری غرض بھی نہ ہو یعنی ہو عموماً ایسی نیت کے لوگ بہت پائے جاتے ہیں جو خلط و اعلاص لہما و اخرا سیئاً کا مصداق ہیں +
سوم خالصاً لہ لہ جس میں عبادت خدا کا کچھ حصہ بھی شامل نہ ہو ایسی نیت کے اشخاص سے دنیا بھری ٹھہری ہے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو الدین منل مسیہم فی الحیوۃ الدنیا کہا گیا ہے +

علم میں اپنے تئیں پاکیزہ نہیں بنا سکتے کہ نفس بڑے تر سے رانی کی طوت کچھ بھالتا ہے۔ ۱۱۰۰ھ میں علیہ السلام نے انسانی اس مباحہ جوئی کی رفتار سے بھی زیادہ غیر محسوس ہے جو تھوڑی سی مدت میں ٹھوس پتھر پر چل رہی ہو۔ ۱۱۰۰ھ میں جو شخص چالیس دن تک اخلاص کا حق ادا کرے تو حکمت و دانش کے چٹے اس کے دل سے چھوٹ کر زبان پر جاری ہونے لگتے ہیں ۱۱۰۰ھ میں ایماندار کی نیت اس کے اس عمل سے بہتر ہے جو اس نیت سے وقوع میں آتا تھا۔ ۱۱۰۰ھ میں +

میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ خیال سچا خود قابل وقت ہے کیونکہ خلق جو ایک طرحی ہے موضوع واقع ہوا ہے اور القرآن اس پر محمول ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی فطرت ہی عین قرآن تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اتباع حضور علیہ السلام تعلیم قرآن کے رُوسے واجب قرار دیا گیا کیونکہ کوئی شخص حقیقی تعلیم کو بدوں اتباع سنت حاصل نہیں کر سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو دربابہ اخلاص کیا حکم ہوتا ہے؟

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا اول المسلمین۔
اس آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص اسی وقت خالص الایمان ہو سکتا ہے جبکہ اس کے تمام عبادات ومعاملات اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا مندی اور تقرب کی نیت پر مبنی ہوں چنانچہ لفظ بذلک کو امرت پر مقدم لگنے سے صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کے حضور سے بغیر خدا کو صرف اسی طریق پر چلنے کا حکم ہوا ہے اگر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طریق اختیار کرتے تو اس میں خدا کی رضا مندی نہ ہوتی۔ اس آیت میں الفاظ لله رب العالمین لا شریک لہ بالخصوص قابل غور ہیں کیونکہ جب یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک چیز کی تربیت کرنے والا اور اس کا اسکے کمال حقیقی کی طرف راہنمائی کرنے والا صرف وہ خداوند سبحانہ و تعالیٰ ہے جو اپنی ذات و صفات میں بیکاد اور بے ہمتا ہے اور جس کے علم و ارادہ قدرت سے ہم ایک آن کے لئے بھی باہر نہیں جاسکتے تو یہ امر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی غیر کو اپنا معبود قرار دیا جائے بلکہ یہ تو محض شرک ہے۔ ہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جیسا انسان دنیا میں سلسلہ اسباب کے اندر اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ بدوں اس سلسلہ کے کوئی کام بھی طے نہیں ہو سکتا تو کیونکر اخلاص کامل مقصود ہو سکتا ہے؟ سو اس کا جواب خود اسی آیت کے الفاظ محیای ومماتی میں موجود ہے جنکی تفسیر میں مفسر علی بن احمد ماہمی یوں لکھتے ہیں

ای ما افعله للحیاء فلا افعله لذاتہ لئلا افعله علی عبادتہ وما افعله لہماتی فلا افعله لطلب الجنة اولہم رب من النار بل لہمنا اللہ والتقرب الیہ فنجیب ما توہمتم فیہ الشرک

علی ای بغیر ان شرکین کو کہہ دو کہ کسی کی طرف میرا نماز اور کربانہ اور احکام کی کو بجالانا اور میرا ملائذگی اور آخرت کے تمام کام کی سب اس خدا کیلئے ہیں جو مخلوقات کا تربیت کرنے والا ہے اور جس کا کوئی شرک یکہ نہیں دیکھے اسی کا حکم ہوئے اور میں ہی اسلام لایا ہوں میں ہی ہوں ان میں

كان لله ولا ينافي ذلك حصول اسبابها لكونها من رب العالمين ولكن لا تشرط له في الطلب فلا يطلب معه سواه - اور آيہ و ما امر و الا ليجد والله فخلصين له الدين میں جو ما حرف تعریف الا حرف استثنایہ شتمل ہے غور کرو کہ کس زور کے ساتھ عبادت کو اخلاص نیت پر منحصر رکھا گیا ہے جس کا مرتب مفہوم یہ ہے کہ جس عبادت میں اخلاص نیت نہیں وہ عبادت سرے سے عبادت ہی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس عبادت سے مذکورہ بالا سوال کا قطعی جواب مل گیا ہو گا اس لئے میں کوشش کرنا چاہیے کہ ہم اخلاص نیت پیدا کریں ورنہ بدول اس کے ہمارے سب افعال آخرت میں موجب خیال ہونگے خدا ہر ایک مسلمان کو توفیق دے۔ آمین۔ اس آیت کے الفاظ انا اول المسلمين میں بھی کافی غور کرنا چاہیے کیونکہ ان میں حضور علیہ السلام کی پیروی کرنے کا حکم مندرج ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص اول ہی اول جس کسی روش پر چلتا ہے وہ بعد میں اس روش پر چلتے والوں کے لئے نمونہ بنتا ہے جو ہر ایک طرح کا مل ہوتا چاہیے *



علم یعنی میں جو کچھ اپنی زندگی کیلئے کرتا ہوں وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ وہ امور ایک گونہ عبادت الہی میں میرے ممد و معاون ہیں۔ اسی طرح میں جو کچھ اپنی آخرت کیلئے کرتا ہوں وہ جنت کی طلب اور دوزخ سے بچنے کیلئے نہیں بلکہ میرا کام اللہ تعالیٰ کی رضا اور نعت حاصل کرنے کی خاطر ہے۔ تم لوگ جس کام کو شرک خیال کر کے میری طرف منسوب کرتے ہو وہ سب کچھ اللہ کیلئے ہے اور یہ اخلاص حصول اسباب کا معنی نہیں کہ اسباب بھی اللہ ہی کی طرف سے ہیں اس لئے میں اپنی ہر نیت میں جو حقیقی کے سوا کسی غیر کا لالچ نہیں ہوں سو امنہ *

باب اول

مادہ کی حقیقت نامعلوم ہے

محسوسات خارجیہ مادی اشیاء کے مجموعہ کا نام ہے اور مادی اشیاء ہیں کسی نہ کسی جسم کی صورت میں محسوس ہوتی ہیں اور جسم بجائے خود چند عوارض مثلاً رنگ شکل مقدار وغیرہ کی مجموعی ہیئت کا نام ہے۔ اس امر میں حکماء کا اختلاف ہے کہ آیا یہ عوارض اجتماعی صورت میں جسم کی حقیقت کو پورا کر دیتے ہیں یا انکے علاوہ جسم میں کوئی اور چیز بھی ایسی ہے جسکو یہ عوارض اجتماعی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور جس کا نام مادہ ہے۔

حکماء کے ایک فریق کا خیال ہے کہ عوارض کے مجموعہ کے سوا جسم میں کوئی اور حقیقت نہیں پائی جاتی اس لئے مادہ ان عوارض سے علیحدہ کوئی اور چیز نہیں۔ مگر حکماء کا ایک دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ عوارض مذکورہ بالا کے سوا جسم میں ایک اور حقیقت بھی شامل ہے جو بذات خود تمام عوارض سے خالی ہے اور اس میں نہ تو اتصال پایا جاتا ہے نہ انفصال اور اسی کا نام مادہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جسم کو عوارض سے خالی ہم محسوس نہیں کر سکتے اس لئے اثبات مادہ کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے۔

وجود مادہ کے انکار کی صورت میں جسم صرف عوارض کے مجموعہ کا نام ہے اور وجود مادہ کے تسلیم کر لینے پر جسم مادہ اور عوارض سے ایک مرکب حقیقت کا نام ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر دو صورت میں ہیں جسم کی حقیقت کے اور اک کرنے میں سخت وقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے ہم بالیقین نہ تو یہ مان سکتے ہیں کہ عوارض کے علاوہ جسم میں کوئی اور شے مثلاً مادہ نہیں پائی جاتی اور نہ یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ عوارض سے علاوہ کوئی زائد چیز جسم میں شامل ہے جس کو یہ عوارض لاحق ہوتے ہیں جسکے ہر دو فریق اپنے اپنے مذہب کے اثبات میں دلائل غلطی پیش کرتے ہیں مگر حق یہ

ہے کہ دلائل قطعیہ کی پیش کرنے سے ہر دو طریق غائب ہیں۔ اس لئے ہم ہر دو طریق کے دلائل سے قطع نظر کرتے ہیں۔ ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ہم کائنات میں مختلف قسم کے اجسام کا ادراک کرتے ہیں مگر ہم ان کی ماہیت اصلی کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہماری تحقیق کی غایت یہ ہے کہ ہم کسی جسم پر کیا بیانی اصول پر اجزاء میں تحلیل کر سکتے ہیں مگر پھر ان اجزاء میں وہی گفتگو جاری ہوگی جو پہلے مرکب کی صورت میں۔ بالآخر کسی تمام پر پہنچ کر ہمیں اپنی بے بسی کا اقرار کرنا پڑے گا اور بے ساختہ یہ ماننا پڑے گا کہ ”سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم“

مادہ کسی چیز کی علت نہیں ہو سکتا

اگر ہم مادہ کی حقیقت کو تسلیم کر لیں تو ہمیں اس امر کا تسلیم کرنا ضروری ہو جائیگا کہ مادہ بذات خود کسی چیز کی علت نہیں ہو سکتا کیونکہ علت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات میں مستقل طریق پر ثابت و قائم ہو چنانکہ عوارض کے بغیر اس کے وجود کا تحقق ہوتا متصور نہیں اس لئے وہ اپنی ذات میں مستقل وجود نہیں رکھتا اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی حلول کی علت نہیں بن سکتا اور نہ وہ بدو ان عوارض کے خواص اور آثار کی قابلیت رکھتا ہے لہذا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کو تسلیم کر لیں کہ مادہ میں قوت فعل نہیں پائی جاتی۔

تمام اشیاء مادہ متحد الاصل ہیں

ہم مختلف قسم کے اجسام کا ادراک کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ مختلف قسم کے آثار و خواص کا مصدر ہیں مگر بائیں ہمہ اختلاف وہ متحد الاصل ہیں کیونکہ خواص اور آثار مادہ کی ذات ہیں داخل نہیں بلکہ مختلف عوارض بیرونی کے لاحق ہونے سے اجسام مختلف آثار و خواص کا مصدر قرار پاتے ہیں مگر ان بیرونی عوارض سے قطع نظر کر لیں تو ان سب کی اصلیت ایک ہی تسلیم کرنی پڑے گی۔ غماص ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور یہ تبدیلی بیرونی عوارض کی وجہ سے وقوع میں آتی ہے۔ بیرونی عوارض اپنی کیفیت اور کثیت میں مختلف ہوتے ہیں اس لئے اجسام کے آثار و خواص

بھی مختلف ہی ہونگے مثلاً معدنیات کو لو اور غور کرو کہ مختلف قسم کے بیرونی عواض ارضی اور مادی کے اختلاف کی وجہ سے کس طرح ایک ہی مادہ مختلف قسم کی موتیں ہوتا۔ چاندی ستانیا پتیل۔ لوہا وغیرہ اختیار کر لیتا ہے یہی حال نباتات کا ہے ایک ہی گٹھلی یا بیج سے ایک تناور درخت مختلف اجزاء میں پھلتا پھولتا ہے اس کے پتے میں وہ ذوق نہیں جو اس کے پھل میں پایا جاتا ہے اور اس کے پتوں میں وہ خاصیت نہیں جو اس کی جڑوں میں پائی جاتی ہے حالانکہ ان کا منبع وہی ایک گٹھلی یا بیج ہے و فی الارض قطع متجوسرات من اعناب و زرع و خیل صنوان و غیر صنوان یسقی بماء واحد و بفضل بعضہا علی بعض فی الاکل۔ ان فی ذلک لآیت لقوم یعقلون ۞

سلسلہ نظام عالم ایک قانون کلی کے زیر اثر چل رہا ہے

سرسری طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ نظام عالم میں مختلف اشیاء مختلف قسم کے قوانین کے زیر اثر قائم ہیں مگر جب یہ نظر غور دیکھا جاتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایک ہی قانون کلی بلا استثناء تمام اشیاء عالم پر منطبق ہے۔ وہی ایک قانون مختلف موارد میں مختلف آثار اور نتائج کا موجب بنتا ہے جیسے ایک ہی مٹی سے جو قوت برقی سے کام کر رہی ہو مختلف قسم کے عمل ٹھہریں آتے ہیں اسی طرح عالم کائنات پر خواہ اشیاء ارضی ہوں یا سماوی خواہ جمادی ہوں خواہ نباتی یا حیوانی سب کی سب اسی ایک قانون کلی کے ماتحت مختلف قسم کے آثار کا مصدر ہیں۔ اس قانون کلی کو ہم قانون فطرت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ قانون غیر متبدل ہے مگر اس کا غیر متبدل ہونا اس امر کا مستلزم نہیں کہ کوئی ایسی صورت عمل وقوع میں نہ آئے جس کے اسباب کا ہم علم نہیں اور ہم غلطی سے اسے قانون فطرت کے برخلاف سمجھ لیں۔ اس کی تفصیل ہم آگے چل کر قوانین فطرت کے زیر عنوان بیان کرینگے۔ اس لئے کہ لا یتبدل خلق اللہ ہر حالت میں صحیح اور درست ہے ۞

اشیاء کائنات سب کی سبب کا شے ہیں

ہر ایک ایسی شے حادث کہلاتی ہے جو اپنے موجود ہونے سے پہلے معدوم تھی چونکہ حادث اپنے وجود کے لئے آپ علت نہیں ہو سکتا اسلئے ضروری ہے کہ اس کے وجود کی علت کوئی ایسا امر ہو جو اس کے موجود ہونے سے متقدم اور اس کی ذات سے خارج ہو۔ اسباب مناسبہ کی موجودگی پر علت کسی شے کے وجود کا افادہ کرتی ہے۔ اکثر لوگ سبب اور علت میں امتیاز نہیں کیا کرتے۔ اور انہیں اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ علت کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے کا کام کرتی ہے اور اسباب علی علت کے لئے بمنزلہ شرائط کے ہیں یعنی جب تک اسباب مناسبہ موجود نہ ہوں علت اپنا عمل نہیں کرتی۔ اسی علم امتیاز کی وجہ سے بعض لوگ اسباب کو علت کی حیثیت سے بلا نظر کر کے کسی قسم کی غلطیوں میں پڑ جایا کرتے ہیں اور ان اسباب کو ایک قانون قطعی قرار دے لیتے ہیں حالانکہ یہ ممکن ہے کہ کسی شے کے عدم سے وجود میں آئیے اسباب مختلف ہوں اور ضروری نہیں کہ علت کسی خاص سلسلہ اسباب میں اپنے عمل کی پابند ہو۔ اس لئے علت کے عمل کو ہم کبھی کسی خاص سلسلہ اسباب میں محدود نہیں کر سکتے۔ مثلاً حرارت کے پیدا کرنے کے لئے مختلف اسباب ہیں۔ ان اسباب کے متیا ہونے پر اگر علت اپنا عمل کرے تو نتیجہ معینہ ظہور پذیر ہوگا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ اسباب کے متیا ہو جانے پر بھی نتیجہ معینہ ظہور میں نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر کوئی سبب خفی نتیجہ کے ظہور پذیر ہونے سے مانع ہوتا ہے جس کا ایسا اوقات ہیں علم نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ علت نتیجہ معینہ کے ظہور میں لانے سے عاجز ہے بلکہ یہ امر قانون فطرت کی حدود کی نگہداشت پر مبنی ہے جسکو ہم غیر متبدل کہ چکے ہیں اسی غلط فہمی کے رفع کرنے کے لئے محققین کا یہ جملہ مشہور ہے :-

”لولا الاسباب لَمَا اسرتاب مرتاب“ یعنی اگر لوگ سلسلہ اسباب میں نتائج دیکھنے کے عادی نہ ہوتے تو کسی شخص کو بھی (مشیت الہیہ) کے وجود میں شک نہ ہوتا۔

ہماری اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ عالم کائنات اپنی ہر ایک شے حادث ہے کیونکہ وہ اپنے

موجود ہونے سے پہلے معدوم تھی اسلئے ہم ہر ایک شے کو مخلوق تسلیم کرتے ہیں خواہ اس کی مدت وجود نہ ہو اور لاکھوں سال ہو اسلئے اجماع فکری بھی حادث ہیں اور اسلئے وہ مخلوق ہیں اور چونکہ ہر ایک خلق قانون تغیر و انقلاب کے زیر اثر ہونے سے خارج نہیں اسلئے وہ قدیم نہیں ہو سکتا۔ یا یوں کہو کہ ہر ایک مخلوق شے کے لئے کوئی نہ کوئی ابتدائے زمانی ہے کیونکہ قدیم شے تغیر و انقلاب قبول نہیں کر سکتی اور یہی مطلب ہے اے خلق السموات والارض کا۔

ہر ایک حادث فانی ہے

کسی شے کا حادث ہونا اس امر پر دلالت ہے کہ اس کے وجود کے لئے دوام دلیقا نہیں بلکہ وہ فنا کی طرف مائل ہے۔ فنا سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر ایک شے کی ہیئت ترکیبہ قابل فنا ہے اور جب یہ امر عالم کائنات کی ہر ایک شے کے لئے علیحدہ علیحدہ طور پر ثابت ہے تو کل عالم کائنات کا فانی ہونا ایک بدیہی امر ہے اور آئینہ کل شیئی عیالک الا وجہہ کا اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

سلسلہ کائنات لاتناہی نہیں ہو سکتا

جو لوگ عالم کو قدیم مانتے ہیں وہ سلسلہ کائنات کو لاتناہی کہتے ہیں یعنی ان کا خیال یہ ہے کہ سلسلہ کائنات کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ یا یوں کہو کہ وہ عالم کو ابدی اور اتلی مانتے ہیں مگر یہ خیال سرسرا بطل ہے کیونکہ سلسلہ کائنات قانون سبب و مسبب سے وابستہ ہے ہم کسی حادثہ یا واقعہ کا بلا سبب ظہور میں آنا تسلیم نہیں کر سکتے اور نہ فطرت انسانی اس بات کو تسلیم کر سکتی ہے کہ سلسلہ اسباب اوپر کی طرف اتنا دور چلا جائے کہ کہیں کسی ایسے سبب پر اس کا خاتمہ نہ ہو جو تمام اسباب کا سبب اولین کہلا سکے۔ زور اغور کرو تمہاری فطرت خود بخود یہ شہادت دیگی کہ سلسلہ کائنات کو لاتناہی تسلیم کرنا ایک عجیب گورکھ دھندا ہے جس کا کوئی مغہم محفل ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کوئی ایسا امر جس کے قبول کرنے سے فطرت انسانی عاجز ہو ہو کر گنہگار قبول نہیں اس لئے سلسلہ کائنات کا لاتناہی ہونا خواہ از لا ہو خواہ ایداً ایک ایسا معتمد ہے جس کا عقل انسانی کے دائرہ عمل سے خارج ہے مع ہذا سلسلہ

کائنات کے لاتنا ہی ماننے والوں کے پاس کوئی قطعی دلیل بھی موجود نہیں جو مثبت دعویٰ ہو بیشک یہ امر قابلِ وقت ہے کہ سبب اولین جس کو ہم اصطلاحاً علتِ اولیٰ کہہ سکتے ہیں سلسلہ کائنات سے ایک علیحدہ ماہیت کا نام ہے جس کی بحث ہم آئندہ صفحات میں کر چکے آئیے "وما یصلکنا الا الدھر" میں اسی زعمِ باطل کا رد ہے ۔

تمام اشیاء عدم سے وجود پذیر ہوتی ہیں

بعض کوتاہ فہم لوگوں کا خیال ہے کہ ہر ایک چیز کسی دوسری موجود چیز سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شے سے کوئی چیز ہست نہیں ہو سکتی۔ اس امر میں وہ صرف اپنے مشاہدہ کو حجت لاتے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان سے اور ایک گھوڑا دوسرے گھوڑے سے وجود پذیر ہوتا ہے مگر یہ خیال اصولِ حکمت کے منافی ہے اور بعض حکماء اور متقدمین (جالیانوس و اسکندر) نے ثابت کیا ہے کہ کسی شے کا عدم محض سے وجود پذیر ہونا ایک امر واقع ہے اس دعویٰ کے اثبات میں ہم حسبِ میل تقریر کر سکتے ہیں :-

ہم دیکھتے ہیں کہ اشیاءِ محسوسہ کی صورتوں میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے مگر محل (وہ شے جس پر صورت طاری ہوتی ہے) بذاتہ غیر متبدل ہے۔ اشیاءِ مادیہ کی شکلیں اور صورتیں سب کی سب کسی نہ کسی جسم میں پائی جاتی ہیں جو ان کے لئے محل ہے اور جو اصل بدل کے وقت تین حال سے خالی نہیں کیونکہ یا تو صورت کے اصل بدل کے وقت پہلی صورت کے باقی رہنے کے ساتھ دوسری صورت بھی باقی رہتی ہے۔ یا وہ صورت کسی دوسرے محل کی طرف منتقل ہو گی یعنی وہ محل نہیں ہوتا۔ یا پہلی صورت بالکل باطل ہو کر اس پر دوسری صورت عائد ہوتی ہے ۔

پہلی صورت تو بالکل باطل ہے کیونکہ متضاد صورتیں اور مختلف شکلیں ایک ہی آن میں ایک محل میں جمع نہیں ہو سکتیں اور دوسری صورت بھی ناممکن ہے کیونکہ نقل مکانی محل کے لئے تو ممکن ہے مگر وہ صورت کا منتقل ہونا بغیر محل کے ایک محال امر ہے اور یہ امر بالکل واضح ہے۔ اب صرف

تیسری صورت باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلی صورت باطل ہونے سے اپنے محل سے زائل ہو کر دوسری اس جگہ آ موجود ہوتی ہے اور اس صورت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی صورت وجود سے عدم میں چلی گئی۔ سو جب پہلی کی نسبت ہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ وہ وجود سے عدم میں چلی گئی۔ تو دوسری کی نسبت بھی ہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ وہ عدم سے وجود میں آگئی یعنی پہلے نہایت مٹی پھر ہست ہو گئی اور اگر ہم یہ نہ مانیں تو ہمیں پہلی دونوں صورتوں میں سے ایک کا قائل ہونا پڑیگا مگر وہ دونوں باطل ثابت ہو چکی ہیں اس لئے یہ تیسری صورت سچاے خود صحیح ہے کہ صورت اور دیگر کیفیات یکے بعد دیگرے عدم سے وجود میں آتی رہتی ہیں۔ اور ابداع کے یہی معنی ہیں۔ کیونکہ اگر خالق حقیقی کسی موجود چیز کو کسی دوسری موجود چیز سے پیدا کرتا تو اس طرح پیدا کرنے کو ابداع نہیں کہہ سکتے بلکہ ایجاد کا لفظ بولا جائیگا۔ ابداع اسی صورت میں کہہ سکتے ہیں جبکہ کوئی شے عدم سے وجود میں لائی جائے اور غور کرنے سے یہ امر بالکل واضح ہو سکتا ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حیوان مادہ مٹی سے پیدا ہوتا ہے اور مادہ مٹی تبدیل و تبدیلیج صورت حیوانی اختیار کرتا ہے اور اپنی پہلی صورت سے کسی دوسری صورت کو قبول کرتا ہے اور مادہ مٹی کا اصل خون ہے اور خون غزل سے اور غزل نباتات سے اور نباتات عناصر سے پیدا ہوتی ہے اور عناصر بالآخر کسی کسی مقام پر بسیطہ جاتی ہیں اور بسیطہ صرف ہوتی اور صورت کا ثابہ اور ہوتی اور صورت تمام موجودات سے پہلے ہیں اور ایک کا بجز دوسرے کے وجود ناممکن ہے اور ان دونوں تجزیہ کے بعد نتیجہ کے اجزاء میں ناممکن ہے اسلئے ضرورتاً یہ ماننا پڑیگا کہ یہ ہر دو عدم سے وجود پذیر ہوئی ہیں اور یہی ہمارا مطلوب ہے۔

خواص اشیاء کا حصر ناممکن ہے

کسی ایک شے کو لے لو اور اس میں غور کر کے دیکھو کہ وہ کن خواص کی قفل ہے؟ تم عمل تجزیہ کے اس کے خواص میں آثار کا پتہ لگا سکتے ہو مگر تمہارا عمل ایک حد میں سے زیادہ تجاوز نہیں کر سکیگا۔ اسلئے ہمارے پاس کوئی ایسی عملی دلیل نہیں جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکیں کہ کسی چیز کے خواص میں آثار فلال حد تک وہ ہیں بلکہ یہ احتمال ہر حالت میں باقی رہیگا کہ ہمارے مجوزہ خواص میں آثار سے کہیں زیادہ خواص آثار کا پایا جانا ناممکن ہے کیونکہ عوارض بیرونی کا حصر ناممکن ہے۔ اسلئے ان عوارض کے اس شے پر لاحق ہونے سے خواص آثار کا حصر بھی ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم باوجود ہیئت سی ترقی علوم و فنون کے یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ اشیاء کے خواص آثار کی تحقیقات موجودہ نامکمل ہیں اور اس امر کی صداقت پر بحث کرنے کی ہمیں زیادہ ضرورت نہیں علوم و فنون کی نسبت ہمارا مشاہدہ ہے کہ وہ یوں یا فیوماً ترقی پذیر ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ اشیاء کائنات کے خواص و آثار کے متعلق ہماری تحقیق ابھی تک پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی ۔

رابط سبب و مسبب

انسان کا فطری خاصہ ہے کہ وہ کسی واقعہ یا حادثہ کو کسی نہ کسی سبب کے ساتھ تعلق دے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے گرد پیش بلکہ خود اپنے جسم میں حوادث کو واقع ہوتے دیکھتا ہے اور ان کے اسباب کی تلاش میں لگا رہتا ہے۔ اس لئے یہ عمل بطور قاعدہ کلیتہ کے اس کی طبیعت میں متقل طور پر درجہ یقین کو پہنچ چکا ہے کہ ہر ایک واقعہ کا کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہیے۔ بدن سبب کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سبب و مسبب کا رابطہ ایک عادی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عادت الہیہ اس امر پر جاری ہے کہ ایک شقہ کے بعد دوسرا واقعہ ظہور پذیر ہو اس میں حکمت یہ ہے کہ انسانی فطرت سلسلہ نظام عالم میں اسباب سے مسببات کے وجود میں آنے کے ساتھ مانوس رہتی ہے۔ اور اس کی امید ادنیٰ کا سلسلہ بدستور جاری رہتا ہے انسانی فطرت میں جو قوی و ولایت رکھے گئے ہیں ان کو ان قوی کے ساتھ جو عالم کائنات میں عمل کر رہے ہیں ایک گونہ مناسبت ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کو عالم اصغر اور عالم کائنات کو عالم اکبر کہا گیا ہے۔ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں :-

وتنظر عمارانہ جبرہ صغیر و فیلہ الطوی العالم الاکبر

اسی مناسبت پر انسان کسی کام کی پیش رفت کے لئے ہمیشہ اسباب کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے مگر وہ اسباب کی پابندی سے کبھی تو کامیاب ہوتا ہے اور کبھی کامیاب نہیں ہوتا کیا اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اسباب بداتہا مؤثرہ نہیں؟ اسلامی عقائد کی رُو سے اس کا جواب یہی ہونا چاہیے

کہ اسباب بذاتہا مؤثر نہیں بلکہ حقیقی مؤثر ذات یاری کا ارادہ انلی ہے اور اسباب صرف عاۃ اللہ کے مطابق اپنا کام کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اسباب کسی موافق نتیجہ کے پیدا نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کچھ ایسے اسباب خفیہ بھی عمل کر رہے ہوتے ہیں جو اسباب مقررہ کو ان کے عمل سے روک دیتے ہیں اور یہیں ان اسباب خفیہ کا علم نہیں ہوتا اسلئے نتیجہ موافق ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ایسے اسباب خفیہ کے وجود کا اقرار کر لیتے پر بھی یہی کہیں گے کہ وہ اسباب خفیہ ارادہ انلی کے تابع ہیں اور ان کا نتیجہ محض سے ملنے ہونا حکمتِ خداوندی پر مبنی ہے۔ اس امر کا ثبوت بہر صورت مقررہ کے ذمہ ہے کہ اسباب بذاتہا مؤثر ہیں۔

بدیشک عام طور پر جب ایک واقعہ دوسرے واقعہ کے بعد ظہور پذیر ہوتا ہے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جو واقعہ پہلے وقوع میں آتا ہے بعد میں وقوع میں آنے والے کا سبب ہے مگر اسلامی عقیدہ کی رو سے سبب بذاتہ مؤثر نہیں۔ اگر حکمتِ خداوندی متقاضی ہو تو وجود سبب پر مستتب وقوع میں آسکتا ہے ورنہ یہ ممکن ہے کہ سبب ہو اور سبب ظہور میں نہ آئے (خواہ وہاں اسباب خفیہ عمل کر رہے ہوں یا نہ) اور سبب موجود ہو اور اس کا سبب موجود نہ ہو مثلاً یہ امر کہ آگ جسم کو جلا دیتی ہے اور پانی پائس کو بجھا دیتا ہے بجائے خود صحیح ہے مگر بطریق عاۃ اللہ بطریق تاثیر ذاتی۔ کیونکہ آگ اور پانی میں کوئی چیز بذاتہا مؤثر نہیں بلکہ آگ اور پانی کا فعل ارادہ انلی کے تابع ہے کیونکہ یہ امر بدلائل قاطعہ ثابت ہو چکا ہے کہ تمام حوادث عالم کائنات میں ارادہ ذات یاری کے مطابق وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اگر اسباب کو بذاتہا مؤثر مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خالقِ حوادث ہیں مگر وصفِ خالقیت مولیٰ خالق حقیقی کے کسی غیر کی طرف نسبت نہیں کی جاسکتی کیونکہ جو چیز غیر اللہ ہے وہ مخلوق ہے اور مخلوق کبھی خالق نہیں ہو سکتا علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ امور حادثہ میں ان کے فاعل کے علم و قدرت و حکمت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور ان صفات کو کوئی عقل و ہوش کا آدمی مادہ کی طرف جو ان صفات سے بالکلیت خالی ہے کبھی نسبت نہیں کر سکتا۔ غور کرو کہ ایک بیج سے ایک درخت پیدا ہوتا ہے جو مختلف حصصِ تناسلی شگوفہ پتہ پھل پھول۔ ذائقہ۔ بو۔ رنگ خاصیت اور دیگر آثار پر مشتمل ہوتا ہے۔

کیا یہ آثار ایسے ہی اتفاقیہ طور سے مادہ پر خود بخود مرتب ہو گئے؟ حالانکہ کلاماً بلکہ خود مادہ کے پیدا کرنے والی ذات بھی وہی خالق حقیقی کی ذات ہے جس نے مادہ کو اس قابل بنایا کہ اس پر مذکورہ بالا آثار مرتب ہو گئیں۔ مادہ بذاتہا جو کچھ بھی ہو تمام اشیاء کے لئے اصل ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اشیاء کے خواص و آثار کو ان اشیاء کی ذات سے کس چیز نے مختص کیا ہے؟ اگر مادہ کی ذات کو سبب تخصیص مانا جائے تو چونکہ مادہ سب اشیاء کا ایک ہی ہے اس لئے تمام اشیاء کو ایک ہی قسم کے آثار و خواص کا مصدر ماننا پڑے گا۔ مگر یہ صراحتاً باطل ہے۔ لہذا خالق حقیقی کے ارادہ ازلی کا اقرار کئے بغیر کوئی چارہ نہیں اگر اس کا ارادہ معہودہ عادات کے برخلاف جاری ہو تو اس میں کوئی نامحال عقلی لازم آتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ مخالفت یہ کہہ سکتا ہے کہ عادتہ اللہ کے برخلاف عام طور پر کبھی کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ سو اس کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسباب عادیہ بذاتہا مؤثر ہوں اور عادتہ اللہ کے برخلاف کوئی حادثہ وقوع میں نہیں آسکتا۔ ”فعل الله ما يشاء ويحكم ما يريد“

حقائق غیر مادیہ یا ماوراء المادہ

زمانہ حال کے محققین کی طرف سے جو ہر ایک امر میں تبدلِ عقلی کے دلدادہ ہیں یہ سوال اکثر سننے میں آیا کرتا ہے کہ آیا ہم ہر ایک حقیقت کو جو ہمارے تصور میں آتی ہے اور اک کر سکتے ہیں اور کیا ہر ایک حقیقت کے متعلق ہمارا علم کامل ہے؟ اس سوال کو یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ آیا ان مادی اشیاء کے علاوہ جن کا ہم بذریعہ حواس اور اک کر سکتے ہیں کوئی اور بھی ایسے حقائق فی الواقع موجود ہیں جن میں ہم بذریعہ حواس محسوس نہیں کر سکتے؟ انہیں حقائق کا نام حقائق غیر مادیہ ہے۔

اس سوال کے جواب میں ہم انہیں لوگوں کے ایک کلمہ مقولہ کو پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ”انسان کی تحقیق کا منبع اس قدر محدود ہے کہ جو کچھ آج تک معلوم ہو چکا ہے بمقابلہ اس نامعلوم کے جو ابھی تک خیرِ حقائیں پڑا ہے وہ نسبت بھی نہیں رکھتا جو ایک قطرہ کو بحرِ ناپید کنار سے ہو سکتی ہے۔“ بے شک یہ مقولہ صاف اور واضح ہے۔ اور بقول قرآنیہ ”وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا“ کے ساتھ

بالکل مطابق ہے اس خیال کو تہ نظر رکھتے ہوئے ایک اضافہ پسند محقق کی کبھی یہ رائے نہیں ہونی چاہئے کہ محققانہ
 وہ فلسفہ اعداء ماحصلوا " جس چیز کی حقیقت کا ادراک ذکر کے سرے سے اس کے وجود کا انکار کرنے
 کیونکہ یہ مسلم ہے کہ کسی چیز کے ہلے اور اک سے خارج ہونے کی وجہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز دائرہ وجود
 سے بھی خارج سمجھی جائے۔ اقلاطون الہی کا قول ہے کہ ایسے بیسیوں حقائق میں جن کے وجود کا مجھے یقین ہے مگر آپ
 کوئی دلیل میرے پاس موجود نہیں اور دلیل نہ ہونے کے مختلف وجوہ ہیں اول تو یہ کہ ہماری توجہ فکر یہ
 ان کی حقیقت کی طرف مائل نہیں ہوئی جس سے یہ خیال عام طور پر دلوں میں جم گیا کہ اس عالم مادی کے سوا
 اور کوئی عالم موجود نہیں۔ دوم یہ کہ ہمیں ایسے حقائق پر آگاہ ہونے کی بابت کوئی دلیل نہیں مل سکتی۔
 سوم ممکن ہے کہ ایسے وسائل ہمارے پاس موجود نہ ہوں جو اس عالم کے سوا کسی دوسرے عالم تک ہمیں
 پہنچا سکیں۔ قوت کبر یا بیہ کے انکشاف سے پہلے کون اس کے وجود اور آثار کا قائل تھا؟ حالانکہ
 اس کا انکشاف علم طبیعیات کے تجاریک نتیجہ ہے مگر بایں ہمہ وہ اب تک بھی ہم پر ایسی ہی مخفی ہے کہ ہم اپنے
 آپس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے حواس سے اس کے آثار
 کا احساس کرتے ہیں اور اگر ہم ان لوگوں کے اس قول کو کہ جو چیز جو اس سے محسوس نہیں ہو سکتی ہم اس کی
 تصدیق نہیں کر سکتے عام طور پر تسلیم کر لیں تو ہمیں کئی ایک مواقع پر اس کے خلاف بھی چلنا پڑتا ہے مثلاً
 ایٹم جس کا حواس سے احساس نہیں ہو سکتا مگر اس کے وجود سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ روشنی کے
 پھیلنے کی تشریح صرف ایٹم کے اثبات وجود پر موقوف ہے۔ علاوہ ازیں ایک قسم کی اشیاء ہیں کہ
 جن کے ادراک سے ہمارے حواس قاصر ہیں اور کسی دوسری صورت میں ان کے وجود کا اقرار کرنا پڑتا ہے
 مثلاً ایسی موجودات جن کو صرف خوردبین کے ذریعے سے ہم ادراک کر سکتے ہیں جب عالم مادی میں ہمارے
 حواس کا یہ حال ہے تو اس میں عالم مادی سے بالاتر حقائق کا حواس کے ادراک سے خارج ہونا کونسی

عملہ ایٹم ایک قسم کی گیس ہے جو تمام خلا میں پھیلی ہوئی ہے اور وہ بذاتہ ساکن ہے جب تک کوئی دوسرا جسم اسے حرکت
 نہ دے جس طرح ہوا کسی آواز کو بذریعہ موج کاں تک پہنچاتی ہے اسی طرح ایٹم روشنی کو موج کے ذریعہ قوت
 باصرہ تک پہنچاتا ہے اور ان لوگوں کا خیال ہے کہ قوائے کیمیاء و حرارت اور کبریا بیہ و مقناطیسیہ ایٹم کی مختلف
 حرکات کا نتیجہ ہیں۔ اور ایٹم ہی ان تینوں کو مادہ روشنی کے ساتھ ترکیب دینے کا واسطہ ہے۔ ۱۲- منہ +

نئی بات ہے؛ اگر ہم نفس انسانی کی حقیقت کو غیر محسوس تسلیم کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ مانع نہیں کہ عالم مادی سے بالاتر کوئی اور ایسا عالم بھی موجود ہو جس کو ہم نے محسوس نہیں کر سکتے۔

ہر ایک شخص فطرۃً اپنے آپ سے یہ سوال کر سکتا ہے کہ اگر وہ خدائے خالق السموات والارض کے وجود اور اس کے صفات کا علم پر ایمان نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے حیوانی جذبات اور بے اعتدالیوں سے کوئی چیز مانع ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب اگر وہ (بیرونی تاثرات سے فلذغ اور مختلف لوگوں کی آراء سے فلسفہ سے خالی الذہن ہو کر) تجویز کیے گا تو یقیناً نفی میں ہو گا کیونکہ انسانی فطرت کے لاتناہی کمالات کی کھن منزل بجز کسی خاص دستور العمل کی پابندی کے طے نہیں ہو سکتی۔ اس دستور العمل کے لئے ضروری ہے کہ قواعد و ہدایہ کے تاثرات سے بالکل بری ہو اور یہ خاصہ دون تعلیم وحی کے کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس خیال کی موجودہ زمانہ کے بعض مغربی فلاسفہ نے بھی بالاتر چلے زور کے ساتھ تائید کی اور میرے خیال میں ہر ایک شخص کو خواہ وہ کیسا ہی منکر کیوں نہ ہو بعض ضروری اسباب کے پیش آنے پر اس مرکز تحقیق پر پہنچ جانے کا موقع ضرور ملتا ہے۔ اور یہ اس نوع فطرت کا نتیجہ ہے جو انسان کی جبلت میں خداوند کریم نے ودیعت رکھا ہے۔

یورپ کا مشہور فلاسفر رومیو لکھتا ہے کہ میں یہ گمان کیا کرتا تھا کہ انسان وجود خالق کا اقرار کئے بغیر بھی انسانی اعلیٰ کمالات کی منزل تک ترقی کر سکتا ہے مگر بالاتر عجیبے یقیناً معلوم ہو گیا کہ میرا یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ بدون ایک حقیقی مبدء و کے انسان حقیقی مسترت کا کبھی مالک نہیں ہو سکتا۔ اور یہ خیال نہایت صحیح اور مشہور ہے جس کے برخلاف ہمارے فطرت کسی بات کو صحیح نہیں سمجھ سکتی؛ یہی مطلب ہے آیہ انی اللہ شاک فاطر السموات والارض کا یعنی کیا اللہ تعالیٰ کے وجود میں بھی کچھ شک کی گنجائش ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے؟ اس آیت میں الفاظ "فاطر السموات والارض" جو ترکیب بخوی کی گئی اس سے صفت واقع ہوئے ہیں وجود ذات باری کے اثبات میں بمنزلہ حجت قاطعہ کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یا فطرت انسانی اس سلسلہ کائنات کے بلا کسی صلح کے موجود ہونے کو کبھی تسلیم

کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ طرز بیان صرف قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ ایک مادہ سے سادہ پیرایہ بیان میں دقیق سے دقیق فلسفہ کو بھرتی ہے اور یہی اس کے اعجاز کی ایک دلیل بنی ہے۔

موجودہ زمانہ میں یورپ کے دو بڑے مشہور فلاسفوں کے درمیان اثباتِ مائعِ عالم کے مسئلہ پر چب گنگوٹ ہوئی تو ایک طویل بحث کے بعد منکر کے سامنے یوں استدلال کیا گیا تھا کہ اگر ہم مادہ کو غیر مخلوق تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ اس میں تمام وہ قوتیں موجود ہیں جن کے ذریعہ سے وہ خود ہی انسان کا خالق ہو سکتا ہے تو عقل اس امر کو کیسے صحیح باور کرے گی کہ ایک غیر مد رک ہستی جو کسی خل کی غایت کا علم نہیں رکھتی اپنے عمل کی ہیئت کو خود ہی بدل کر مذکر کی طرح ایک مؤنث کو پیدا کرتی ہے اور یا آنکہ مذکر اور مؤنث میں پورا تشابہ پایا جاتا ہے مگر باوجود اس کے ان میں ایک نمایاں فرق بھی موجود ہے۔ کیا یہ تشابہ اور تفارق اس امر کی قطعی دلیل نہیں کہ کوئی نہایت ہی اعلیٰ عقلیت ہستی اس سلسلہ ایجاد پر مکران ہے جس کی کامل قدرت۔ کامل حکمت۔ کامل علم اور کامل ارادہ کے نتائج نہایت واضح طور پر مظاہر کائنات میں مشاہدہ ہو رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا دلیل بالکل ایک معمولی دلیل ہے جو ہر ایک فطرتِ سلیم کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ آیاتِ قرآنیہ پر غور کرو کہ ضرورتِ مائع پر سینکڑوں مختلف مظاہر قدرت کے استدلال کر کے منکرین کے دانت کھٹے کھٹے ہیں مگر جو شخص تندر نہیں کرتا اور تحقیق حق کی ضرورت نہیں سمجھتا اس کے لئے کوئی دلیل بھی کافی نہیں۔ یہ بالکل یقینی بات ہے کہ اہل فلسفہ نے اپنی فلاسفی سے کوئی ایک دلیل بھی ایسی پیش نہیں کی جس کو قرآن مجید نے نہایت معمولی طرز بیان میں ادا کر دیا ہو مثلاً اس دلیل کو کہ اگر ہم وجودِ مائع کی ضرورت کو تسلیم نہ کریں تو مادہ کا خود علت ایجاد ہونا ناممکن پڑے گا مگر مادہ محض ایک غیر مد رک ہستی کا نام ہے اس لئے وہ کسی مد رک ہستی (انسان) کے وجود کی علت نہیں ہو سکتا قرآن مجید نہایت لطیف اور سادہ پیرایہ میں یوں بیان کرتا ہے :-

”وَلَا تَدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ“

نیوٹن انگلستانی اپنی تحقیق کے آخری مرحلہ پر یہاں تک پہنچ گیا تھا کہ اس نے وجودِ مائع کے سوال پر مسائل کو یہ جواب دیا کہ صرف ایک اندھی مزدور کے وجود کو مؤثر ماننا ہماری سمجھ میں نہیں آتا یعنی یہ خیال کہ عالم کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے یہ ایک قسم کی مادی طبعی ضرورت کا نتیجہ ہے بالکل باطل ہے کیونکہ یہ تنوع (گونا گونی) اور مخالف ایکے پرست دلیل ہے وجودِ مائع حکیم پر یعنی اشیاء کا وجود اور تغیرات جو بلحاظ اختلاف زمان و مکان وقوع پذیر ہوتے ہیں کئی برست حکمت پر مبنی ہیں اور حکمت کا وجود بدون کسی حکیم کے پایا نہیں جاسکتا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ گذشتہ تین صدیوں سے مادی فلسفیوں نے یورپ میں بہت ترقی کی ہے اور بالخصوص اٹھارویں اور انیسویں صدی کے محققین علمائے مادہ نے قریباً قریباً اتفاق کیا ہے کہ جو کچھ ہے مادہ ہی مادہ ہے اور اس سے بالاتر اور کوئی حقیقت نہیں یہی وجہ ہے کہ یورپ میں الحاد اور زندقہ کو اس قدر ترقی ہوئی کہ پادری لوگ اس کا کچھ بھی مقابلہ نہ کر سکے ایسے پرخطر وقت میں روح اور اس کے عجائبات اور ثواب و عقاب وغیرہ امور کے پیش کرنے کے لئے مختلف تجاویز قرار دی گئیں چنانچہ انیسویں صدی کے آخری نصف میں کئی ایک

لے مادی مذہب نے یورپ کے لوگوں میں اس قدر ترقی کی کہ انیسویں صدی کے وسط میں قریباً تمام یورپ بالخصوص جرمنی، فرانس اور انگلستان بالکل دہریہ ہو گئے۔ جسے بڑے علمی حلقوں میں کھلم کھلا تنقید دی گئی اور کئی ایک بلکہ روح اور ثواب و عقاب وغیرہ امور کو عقل بشریت کے منفع کا نتیجہ قرار دیا جاتا۔ اس طوفان بے تیزی کا مقابلہ کرنے سے بیمار مشنری بالکل عاجز تھے۔ اسی اثناء میں بعض محققین نے اسلامی تعلیم پر غور کرنا شروع کیا۔ کیونکہ حیسانیت اس خرابی کا انسداد کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہائے الحمد للہ کہ مختلف محققین کی تحقیق نے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچادی کہ متکین روح حق گمراہ لوگ ہیں اور روح جسم انسانی سے ایک علیحدہ حقیقت معینہ کا نام ہے جو مردک و مدبرہ منصرف ہے اور وہ چیز و شے افعال کا کسب کرتی ہے اور اس کے کمال تک پہنچنے کے لئے یوم آخرت کا تسلیم کرنا لازمی ہے۔ گو ہم اس کی تفصیلی حقیقت کا علم نہ رکھتے ہوں مگر روح کی خلقت اس کی ضرورت سے ہرگز منافی نہیں بلکہ بدن اس کے اس کمال پر انہیں ہوتا۔ اس خیال کو پہلے پہل جرمنی کے ایک مشہور فلاسفر کراٹس نے اپنے ایک علمی پریم میں شائع کیا تھا۔ ایک عربی مصری رسالہ اس شخص کے خیال کو اپنے الفاظ میں یوں ترجمہ کرتا ہے:-
 "ان العلوم الطبيعية قد تجارات علی فکر ان خلود النفس قد اقتبھا اللہ بان حکم علیھا بان تکون ہی نفسھا الی تقیہ علی دلائل الخلود البرهان القاطع"۔ یہی علوم طبیعیہ روح کی آئینہ زندگی اور اس کے دوام سے انکار کرنے لگ گئے سو عدائے تعالیٰ نے یہ سزا دی کہ وہ خود ہی روح اور اس کی بنا پر دلائل قاطعہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔
 یعنی علومِ طبیعیہ بجائے اس کے کہ انکار کریں اس ضرورت کو ثابت کرتے ہیں۔ ۱۲- منہ *

انجمن حقیقت روح اور اس کے عجائبات کی تحقیق کے لئے قائم ہوئیں جنہوں نے روح اور اس کے عجائبات کی بڑے زور سے تصدیق کی۔ ان انجمنوں میں سے سب سے زیادہ مشہور انجمن وہ تھی جو ۱۸۶۹ء میں بمقام لندن منعقد ہوئی۔ اس انجمن کے ارکان ٹی بی اے اکابر علمائے فلسفہ ہندسہ تاریخ طبیعیات ریاضیات البیات قرار پائے جن میں مشاہیر یہ لوگ تھے۔ جان لیک ہکسلے لولس۔ الفوڈ سل ولانس ڈارون سرجان قابنی۔ جان کوکس۔ کنون پروفیسر وغیرہ۔

اس انجمن کی یورپ میں بڑی دھماک بڑ گئی تھی اور لوگ اس کی آخری تحقیق کے سخت منتظر تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس انجمن کا فیصلہ آخری اور قطعی ہو گا جس کا اپنی کہیں نہیں ہو سکیگا۔ چنانچہ اس انجمن کے اجلاس متواتر دوڑھ سال تک ہوتے رہے اور بڑے بڑے پیرزور علمی مباحث اور اعتراضات کے طے ہونے پر اس انجمن کا مقصد فیصلہ حسب ذیل تجاویز کو ایک عربی مصری صالح کے ایڈیٹر نے ترجمہ کیا ہے :-

”ان الجمعية استقرت فی تقریرها علی الاعمال الی شامد ہا کل الاعضاء مہما کانت محسوسة لشاعرہم و کانت مہما معتزنة بالبرهان العلمی۔ ان اربعة انحاس الاعضاء ابتداوا البحث و ہم فی اشتداد درجات الکامر لہذا الاشیاء و معتقدون قلبا و قالبا انہا لیست الا نتیجة الحش اولوہم و بالآلاتی نتیجة اہل الاضطرابی للاعصاب و لکن بعد ان وضعت لہم ہذا الاشیاء و ضوحا تاما فی شروط نفث کل تلک المفروض ولید تجارب و قیقة حید انکسرت مرار الم یروضوا الاعضاء المنکسرین ببدأ امن اعتقاد ان ہذا الخوارق حقیقة و غیر القہود اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس انجمن نے انہیں اعمال تک اپنی کاروائی کو محدود رکھا جو محسوس ہو سکتے ہیں اور جن کا صحیح ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہے اس مجلس کے کچھ ارکان نے اس عظیم الشان بحث کو ایسی حالت میں شروع کیا کہ وہ شروع اور امور روحانیہ کی بابت سخت

انکار کرتے تھے۔ اور ظاہر و باطن میں اس امر کے قابل تھے کہ یہ باتیں محض ایک قسم کا دھوکا ہیں یا قوت و اہمہ کا نتیجہ ہیں یا اگر ان کی کچھ حقیقت ہو سکتی ہے تو اسے نظام عصبی کا نتیجہ سمجھنا چاہئے (الفرق مادہ سے علیحدہ کوئی اور حقیقت ناممکن ہے) لیکن جب ان لوگوں پر نہایت وضاحت کے ساتھ ان امور کی حقیقت منکشف ہو گئی اور ان کے خیالات فاسدہ نازل ہو گئے اور پھر ایک ہی دفعہ نہیں بلکہ بار بار ان حقائق کو تجربہ و مشاہدہ میں لایچکے تو انہیں اس امر کے یقین کہ لینے میں کچھ انکار نہ رہا کہ حقائق روحانیہ فی الحقیقت مادہ سے علیحدہ بجائے خود ایک مستقل موجودات ہیں۔ مشہور ڈاکٹر کمر وکس جب انگلستان کی رائل سوسائٹی کا پریزیڈنٹ مقرر ہوا تو اس نے اپنے پہلے لکچر میں جو یہ وقت تقریر اس نے پڑھا تھا یہ ظاہر کیا کہ ”میں ہر بار عرض کرتا ہوں کہ سال سے نہ صرف اس امر کا مستند ہوں بلکہ بذریعہ دلائل اس کو پایہ ثبوت تک پہنچا سکتا ہوں کہ عالم فطرت میں ایک زبردست عقلی ہستی حکومت کر رہی ہے جو مادہ سے بالاتر ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر طرور نے جو مدعیان روحانیات کو عنون اور پاگل کہا کرتا تھا اپنی تحقیقات کے آخری درجہ میں اس نکتہ پر آپہنچا کہ جو کچھ اس نے سمجھ رکھا تھا بالکل غلط تھا چنانچہ اس نے اپنے دو بیوں ایک کتاب لکھی جس کے آخر میں وہ دوسروں کو بطور نصیحت خطاب کرتا ہے ”ہیں اس دعویٰ سے ہمیشہ بچنا چاہئے کہ ہم بڑے لطیف اور دقیق عقل کے آدمی ہیں اور تمام مدعیان روحانیت (انبیاء علیہم السلام وغیرہم) کے دعویٰ کو باطل نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ اپنے تئیں کامل عقل سمجھ کر ان لوگوں کی تعلیم سے مستفید نہ ہونا سخت گمراہی ہے۔“ یہی حال دیگر بعض اکابر علمائے یورپ کا تھا کہ وہ مدتوں منکر رہ چکے تھے بعد قائل ہوئے ان میں سے جارج سکسٹن چیمبرز جیمز وغیرہ سخت متکبرین تھے جو اب میں آپ اپنا رد کرنے لگے۔

لے یورپ کے اکثر محققین کا شیوہ ہے کہ وہ اپنی غلطی کا اقرار خود کر لیا کرتے ہیں اور پھر اس کی تہنیر بھی خود ہی کرتے ہیں۔ خود کہہ تو یہ عادت واقعی سلامت طبع کا نتیجہ ہے ورنہ ہمارے موجودہ علمائے اسلام میں اکثر ایسے اصحاب موجود ہیں کہ باوجود ول ہی غلطی سے آگاہ ہو جانے کے بھی اپنی بات پر بے سنی زور دیتے پہلے جانتے ہیں۔ گویا مخالفت کی بات مان لینے کو اپنی ہمت تک سمجھا جاتا ہے مگر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا شیوہ نہیں تھا۔ ۱۲۰۰ھ

سچ پوچھو تو قرآن مجید کی حقیقی تعلیمتاحال یورپ میں شائع نہیں ہوئی اور اگرچہ ایک اشخاص نے اپنی ذاتی تحقیق سے کچھ سمجھا بھی ہے تو بالکل ناکافی ہے کیونکہ اسلام اور شائع اسلام اور شریعت اسلام کے متعلق ابھی تک یورپ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ لوگوں میں بشتار غلط فہمیاں مروج ہیں۔ اگر اسلامی سلطنتوں کی طرف سے کوئی انتظام اشاعت کا کیا جائے تو یقیناً نہایت ہی مفید ہو۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اسلامی دشمنی وہ کام نہیں کرینگے جو نہایت مدلل مضامین کے شائع کرنے سے مقصود ہو سکتا ہے۔

حقائق غیر مادیہ یا ماوراء المادہ

بعثت انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع آفریش انسان سے جاری ہے کیونکہ نوع انسان کے اس گروہ بزرگ کا وجود انسانی فطرت کی تکمیل تربیت کے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے اس کی حیوانی تربیت کے لئے مواد غذائیہ کا وجود۔ اگر اس بزرگ جماعت کے افراد دنیا میں شرف نہ لاتے اور اللہ تعالیٰ کی وحی کے تحمل ہو کر نوع انسان کی تربیت کے تشکمل نہ ہوتے تو دنیا مادہ پرستی اور ظلمت شرک سے کبھی باہر نہ آتی کیونکہ انسان چاروں طرف سے مادیات کے اثر سے گھرا ہوا ہے اور بجز مادہ اور مادہ کے تاثرات کے کسی چیز کا احساس نہیں کر سکتا اور وہ اپنے علوم و معارف کی بنیاد اپنے تجربہ اور مشاہدہ پر قائم کیا کرتا ہے اور اس سے زیادہ کسی چیز کا علم اسے نہیں ہو سکتا اور نہ خود بخود اس کو کسی ایسی پاک اور مطلق ہستی کا علم حاصل ہو سکتا ہے جو اس تمام دائرہ کائنات پر اپنے صفات کاملہ سے احاطہ کئے ہوئے ہے حکماء کا گروہ جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں غور کرنے سے ایک حد تک ان سے متفق بھی ہو جاتا ہے تربیت انسانی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس گروہ میں وہ لوگ جو مادیات پر غور و پروا ذات کیا کرتے ہیں اور اس لئے وہ مادی فلسفی کے نام سے مشہور ہوتے ہیں دنیا کو ہمیشہ نچریت اور دہریت کی تعلیم دیا کرتے ہیں۔ نیا چرہ وجود صانع (ذات باری) کا اقرار کرتے تو ہیں مگر اس کو مطلق قرار دیتے ہیں یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ

صانع نے عالم کو پیدا کیا ہے۔ اشیائے عالم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بے تعلق ہو چکا ہے۔ اشیاء کی اسے علیحدہ علیحدہ قدرت مقرر کر دی ہے جس کے مطابق ان میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور یہی ہی چلا آتا ہے۔ مگر دہریت اس سے آگے بڑھ کر صلح کی ضرورت سے بھی انکار کرتی ہے۔ ان کے نزدیک عالم قدیم ہے نہ کوئی اس کا خالق ہے اور نہ کوئی مخلوق اشیاء خود بخود اپنی طبعی حالت کے مطابق بنتی بگڑتی ہیں۔ انہیں اشیاء میں حضرت انسان بھی ہے جو دیگر اشیائے عالم کی طرح پیدا ہوتا ہے اور مر کر خاک ہو جاتا ہے اور بس۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ ہر دو مذہب باطل میں۔ پہلے مذہب میں صفات کاملہ ذات باری کا انکار لازم آتا ہے اور اس لئے منافی اسلام ہے اور دوسرے میں سرے سے ذات باری کی ضرورت سے ہی انکار ہے۔ اس لئے تعلیم اسلام کے تحت مخالف ہے۔ اب ہم بفضلہ تعالیٰ ذیل میں ہر دو مذہب کا بظان ثابت کرتے ہیں۔

(۱) نیا چہ جو صانع عالم کو معطل قرار دیتے ہیں اور اس وجہ سے انہیں ذات باری کے صفات کاملہ کا انکار لازم آتا ہے اپنے استدلال میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ طبیعت اشیاء کو موثر مستقل تسلیم کرتے ہیں حالانکہ طبیعت اشیاء اپنے خود کو کوئی مستقل علت نہیں کیونکہ اقل تو طبیعت اشیاء کا وجود ہی معرض بحث ہے یعنی ختم کو حق ہے کہ وہ طبیعت کا انکار کر دے۔ نیچری کے پاس بجز اس کے کیا دلیل ہے کہ وہ اشیائے خواص کو ایک متعل رروش پر اپنے تجربہ و مشاہدہ کے لئے تسلیم کرتا ہے مگر یہ تجربہ و مشاہدہ اس امر کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ طبیعت اشیاء کا وجود ہے اور اگر بالفرض ہم مان بھی لیں کہ طبیعت کا وجود ہے تو یہ کیونکر ثابت ہوا کہ مستقل موثر ہے یعنی وہ کسی دوسری آرزو طاقت (ارادہ انلی) کے تابع نہیں ہم صرف اشیاء کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ ان آثار کے ظہور کا سبب خود اشیاء کی ذات میں موجود ہے یا کوئی خارجی امر ہے؟ چونکہ ہم بالیدہریت جانتے ہیں کہ اشیاء کی ذات ان اشیاء سے کوئی علیحدہ چیز نہیں اس لئے اگر اشیاء کو ہم آثار کی علت قرار دیں تو لازم آئے گا کہ وہ آثار بھی اشیاء کی ذات کے ساتھ ہی موجود ہوں کیونکہ معلول اپنی علت سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتا۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آثارِ مجدد ہیں یعنی یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اشیاء کی ذاتِ علتِ آثار نہ ہو بلکہ ان آثار کا مبداء کوئی ایسا امر ہے جو ذاتِ مہیا سے خارج ہے۔ چونکہ اشیاء اور ان کے متعلقہ آثار ایک خاص ترتیب و نظام پر جاری ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ مبداء کوئی عقلی سہی ہو جو تمام صفاتِ کاملہ کی جامع ہے۔ یہی معنی ہیں آیہ کُلُّ یومھو فی شانِ اکے۔ یہ آیت تیاچہ کی گردن پر تشریحِ ربان ہے۔

واضح ہو کہ تیاچہ جو طبیعتِ اشیاء کو علتِ متقل مانتے ہیں اپنے باطل مذہب کے دوسے قصا و قدر کے منکر ہیں اور اس لئے ان کا مذہب صریح طور پر تلمذِ شرک ہے کیونکہ غیر اللہ کو مؤثر مانتا ہی مبداءِ شرک ہے۔

(ب) دوسرے کے برخلاف ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم طبیعتِ اشیاء کو مؤثر حقیقی تسلیم کر لیں تو کچھ شک نہیں کہ انسانی دائرہٴ علم کی وسعت مادیات سے زیادہ کسی چیز پر محیط نہیں ہو سکتی اور اس صورت میں اخلاقِ فاضلہ کے لئے کوئی صحیح معیار قائم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اخلاقِ فاضلہ کا ماحذہ انسانی مادی فطرت نہیں بلکہ مادہ میں جن و ترتیبِ اشیاء سے تلخ معیجہ عقلیہ کے پیدا کرنے کی قابلیت نہیں اس لئے ضروری ہے کہ اخلاقِ فاضلہ کا عقل کوئی امر غیر مادی ہو۔ اسی کو اصطلاح میں نفس یا روح بولا کرتے ہیں۔

(ج) خواب کی حالت میں ہمارے تمام حواسِ بیرونی معطل ہو جاتے ہیں مگر عقل اور اکاستہ جاری رہتا ہے۔ سوال یہ عاید ہوتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو اشیاء کی صح و ترتیب میں لگی رہتی ہے۔ کیونکہ اگر اس عقل کی علت صرف کسی مادی حقیقت کو قرار دیا جائے تو یہ سوال عاید ہوگا کہ جب اس بیرونی معطل ہیں اور باہر کی اشیاء بھی اپنا اثر نہیں ڈال سکتی ہیں تو تحریکِ عقل کے لئے کونسی چیز علت ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ تو اے دماغی خود بخود اس عقل کی علت ہیں تو صحیح نہیں ہوگا کیونکہ تو اے دماغی محض ایک اعتباری وجود ہے فی حد ذاتہ ان کا کوئی وجود نہیں اور کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں کہ جس مشترک ساقطہ متخیلہ وغیرہ کوئی حقیقی وجود رکھتی ہیں کیونکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ

صرف ایک ہی وجود غیر مادی ہے جو مختلف مخلوق کو نہایت تیزی کے ساتھ سر انجام دیتا ہے اسی کو ہم نفس ماریج کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں +

(د) خواب کی حالت میں نفس ایسے واقعات کا بھی ہم اور اک کیا کرتے ہیں جو زمانہ آئندہ کے مطلق ہو اکرتے ہیں اور ان کے احساس کا پیر وئی محاسن پر پہلے سے کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان واقعات کے وقوع پذیر ہونے پر ہمیں یقین ہونا پڑتا ہے کہ یہ وہی واقعات ہیں جن کا بحالت خواب ہمیں ادراک ہو چکا ہے۔ چونکہ ہم ہر ایک شخص کے اپنی ذاتی تجربہ پر موقوف ہے اس لئے اس کے ثبوت میں ہم زیادہ بحث کی ضرورت نہیں سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ کے واقعات کا علم جب کسی مادی حقیقت کا کام نہیں تو پھر ایسے واقعات کے بحالت خواب اپنے شرف ہونے کی علت کسی غیر مادی حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں ہم اس واقعہ کی کوئی صحیح توجیہ نہیں کر سکتے +

(ه) ہماری فطرت میں طبعاً یہ خیال مرکوز ہے کہ ہم فانی نہیں ہو سکتے بلکہ ہمیں صرف موت سے اپنی واضح فطرت کے انقلاب کا یقین ہوتا ہے نہ فنا سے مطلقاً۔ اور یہ خیال ایسا قوی ہے کہ اس کا برعکاس ہم کبھی تجویز نہیں کر سکتے ہم اپنی طبعی حالت کے رُوسے آئندہ اپنی بہتری کے خواہشمند رہتے ہیں حتیٰ کہ مرنے کے بعد ہم اپنے آرام و لذت کے امیدوار ہوتے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ گویا جیستی کی دست موجود ہستی کی سی نہیں ہوگی بلکہ کوئی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ صورت ہوگی جو موجودہ زندگی کے لوازم سے بالکل بری ہوگی مگر ہم اپنی ذات اور اس کے عل اور اک سے معطل نہیں ہونگے۔ خود کرنے سے معلوم ہوگا کہ جس طرح دیگر اشیاء کا وجود بکلی فنا نہیں ہوتا بلکہ صرف تغیر و انقلاب ہوتا ہے اسی طرح حضرت انسان اپنی فطرت کے رُوسے فنا سے مطلق کو قبول نہیں کر سکتا بلکہ اس کا آئندہ کسی دوسری صورت میں منتقل ہونا ضروری ہے اور اگر ہم انسان کو صرف ایک مادی حقیقت تسلیم کریں تو کچھ شک نہیں کہ اسکو دیگر اشیاء عالم پر کوئی فوقیت نہیں ہو سکتی اور اس طرح انسان کی وہ شرافت اور عزت جو اس کو دیگر موجودات عالم پر بالبداهت حاصل ہے بالکل باطل ہو جاتی ہے لہذا ہمیں ضرورتاً اس امر کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ اس کی مذکورہ بالا خواہش کسی ایسی غیر مادی حقیقت کا نتیجہ ہے جو اپنے صفات اور لوازم سے اشیاء مادیہ

سے بالاتر ہے اور وہی حقیقت نفس یا روح کے نام سے موسوم ہوتی ہے *

(۸) یہ بالکل صحیح ہے کہ اس سلسلہ کائنات کے آغاز کے متعلق کوئی یقینی قطعی توجیہ تو یہ نہیں کر سکتے جو
ہمارے مشاہدات و تجربات کی بنا پر صحیح تسلیم کی جاسکے کیونکہ جس طرح اس سلسلہ کے آغاز کی کیفیت ایک ماحر
مبہم ہے اسی طرح اس کے قدیم اور لامتناہی ہونے کو بھی عقل انسانی باور نہیں کر سکتی۔ اور جن لوگوں نے
عالم کو قدیم مانا ہے یہ ان کی سلسرہ حیرالت ہے۔ کیا فطرت میں کوئی اصل قطعی ایسا موجود ہے جس پر ایسے
کائنات کا قدیم ہونا بنی کیا جائے۔ آج تک قائلین قدیم عالم نے کوئی صحیح توجیہ اس مسئلہ کی نہیں کی مگر ہم
یہ بھی یقیناً جانتے ہیں کہ عالم کے حدوث کا مسئلہ بھی ایسا سہل اسلیم نہیں کہ شکر کو اس کے برصاف کچھ
نہ کچھ کہنے کا موقع نہ ملے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر خصم صداقت پسند اور تسلیم الطبع ہو تو اس قدر تسلیم
کئے بغیر نہ رہ سکے گا کہ حدوثِ عالم پر ہمیں ایسے بہت سے دلائل مل سکتے ہیں جو مجبوری طوع پر حدوثِ
عالم کے اثبات کو قطعی بناتے ہیں۔ چونکہ قدم اور حدوث ہر دو متضاد مفہوم ہیں اس لئے ضروری ہے
کہ عالم یا تو قدیم ہو گا یا حادث۔ لیکن قدیم ہونے کا خیال ایسا ناممکن تسلیم ہے جس کو انسانی فطرت محض
بظاہر فرض کے تسلیم کر سکتی ہے نہ بطور حقیقت نفس الامر کی۔ کیونکہ ہماری فطرت بلا کسی خارجی اثر کے
ان خود اس امر کے تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ ظہور واقعہ بلا کسی علت کے نہیں ہو سکتا اس لئے وجودِ عالم
جو ایک نفس الامر حقیقت ہے کیونکہ بلا علت ظاہر ہوا۔ مگر حدوث کے قائل ہونے کی صورت میں ہم زیادہ
سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں قطعی اور حقیقی توجیہ کا علم نہ ہو۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت
اس کے حدوث کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی لہذا ہمارا حدوثِ عالم کے متعلق کسی توجیہ پر آگاہ نہ ہو سکتا ہم
پر قدمِ عالم کے قائل ہونے کو واجب نہیں کر سکتا۔ اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ حدوثِ عالم کا قائل ہونا
کسی محقق کے لئے قدیم عالم کے قائل ہونے کی نسبت زیادہ آسان ہے کیونکہ اس سے ایک گونہ مطمئن
ہو سکتا ہے مگر قدیم عالم کا قائل ہونا ایک ایسا ناممکن خیال ہے جس کو انسانی فطرت ایک آن کے لئے
بھی تسلیم نہیں کر سکتی۔ فوراً تھوڑی دیر کے لئے غور کرو کہ انسان کا سلسلہ پیدائش اگر لامتناہی تسلیم کیا جائے
یعنی اگر ہم یہ مان لیں کہ انسان کے پیدا ہونے کا کوئی میدان نہیں تو کیا ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ انسان کی

پیدائش کیونکر وقوع میں آئی یہ ہم سلسلہ شمار میں خواہ کسی دھڑک پر چلے جائیں مگر ہماری فطرت بالآخر ہمیں
مجبور کرے گی کہ کسی مقام پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہونا چاہئے کیونکہ عالمِ مادیات میں کوئی چیز لائقِ حیرت نہیں
اور یہ امر بچائے خود ہمارے تجزیہ اور مشاہدہ سے تسلیم کیا جا چکا ہے ۔

جب جو وہ زمانہ کے اکثر فلاسفر ان اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ایک امر جو تجزیہ و مشاہدہ کے
واسطہ سے باہر ہو قابلِ تسلیم نہیں تو کیونکر ہم انسانی سلسلہ وجود یا کسی دیگر مادی کائنات کو لائقِ تسلیم
کر سکتے ہیں اور لائقِ حیرت ہی پر دلیل ہی کیا ہے ؟ کیونکہ صرف ایک ملین فاسد کو مان لینا کوئی قطعی حجت
نہیں بلکہ حوادثِ کائناتاً تا وجودِ عظمِ عالم کے حدود کی دلیل ہے کیونکہ تفسیر و تفسیرِ عالمِ کبھی قدیم موجود
کا خاصہ نہیں ہو سکتا ۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ مادہ کے اشکال ۔ انوان و غیرہ عوارضِ حادث ہیں مگر مادہ
نفسِ قدیم ہے ۔ مذکورہ بالا دلیل سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ عوارض متغیر ہوتے ہیں مگر مادہ بذاتِ
ہرستور موجود رہتا ہے ۔ اور اس لئے اس کے حدود پر کوئی علیحدہ دلیل قائم ہونی چاہئے ۔ ہم کہتے
ہیں کہ مادہ بذاتِ عوارض موجود نہیں ہو سکتا بلکہ بعض اہل فلسفہ نے تسلیم کیا ہے کہ مادہ و حقیقت کوئی چیز
نہیں کیونکہ ہمیں بجز مجموعہ عوارض کسی دیگر چیز کا احساس و ادراک نہیں ہوتا اس لئے ہمارے پاس
کوئی دلیل نہیں کہ عوارض کے علاوہ کوئی چیز بھی موجود ہے بلکہ انہیں مجموعہ عوارض کا نام جسم ہے
گویہ مذہب ایک بدیہی اسرار کا انکار ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ہم عوارض سے مجرور کر کے
جسم کی حقیقت کا ادراک کرنا چاہیں تو یہ ایک امر ناممکن اور محالِ عقلی ہے اس لئے جب ایک شے
کی ہستی اور اس کے تعین وجود ہی ہم نہیں کر سکتے تو اس کے قدیم و حادث ہونے کو ہم کہاں تک
طے کر سکیں گے ؟ یہ محض ہوشیاری کی ایک دھبی زلزلہ ہے کہ مادہ قدیم ہے ۔ حق یہ ہے
کہ مادہ مجرد کی حقیقت کے ادراک میں عقلِ انسانی قاصر ہے ۔ جب کبھی لوگ اس کے متعلق بحث
کیا کرتے ہیں تو محض ایک فرضی وجود کو مد نظر رکھ کر کہتے ہیں ۔ ورنہ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے
کہ تم پہلے اسکی حقیقت کا پتہ تو دو تو کچھ شک نہیں کہ وہ اس سوال کے جواب میں مہوت ہو کر رہ جائینگے ۔

(۱) اشیاء کی حقیقت کا اور ایک یہ نہیں کہ عمل ثقیل و ترکیب کے ذریعہ سے ہم اس کے اجزاء کا علم حاصل کر لیں مثلاً اگر کوئی شخص کسی خاص جسم کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ دکھلا دے اور اس عمل سے اسکے چند ایک خواص کا بھی اسے علم حاصل ہو جائے تو محقق کے نزدیک یہ بھی صحیح نہیں ہوگا کہ اس شخص کو مادہ کی حقیقت کا علم حاصل ہو گیا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں یہی مادہ کی حقیقت کا مطلقاً علم نہیں ہو سکتا اور ہم ذاتیہ مادہ کی نسبت (الشرطیکہ) ہم یہ مان لیں کہ مادہ کافی حد ذاتہ کا کوئی وجود ہے یا کچھ نہیں کہہ سکتے بلکہ جو کچھ ہم جان سکتے ہیں وہ صرف اجسام کے چند ایک خواص ہیں اور پس۔ اور یہ معلوم ہوا کہ ہم بھی بقایا بن لا متناہی ہوں و اسرار کے جو عالم مادی میں پختی ہیں کچھ نسبت نہیں کر سکتے اور اگر کوئی شخص ان چند خواص سے جواب تک معلوم ہو چکے ہیں یا آئینہ معلوم ہوں مادہ کے متعلق کسی زیادہ حقیقت کے علم کا دعویٰ ہو تو وہ بکواس کرتا ہے۔ انسانی تجربہ و مشاہدہ کا دائرہ اس سے زیادہ پریٹ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم دہریہ سے سوال کرتے ہیں کہ بس عالم کائنات کی حقیقت یہی ہے جس کو کوئی خاص کے ساتھ ہم نے محسوس کیا ہے؟ مگر یہ خیال ایسا صحیح البطلان ہے کہ جس کو کوئی ذی ہوش کسی صورت میں نہیں کر سکتا کیونکہ حقائق اشیاء کے متعلق علم خواص کا وہ ذریعہ مطلق ہونا قطعی دلیل ہے انسان کے محدود علم ہونے پر اور یا اس بہ ترقی اگر موجودہ حالت سے جدا ہونا زیادہ معلومات کا دائرہ میں ہو جائے تو ہم پھر بھی اس امر کے متنبی نہیں کر سکتے کہ ہم نے تحقیق کا آخری مرحلہ طے کر لیا ہے یا حقائق اشیاء کا اور ایک حاصل کر لیا ہے کیونکہ ہم علم خواص اشیاء سے زیادہ کوئی ترقی نہیں کر سکتے اور یہی ہمارے تجربہ و مشاہدہ کی انتہائی منزل ہے اور اس سے آگے جانے کا کوئی طریق چاہے جسے مستشرقین مگر ہم فطری یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ خواص بجائے خود صفات کا حکم رکھتے ہیں اور صفات اپنے موصوفات سے علیحدہ ہو کر موجود نہیں ہو سکتے انہیں موصوفات کا جو شکست و عوارض مثلاً رنگ، شکل، طول و عرض و وزن و غیرہ کے پردہ میں مخفی ہیں دیکھ لینا حقائق اشیاء کا علم کہلاتا ہے اور یہ وہ علم ہے جو تجربہ و مشاہدہ کے دائرہ سے خارج ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا اس علم کا حصول ممکن بھی ہے؟ دہریہ کو اس مقام پر پہنچ کر سخت مشکل پیش آتی ہے اور وہ ایسا عاجز آتا ہے جیسا کہ ایک گدھا جو چر میں نہیں جلدے۔ دہریہ کے لئے

یہ مقام حیرت ہے اور غارت کے لئے مقام خیرت *

استدلال بر وجود ذات

اس مقام پر ہم دہری کو ایک نہایت باریک استدلال کی طرف توجہ دلاتے ہیں اگر کسی سوادت مند کو توفیق ان کی یا وہ ہو تو وہ یقیناً

راہِ راست پر آجاتا ہے ورنہ انکار کا میدان بہت وسیع ہے ہم عالم کائنات میں حوادث (افعال) کا مشاہدہ کرتے ہیں اور نہ صرف افعال بلکہ افعال میں ایک خاص سلسلہ نظام کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں جو خاص خاص اسباب اور نتائج پر مشتمل ہے اور یہ ایک ایسا واضح امر ہے کہ جس کو ہر ایک لطیفہ کی عقل کا آدمی تسلیم کرتا ہے۔ یہ سلسلہ نظام جس میں ہم افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں یہ صفات کا نتیجہ ہے یعنی جب تک ہم علم - ارادہ - قدرت اور حکمت کا وجود بطریق علت کے تسلیم نہ کریں ہیں افعال کا وجود میں آنا صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یہ امر ہمارے لئے طبعی ہے کہ ہم کسی واقعہ کو بلا علت تسلیم نہیں کر سکتے۔ منکر خواہ ان افعال کی علت کچھ سمجھے مگر یہ ضروری ہے کہ افعال بدون صفات ظہور پذیر نہیں ہوتے اب ہم حکم سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کونسی ہستی ہے جو ان صفات کی تحمل ہے؟ کیونکہ صفات بدون کسی موصوف کے وجود نہیں رکھتے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ علم کسی محل سے جس کو عالم کہتے ہیں قائم رہ سکتا ہے اسی طرح ارادہ کسی مرید سے اور قدرت کسی قادر سے اور حکمت کسی حکیم سے..... علیٰ ہذا الصیغہ جس صفت کا کوئی اثر ہم محسوس کر سکیے نہیں ماننا پڑے گا کہ وہ کسی موصوف کے ساتھ قائم ہے یعنی ایسی ذات کی ضرورت ہے جو موصوف ہو سکے۔ اب ہم یہاں سوال کرتے ہیں کہ وہ موصوف یعنی ذات کون ہے؟ ظاہر ہے کہ اب..... اگر اس ذات سے خود انہیں اشیا کی ذات مراد لی جائے یعنی کوئی خارجی امر علت قرار نہ دیا جائے تو کچھ شک نہیں کہ اگر وہ علت خود اس شے کی ذات ہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کا معلول یعنی وہ اثر جو اب مترتب ہوا ہے پہلے سے موجود نہ تھا کیونکہ معلول کبھی اپنی علت سے جدا نہیں ہو سکتا۔ نچا ایک شے خود ہی علت اور خود ہی معلول نہیں ہو سکتی اس لئے ضروری ہے کہ افعال اور حوادث کی علت کوئی امر خارجی ہو یعنی کوئی ایسا امر ہو جو اشیا کی ذات سے خارج ہو۔ اب یہ امر خارج کوئی مادی مخلوق تو ہو نہیں سکتا کیونکہ کوئی شے جو مخلوق ہو موصوف صفات کا ملکہ نہیں

ہو سکتی اس لئے ضروری ہے کہ وہ امر کو ایسی ذات ہو جو مخلوق نہیں سوچ بوجھ مخلوق نہیں تو وہ نہ تو جسم ہوگی نہ جسم کی کوئی وصف اور اس لئے وہ قدیم ہوگی اور بذات خود موجود ہوگی۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کامل الصفات ہو اور اس کے صفات بھی اس کی ذات کے ساتھ موجود ہوں اپنی کسی غیر سے استفادہ نہ ہوں کیونکہ جب تک وہ ذات کامل الصفات نہ ہوگی وہ خالق قرار نہیں پاسکتی۔ اس لئے ضرور ہے کہ (شیائے کائنات کا خالق وہ ذات وحدہ لاشریک ہے جو تمام صفات کا مالک کے ساتھ منصف ہے۔ اور اس کے صفات اپنی ذات کے ساتھ موجود ہیں۔ جو انور کسی مخلوق کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں ان سے اس کی ذات بری ہے۔ وہ کامل علم۔ کامل ارادہ اور کامل قدرت اور کامل حکمت کا مالک ہے اور اس کے ان صفات کے آثار یہ موجودات ہیں جن سے ایک مجموعہ صاف طور پر اس ذات بے ہمتا کی توحید کے اقرار پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم اس ذات بے چون و چندی نسبت کوئی مثل تجزیہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے دائرہ ادراک میں بجز مادیات اور لوازم مادیات کے کوئی اور چیز داخل نہیں۔ ہاں ان آثار کا وجود خود اس کے وجود حقیقی پر شہادت دے رہا ہے۔

و فی کل شیء لہ ائیۃ ۖ ندال علی انہ واحد

حقیقت مادہ کے متعلق جدید تحقیقات

سائنس کا اصل مقصد یہ ہے کہ کسی امر نہری بحث کے ان ممکنہ واقعات کے متعلق جن کا ہمیں علم حاصل ہو قواعد کلیہ دریافت کئے جائیں۔ جب کوئی واقعہ (فیکٹ) اور نظریہ (تھیوری) ہر دوسرے میں متعارض ہو جائیں تو ہمیں یا تو واقعہ کا انکار کرنا ہوگا یا نظریہ کا۔ نظریہ کے متعلق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ واقعات کے اول بدل اور ان کے عمل کی صحیح تحقیق پر بدلتا رہتا ہے۔ چنانچہ ٹیوٹن کی تھیوری (کشش ثقل) کو انیسٹائن نے کسی حد تک بدل دیا ہے یا ٹیوٹن کے نظریہ کے مطابق خلائے مطلق موجود ہے جو مختلف نقاط کا مجموعہ ہے مگر مائش نے انیسویں صدی کے آخر یہ خلائے مطلق کا انکار کر دیا۔ اسی طرح آج سے پہلے اور آج بھی مادہ اور روح کو علیحدہ علیحدہ حقیقت خیال کیا جاتا تھا۔

مگر موجود حقیقتات۔ نئے قانون وحدت (جو احسن اسلامی فرقہ اہل تصوف میں تسلیم کیا گیا ہے) کی بناء پر مادہ اور روح کو متحد الاصل قرار دیا ہے کیونکہ ہمارے احساسات مادہ کا جزو ہیں۔ بہر حال جو تجرباتی سائنس کے گرد سے بڑی احتیاط سے کئے جاتے ہیں ممکن ہیں کہ وہ درست ہوں بشرطیکہ شرائط کی احتیاط سے کو فرض کر لیا جائے مگر پھر بھی ہم نہیں یقینی طور پر صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔

ظہور علیحدہ مادی اشیاء میں جو متناہی صورت میں واقع ہوتی ہیں مادہ اور قوت برقی کو مرکز ایک ہی ہے مثبت برقی اور منفی برقی قوتوں کے ساتھ ممکن ہے کہ کوئی تیسری چیز برقی کہ تختہ کوانٹم کہتی ہو جیم کے ہر ایک ذرہ کا ایک مرکز ہے جو اسی ذرہ کا ایک چھوٹا جزو ہے جس کے گرد دوسرے چھوٹے چیز جو حرکت کرتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اس چھوٹے جزو کا ایک مرکز ہے جس کے گرد دوسرے چھوٹے ذرات حرکت کرتے ہیں اور اسی طرح آگے یہ سلسلہ حرکات جاری رہتا ہے جس طرح دیگر سیارات آفتاب کے گرد حرکت کرتے ہیں جب ہم مثبت اور منفی برقی قوتوں تک پہنچیں تو قوت متعاطیسی اور کربابی کے اصول متر لزل ہو جاتے ہیں۔ یہ بالاتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ کہہاں قوت لامر احساس کرنی وہاں مادہ موجود ہوگا ہو اور اس سلسلے سے ہمیں کسی لطیف حقیقت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور اس سے گیس اور گیس سے اتھیر کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خلا میں جو تغیر و تبدل پیدا ہو رہا ہے اتھیر کا نتیجہ ہے۔ جہاں ٹھوس مادہ موجود نہیں وہاں بھی ہمیں کمیادی ترکیب کے وجود کا یقین ہے۔ ٹھوس مادہ میں بھی بعض ایسی ترکیب ہوتی ہیں جن کی نسبت یہ خیال ہو سکتا ہے کہ ان میں مادہ کے جوہر کا کوئی تعلق نہیں اور بااں ہمہ مادی اور غیر مادی میں فرق ظاہر کر سکتے ہیں۔ مادہ اور خلا کے قوانین میں وہی فرق ہے جو قوانین علت و معلول میں ہے جن پر تو اتر واقعات کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ مادہ میں کوئی جوہر لیا ہے جو خلا میں نہیں۔

مادہ کے علم کی دو صورتیں ہیں اول اشیائے محسوسات کی ذوات کا غیر مربوط علم۔ دوم محسوسات کی صفات کا مربوط علم جس پر قواعد کلیہ وضع کئے جاتے ہیں۔ سائنس میں اکثر اشیاء کی ترکیب کا پتہ

دے سکتی ہے مگر بعض جگہ وہ بالکل خاموش رہتی ہے مثلاً کسی چیز کے اجزاء اولیہ کے متعلق اس سوال کے جواب میں کہ آیا ان اجزاء کا پھر تجزیہ ہو سکتا ہے یا نہیں سائنس بالکل خاموش ہے۔ لہٰذا اس ایک خاص تک سائنس ہمارا رفیق سفر ہے اور اس کے آگے نہیں۔ ہماری فطری شہادت یہ ہے کہ ہم تجزیہ کا پھر تجزیہ کریں مگر ہم ایک خاص حد تک پہنچ کر بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ سائنس فلسفی طور پر کئی ایک سوالات کے جواب سے عاجز ہے مثلاً برقی قوتوں پر مادہ کی موجودہ تحقیق فہم ہو چکی ہے مگر ممکن ہے کہ اس سے آگے کچھ اور حقیقت کھلے۔

باش تا آفتاب جلوہ کند ۔ کیوں ہنوز از نسل سحر است

مادی اجسام کی ترکیب قدیم الایام سے اجزاء ذیقیمراطیہ سے ملتے چلتے آتے ہیں۔ ان اجزاء میں کہ ربا نیئت پائی جاتی ہے جنہیں الیکٹرونز (مثبت برقی قوت) کہتے ہیں تمام اشیائے عالم کی ترکیب اسی برقی قوت کے اجزاء کا مجموعہ ہے۔ یہ الیکٹرونز حرکت کی صورت میں مادہ میں موجود ہیں اور حرکت کا انحصار دو متضاد قوتوں پر ہے یعنی قوت جاذبہ اور قوت دافہ۔ اور ان دونوں کے مشترکہ عمل سے سلسلہ نظام عالم قائم ہے۔ ہم اس قانون کا نام قانون تلافی کہتے ہیں۔

اس تقریر کا محال یہ ہے کہ مادہ دراصل مثبت اور منفی برقی قوتوں کی لہروں کے اتصال سے پیدا ہوتا ہے یا یوں کہو کہ مادہ دراصل مذکورہ بالا دو قوتوں سے پیدا ہوتا ہے جو انرجی (قوت) کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انرجی کی نسبت پہلے یہ خیال تھا کہ وہ فنا نہیں ہوتی چنانچہ اس کے غیر فانی ہونے کے مسئلہ کو مسئلہ تحفظ قوت کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا مگر جدید ترین تحقیقات کے رُوسے یہ ثابت ہوا ہے کہ انرجی بھی فنا ہوتی ہے۔ انرجی ابھرنے کے ذریعہ ایک جسم سے دوسرے جسم میں گذر کر خارج یا فنا ہو جاتی ہے اسی خیال کے رُوسے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ زمین کی حرکت ایک درجہ فی ثانیہ کے حساب سے فنا ہو رہی ہے چونکہ اشیائے عالم الیکٹرونز سے مرکب ہیں جو دراصل حرکت ہے اور حرکت فنا ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسرے نقطوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مادہ فنا ہو رہا ہے۔ ریڈیم کے متعلق جو جدید تحقیقات کی گئی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ریڈیم کا کچھ حصہ ایک نہایت ہی خفیت

اول طیف مقدار میں فنا ہو رہا ہے جو کسی اور صورت یا ہیئت میں منتقل نہیں ہوتا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مادہ اشکال اور صورت اور اپنی ہیئت کی میادی تبدیل کرتا رہتا ہے مگر فنا نہیں ہوتا لیکن بڑیم پر جو تجربات کئے گئے ہیں ان سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ریڈیم کا ایک خفیف جزو خارج ہو کر لہری وجود سے صنائع ہو جاتا ہے جس کا پھر کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ مادہ درحقیقت انرجی (قوت) ہے اور قوت کی صحیح حقیقت تاحال تحقیق نہیں ہو سکی۔ وزن وغیرہ عوارض مادیہ جو مادہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں نہیں قوت نہیں کہا جاسکتا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ قوت کے بعض آثار اور صفات ایسے ہیں جن سے مادہ کی حقیقت اور جوہر پر کچھ روشنی پڑتی ہے کیونکہ قوت کی ہی ترکیب و تحلیل سے مادہ بنتا ہے۔ اور قوت فانی ہے لہذا مادہ بھی فانی ہے گو اس کے فنا ہونے کی مقدار بہت خفیف ہے مگر وہ تباہ ہو جاتا ہے ریڈیم ایک کیمیائی اور براق دھات ہے اگر اس کو سپکٹرو سکوپ (آر۔ او۔ ان۔ ٹم) میں رکھ کر دیکھیں تو روشنی کی کرنیں اڑتی ہوئی نظر آئیں گی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کرنیں برقی چمکاڑیاں ہیں جو آہستہ آہستہ ریڈیم سے نکل کر نامعلوم حالت میں پہنچ جاتی ہیں یا یوں کہو کہ فنا ہو جاتی ہیں۔ اس نظریہ سے جو تجربہ کہ رُوسے قائم کیا گیا ہے مادہ کا فانی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جوہرین فلاسفوں کا جو مادی وحدۃ الوجود کے قائل ہیں یہ خیال ہے کہ ارادۃ ازلی سے حرکت اور حرارت اور حرارت سے برقی قوت اور برقی قوت سے ذرات اور ذرات کے ترکیب تحلیل سے نظام شمسی (قانون تدارک) اور نظام شمسی سے تمام نشیئہ عالم کا وجود ظہور میں آیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام کائنات نظام شمسی کے ماتحت چل رہا ہے اور نظام شمسی کی علت العلل ارادۃ انہی ہے۔ مادی وحدۃ الوجود کے قائلین اس ارادۃ ازلی کو جوہر ازلہ مصل مادہ بتاتے ہیں۔ حضرات متصفوہ روحانی وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور ارادۃ ازلی سے ذات باری کا ارادہ مولا لیتے ہیں۔ بعض مادی وحدۃ الوجود کے قائلین کا خیال ہے کہ ارادۃ ازلی میں شعور تھا اور بعض اس کا انکار کرتے ہیں اور بعض کا یہ خیال ہے کہ شعور اس میں بالقوہ تھا اور ایک نہ گذرے پروہ اس میں بالفعل موجود ہو گیا۔ جدید تحقیقات کے رُوسے بھی ثابت ہو گیا ہے کہ قوت ارادی اجسام کو پیدا کرتی ہے مگر

ان اجسام کی کیفیت بنایت لطیف تھی ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ لوگ آہستہ آہستہ اپنی تحقیقات کو اسی مرکز پر لا رہے ہیں جس کو صوفیائے کرام عالم مثال کے نام سے تسمیہ کرتے ہیں ساوی وحدۃ الوجود اور روحانی وحدۃ الوجود کو مغرب متحد الخیث سمجھا جائیگا اور اس منزل تحقیق پر پہنچ کر ان لوگوں کو جو مادہ کو غیر فانی مانتے ہیں معلوم ہو جائیگا کہ آیہ دو کلمی ثبوتی حاکم لا وجهہ کی کیا تفسیر ہے ۔

الوسائل والاسباب

جب اس امر کیلئے دیگرے وقوع میں آئیں تو انسانی فطرت ان میں کوئی نہ کوئی ربط قائم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ گو ہر درست یہ نہ کہا جاسکے کہ یہ ہر دو امر باہم سبب مسبب ہیں مگر جب بار بار ایسا ہوتا دیکھا جائے تو ایک کثیر التعداد مثالوں کے مشاہدہ کر لینے پر ہر دو کا مربوط ہونا یقین کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے اس ربط علتی کے قائم کرنے میں اہل مذہب اور اہل فلسفہ مدیلولوں سے باہم لڑتے جھگڑتے چلتے آتے ہیں۔ ہر دو اہل مذہب کہتے ہیں کہ سبب مسبب میں لزوم ضروری نہیں یعنی یہ ضروری نہیں کہ جن دو امور کے درمیان ہم نے ربط علتی قائم کیا ہے وہ ایک دفعہ پر اس طرح لازم و ملزوم ہوں کہ سبب پہلا امر (سبب) وقوع میں آئے تو دوسرا (مسبب) بھی ضرور وقوع میں آجائے بلکہ ممکن ہے کہ سبب کے وجود پر مسبب موجود نہ ہو۔ اہل فلسفہ کہتے ہیں کہ جب سبب کے وجود پر مسبب موجود نہ ہو تو کوئی اندرونی یا خارجی مانع اثر کو روکنے والا وہاں ضرور موجود ہوگا۔ سبب کے وجود پر مسبب کا وجود ضروری ہے۔ اہل مذہب کی طرف سے اس کا یوں رد کیا گیا ہے کہ ہر گاہ یہ خیال محض ظن پر مبنی ہے اس لئے ہم قطعی طور پر کہیں یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ سبب مسبب میں ایک غیر متفک ضرورت کا تعلق ہے کیونکہ تجربہ یا مشاہدہ نے ہمیں یہ تو بتلایا کہ (ا) اور (ب) میں سبب مسبب کا ربط ہے مگر ہر دو میں مستقل لزوم کی کیا دلیل ہے؟ تجربہ و مشاہدہ سے اس لزوم کا ثابت ہوتا ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہے مگر ایسی خارجی دلیل کے پیش کرنے میں اہل فلسفہ آج تک ہلنہ بیچے مقروض ہیں اور مقروض بہتیکے ۔

اہل اسلام میں غزالی ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے اس مسئلہ میں اہل فلسفہ کی کھلم کھلا مخالفت کی ہے چنانچہ اپنی کتاب "مناہات الفلاسفہ" میں انہوں نے اس کے متعلق حسبِ ذیل تقریر کی ہے۔
 ودان هذا الاقتناع المشاهد في الوجود بين الاسباب والمسببات اقتران تلازم بالضرورة
 فليس في المتدور وجود المسبب دون السبب وإنما يجب علينا انكار هذا القول
 لاذ يمتنع به اثبات المعجزات الخارقة للعادة من قلب العصاة ثبانا واحياء الموتي وتقسيم
 يعني ہم فلاسفہ کے اس اصل کے ساتھ ہرگز اتفاق نہیں کرتے کہ سبب و مسبب میں جو اتصال دیکھا جاتا
 ہے یہ اس قسم کا ہے کہ طرفین کبھی کسی صورت میں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے اس لئے کوئی
 مسبب بلا سبب و قوع نہیں آ سکتا اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے اس قول کا ہم اس لئے انکار کرتے ہیں
 کہ اس اصل کے صحیح مان لینے سے اثبات معجزات مثلاً عصا کا از دہا بن جانا۔ مردہ کا زندہ ہونا اور چاند
 کا پھٹ جانا وغیرہ ممکن ہو جائینگے چنانچہ اہل فلسفہ نے اسی شکل کو یہ نظریہ رکھ کر معجزات سے یا تو انکار کر دیا
 ہے یا کسی دوسری ایسی تاویل کے قائل ہوئے ہیں جو سلسلہ اسباب میں میاں پر تجربہ و مشاہدہ پر صحیح اثر
 کے مثلاً مستدر کے پھٹ جانے کو عالم کائنات کے ایک قانونِ طبیعی (مد و جزر) کا نتیجہ قرار دیتے ہیں
 اگرچہ القادر قرآن مجید اذ کتب سابقہ اس خیال کو نہایت زور کے ساتھ غلط قرار دیتے ہیں۔ غزالی
 کہتے ہیں کہ سلسلہ اسباب میں ایک لفظ کا عادتاً دوسرے واقعہ کے ساتھ مربوط ہونا تو ہم تسلیم کرتے ہیں مگر
 ہم ہر دو کے باہم لزوم ہمیشہ اکٹھا واقعہ ہونے کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتے۔ خلاصہ ان کے مذہب
 کا یہ ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ سبب ہو اور مسبب نہ ہو۔ یا مسبب ہو اور سبب نہ ہو۔ ان کے نزدیک اس
 اصل کی تمام علوم میں یکساں طور پر وقت کی جاسکتی ہے۔ طب ہیئت۔ طبیعیات کے مسائل میں
 ہم اس کی اصلیت کو براہِ تسلیم کرینگے مثلاً آگ اور روئی کو ملائے گا یہ نتیجہ ہو گا کہ روئی جل جائیگی مگر یہ
 کہیں سے معلوم ہوا کہ آگ و حقیقت جلا دیتے کا فعل کرتی ہے۔ یہ بات صرف ہمارے کثرتِ مشاہدہ کا نتیجہ
 ہے اس لئے ہمارے ذہن میں یہ بات جاگزین ہو چکی ہے کہ آگ جلانے کی علت ہے۔ بلکہ فاعلِ حقیقی محض
 اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے اور ملائکہ حسبِ مشیت اس ارادہ کو نافذ کرتے ہیں خواہ یہ ارادہ کسی واقعہ کے

ہونے کے متعلق ہویا یہ ہونے کے چنانچہ اس کے متعلق لکھتے ہیں:-

”وإذا ثبت ان الفاعل يخلق الاحتراق باسرها فانه عند ملاقاته القطنه النار لم يكن في العقل ان لا يخلق مع وجود الملاقاته“ یعنی جب یہ بات مسلم ہے کہ فاعل حقیقی روئی اور آگ کے باہم ملنے پر احتراق (جل جانے) کو وقوع میں لاتا ہے تو چونکہ وہ اپنی آزاد مرضی کا پابند ہے اس لئے عقلاً یہ امر باطل ممکن ہے کہ وہ آگ سے روئی کے ملنے پر احتراق کو وقوع میں نہ لائے ۛ

پھر خود ہی اپنی اس تقریر پر یہ اعراض کرتے ہیں کہ اس صورت میں مخالفت یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر آپ کا یہ خیال صحیح مانتا جاوے تو امان اٹھ جائیگی۔ اسلئے یہ بھی ممکن ہوگا کہ ایک شخص اپنے غلام کو رات کے وقت آدمی پالنے اور صبح کے وقت وہ گدھابن جائے اور کہیں کتاب لکھی ہو وہ گھوڑا بن جائے۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ایسا ہونا واجب ہے بلکہ ہم صرف امکان کے قائل ہیں یعنی ہمارا صرف یہ دعویٰ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ایسا کر دے اور اگر نہ چاہے تو نہ کرے کیونکہ آزاد مرضی کے یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اور چونکہ پیدا ہوتے ہی ہم روئی اور آگ کے ملاپ کا نتیجہ دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے ہماری طبائع میں یہ امر راسخ ہو جاتا ہے کہ ایسا ہی ہوگا مگر کوئی سمجھدار آدمی کثرت مشاہدہ سے اس نتیجہ کے لزوم و وجوب یا ضرورت کا قائل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس ضرورت کے متعلق علمے پاس کوئی دلیل نہیں ۛ

ہم نے مذکورہ بالا دلیل کو غزالی کی کتاب ہتاف الفلاسفہ سے اخذ کیا ہے مگر زمانہ حال کے ایک مغربی فلاسفر نے بھی اس رائے کی تصدیق کی ہے۔ چنانچہ ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ ہیوم (انگلستانی فلاسفر) کے زمانہ سے پہلے تمام فلسفیوں کی یہ رائے تھی کہ علت اور معلول کے تصور میں طاقت اور اتصال کا تصور ضمتاً شامل ہے یعنی علت میں معلول کے پیدا کرنے کی طاقت ہے اور علت اور معلول میں ایک ضروری اتصال ہے۔ مابلیانش اور غزالی وغیرہ چنداں فلسفی طاقت کے وجود کے قائل ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ طاقت علت کی طاقت نہیں بلکہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے ہے زمانہ حال کے فلاسفہ میں سب سے اول ہیوم نے طاقت اور ضرورت کے وجود پر اعتراض کیا۔ اور کہا

کہ طاقت اور ضرورت کا تصور کہاں سے پیدا ہوا؟ وہ اپنے معمول کے موافق تجربہ کو شاید لاتا ہے اور کہتا ہے کہ عالم خارجی اور عالم ذہنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک حادثہ کے بعد دوسرا حادثہ ہمیشہ بالاستقلال پیدا ہوتا ہے۔ اور اراوہ کے بعد اعضا میں حرکت ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن اس امر کا کیا ثبوت ہے کہ پہلے حادثہ میں دوسرے حادثہ کے پیدا کرنے کی طاقت تھی یا ان میں ضروری اتصال ہے؟

میوم انگلتانی کی اس تقریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بعینہ وہی تقریر ہے جس کو اس سے بہت عرصہ پہلے غزالی لکھ چکے ہیں۔ اور حقیقت غزالی کا یہ اعتراض ایسا مضبوط ہے کہ کوئی فلاسفر اب تک اس کا جواب نہیں دے سکا۔ ہاں ہم یہ بھی ظاہر کئے دیتے ہیں کہ غزالی کے اس مذہب پر یہ اعتراض عاید نہیں ہو سکتا کہ سلسلہ اسباب بالکل ہی ناقابل اعتماد ہے کیونکہ ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ وہ صرف علت و معلول کے ربط اور اتصال کو ضروری نہیں مانتے یہی وجہ ہے کہ وہ معجزات کو نہایت آسانی کیساتھ منکرین کے سامنے ثابت کر سکتے ہیں۔ ورنہ فلسفیانہ خیال پر محال ہے کہ کوئی شخص معجزات کا عقلی ثبوت دے سکے کیونکہ تجربہ و مشاہدہ کے اصول معجزات پر حاوی نہیں غزالی کے مذکورہ بالا مذہب کے یہ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حسب مشیت مسببات کو بدون اسباب کے اور نیز بواسطت اسباب بھی پیدا کر سکتا ہے مگر ہم الفاظ ”بدون اسباب“ کے یعنی بھی لے سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام قدرت میں کسی حادثہ کے لئے مختلف قسم کے اسباب قرار دیئے ہیں بعض تو ان میں مہمود اور معین ہیں جن کے دیکھنے کے ہم عادی ہو چکے ہیں اور بعض غیر مہمود اور غیر معین عام حالات میں اسباب مہمود کے مطابق اس سلسلہ عالم کا وجود قائم ہے اور اثبات قدرت کاملہ کے لئے اسباب غیر مہمودہ (مخفیہ) کے مطابق کسی امر کو وقوع میں لایا کرتا ہے۔ مثلاً (خرق عادات) کے موقع پر جہاں کسی نبی اللہ کے ہاتھ پر اتمام حجت مقصود ہوتا ہے۔ غزالی کے مذہب کی یہ تاویل کسی صورت میں غلط نہیں سکتی کیونکہ کسی حادثہ کے اسباب کا حصر کرنا انسانی عقل سے بالاتر ہے اور اگر خرق عادات یا حشر اجساد کے اسباب ہیں علم ہو جاتا تو تبلیغ وحی کی حکمت باطل ہو جاتی یعنی خرق عادت لوگوں کے لئے حجت نبوت نہ ہوتا اور حشر اجساد پر ایمان لانا از قسم ایمان بالخیب سمجھا جاتا *۔

ناظرین اس امر کو بھی ملحوظ رکھیں کہ سرزمینِ غرب کے اسلامی فلاسفر قاضی ابوالولید ابن رشد نے
 امام غزالی کے مذکورہ بالادہب کی بڑے زور سے مخالفت کی ہے غزالی نے جن دنوں تہافت الفلاسفہ
 لکھی تھی شام اور مصر وغیرہ ممالک میں ابن سینا اور فارابی کے فلسفہ ارسطو پر لوگوں کی توجہ مبذول
 ہو رہی تھی غزالی نے اس کتاب سے فلاسفہ کے مسلمات کو مجروح ثابت کر کے دین حق کی عظمت
 کو قائم رکھا کیونکہ ان دنوں اہل عرب میں غزالی جیسا متکلم کوئی شخص موجود نہ تھا۔ مگر مشہور ازانہ
 بعد اندلس و مراکش میں ابن رشد ابن الطیقل ابن سبّا مشہور فلاسفہ اسلام پیدا ہوئے اور
 قرطبہ اور قیروان بغداد کے قائم مقام بن گئے اولوگوں نے فلسفہ کی حمایت میں بڑا زور مارا۔
 چنانچہ ابن رشد نے غزالی کی دعوئیں تہافت التہافت لکھی اور اس میں فلاسفہ کے مذہب
 کی تائید کر کے یورپ کے اہل مذاہب میں ایک ہتکے سا بچا دیا مگر اہل اسلام نے اس کے
 فلسفہ کو وقت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اگرچہ کہیں کہیں اس کے ہم نوا اب تک بھی موجود ہیں
 غزالی خالص اسلام کی وہی صورت دکھاتے ہیں جس کو شارع علیہ السلام نے اہل علم کے سامنے
 پیش کیا اور ابن رشد تاویل و تخییل کے پاتید ہیں اس لئے ان کا طریق مذہب فلسفیانہ انداز کا
 ہے اور قاعدہ ہے کہ جو شخص جن اصول کی صحت کا قائل ہوتا ہے انہیں کے مطابق وہ اپنی تحقیق
 کے متعلق زور لگاتا ہے۔ چونکہ ابن رشد کے مذہب کی تائید ظاہر کتاب و سنت سے نہیں تھی
 اس لئے اسلام کی اصل صورت دیکھنے کے لئے ان کی تحقیقات پایہ اعتبار سے ساقط سمجھنی
 چاہئیں ”والعلم عند اللہ“

تجربہ و مشاہدہ

(سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیٰ الحکیم)

(۱) تجربہ و مشاہدہ قریباً و دو مترادف لفظ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تجربہ میں ہمارا
 بعل خود کسی سلسلہ علت و معلول کا علم حاصل کرنا ضروری ہے مثلاً کوئین کو جو ایک مشہور دوائی

ہے جب موسیٰ بخار کے لیے ہم بار بار استعمال کر کے اس نتیجہ تک پہنچ جائیں کہ اس سے بخار
 ٹوٹ جاتا ہے تو ہمارا یہ عمل تجربہ کہلاتا ہے اس لئے کارخانہ قدرت میں اگر ہم کوئی ایسا سلسلہ
 علت و معلول کا پائیں جو انسانی عمل سے برتر ہو تو اس کے متعلق جو علم ہمیں حاصل ہو گا اسے تجربہ
 نہیں بولیں گے بلکہ وہ مشاہدہ ہے مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی اخیر یا بدل کے مینہ نہیں بہتا۔ اس لئے
 گریہ اور بھی ایک نتیجہ ہے مگر ہمارے عمل سے خارج ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ کبھی کبھی عمل مشاہدہ کو
 بھی تجربہ کے لفظ سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں مگر تجربہ و مشاہدہ کے صحیح معنی میں ہیں جو اوپر لکھ دیئے
 گئے ہیں۔

(۲) تجربہ و مشاہدہ کی صحت کا معیار اس امر پر موقوف ہے کہ تجربہ و مشاہدہ کرنے والا شخص
 صحیح الفطرت و تسلیم القوی ہو مگر یہ امر کہ صحیح الفطرت اور تسلیم القوی کس شخص کو تسلیم کیا جائے
 ایک مشکل کام ہے کیونکہ فطری لطافت اور کمزورت اور قوی کے نقصان و کمال کا عام طور پر کوئی
 ایک قیاس معیار مقرر نہیں مگر عام شہادت پر تجربہ و مشاہدہ کی صحت کا قریباً یقین حاصل ہو جاتا ہے۔
 یہی وجہ ہے کہ دو چار آدمیوں کے تجربہ کے کبھی یقینی علم حاصل نہیں ہوتا اگرچہ تجربہ کرنے والے کو
 بجائے خود یقینی علم حاصل ہو جائے۔

(۳) تجربہ و مشاہدہ سے ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی نسبت ہم ہر حالت میں کامل
 یقین ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ ہاں وہ ایسا علم ہو گا جس میں ہم نتیجہ مستقیم کی وجودی حاضری کو
 راجع کر سکتے ہیں تجربہ و مشاہدہ کے متعلق اس خیال کی خوب چھان بین کرنا چاہیے کیونکہ اس پر بہت
 سنی فلسفی تحقیقات کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ عوام الناس بے سوچے سمجھے تجربہ و مشاہدہ کو ہر حالت میں
 قطعی اور اس لئے قابل حجت سمجھ کر اکثر صد اقلوں کا انکار کر دیتے ہیں تعجب ہے کہ اکثر یہ شہادت کو
 جو غلبہ یقین کا موجب ہو سکتی ہے نہ کلی یقین کا کیونکہ یہ لوگ قطعی و مطلق سمجھ لیتے ہیں حالانکہ علت و
 معلول میں مدعی لزوم ہونا آسان کام نہیں۔ گو اکثر اہل فلسفہ کا یہ خیال ہے کہ علت تمامہ ہمیشہ
 نتیجہ مبینہ پیدا کریگی۔ مگر محققین کی رائے اس کے برخلاف ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں علت تمامہ کے

وجود پر صرف ایک نتیجہ معینہ یعنی معلول کے وجود کا یقین تو حاصل ہو جاتا ہے مگر اس بات کی دلیل کوئی
 نہیں کہ پہلے واقعہ یعنی علت کے ساتھ دوسرے واقعہ یعنی معلول کا وجود لازمی امر ہے۔ دوسرے
 لفظوں میں یوں سمجھو کہ ہیں یہ تو یقین ہے کہ نتیجہ معینہ اس خاص علت معلوم ہی سے پیدا ہوتا ہے مگر یہ
 یقین کس طرح حاصل ہو کہ نتیجہ معینہ اور علت مذکورہ میں ایسا قطعی اور یقینی لزوم پایا جاتا ہے کہ ہمیشہ
 کے لئے نتیجہ علت مذکورہ سے علیحدہ نہیں ہوگا۔ اس کے متعلق صرف یہی کہنا کافی نہیں ہوگا کہ
 لزوم کا یقین قانون طبعی ہے کیونکہ اسی امر میں تو بحث ہے کہ آیا ایسا ہونا ضروری ہے۔ اور جب یہ
 ثابت ہوئے تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاں ہمیشہ ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ یہ قانون طبعی ہے۔ اور نہ یہ
 کہنا کافی ہو سکتا ہے کہ علت معلول میں لزوم کا یقین فطری شہادت پر موقوف ہے کیونکہ یہ قاعدہ
 بھی کلیہ نہیں مثلاً دو اور دو کا چار ہونا تو بے شک فطری شہادت سے مسلم ہے جس کے برخلاف عقل
 کبھی تجویز نہیں کر سکتی۔ برخلاف اس کے آگ کا لکڑی کو جلا دینا گو عادتہ اللہ کے مطابق صحیح ہے
 مگر وجہ لزوم نامعلوم مثال اول میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت انسانی نتیجہ معینہ کے قطعی ہونے پر شہادت
 دے رہی ہے اور یہ بات پہلے تجربے پر موقوف نہیں۔ مگر مثال ثانی میں صرف یہی ہے کہ جس قدر قطعات
 آگ سے لکڑی کے جل جانے کے ہم نے دیکھے ہیں ان میں ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ آگ لکڑی کو جلا
 دیتی ہے لیکن اس کے قاعدہ کلیہ ہوئے کا ادغامض باطل ہے کیونکہ وجہ لزوم ثابت نہیں۔ مثال
 میں اگر وجہ لزوم فطری شہادت پر موقوف ہوتی تو آگ کے لکڑی کو جلا دینے کا علم کبھی نہ ہوتا حالانکہ
 بدون اشتداد کثیر ہیں یہ بات حال نہیں ہوتی۔ ہماری یہ تقریر مذکورہ بالا مذہب غزالی کی تائید کرتی ہے۔
 (۴) گو مذکورہ بالا مثالوں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ قانون فطرت اور قانون عادی ایک
 نہیں ہو سکتے مگر بعض مزید اطمینان زیادہ تشریح کی ضرورت ہے۔ واضح ہو کہ قانون فطرت ایسے قانون
 کو کہتے ہیں جن کا خلاف عقل کبھی تجویز نہیں کر سکتی اور قانون عادی ایسے قانون غیر قطعی کو کہتے ہیں
 جن کا خلاف بعید از عقل ہو یعنی عقل بآسانی اس کا خلاف تسلیم نہیں کر سکتی مگر اس کے امکان کو
 تسلیم کرتی ہے کیونکہ عادتاً عقل ایک قاعدہ کی پابند ہوتی ہے اس لئے اس کا خلاف تسلیم کرے میں

اسے کچھ تامل ہوتا ہے مگر چونکہ تسلیم کر لینے میں کوئی وجہ سوائے عادت کے معلوم نہیں ہوتی اسلئے مجبوراً اسے اس کے امکان کا اقرار کرنا پڑتا ہے مثلاً ”کل اپنے جزو سے بڑا ہوتا ہے۔“ ایک چیز ایک ہی آن میں موجود و معدوم نہیں ہو سکتی۔ چار ایک ایسا عدد ہے جو دو برابر صحیح عددوں میں تقسیم ہوتا ہے۔“ کوئی معلول بلا علت نہیں ہو سکتا۔“ کسی مثلث کے دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے سے بڑا ہوتا ہے“ وغیرہ وغیرہ ایسے قوانین فطرت ہیں جن کے تسلیم کر لینے میں عقل انسانی مجبور ہے اور ان کا خلاف محال ہے۔ اور آگ جلاتی ہے۔ پانی میں سیلان پایا جاتا ہے۔“ اگر پتھر اوپر کی طرف پھینکا جائے تو زمین کی کشش ثقل اسے نیچے کی طرف کھینچے گی۔“ بارش بادل کے آنے پر ہوتی ہے۔“ دو چیزوں کے رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔“ وغیرہ وغیرہ محض قوانین علویہ ہیں جن کا خلاف صرف بعید از عقل ہے نہ محال۔

اس خیال کو دوسرے پہلو میں لیں سمجھو کہ انسان کو جب قدر جو اس قسم کے ذریعہ سے علم حاصل ہوتا ہے وہ علم صرف جزئیات یعنی خارجی اشیاء کے متعلق ہو سکتا ہے اور جو علم خارجی اشیاء کے متعلق ہو اس سے عقل کسی غیر متبدل یقینی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتی کیونکہ اول تو علت و معلول میں ہمیشہ کے لئے وجہ لازم کا مدعی ہونا بجائے خود مجہول ہے۔ دوم جب قدر اشلکلیں گی وہ بہر صورت محدود ہی ہوں گی جنہر کوئی کلی حکم یقینی طور پر ہرگز مترتب نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) اشیائے مادی کے متعلق بذریعہ تجربہ و مشاہدہ ہیں جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محدود ہو گا مثلاً ہم پانی کے متعلق صرف چند ایک خواص کا علم رکھتے ہیں اہد بذریعہ عقل تحلیل ہم اس کے اجزاء علیحدہ علیحدہ دکھا سکتے ہیں مگر اس سے ہمیں کسی حقیقت اصلہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ حاصل شدہ اجزاء میں ہم پھر وہی کلام کرینگے جو پہلے مرکب میں کی تھی اور اگر بالفرض اجزاء کے اجزاء میں ہم دکھا سکیں تو پھر وہی گفتگو باقی ہے جو پہلے تھی یعنی کہ ہمیں کسی ایسی حقیقت کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا جس پر آئندہ سوالات کا سلسلہ بند ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک مادہ کی نسبت کچھ نہیں کھلا کہ وہ کیا بلا ہے؟

اشیاء کے خواص کا حصر ناممکن ہے اسلئے اگر کسی شے کے متعلق کوئی مجہول خواص دریافت نہیں تو

سیر دست نہ تو ہم پورے طور سے اقرار کر سکتے ہیں نہ انکار۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو خاص کسی ایک شے کے متعلق دریافت مطلق انکار وجود مفید ہو یا مطلق مثلاً مقناطیس میں قوتِ جاذبہ کا ہم علم رکھتے ہیں مگر اس بات کا تجربہ ہو چکا ہے کہ زلزلہ آنے کے وقت اس کی قوتِ جاذبہ یا کل معدوم ہو جاتی ہے اب بظاہر زلزلہ کے آنے اور مقناطیس کی قوتِ جاذبہ کے زائل ہونے میں کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا یعنی کوئی سائنس دان یہ نہیں بتا سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یا مقناطیس کی قوتِ جاذبہ کا عمل ایک عام بات ہے جو مشاہدہ میں ملتی ہے مگر یہ عمل مقناطیس کی ڈلی کے ہر دوسروں پر تو موجود ہو گا لیکن اگر اس کے نقطہ وسطی پر امتحان کیا جائے تو ہرگز نہیں حالانکہ اس کے تمام اجزاء میں قوتِ جاذبہ کا خاصہ موجود ہے چنانچہ

۱۔ پ۔ ج۔ ایک مقناطیسی سلاح کو لیکر دیکھو کہ ہر دو نقطہ (۱) اور ج پر تو قوتِ جاذبہ اپنا عمل کرے گی مگر نقطہ ب پر نہیں اور اگر اس کو نقطہ ب پر ضعف کر کے توڑ لیا جائے تو پھر نقطہ ب پر بھی قوتِ جاذبہ اپنا عمل کرنے لگے گی۔

(۶) یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ مادہ تمام اشیائے مرکبہ کا ایک ہی ہے اور کل کیمیا سے ہیں صرف انکی تحلیل و ترکیب کا علم حاصل ہوتا ہے مگر انکی حقیقت کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کیوں خاص سلسلہ خاص کا قلال شے سے مخصوص ہے؛ البتہ عقل یہ حکم لگاتی ہے کہ اشیاء کی ترکیب میں اجزاء کی کیفیت اور کثرت اپنی مقدار کی ایک خاص مناسبت کو ملحوظ رکھا گیا ہے جس سے انکی صورت دعویٰ اس کے متعلق آثار و خواص میں ہم ایک نمایاں تفرقات دیکھتے ہیں چنانچہ بندہ یہ علم کیمیا با اوقات بعض اشیاء کے اجزاء کی مناسبت کو سورہ اعتباریہ میں ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ مگر اس سے آگے اور کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ بات تو ہم نے دیکھ لی کہ قلال شے کے اجزاء کیا ہیں اور وہ کس نسبت سے اس میں شامل ہیں مگر ان کی حقیقت اور ان کے متعلقہ خواص کی علت ہم ہرگز نہیں بتا سکتے اور جب ہم یہ نہیں بتا سکتے تو ہم کبھی اس امر کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتے کہ کسی شے کا کوئی مجهول خاصہ ہمارے انہیں قواعد کے رُوسے اس میں موجود ہے یا معدوم ہے جن کی ہم تحقیق کر چکے ہیں۔

(۷) تجربہ و مشاہدہ کے اصول پر عالمِ مادیات میں لاکھوں تصرفات ہو رہے ہیں اور انہیں اصول

پر ہم ان کے علمی نتائج کا پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ نئے نئے ایجادات اور علوم و فنون کی ترقیات سب کے سب تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہیں (اس لئے عام طور پر یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ امثلہ کثیرہ کو دیکھ کر ہم ایک قاعدہ کلیہ وضع کر لیتے ہیں اور اس کو علمی طور پر امتحان کر کے آئندہ تحقیقات کی بنا اس پر قائم کرتے ہیں مگر نہایت باریک فلسفی تحقیقات کی رُو سے ہم مادیات میں کسی قاعدہ کلیہ تسلیم نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے عقلیات میں قواعد کلیہ کی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اشیائے مادیہ کے متعلق ہمارا علم اضافی ہے اور اضافی رہے گا۔ اضافی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مادی اشیاء کا ادراک ہم بذریعہ حواس ظاہری حاصل ہوتا ہے جن کا عمل بہر صورت محدود تسلیم کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں بعض ایسی شرائط مثبتہ یا منفیہ عمل کی صحت کے لئے ضروری ہوتے ہیں جن کے بدون نتیجہ مینہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے گو ہم عام طور پر کسی قاعدہ کی کلیت کو تسلیم کر لیں مگر پھر بھی ممکن ہے کہ کسی شے مادی کے بعض خواص کا ظہور کسی خاص مادہ یا جگہ یا وضع پر بالکل مخالف ان خواص کے ہو جو پہلے ہماری تحقیقات میں پایہ ثبوت تک پہنچ چکے ہیں مثلاً بعض سیارات کی رفتار میں ہوتی ہے جس سے کسی خاص نتیجہ کو متعلق کیا جاتا ہے اور جب وہ اپنے کسی خاص مدار میں جس کو وہ کئی صدیوں کے بعد پیدا کرتے ہیں حرکت کرنے لگتے ہیں تو مذکورہ بالا نتیجہ کا ظہور رک جاتا ہے اس طرح ہماری تحقیقات میں علم اجرام سماوی کے متعلق ایک اور اضافہ ہو جاتا ہے اور ہم اس کو بطور قاعدہ کلیہ تسلیم کرتے ہیں لیکن کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ آئندہ ان سیارات کے بعض اوضاع ایسے پیدا ہونے ممکن نہیں جو ایسے نتائج کے متضاد ہوں جو تمام سابقہ نتائج سے مختلف ہیں اس لئے گو پہلے حالات کے پیدا ہونے پر پھر وہی نتائج ظہور میں آئے لیکن درہم کہ دیں کہ جب اس قسم کے حالات پیدا ہونگے تو ایسے نتائج ظہور میں آئینگے۔ اسی لئے یہ قاعدہ کلیہ ہے مگر قاعدہ کلیہ کے لئے صرف چند ایک امثلہ کا دیکھنا کافی نہیں ہو سکتا یہی منی ہیں اس جلد کے کہ اشیائے مادیہ کے متعلق ہمارا علم اضافی رہتا ہے اور اسی کی طرف قرآن پاک نے اشارہ کیا ہے۔ ”وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا“ الغرض

ہم تجربہ و مشاہدہ کے جس تہ پر چڑھتے ہیں اس اقرار کرنا پڑتا ہے کہ گو ہم ایک وجہ اور آگے ہیں مگر کثرت حقیقت کے رُوسے یہاں روزِ اول کا معاملہ درپیش ہے۔

سرا لے الام لقیضی لی الخ۔ فصیر اخرہ اولاً

(۸) تجربہ و مشاہدہ کے ہر حالت میں غیر یقینی ہونے پر ایک سیل یہ ہے کہ ہم جو اصل شے کے تمام جہات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا پرواز صرف اسی قدر ہے کہ ہم فطرتاً ہر ایک نقطہ کی علت تلاش کئے بغیر نہیں رہ سکتے جیہ کی وجہ گمان غالباً مثلاً کثیرہ کے دیکھنے سے پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے تو ہم ایک قاعدہ کلیہ فرضیہ وضع کر لیتے ہیں جب ہم اس کے برخلاف کسی اور حالت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو پھر اس کی وجہ کے متلاشی ہوتے ہیں حالانکہ حالت مذکورہ سے پہلے ہی اسی وجہ کی ضرورت کا خیال بھی نہ تھا مثلاً مقابلہ کی یہ خاصیت کہ وہ زلزلہ کے آنے سے کچھ وقت پہلے مسلوب الخالصیت ہو جاتا ہے جب تک ہم معلوم نہ ہوتی ہیں کہ گمان بھی نہیں گذرتا تھا کہ کوئی حالت ایسی بھی ہو سکتی ہے جس میں یہ خاصیت بالکل زائل ہو جائے۔ پھر جب یہ حالت مشاہدہ کر لی تو ہماری تحقیقات کی فہرت میں ایک ر قاعدہ کلیہ کی مدبّر صادی گئی۔ اس قدر پرواز کے بعد ہمارا دوسرا پرواز یہ ہے کہ اشیائے ناویہ میں جب دو واقعات کو وقوع کے لحاظ سے ہم متحد المکان یا متحد الزمان دیکھتے ہیں تو ہم از خود قیاس کرتے ہیں کہ ان کے درمیان کسی قسم کا تعلق ہونا چاہیے اسلئے ہم کسی نہ کسی پہلو میں ان دونوں میں ایک تعلق کا ہونا تسلیم کرتے ہیں اور اسی پر اپنی اسندہ تحقیق کی بنیاد قائم کرتے ہیں اور اس تحقیق کو اس وقت تک قطعی سمجھتے ہیں جب تک کہ ہمیں کسی برخلاف حالت کا علم حاصل ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس ہیں یا تو اپنی سابقہ تحقیقات کو نئی شرائط سے مشروط کرنا پڑتا ہے یا بالکل ان کا رو کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ اسی امر کی طرف ایک محقق فاضل نے جملہ ذیل میں اشارہ کیا ہے: ^۱ یدرک الاشیا بلطریق العقل۔ وقد یخبرہ بشئ ثم یخبرہ بخلافہ ثم یدعیہ وہ شک فیہا او یجزم کلا حدھا علی الاخر ^۲ الخ۔

^۱ اس نے سلسلہ امور کو اس طرح غیر متناہی بلایا کہ جس امر کو وہ آخری سمجھا دی پہلا پایا۔ ۱۲۔ منہ + ۱۵ یعنی انسان ہمیشہ اشیا کا ادراک کرتا رہتا ہے۔ مگر بطریقِ ظن و شک بھی تو اسے کسی خاص امر کا یقین مل حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی اس کی جہت خلاف کا پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی دونوں جہتوں میں شک ہوتا ہے۔ یہاں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ ۱۲۔ منہ +

(۹) یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہماری تحقیقات مختلف لوگوں کے تجربات و مشاہدات کا مجموعہ ہے اس مجموعہ میں ہمیشہ ترمیم و ترقی کے لئے کافی کجائش موجود رہتی ہے۔ انسانی ضروریات نئی نئی ایجادات کا موجب ہوتی ہیں اس لئے صنعت و حرفت کے اصول میں تمدن و معاشرت کی سہولت کو مد نظر رکھ کر آئے دن کچھ نہ کچھ زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ مگر اس سے اشیاء کے حقائق اصلیت کا پتہ لگانا محال ہے اس سے تو فقط مادی اشیاء کو مختلف صورتوں اور حالتوں میں ترکیب دینے کے خاص خاص نتائج کا علم حاصل ہو سکتا ہے اور یہ امر نہ تو کسی زمانہ سے مخصوص ہے نہ کسی ملک سے نہ کسی قوم سے بلکہ قانون الہی اسی امر کا مقتضی ہے کہ وہ انسانی ہستی کو ہمیشہ غیر قائل رکھے۔ یہ ہماری فطرت ہے کہ جہاں کسی امر کی علت کو ہم جان جاتے ہیں (خواہ وہ علت واقعی ہو یا فرضی) تو ہمارا تمام استغجاب زائل ہو جاتا ہے اور ہم ایک گوتہ المینان پالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ تمام ایجادات ہماری نظروں میں معمولی معلوم ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا خیال کے رُوس ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس مادی دنیا میں صرف اسی قدر تصرف کر سکتے ہیں کہ اشیاء کے اسباب و روابط و نتائج کی تحقیقات سے صنعت و حرفت میں یو ایف او مارتی کرتے رہیں کیونکہ انسان کے ظاہری کمالات کے لئے صرف اسی قدر ضروری ہے حقائق اشیاء کے متعلق ہم ہم کوئی قطعی تحقیق پیش نہیں کر سکتے کیونکہ اسکے لئے ایک دوسرے سلسلہ قوی کی ضرورت ہے۔

(۱۰) مذکورہ بالا تقریر کا حاصل یہ ہے کہ۔

(۱) ہمارا علم و وقم کا ہے۔ فطری کسی۔

(ب) ہم کسی علم بذریعہ تجربہ و مشاہدہ حاصل کرتے ہیں اور فطری بمقتضائے فطرت ہیں

حاصل ہوتا ہے۔

(ج) تجربہ و مشاہدہ میں ہم کسی سلسلہ علت و معلول کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

(د) علت و معلول میں ہم اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ فلاں معلول کی علت کیا ہے مگر وجہ لزوم

کا قطعی طور پر مدعی ہونا باطل ہے۔

(۵) ہم اشیاء کے بعض قوہوں کا علم حاصل کر سکتے ہیں مگر ہمیں حقیقت اشیاء کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا۔
 (۶) قوہوں کیسا اوقات مشروط بشرائط ظاہر ہوتے ہیں اور شرائط مثبتہ اور منفیہ ہو سکتے ہیں مگر ہمیں
 جمیع شرائط کا علم حاصل ہونا ناممکن ہے اس لئے ممکن ہے کہ کسی چیز کا کوئی خاصہ کسی خاص الہی شرط سے
 مشروط ہو جو ہمارے علم سے خارج ہے پس اس کا انکار جائز نہیں۔

(۷) قوانین فطرت ایسے امور کا نام ہے جن کا خلاف محال عقلی ہو اور قوانین علویہ ایسے قوانین کو
 بولتے ہیں جو محال نہیں مگر تحریرہ اور مشاہدہ سے بطور ظن غالب ہم ان کو قواعد کلیہ تسلیم کر لیتے ہیں
 لیکن وہ حقیقت وہ کلیہ نہیں ہو سکتے۔

(۸) ہمارا علم اضافی ہے یعنی کبھی کامل نہیں ہو سکتا۔ بذریعہ حواس ہم صرف اشیاء مادیہ
 تصرف کر سکتے ہیں اور بس ۵

اللہم للرحمن جل جلالہ - وسواہ فی غمراتہ یتغبحم
 ما للتراب وللعلوم وانما - یسعی لیعلم انه لا یعلم

واقعات کا علم اور عقل

(یہی دونوں سچے ایمان کے ملازم ہیں)

اصل یہ ہے کہ قرآن شریف دوسری مذہبی کتابوں سے اسلئے ممتاز ہے کہ وہ تمام عقائد
 کے بارہ میں عقل کو مخاطب کرتا ہے اور خلاف و عناد کی صورت میں اسی کو حکم قرار دیتا ہے۔ اسے
 جس عقیدہ کو ثبات کیا ہے یا جس کا رد کیا ہے دلیل عقلی سے کیا ہے۔ دوسری اور کونسی
 کتاب ہے جس نے حدود عالم پر اجرام سماوی کی حرکات سے دلیل پیش کی ہے مثلاً سورہ انعام
 میں اپنی قوم کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلیل پیش کی ہے اس کو یاد کرو اور حضرت مریم

۱۵ حقیقی اور کامل علم صرف خدا نے برتر کو حاصل ہے امدیاتی تو سب علم کے بحر میں غوطے کھا رہے ہیں۔ بھلا آدمی جو
 ایک مشت خاک ہے کیا علم حاصل کر گیا اس کی تمام کوشش کا نتیجہ تو یہ ہے کہ وہ جان لے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ ۱۲۔ منہ *

اور عیسیٰ علیہا السلام کے عبادت کرنے والوں کی رو میں اس آیت میں خود کرو۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک ایسی ہی ہے جیسے آدم۔ خدا نے انہیں پیدا کیا اور پھر فرمایا ہو جاؤ ہو گئے۔ یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو حضرت عیسیٰ کے بے باپ پیدا ہونے کو الوہیت کی دلیل ٹھہراتے تھے۔ اثبات نبوت میں اس آیت کو دیکھو۔ ”یا کہتے ہیں وہ تو باتیں بناتا ہے نہیں وہ ایمان نہیں لائینگے۔ اچھا اگر سچے ہیں تو ایسی ہی ایک بات وہ بھی بنالائیں“ اور یہ آیت میں پہلے بھی تم میں ایک مدت رہ چکا ہوں۔ سمجھتے نہیں“ اور یہ آیت ”تم کوئی پوتھی کتاب بھی نہیں پڑھے تھے اور نہ ہاتھ سے لکھ سکتے تھے ایسا ہونا تو اہل باطل اور سچی شک میں پڑ جاتے“ اور حشر کے محال نہ ہونے کی دلیل میں یہ آیت ”جس نے آسمان بنائے۔ زمین پیدا کی کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ ان کے مثل پیدا کر سکے۔ بیشک وہ قادر ہے بڑا پیدا کرنے والا ہے اور دانابہ“۔ اسی طرح کی اور آیتیں جو علم کلام کی بنیاد ہیں +

صرف عقائد ہی کے متعلق دلیل قائم کرنے پر نہیں کفایت کی بلکہ غالباً تم کسی امر دینی کو نہ پاؤ گے جس کی دلیل نہ بتائی ہو بخیر معرفت سبب کے وہ تسلیم و تقلید کو پسند نہیں کرتا مثلاً فرمایا ہے۔ ”روزہ تم پر فرض ہوا ہے جس طرح کہ تم سے قبل لوگوں پر فرض تھا شاید تم پر ہیز گاری کرو“۔ یعنی روزہ جو ارادہ کو قوی کرتا ہے۔ مراقبہ الہی پر نفس کی تربیت کرتا ہے اور مالِ نعمت پر اس نعمت کی قدر سے شناسا کرتا ہے پر ہیز گاری کا بڑا وسیلہ ہے تعزیرات کی بات بتایا ہے۔ ”کہ اے ذی عقل لوگو تمہارے لئے قصاص میں حیات ہے۔“ اخلاق کے متعلق ہدایت کی ہے۔ ”نیکی اور بدی یا ہم برابر نہیں۔ کسی بہتر طریقہ سے نالو اس طرح جس کو تم سے عداوت ہے وہی تمہارا مہربان دوست ہو جائیگا۔“ اسی طرح کی اور بہت سی آیتیں جو قرآن کے سوا اور کسی کتاب میں نہیں۔ قرآن کا کوئی صفحہ تم کو اس قسم کے اقوال سے خالی نہ ملے گا۔ شاید تم عقل سے کام لو سوچو۔ اے اہل عقل۔ اہل دانش۔ عقلمند کیلئے وغیرہ وغیرہ۔ علم و علما کی شان میں بہت سی آیتیں اتری ہیں۔ ”اے عالم ہی سمجھتے ہیں۔ خدا سے اسکے عالم بندے ہی ڈرتے ہیں۔ اس کا مطلب خدا جاننا ہے اور زبردست اہل علم۔ کیا برابر ہو سکتے ہیں جو ذی علم ہیں اور جو ذی علم نہیں۔“ ان سب کے بعد اب مسلمانوں کو کسی ایسے عقیدہ کی کوئی پروا نہیں جو علم صحیح

کے مخالفت یا حکم عقل کے منافی ہو ایسی حالت میں کہ تم ایک غیر مسلم کو دیکھو گے کہ وہ ایک ایسے اعتقاد کے آگے سر جھکا رہا ہے جس کو وہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھنے کے قابل بنا سکتا ہے بلکہ اعتقاداً مان کر پھر نماز و دعا وغیرہ میں مشغول ہوتا ہے تاکہ یہ عقیدہ دہن میں راسخ ہو جائے۔ مسلمان کو تم اس حالت میں پاؤ گے کہ وہ اپنے فکر سے حجاب کو چاک کر رہا ہے اور اپنی کتاب کے اس قول پر عمل کر کے ملکوت اعلیٰ میں ترقی کر رہا ہے۔ ”کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا ہو رہا ہے“

قرآن کسی سے فقط معجزات اور خوارق عادات کے قصے بیان کر کے ایمان کا مطالعہ نہیں کرتا بلکہ جو کہتا ہے اس میں غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ”قرآن میں غور نہیں کرتے۔ کیا دلوں پر قتل لگے ہیں؟“ اس طرح پر قرآن نے تمام دوسری کتابوں سے اختلاف کر کے عقل کے لئے ایک وسیع دروازہ کھول دیا کہ قرآن کی باتوں میں بحث کی جائے تاکہ قطعی طور سے ثابت ہو جائے کہ نبی احمی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسی کتاب تصنیف کرنا ایک مر محال ہے۔ قرآن کا یہ طریق نہیں کہ ان کہانیوں کے شمار کرنے سے فلسفہ عقل کا دروازہ بند کر لے جن سے کوئی قوم غالی نہیں کہ اپنے بانیان مذہب کے لئے افسانے منسوب کئے ہوں بعض لوگ مثلاً حضرت عیسیٰ سے (اگر روایت صحیح ہے) ان قصوں کا انکار پایا جاتا ہے حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں۔ ”یہ شریار اور فاسق لوگ نشانہ نبی مجروحہ کے خواہشمند ہیں ان کو یونہی پیغمبر یعنی حضرت یونس کے معجزہ کے علاوہ اور کوئی معجزہ نہیں دکھایا جائیگا۔ مطلب یہ کہ جس طرح شہر نینوی کے لوگ حضرت یونس پر فقط ان کے وعظ سے ایمان لائے بعینہ اسی صورت سے بغیر کسی معجزہ کے لوگ مجھ پر بھی ایمان لائیں اور اس کے بعد جو یہ قول ہے کہ اس لئے کہ جس طرح یونہ مچھلی کے شکم میں تین دن رات رہے تھے اسی طرح انسان کا بیٹا بھی زمین کے اندر تین رات دن رہے گا“ تو اس کی نسبت خود عیسائی محققین کا قول ہے کہ یہ انجیل کہنے والے کی طرف سے شرح ہے۔ یہ قول دو صورتوں سے غلط ہے۔ اولاً اس لئے کہ حضرت عیسیٰ زمین کے اندر صرف ایک دن اور دو رات رہے جیسا کہ تمام انجیلیوں میں بہ تصریح مذکور ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ حضرت عیسیٰ اپنے رفیع کے بعد ان طالبوں سے نہ تو کسی پر ظاہر ہوئے اور چند عورتوں اور بعض متقدموں کے علاوہ نہ اور کسی نے اس کو دیکھا۔ پھر یہ کیونکر مخالفین کے لئے کافی معجزہ ہو سکتا ہے؟ خلاصہً

یہ کہ انجیل کی اس عبارت سے حضرت عیسیٰ کے تمام معجزات باطل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر زیادہ جرح سے کام نہ کیا جائے جب بھی فقط ایک معجزہ زمین کے اندر رہنے کا باقی رہ جاتا ہے جس کا حال تم ابھی سن چکے۔ یہی حالت تمام ایسے مذاہب کی ہے جن کے پاس کوئی ایسی دلیل اس قسم کے قصوں اور عجولوں کے علاوہ نہیں ہے۔ کیا ایسے مذاہب کا مقابلہ اس مذہب کیا جاسکتا ہے جس کا کوئی عقیدہ کوئی امر کوئی نہی اور کوئی حکم ایسا نہیں جس کی عقلی دلیل خود اس کی آسمانی کتاب سے نہ ملتی ہو؟ کیا اچھا دین ہے کہ ارباب مذاہب عقل کو مردہ کر چکے تھے مگر اُس نے زندہ کیا۔ اور علم کو دفن کر چکے تھے۔ مگر اس نے پھر جان ڈالی۔ اس سے بڑی اور کیا اصلاح ہوگی؟۔

غایت العقل

انسانی عقل جزئیہ محسوسات مادی سے باہر نہیں جاسکتی۔ اور ہمارا تمام علم مادی اشیاء کے تجربہ مشاہدہ تک محدود ہے مگر ہم بذریعہ وحی ناطق جو تمام نوع انسانی کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بطور صحبت نازل کی گئی اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ مادی موجودات سے بالاتر بھی ایک سلسلہ موجودات کا لبعیتہ اسی طرح اپنی ہستی کا مالک ہے جس طرح مادی اشیاء کا سلسلہ اور وہ سلسلہ موجودات بعینہ ہمارے مادی سلسلہ اشیاء کی طرح قوانین مخصوصہ کا پابند ہے لیکن سوال یہ عائد ہوتا ہے کہ آیا بروئے علوم فلسفہ و طبیعیات ہم ایسے سلسلہ موجودات کا ادراک حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔ اس کا مجملہ جواب تو یہ ہے کہ نہیں مگر اس اجمال کو ذرا تفصیلی طور پر استدلالی صورت میں لانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہم ہر وقت اپنے ذہن میں عمل ادراک کے پابند ہیں اور عمل ادراک کا پابند ہونا انسانی ہستی کے فنا کی دلیل ہے۔ مگر ہم کوئی ذہنی عمل ایسا نہیں کرتے جس کا ماتخذ محسوسات مادیہ نہ ہوں یعنی جن مختلف امور کو ہم بذریعہ قوت متفکرہ ترتیب دیتے ہیں وہ سب کے سب خارجی اشیائے مادیہ سے ماتخذ ہوتے ہیں خواہ وہ ان اشیاء مادیہ کے لوازم ہوں یا عوارض دیگر۔ اور انہیں امور پر ہمارے قیاسات و دلائل کے نتائج کا مدار ہوتا ہے ہم کوئی ایسا ذہنی عمل نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں جس کے اجزایا تو خود اشیائے مادیہ نہ ہوں یا ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے

ہوں کیونکہ جو چیز ہمارے حواس میں نہیں آئی وہ کسی طرح ہمارے عمل ذہنی کا معمول نہیں ہو سکتی۔ عرو۔ نقطہ۔ خط۔
 وحدت وغیرہ امورِ عمل ذہنی کا معمول بنتے ہیں مگر کون کہتا ہے کہ ان امور کے تعلقات انتہا ماورئیں ہیں
 ہم خواہ تحقیقات کے میدان میں کسی حد تک ترقی کر جائیں مگر انتہائے غیر محسوسہ ہمارے عمل ذہن کا معمول
 نہیں بن سکتیں پس ایسے امور کے وجود تسلیم کرنے اور ان کی حقیقت پر ایمان لانے کے لئے ہمارے
 پاس بحرِ تعلیم وحی کے کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تھائن غیر مادیہ مثلاً ملائکہ
 ابلیس۔ عذاب و ثواب وغیرہ کو اصول فلسفہ و سائنس پر جانچنا چاہئے یہ نہایت ہی احمقانہ خیال ہے
 جس کی تائید بجز کسی دہری یا بچہری کے کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ اور اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو یقیناً نبوت
 انبیاء علیہم السلام کی کچھ ضرورت نہ تھی کیونکہ انسانی تجربات و مشاہدات سے جہاں روزمرہ ہزاروں
 اور لاکھوں نئے نئے ایجادات ترقی پذیر ہو رہے ہیں آخر ایک نہ ایک دن ان امور کا وجود بھی پایہ ثبوت
 تک پہنچ جائیگا مگر بالعکس جس قدر مادی ایجادات روز بروز ترقی کرتی چلی جا رہی ہیں اسی قدر تھائن
 غیر مادیہ کا انکار بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ مسلم ہے کہ انسان جس قدر مشاغل مادی میں زیادہ مستغرق ہوتا
 ہے اسی قدر روحانی پہلو اور اس کے عجائبات کے علم سے دور چار پڑتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ بالکل منقطع
 ہو کر عالم روحانی اور اس کے معارف و حقائق کا انکار کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم وحی
 اور نبوت کو ایک فرضی افسانہ یا کسی مصلحت وقتی کا نتیجہ کہنے لگتا ہے۔ لغو و باندہ من و دلک۔ مگر یہ سب
 خرابی اس امر کا نتیجہ ہے کہ انسان بسا اوقات اپنے ضعف فطرت کا اندازہ نہیں کرتا اور اپنے محدود اور
 نہایت ہی ناچیز علم پر اس قدر گھمنڈ کرنے لگتا ہے کہ جہاں ایسے چند ایک مسائل کا پتہ لگایا مختلف لوگوں
 کے آراء فلسفہ سے واقف ہو گیا تو یوں سمجھ لیتا ہے کہ از عرش بریں تا فرش زمین شہِ ذرہ کائنات
 کی حقیقت اور انشائے ربطِ علّی کا اسے علم حاصل ہو گیا ہے مگر وہ ایک اہلِ دل کے اس قول سے بالکل
 ناواقف ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنے ذاتی معلومات کو ان معلومات سے علیحدہ کرنے لگے جو لوگوں سے
 اس نے مستعار لئے ہوئے ہیں تو غالباً اس کا علم صفر کے درجہ تک آ رہے گا۔ بہر صورت یہ ہمارا انتہائی

غلطی ہے کہ ہم اپنی عقل جزئی کے دائرہ میں کھینچ ناکر ان امور کو بھی لانا چاہتے ہیں جو مافوق عقل ہیں
یہ مخالف عقل عقل سلیم ہم کو نبوت اور وحی کی ضرورت کا پتہ دیتی ہے مگر ان حقائق کا علم جو مخصوص تعلیم وحی
ہیں ہیں صرف تعلیم وحی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے لاغیر اسی امر کی طرف ایک حقیقت بین نے یہیں الفاظ
اشارہ کیا ہے :-

العقل یرتقی الی سراط الطباع ولا یرتقی الی ما سواها من الذمائع
نہر جائے مرکب تو اس تاختن - کہ جاہا سپر باید انداختن

دہریت

جب ہم کسی مسئلہ کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں تو اس کے متعلق ہم تمام ایسے اسباب کی تلاش کرتے ہیں
جو ہماری تحقیق میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کچھ نہ کچھ دخل رکھتے ہوں مثلاً اگر ہمیں یہ مطلوب ہو کہ مختلف اجسام
کے قانون تجاذب کی حقیقت کو سمجھیں تو ہمیں ضروری ہوگا کہ ہم اصول طبیعیات کی طرف رجوع کریں اور
اس فن کی کتابوں میں قانون مذکور کے متعلق جس قدر محققین کی تحقیقات پر ہم مطلع ہونگے اسی قدر ہماری تحقیق
صحیح اور قابل طمینان ہوگی اسی طرح اگر ہم یہ چاہیں کہ کسی خاص سیارے کی مقدار حرکت اور اپنے مدار میں اس کے
اوضاع مختلفہ کی کیفیت کا اندازہ لگائیں تو جب تک ہم علمائے علم ہست کی کتب کی طرف متوجہ ہو کر
قواعد ضروریہ سے بخوبی واقفیت حاصل نہ کریں مسئلہ مذکورہ میں ہم کوئی صحیح جواب نہیں پاسکتے۔ علیٰ ہذا
یہ بات ہر حالت میں مسلم ہے کہ کسی مسئلہ کی تحقیق کیلئے ہمیں اس کے متعلقہ علوم و فنون کی کتابوں پر کافی عبور
ہونا چاہئے ۔

مگر یہ بات بالکل ایک معمولی اور سرسری خیال ہے جس کی صحت میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مجھے
اس پہلو کو نظر انداز کر کے اس امر کی طرف توجہ کرنا مطلوب ہے کہ جن علوم و فنون کی کتابوں سے ہم کسی مسئلہ
کی تحقیق کے لئے قواعد ضروریہ اور اصول اولیہ کو سیکھ سکتے ہیں وہ علوم و فنون کیونکر جمع ہوئے۔ سو اس سوال

۱۔ عقل جزئی مادی اشیائیں سبب متب کا تعلق دریافت تو کر سکتی ہے مگر وہ مادی اسباب کی نہیں سمجھ سکتی۔ ۱۲ منہ +

کا جواب معمولی اور سرسری نہیں بلکہ نہایت دقیق فکر اور غور پر مبنی ہے۔ انسانی دنیا میں آج تک جس قدر علوم اور فنون کے متعلق تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو چکا ہے ان میں سے کسی ایک علم و فن کو لو اور اس کی کیفیت وین پر غور کرو تو ہمیں بالآخر معلوم ہو جائیگا کہ انسانی تحقیقات کی بناء پر ہم نے اس نور فطرت کا نتیجہ ہے جس کو حکیم مطلق نے اپنی حکمت کاملہ سے ہماری اندر ودیعت رکھا ہے اور یہ وہی نور فطرت ہے جس سے حضرت انسان نے اشرف المخلوقات کا معزز لقب حاصل کیا ورنہ ایک جاندار مخلوق ہونے کے لحاظ سے انسان اور دیگر حیوانات ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں یہی نور فطرت ہے جس کو قوۃ عاقلہ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چونکہ قوۃ عاقلہ تمام انسانوں میں موجود ہے گو اس کے مدارج مختلف ہیں اسلئے یہاں طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قوۃ عاقلہ جس کو عقل انسانی بھی کہہ دیتے ہیں ہر ایک امر کی تحقیق کے لئے کافی ہو سکتی ہے تو پھر تعلیم وحی کی کیا ضرورت ہے؛ کیونکہ یہ بات تو مسلم ہے کہ اگر کسی خاص امر کی تحقیق سے زبرد - عمرو - بکرو وغیرہ معذور ہیں تو کیا معذور ہے کہ تمام افراد انسانی معذور قرار دیئے جائیں اور جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی عقل ہمیشہ آئے دن نہایت عجیب و غریب تحقیقات ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں تو بالیقین ہمیں اس امر کا اقرار کر لینا لازمی ہو جاتا ہے کہ انسانی عقل کے لئے ہم ایک ایسی حد میں کا پتہ نہیں لگا سکتے جس کی نسبت ہم قطعاً فیصلہ کر سکیں کہ عقل انسانی اس سے آگے تجاوز نہیں کر سکتی اس کی تائید علوم جدیدہ کی روز افزوں ترقی کے دیکھنے سے اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ حال ہی میں مالک مغربی کے حکمائے ایک قسم کی ایسی برقی کرفوں (کریس) سے یہی تحقیق کی ہے جو اجسام کی دوسری طرف کو نفوذ کر سکتی ہیں اور اس طرف کے آدمی کو دوسری طرف کی تمام کیفیات کا مشاہدہ برابر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس آلہ سے ڈاکٹروں نے جسم کے اندر فنی اعضا کی بیماریوں کی تحقیق میں بڑی مدد حاصل کی ہے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر حیرت انگیز عجائبات جدیدہ کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ آج جن امور کو اسرار خفیہ کہا جاتا ہے اور جس کی نسبت اکثر موجودہ امتوں کا یہ خیال ہے کہ بدول تعلیم وحی حاصل نہیں ہو سکتے کسی آئندہ زمانہ کی تحقیقات سے مختلف علوم مروجہ کے اصول میں داخل سمجھے جائیں۔ اور قاعدہ ہے کہ جیہ کوئی امر کی مشاہدہ یا تجربہ کی ذیل میں آ جاتا ہے اور اس کے سلسلہ اسباب پر ہم عملی طور پر بحث کر سکتے ہیں تو اس کے متعلق ہمارا تمام تحیر اور استعجاب زائل ہو جاتا ہے۔ عرب کے

مشرکوں اور معمرے افریقہ کے وحشیوں کو اگر اب سے دو سو سال پہلے یہ کہا جاتا کہ تار برقی بحساب سات
میل فی سیکنڈ فاصلے طے کرتی ہے تو وہ کبھی مابود ذکر تے گرجا وہی لوگ ہیں کہ یہ تمام تقاضے ان کے لئے
معمولی باتیں سمجھی جاتی ہیں گو وہ خود ابھی ان سے مستفید نہیں ہو سکے انہیں حیرت انگیز ایجادات نے دنیا
بھر کی قوموں کو چوکنا کر دیا ہے اور جوں جوں ممالک مغربی کا تسلط روئے زمین پر پھیلتا چلا جاتا ہے قوموں
کی قویں ان کی طرف جھکتی چلی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تسلیم و جی کے ماننے والوں کے پاؤں ڈگمگائے
ہیں۔ اور مذہب کو برائے نام صرف بطور امتیاز ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم لوگ یہاں بیٹھے اس امر کو
کافی یقین کے ساتھ تسلیم کر لیتے ہیں کہ مغربی ممالک کی قویں اس امر کے درپے ہو رہی ہیں کہ مذاہب کی
خصوصیت تمام اقوام عالم سے اٹھا دی جائے کیونکہ انہیں یقیناً معلوم ہے کہ مذہبی قیود کی پابندی
قوموں کے عام اختلاط کی سخت مانع ہے اس لئے گو کسی ملکی قانون میں اس امر کو یا تصریحاً ملحوظ نہ
رکھا گیا ہو کہ مذہبی امتیازات کو اڑا دیا جائے مگر مغربی ممالک کی قانونی روش کے علی نتائج ہر ایک
مذہب کے کمزور کر دیتے ہیں پورا پورا قبض و تصرف رکھتے ہیں۔ اسی طرح سلسلہ تصنیف و
تالیف کی بنا پر بھی ممالک مغربی میں قیود مذہبی کے اٹھا دینے پر قائم کی گئی ہے جس کی تائید میں اکثر
فلاسفہ عمر بھر سرگرم رہے۔

(سوال) مگر کیا مذکورہ بالا عجائبات جدیدہ کا رد افروں ترقی پر ہونا واقعی اس امر کی قطعی
دلیل ہے کہ انسانی دنیا کسی آئندہ زمانہ میں تعلیم و جی کی ضرورت سے سیکھ دوش ہو جائیگی؟

(جواب) یہ سوال ہمارے موجودہ زمانہ میں بالخصوص قابل غور مسئلہ ہو گیا ہے کیونکہ مغربی تعلیم
کے لوگ قریباً قریباً اس کی حقیقت پر جھک رہے ہیں اور بعض تو ٹھیک کھلا اس امر کا اقرار کر چکے ہیں
کہ ہم ایک ایسے ہند اور کامل زمانہ ترقی تک پہنچ چکے ہیں کہ اب جنت و جہنم وغیرہ امور کے وعدہ
و وعید کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ یہ باتیں عوام الناس کے لئے صرف اس زمانہ میں ضروری سمجھی
گئی تھیں جبکہ انسانی تمدن و معاشرت کے متعلق کسی قسم کی ترقی و تہذیب کا آغاز نہیں ہوا تھا اب
جبکہ علوم و فنون جدیدہ نے ہمارے لئے تمام ترقی کی راہیں کھول دی ہیں اور ہمیں اپنے ہر ایک مفاد

کے اصول کا پتہ لگ گیا ہے اور شاہی لٹری اور تہذیب کو پوسے طور پر ہم سمجھنے لگ گئے ہیں کیا ضرورت ہے کہ وحدہ و وعید سے (جو صرف فرضی اور وہی باتیں ہیں جو مصلحانِ زمانہ سابق نے عام جاہلوں کو متہذیب بنانے کے لئے بطور مصلحت مان رکھی تھیں) لوگوں کو اخلاق و تہذیب کی طرف متوجہ کیا جائے ؟

ناظرین غالباً سمجھ گئے ہونگے کہ اس الحاد کی بنا خالص دہریت پر قائم ہے جس کا جابجا قرآن مجید نے رو کیا ہے کیونکہ جو شخص انسانی ہستی کے لئے مرنے کے بعد کسی دوسری زندگی کا اقرار کرتا ہے وہ باسانی تعلیم وحی کی ضرورت کو قبول کر سکتا ہے اور ایک آن کے لئے بھی اس صریح کفر کو نہیں سن سکتا۔ اس غلطی کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ معترضین نے انسانی ہستی کی حقیقت اور اس کی غایت پر مطلقاً توجہ نہیں کی بلکہ انسان کو صرف ایک ایسا ذی شعور حیوان تسلیم کر لیا ہے جو اس دنیا میں حظِ نفسانی اور لذاتِ جسمانی سے متہت ہو کر خاک میں جا ملتا ہے جس کا بعد میں کوئی اثر و نشان باقی نہیں رہتا۔ اس لئے میں صرف حقیقتِ انسان اور اس کی غایت پر بحث کرتا ہوں کیونکہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مرنے کے بعد اس کو کسی نئی زندگی میں اپنے اعمالِ نیک و بد کا جوابدہ ہونا ہے تو اس بات کا ماننا لازمی ہو جائیگا کہ آئندہ زندگی کی اصلاح کے لئے انسان کو تعلیم وحی کی پابندی کے بغیر کوئی چارہ نہیں کیونکہ آئندہ زندگی کے حالات ہلے ہوئے اور قوتِ ادراک سے خارج ہیں اس لئے ان کی تصدیق انسانی مشاہدہ و تجربہ کے اصول پر ہرگز نہیں کر سکتے ہم صرف اس کی ضرورت کو بند رہیہ ذور عقل و یکھ سکتے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے ۔

انسانی حقیقت کے سمجھنے کے لئے پہلے اس امر کا فیصلہ کر لیا چاہئے کہ موجودات دو صوبوں مادی اور غیر مادی میں منقسم ہے مگر دہرہ اور قریباً قریباً نیچر پر بھی اس امر کا انکار کرتے ہیں بلکہ ان کے نزدیک تمام موجودات صرف مادی اشیاء میں منحصر ہیں لیکن حق یہ ہے کہ کوئی ایسی قطعی دلیل بجز وہم و عن کی پابندی کے آج تک ان کی طرف سے نہیں مل سکی جس پر فطرتِ انسانی جو طبعاً اور فطرتاً حلل پر مجبور ہوتی ہے قانع ہو سکے۔ فرض کر دو کہ اگر ہم غلطی دیر کے لئے تسلیم بھی کر لیں کہ سلسلہ کائنات کا کوئی ایسا صالح حکیم مطلق جو تمام صفاتِ کاملہ سے متصف ہو نہیں ہے تو از خود

ایک اندرونی شہادت ہمارے اس خیال کی تکذیب کرتی ہے اور کسی بالاتر علت کی تلاشی رہتی ہے کیونکہ جب ہم سلسلہ نظام کائنات میں کامل غمہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی زبردست اخلاقی اور عقلی ہستی کا یقین کر لینا لازمی ہو جاتا ہے اور یہ شہادت ایک ایسی قطعی اور غیر متبدل حجت ہے جس کا ہجر ایک کور باطن آدمی کے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پس یہی ایک زبردست دلیل ہے جس کو ابتدائے آفرینش سے آج تک انبیاء علیہم السلام اور روئے زمین کے اہل علم ہستی ذات باری کے متعلق پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ اور میرے خیال میں ہجر اس کے اور کوئی دلیل اس موضوع کو پایہ ثبوت نہیں پہنچا سکتی یہ دلیل اس اصل عظیم پر مبنی ہے کہ اتنی فطرت کسی واقعہ کو بدو ن اس کے سبب کے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ جب اسے کسی واقعہ کا سبب معلوم ہو جاتا ہے تو وہ بقدر علم مطمئن ہو جاتی ہے ورنہ نہیں۔ چونکہ یہ شہادت محض فطری شہادت ہے اس لئے میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہجر کو باطن آدمی کے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ جس طرح بعض لوگ مادہ ذائبے بصارت پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بعض لوگ فطر تائبے بصیرت بھی پیدا ہوتے ہیں سو ایسوں کے لئے کسی کے پاس کوئی چارہ نہیں جو لوگ مذکورہ بالا فطری شہادت کا انکار کرتے ہیں درحقیقت ایک بڑی بھاری غلطی میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ اشیائے موجودات کا ایک خاص سلسلہ نظام و ترتیب میں واقع ہونا اور ہر ایک کا اپنے طبعی خاصہ کے دائرہ میں محدود رہنا کوئی ایسا سرسری امر نہیں جس کو صرف مادی انقلابات کی حد تک محدود رکھا جائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ متکرر اس ترتیب و نظام اور خواص اشیاء کو اگر صرف مادی انقلابات کا نتیجہ تسلیم کرے تو امر زیر بحث کا فیصلہ منقطع نہیں ہو جاتا کیونکہ مادی انقلابات کچلے خود کوئی علت نہیں ہو سکتے مادیات صرف قوت متفعّلہ رکھتی ہیں نہ قوت فاعلہ۔ یعنی اشیائے مادی میں صرف کسی دوسری شے سے اثر قبول کرنے کا خاصہ پایا جاتا ہے اور خود کسی دوسری چیز میں اثر پیدا نہیں کر سکتیں۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ دو چیزوں کے اتصال سے ایک خاص نتیجہ پیدا ہوتا ہے مگر گفتگو یہ ہے کہ یہ اتصال کہاں سے پیدا ہوا اور کیوں دوسری دو اشیاء کے اتصال سے نتیجہ پیدا نہ ہوا؟ اگر کوئی شخص اس سوال کا یہ جواب دے کہ یہ اتصال ان کی طبعی کشش کا نتیجہ ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ ہر دو چیزیں تو علیحدہ علیحدہ

دو اشیائیں اور ان کی اس طبعی کشش کا خاصہ بھی ایک علیحدہ امر ہے یعنی ہر دو اشیائیں اور ان کی طبعی کشش ایک شے نہیں ہیں اس لیے ہم طبعاً یہ سوال کرینگے کہ اس طبعی کشش اور اس شے میں جس میں کشش پائی جاتی ہے اتصال کیونکر ہوگا؟ اگر منکر ہے کہ خود بخود تو ہم کہیں گے کہ خود بخود کا لفظ ایک بے معنی بات ہے کیونکہ یہ ایسا معاملہ ہے جس کو فطرت مردود کر رہی ہے اور اس کا مفہوم ہم تو کیا کوئی فرد بشر بھی نہیں سمجھ سکتا کارخانہ فطرت میں کوئی امر ایسا موجود نہیں جس کی تشریح سلسلہ علت و معلول میں نہیں کی جاسکتی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ ہم کسی واقعہ کی علت دریافت کرنے سے کسی وقت عاجز ہو جائیں مگر یہ ہماری اپنی کمزوری ہوگی نہ ہمارے اس اصل عظیم کی کہ کوئی واقعہ بے علت موجود نہیں ہوتا۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بحر تعلیم وحی کی پیروی کہہ میں حقیقی غایت کا کچھ پتہ نہیں مل سکتا۔ نور فطرت یا عقل انسانی ہمیں صرف حقیقی غایت کی ضرورت کا پتہ دے سکتی ہے یا یوں کہو کہ نور فطرت صرف اس استعداد کا نام ہے جس سے انسان بذریعہ وحی اپنی حقیقی غایت کی طرف رجوع کر نیکی قابلیت رکھتا ہے۔ اگر ہم تعلیم وحی کی ضرورت کو محسوس نہ کریں تو گویا خداوند جل و علا کی ایک بڑی بھاری امانت میں خیانت کرینگے کیونکہ ہم نے نور فطرت سے وہ کام نہیں لیا جو خدا نے اس کے متعلق قرار دیا تھا۔ عقل انسانی ایک چرخ ہے جو تعلیم وحی کا روغن ڈالے بغیر کبھی روکشی نہیں دے سکتا ہم تمکھیں رکھتے ہیں مگر جب تک آفتاب اپنی روشنی کا فیض عام ہم تک نہیں پہنچاتا ہم اشیاء کا نظارہ نہیں کر سکتے۔ زمین میں مختلف چھول پھل اگانے کی قابلیت موجود ہے مگر جب تک آسمان پر سے باران رحمت نازل نہیں ہوتا کسی قسم کی روئیدگی کا وجود ممکن نہیں۔ یہی مثال بعینہ عقل انسانی کی سمجھو جس کو خداوند کریم نے بطور رویت ہماری فطرت میں مرکوز کیا ہے مگر وہ حقائق اشیاء کو محاطہ بدوین تعلیم وحی حاصل نہیں کر سکتی اور جو لوگ اس کے فیض سے مستفید نہیں ہوتے ان کی مثال بعینہ اس شورہ نازدین کی ہے جس پر باران رحمت تو نازل ہوتا ہے مگر وہ کسی قسم کی پیداوار نہیں دے سکتی۔

الضرر دہریت محض ظن کا ذب کی پیروی کا نام ہے۔ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔

دوسری فطرت کے آدمی کو کبھی کسی بات پر یقین حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہمیشہ شک و تردید کی حالت میں غلط
 چرچاں رہتا ہے کیونکہ حق صرف مسئلہ توحید سے حاصل ہوتا ہے جس سے دل مرکز صداقت پر ہدایت مضبوط
 طور سے اپنے پاؤں جاملتا ہے۔ مگر توحید کہاں سے مل سکتی ہے؟ قرآن مجید سے جو ہماری ہادی برحق
 جناب محمد مصطفیٰ (ص) کو خزانہ رحمت و لطف الہی سے بغرض ہدایت عالمین عطا ہوا۔
 ”ذٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ“

دہریت کا آغاز اس امر سے ہوتا ہے کہ انسان سلسلہ نظام مادیات کو اشیاء و بیجا ایک طبعی خاصہ
 تصور کرنے لگتا ہے یعنی وہ یہ یقین کر لیتا ہے کہ ایک مادی چیز دوسری مادی چیز میں فطرتاً اپنا اثر پیدا
 کرتی ہے اور دوسری چیز اس کے اثر کو قبول کرتی ہے۔ اسی طرح تمام سلسلہ کائنات میں اشیاء کے اندر
 ان کے طبعی خاصہ کی رو سے تاثیر و تاثر کا عمل جاری ہے اور کوئی ایسی مافوق طاقت اس تاثیر و تاثر
 کو اپنے قبضہ قدرت میں نہیں رکھتی جس کو خدائے قادر و مطلق کے نام سے پکارا جاتا ہے مگر ایسے بوقوف
 کو اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ جس امر کو وہ الکاح کی دلیل گردانتا ہے اسی کی تہ میں ہستی ذات باری کے وجود
 کی قطعی دلیل موجود ہے موجودہ زمانہ میں سلسلہ اسباب پر لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہو رہی ہے اور یہی
 امر موجب ضلالت عظیم ہے۔ کسی اہل حق نے کیا سچ کہا ہے۔ ”لو لا الاسباب لما استتاب مرتاب“
 یعنی اگر یہ سلسلہ اسباب عوام الناس کی نظروں میں نہ ہوتا تو کوئی شخص کبھی شک میں نہ پڑتا۔ سلسلہ اسباب
 کی ہستی اور ضرورت سے تو واقعی کسی کو انکار نہیں مگر مومن اور مشرک میں فرق یہی ہے کہ مومن تو سلسلہ اسباب
 کو واسطہ سمجھتا ہے اور ذات باری کو فاعل مؤثر اور مشرک کی نظر واسطہ سے آگے متجاوز نہیں ہوتی مگر اس
 خیال باطل کی تابید نہ تو فطرت انسانی کر سکتی ہے نہ تعلیم آسانی *۔

دہریت کے رویں آج تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ گو نہ کورہ بالا سطحوں میں اس مذہب کے
 بطلان کا ثبوت پیش کیا گیا ہے مگر یہ بغرض مزید اطمینان اسی خیال کو زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کرتا ہوں
 (۱) ہمارا یہ خیال کہ ہم جو ابدہ ہیں ایک فطری خیال ہے اور تفکر ہمارا ایک طبعی علم ہے۔ اس کا تجربہ یوں
 ہو سکتا ہے کہ ایک نو عمر بچہ بھی جب کوئی ایسا کام کرتا ہے جو کسی کی مرضی کے برخلاف ہو تو گویا اس کو اس کے

کرنے کی محنت نہ کی گئی ہو مگر پھر بھی اس کو جوابی کا خیال رہتا ہے اس فطری خیال سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جس طرح ہماری جسمانی بناوٹ میں عقل کا وجود پہلے ہے اسی طرح سلسلہ کائنات میں عقل کا وجود پہلے ہے اور حدیث جنابِ نبیر علیہ السلام میں اس کی تائید موجود ہے حدیث قال "اول ما خلق الله العقل" اس خیال سے مستنبط ہوتا ہے کہ سلسلہ کائنات بھی کسی عظیم الشان متفکر کے تابع ہے اور متفکر ایک ذات ہے اس لئے کائنات ایک ذاتی متفکر کی مشابہت ہے۔

(ج) چونکہ سلسلہ کائنات کی ابتدا کا ہم کو کچھ علم نہیں اس لئے عقل کا اس سلسلہ میں اول تسلیم کرنا ہمیں اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں عقل کا درجہ پہلے ہے اور چونکہ عقل ایک آزاد طاقت ہے اس لئے وہ کسی مادی قانون کے تابع نہیں ہو سکتی کیونکہ مادی قوانین تقیید سے باہر نہیں جاسکتے۔ گویا عقل حاکم ہے اور مادی قوانین اس کے محکوم چونکہ انسان کی عقل جزئی بھی مادی تصرفات کی علت ہے اس لئے سلسلہ کائنات کے لئے بھی ایک عقلی ہستی کا وجود اور اس کا اعلیٰ ہونا ضروری ہے۔

(ج) سلسلہ کائنات کے وجود کے متعلق ہمارا علم دو حدود میں محدود ہے (۱) یہ کہ کائنات کا کوئی آغاز نہیں (۲) یہ کہ اس کا کوئی آغاز مطلق ہے۔ مگر خود کرتے سے معلوم ہو گا کہ ہر دو کا عقلی ثبوت بڑے قوانین تجربہ و مشاہدہ محال ہے لیکن یہ ہر دو خیال ایک دوسرے کی نفی میں ہیں اور سلسلہ قاعدہ ہے کہ نہ تو اجتماع نفی میں صحیح ہے اور نہ ارتفاع نفی میں یعنی نہ تو ہم ہر دو کو باطل قرار دے سکتے ہیں نہ ہر دو کو حق۔ مگر ہماری فطرت اس شک کی حالت پر قانع نہیں ہو سکتی اس لئے ہم اپنی ذات کی طوط رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہم ایک عقل آزاد کی مالک ہیں یعنی ایک اخلاقی اور آزادانہ عمل خالص اندر موجود ہے جو کسی عامل کی ذات سے قائم ہے۔ اور ہمارا یہ خیال ایک فطری عمل ہے یعنی اکتسابی نہیں اس لئے ہم بالطبع سلسلہ کائنات میں بھی ایک اخلاقی اور آزادانہ عمل کا وجود ضرورتاً تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اور اسی لئے ہم سلسلہ کائنات کے آغاز مطلق کو تسلیم کرتے ہیں گو کہ ہمیں اسکی کیفیت کا تفصیلی علم نہ ہو۔ علاوہ ازیں ایک ایسے سلسلہ کی تعلیم میں معین اور غیر متبدل قوانین کا ذکر ہے انسانی نفس تاملقہ کو اس لائق نہیں کہتی کہ وہ حقیقتِ آزادی کو سمجھ سکے کیونکہ اس بات کے تسلیم کر لینے سے کہ تمام

کائنات پابندِ تقدیر ہے اور کسی عاملِ خلاق کی محکوم نہیں ہیں صداقت کی لاناہٹا تلاش کی طرف سے بالکل روک دیتا ہے اور میرے خیال میں ایسا شخص بجائے خود قوانینِ فطرت سے زیادہ ملِ تعجب ہو جانا ہے کیونکہ وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا اور عدمِ اطمینان جتنی صداقت کی نشہ ہے گویا وہ اپنے انکار سے یوں ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں حقیقی صداقت کا کوئی مفہوم نہیں حالانکہ یہ خیال بالکل باطل ہے۔ ناظرین کو یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ حکماءِ اشراقیین یا علمِ الہیات کے جانے والوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کو خدا کی ہستی اور اس کے لامتناہی اسرار و معارف کا علم مادی قوانینِ فطرت تک محدود رہنے سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ قوانینِ فطرت کی قید انسان کو مادی موجودات سے زیادہ اشرفِ ثابت نہیں مچنے دیتی بلکہ ہمیں چاہئے کہ قوانینِ مادیہ کو آئینہ ہستی مطلق کا خیال کر کے حقیقت سے آگہی حاصل کریں (سوالیئے کر اہم کا یہی مسلک ہے) چنانچہ اقلاطون کا قول ہے کہ قوانینِ فطرت کو افضل قرار دینے کی غلطی نے خدا کے اعتقاد کو اُڑا دیا ہے *

کینٹ جرمین فلسفی کا قول ہے کہ مادی دنیا بشر کی طبع کو حقیر اور فانی ثابت کرتی ہے مگر عالمِ اخلاق اس کی فضیلت برصحاتا ہے اور اس کا اس چند روزہ زندگی کے بعد باقی رہنا پسند کرتا ہے۔ جگلوبنی کا قول ہے کہ قدرت یعنی مادی قدرت خدا کو مخفی رکھتی ہے اور انسان خدا کا منظر ہے اور یہ بات کہ خدا صرف الہامی کتابوں سے ملتا ہے حق ہے۔ ثبوتِ ذاتِ باری کے متعلق قرآن مجید نے دو قسم کے دلائل پیش کئے ہیں :-

- اول۔ دلائلِ آفاق یعنی ایسے دلائل جو عالمِ خارجی کی حقیقت میں غور کرنے پر مبنی ہیں۔
- دوم۔ دلائلِ انفس یعنی ایسے دلائل جو انسان کو اپنی حقیقت ذات میں غور کرنے پر مبنی ہیں۔

۱۔ ایک سر یہ جو قوم کا ہندو تھا اور اہلِ یورپ کے فلسفہ کو خوب بڑھ کر کھانا اکیڈم فاکسار کے مکان پر پڑھ کر تحقیق آجیاں نے بس کی تقریریں اس کو مناسب جواب دیا۔ گو وہ میرے دلائل کی کسی قسم کی جرح نہ کر سکا مگر وہ قائل بھی نہ ہوا۔ آخر میں نے اسے بچھا کر کہیں کچھ کبھی اطمینان بھی طلب کیا نہیں؟ وہ کہنے لگا کہ مجھے اپنے خیال و ہریت پر بھی اطمینان نہیں بلکہ میری طبیعت میں ہمیشہ ایک گوندِ حلقہاں رہتا ہے جو کبھی دور نہیں ہوتا ایسی کوئی کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کے پاس کوئی چارہ ہو تو بیٹاؤں میں سے تو آپ یا کتب تک حقیقتِ توحید سے واقف نہ ہو کر کھانا دہیں ہو یا کہ کوئی توحید آہی میں خدا کے اندر راحت مہر جی ہے کہنگار ہاں۔ پھر وہ چلا گیا اور وہاں نہیں آیا۔ ۱۲۔ سنہ ۵۰

ابن ہرودس قسم کے دلائل کو آیہ "وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي الْفَسْكَ أَفْلا تَبْصُرُونَ" میں بیان کیا گیا ہے مگر جو لوگ فطری کج فہم ہوں ان کو بھلا کون درست کر سکتا ہے؟
فَانْهَ الْأَقْمَى الْأَبْصَارَ وَلَكِنْ تَتِمَّى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ *

منجربیت

المعقل العاقل اعطيت لدلك العبودية لا للتصرف في الربوبية

عقل ایک آلہ ہے جو حقیقتِ عبودیت کے سمجھنے کیلئے عطا کیا گیا ہے نہ ربوبیت میں تصرف کرنے کیلئے
افراط و تفریط انسان کا عقلی خاصہ ہے اور اس کے کمال حقیقی تاک ہیچے میں جو امر سنگ راہ
ہوتا ہے وہی افراط و تفریط ہے۔ افراط و تفریط کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے علمی یا
علمی طریق میں کیفیت یا کیفیت کو ملحوظ نہیں رکھتا بلکہ حد اعتدال سے یا تو نیچے یا اوپر کو تجاوز کر جاتا ہے۔ مگر
مستقدمات و کلیات میں حد اعتدال کو ملحوظ رکھنا ہی اسلامی شریعت کے مقصد کو پورا کرنا ہے۔ چنانچہ ہر روز
پانچ و قہم اہدانا الصراط المستقیم کہتے ہیں جس کا مفہوم بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہم نہایت خشوع و خضوع
کے ساتھ جناب باری عز اسمہ سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اعتقادات اور اعمال کی اس روش پر چلائے
جو الذین انعمت علیہم یعنی انبیاء و صدیقین۔ شہداء اور دیگر صالحین کو حاصل تھی چونکہ اس صراط
مستقیم شریعت پر چلنا انسانی زندگی کا اہم و اشرف مقصد ہے اس لئے خداوند کریم نے محض اپنے
فضل بے پایاں سے ہیں وہ دو عالمیت فرمائی ہے جو ہماری تمام دینی و دنیوی مصلحتوں پر مشتمل ہے۔ تمام
اکابر علمائے امت نے بالاتفاق اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ سے برصحر آج تک کوئی جامع کلمات
کسی حقانی کتاب میں نازل نہیں ہوئے۔ چنانچہ بعض علمائے ربانی نے لکھا ہے کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام
کی تمام کتب منزلہ کالب لباب قرآن مجید ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کالب لباب یہ سورۃ فاتحہ ہے جس

۱۔ زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے دلائل توصیف ذات باری موجود ہیں اور تیر تہائی اپنی ذات کیا تم خود نہیں کہتے؟ ۱۲۔ منہ
۲۔ ان لوگوں کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ ان کے دل اندھے ہیں۔ لغو ذلک باللہ منہا۔ ۱۲۔ منہ *

کے فضائل بے انتہا کتب تفاسیر و احادیث میں مرقوم ہیں۔

چونکہ معتقدات اور اعمال میں فراط و تغریط کا ملحوظ رکھنا سخت دشوار ہے اس لئے خداوند کریم نے ہم پر اطاعت جناب ساتھ اب کو فرض ٹھہرا دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بصورتِ کامل اتباع ہم جو ابدی کے بوجھ سے سبکدوش ہو کر نعم ابدی کے مالک ہو جائیں گے۔ ورنہ کوئی شخص خواہ وہ کسی پایہ کا حکیم و دانشمند ہو اپنی جمیع معتقدات و اعمال میں فراط و تغریط سے خالی نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی انسان کی صنفِ فطرت کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے محدود و قاصر پر استعد بھروسہ کر لیتا ہے۔ کہ وہ اپنے تئیں شریعتِ حق کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیکر اپنے ناقص اور غلط و صحیح خیالات کو متبادلہ شریعت زیادہ قابل اعتبار یقین کرنا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عقلِ نارسا کی ایک بہت بڑی آفت اس کے پیچھے لگی ہوئی حالانکہ یہ تسلیم ہے کہ عقلِ جزئی جو ہر ایک فرد بشر کو علیحدہ علیحدہ کچھ نہ کچھ دی گئی ہے صرف اسی حد تک اس کا ساتھ دے سکتی ہے جس حد تک فطرتاً اس کو پہنچنا چاہئے۔ اور اپنی حد سے آگے اس کا تجاوز کرنا خطِ محض ہے اسی طرح ضروری حد تک نورِ عقل سے کام نہ لیتا بھی مخالفتِ فطرت کرنا ہے۔ پس میں معلوم کرنا چاہیے کہ انسانی دندگی کی بہترین رفتار کیلئے عقل کہاں تک ہماری دستگیری کر سکتی ہے؟

ہماری فطری محذوری | ہم اپنی فطرتِ خودی سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتے ہم دیکھتے ہیں کہ ہم محذورِ عقلی ہیں اس لئے اگر ہم اپنے قوا سے اس کی ذاتی قابلیت سے زیادہ کام لینا چاہیں گے تو اس کا نتیجہ ہماری ہلاکت ہو گا مگر اس امر کا صحیح موازنہ کرنا کہ ہم کہاں تک اپنے قوی سے کام لے سکتے ہیں سخت مشکل ہے اسی ایک غلطی کا نتیجہ ہے کہ بعض اوقات اکثر جاہل اپنے جسمانی قوی پر ناجائز بوجھ ڈال دیتے ہیں جس کا نتیجہ کوئی جسمانی خلل یا موت ہوتا ہے۔ اور اسی طرح اکثر جاہل فلسفہ جو

لے حکما کی سوانح عمریاں پڑھو کہ ان کے معتقدات میں کس قسم کی بے سرو پائی تھیں داخل تھیں جس کو بعض ان کی قوتِ داہمہ کا نتیجہ کہنا چاہیے۔ اور ان میں سے اکثر کی علی حالتِ یحییٰ کو یا تو باطل فرائضِ فطری سے سبکدوش یا ہر ایک قسم کی شہواتِ انشانیہ میں مستغرق اور مدہوش تھے اور بعض ایسے بھی گندے ہیں کہ جن کے معتقدات و اعمال میں تو کسی قدر صلاح تھی مگر عبادت کے میدان میں ایک قدم بھی نہ چل سکے۔ ان کے ہاں صرف ایک اخلاقی حالت کا پابند ہونا کافی سمجھا گیا تھا۔ مگر یہ سب ملعون ہیں +

قواء و داعی کو ایسے امور میں لگاتے ہیں جو حیر عقل سے بالاتر ہوتے ہیں مختلف قسم کے غلط خیالات کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ان کی روحانی ہلاکت ہے لیکن اگر ہم اپنی محدودی کی حد کا صحیح اندازہ لگائیں تو ہم ہر ایک طرح باطن و امان زندگی بسر کر سکیں گے۔

اس محدودی کا معیار جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ افراد انسانی میں مدارج عقل مختلف ہیں تو ہم یقین کر لیتے ہیں کہ افراد انسانی میں ہم عقل کا کوئی خاص ایسا درجہ

قائم نہیں کر سکتے جس کی نسبت ہم یقین ہو جائے کہ اس درجہ سے آگے عقل انسانی کا کوئی درجہ ممکن نہیں بلکہ ہمیں یہ خیال کرنے کی گنجائش ہر حالت میں ہوتی ہے کہ کسی خاص فلاں درجہ سے آگے بھی کسی درجہ عقل کا وجود ممکن ہو سکتا ہے لیکن جب ہم یہ نظر اجمال بغیر کسی خاص فرد کی حالت پر غور کرنے کے ایک عام نظر انسانی فطرت پر ڈالتے ہیں تو ہم یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی خاص حد عقل جزئی کی ہیں معلوم نہ ہو سکے مگر یہ قضیہ ہر حالت میں صحیح ہے کہ کوئی انسانی عقل لامتناہی طاقت کی مالک نہیں ہو سکتی پس جب یہ دو متضاد خیال ہمارے سامنے موجود ہیں تو فیصلہ کا کیا طریق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا کلی معیار نہیں جس پر عقل کی محدودیت کا اندازہ لگا سکیں اور اگر کوئی شخص اپنی طرف سے تجویز کر لیا تو وہ اس کی اپنی عقل کا نتیجہ ہو گا جسکی پابندی دوسروں پر لازم نہیں مگر یہ جواب جو بالکل نفی میں دیا گیا ہے صرف اسی حد تک صحیح ہے کہ اس کو کسی عقل انسانی کا فیصلہ قرار دیا جائے اور اگر وحی آسمانی سے ہیں پتی محدودیت کا پتہ لگ جائے تو ہم واقعی اس کی پابندی لازم ہو جائیگی یعنی جس صورت میں وحی آسمانی ہمارے قومی کی حد کا پتہ دیدے تو ہمیں لازم ہو گا کہ ہم اس حد کی نگہداشت کریں پس وحی آسمانی ہماری محدودی کی حد مقرر کرنے کے لئے ایک صحیح معیار ہے جس سے ہمیں کسی طرح گریز نہیں۔

وحی آسمانی ہمیں اس باب میں کیا تعلیم دیتی ہے ناظرین آپ خوب جانتے ہیں کہ صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیں صحیح مظاہر

موجودات میں آراؤانہ غور و پروا دت کر کے نتائج صحیحہ اخذ کرنے کی تعلیم دیتی ہے اور اگر ہمارے لئے

لئے تعلیم کر دیا گیا ہے کہ مخاطب ضرورت وحی کا اتوار کر لیتا ہے جس پر آئندہ بحث ہوگی۔

محققین اس تعلیم کی طرف متوجہ ہوں تو وہ یقیناً دوسری تحقیقات سے دستبردار ہو جائیں۔ مگر انہیں کہ انہیں ان اصول و قیوں کی کچھ قدر نہیں کیا ہم اہل اسلام کیلئے کچھ کم فخر کی بات ہے کہ ہم ایک ایسی جامع اور مکمل کتاب کے مالک ہیں جس کی نظیر دنیائے زمین کی تمام اقوام میں ناپید ہے۔

یہ واقعی سچ ہے کہ وحی آسمانی ہیں حقائق موجودات کی طرف بڑے زور سے متوجہ کرتی ہے اور اس امر پر اہل ہے کہ خداوند کریم نے ہماری فطرت میں تحقیق حقائق کی قابلیت و ولایت رکھی ہے۔ مگر وہی وحی آسمانی ہیں یہ بھی بتلاتی ہے کہ وما اوتینا من العلم الا قلیل (تم بہت تھوڑا علم دیئے گئے ہو) اس سے معلوم ہوا کہ گو ہم تحقیق حقائق کے میدان میں کسی حد تک ترقی کر جائیں۔ مگر ہم بھی ہمارا علم اضافی ہے جس کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس بات میں لفظ العلم سے علم حقائق موجودات یا علم معرفت ذات باری مراد ہے غور کرنے سے معلوم ہو گا۔ کہ جس علم کا حصول نوع الثانی کے لئے ممکن ہے۔ اس کی طرف ہیں متوجہ بھی کیا گیا ہے اور جن امور کی قابلیت ہماری فطرت میں ولایت نہیں رکھی گئی ان سے ہمیں قطعاً روک دیا گیا ہے۔ مثلاً ذات و صفات باری عز اسمہ میں ہیں ہدایت کی گئی ہے جو کچھ شارع علیہ السلام سے بہکاوہ نہ چکا ہے اس کے لئے تیار نہ کریں اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرے گا تو یقیناً گمراہ ہو گا۔ معتزلہ اور نچر یہ لئے اس حکم کو توڑنا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے صفات کی نفی کر دی کسی نے تقدیر کا انکار کر دیا کوئی حیر کا قائل ہوا کوئی خدا کو محفل سمجھنے لگا کسی نے خدا کیلئے انسان کی طرح اعضاء وغیرہ تجویز کئے علی ہذا القیاس جن لوگوں نے اپنی عقل کو بے عمل استعمال کرنا شروع کیا وہ گمراہ ہو کر جہنم کا ایندھن بن گئے۔ اور طرفہ یہ کہ یہ شیاطین الانس اپنی جگہ سمجھتے رہے کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں وہی حق ہے۔ اور یہ نہ سمجھے کہ شیطان نے ان کو دھوکا دے رکھا ہے اور وہ مصداق ہیں اِیَّہِ الْکُفْرُ بِقَبِیْعَةِ یَحْسِبُہُ الطَّمَانُ مَا حَتَّى اِذَا جَاہِلٌ مَّجِیْدٌ شَیْءٌ کہ حدیث کے یہ الفاظ ہیں: ثَلَاثٌ یُبْرِحُ النَّاسُ بَیْنَمَا لَوْ حَتَّى یَقُولُوا اِهْذَا اللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَهَنْ خَلَقَ عَزَّ وَجَلَّ (بخاری) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ ایسی باتوں میں دخل دینے لگتے جن کی قابلیت

لے جمل کے سراب کی طرح جسکو پیسا آدمی دوسرے پانی خیال کرتا ہے اور جب اس کے نزدیک آتا ہے تو کچھ بھی نہیں پاتا۔
۱۲۔ منہ ہ لوگ ہمیشہ ایک دفعہ سے سوال کر لیتے تا آنکہ وہ یوں کہنے لگے کہ یہ ب کچھ تو اللہ نے پیدا کیا جلا اللہ کو کس نے پیدا کیا۔ ۱۲۔ منہ ہ

ان کی فطرت میں نہیں کمی گئی۔ اب غور کر کے دیکھ لو کہ اس فرمانِ نبوی کو جو حکمِ نبی پر مشتمل ہے سب سے پہلے اہل فلسفہ نے توڑا جنہوں نے اپنی اٹھ کے مطابق صفاتِ باری میں بحث شروع کی اور قرآن مجید کی آیات کو ان کے غیر معنوں پر محمول کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملائکہ اہلسی معجزہ جنت و نار وغیرہ امور کا یا توصفات انکار کر دیا یا کسی غلط صورت میں ان کی تاویل کی انہیں اہل فلسفہ کے قائم مقام پیچیدہ طالعہ میں جن کا کوئی خاص طریق اسلام میں معین نہیں جبکہ وہ محض اپنی عقل ناقصہ پر چلنا اپنا فخر سمجھتے ہیں اور علمائے اہل سنت کو برا بھلا کہتے ہیں الخرض تعلیم وحی میں بتلاتی ہے کہ ہم بدون کتاب اللہ اور سنت شارع علیہ السلام کے ایک قدم بھی اٹھائیں خواہ مستحقات میں ہو خواہ علیات میں اور آیہ ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم کی دعید کہتے ہیں۔ قرآن مجید نے ایسا علوم و فنون کی عام اجازت دی ہے کیونکہ یہ باتیں تفکرِ صحیح اور تجربہ اور مشاہدہ کا نتیجہ ہیں مگر دوبارہ امورِ بشریت میں محدود کر دیا ہے اسلئے ہم کتاب اللہ و سنت سے ایک آن بھی علیحدہ نہ کر مسلمان نہیں رہ سکتے۔

عقل جزئی کے محدود ہونے کی مثال اس میں بھی موجود ہے یہ امر کہ عقل جزئی کا عمل محدود ہے اس امر پر غور کر لینے

واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بدون استعانت جو اس کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتی اور یہ مسئلہ ہے کہ جو اس کا عمل بالکل محدود ہے دیکھو کہ ہر ایک حل اپنی ذاتی طاقت سے زیادہ ہمیں کچھ کام نہیں دے سکتی مثلاً اگر قوتِ باصرہ کو آفتاب کے جرم پر پانچ سات سنٹ تک متوازن کیا جائے۔ تو بعد میں ایک قسم کی تیرگی اور تاریکی آنکھوں کے سامنے پھیل جائیگی جس سے معمولی اشیاء بھی نظر نہ آسکیں گی۔ اسی طرح قوتِ سامعہ کا حال ہے کہ اگر کوئی مہیب اور نہایت سخت ہائل آواز کانوں تک پہنچ جائے تو کچھ دیر تک اس کی گونج کانوں میں محسوس ہوتی رہتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات بعض موتیں بھی واقعہ ہو جاتی ہیں اس کی وجہ بدون اس کے

لے نیا چہ کا قاعدہ ہے کہ احادیث و خالفت کا توصاف انکار کر دیتے ہیں اور آیات قرآنیہ کو خلاف اصول توڑ کر دیتے ہیں جبکہ مطلب یہ ہے کہ بالواسطہ منکر قرآن میں بلکہ عقل جزئی سے مراد ہے شخصی عقل جو ہر ایک فرد بشر کو حسب استعداد دے گئی ہے اور وہ بدون مدد جو اس کے کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکتی۔ برخلاف عقل کلی کے کہ وہ جاس ملاہری کی محتاج نہیں کیونکہ وہ مخالف غیر باطنی کا ادراک کرتی ہے جسے استعمال جو اس کی ضرورت نہیں پڑتی اور یہ عقل انبیاء علیہم السلام اور دیگر کاملین کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔ ۱۲۰ منہ

اور کیا ہو سکتی ہے کہ علم جس محدود عمل کا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ جب غیر معمولی بوجھ ان پر ڈالا گیا تو وہ ناکارہ ہو گئے پس عقل جزئی سے اگر کوئی شخص ایسے حقائق کا ادراک کرنا چاہے گا جو مادیات سے بالاتر ہیں تو اس کا نتیجہ حیران کن ہو گا کہ اس کی عقل بالکل ناکارہ ہو جائے اور صحیح عمل سے رک جائے پس جن لوگوں نے امور مافوق المادیات کو اپنی عقل جزئی پر پرکھنا چاہا ہے انہیں سوائے ضلالت اور انکار کے کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ یاد رکھو کہ جن لوگوں نے ملائکہ ایلیس وغیرہ امور کا انکار کیا ہے اسکی وجہ یہی تھی کہ مخالف عقل و مافوق العقل

ناظرین اس امر کو نظر انداز نہ کریں کہ اکثر محدثین نے الفاظ مخالف عقل اور مافوق العقل میں تمیز نہیں کی کیونکہ یہ تو مسلم ہے کہ ملائکہ۔

معجزہ ایلیس وغیرہ حقائق عقل جزئی کے عمل سے بالاتر ہیں۔ اور اسی لئے ہم انکو لفظ مافوق عقل سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر تسلیم نہیں کرتے کہ وہ مخالف عقل ہیں۔ کیونکہ لفظ مخالف عقل میں اس امر کا مفہوم بھی داخل ہے کہ بذریعہ اصول نظر و استدلال جو تجربہ و مشاہدہ سے قائم کئے گئے ہیں کوئی امر زیر بحث ناممکن ثابت ہوا مگر ہم تو سرے سے ہی اس امر کا اصول تجربہ و مشاہدہ پر جانچنا ہی تسلیم نہیں کرتے پھر ناممکن کیا۔ مخالف عقل ہونا تو بت لازم آتا ہے امر زیر بحث اصول تجربہ و مشاہدہ کی ذیل میں نہیں آ سکتا و ایلیس فلیس ہاں عقل کلی کے رُف سے جو صرف ایسے امور کا ادراک کرتی ہے جو مادی کائنات سے بالاتر ہیں مذکورہ بالا امور بالکل ثابت شدہ حقائق اور عقل کلی کی ضرورت اور اس کی وسعت عمل سے انکار کرنا سراسر جہالت اور ناواقفیت ہے کیونکہ ایسا منکر کمالات روحانی اور کمالات مادی ہیں کچھ تمیز نہیں کرتا۔ اور اگر یہی بات ہوتی تو جو جس گدھے بل کوئے کو حامل ہوتی ہے وہی حضرت انسان کو تو چاہئے تھا کہ گدھا اور بیل بھی عارف ربانی بنتے ہوتے پس یاد رکھو کہ نیا چہرہ جن اکثر اشیاء شرعیہ کا انکار کرتے ہیں وہ مافوق عقل ہیں نہ مخالف عقل۔

حکیم ابوعلی مسکویہ المتوفی ۷۲۱ھ کی رائے | حکیم ابوعلی مسکویہ اسلامی حکیم فلسفہ شریعت پر غور کر کے حسب ذیل کہتا ہے:-

وهذه المواضع الغامضة التي هي غير معادة لاكتو الناس حي او اخر الحكمة

ولیس تحقیقہا العامة لانہم انہا یعرفون الحس وما یلزمہ عن الوحدۃ کل ما یحصل
لہم من هذا الوجه لم یلقوا الیہ وظنوا باطلا لا نہم لا یرونہا اذ كانت العین
التي تبصر بہا هذه الاشياء لیست موجودة وبینہم وسین الحقائق بحجب کشفہ من
الحواس والحقائق لبعید ونہا خرافات وارباب البصائر رحمہم کما یرحمون العمیان۔

(ترجمہ) یہ دو تین مقامات جو اکثر لوگوں کیلئے غیر معمولی ہیں حکمت الہیہ کے آخری رموز ہیں اور عام لوگوں
کے نزدیک ثابت نہیں کیونکہ وہ مادی محسوسات اور اسکے متعلقہ امور مثلاً قوت و اہمہ کے درکات کے سوا کچھ
نہیں جانتے سوائے انہیں چونکہ غیر مادی امور کے ادراک کی استعداد نہیں ہوتی اس لئے وہ ان کی طرف متوجہ
نہیں ہوتے بلکہ ان امور کو باطل سمجھتے ہیں ویراسکی یہ ہے کہ انہیں وہ آنکھیں نہیں ملی جس سے ان اشیا کو دیکھا جاتا
ہے اور ان حقائق کے درمیان حواس ظاہری کا پردہ حائل ہوتا ہے۔ اور وہ ان حقائق کو خرافات خیال کرتے
ہیں اور ارباب بصائر (انبیاء اولیاء) ان لوگوں کو اندھے سمجھ کر ان کو قابلِ رحم جانتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔

ولذلک لا تزال تسمع من لا طبقۃ لہ فی هذا العلم اذا شیء الیہم شیء

من المأكولات المحرمة التي لیست فی مراد لبقولہن هذه صفت المعدم وهذا

شیء وهذا غیر موجود کخری فی انه غیر موجود فی الحواس التي یطلبونہ فیہا و لکنہ

موجود حق الوجود و لیس ہو لا ذوی البصار اذ قد صدقہ و اما بہ یروی الموجود

حقا سوانہ یشغی أن یتعطف علیہم بالرحمة کما یتعطف علی لاکمہ.... الخ

(ترجمہ) اور یہی وجہ ہے کہ تو ہمیشہ ان لوگوں سے جنہیں اس علم میں کچھ فعل نہیں جب ان کے پاس غیر مادی
اشیا کی نسبت کچھ ذکر کیا جاتا ہے یہ سنیا کہ یہ باتیں تو محض فرضی ہیں جنکا کچھ وجود نہیں اور مجھے اپنی جان
کی قسم ہے کہ وہ ان کے حواس میں جن سے وہ انہیں ادراک کرنا چاہتے ہیں واقعی معدوم ہیں مگر فی حداثہ
وہ موجود مستقل بالذات ہیں اور یہ بیچاے بے بصیرتی کی وجہ سے انکا انکار کرتے ہیں۔

ناظرین اس امر کو نظر انداز نہ کریں
نیا چہرہ ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتے چلے آئے ہیں
کہ انبیاء علیہم السلام کی مخالفت

کرنے والے عموماً وہی لوگ تھے۔ اور اب بھی وہی ہیں جنہیں عالم ہادی کے سلسلہ اسباب کی طرف زیادہ مصروفیت کا موقع ملا ہے اور خواص اشیاء اور رابطہ علمی کی تحقیق میں عمر کھودی اور حقائق غیر مادیہ کو بوجہ بے بصیرتی کے محض افسانہ باطل اور اپنے مسلمہ اصول تجربہ اور مشاہدہ پر اسباب کو علت موثرہ سمجھتے رہے یعنی وہ اس مرکز سے ابھر کر ہر حرکت نہ کر سکے کہ اسباب موجودہ ہی پر سلسلہ انتظام کائنات چل رہا ہے اور یہ کہ خداوند تعالیٰ جس لامتناہی مشیت و قدرت کی تہ تک انسانی فطرت ہرگز نہیں پہنچ سکتی وہ صرف اپنی چند قوانین کا پابند ہے جن کا آج تک انسانی دنیا میں مشاہدہ ہو چکا ہے اور ان قوانین کے علاوہ قدرت خداوندی کسی امر پر جاوی نہیں چنانچہ یہ سب خیالات باطلہ ان محدین کی تحریرات میں جا بجا موجود ہیں انہیں خیالات پرودہ تمام ان حقائق کا انکار کر دیا کرتے ہیں جو بذریعہ وحی ناطق ہم تک پہنچ چکی ہیں۔ گویا یہ لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ قدرت ذات باری کو اپنی ناقص عقول کے دائرے میں محدود کر لیں مگر ان کم عقلوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی تمام عمر علت و معلول کی بکواس میں بسر ہو گئی مگر یہ متہم پھر بھی نہ کھلا کہ وہ خود کیا ہیں۔

تو بر اوج فلک چہ دانی چیت - چوں ندانی کہ دیر سرائے تو کیست

کیا کوئی بدعتیہ فخری آج تک صاحب مقام و یکھایا سا گیلیا ہے۔ حاشا و کلام اس کی وجہ بجز اسکے کچھ نہیں کہ یہ لوگ خدا کے تابع فرمان نہیں ہوتے بلکہ اپنی روش سے خدا کو اپنا تابع کرنا چاہتے ہیں۔

سلسلہ اسباب ہادی کو علت موثرہ سمجھنے کا خیال انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے سخت مخالف ہے کیونکہ ان کی تعلیم توحید الہی ہوتی ہے جو سلسلہ اسباب کی علت کے نقش کو دل پر سے محو کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور طے یہ کہ یہ لوگ اپنی جگہ دعویٰ توحید بھی جتاتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے جسے اپنے تئیں ایک قانون کا پابند کر لیا ہے اس کے برخلاف نہیں کر سکتا بھلا کوئی ایسے یادہ گو سے یہ تو دریافت کرے کہ عدو اللہ وعدو الرسول خدا نے کب تجھ سے یہ راز کھمڈیا تھا جس کی خبر نہ تو اسنے

سلسلہ کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ ہم سلسلہ اسباب کی ضرورت کا انکار کر رہے ہیں۔ کیونکہ ایک ایسی واضح ضرورت کا کوئی شخص منکر نہیں یہاں صرف یہ مقصود ہے کہ سلسلہ اسباب ہادی کے علاوہ ایک سلسلہ اسباب ردحالی بھی ہے۔ جس کی حقیقت سے انبیاء علیہم السلام اور دیگر مقربین بارگاہ آگاہ ہوتے ہیں +

اپنی کتاب پاک میں دی اور نہ اسکے رسول مقبول نے کہیں اسکا پتہ دیا۔ یہ کلمہ جناب یاسی میں ایسی گستاخی ہے جس کی تطہیریں کبوت کلمہ تخریم من افواہہم^{۱۵}۔ اے نادان خدا بیشک اپنی حکمت کاملہ سے ہر ایک امر کی نہ کسی قاعدہ مصلحت پر مبنی کیا کرتا ہے گفتگو تو یہ ہے کہ آیا تو نے اس کی لائق ہی حکمت کا حصر کر لیا ہے جس سے تجھے ایسا یحیٰ بن کامل ہو گیا۔ قرآن مجید تو صاف کہتا ہے۔ ما اشدھم نقم خلق السموات والارض من لا خلق النفسہم^{۱۶}۔ کچھ شک نہیں کہ تیری یہ بکواس محض ظن کا زب ہے۔ وان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً^{۱۷}۔

نیچریت اور اقوامی کا اصلی سبب ہے | یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صرف سلسلہ اسباب کو علت موثرہ^{۱۸} سمجھنا ہی ہمیشہ قوموں کے ادوار و تسنل کا موجب ہے ا

ہے اور ہر ایک زمانہ میں اپنی نیچریوں نے دنیا میں ہر ایک قسم کی بدعیانیت اور بے ایمانی کو رواج دیا ہے کیونکہ اس اعتقاد سے آہستہ آہستہ ترقی کر کے قومیں مشرک بنی گئیں اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے منہ پھیر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیرت الہی نے ان کو دنیا سے بے نام و نشان کر دیا۔ قرآن مجید کی تعلیم میں یاد کرو کہ انہی پابندی اسباب پر مختلف اقوام انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کرتی رہیں اصدہ نہیں توحید کی طرف کھینچتے رہے یاد رکھو کہ خدا کی نصرت انہیں لوگوں کے شامل حال ہوا کرتی ہے جو اس کی توحید کو خالص کرتے ہیں اور جبکی نظروں سے ماسوی اللہ کی اٹھ گیا، تو باقی تمام مظاہر موجودات میں اودہ اتلی کو بلا واسطہ موثر دیکھ رہے ہوتے ہیں اگر میں شبہ ہوتا تو پھر لو کہتا اللہ لا غلبہ انا ورسلی اور بغلاف اسکے جب غیر اللہ کو موثر سمجھ کر خدا کو محفل کر دیا جاتا ہے تو اس وقت تک لوگ باطل صریح شرک اتر آتے ہیں نہ حجت پوری نہیں کی جاتی۔ مگر حیثیت کو پہنچ جاتے ہیں تو اللہ تبارک تعالیٰ اپنی عادت قدیمہ کے مطابق انہیں دولت اور پستی کے گہنہ میں جھونک دیتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اسباب پرستی سے بڑھ کر کوئی امر منہائے دین نہیں کیونکہ وہ حقیقت شرک کی

۱۵ چھوٹا منہ جڑی بات۔ ۱۶ میں نے انہیں تو زمین آسمان پیدا کرتے وقت حاضر کر لیا تھا۔ اور نہ خود انہیں پیدا کرتے وقت ۱۷ ظن حق کے لئے کچھ مفید نہیں ہوتا ۱۸ اسباب کو علت موثرہ سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یقین رکھا جائے کہ بدن معینہ اسباب کے خدا کچھ نہیں کر سکتا یا یہ کر سکتا ہے یا یہ کر سکتا ہے مگر کرتا نہیں۔ ۱۲۔ ۱۱۔ ۱۰۔ ۹۔ ۸۔ ۷۔ ۶۔ ۵۔ ۴۔ ۳۔ ۲۔ ۱۔ ۰۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳

بنیادیں سے قائم ہو جاتی ہے۔ بالآخر یہ کھنابلے محل نہ ہوگا کہ اہل اسلام کے تنزل کی اہلی وجہ
بہی نہ چیریت ہے یعنی سلسلہ اسباب کو علت مؤثرہ سمجھنا۔

علت و سبب میں امتیاز

ہیچریت اور وہریت ہر دو کی بناء اس باطل خیال پر قائم کی گئی ہے کہ اشیائے اپنے
طبعی خواص کے رُو سے مؤثر ہیں۔ عوام الناس کے کلام میں اگر اس خیال کی صداقت تسلیم کر لی
جائے تو کچھ حرج نہیں لیکن ایک مستبصر محقق کی میزان تحقیق میں اس خیال کا کوئی وزن نہیں کیونکہ
علت کا مفہوم جو فنِ عقلیات کے دلدادہ اصحاب تجویز کیا کرتے ہیں یہ ہے کہ ایک شے دوسری
شے کو عدم سے وجود میں لاتی ہے مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کوئی شے عالم کائنات میں جو مخلوقیت
کا لباس پہن چکی ہے فی الحقیقت علت نہیں کہلا سکتی بلکہ ایک واقعہ کے بعد جب دوسرا واقعہ ہمیشہ
ضروری طور پر وقوع میں آتا ہے تو ہم پہلے واقعہ کو دوسرے واقعہ کا سبب قرار دے سکتے ہیں
نہ علت یعنی پہلا واقعہ ایک ایسا واسطہ ہے جس کی وساطت سے مشیت الہیہ یا ارادہ انہی دوسرے
واقعہ کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اس لئے صحیح طور پر ارادہ انہی ہی ہر ایک واقعہ کی علت ہے
اور تمام اشیائے کائنات سلسلہ سبب و مسبب میں وابستہ ہیں۔ عام لوگ پہلے واقعہ کے بعد
دوسرے واقعہ کو وقوع میں آتے دیکھ کر ان میں علت و معلول کا ربط قائم کر دیا کرتے ہیں
مگر یہ سراسر غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ میں سبب کا لفظ تو مستعمل ہوا ہے مگر علت کا
لفظ استعمال میں نہیں لایا گیا۔ حدیث نبوی میں ایک دُعا کے یہ الفاظ ہمارے اس دعویٰ
کی تصدیق کے لئے کافی حجت ہیں حیرت قال علیہ السلام :-

”اللھم ما اصبحت لی من نعمۃ اوبک من خلقت فمنت فمنت وحدک“

لا شریک لک فلاک الحمد ولک الشکر۔“

خط کشیدہ الفاظ کے مفہوم میں غور کرو جن سے صاف طور پر عیاں ہے کہ تیری

مشیئتِ اتری ہی کے واسطے سے ہر ایک نعمت بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ کوئی مخلوق بذاتہ کسی قسم کی نعمت کے لئے علت نہیں ہو سکتا کیونکہ ایسا اعتقاد شرک محض ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر ایک مخلوق محتاج ہے کیونکہ جس کو فنا احاطہ کئے ہوئے ہے اور احتیاج اور فنا دو ایسے امر ہیں جو کسی چیز کو دوسری چیز کی علت ہونے سے مانع ہیں۔ کتاب اللہ کے الفاظ ”خالق کل شیئ“ اور ”کل شیئ ہالک لاجہ“ اہل بصیرت کے لئے کافی تحت ہیں۔

اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ ماسوی اللہ مخلوق ہے اور کوئی مخلوق بوجہ احتیاج و فنا علت کمالانے کا متحق نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارے اس اصل عظیم کی صحت کا اقرار کر لیا جائے (اور اقرار کئے بغیر چارہ بھی نہیں) تو بہت سی اُن مشکلات کا حل ہو جاتا ہے جو عقلیات کے دلدادگان کو گاہ بیگاہ پیش آیا کرتی ہیں۔ بالخصوص خرق عادات کا مسئلہ نہایت آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات میں اس کے متعلق ہم کچھ لکھ آئے ہیں۔



باب دوم

صانع عالم کا اثبات

یہ امر صاف اور واضح ہے کہ شروع آفرینش سے آج تک تمام انبیاء علیہم السلام اور حکماء اور عقلاء صانع عالم کے وجود کو تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اور اپنے اپنے طریق پر اس دعویٰ کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صانع عالم کے ثبات وجود میں کسی طویل و دقیق سلسلہ دلائل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں اور اسی خیال پر اکثر حکماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ صانع عالم کا وجود تمام اشیائے کائنات کے وجود سے زیادہ واضح۔ زیادہ ظاہر اور زیادہ صاف ہے چنانچہ قرآن مجید نے اس امر کی طرف آیہ ”انی اللہ شاک فاطر السموات والارض“ میں اشارہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اور تو اور کیا اللہ تعالیٰ کے وجود میں بھی کسی قسم کا شک ہو سکتا ہے جو زمین اور آسمان کا پیدا کرنے والا ہے؟ مگر اکثر کوتاہ فہم لوگ غلط استدلال کی وجہ سے شکوک اور دساوس کے دلدل میں پھنس کر صانع عالم کے وجود کا انکار کر دیا کرتے ہیں اور اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان دو اہم اصول کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اول یہ کہ ہر ایک واقعہ یا حادثہ کے لئے کسی نہ کسی علت کا وجود ضروری ہے۔ دوم یہ کہ طبیعت اشیاء بالاستقلال مؤثر ہے حالانکہ طبیعت اشیاء بجائے خود معلول ہے۔ اگر ان ہر دو اصول کی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو وجود صانع کے اثبات میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔

سلسلہ کائنات جو اشیائے ارضی و سماوی پر مشتمل ہے ایک ایسا واقعہ ہے جس کی صلیبت وجود سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر وجود پذیر ہوا؟ اس سلسلہ

کائنات میں ہم مختلف قسم کے افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں یا یوں کہو کہ مختلف قسم کے تغیرات اظہار کا ایک غیر متبدل سلسلہ ہر ایک آن میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ انہیں تغیرات و انقلابات کو ہم نے افعال کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور افعال نتیجہ ہیں صفات کا۔ اس لیے ضروری ہے کہ فعل کا فاعل اس صفت سے منصف ہو جس صفت کا نتیجہ کسی فعل کا ظہور قرار پاتا ہے۔ مثلاً زید جب تک وصف کتابت سے منصف نہ تسلیم کیا جائے اس سے فعل کتابت ہرگز صادر نہیں ہو سکتا۔ یا مٹا رہے جب تک وہ فن تعمیر کا ماہر نہ ہو کسی بڑی یا چھوٹی عمارت کا کھڑا کروکھانا متصور نہیں۔ علیٰ ہذا ہر ایک فعل کسی صفت کا نتیجہ اور صفت کسی نہ کسی موصوف کی ذات سے قائم ہوتی ہے۔ وصف کتابت بغیر وجود کتاب کے اور وصف طبابت بغیر طبیب کے بجائے خود کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ کتابت اور طبابت ایسے امور ہیں جو کتاب اور طبیب کے وجود کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ عالم کائنات میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک مستقل سلسلہ کون و فساد لگاتار جاری ہے یا یوں کہو کہ اشیائے عالم نبتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اس بننے اور بگڑنے کو ہم صنعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور صنعت ایک فعل ہے جس کا وجود بحرِ صانع کے نامکن ہے۔ دلیل کا حاصل یہ ہے کہ عالم مختلف مصنوعات پر مشتمل ہے اور ان تمام مصنوعات کے لئے کسی صانع کی ضرورت ہے جسے ہم صانعِ عالم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حکماً اور انبیاء علیہم السلام کا اتفاق وجودِ صانع پر

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ وجودِ صانع اور اس کے صفاتِ کاملہ کے اثبات پر ہمیشہ تمام حکماً اور انبیاء کا اتفاق رہا ہے کیونکہ ہر ایک نے ان میں توحید اور ریاست و اخلاق کی ضرورت کے متعلق ہر وہ فرقہ اپنے اپنے طریق کے مطابق اہل عالم کو تلقین کرتے چلے آئے ہیں البتہ ہر وہ کے مابین جہاد ہیں مگر نتیجہ میں ہر دو متفق ہیں۔ حکماً عالمِ مادیات میں غور و خوض کر کے برہان و استدلال سے کام لیتے رہے ہیں جن کی بناءً اصولِ تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی

تعلیم کا مآخذ وحی الہی ہے۔ جو ہر ایک قسم کے شک شبہ کی آمیزش سے پاک اور صاف ہوتی ہے۔
 برہان استدلال کے عمل میں ممکن ہے کہ کسی قسم کی غلطی واقع ہو جائے کیونکہ تجربہ اور مشاہدہ بیرونی حواس
 کا کام ہے جن کے ادراکات ہر حالت میں قطعی نہیں ہو سکتے مگر تعلیم وحی میں اس قسم کے احتمالات کا ہرگز
 امکان نہیں۔ استدلال و آیات سے معانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور وحی معانی سے مادیات کی طرف
 اس کی مثال ان دو مضمونوں کی سی ہے جن میں سے ایک تو کسی سطح پر نیچے سے اُپر کو اُٹے اور دوسرا
 سطح سے اتر کر نیچے کو اُٹے۔ ظاہر ہے کہ ہر دو ایک ہی فاصلہ طے کر نیچے گریں گے اور اُپر کو جانے
 میں جو تکلیف پیش آتی ہے وہ اُپر سے نیچے کی طرف آنے میں نہیں آتی۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں
 جو سہولت اور آسانی رکھی گئی ہے وہ حکماء کی تعلیم میں نہیں پائی جاتی۔ انبیاء کے طریق تعلیم سے جاہل
 سے حکیم تک سب یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں گو جاہل کا علم نتیجہ معینہ کے متعلق زیادہ مفصل
 نہیں ہوتا اور حکیم کا علم عاتق فیصلی ہوتا ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے ایک شخص جو فن طبابت
 سے بالکل بے بہرہ ہے اور ایک طبیب باہر جو اصول طب سے پوری طرح آگاہ ہے۔ غذا ہر دو کے
 معدہ میں یکساں طور پر ہضم قبول کرتی ہے اور اس کے نتیجہ سے دونوں یکساں طور پر مستفید ہوتے ہیں۔
 مگر اصول طب سے ناواقف تو کیفیت ہضم غذا اور اس کے مختلف اجزاء میں مقسم ہونے کے علم سے بالکل
 بے خبر ہے مگر طبیب باہر اس کی کیفیت ہضم کی تفصیل سے پورے طور پر آگاہ ہے۔ برخلاف اس کے
 حکماء کے طریق استدلال سے عالمہ ناس مستفید نہیں ہو سکتے بلکہ بسا اوقات وسوسوں اور شکوک کے دلدل
 میں پھنس جاتے ہیں۔ مح ہذا انبیاء علیہم السلام کی تعلیم چونکہ علمی ریاضات پر مشتمل ہوتی ہے اس لئے اس کا
 نتیجہ طالب ہدایت کے حق میں بہت جلد مترتب ہو جاتا ہے اور یہ بات حکماء کے طریق استدلال
 میں عموماً نہیں پائی جاتی *

حدوثِ عالم پر مزید بحث

قبل اس کے کہ ہم حدوثِ عالم کے منکرین کے خیال کو باطل ثابت کریں مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ ان کے مذہب اپنی قدامت عالم کو مفصل قلمبند کیا جائے۔

جو لوگ عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہیں ان کا خیال ہے کہ تمام اشیائے ارضی و سماوی کی اصل صرف دو امر ہیں۔ مادہ اور اس کی قوت یا حرکت۔ اور یہ دونوں قدیم ہیں جو ایک دوسرے کے بغیر وجود نہیں ہو سکتے۔ مادہ سے مراد ایسے ذرات متناہ غیر متصلہ ہیں جو ایک لامتناہی خلا میں پھیلے ہوئے ہیں اور قوت سے مراد مذکورہ بالا اجزاء کی حرکات ہیں اور یہ حرکت خود انہیں اجزاء کی ذات سے پیدا ہوئی اور اس حرکت کی وجہ سے مادہ نے مختلف اجسام ارضی و سماوی کی صورت اختیار کر لی۔ اور یہ عمل کشش کھربانی کے مطابق پورا ہوا۔ کشش کھربانی سے اجزاء نے ایک کرہ کی صورت اختیار کر لی جو اپنے محور پر حرکت کرنے لگا اور بعض دیگر قوانین کے عمل سے اس کرہ میں اشتعال پیدا ہوا جس پر وہ کرہ سورج کی شکل میں منتقل ہو گیا۔ اور سورج کے دوران سے دیگر سیارات اس کے چرم سے ہوتے چلے گئے جو کرہ کی صورت میں اپنے اپنے محوروں پر گردش کرنے لگے۔ مجملہ ان کے ایک سیارہ وہ کرہ ہے جس کو ہم زمین کہتے ہیں اور جس پر نوع انسان آباد ہے۔ یہ کرہ ایک طویل زمانہ تک گردش کرتا رہا اور تدریج اپنی بیرونی سطح سے سرد ہوتا چلا گیا اور طبقات کی صورت اختیار کر لی اور اجزاء مادہ میں حرکات مختلفہ سے خام و خاص کیفیات ظاہر ہوئیں جن سے مختلف قسم کے اجسام معدنی۔ حیوانی۔ نباتی متولد ہوئے اور علم طبقات الارض کے جدید اکتشافات سے یہ امر واضح ہو گیا کہ سب سے اخیر طبقہ زمین حیوانات اور نباتات کے آثار سے خالی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کرہ زمین پر ایک ایسا زمانہ بھی گذر چکا ہے جبکہ اس میں اجسام حیوانی کی قسم کی کوئی چیز موجود تھی مگر عمل کیمیادی کے بعد کی بحث اور اکتشاف سے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ بذریعہ حرکات اجزاء مادہ میں ایک اجتماعی صورت پیدا ہو گئی اور ان سے عناصر وجود پذیر ہوئے جو ساٹھ سے زیادہ کی تعداد تک پہنچ چکے ہیں اور ان اجزاء سے مادہ میں ایک نسبت مخصوصہ کے ساتھ امترج پیدا ہوا جس سے معدنیات اور حیوانات وجود پذیر ہوئے۔ اور یہی مادہ مختلف صورتوں میں ترکیب پاکر اجسام عضویہ کی شکل میں ظاہر ہوا جو حیوانات اور نباتات کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس لئے حیات (زندگی) انہیں عناصر کے فعل و انفعالات

اور کیمیاوی امتزاج کے آئندہ سے ایک ظہورِ اثر کا نام ہے اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں کو جس خیال
 کیا گیا ہے جم سے کوئی تعلق نہیں رکھتی پھر ان اجسامِ حیوانیہ اور نباتیہ سے سلسلہ تو الدجاری ہوا۔ یہ سلسلہ
 چار قانونِ طبعی کے ماتحت جاری ہے اول قانونِ تباہی انفرادی کے دوسرے ہر ایک فرد ایک دوسرے
 سے متاثر ہوتا ہے مثلاً ایک تدکر ہے تو دوسرا مومت۔ دوسرا قانونِ انتقالِ تباہی جس کے
 دوسرے افراد میں قوی اور ضعیف اور دیگر عوارض خارجیہ کا ظہور ہوا۔ سیم قانونِ تنازع البقائین الافراد۔
 جس کے دوسرے قوی ضعیف پر غالب اگر ضعیف کو ہلاک کر دیتا ہے۔ چہارم قانونِ انتخابِ طبعی جس کے
 دوسرے طبیعتِ افراد میں اور اکمل کی حفاظت کرتی ہے۔ یہ قوانین اربعہ لاکھوں صدیوں تک اپنا
 عمل کرتے رہے اور اجڑائے مادہ کی اضطراری حرکت کی ذیل میں اس موجودہ حالت تک پہنچ گئے مگر
 انسان بھی انہیں افرادِ حیوانیہ میں سے ایک فرد ہے جو انتخابِ طبعی کے قانون کے مطابق ترقی کرتے کرتے
 موجودہ حالت تک پہنچ گیا ہے اور چونکہ اسے بندر کے ساتھ ایک گونہ مشابہت ہے اس لئے ہم کہہ سکتے
 ہیں کہ انسان اور بندر کی اصل ایک ہی ہے مگر انسان نے بندر پر ترقی کرتے کرتے فوقیت حاصل
 کر لی۔ اور وہ تمام انواعِ حیوانات میں سے سب سے آخری حیوان ہے جو لاکھوں صدیوں سے ترقی
 کرتے کرتے اس صورت میں نمودار ہوا ہے اور بے شمار انواعِ حیوانات اس کے اس حد تک پہنچنے
 سے پہلے موجود ہو چکے ہیں اور اس کی عقل اور اوراک مادہ کے اجڑائے متحرک کے نخل و انفعال
 کا نتیجہ ہے گو اصل مادہ اور حرکت کے اندر عقل اور اوراک موجود نہ تھے۔ علاوہ انہیں اس کی عقل دیگر
 حیوانات کی عقل سے فی نفسہ مخالفت نہیں۔ ہاں کمی بیشی کا فرق ضرور ہے۔ رہا شریعتِ اسلام کے
 دیگر مسائل کا قضیہ مثلاً انسان کامرنے کے بعد پھر زندہ ہونا اور بہشت و دوزخ اور وجودِ ملائکہ
 اور جن اور آسمان اور عرش اور کرسی اور لوح و قلم وغیر ذلک سوال کے متعلق ہمارے علومِ عقلیہ
 کے میزان میں کوئی وقت نہیں اور نہ ان کے متعلق کوئی قطعی دلیل پائی گئی ہے اس لئے ہم اہل طبعیات
 ان کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان عقائد میں اکثر ایسے ہیں جو قانونِ طبعی کے دوسرے نامکمل تسلیم کئے گئے
 ہیں اور ہم اہل طبعیات کے جمہور کی یہ آخری رائے ہے۔

یہ تقریر حدودِ عالم کے منکرین اور صالح عالم کے وجود کو ضروری نہ سمجھنے والوں کے مذہب کا خلاصہ ہے ہم بفضلہ تعالیٰ اس کو باطل ثابت کرتے ہیں۔ قاری کو چاہئے کہ وہ نہایت غور اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کرے :-

مذکورہ بالا مذہب کی بنیاد اس امر پر قائم کی گئی ہے کہ مادہ عالم قدیم ہے اس لئے اُسے کسی صالح یا خالق کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ منکرینِ ارضی و سماوی انقلابات اور تخریرات کا مشاہدہ کرتے ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان تخریرات و انقلابات کے آثار حادث ہیں۔ اور یہ امر بھی واضح ہے کہ ان تخریرات و انقلابات کی علت مادہ کی ذات نہیں ہو سکتی کیونکہ مادہ میں بذاتِ خود یہ صلاحیت نہیں اس لئے یہ لوگ مجبوراً مادہ کے اجزاء میں حرکت کے وجود کے قائل ہو گئے اور مادہ اور حرکت سے مذکور بالا آثار کے ظہور کو تسلیم کرنے لگے۔ اور اگر یہ لوگ مادہ کو حادث مان لیتے تو انہیں وجودِ صالح کی ضرورت سے کبھی انکار نہ ہوتا۔ اور انہیں تسلیم کرنا پڑتا کہ جس ذاتِ اقدس نے مادہ کو پیدا کیا ہے وہی آثارِ مادہ کا بھی موجب ہے۔ اس صورت میں انہیں یہ ضرورت پیش نہ آتی کہ مادہ اور حرکت کے اجتماع سے جن میں نہ تو ارادہ ہے نہ ادراک نہ تدبیر مذکورہ بالا عجیب و غریب آثار جن کو دیکھ کر ایک سلیم العقل آدمی کسی صالح کامل القدرہ اور کامل الحکمت کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کر سکتا اتفاقاً یہ طور پر ظہور پذیر ہوئے ۔

منکرینِ صالح کے مذہب کی بنیاد مفصل ذیل تین امور پر ہے جن کی صحت کی نسبت قطعی طور پر نہایت مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں حالانکہ نفسِ لامر میں ان کی صحت کا دعویٰ ناممکن ہے۔ اول یہ کہ وہ مادہ کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور اسی طرح اجزائے مادہ کی حرکت کو بھی قدیم مانتے ہیں۔ اور یہ خیال کرتے ہیں کہ مادہ اور حرکت اجزاء ہر دو ازل سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ دوم یہ لوگ مانتے ہیں کہ مادہ کے مختلف قسم کے آثار ارضی و سماوی اشیائیں حادث ہیں بالخصوص طبقہ حیوانات میں کیونکہ طبقات الارض کی نئی تحقیقات سے انہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ نباتات و حیوانات کے مختلف انواع زمین میں پہلے موجود نہ تھے بلکہ کئی لاکھوں صدیوں بعد وہ پیدا ہوئے اور انسان

ان سب میں آخر وجود پذیر ہوا۔ کیونکہ زمین کے نیچے کے طبقوں میں اس کے آثار نہیں پائے گئے
 ہجوم یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مادہ کے مختلف آثار حرکت اجزاء کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے
 اور حرکت ازل سے مادہ کے ساتھ لازم ہے۔ اور مادہ اور حرکت ہر دو ارادہ اور ادراک سے خالی
 ہیں۔ با این ہمہ وہ قائل ہیں کہ یہ آثار مادہ اور حرکت ہر دو کے اجتماع سے بطور معلول کے ظہور
 پذیر ہوئے۔

ان ہر سہ قضایا کے برخلاف ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات مسلم ہے کہ معلول اپنی علت سے کبھی
 مختلف نہیں ہوتا یعنی علت کے وجود کے ساتھ ہی معلول کا وجود پایا جاتا ضروری ہے جس کا یہ مطلب
 ہے کہ اگر علت حادث ہوگی تو معلول بھی حادث ہوگا اور اگر قدیم ہوگی تو معلول بھی قدیم ہوگا اور اگر
 مادہ اور حرکت کے قدیم ہونے کے قائل ہیں اور ان ہر دو کو آثار مادہ کے لئے علت تسلیم کرتے ہیں
 اس لئے معلول یعنی آثار بھی قدیم ہونگے مگر یہ لوگ اپنے علوم جدیدہ کی بنا پر ان آثار کو حادث
 ملتے ہیں لہذا انہیں لوگوں کے اصول پر یا تو مادہ و حرکت کا حادث ہونا لازم آتا ہے یا آثار
 کا قدیم ہونا۔ مگر یہ لوگ ان ہر دو صورت کے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔
 اس انکار کی صورت میں مخالف کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کے استدلال کے ابطال کا
 مدعی ہو مگر ہم ایک دوسری صورت میں بھی ان لوگوں کو ملزم قرار دے سکتے ہیں جس کی تقریر
 یوں ہو سکتی ہے :-

کہ حرکت کا وجود ہر کسی محرک کے نہیں پایا جاسکتا کیونکہ حرکت ایک امر عارض ہے اور اس
 کے مادہ کو عارض ہونے کی صورت میں کسی علت کی ضرورت ہے مگر مادہ میں علت ہونے کی قابلیت
 نہیں اس لئے حرکت کے قدیم ہونے کا دعویٰ سراسر باطل ہے اور جب حرکت کو قدیم قرار دینا باطل
 ثابت ہوا تو یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ حرکت کے مادہ کو عارض ہونے سے پہلے مادہ کس حالت میں تھا؟
 اور اس کے اجزاء میں حرکت کیونکر پیدا ہوگئی؟ اور یہ کہنا کہ حرکت ایک مادہ کی اضطرابی حالت
 کی وجہ سے ہے تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اضطراب کا کیا ثبوت ہے؟ اور یہ اضطراب

ماوہ کی ذات میں انہی ہے یا غیر انہی؟ اگر انہی ہے تو مختلف قسم کے آثار بھی جو مادہ پر مترتب ہوتے ہیں ضرور انہی ہونگے مگر یہ لوگ ان آثار کو حادث مانتے ہیں لہذا ماوہ کی حرکت اضطرار یہ انہی نہیں ہو سکتی۔ اور غیر انہی ہونے کی صورت میں حرکت کا حادث ہونا تسلیم کرنا پڑے گا اور اس صورت میں بھی ہمارا دعویٰ بدرجہ اولیٰ ثابت ہے۔

لیکن ہم ایک دوسری صورت میں ماوہ کے حادث ہونے کو یوں ثابت کر سکتے ہیں کہ ماوہ کا وجود بجز صورت کے نہیں پایا جاسکتا اور جب ماوہ اور صورت دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہیں تو ان کے اتصال کی علت کیا ہے؟ کیونکہ ماوہ بغیر صورت اور صورت بغیر ماوہ کے ناممکن الوجود امر ہیں۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماوہ اور صورت کے اتصال کی علت کوئی امر خارجی ایسا ہے جو ہر دو کی حقیقت سے خارج ہے اور وہی علت صلاح عالم کے وجود کو ظاہر کرتی ہے جس نے اپنے آزاد ارادہ سے ہر دو میں اتصال پیدا کیا اور اس اتصال سے پہلے نہ تو ماوہ کا وجود تھا نہ صورت کا۔ گویا ماوہ کا صورت قبول کرنا اس کا عدم سے وجود میں آنا ہے۔ اور یہی ہمارا دعویٰ ہے لہذا ماوہ کسی صورت میں بھی قدیم نہیں ہو سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب صلاح عالم کا وجود قدیم ہے اور وہ وجود ماوہ کی علت بھی ہے تو معلول اپنی علت سے کبھی مختلف نہیں ہو سکتا جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے اس لئے ماوہ بھی قدیم ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ماوہ معلول ہے اور معلول اپنی علت کا محتاج ہوتا ہے اور جو چیز محتاج ہو وہ قدیم نہیں ہو سکتی۔ معلول کا علت سے مختلف ہونا اس صورت میں لازم آسکتا ہے جبکہ ماوہ کی کوئی وجودی صورت تسلیم نہ کی جائے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماوہ اپنی خارجی ماہیت سے پہلے صلاح عالم کی علمی صورت میں وجود رکھتا تھا اور یہ علمی ماہیت بیشک قدیم ہے اور اس کے قدیم ماننے سے ماوہ کی خارجی حقیقت کا قدیم ہونا لازم نہیں آتا۔ یہ واضح رہے کہ ماوہ کی علمی ماہیت معلول نہیں بلکہ معلول اس کی خارجی حقیقت ہے اور پس کیونکہ علیم ذات باری قدیم ہے۔

توحید ذات باری

اثبات توحید عقائد اسلام میں سب سے پہلا مسئلہ ہے اور بنیائیت و قیق عقلی انسانی بیشک اس کے وجود کی ضرورت کا پتہ تو دوسرے کرتی ہے مگر اس کی حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کیونکہ ہم کسی چیز کی حقیقت کا علم جب بذریعہ دلائل حاصل کرتے ہیں تو ان دلائل کی بنیاد ہمیشہ ایسے امور پر مبنی ہوتی ہے جو ہماری تجربہ اور مشاہدہ کے دائرہ میں پہلے سے آچکے ہوں۔ اندر یہ ظاہر ہے کہ ہمارے تجربات و مشاہدات محسوسات مادیہ کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے اور جب وہ ذات اقدس "لیس کمثلہ شئی" ہے تو ہمارے دلائل بجائے اس کے کہ ہمیں اس کی حقیقت کا پتہ دیں ہیں یا تو حیرت و دہشت میں ڈال دینگے یا غلط راستہ پر لے جا کر شرک و کفر کا نہ عقائد تک پہنچا دینگے۔ یعنی خالق حقیقی کے صفات کو مخلوق کے صفات پر قیاس کرنے لگیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں عقلی استدلال کرنے والوں کے بیشتر مذاہب پیدا ہو گئے ہیں جن میں کوئی بھی افراط و تفریط سے خالی نہیں اس لیے بہتر ہے کہ عقلی استدلال سے جو اس مسئلہ میں کچھ کام نہیں دے سکتا اعراض کر کے صرف کتاب اللہ کو حجت قاطعہ تسلیم کر لیا جائے۔ عقلی استدلال کے رُوء سے ہم مثبت پہلو میں جس امر کو اس کی ذات اقدس کے ساتھ نسبت کرینگے (تو چونکہ اس کا ماخذ محسوسات خارجیہ ہی ہوگا) ذات باری اس سے بری ہوگی۔ اس لیے اگر کچھ کام دے سکتا ہے تو صرف منفی پہلو مثلاً اگر ہم ذات باری کو "سمیع و بصیر" کہیں تو لوگ اس کی صفات سمیع و بصیر کو انسانی سمیع و بصیر پر قیاس کر لیتے ہیں مگر مخلوق کی سمیع و بصیر آلات جسمانی کی محتاج ہیں۔ اس لیے یہ استدلال کا پہلو کچھ مفید نہیں بلکہ عین ضلالت ہے۔ البتہ منفی پہلو میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ سمیع و بصیر ہے مگر اس کی سمیع و بصیر کی وہ حقیقت نہیں جو مخلوق کی سمیع و بصیر کی حقیقت ہے اس مسئلہ کی توضیح کے لئے ہم جناب امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے ایک خطبہ کا ذیل میں کچھ اقتباس کرتے ہیں جو مشاء توحید کے سمجھنے کیلئے ارباب مفید ہے خصوصاً "سب قرابت اس ذات اقدس کے لئے ہے کہ جس کی مدح کی غایت کو اہل سخن نہیں پہنچ سکتے۔"

اور جس کی نعمتوں کا شمار اہل شمار نہیں کر سکتے۔ اور مجاہدت و ریاضت والے اس کا حق عبادت بجا نہیں
 لاسکتے وہ ایسی برزخات ہے کہ نظر و فکر کی اس تک رسائی نہیں اور دانش اس کو نہیں پاسکتی۔ اس کی
 صفت کے لئے کوئی حد متین نہیں اور نہ اس کے لئے کوئی وقت ہے جو شمار ہو سکے اور نہ کوئی مہلت
 مقررہ۔ اس نے موجودات کو محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا اور ہواؤں کو اپنی رحمت سے پھیلا یا اور
 سطح زمین کو پھیلانے کی مینوں سے مضبوط کیا۔ دین کی پہلی بات اس کی معرفت ہے اور کامل معرفت
 اس کی تصدیق ذات پر اور کامل تصدیق اس کی توحید پر اور کامل توحید اس کے اخلاص پر اور کامل
 اخلاص اس امر پر موقوف ہے کہ تمام ان صفات کی اس کی ذات سے نفی کی جائے (جن صفات
 کے ہم اشیائے موجودات میں آثار دیکھتے ہیں) کیونکہ صفت اور چیز ہے اور موصوف اور۔ اور اگر
 ان آثار مشاہدہ پر اس کی صفات کو قیاس کیا جائے تو ذات میں ترکیب لازم آئے گی جو منافی توحید
 ہے۔ سو جو شخص اس کی ذات کو ان صفات سے موصوف کرتا ہے وہ اس کی ذات کو غیر ذات
 کا قرین بناتا ہے اور جس نے اس کو غیر کے ساتھ قرین بنایا اس نے اس کی ذات کو مرکب قرار
 دیا اور جس نے مرکب قرار دیا اس نے اس کو قابل تقسیم بنا دیا اور جس نے قابل تقسیم بنایا وہ اس
 سے جاہل رہا اور جو اس سے جاہل رہا اس نے مادی اشیاء کی طرح اسے قابل اشارہ بنا دیا اور
 جس نے اسے قابل اشارہ بنایا اس نے اسے محدود کر دیا (کیونکہ ہر ایک مادی چیز مکان و
 زمان میں محدود ہے) اور جس نے اسے محدود کیا اس نے اسے قابل شمار کر دیا (اور قابل
 شمار ہونا کثرت کی فرع ہے نہ وحدت کی) اور جس نے کہا کہ وہ کسی چیز میں ہے تو اس نے اسے
 کسی چیز کے اندر قرار دیا اور جس نے کہا کہ وہ کسی چیز پر ہے اس نے اسے اس عالم سے یا ہر
 کر دیا (یعنی وہ اندرون و بیرون سے بالاتر ہے کیونکہ یہ مایات کا خاصہ ہے) وہ ہست ہے پر
 حادث نہیں موجود ہے پر عدم کے بعد وجود پذیر نہیں ہوا (بلکہ ازلی ہے) وہ ہر ایک چیز کے ساتھ
 ہے مگر ایسے نہیں جیسے دو چیزیں آپس میں ملتی ہیں۔ وہ ہر ایک چیز کا غیر ہے مگر ایسے نہیں کہ اس
 سے علیحدہ ہے۔ وہ ہر ایک چیز کا فاعل ہے مگر اس کے فعل کے لئے حرکت اور آلہ کی ضرورت نہیں

وہ اس وقت بھی بصیر تھا جبکہ کوئی مبصر نہ تھا۔ وہ پہلے تھا جبکہ کوئی غیر جس کے ہونے پر اس اور نہ ہونے پر وحشت پیدا ہو سکے کبھی موجود نہ تھا۔ اس نے خلقت کو از سر نو ابتدا پیدا کیا بدون کسی سوچ بچار یا تجربہ و مشق کے۔ اور بخیر کی حرکت کے جس کو اس نے پیدا کیا ہو اور بخیر اتمام نفس کے جس کی اسے ضرورت اعلیٰ ہوئی ہو۔ اشیاء کو عین ان کے اوقات معینہ پر علم سے وجود میں لایا اور مختلف اشیاء کو باہم ملایا۔ اور ان کی فطرتیں ان ہی قائم کیں اور ان فطرتوں کو ان کے اجسام کے ساتھ لازم کر دیا۔ وہ ان اشیاء کو ان کے پیدا کرنے سے پہلے ہی جانتا تھا اور ان کے حدود و غایت پر وہ محیط تھا۔ اور ان کے مناسبات اور مخالقات سے وہ آگاہ تھا۔

مذکورہ بالا اقتباس سے ذات باری کے مفضلہ ذیل صفات کا پتہ لگتا ہے :-

اول قدرت۔ کیونکہ اشیائے کائنات ارتقی ہوں یا سماوی ایک مضبوط آزاد غیر متبدل قانون کے تابع ہیں اور ان تمام اشیاء کا انسانی فطرت کی ضرورتوں کے ساتھ عین مطابق ہونا اس کے کامل قدرت ہونے کا بین ثبوت ہے۔ ”وہو علی کل شیء قدير“

دوم علم۔ کیونکہ تمام اشیائے کائنات مخلوق ہیں اور خالق کے لئے مخلوق کا عالم ہوتا ضروری ہے چنانچہ قرآن و قرآن کائنات کو اس کا علم احاطہ کئے ہوئے ہے ”وہو لکل شیء علیہ“ اس کی صداقت پر شاہد ہے۔

سوم حیوۃ۔ کیونکہ جو ذات اقدس علم و قدرت سے متصف ہے وصف حیات اس کے لئے ضرورتاً ثابت ہے۔ ”وہو الحی القیوم“

چہارم ارادہ۔ وہ آزاد ارادہ کا مالک ہے اور ہر ایک حادثہ اس کے ارادہ سے صادر ہوتا ہے۔ ”فعال المایرید“

پنجم سمع و بصر۔ وہ دلوں کے پوشیدہ رازوں کو دیکھتا اور اندھیری رات میں ٹھوس پتھر پر سیاہ چوہنی کے رنگنے کی آہٹ کو بھی سنتا ہے۔ ”وہو السميع البصیر“

ششم کلام۔ وہ ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے جس میں

صوت اور حرکت کو نقل نہیں اور نہ وہ کسی غیر کے کلام سے مشابہ ہے اور وہ دیگر صفات کی طرح قدیم ہے اور اس میں تخیر اور تبدل کو کچھ دخل نہیں۔ البتہ وہ کلام الہی جو کتب سادہ میں تلاوت کیا جاتا ہے حادث ہے مگر وہ کلام جو مصنفہ ذات باری ہے وہ کلام نفسی ہے اور وہ صوت اور لفظ پاک ہے۔

مسئلہ صفات پر بحث

صفات ذات باری کا مسئلہ اسلامی عقائد و اصول کے رُوسے ایک نہایت اہم اور دقیق مسئلہ ہے۔ علمائے اسلام نے اس میں نہایت عریل و بسیط مباحث طبع نہ کئے ہیں اور جس قدر اختلاف اس مسئلہ میں پایا جاتا ہے غالباً کسی دوسرے مسئلہ میں نہیں پایا جاتا۔ اسی مسئلہ کے اختلاف پر متکلمین کے متعدد مذاہب قائم ہو گئے ہیں۔ چونکہ وہ مذاہب سب کے سب فلسفیانہ طرز استدلال پر مبنی ہیں اور ناظرین کے لئے تشویش ذہن کا موجب ہیں اس لئے ہم اس خازنار میدان میں چلنا پسند نہیں کرتے۔ اس مسئلہ کے متعلق جو کچھ ظاہر کتاب و سنت سے ثابت ہوتا ہے اسی کو صحیح مذہب قرار دینا چاہئے۔ اور ایک طالب حق کے لئے جو اپنے عقائد کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے اسی قدر کافی سمجھا جاتا ہے۔ سلط صالحین کا مدار صرف کتاب و سنت کے لصوص پر تھا وہ اس مسئلہ میں بہت احتیاط سے کام لیا کرتے اور اپنی ذاتی رائے پر اعتماد کرنے سے ہمیشہ اجتناب کیا کرتے۔

واضح ہو کہ کتاب و سنت میں صراحتاً ذات باری کے صفات کا ذکر پایا جاتا ہے اس لئے ہم کسی صورت میں صفات سے انکار نہیں کر سکتے جیسا کہ معتزلہ فرقہ کے علمائے تاویل کر کے صفات کی نفی کر دی ہے۔ ہم عالم کائنات میں سیارۂ افعال کا مشاہدہ کرتے ہیں جو ایک غیر متبدل قانون کلی کے زیرِ عمل قائم ہے اور ہم پہلے بیان کرتے ہیں کہ افعال صفات کا نتیجہ ہیں اور صفات کا مجر ذات کے بجائے خود کوئی وجود نہیں۔ صفات ہمیشہ کسی نہ کسی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔ کتاب اللہ میں اسی غیر متبدل قانون کلی پر ثبات صفات کی بابت استدلال کیا گیا ہے۔ اور

کتاب اللہ کے کلام الہی ہونے پر قطعی دلیل ہے کہ اس نے عالم کائنات کی ہر ایک شے کو
مناط استدلال قرار دیا ہے

وفی کل شیئ لہ ایۃ - تدل علی انہ واحد

اجرام سماویہ کے متعلق موجودہ علم ہیئت کے علماء کا خیال ہے کہ ہر ایک ستارہ اپنی خاصیات میں
دوسرے ستاروں کی نسبت نمایاں امتیاز رکھتا ہے بعض تو بہت ہی چھوٹے ہیں اور بعض بہت
بڑے جتنی کہ بعض کی نسبت تو ان کا یہ خیال ہے کہ ہمارا کرہ زمین اس کے سامنے وہی نسبت رکھتا
ہے جو ایک ریت کے ذرہ کو اس کرہ سے نسبت ہو سکتی ہے جس کا قطر ایک ہاتھ ہو۔ زمین کا قطر
آٹھ ہزار میل اور اس کا محیط قریباً پچیس ہزار میل قرار دیا گیا ہے اور آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ ہزار
پانچ سو اسی میل اور اس کا محیط قریباً چھپیس لاکھ اسی ہزار پانچ سو میل ہے۔ اور بعض سیارات
ہم سے بہت قریب ہیں اور بعض لاکھوں اور کروڑوں میل کے فاصلہ پر ہیں۔ اور بعض اپنے
مدار میں بہت آہستہ رفتار کے ساتھ حرکت کرتے ہیں اور بعض اس قدر تیز رفتار ہیں کہ ایک
گھنٹہ میں تیس ہزار میل کا فاصلہ طے کر جاتے ہیں۔ اور بعض سورج رنگ کے ہیں اور بعض زرد۔
اور بعض سفید۔ بعض کی روشنی ذاتی ہے مثلاً سورج اور بعض کی آگنی مثلاً چاند اور بعض دیگر
سیارات بعض حرارت سے بالکل خالی ہیں اور بعض بایت گرم۔ اور اپنی گردش میں آفتاب سے
روز بروز قریب ہوتے جاتے ہیں اور بعض دیگر روز بروز بعید۔ بعض کی روشنی گھٹی بڑھتی رہتی ہے
بعض کا ظہور کسی خاص وقت میں ہوتا ہے اور ایک خاص مہلت کے بعد چھپ جاتے ہیں بعض
کی روشنی ہم تک سینکڑوں برس کے بعد پہنچتی ہے جبکہ آفتاب کی روشنی آٹھ سیکنڈ میں ہم تک
پہنچ جاتی ہے۔ اور بعض کرہ زمین کی طرح آباد ہیں اور بعض آبادی سے بالکل خالی ہیں بعض کی
سمت شمالی ہے بعض کی جنوبی۔ اور بعض کا سفید ہیں اور بعض کسوٹ بعض قافون کشش ثقل
سے خلا میں قائم ہیں۔ اگر محققین علم ہیئت کی اس تحقیق کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ سوال عائد
ہوتا ہے کہ جب ان اجرام سماویہ کا اصل مادہ ایک ہے اور نفس مادہ اس امر کا مقتضی نہیں کہ ہر ایک

ایسی خصوصیات کے ساتھ مختص ہو جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں۔ تو ان خصوصیات کے اپنے اپنے اجرام سے مختص ہونے کی علت کیلئے ہے: اس کا جواب ان محققین کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ ان خصوصیات کی علت جو ایک عجیب غریب نظام پر مشتمل ہے اور جو مخلوقات کے مصالح اور منافع اپنے اندر لئے ہوئے ہے اجرائے مادہ کی حرکت ہے جس میں نہ تو اوراک اور ارادہ پایا جاتا ہے نہ امتیاز اور تدبیر بلکہ اس کا صحیح جواب یہ ہونا چاہئے کہ ان اجرام کے اس صورت موجودہ میں قائم کرنے کا حقیقی فاعل وہ ذات اقدس ہے جو اپنے علم۔ ارادہ۔ قدرت اور حکمت میں کامل ہے۔

اسی طرح جب ہم فضا کے اندر کی کائنات میں غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تمام فضا ہوا سے پُر ہے جس سے نباتات اور حیوانات کی حیات کا سلسلہ جاری ہے اور چونکہ ہوا تمام اشیاء سے حیات کے لئے زیادہ ضروری سمجھی گئی ہے اس لئے وہ ایک کثیر مقدار میں موجود ہے جس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ یہی حال ہر ایک شے کا ہے کہ جس قدر اس کی حاجت نباتات و حیوانات کے لئے کم و بیش ہے اسی قدر اس کی مقدار میں بھی کمی بیشی پائی جاتی ہے۔ ایہ۔ ”کل شیء عندہ بمقدار“ کے یہی معنی ہیں۔

مختلف قسم کی ہواؤں کے چلنے اور ان کے منافع اور خصوصیات میں غور کرو کہ وہ کس طرح مختلف جہتوں سے خاص خاص وقتوں میں چلتی ہیں۔ کوئی مرطوب ہے اور کوئی یابس۔ اور ایک حار ہے تو دوسری بارو۔ ایک تند ہے تو دوسری نرم۔ ایک رات کو چلتی ہے تو دوسری دن کو۔ بادلوں کی ماہیت میں غور کرو کہ وہ کس طرح بنتے ہیں اور ہوائیں ان کو کس طرح ایسے قطعات زمین تک پہنچا دیتی ہیں جہاں ان کے برسنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان میں رعد و برق پائے جاتے ہیں جن کی حرارت اور حرکت سے بادلوں میں تہوج پیدا ہوتا ہے جس سے پانی کے اجزائے میں تحلیل پیدا ہوتی ہے جس سے وہ برسنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اپنے پانی سے مرہ زمین کو زندہ کرتا ہے جس سے مختلف قسم کے خوب فلات و نباتات جن پر انسان اور دیگر حیوانات کی زندگی کا انحصار ہے پیدا ہوتے ہیں۔

اسی طرح روشنی کا حال ہے جو ایک نہایت عجیب غریب قانون کے ماتحت منکس ہوتی ہے اور مختلف رنگوں میں بھلتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے محققین نے روشنی کے اصول پر بڑے بڑے لمبے مباحث لکھے ہیں جن سے یہ بات پائیدار ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ نباتات و حیوانات کی زندگی کا انحصار اور ان کی نشوونما اور صحت اور نہ صرف بچے پر ایشیم کے ہلاک کرنے اور مہمات کے دکھائی دینے کا مدار صرف روشنی پر ہے اور عالم کائنات کی نظم و نسق میں جس قدر فوائد روشنی سے حاصل ہوتے ہیں ان کا شمار ناممکن ہے۔ مگر باوجود روشنی کے اس قدر آثار مشاہدہ کرنے کے بھی اس کی باہت ابھی تک لاپتہ ہے اور تا حال اس کی کوئی تسلی بخش تشریح نہیں ہو سکتی۔ ایک بڑے مشہور محقق کی روشنی کے متعلق یہ رائے ہے کہ وہ نہایت چھوٹے ذرات کا نام ہے جو کسی روشن جسم سے علیحدہ ہو کر پھرتے ہیں۔ مگر بعد کے محققین نے دلائل کے ساتھ اس مذہب کو مردود قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہتھر کے اجزاء کی حرکت کا نام ہے جو غیر محدود فضا میں پھیلا ہوا ہے اور اس وقت تک جہور کی سائے میں یہی مذہب صحیح قرار دیا گیا ہے۔ مگر ایک مخالف کہہ سکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہتھر کے اجزاء کی حرکت ایک صاف شفاف اور دل دار بلور کے تختہ میں نفوذ کر کے تختہ کے دوسری طرف پھور پڑے ہو اور جیسا ہی تختہ کے ایک طرف سیاہی پھیر دی جائے تو مذکورہ بالا اجزاء کی حرکت تختہ میں نفوذ نہ کرے حالانکہ سیاہی کا نہایت باریک پردہ جو ٹھوس بھی نہیں ہے بدرجہ اولیٰ نفوذ کے قابل تھا؟ اور اس سوال کا یہ جواب کہ رنگ طبعاً حرکت اجزاء کا مانع ہے صحیح نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ایسا ہونا حکمت خداوندی سے بعید نہیں لیکن اس امر کی توجیہ نہایت ذمہ ہے کہ کیوں حرکت اجزاء ایک ٹھوس دل دار تختہ میں تو نفوذ کرے اور باریک غیر ٹھوس پردہ میں نفوذ کرنے سے عاجز ہے؟

موجودہ زمانہ کی نئی ایجادات میں ایک قسم کا روغن ایجاد کیا گیا ہے کہ جب اسے چند منٹ کے لئے سورج کی روشنی میں رکھ دیں تو اندھیری رات میں برابر جلتا رہتا ہے جس کی توجیہ لوں کیا کرتے ہیں کہ آفتاب کی روشنی سے روغن میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر سوال یہ عائد ہوتا ہے کہ روغن میں یہ حرکت کس طرح جاری رہ سکتی ہے؟ جبکہ سورج کی روشنی اس سے منقطع ہو چکی ہو۔

اور بظاہر یہ بات قانونِ انکاس کے برخلاف ہے۔ ان واقعات میں غور کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اشیائے مذکورہ بالا میں ان کی متعلقہ خصوصیات کی تخصیص کی کیا علت ہے؟ اور یہ امر ایسا سرسری نہیں کیونکہ ان اشیائے متعلق نباتات و حیوانات کے اس قدر منافع و مصالح و بہتیں ہیں جن سے کوئی عقل دہم بوش کا آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ کیا اجڑے مادہ کی حرکت کو علت قرار دے گے یا اقتضائے طبیعت و ضرورت کو؟ مگر ایسے جوابات سے جوہم اوسم عمل ہوں کوئی محقق کہاں تک مطمئن ہو سکتا ہے؟ نہیں نہیں بلکہ آدھے سچے دل کے ساتھ اقرار کر لو کہ مذکورہ بالا عجیب و غریب آثار اور خواص کا بخیر کرنے والا وہی عظیم حکیم اور خیر قدیر ہے جو ان اشیاء کو عدم سے وجود میں لایا اور خاص خاص آثار و خصوصیات کو ان سے تعلق دیا۔

اسی طرح زمین اور اس کی جغرافیہ طبعی حالت میں غور کر جس کے تین چوتھائی حصہ کو بحر محیط احاطہ کئے ہوئے ہے اور صرف ایک چوتھائی مختلف قسم کی معدنی۔ نباتی حیوانی مخلوقات کے لئے باقی رہ جاتی ہے جس طرح پانی کے اندر بے شمار مخلوقات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اسی طرح زمین کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کی معدنی۔ نباتی اور حیوانی مخلوقات پائی جاتی ہے اگر کوئی شخص ان تمام بری و بحری مخلوقات کا حصر کرنے لگے اور مختلف قسم کی اشیاء کی بناوٹ اور ان کے آثارِ مخصوصہ اور ان کے مصلح و منافع کا اندازہ لگاتا چاہے تو ناممکن ہے کہ وہ ابد الابد تک کی عمریں بھی عہدہ بردار ہو سکے۔ اور یہی مطلب ہے آیہ۔ "عطی کل شیئاً خلقہ ثم ہدائی" کا۔

اس کرہ خاک کی ماہیت میں غور کرو کہ کس طرح اس کی سطح پر پہاڑ۔ دریا۔ میدان۔ نیستان اور قایمیں اور راستے پائے جاتے ہیں اور یہ سب چیزیں انسان کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ پہاڑوں کو دیکھو کہ ان کے وجود کے ساتھ کس قدر انسانی ضرورتیں وابستہ ہیں۔ ان کی تہیں سے پانی پھوٹتا ہے جس سے نباتات اور حیوانات سیراب ہوتے ہیں مختلف قسم کے جانور اور وحوش کے لئے پناہ ہیں اور غائی لکڑی اور ایندھن اور مختلف قسم کے

قیمتی پتھر اور دعائیں پیدا ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود انسان کی زندگی کے لئے ضروری
 سمجھی گئی ہے۔ بعض کو ہستانی علاقوں میں ایسی سرسبز وادیاں بھی پائی جاتی ہیں جہاں رنگارنگ کے
 پھول اور پل اور درختان سرسبز اور جاری چٹے اور خوش آواز پرندوں کی سُرئی آوازیں اور
 باؤنیم کے جھنکے شہنشاہیں کی یاد دلاتے ہیں اور انسان کے سرور و خاطر اور انشراح صدر
 کے لئے ایسے قدرتی مناظر کی جو ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ خود ظاہر ہے +

غاروں کی حقیقت میں غور کرو جو کئی ایک قسم کے حیوانات کے لئے مستحکم پناہ گاہوں کا کام
 دیتی ہیں۔ ان میں بعض ایسی بھی ہیں جن کی تہ ایام گریما میں تو سرد ہو جاتی ہے اور جاٹے کے دونوں
 میں گرم۔ اس لئے ایسے حیوانات جو سخت سردی یا گرمی کی تاب نہیں لاسکتے ان کی تہ میں اپنا
 ٹھکانا بنا لیتے ہیں +

میدانی زمین کے مصلح میں غور کرو کہ ان میں بعض میں کسی خاص قسم کی نباتات پیدا ہوتی
 ہے جو کسی دوسرے حصہ زمین میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح میدانی علاقوں میں بعض تو بہت
 سخت اور دشت ہوتے ہیں جو عمارت کے کام آتے ہیں اور بعض سختی اور نرمی میں متوسط ہوتے
 ہیں جو کھیتی باڑی کے کام آتے ہیں +

معدنیات میں غور کرو کہ زمین کی تہ میں ایک ہی مادہ سے کس طرح سے مختلف قسم کی فلزات
 تیار ہوتی ہیں جن سے سطح زمین پر پہنچنے والے بے شمار منافع حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض
 تو جامد اور بعض مائل ہیں اور بعض دشت ہیں اور بعض نرم۔ اور بعض دیرہ دیرہ ہو سکتی ہیں اور بعض
 نہیں ہوتیں۔ اور بعض گل سکتی ہیں اور بعض نہیں گل سکتیں۔ بعض جو جھل ہیں اور بعض ہلکی۔ کوئی نرو
 رنگ کی ہے اور کوئی سفید۔ کوئی سبز اور کوئی سیاہ۔ انسان انہیں مختلف طریق پر اپنے استعمال
 میں لاتا ہے بعض کو کھانے پینے کے کام میں لاتا ہے بعض کو دوا کے طور پر اور بعض سے مختلف
 پیشوں کے اسلحہ اور اوزار تیار کرتا ہے اور بعض محض زیب و زینت کا کام دیتی ہیں۔ اور سب میں
 لوہا تمدن و معاشرت کی مختلف صورتوں میں سب سے بڑھ کر کار آمد چیز ہے۔ کتاب اللہ میں

اس کا ذکر خاص طور پر مذکور ہے چنانچہ فرمایا "وانزلنا الحديد فيه باس شديد ومنافع للناس"۔
 اگر کوئی محقق ان سب کے عجیب و غریب خواص کا پتہ لگانا چاہے تو بالیقین کہا جاسکتا ہے کہ
 وہ ان کے حصے عاجز ہو کر رہ جائے۔ مثال کے طور پر مقناطیس کو لو جو ابے کو جذب کرتا ہے
 کیا تم اس کی علت بتا سکتے ہو؟ اگر تم یہ جواب دو کہ اس کی علت وہ حرکت ہے جو مقناطیس کے
 اجزاء اور ان کی خاص ترتیب سے پیدا ہوتی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ فی الواقع یہی وجہ
 ہو سکیں یہ ایک مبہم اور ناقابل اطمینان جواب ہے کیونکہ اول یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا حرکت
 کی خصوصیت مقناطیسی اجزاء کے ساتھ کیونکر ہو گئی؟ اور دوسری دھاتوں کے اجزاء میں ایسی حرکت
 کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ دوم یہ کہ جب مقناطیس کو لوہے کی ایک دوسری سلاح سے چپان
 کر دیا جائے تو اس سلاح میں بھی وہی مقناطیسی قوت جذب پیدا ہو جاتی ہے اور جب تک مقناطیس
 کے ساتھ چپاں ہے اس میں قوت جذب برابر موجود رہتی ہے اور جب وہ علیحدہ ہو جائے تو وہ
 قوت اس سلاح سے نائل ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے جبکہ ایک فولادی سلاح مقناطیس سے
 چپاں ہو تو اس میں بھی قوت جذب پیدا ہو جاتی ہے اور اگر مقناطیس سے علیحدہ کر لی جائے تو
 اس سلاح میں قوت جذب بدستور موجود رہتی ہے اور نائل نہیں ہوتی۔ کیا تم اس امر کی کوئی
 صحیح توجیہ بنا سکتے ہو کہ لوہا اور فولاد کی مذکورہ بالا خاصیتوں میں وجہ امتیاز کیا ہے؟ سوم یہ کہ
 مقناطیس کے دونوں کناروں پر قوت جذب موجود ہے اور اس کے وسط میں یہ قوت بالکل
 معدوم ہوتی ہے اور اگر اسی مقناطیسی ٹکڑے کو اس کے وسط سے توڑ دیا جائے تو اس کے
 دونوں کناروں پر پھر وہی قوت جذب بدستور پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا تم اس کی صحیح توجیہ بیان
 کر سکتے ہو؟ نیز مقناطیس میں تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ زلزلہ کے آنے پر اس کی قوت جذب
 بالکل مفقود ہو جاتی ہے اور زلزلہ کے رک جانے پر پھر وہی قوت لوٹ آتی ہے۔ چنانچہ اسی
 اصل پر وہ آلہ تیار کیا گیا ہے جو وقوع زلزلہ کے قرب کا پتہ دیتا ہے تم ان سب سوالات کا جواب
 بجز اس کے اور کیا دے سکتے ہو کہ یہ مقناطیس کی فطری خاصیت ہے مگر ایک صحیح العقیدہ مسلمان

نہایت تسلی اور اطمینان کے ساتھ یہی کہیگا کہ ان آثار کی تخصیص اور ان خواص کی تجویز ایک ایسے کامل القدر اور کامل العلم وال حکمتہ ذات کے قبضہ قدرت میں ہے جو ان چیزوں کا خالق بھی ہے۔ انصاف سے کہو کہ تمہاری توجہات تسلی بخش ہیں یا یہ جواب ؟ *

آؤ در زمین کی مخلوقات نباتیہ میں بھی غور کرو اور ان کے عجائب و غرائب آثار اور مختلف قسم کے اشکال والون کو دیکھو کہ کس استحکام کے ساتھ ان میں ایک غیر متبدل اسرار و حکم کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے ؟ ایک چھوٹا سیاج مٹی اور پانی اور ہوا کے اجزاء کو اپنی طرف جذب کرتا ہے اور ستور سے ہی دلوں میں اس میں نشو و نما کے آثار ظاہر ہوتے لگتے ہیں اور وہ بتدریج اجزلے عناصر کو اپنی طرف جذب کرتے کرتے ایک جسم نامی بن جاتا ہے جس میں حیات نباتیہ پائی جاتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ ایک سخت بن جاتا ہے۔ یہ ایک جسم نباتی ہے جس میں قوت ارادہ اور ادراک مفقود ہے بلکہ وہ جسم جمادی کے مشابہ ہے لیکن زمین کے پیٹ میں اس کی جڑوں کے پھیلنے اور عناصر سے غذا حاصل کرنے کے رُوسے وہ ایک جسم حیوانی سے مشابہ ہے۔ علم نباتات کے محققین کے نزدیک یہ امر پائے ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ نباتات میں بھی ایک ایسی شوح ہے جس کی وجہ سے جسم نباتی بعض ایسے آثار کا مصدر ہے جو حیوان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ علامہ حسین آفندی جو موجودہ طبقہ علمائے مصر میں ایک مستند عالم ہیں اپنے رسالہ جمیدیہ میں لکھتے ہیں :-

میں نے اپنی آنکھوں سے بیروت کے منہ افابہ میں ایک قسم کی نبات کا مشاہدہ کیا ہے کہ اس میں ایک زرد رنگ کے پرندے کی شکل کے شکوفے پائے گئے اور اس میں سرور آنکھیں اور چونچ اور گردن۔ سینہ اور دو پھیلے ہوئے بازو علیحدہ علیحدہ نظر آتے تھے اور وہ مرغ کی طرح اپنے پاؤں پر قائم تھے۔ شکوفہ کے پیٹ کے نیچے کی طرف شہد کی مکھی کی صورت نظر آتی تھی جس کا منہ اس کے پیٹ پر رکھا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ چوس رہی ہے اور مکھی کا سرور آنکھیں اور منقش بیٹھ اور دو بازو صاف طور پر نمایاں تھے۔ الغرض شہد کی مکھی اور مذکورہ بالا صورت میں کچھ تفاوت معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہاں کے لوگ اس شکوفہ کو ”زہرہ الخلة“

بولتے تھے۔ "کیا اس قسم کی نباتات سے معرضِ وجوہیں آنے کی علت ماہرانِ علم نباتات بیان کر سکیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ہاں ایک صحیح العقیدہ مسلم یہ جواب دے کر سائل کو مطمئن کر سکتا ہے کہ اس کا صالح ایک کامل القدرۃ اور کامل الحکمۃ والعم ذاتِ اقدس ہے اور بس۔ اجزائے مادہ اور قانونِ نباتات کے پیچھے لگنے سے کوئی شخص تسلی نہیں پاسکتا۔

بعض نباتات میں قوتِ حسِ اسی طرح پائی جاتی ہے جیسے حیوانات میں۔ چنانچہ مشہور نباتات سب (چھوٹی موٹی) میں قوتِ حسِ اس درجہ تک پائی جاتی ہے کہ اگر اسے کوئی چھو دے یا ہلاکے تو وہ سکر جاتی ہے اور اس کے پتے باہم اکٹھے ہو کر مل جاتے ہیں۔ اور ایک قسم کی نباتات ہے کہ اگر کسی اس پر بیٹھ جائے تو وہ مکھی کو ایسے طور پر قابو کر لیتی ہے کہ وہ اڑ نہیں سکتی اور اس کا سارا خون چوس لیتی ہے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ نباتات کسی خارجی چیز کے حرکت دینے سے متحرک ہوتی ہیں مگر ایک قسم کی نباتات ہے کہ وہ بغیر کسی قسم کے خارجی اثر کے خود بخود حرکت کرتی رہتی ہے۔ اس کے تین پتے ہوتے ہیں ایک بڑا جو درمیان میں ہوتا ہے اور دو اس کے دونوں طرف وہ رات دن گرمی و سردی میں برابر حرکت کرتے رہتے ہیں۔ ایک پتا دوسرے کو اٹھتا ہے تو دوسرا نیچے کو آتا ہے۔ اور ایک قسم کی نباتات ہے کہ اس کے درمیان کا پتا صرف صبح و شام کو حرکت کرتا ہے اور اس کے دونوں طرف کے پتے باہم دن بھر متضاد حرکت کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس قسم کی نباتات دیرپائے لنگا کے کنارہ پر بھی ملتی ہے جس کے پتے ایک منٹ میں ساٹھ دفعہ حرکت کرتے ہیں۔ ہندو لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اور ایک قسم کی نبات ایسی ہے کہ آفتاب کی حرکت کے ساتھ ساتھ اس کا شگوفہ بھی حرکت کرتا رہتا ہے۔ عرب اس کو "عابد الشمس" اور ہندی اُسے "سورج مکھی" بولتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنا رخ آفتاب کے عین مقابل پھیرتی رہتی ہے۔ ملک امریکہ میں ایک ایسا درخت پایا گیا ہے کہ جب کوئی حیوان اس کے قریب جائے تو اس کی شاخوں میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ حیوان کو ایک نہایت قوتِ جذب کے ساتھ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جہاں سے وہ

وہیں نہیں لے سکتا اور بالآخر وہیں مرجاتا ہے۔ ایک شخص ہندی ستیاج نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس نے اپنے حالات سفر میں لکھا ہے کہ جنگل کے جانور اس درخت کے پاس بھی نہیں بھٹکتے۔ عربی زبان میں اس درخت کا ترجمہ شجرۃ الموت کیا گیا ہے۔

نباتات میں بعض بڑے بڑے طول عرض کے درخت بھی پائے جاتے ہیں جن کا محیط نوے کرم تک پایا گیا ہے اور بعض کا طول تین سو یا چار سو کرم تک پہنچ گیا ہے۔ ماہرین علم نباتات نے اندازہ لگایا ہے کہ ان کی عمر پانچ ہزار سال سے ہرگز کم نہیں۔ امریکہ اور نکٹا لینڈ میں ایسے درخت دیکھنے میں آئے ہیں۔ کیلیفورنیا میں ایک صنوبر کا درخت ہے جس کا طول تین سو کرم اور محیط تیس کرم ہے۔ اس کی عمر کا اندازہ چھ ہزار سال لگایا گیا ہے بحر اوقیانوس کے بعض جزائر میں ایک درخت پایا گیا ہے کہ اگر دس آدمی اپنے ہاتھ پھیلا کر اس کے تنے کا احاطہ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے اور باوجودیکہ اس کی عمر کا اندازہ کئی ہزار سال لگایا گیا ہے مگر ابھی تک وہ دیسا ہی ہر ابھرا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اس کی پیدائش انسانی پیدائش سے بہت پہلے کی ہے +

اور بعض نباتات اس درجہ تک چھوٹی ہیں کہ وہ سوائے خوردبین کے محسوس نہیں ہو سکتیں نباتات میں ایسے بھی اقسام نبات پائے جاتے ہیں جن کی حالت باہم متضاد واقع ہوتی ہے اور ان کے اشکال۔ پتے۔ شاخوں۔ پھلوں اور بیجوں اور رنگوں اور بو اور ذائقہ میں اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ انسان کی عقل و نگ رہ جاتی ہے بعض موسم گرما میں بعض موسم سرما میں بعض موسم بربیع میں اور بعض نہریں میں پھلتے پھوٹتے ہیں اور بعض میدانی اور بعض پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے ہیں بعض باریش کے پانی سے نشوونما پاتے ہیں اور بعض پانی کی ضرورت نہیں رکھتے +

اور نباتات میں سب سے بڑی عجیب بات یہ ہے کہ ایک خاص نبات کو لو اور اس کے مختلف اجزاء کا امتحان کرو۔ جو خاصیت اس کے پھل میں پائی جاتی ہے وہ اس کی جڑوں اور پتوں میں نہیں اسی طرح بالکس بھی حالانکہ اس نبات کا مادہ ایک ہی ہے اور ایک ہی پانی

سے سیراب ہوتی ہے اور ایک ہی ہوا میٹھی اور روشنی سے تربیت پاتی ہے۔ کیا یہ عجائبات کسی مُبدع قادرِ حکیم۔ قادرِ عظیم کی قدرت کا اندک کا نتیجہ ہیں یا محض اتفاقیہ طور پر ظہور پذیر ہو سکتی ہیں؟ نہیں بلکہ یہ خالقِ حقیقی سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے وہ نعمتیں ہیں جن کا نہ تو شمار ہو سکتا ہے اور نہ ان کا شکریہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ وان تقدوا لعلہ لا یختصروہا۔

عالم نباتات میں محققین نے بعض جزائر میں ایک ایسے وخت کا پتہ لگایا ہے جس کا پھل پکی ہوئی روئی کی طرح گول ہوتا ہے اور جس کا وزن چوبیس ڈرام کے برابر اندازہ لگایا گیا ہے۔ عربی میں اس کو شجرۃ الخبز بولتے ہیں۔ ان جزائر کے لوگ اسے توڑ کر ویسے ہی کھاتے ہیں جیسے مصنوعی پکی ہوئی روئی کھائی جاتی ہے۔ اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں ایک قسم کا درخت پایا گیا ہے جس کے تنے میں شگاف کرنے سے گائے کی دودھ کی طرح تازہ دودھ بہتا ہے۔ اسی طرح برازیل میں ایک درخت پیدا ہوتا ہے جس کے پھل کاس لیموں کا سا ہوتا ہے اور اس کے تنے سے سفید اور لذیذ دودھ نکلتا ہے جو وہاں کے لوگوں کی بہترین غذا ہے۔

الارض عالم نباتات کے عجائبات لا تعدنی ولا تحصى ہیں جن کی تفصیل سوائے ان کے خالقِ حقیقی کے کوئی نہیں جانتا ہے۔

تأمل فی نبات الارض والنظر - الی آثار ما صنع الملیل

علیٰ قصب السمر بعد شہادت - بان اللہ لیس لہ شریک

یعنی زمین کی مختلف قسم کی نباتات میں غور کرو اور ان عجائب و غرائب آثار کو دیکھو جو ایک بے زبردست ماحولِ قدرت وابتِ اقدس کا نتیجہ ہیں۔

وہ آثار اپنی زبانِ حال سے بے حد عجب و شگاف کا قیمتی پتھر ہے۔ (مشافہ) پر اس امر کی بابت سچی شہادت دے رہے ہیں کہ اس خالقِ حقیقی کا کوئی شریک نہیں۔

ابو نواس کے ان ہر دو شعر کی تصدیق کرنا چاہو تو کسی توحۃً مغلز میں تھوڑی دیر کے لئے مختلف قسم کے پھولوں کے عجائبات میں غور کرو۔ یہیں بعض پھول ایسے بھی ملینگے جن کی پتیوں کے

مختلف حصص کے ہمیں مختلف رنگ نظر آتے گئے۔ ایک متبحر محقق کے لئے بس یہی ایک پتی بہرہ کامل کا کام دے جاتی ہے شیخ شیراز نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

برگ و جھت ان سبز و نظر پوشیار - ہر ورق و فقریت معرفت کردگار

انہی آؤ عالم حیوان میں غور و غوص کریں اور دیکھیں کہ سطح زمین پر کس قدر بیشمار حیوانات نظر آتے ہیں۔ ان کا وجود پذیر ہوتا اسی قانون کلی کے تابع ہے جو عالم نباتات میں عمل کر رہا ہے یعنی جس طرح نباتات غذا حاصل کرتی ہیں اسی طرح عالم حیوانات کی نشو و نما بھی مادہ غذائیہ پر منحصر ہے۔ ان میں سے انسان کو لو۔ وہ لقمہ کو منہ میں چباتا ہے اور وہ معدہ میں پہنچ کر مضغ قبول کرتا ہے جس سے قوائے طبعیہ اپنے حیرت انگیز عمل سے مادہ غذائیہ کو علیحدہ کر کے بدن کے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور فضلہ کو امعاء کے راستہ سے باہر پھینک دیتے ہیں۔

مادہ غذائیہ پاک و صاف ہونے کے بعد دوران خون کے ذریعہ سے ہر ایک عضو میں حصہ رسدی پہنچتا ہے۔ اسی مادہ غذائیہ کے ایک حصہ سے مادہ مٹی تیار ہوتا ہے جو رحم میں پیچکر بصورتِ علقہ متغیر ہوتا ہے اور بعد میں ایک مضغ کی شکل قبول کر لیتا ہے اور بتدریج نشو و نما پا کر انسانی صورت میں آجاتا ہے جس میں تمام اعضاء متشکل ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ جب اس کے ایامِ تربیت پورے ہو جاتے ہیں تو اس میں حیاتِ حیوانی جو حرکت کا موجب ہے پیدا ہو جاتی ہے اور مدتِ محینہ کو پورا کرنے کے بعد باہر آتا ہے اور پستانِ مادر سے محض: الہام ربانی اپنی غذا حاصل کرتا ہے اور بتدریج اس کے قوائے جسمانی اور قوتِ ادراک ترقی کرنے لگتے ہیں اور بالآخر وہ مختلف مراتبِ تربیت کو طے کر کے ایک عاقل - حکیم محقق انسان بن جاتا ہے اور عالم کائنات کی مختلف اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے "غبار اللہ احسن الخلقین" یہی حال دیگر انواعِ حیوانات کی پیدائش کا ہے مگر ہم یہاں انسان کی بعض جسمانی حصص کی بناوٹ پر مختصر طور پر بحث کرتے ہیں جس سے انسانی اعضاء کی ترکیب کے مصالح اور منافع سمجھیں آجائیں۔ اگر ہر ایک عضو کی بناوٹ کے متعلق حکمتیں اور مصلحتوں پر

بحث کی جائے تو سلسلہ کلام بہت طویل ہو جائیگا۔ ایک مختصر محقق غور کرنے سے بے شمار مصلحتوں پر نگاہ ہو سکتا ہے +

صانع حقیقی نے جسم حیدان کو ایک ہی ہڈی سے پیدا نہیں کیا بلکہ اس کا سہیل بہت سی ہڈیوں سے تیار ہوا ہے کیونکہ اگر ایک ہی ہڈی سے بنایا جاتا جو سر سے پاؤں تک سخت مکڑی کی طرح ہوتی تو اس کا تمام بدن نکما ہو جاتا۔ لیکن بہت سی ہڈیوں سے مرکب ہونے کی صورت میں کسی ایک کے ٹوٹ جانے پر دوسری کو اثر نہیں پہنچتا۔ مثلاً سر کی ہڈیوں میں غور کرو کہ اس کی صورت کنڈائی میں کس قدر بے شمار حکمتیں مندرج ہیں مثلاً سر کو گول پیدا کیا ہے کیونکہ مدور شکل ذوالاضلاع شکل سے کسی پتھر یا لکڑی کے گننے سے نسبتاً زیادہ محفوظ رہتی ہے آدمی کے سر کا کاسہ بہت سی ہڈیوں سے جو ایک خاص اندازہ و ترکیب سے باہم ملائی گئی ہیں مرکب ہے تاکہ وہ بخارات جو معدہ سے دماغ کو صحر و کرتے ہیں ہڈیوں کے جوڑوں سے خارج ہوتے رہیں اور آدمی تندرست رہے۔ اسی طرح جرم دماغ کے گرد اگر ایک باریک جھلی پیدا کی گئی ہے تاکہ جرم دماغ اور سر کی ہڈیوں کے درمیان حائل ہے اور برقی صدموں سے دماغ جلد متاثر نہ ہو۔ اور بہت سی باریک رگیں اس جھلی سے نکلی گئی ہیں جو سر کی ہڈیوں کے جوڑوں سے ملی ہوئی ہیں اور یہ رگیں جذبِ رطوبت کا کام کرتی ہیں۔ کاسہ سر کی ہڈیاں اس طرح جوڑی گئی ہیں جیچ چار دیواری اور چھت کی شکل میں کھئی گئی ہیں۔ علم تشریح الابدان کا ماہر ان ہڈیوں کی ترکیب و مصلحت سے بخوبی آگاہ ہے۔ اسی طرح نگلیوں کی بناوٹ میں غور کرو کیونکہ موجودہ بناوٹ کس قدر مشیما مصلحتوں پر مشتمل ہے۔ ہر ایک نگلی متعدد ہڈیوں سے مرکب ہے۔ اگر انگلی کی بناوٹ ایک ہی ہڈی سے ہوتی تو خیال کرو انسانی کاروبار میں کس قدر خلل پیدا ہوتا۔ اور اگر دو ہڈیاں ہوتیں تو پھر بھی موجودہ سہولت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ دونوں ہتھیلیوں کو ملانے سے ایک پیالہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وضع سے انسان جتنے کام کر سکتا ہے وہ سب کو معلوم ہیں اگر ہتھیلی کی ہڈیوں کو موجودہ نظام ترکیب میں نہ رکھا جاتا تو خیال کرو کہ کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا

ہاتھ کی انگلیوں سے اگر ایک انگلی بالخصوص انگوٹھا صانع ہو جائے تو دنیا کے کاروبار میں انسان ایک
 نکتی سستی سمجھا جائے۔ اور اگر موجودہ نظام کو بدل کر ان ہڈیوں کو کسی دوسری صورت میں ترکیب
 دیا جائے تو پھر بھی انسان کوئی کارآمد ہی ثابت نہ ہوگی۔ اور اس حکمت میں غور کرو کہ ہڈیوں کے
 دونوں طرف رباطات پیدا کر دیے ہیں تاکہ ایک ہڈی دوسری سے مضبوط طور پر وابستہ رہے
 اور اپنی جگہ سے ہٹ نہ سکے۔ انگلیوں کے سروں پر ناخن کے پیدا کرنے پر بھی غور کرو کیونکہ
 انسان اپنے ناخنوں کو بدن کے ٹھنڈے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے پکڑنے میں استعمال کرتا ہے
 اور ہمیشہ مستقل ہونے سے ضروری تھا کہ وہ گھس جائیں۔ اس لئے حکمت الہی متقاضی ہوئی کہ وہ ہمیشہ
 بڑھتے ہیں۔ پھر انگلیوں کی قوت لامسہ میں غور کرو۔ بالخصوص انگشت سبابہ جو اس قوت میں سب
 انگلیوں سے ممتاز ہے اور یہ اس لئے ہے کہ انسان سرد یا گرم یا خشک یا شیا کا امتحان کر سکے۔
 اسی طرح دیگر اعضائے انسانی کی بناوٹ اور مصالح میں غور کرو تمہیں حکم واسرار الہی
 کا ایک بحر زخار نظر آئے گا جن کو دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ اگر کوئی محقق آنکھ
 کی بناوٹ اور اس کے مصالح اور منافع میں غور کرے تو اسے یقین ہو جائیگا کہ مسد کے دانہ
 کے برابر آنکھ کی پتلی میں زمین و آسمان جیسے وسیع مخلوقات کا عکس کس طرح صحیح ادراک کا واسطہ
 بنتا ہے۔ انسان کی عقل اس کی علت کے سمجھنے سے قاصر ہے اور بے اعتیار زبان سے نکلتا
 ہے۔ ”تبارک اللہ احسن الخالقین“

منہ میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جس کا نام زبان ہے اور اس میں قوت لفظ رکھ دی گئی
 ہے۔ بے کے ذریعہ ہم اظہار مافی الضمیر کرتے ہیں اور دنیا کے کاروبار کا انحصار اسی گوشت کے
 ٹکڑے پر قرار دیا گیا ہے۔ کیا کسی کامل العتدہ والحکمۃ صانع کی تجویز کے بغیر ایسا ہونا عقل انسانی
 تسلیم کر سکتی ہے؟۔ فسبحان من خلق الانسان وعلمہ البیان“

الغرض اگر انسان کی جسمانی بناوٹ پر غور و خوض کیا جائے تو اس کو خالق حقیقی کی حکمت کا ملہ
 پر ایمان لائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ صدق اللہ تعالیٰ۔ ”وفی انفسکم افلا تبصرون“

عالم حیوانات میں ہم مختلف قسم کی مخلوقات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بعض تو بہت بڑے ہیں مثلاً ہاتھی اور بعض اس قدر چھوٹے کہ وہ خوردبین کے بغیر محسوس بھی نہیں ہوتے۔ پھر اگر ان کی جسمانی بناوٹ اور پیدائش اور حصولِ غذا اور مدتِ عمر اور ان کے دیگر آثار و خواص کے اختلافات پر غور کیا جائے تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ یہ قدرت و حکمت صرف اسی خالق و مدبرِ عالم کی ذاتِ اقدس سے مخصوص ہے جس کی صفاتِ کاملہ و لامتناہیہ کا اندازہ لگانا عقلِ انسانی کا کام نہیں اور جس پر کوئی قانونِ حکمران نہیں اور نہ کوئی ضرورت اسے مجبور کرتی ہے۔ عاجز انسان کو بغیر اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرنے کے کوئی چارہ نہیں۔ اس صانعِ حقیقی کے حیرت انگیز افعال کا اندازہ اور اس کی لامتناہی صفات کی حقیقت کا ادراک کرنا ایک امرِ محال کو ممکن بنانے کا ادعا کرنا ہے شیخ شیراز نے سچ فرمایا ہے اور ہر ایک عارفِ باللہ کا یہی مذہب ہے اور ہونا چاہئے۔ اے برتر از خیال و قیاس گمان و دہم و ذہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم و فر تمام گشت و بپایاں رسید عمر و ماہچنناں در اولِ وصف تو ماندہ ایم

مسئلہ تنزیہ و تشبیہ

قرآن خالص توحید اور مطلق تنزیہ لے کر آیا ہے اور کہہ رہا ہے ”کہ خدا ایک ہے۔ آنکھیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ اور وہ آنکھوں کا محیط ہے۔ اس کے مانند کوئی چیز نہیں۔“ محاورہ کی ضرورت اور دوزمرہ کے علاوہ جن باتوں سے کہ تشبیہ و تحسین کا لگانا ہو سکتا ہے قرآن نے ان سب سے کنارہ کیا حتیٰ کہ اس قول میں کہ ”اس پر (خدا پر) بہت آسان ہے“ مخلوقات کیساتھ چونکہ بظاہر مشابہت معلوم ہوتی تھی اس لئے اس کے بعد ہی کہہ دیا کہ ”اس کی مثال بہت اعلیٰ ہے۔“ اس باب میں قرآن تمام دوسری کتابوں سے جو تشبیہوں اور ادنیٰ درجہ کی مثالوں سے بھری ہیں فائق ہے۔ اس نے اس قسم کے اقوال سے کہ ”کوئی چیز ایسی نہیں جو خدا کی حدیں تسبیح نہ کرتی ہو“ اور ”آسمان و زمین میں کوئی ایسا ماں نہیں جو خدا کا بندہ نہ ہو“ بتا دیا کہ شجر و حجر و بشر

جتنے ہیں خدا کے سوا کسی کی پُرتش جائز نہیں "یا اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے
 مدد مانگتے ہیں" اس سے انسان کو اس کی حقیقت حال سے شناسا کر دیا کہ اُسے یہ لائق نہیں کہ
 خالق کے سوا کسی اور سے دُور سے اور ہر طرف سے جو اس کو توہمات گھیرے ہوئے تھے ان
 سے اس کو نجات دے دی۔ اس کے بعد خدا نے اس کو اطمینان دلا کر یہ بھی بتا دیا کہ میرا مہربان
 رحمت کرنے والا ہوں۔ ماں لڑکے سے جس قدر محبت کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ میں انسان
 پر پیوستہ کرتا ہوں۔ انسان کی شاہ رگ سے بھی قریب ہوں اور جب وہ دعا کرتا ہے تو میں
 اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ اس کے ان احسانات پر ایک مسلم باوجود اس کے عظمت و جلال
 کے دس کا قریب اس کر لیتا ہے۔ اور نافرمانی کی صورت میں اس کے عذاب سے ڈرتا ہے نہ
 اسے منہ خیال کر کے اسے پیا کرتا ہے اور مخالفت کی صورت میں اس کے عذاب سے ڈرتا
 ہے۔ ایسے نافرمانی کرنے پر بھی انسان اگر اس کی طرف رجوع کرے تو اس کے دروازہ کو
 کھلا ہوا اور اس کی محفرت کو وسیع پائیگا۔ چنانچہ فرمایا کہ اے میرے بندو کہ جو بے اعتدالیان
 کر چکے ہو خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ۔ خدا تمام گناہوں کو بخش دیکو اور وہی بخشے والا مہربان
 ہے۔ اللہ اکبر کہاں یہ اعتدال اعتقاد رکھاں ان لوگوں کا گمان باطل کہ جب تک انسان اپنے
 گناہ کا کفارہ خود بخود ہے خدا اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ گو وہ انکار کریں لیکن اس غلو سے ان
 کو شرک بتی میں اور تشبیہ و تمثیل اور مخالفت عقل و نقل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ افراط ہو چکا اب اس
 اعتقادی اعتدال کا ان لوگوں کی تقریط سے مقابلہ کیجئے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا ان سے
 دُور ہے اسے ان کی پرواہ نہیں اور وہ ان کے ساتھ بھلائی کرنا نہیں چاہتا۔

عیسائی پادریوں میں بعض مدعیانِ علم کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی کتاب میں کوئی ایسی آیت
 نہیں جو بندوں سے خدا اور خدا سے بندوں کی محبت پر دلالت کرتی ہو۔ اس میں جو کچھ
 ہے دُور و دُشست کی باتیں ہیں لہذا اس مقام پر میں اس مطلب کی آیتیں قرآن مجید سے لے کر
 درج کرتا ہوں۔ کہ وہ کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا بھی تم سے محبت

کرے گا۔ ایماندار خدا سے جبری محبت رکھتے ہیں۔ عنقریب خدا ایسی قوم کو لائے گا جو خدا سے محبت رکھتی ہو اور خدا ان سے۔ خدا کی محبت پر مال دیتے اور خدا کی محبت پر کھانا کھلاتے ہیں۔“ ان آیتوں میں رضا مندی۔ مہربانی۔ رحمت اور محفرت کے تذکرے ہیں جن کی مثال خود عیسائیوں کی کتاب میں بھی موجود نہیں۔ یہی کافی ہے کہ قرآن ہر ایک سورت کو اسمِ رحمن و رحیم سے شروع کرتا ہے۔ تو کیا یہ جیسا ہدیان کہتے ہیں مسلمانوں کا معبود منگدل ہے؟ اصل یہ ہے کہ تقصیب اندھا اور بہرہ بنا دیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس اعتقادِ صحیح کی وجہ سے روئے زمین سے بُت پرستی اور ان تمام عقیدوں کی جو صورتِ بُت پرستی سے مختلف ہیں مگر حقیقتاً اس سے متفق ہیں پوری بیخ کنی ہو گئی اور عقل ان تمام شہادت و خرافات سے جو دوسری قوموں کو گھیرے ہیں پاک و صاف ہو گئی۔ اس سے بڑی اور کیا اصلاح ہو گی؟

الغرض تنزیہ کا مفہوم یہ ہے کہ ذاتِ باری کو ان تمام صفات سے پاک مانا جائے جو مخلوق میں پائے جاتے ہیں اور تشبیہ سے مقصود یہ ہے کہ اس کے لئے ان تمام صفات کو ثابت کیا جائے جو مخلوق کے لئے ثابت ہیں مگر نہ تو تنزیہ کا یہ مطلب ہے کہ صفات کی بالکلیت نفی کی جائے اور نہ تشبیہ سے یہ مقصود ہے کہ اس کی صفات کی حقیقت مخلوق کی صفات کی حقیقت کا عین سمجھی جائے بلکہ اسلامی صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ذاتِ باری صفاتِ کاملہ سے موصوف ہے جنکی کنہ اور حقیقت مخلوق کی صفات کی طرح نہیں۔ آیہ۔ لیس کہ مثلہ شیئی سے اگر تنزیہ کی طرف اشارہ ہے تو اس کے الگ حصہ وہو السمیع البصیر میں تشبیہ کا اشارہ پایا جاتا ہے مگر یہ تشبیہ صرف لفظ سمع و بصر کے خالق و مخلوق ہر دو پر اطلاق کرنے سے مفہوم ہوتی ہے نہ ہر دو کے سمع و بصر کے یکساں ہو نیسے۔ اس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ ذاتِ باری کے صفات پر انہیں الفاظ کا اطلاق کیا جاتا ہے جو مخلوق کے صفات پر اطلاق کئے جاتے ہیں مگر ہر دو کے صفات کی حقیقت ایک نہیں۔ دیکھو قرآن مجید میں ذاتِ باری کے لئے یہ۔ وجہ۔ استوی وغیرہ صفات کا ذکر آیا ہے مگر ہم ان کی کنہ کے متعلق

کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ مخلوق کے یہ۔ وجہ۔ استوئی پر محمول نہیں کہے جاسکتے۔ ایسے آیات و تشابہات بولتے ہیں اور ان کے متعلق صحیح مذہب یہ ہے۔

تشابہ بخواں درو ما ویز - در خیالات پیہدہ بگرہ نزد

مسئلہ رویت ذات باری عزائمہ

مسئلہ رویت کا مفہوم یہ ہے کہ آیا کوئی شخص ذات باری کو آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:-

پہلی یہ کہ کوئی شخص دنیا میں دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق ائمہ اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ ذات باری کا آنکھوں کے ساتھ دیکھا جانا دنیا و آخرت میں عقلاً جائز ہے اور عالم آخرت میں سمعاً و نقلاً امر واقع ہے۔ البتہ اس بارہ میں اختلاف ہے کہ شرعاً دنیا میں رویت ذات باری جائز ہے یا نہیں۔ اس صورت کو بعض نے تو جائز رکھا ہے اور بعض نے انکار کر دیا ہے۔ تو جو لوگ دنیا میں اس کے اثبات کے قائل ہیں انہوں نے صرف حضور علیہ السلام کے لئے شریح مہراج میں رویت کا فتویٰ دیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ آپ نے روحانی طور پر شرف رویت حاصل کیا نہ ظاہری آنکھوں سے۔ اس لئے اگر کوئی شخص خواب کی حالت میں رویت کا مدعی ہو تو بعض عمامے نزدیک جائز ہے کیونکہ خواب کی حالت میں حقائق کا انکشاف تصورات مثالیہ کی صورت میں ہونا ممکن ہے اور بیداری کی حالت میں مدعی کا ایسا دعویٰ باطل ہے کیونکہ بیداری کی حالت میں حواس بصر کے ساتھ صرف ادویات کا اور اک ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر بیداری کی حالت میں الزامہ صفات اور آثار مصنیعات کے مشاہدہ کا مدعی ہو تو یہ صورت ناممکن نہیں جیسا کہ بعض اکابر صوفیائے کرام کی نسبت مروی ہے مولف تعریف جو بن تصوف میں ایک بے نظیر کتاب ہے اور جس کی نسبت ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ فن تصوف میں ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی لکھتے ہیں کہ اکابر شراح کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جو

شخص دنیا میں ان آنکھوں کے ساتھ ذاتِ باری کی رویت کا دعویٰ ہو وہ سخت گمراہ اور جھوٹا ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے اس نے خدا کے گوشناہت نہیں کیا۔ اگر کسی بزرگ سے غلیہ سُکر میں بے اختیارانہ اس قسم کے الفاظ منہ سے نکل گئے ہوں تو ان کی تاویل کی جائیگی کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ غایتِ استغراق و اشتغال کی حالت میں غائب حاضر معلوم ہو۔ چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے: "اَلَا حَسْبُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَانَ تَزَاهُ" یعنی احسان کے یہ معنی ہیں کہ تو خدا کی عبادت ایسے کرے گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ اور عبد اللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ انہوں نے حالتِ طواف کعبہ کے متعلق فرمایا: "کُنَّا نَتَزَاهٰی اللّٰهَ" یعنی ہم کھلم کھلا خدائے تعالیٰ کو دیکھتے تھے۔ صاحبِ عوارف لکھتے ہیں کہ اپنی کتابِ اعلامِ اہلِ ہند میں وہ عقیدہ اس بابِ المتقی میں لکھتے ہیں کہ ان آنکھوں سے فُتیتِ ذاتِ باری عالمِ دنیا میں دشوار ہے کیونکہ دنیا دار القلب ہے اور آخرت دار البقا۔ اکابرِ علماء کو اس دنیا میں ظلم البصیرین کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں انکے لیے عین البصیرین کا درجہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس امر پر جمیع علمائے امت کا اتفاق ہے کہ ان آنکھوں سے دنیا میں کوئی شخص ذاتِ باری کو نہیں دیکھ سکتا۔ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کی نسبت علماء کا اختلاف ہے اور بس۔ اس لیے اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے کہ وہ شرعاً واجبِ تشریہ ہے کیونکہ وہ مقتری علی اللہ ہے اور مقتری علی اللہ سے جرحہ کر کوئی شخص ظالم نہیں ہو سکتا اور شرعاً ایسا شخص کافر ہے۔ عقائد کی کتابوں میں یوں ہی لکھا ہے۔ عقائدِ مظلومہ کے اشتعال ذیل اس پر پرتا ہوا ہے۔

وَمَنْ قَالَ فِي الدُّنْيَا يَرَاهُ بَعِيْنُهُ ۖ قَدْ لَبَّ زَنْدِيقٌ طَغَىٰ بِتَكْذِبِهِ
وَحَالَفَ ۚ كُتِبَ لَهُ وَالسَّهْلُ كُلُّهَا ۖ وَنَرَاكَ عَنِ الشَّرْعِ الشَّرِيفِ وَالْأَعْدَاءِ
وَذَلِكَ مِمَّنْ قَالَ فِيهِ الْهَتَا ۚ يَرِي وَجْهَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اسْوَدًا
تَرْجُمُهُ ۚ جو شخص یہ کہتا ہے کہ دنیا میں اپنی آنکھ سے خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہے سو وہ زندقہ و

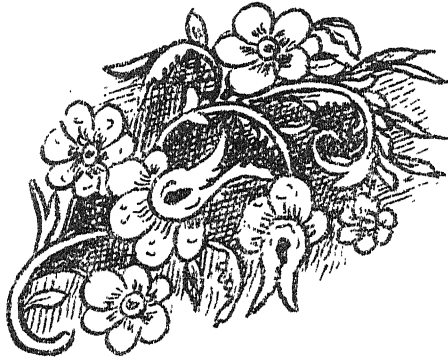
و کیش ہے اور جمیع کتب سہادیہ اور رسولوں کی مخالفت کرتا ہے اور شریعت حقہ سے ہر ت و ر
جا چڑتا ہے یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قیامت کے دن رُوسیا
اُٹھیں گے۔

حاصل یہ ہے کہ رویت ذات باری اولیا۔ اللہ کے لئے اس دنیا میں جائز نہیں کیونکہ
یہ ایک ایسا امر ہے کہ جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام رک و بیٹے گئے تھے بھلا کس فی اللہ
کا کیا ٹھکانا ہے ہم ادھر لکھ آئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرات علماء کا حجت
ہے۔ بہر صورت اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو اس صورت اگر اس کی تاویل کا قائل ہو تو ممکن
ہے اور وہ قابلِ تخرص نہیں بل صورت دیگر وہ گمراہ اور زندیق ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص بہ حالت خواب رویت کا دعویٰ ہو سو ایسی رویت
بلا کیفیت اور بہت من لوازم مادیات سے پاک ہو تو اکثر ائمہ کے نزدیک جائز ہے۔ چنانچہ
ایک طویل واقعہ میں امام ابو حنیفہؒ کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے حضرت
رب العزت کو نزائے دفعہ خواب میں دیکھا ہے اور اس کے بعد پھر ایک دفعہ دیکھا جس
سے توفیق کا دیکھنا پورا ہو گیا۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے
فرمایا کہ میں نے حضرت رب العزت کو خواب میں دیکھا میں نے عرض کیا کہ خدایا تیرا تقرب
کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ ارشاد ہوا اے احمد! میرے کلام سے۔ میں نے عرض کیا کہ
خدایا خواہ تیرے کلام کا کسی کو فہم ہو یا نہ ہو۔ فرمایا۔ فہم اور عدم فہم ہر دو صورت میں۔ اور
ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے "سأبیت ربی فی المنام"
اور بعض دیگر سلف صالحین کی نسبت بھی ایسا مروی ہے۔ اور یہ ایک متم کا مشاہدہ ہے جو اکابر
مقربین کو قلب کے ساتھ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ انکار نہیں ہونی چاہئے کیونکہ یہ
کسی شخص کا اپنا اختیار سی امر نہیں۔ امام رازیؒ "تائیس التقدیس" میں لکھتے ہیں کہ نبی اللہ
کا اللہ تعالیٰ کو کسی مخصوصہ صورت میں خواب میں دیکھنا جائز ہے۔ کیونکہ رؤیا کی حالت میں قوت خیال

کا نصف عالم مثال میں ہوتا ہے۔ اور اکثر مشائخ کرام کا اتفاق ہے کہ عالم آخرت میں فیات باری
مختلف صورتوں میں تجلیات فرمایگا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ عالم آخرت میں حقیقت رویت کی تصدیق کی جائے سو اس
پر تمام ائمہ اہل سنت والجماعہ کا اتفاق ہے جیسا کہ کتاب اللہ میں وارد ہوا ہے :- ”وجوه
یومئذ فاضرة الی ربھا فاطرة“۔ یعنی قیامت کے دن اہل جنت کے چہرے
تر و تازہ ہوں گے جو اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور احادیث صحیحہ میں ایسی تصریحات
بکثرت موجود ہیں مگر مختزلہ رویت کا انکار کرتے ہیں۔



باب سوم

کیا انسان طبعاً آزاد ہے؟

جو چیز مخلوق ہے وہ محتاج بھی ہے اور جو چیز محتاج ہے وہ آزاد نہیں کہلا سکتی کیونکہ انسان محتاج ہے اس لئے وہ طبعاً آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس امر کی دلیل کہ ہر ایک مخلوق محتاج ہوتا ہے صاف ظاہر ہے کیونکہ مخلوق محلول ہے اور محلول اپنے وجود میں علت کا محتاج ہے۔ رہا یہ قضیہ کہ محتاج آزاد نہیں ہو سکتا سو یہ بالکل واضح ہے کیونکہ احتیاج اور آزادی میں باہم ضدیت کی نسبت ہے اس لئے اگر آزادی کے یہ معنی لئے جائیں کہ انسان جن امور کی خواہش کرے اسکو بلا روک ٹوک کر سکے تو یہ سراسر باطل ہے کیونکہ بے شمار ایسے امور ہیں جن پر انسان قدرت نہیں رکھتا پھر وہ آزاد کیسے کہلا سکتا ہے اور جب آزاد نہیں تو قابل غور یہ امر ہے کہ ایسی آزادی ہے کہ کوئی طاقت مانع ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی مخلوقیت ہی فیصلہ کئے دیتی ہے کہ وہ فطرتاً آزاد نہیں پیدا کیا گیا اس لئے اس کا محدود الاختیار ہونا اس کے خالق کے ارادہ انہی پر مبنی ہے جس نے اپنی حکمت کاملہ سے اس کو ایسے قویٰ دیئے جن کا عمل ایک حد میں سے متجاوز نہیں ہو سکتا۔ آیہ ”انما کلت شیئ خلقہ بقدر“ یعنی بیشک ہم نے ہر ایک شے کو ایک اندازہ معین پر پیدا کیا ہے جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ انسان طبعاً آزاد نہیں پیدا کیا گیا تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہے کہ اس کی محدود عقل ایک حد میں سے باہر نہ جاسکے۔ اس لئے یہ لزوماً تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک متناہی ہستی (انسان) ایک غیر متناہی ہستی (ذات باری) کا کبھی بروہ اور اک احاطہ نہیں کر سکتی اور نہ وہ اس کے صفات و افعال کی حقیقت کو پورے طور پر سمجھ سکتی ہے۔

اور اگر آزادی کے معنی لئے جائیں کہ انسان اپنے محدود قویٰ کے عمل میں آزاد پیدا کیا گیا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں بلکہ اگر ہر ایک انسان کو عقلی بالطبع قرار دیا جائے یعنی اس کے طریق عمل پر کسی قسم کی رکاوٹ عائد نہ کی جائے جس سے کہ وہ مقید ہو کر اپنی روش زندگی پر چلا کرے تو سلسلہ نظام عالم ایک ہی آن میں دو ہم برہم ہو جائے اور سلسلہ تمدن و معاشرت جو انسانی زندگی کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔ اس بیان سے واضح ہو گیا کہ انسانی عقل و عقلی و حیوانی کے طریق عمل کی نوعیت قائم کرنے کے لئے کسی ایسے قانون کلی کی ضرورت ہے جس سے نظام عالم بہترین صورت میں قائم رہ سکے۔ ہم آئندہ ادراک میں اللہ اللہ تعالیٰ اس امر کو ثابت کرے کہ وہ قانون کلی صرف قانون شریعت ہی ہے اور بس۔

اس موضوع پر ہمیں بحث کرنے کی ضرورت نہ تھی مگر بعض اوقات مغربی خیالات سے متاثر ہونے والے جہاں تعلیم یافتہ سے سنا جاتا ہے کہ آزادی انسان کا طبعی حق ہے جس کا وہ یہ مطلب لیا کرتے ہیں کہ قانون شریعت کی پابندی ضروری نہیں۔ ہمارے خیال میں دوسرے لفظوں میں اس جملہ کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو انسان بننے کی ضرورت نہیں۔ مگر ان جاہلوں سے اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ جب انسان طبعاً آزاد ہونے کی وجہ سے قانون شریعت کی پابندی سے آزاد ہو سکتا ہے تو کیوں وہ قانون کلی سے آزاد نہیں ہو سکتا؟ قانون کلی خواہ مخواہ پابندی ہو یا جمہوری ہر دو صورت میں انسان کو اپنے ملکی قانون کی پابندی لازم قرار دی گئی ہے اور عدم پابندی کی صورت میں جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے مگر حق یہ ہے کہ قانون ملکی کی پابندی ڈنڈے کے زور سے کرائی جاتی ہے اور قانون شریعت کی پابندی جہاں لئے اختیار ہی قرار دے رکھی ہے تعویب ہے کہ قانون شریعت کے بہ جبر منوائے پر تو انسانی آزادی کے سلب ہونے کا اعتراض عائد ہوتا ہے۔ مگر یہ قانون ملکی کا ذکر آتا ہے تو بجز تسلیم خم کئے کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ عذر کا قول بالکل صحیح ہے کہ ”ماینزع السلطان اکثر ماینزع القرائن“ یعنی جن امور

کی روک تھام حکومت وقت کر سکتی ہے ان کی مقدار قرآن مجید کی روک تھام کی مقدار سے کہیں زیادہ ہے ۔

یہ جملہ اکثر سنا جاتا ہے کہ مذہب کے بارہ میں ہر ایک شخص کو آزادی کا حق حاصل ہے مگر یہ سخت جاہلانہ خیال ہے جو سترہین مغرب کی دہریہ پسند سوسائٹی میں عام طور پر صحیح تسلیم کیا گیا ہے مسئلہ جہاد کی بحث میں انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس خیال کی نفویت اور بطلان کا تار و پود کھول کر دکھلائیں گے ۔ ”والتوفیق من اللہ تعالیٰ“

انسان شرف الکائنات

اگرچہ مسئلہ بہت دقیق نہیں مگر کسی قدر تشریح کا محتاج ہے انسان کی ماہیت کو خود کتاب اللہ میں بیان کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا :-

”الٰہی خالق لبشر اٰس طین فاذا نسوٰیہ ولفخت فیہ من سر و حی ففعلوا لہ سجدین“

اس نص قرآنی سے انسانی ماہیت کا دو جز سے مرکب ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جز اول کا نام جسم ہے اور فقط طین اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جز دوم روح ہے جس کا صراحتاً دوسرے جملہ میں ذکر فرمایا اور تیسرے جملہ میں اس کو مسجود ملائکہ قرار دیا۔ جس سے انسان کے اشرف الکائنات ہونے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ امر اس خالق حقیقی کی حکمت کا ملکی نتیجہ ہے کہ اس نے محض اپنی رحمت انبی سے ایک خیمیں اور ذلیل چیز کو ایک شریف اور پاک چیز کے ساتھ تعلق بخشا اور ہر دو کی ترکیب سے ایک ایسا مخلوق پیدا کیا جس میں عالم مادی کثیف اور عالم روحانی لطیف ہر دو کے خواہیں اور جو ہر قابلیت موجود ہیں جز مادی کی جہت سے وہ شہوات اور لذائذ کا طالب ہے اور جز روحانی کی جہت سے وہ کمال علم معرفت کا مستحق۔ اور ان ہر دو متضاد جہتوں پر حاوی ہونے کی قابلیت کسی دوسرے مخلوق میں موجود نہیں۔ گویا انسان ایک نزع کبریٰ ہے جس میں ہر دو جہت کے آثار و خواص پائے جاتے ہیں اور اسی دو جہتی پراس کو

معترض متحان میں لایا گیا ہے جس کا اشارہ آیہ ۱۱ لیبکو کما یکم احسن عملاً میں کیا گیا ہے ۔
اب آدم انسان کی اس دو جہتی کو ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کریں اور اس امر کو واضح کریں
کہ وہ کیوں مجبورِ خلاق قرار پایا اور کیوں اس کو "وَلَقَدْ كَسَرَ مَنَا بَنِي آدَمَ" کے معزز خطاب سے امتیاز
بخشا گیا اجمت مادی کے رُوس ہم دیکھتے ہیں کہ وہ عالم کائنات کی ہر ایک چیز کو اپنے تصرف میں
لانا ہے اور ہر ایک سے اپنی خدمت کا کام لیتا ہے ۔ عالم کائنات کا ایک ایک ذرہ خواہ راضی ہو یا سادی
بالواسطہ یا بلا واسطہ حضرت انسان کی خدمت میں لگا ہے جس کی تصدیق کیلئے کتاب اللہ شاہد ہے
"اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَانْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجَ بِهِ مِنَ
الشَّجَرٰتِ مَرْهَنًا قَالَتْ لَهُمْ وَسَخَّرَ لَكُمْ الْفَلَاحَ لَتَجْزِيَّ فِي الْيَوْمِ يَوْمَئِذٍ وَ سَخَّرَ لَكُمْ
الْاَنْهَارَ وَ سَخَّرَ لَكُمْ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَ ابْيَضَّ وَ سَخَّرَ لَكُمْ الْبَلِيلَ وَ الْنَهَارَ اَتَكْفُرُ
مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ - وَ اِنْ تَعَدَّ وَالْغَمَّةُ اللّٰهُ لَا تَحْصُوْهُ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ"۔

اس آیت شریفہ کے ایک ایک لفظ میں غور کرو تمہیں مجبوراً ایمان لانا پڑے گا کہ انسان کے اشرفیت
کائنات ہونے پر ایک ایسا مستحکم اور مضبوط استدلال پیش کیا گیا ہے جس کی تصدیق کے لئے صحیفہ
فطرت کا مطالعہ کرنا ایک سچے گواہ کا کام دیتا ہے اور جس کی صداقت کے مان لینے میں کسی کو بھی سببِ رُو
کلام کرنے کا حوصلہ نہیں ! الغرض تمام جمادی - نباتی - حیوانی اشیاء انسان کے مفاد کے لئے پیدا کی گئی
ہیں اور ان سے انسان مختلف طریق پر منتفع ہوتا ہے ۔ اسی طرح کائنات التجو یعنی البرق - برق - باد و
باران وغیرہ حسبِ قدر انسان کی معرفت کو رفع کرنے میں لگے ہیں اور اجرامِ سماوی کی گردش
اور رات و دن کا یہ پھیر اور موسموں کا تغیر و تبدل یہ سب کچھ حضراتِ انسان کی خاطر اپنے اپنے کام
میں لگے ہیں ۔ اگر ایک دن کے لئے فرض کریں کہ کوئی فردِ انسان اس دنیا میں موجود نہیں تو کیا بتا سکتے
کہ ان اشیائے کائنات سے منتفع ہونے کے لئے اور کونسا گرمی قدر مخلوق موجود ہے جو انسان کا
قائم مقام ہو سکے ؟

یقین میدان کہ ماچندیں غرائب - زہرہ ریک دلِ بِنِا ہا دیم
 انسان جوں جوں اپنے معلومات میں ترقی کرتا جائیگا اس کی ضرورتوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا
 جائیگا اور جو اشیاء استعمال میں نہیں آئیں وہ سب انسانی زندگی کیلئے ضروری سمجھی جائیگی۔ عناصر سے آج سے
 چند سو سال پہلے محدود کام لئے جاتے تھے۔ مگر ہماری آنکھوں کے سامنے ہی اُسے سینکڑوں کام لئے جانے لگے
 ہیں۔ واللہ اعلم البیدہ فلسفے اُن سے کیا کیا کام لینگی۔ یہ ہے انسان کی شرفیت کی دلیل بجا طوا دی جہت کے۔
 اب آؤ اس کی اشرافیت پر روحانی جہت سے استدلال کریں۔ ایک حیوانی جسم ہونے کی
 جہت سے انسان کو دیگر حیوانات پر کوئی وجہ ترجیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ جس طرح دیگر حیوانات
 ضرورت تغذیہ اور تنمیه اور بقائے نوع اور دیگر ضروریات حیوانی کی طرف طبعاً مائل ہوتے ہیں اسی
 طرح انسان بھی ان طبعی ضرورتوں کے زیر اثر رہ کر زندگی بسر کرتا ہے یہی وجہ کہ کتاب اللہ میں
 ان لوگوں کی مذمت وارد ہوئی ہے جو نوع انسان کا ایک فرد ہو کر مذکورہ بالا طبعی ضروریات تک
 محدود رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ ”یا کُلون کما تأکل الا طعاماً“ یعنی گائے۔ بکری۔ اونٹ کی طرح
 پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا۔ ”اولئک کا لا طعاماً“۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر
 انسان اپنے فرائض کو اسی حد تک محدود رکھے تو وہ چوپایہ حیوانوں سے بھی زیادہ خس و ذلیل ہو جاتا ہے
 قوتِ جسمانی میں ہاتھی اور شیر اور غنصب اور شہوت میں دیگر درندہ اور وحشی حیوانات انسان سے کہیں زیادہ
 امتیاز رکھتے ہیں۔ اگر انسان نہیں حیوانی لوازم مذکورہ تک ہی محدود رہتا تو آج انسانی ترقی کا سلسلہ
 اس موجودہ صورت تک نہ پہنچ سکتا۔ نہیں بلکہ ماہیتِ انسانی کا صحیح معیار جو ہر عقل پر مقرر ہے۔ یہ جو ہر
 وہ نور ہے جو فطرتِ انسانی میں ولایت رکھا گیا ہے جس کے فرائض وہ حقائق اشیاء کا اور اک کرتا اور نیک
 بد امور میں امتیاز کرتا ہے اور اسی نورِ فطرت پر حکم ”انی جاعل فی الارض خلیفۃ“ اس کو خلافت
 الہیہ کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے اور اسی منصب پر مبعوث ہو کر اس کو یہ استحقاق حاصل ہوا کہ
 کائناتِ ارضی و سماوی کی ہر ایک چیز میں تصرف کر کے عجیب غریب علوم و فنون کو ترتیب دے
 جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں مگر اشیائے کائنات میں تصرف کر کے علوم و فنون کی ایجاد و جو انسان

کی حقیقی غایت نہیں کہلا سکتی بلکہ یہ علوم و فنون صرف اس کی مادی زندگی کو بہترین صورت میں لانے کے لئے سہولتیں پیدا کر سکتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ اس کے حصول غایت کے لئے بمنزلہ اسباب ہیں اس مقام پر یہ سوال طبعاً پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے وجود کی غایت کیا ہے یا یوں کہو کہ انسان کے وجود سے مقصود بالذات کیا امر ہے؟ قبل اس کے کہ اس سوال کا جواب دیا جائے ہیں یہ واضح کر دینا چاہئے کہ امر مقصود بالذات کی حقیقت کیا ہے۔ واضح ہو کہ امر مقصود بالذات اس امر کو کہتے ہیں کہ جس کے حصول پر آئندہ کسی امر کے حاصل کرنے کی خواہش باقی نہ رہے اور جو امر مقصود بالذات کے حاصل کرنے کے لئے واسطہ ہو یا بمنزلہ شرط ضروری سمجھا جائے اسے مقصود بالعرض کہتے ہیں۔ اس تشریح کے رد سے غور کر کے دیکھ لو کہ اگرچہ عام بول چال میں دنیا میں کئی امور ایسے ہیں جن کو ہم مقصود بالذات کہہ سکتے ہیں مگر دراصل وہ مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ ہر ایک امر یا ہر ایک فعل جو ہم سے صادر ہوتا ہے کسی آئندہ دوسرے امر یا فعل کے لئے واسطہ یا شرط سمجھا جاتا ہے اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے تمام امور جو ہماری دنیوی زندگی میں پیش آتے ہیں مقصود بالذات نہیں اور غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ جب تک ہماری دنیوی زندگی کا سلسلہ جاری ہے ہم مقصود بالذات کو کبھی نہیں پاسکتے۔ اس مقام پر یہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ انسان کے وجود سے مقصود بالذات کیا چیز ہے؟ دوم یہ کہ اس کے حصول کا کیا طریقہ ہے؟ اگر ان ہر دو سوال کا صحیح جواب مل جائے تو انسان کے اشرف کائنات ہونے کا مسئلہ خود بخود حوصاف ہو جائیگا۔

انسان کا وجود کی غایت مقصودہ پر دل ہے

اگرچہ آیہ ”وَبَنَّا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا“ یہ آواز بلند ایک محقق کو تھا لائق اشیاء میں غور تفکر کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہے اور محققین کی طبائع بحکم ”یتفکرون فی خلق السموات والارض“ ہمیشہ حقیقہ فطرت کے مطالعہ میں مشغول رہتی ہیں مگر یہ امر مسلم ہے کہ کسی علمی نتیجہ کی فضیلت و شرافت اس کے موضوع کی فضیلت و شرافت پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ مثلاً ایک طبیب بیطار کی نسبت زیادہ شریف

سمجھا جاتا ہے کیونکہ طبیب انسانی امراض کا علاج ہے اور بیطار بہائم کے امراض کا چونکہ انسان افضل و اشرف ہے اسلئے طبیب بھی افضل ہونا چاہئے اس لئے حقیقت انسان کا محقق دیگر اشیا کے کائنات کے محقق کی نسبت زیادہ شریف سمجھا جائیگا۔ آیہ ”لقد خلقنا الانسان فی احسن تقوید“ انسان کی جسمانی اور روحانی ہر دو جہت کی افضلیت پر دال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خالق حقیقی نے جس طرح جسم کی انسانی بناوٹ و دیگر حیوانات کی نسبت کلم ”و صورکم فاحسن صورکم“۔ اشرف و اعلیٰ پیداکر ہے اسی طرح اس کی روحانی اور معنوی صورت کو بھی معرفت حقائق اشیا کے زیر سے آراستہ کیا ہے۔ اور اس صورت معنوی کا کمال جس پر لفظ انسان کا اطلاق حقیقی طور پر کیا جاتا ہے اس کے علمی اور علمی کمالات پر منحصر ہے۔ اس آیت کا استشائیہ عربی یعنی ”الا الذین امنوا و عملوا الصالحات“ چاہئے اس معنی کی تصدیق کرتا ہے۔ کیونکہ ایمان اور اعمال صالحہ انہی ہر دو قوت کمال علم و عمل پر دلالت کرتے ہیں۔ اور لفظ ”علمت“ سے جواب ”ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا“ وار د ہوا ہے۔ کمال علم و عمل ہی مراد ہے کیونکہ خیر کثیر کا وجود بجز ان ہر دو کمال کے مقصور نہیں مگر کمال علم و عمل کا مفہوم کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے۔

ایک حدیث قدسی میں وار د ہوا ہے: ”كنت کنزاً مخفياً فاجبت ان اعرف فخلقت الخلق“ یعنی میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوقات کو پیدا کیا اب کیفیاً یہ ہے کہ اس معرفت الہی کا ستر اور کونسا مخلوق ہے؟ اس سوال کا جواب بھی خود کلام الہی میں دیا گیا ہے ”انا عرفنا الامانة على السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها فحملها الانسان انه کان ظلو ما جھولا“ یعنی ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں۔ زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا سو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور حضرت انسان نے اسے اٹھا لیا بیشک انسان بڑا بے الضاف اور بڑا نادان ہے۔ لفظ امانت کی تفصیل میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ مگر قریباً قریباً قدر مشترک سب میں پایا جاتا ہے۔ توحید ذات باری محبت الہی۔ دین اسلام۔ خلافت الہی کچھ کہو مگر تعلق الوصیت اور عبودیت کی حقیقت کا مفہوم تمام

وجہ مذکورہ میں کیساں طور پر موجود ہے اور اسی کا نام معرفتِ قاتِ باری ہے جس کی حقیقت مقامِ عبودیت میں منکشف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیفیتِ معراجِ نبوی کے بیان کرتے وقت لفظِ "عید" کا استعمال فرمایا۔ حیت قال "سبحن الذی اسرأٰ لعبدا"..... الخ۔ اس آیت شریفہ میں لفظ "عید" سے حضور علیہ السلام کے کمالِ عبودیت کی طرف اشارہ مقصود ہے اور اسی عبودیت کی طرف افرادِ جو جن انسان کو بھی دعوت دی گئی ہے چنانچہ فرمایا "وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون"۔

واضح ہو کہ عبادت اور عبودیت اگرچہ دو متحد الاصل لفظ ہیں مگر اصطلاحاً دونوں کا مفہوم ایک نہیں۔ کیونکہ عبادت تشریعت کے ادا و نواہی کے بجالانے کا نام ہے جن میں اعضاء اور جوارح کو عمل میں لایا جاتا ہے اور یہی عمل جب اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے آثار "عید" کے ظاہر اور باطن میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اور جو جن معرفتِ صفات کا علم وسیع ہوتا جاتا ہے اور جلال و جبریت الہی کا اس کے قلب پر غلبہ ہوتا جاتا ہے اور اپنے تئیں اس کی رحمت اور ربوبیت کا مورد دیکھنے لگتا ہے تو وہ اپنے تمام ارادات اور افعال کو رضائے مولیٰ کے تابع کر دیتا ہے اور بحرِ مشیتِ ازلی کے اپنے ظاہر اور باطن اور اسی طرح عالمِ خارجی کے ایک ایک ذرہ میں کسی غیر کو موثر نہیں دیکھتا اور سلسلہ اسباب کو جو جہاں کی نظر میں موثر نظر آتا ہے بالکل ساقط الاعتبار سمجھ لیتا ہے۔ الرض تمام اشیائے کائنات کو ارادۂ ازلی کے سامنے مقہور و مغلوب پاتا ہے اور "وما تشاؤون الا ان یشاء اللہ" کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر عبادتِ نفس کے حملہ سے مقامِ اطمینانِ قلب پر اس کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اس مقام کے بعد کے حوال و وارادات جو قلبِ عبد پر منکشف ہوتے ہیں اس قابل نہیں کہ انہیں ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔

دریں مشہد کہ النوارِ تجلی است - سخن دارم ولے ناگفتن اولی است

یہ ہے عبد کمال کا مقامِ عبودیت۔

اس بیان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ عبادت مقامِ عبودیت کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ جب تک کوئی شخص مقامِ عبادت میں مستقل حاصل نہیں کر لیتا عبودیت کی منزل کاٹے کرنا اس کے لئے

ناممکن ہے +

واضح ہو کہ مقام عبودیت کا کمال صرف حقیقت یقین کے منکشف ہونے پر منحصر ہے جب تک یقین کے سہ گانہ مدارج پر ترقی حاصل نہ ہو عبد کو عارف کامل ہونا نصیب نہیں ہوتا۔ پہلا درجہ علم الیقین کا ہے مثلاً دوسرے لوگوں کی شہادت سے کسی کو بھی یقین حاصل ہو کہ آگ جلایا کرتی ہے دوسرا درجہ عین الیقین کا ہے مثلاً وہ شخص آگ کو کسی چیز کو جلاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ تیسرا درجہ حق الیقین ہے مثلاً وہی شخص اپنا ہاتھ آگ میں جھونک دے۔ ظاہر ہے کہ ان ہر مراتب یقین میں نمایاں فرق ہے اور سب سے آخری درجہ یقین کا حق الیقین ہے جس سے آگے اور کوئی درجہ یقین کا باقی نہیں رہتا۔ ”ولیس ولاء عبادان قسریۃ“ شکوک اور دساوس کو صرف علم الیقین کی حالت میں فعل ہو سکتا ہے جیسا کہ عام لوگوں کی اعتقادی حالت مشاہدہ میں آتی ہے۔ اور اسی حالت میں استدلال کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس سے آگے استدلال ساقط ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مقام مشاہدہ میں استدلال کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ ”ایہ واعبد سر بلحی یا تیلک الیقین“ میں مفسرین نے یقین کی تفسیر موت سے کی ہے اور حقیقت صحیح ہے کیونکہ یقین کا آخری درجہ صرف کیفیت موت کے طاری ہونے پر کامل ہوتا ہے جس کا اشارہ آیہ۔ ”فلکشفنا عنک غطاءک فبصرک الیوم حدید“ میں کیا گیا ہے مگر اخضع خواص کے لئے ممکن ہے کہ کیفیت موت کے طاری ہونے سے پہلے ہی اس مقام پر داخل ہو جیسا کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔ ”لو کشف الغطاء لَمَا اذودت یقیننا“ یعنی اگر حجاب بشریت ابھی سے اٹھادیا جائے تو میرے یقین میں کچھ ترقی نہ ہوگی۔ یہی مقام عبد کامل کے لئے کمال عرفان کا مقام ہے جس کی کیفیت کے بیان کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ اور نہ عامہ ناس کے اذہان اس قابل ہیں کہ ان حقائق کو بذریعہ الفاظ اخذ کر سکیں۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے۔ ”تکلموا بالناس علی قدر عقولہم“ +

ممکن ہے کہ ایک فلسفی استدلال کا دلدادہ جو ان کیفیات سے مطلق بنے بہرہ ہو انسان کے

ان مدارج کمال تک ترقی کرنے کا متعقد نہ ہو مگر ہم ایسے اصحاب کو اس امر میں غور کرنے کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ جس طرح ایک لادھی محقق کی تحقیق کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ وہ اپنی مدت العمر میں بھی تحقیق کی آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح ایک عارف ربانی عرفان کے لاشاہی بیابان میں جس منزل پہنچتا ہے وہ ہنوز ابتدائی منزل پر کھڑا نظر آتا ہے۔

اے برادر بے نہایت درگاہے ست - ہرچہ کا خجما میر سی بروئے مالیت

انسان کی فطرت اس بات کی نہادیت دے رہی ہے کہ اس کی ہستی ایک لامتناہی ترقی کی قابلیت اپنے ساتھ رکھتی ہے اور یہ ترقی کسی خاص فرد انسانی کی ذات سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا تعلق حقیقتِ ذریعہ انسانی کے ساتھ ہے۔ اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے لئے مقصود بالذات تعلق الہیت اور عبودیت کا مجملہ ہے جس کو معرفتِ ذاتِ باری کہتے ہیں۔

اب ہم دوسرے سوال کے جواب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:-

جب یہ معلوم ہو چکا کہ کمال معرفت انسان کا مقصود حقیقی ہے تو اس مقصود کے حاصل کرنے کی ضرورت بھی انسان کا فطری تقاضا ہے۔ مگر یہ تقاضائے فطرت بسا اوقات جذباتِ نفس کے غلبہ میں عامہ ناس کو محسوس نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ عمر بھر مغلوب النفس رہ کر اس سعادتِ غلطی کے حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ جوہرِ قابلیت مختلف مدارج پر ہر ایک فرد بشر کی طبیعت میں ولایت رکھا گیا ہے۔ مگر جب تک اس کو مناسب تدابیر سے معرضِ ظہور میں نہ لایا جائے انسان جذباتِ نفس کے پھندے سے ہرگز نجات نہیں پاسکتا بلکہ اس کی وقتِ مطلق حیوان کی وقتت سے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ ”ایہ“ قد افلم من نہ کھا و قد خاب من دسھا“ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی مثال بینہ و دھوکہ کی سی ہے کہ جس میں روضن موجود تو ہوتا ہے مگر جب تک مناسب تدابیر کو عمل میں نہ لایا جائے روضن حاصل نہیں ہوتا ”ایہ“ والذین جاہدوا قینا لنھدینھم سبنا“ سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ حصولِ معرفتِ ذاتِ باری کے لئے ریاضت و مجاہدت

کی ضرورت ہے۔ اسی بنا پر ملت اسلام میں عبادات کی مختلف صورتیں بتلائی گئی ہیں جن پر کاربند ہونے سے انسان اپنے مقصود حقیقی کو پالیتا ہے۔ عبادات کے متعلق احکام شریعت اسلام میں کھول دیئے گئے ہیں۔ چونکہ شریعت قانون الہی کا نام ہے جو بذریعہ وحی ناطق بنی معصوم کے ذریعہ بنی آدم کو پہنچائی گئی ہے۔ اس لئے ریاضت و مجاہدت کا طریق صرف شریعت حقہ سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔ نبی اللہ اس ریاضت و مجاہدت کا بہتر سے بہتر نمونہ عملی پیش کیا کرتا ہے اور وہی طالب مقصود کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ اے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ میں اسی بہترین نمونہ کو پیش کیا گیا ہے جس کو اصطلاحاً اتباع سنت سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا "قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ"۔

مسئلہ شرف انسان میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ تمام اشیائے کائنات بالواسطہ یا بلا واسطہ انسان کی خدمت میں لگی ہیں اس لئے تمام اشیاء بہ حیثیت مجموعی انسان کے لئے مقصود حقیقی کے حاصل کرنے میں بمنزلہ اسباب کے ہیں چونکہ یہ امر صاف اور واضح ہے لہذا اس کی تفصیل کی کچھ ضرورت نہیں۔

شیخ شیراز کے اس قطعہ میں غور کرو:-

ابر و باد و مه و خورشید و فلک در کارند تا تو نمانی بکفت آری و بقتلت نخوری
ایں همه بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرط انصاف نباشد کہ تو فراں نیری

انسان ابتداء انسان پیدا ہوا ہے

انیسویں صدی عیسوی میں سرزمین مغرب کے ایک مادی فلسفی نے جس کا نام ڈارون تھا ایک نظریہ قائم کیا کہ انسان اپنی ابتدائی پیدائش میں انسان پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا آغاز مادہ سسٹم سے ہوا جو تدریج عناصر کی شکل میں منتقل ہوا اور عناصر سے مادہ حیوانی کی صورت (پروٹوپلازم) میں۔

پھر اپنی درجہ کے حیوان کی صورت میں۔ پھر ترقی کرتے کرتے بندر کی صورت میں۔ پھر بنی انسان کی شکل میں اور بالآخر انسان کی شکل میں نمودار ہوا۔ اس نظریہ کی تائید پر یہ حکم ”کل جدید لذید“ اور اُدھر سے بہت سی مادہ پرست طبیعتیں جھک پڑیں بالخصوص وہ لوگ جو قیود مذہب سے آزاد ہیں اس کی تصحیح پر آمادہ ہو گئے۔ ڈارون کے اس خیال کی اصل قانون ارتقاء پر مبنی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مرکب شیا اپنی ابتدائی پیدائش میں اس موجودہ شکل و صورت میں نہ تھیں بلکہ مختلف قسم کی صورتوں میں منقلب ہوتے ہوتے بالآخر اپنی اپنی موجودہ صورتوں تک پہنچ گئیں۔ نظریہ کی اصل تو اتنی ہی ہے مگر جو دلائل اس کے متعلق دیئے گئے ہیں وہ ظنیات سے زیادہ کچھ وقت نہیں لکھتے ”ان الظن لا یغنی عن الحق شیاً“ قوانین منطقی کے رُوسے مقدمات ظنیہ سے جو نتیجہ نکالا جاتا ہے وہ بھی ظنی ہوا کرتا ہے ہم اہل اسلام اپنے عقائد کی بنیاد قیاسات ظنیہ پر قائم نہیں کرتے اور ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ بمقابلہ دیگر مذاہب صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے ہر ایک عقیدہ کی بنیاد مقدمات یقینیہ پر قائم کی اور میدان استدلال میں للکار کر اپنے مخالفین کے کہا۔ ”ہا تو اب رہا نکم ان کنتہ صدقین“۔ یعنی اگر سچے ہو تو اپنے دعویٰ میں حجت قطعی پیش کرو۔ چونکہ کتاب اللہ میں مذکورہ بالا عقیدہ کی صریح تائید موجود ہے اس لئے ہم اس نظریہ کے قائلین کے خرافات کو سرسریہ اور باطل سمجھتے ہیں۔ قرآن مجید چونکہ ہر ایک باطل مذہب کے رد کا متکفل ہے اور قیامت تک متکفل رہے گا مذکورہ بالا نظریہ کے رد میں ارشاد فرماتا ہے ”ما اشہد قلہم خلق السموات والارض ولا خلق انفسہم“ یعنی میں نے انہیں آسمان اور زمین اور خود انہیں پیدا کرتے وقت گواہ نہیں بنالیا تھا یعنی یہ لوگ جو زمین و آسمان اور انسان کی پیدائش کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں محض ظن اور اُھل سے کہتے ہیں۔ کیا یہ انکی پیدائش کی وقت پاس کھڑے دیکھتے تھے؟ کہہ زمین کی ابتدائی پیدائش کی کیفیت کے متعلق آج تک قریباً ستائیس مذہب قائم ہو چکے ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک بھی قطعی حجت پر مبنی نہیں بلکہ یہ سب ظن و گمان پر مبنی ہیں۔ انسان کی ابتدائی پیدائش کے متعلق قرآن مجید نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے ”وَبَدَأَ خَلْقَ

الانسان من طین، جس کا مفہوم صریح یہ ہے کہ انسان کی ابتدائی پیدائش کا آغاز خاک سے ہوا۔ قرآن مجید میں انسان کی ابتدائی پیدائش کا ذکر بار بار آیا ہے چنانچہ فرمایا "یا ایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منہا زوجہا وبن منہما رجالا کثیرا ونساء" یعنی اے لوگو اس پر گواہی سے ڈرو جس نے ہمیں ایک نفس (آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا اور اسی نفس سے اس کا جوڑا پیدا کیا (حوّا) اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا اس نفس قطعی سے آدم علیہ السلام کا انسان اول ہو کر پیدا ہوا ثابت ہوتا ہے اور آدم علیہ السلام کی پیدائش کی نسبت کبھی طین، کا لفظ کبھی "صلصال" کا لفظ کبھی "تراب" کا لفظ اور کبھی "حماء مسنون" کا لفظ ارشاد فرمایا ہے اور ان الفاظ سے آدم علیہ السلام کے مادہ جسمی کے خمیر کے مختلف مدارج میں منتقل ہونے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے "خضرت طینۃ آدم بیدئی الریحین صباحا" یعنی آدم علیہ السلام کی مٹی کو میں نے اپنے ہاتھوں سے چالیس صبح تک گوندھا۔ "بیدئی" کا لفظ قرآن مجید میں بھی واقع ہوا ہے اور اس سے آدم علیہ السلام کے ایک بزرگ مخلوق ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد آپ کی اولاد کی پیدائش کا ذکر یوں فرمایا ہے "کہ ہم نے انسان (آدم) کو مٹی سے پیدا کر کے پھر انسان کی پیدائش نطفہ سے اور نطفہ کو مضغہ گوشت کا لوتھڑا کی صورت میں اور پھر اس مضغہ سے ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر ہم نے گوشت چڑھایا۔" کتاب الشکی اس توضیح سے انسان کی ابتدائی اور بعد کے مدارج پیدائش کی ترتیب کا صحیح پتہ لگتا ہے۔ اگر انسان کی پیدائش کی ترتیب کے بے کوئی دیگر مدارج بھی پیش آئے ہوتے جن کا ذکر دارون تھیوری میں پر آچکا ہے تو قرآن مجید کو ان کے بیان کرنے میں کیا حرج تھا؟ ہم کتاب الشکی ان توضیحات کی بنا پر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسان اپنی ابتدائی پیدائش میں مستقل طور پر پہلے ہی انسان پیدا ہوا تھا نہ یہ کہ وہ بند بن کر پھر انسان بنا۔ یہ خیال ہم صرف انسان ہی کی پیدائش کے متعلق ظاہر نہیں کرتے بلکہ موالید ثلاثہ یعنی حادوات و نباتات اور حیوانات ہر سہ قسم کے اجسام مرکبہ کے متعلق ظاہر کرتے ہیں اور

یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ موالید ثلاثہ جس صورت میں وہ اب موجود ہیں اسی صورت وہ ابتدائی پیدائش میں بھی وجود پذیر ہوئے۔ ہاں یہ مان سکتے ہیں کہ انسان اپنی ابتدائی پیدائش میں اتنا مہذب نہیں تھا جتنا کہ ایک طویل زمانہ کے گزرنے پر تدریج مہذب ہوتا چلا گیا اور یہ بات انسانی تاریخ کے واقعات پر چہاں تک ہم پہنچ سکتے ہیں باطل صحیح اور درست ہے ایشیائے مرکیہ کی سب سے پہلی ترکیبی صورت جو عناصر کے اجتماع سے وجود میں آئی وہ جمادات کی صورت میں نمودار ہوئی جمادات نقصان کمال کے رُو سے مختلف مدارج پر نظر آتے ہیں ان میں سے کمال ترین جمادی جسم کے خواہوں آثار نباتات کے ابتدائی مرکبات سے ملنے جلتے ہیں اور اسی طرح نباتات بھی نقصان کمال کے رُو سے متفاوت ہیں و ان میں سے کمال ترین نباتی جسم کے آثار و خواص حیوانی جسم کے ابتدائی مرکب کیساتھ بہت مشابہت رکھتے ہیں اور پھر حیوانی مرکبات بھی نقصان کمال کے رُو سے مختلف مدارج پر نظر آتے ہیں چنانچہ حیوانی جسم کمال ترین فرد آثار و خواص میں ناقص ترین فرد انسانی کیساتھ نہایت مشابہت رکھتا ہے جیسے بن ماس جسکی بناوٹ جسمانی اور دیگر لوازم وحشی انسانوں کیساتھ پوری مشابہت رکھتے ہیں بلکہ ممکن ہو کہ کوئی جاہل بن انسان اور انسان کو ایک ہی نوع مخلوق کے دو فرد قرار دے لے جیسا کہ مسٹر ڈارون کو دھوکا لگا ہے دنیا میں قانون تشابہ کے رُو سے بہت سے مختلف انواع کے افراد کو دیکھ کر ایسا دھوکا لگ سکتا ہے مسٹر ڈارون کے خیال کے مطابق ضروری ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو بنید موجود ہیں وہ فرد زمانہ پر کئی وقت انسان بن جائیں اور سطح بندر کی نوع دنیا سے بالکل معدوم ہو جائے مگر کسی چیز کی نوع جب تک دنیا موجود ہے معدوم نہیں ہو سکتی جس پر اکثر اہل فلسفہ کا اتفاق ہے قانون ارتقاء کے رُو سے ضروری تھا کہ مطلق حیوان کی تدریجی ترقی کچھ ایسے افراد حیوانہ کا بھی نتیجہ دیتی جسکی ماہیت مطلق حیوان اور انسان کے بین میں ہوتی یعنی وہ افراد نہ تو حیوان مطلق ہوتے نہ پورے انسان ایسے افراد کے پورا انسان بننے تک خواہ کتنا ہی دراز عرصہ کھلے ہوتا مگر ایسے افراد کا پایا جانا باہر ضروری تھا مگر نہ تو موجودہ زمانہ میں وہ کسی گذشتہ زمانہ میں ایسے افراد کا پتہ ملا ہے تمام اہل فلسفہ اس بات پر متفق ہیں کہ حیوان ایک جنس ہے جسکے مفہوم میں مختلف قسم کے افراد حیوانات مثلاً انسان لگہ چار گھوڑا بیل۔ لوٹری شیر اور بھیریا وغیرہ پائے جاتے ہیں اور انکی حصول (ڈفرنشیا) انہیں

ایک دوسرے انبیاز دیتی ہیں۔ ڈارون تھیوری کی مطابقت یہ فیصلہ حاصل ہے کہ چونکہ ایک صہ دراز کے گزرنے پر حیوانات کے فیصلہ نزل ہو کر انسان کی فیصلہ (نطق) میں متعلق ہو جائیگی جبکہ مطلب یہ ہے کہ ان حیوانات کی ماہیات متعلقہ جانیگی مگر انقلاب باہت تو اہل فلسفہ کے نزدیک محال ہے اس لئے ڈارون تھیوری فلسفی اصول پر صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتی۔ اس تھیوری کے مؤیدین کا استدلال جیڑنی مشاہدات پر مبنی ہے جن سے پتہ چلا کہ ایک منطون امر کو متیقن خیال کیا جائے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ ان لوگوں کی بڑی دلیل قانون ارتقا کے مطابق یہ ہے کہ حیوانی (علم طبقات الارض) کے نئے کائنات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ زمین کے سب سے پہلے طبقہ میں اعلیٰ درجہ کے نباتات اور حیوانات کے آثار پائے جاتے ہیں اور اس سے اوپر کے طبقہ میں نباتات اور حیوانات کے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جو پہلے طبقہ کے نباتات و حیوانات کے آثار سے کچھ ترقی یافتہ نظر آتے ہیں علیٰ ہذا اسی نسبت پر اوپر کے طبقوں میں نباتات و حیوانات کے آثار نیچے کے طبقات سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور سب سے اوپر کے طبقہ کے آثار نباتانہ و حیوانیہ کا زمانہ پہلے طبقات والے نباتات و حیوانات کے زمانہ سے بعد کا زمانہ ہے جوں جوں نباتات و حیوانات کی حیوانی ترکیبیں گہری چلی گئی اعلیٰ درجہ کے حیوانات و نباتات فنا ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ نباتات و حیوانات کی موجودہ صورت قائم ہو گئی مگر ان اشیاء کے انواع ابتداءً مستقل طور پر ایسے ہی پیدا ہوتے جیسے کہ اب ہیں تو پہلے اور درمیانہ اہل اوپر کے طبقات کے آثار کیساں پائے جاتے چونکہ مشاہدہ ان آثار کے کیساں ہو چکی تاہم نہیں کرتا اس لئے ہم موجودات عالم کی پیدائش کے متعلق یہ نظریہ قائم کر سکتے ہیں کہ نباتات و حیوانات اپنی ابتدائی حالت میں اس موجودہ صورت ترکیبہ میں نہ تھے بلکہ قانون تنازع البقا کے رُوسے اعلیٰ اور قوی کے وجود پر اعلیٰ اور ضعیف فنا ہوتے چلے گئے اور اسی طرح یہ سلسلہ ارتقا جاری رہا اور اشیاء کے ابتدائی انواع نے موجودہ انواع کی صورت اختیار کر لی اور یہ قانون ارتقا چار اصول پر مبنی ہے اول قانون ورثہ جس کا مطلب یہ ہے کہ فرع میں اصل کے صفات پائے جاتے ہیں۔ دوم قانون تباہن جبکہ مطلب یہ ہے کہ فرع میں بعض صفات ایسے بھی ہوتے ہیں جو اصل کے صفات سے متغایر ہوں سیوم قانون

تعارض البقا جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض انواع دیگر انواع پر اسبابِ معیشت میں سبقت کر کے قوی ضعیف کو ہلاک کر دیتا ہے۔ چہاں م قانون انتخابِ طبیعی جس کا مطلب یہ ہے کہ قوی اور ضروری پائدار رہتا ہے اور ضعیف اور غیر ضروری فنا ہو جاتا ہے۔

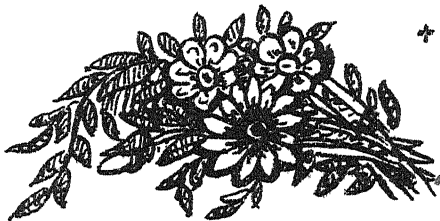
واضح ہو کہ مذکورہ بالا دلیل اور چہار گانہ قانون کو اگر استدلال کے میزان میں وزن کیا جائے تو یقیناً کہنا چاہیے کہ ان کا کوئی وزن نہیں۔ اہل استدلال کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ "اذلجاء لاحتمال بطل الاستدلال" یعنی جب کسی دلیل میں جانبِ مخالفت کا احتمال پیدا ہو تو پھر وہ دلیل دلیل نہیں رہتی اس قاعدہ کی مطابق نباتات اور حیوانات کے آثار کا مذکورہ بالا خیال ایک ظنِ فاسد سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا کیونکہ اول تو نباتات اور حیوانات کا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ کی طرف ترقی پانصرت بعض آثار میں ثابت ہوا ہے نہ جمیع آثار میں اور ممکن ہے کہ ان بعض آثار کی اس تدریجی ترقی کے اسباب وہ نہ ہوں جو تم سمجھے ہو اور اگر ہم ان آثار کو علیحدہ علیحدہ ان کی مستقل ابتدائی پیدائش کا نتیجہ قرار دیں تو بتائے اس میں کیا حرج ہے؟ مثلاً ایک قسم کے سانپوں کے متعلق ثبات ہوا ہے کہ وہ پاؤں رکھتے تھے اور اس کی تائید بعض روایات سے بھی ہوتی ہے چنانچہ ابن عباس اور ابن وہب سے قصہ آدم علیہ السلام میں مروی ہے "فاحبطها الله تعالى الى الارض و مسح صورها وقد كانت حسنة الصورة ذات قوائم اربع" (کذا فی قلب الاسرار) یعنی خدائے تعالیٰ نے سانپ کو زمین کی طرف اتارا اور اسکی صورت کو لپٹ دیا اور یہ ایک خوبصورت جانور تھا جسکے چار پاؤں تھے کیا اس روایت کے مطابق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس قسم کے سانپ ایک مستقل نوع رکھتے تھے؟ اگر مذکورہ بالا قانون وراثت صحیح ہوتا تو موجودہ حالت میں بھی سانپ کے پاؤں دیکھے جاتے اور اگر اب بھی کہیں ایسے سانپ پائے جاتے ہیں تو پھر بھی ہم نہیں کہیں گے کہ یہ نہ پاؤں رکھنے والے سانپوں سے ایک علیحدہ نوع کے سانپ ہیں ادنیٰ درجہ کے نباتات و حیوانات کا اعلیٰ درجہ کے حیوانات و نباتات تک ترقی کرتا محض ایک نطنی امر ہے کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادنیٰ درجہ کے

مرکبات کو اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر ایک نوع قرار دیا ہے اور اس کے بعد اعلیٰ درجہ کے مرکبات نباتی و حیوانی کو ایک دوسری مستقل نوع قرار دیا گیا اور اس کو اپنے سے پہلے ادنیٰ نوع کیساتھ کسی قسم کا تعلق نہ ہو جب یہ احتمال قوی طور پر موجود ہے تو ہم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ ایک ہی نوع تدریجی ترقی سے ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت تک پہنچ گئی؟ طبقات الارض کی جدید تحقیقات ہمارے اس احتمال سے ہرگز متخالف نہیں ہو سکتیں بلکہ ہم ایسے آثار نباتیہ اور حیوانیہ کی نسبت یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک جب کے آثار مستقل طور پر اپنے اپنے دور زمانی کی ضرورت اور مناسبت پر مبنی ہیں چنانچہ ہم ہر سال اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ بہت سی حیوانات و نباتات موسم زمرستان کے گزر جانے اور موسم بہار کے آنے پر پیدا ہوتے ہیں اور سب سے پہلے ادنیٰ درجہ کی نباتات پیدا ہونا شروع ہوتی ہے پھر تدریج اعلیٰ قسم کی نباتی اور حیوانی مخلوق کا نظر آنے لگتی ہے مثلاً چھپرکھی پتھر اور دیگر غوثتیں رہنے والے جانداروں شروع موسم بہار میں پیدا ہوتے ہیں اور تدریج اعلیٰ نباتی اور حیوانی مرکبات وجود پذیر ہوتے ہیں انہیں جوں جوں گرمی بڑھتی چلی جاتی ہے اسباب طبعیہ سے وہ خود ہی ہلاک ہونے چلے جاتے ہیں اور آخر موسم گرما پھر بڑے بڑے مرکبات باقی رہ جاتے ہیں جو قانون انتخاب طبعی کا نتیجہ ہیں اس لئے حالات طبعیہ میں غور کرنے سے واضح ہو سکتا ہے کہ طبقات الارض کی یہی تحقیقات کیسے طبعی ہیں حال ان آثار کا ہے جو مختلف طبقات زمین میں ادنیٰ اور اعلیٰ مرکبات کی صورت میں نظر آتے ہیں مبنی ہم انہیں علیحدہ علیحدہ مستقل النوع کی پیدائش قرار دیتے ہیں نہ یہ کہ وہ ایک ہی نوع کے افراد کی تدریجی ترقی کا نتیجہ ہیں۔ رہا قوانین چارگانہ مذکورہ بالا جن پر قانون ارتقاء مبنی سمجھا گیا ہے یہ بجائے خود دلائل نہیں ہیں بلکہ نباتی اور حیوانی مرکبات کی تدریجی ترقی کیلئے ایک قسم کی توجیہ کا واسطہ ہیں کیونکہ قانون وراثت ہمارے مذہبی اصول کیساتھ کچھ مخالفت نہیں رکھتا بلکہ ہم اسے ممکن الحصول سمجھتے ہیں یہی حال قانون تنازع البقا کا ہے جس کو ہم مشابہہ کے رُو سے صحیح تسلیم کر سکتے ہیں مگر یہ ہر دو قانون جس طرح ہمارے قانون ارتقاء کی صورت میں صحیح ہیں اسی طرح ہمارے اس عقیدہ کے مطابق بھی صحیح ہیں کہ مرکبات کی النوع علیحدہ علیحدہ مستقل طور پر وجود پذیر ہوئیں اور قانون تناسل کیسے ممکن ہے کہ کفر میں جن آثار تناسل کے پائے جاتے ہیں عرض ہیں جو بہرہ نہیں جس سے ایک نوع کا دوسری نوع کی طرف منتقل اور تغیر ہونا ضروری ہو مگر ہمارے

دیکھتے ہیں کہ فرع اپنے اصل سے تغایر ہوتی ہے اور کیا حیوانی اور نباتی میں اس کا رابرث ابدہ کیا جاتا ہے اور ایسا ہونا حکمتِ خداوندی پر مبنی ہے کیونکہ اگر کسی نوع کے تمام افراد ایک ہی صورت رکھتے اور ان میں کسی قسم کا تغایر نہ ہوتا تو ان افراد میں اشتباہ اور التباس پیدا ہو کر سلسلہ نظامِ عالم ہمہ گیر ہو جاتا مثلاً کوئی شخص اپنے بیٹے کو دوسرے کے بیٹے سے کبھی تمیز نہ کر سکتا اور نہ اپنی عورت کو کسی دوسری عورت سے حتیٰ کہ زید بکر کی جگہ پھانسی چڑھایا جاتا اور عمر و خالد کی تزوہ وصول کر لیتا علیٰ ہذا انتظامِ عالم میں اس قدر خلل و فساد رونما ہوتا کہ تمدن و معاشرت کا وجود ناممکن نظر آتا۔ قانون تیار کیا ایک ایسا قانون ہے کہ جس کا ظہور تمام عالم کائنات میں نظر آتا ہے حتیٰ کہ ایک کاریگر کی ایک ہی قسم کی دو تیار کی ہوئی چیزیں کبھی کامل طور پر مشابہ نہیں ہو سکتیں خواہ وہ کاریگر اپنی صنعت میں کتنا ہی کمال رکھتا ہو۔ اگر یہ حکمتِ خداوندی کا نتیجہ نہ ہوتا بلکہ قسم مادہ پرستوں کے خیال کے مطابق عملِ طبیعت کا نتیجہ ہوتا تو نہ اسے قانونِ ولادت کے رُوسے ضروری تھا کہ فرع عین اصل کے مطابق وجود پذیر ہوتی اور اصل کے تمام صفات بلا کم و کاست اس میں پائے جاتے اور دونوں میں کسی قسم کا تغایر نہ ہوتا۔ اور قانونِ جہارم کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ قانون بھی ہمارے اس عوٰنی کے منافی نہیں ہے کہ تمام انواع ابتدائی پیدائش میں مستقل طور پر وجود پذیر ہوئے ہیں کیونکہ یہ جائز ہے کہ پہلے ادنیٰ درجہ کے مرکبات پیدا ہوئے ہوں اور پھر اعلیٰ درجہ کے انواع مستقل طور پر وجود پذیر ہوئے ہوں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اعلیٰ نوع کو ادنیٰ نوع کی ترقی یافتہ صورت تسلیم کریں؟ اور اسی طرح اس سلسلہ انواع مرکبات کو علیحدہ علیحدہ مستقل پیدائش پر مبنی کریں؟ الغرض مذکورہ بالا چار گانہ قوانین کی اصلیت اور سچے دعویٰ استقلالِ انواع میں کسی قسم کی منافات نہیں۔ کیا قانون ارتقا کے پاس کوئی ایسی عقلی دلیل ہے جس سے ایک نوع کا تدریجی حالت میں ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت تک ترقی کرنا ثابت ہو سکے؟ ہاں! وہ کلام بلکہ ان لوگوں کے دلائل صرف ظنیات کی حد تک محدود رہ سکتے ہیں مگر یہ مقابلہِ مخصوص شریعہ جو تدریجہ وحیِ ناطق ہم تک وصول ہوئی ہیں ہم انکی کیا قدر قیمت سمجھتے ہیں اسلئے ہم اس قانون ارتقا

کے رُو سے کبھی تجزیہ نہیں کر سکتے کہ انسان اور بندر ایک اصل واحد سے مشتق ہیں محض ہر دو کی بعض امور میں مشابہت کی بنا پر ہم اس معنوی کو قیاسی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اگر یہ خیال صحیح ان لیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ انسان اپنی شریعت و ولادت میں عقلی اور حیوانی طور پر نہایت کمزور بلکہ لاشے محض ہوتا ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ چل سکتا ہے نہ بٹھیسکتا ہے اور نہ کسی چیز کو سمجھ سکتا ہے اور نہ وہ نیک و بد اور نافع و مضر میں کچھ امتیاز کر سکتا ہے مگر بتدریج وہ عقلی طور پر اس درجہ تک ترقی کرتا ہے کہ تمام دیگر حیوانات کے سبقت لے جاتا ہے اور عجیب غریب علوم و فنون کا موجد بنتا ہے اور حیوانی طور پر بھی وہ اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ بڑے بڑے عالیشان عمارات عالیہ کا بانی قرار پاتا ہے برخلاف اس کے بندر پیدا ہوتے ہی چند روز کے بعد اپنے منفعات اور مضرت اور حرکت ارادی میں پورے طور پر قادر نظر آتا ہے حالانکہ انسان کے بچہ میں یہ بات کئی سال کے بعد نظر آنے لگتی ہے۔ اگر قانون ارتقا کے مطابق انسان اور بندر کی اصل واحد ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ انسان کا بچہ ولادت کے وقت مذکورہ بالا صفات میں بندر سے کم درجہ پر ہو حالانکہ آدمی کا بچہ بندر کی ترقی یافتہ حالت میں پیدا ہوا ہے؟ جب دونوں کی اصل ایک ہے تو کیوں انسان کا بچہ بندر کے بچہ سے قوت اور اوراک میں ناقص دیکھا جاتا ہے بلکہ ولادت کے وقت انسان کے بچہ میں یہ صفات بالکل نفی کے درجہ پر نظر آتی ہیں؟ انقض ہم کو قانون ارتقا کے قائلین کی طرف سے دلائل قطعیہ کا کچھ پیشہ نہیں ملا۔ لہذا اس قانون کی بنا پر جتنے نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ ”بناء الفاسد علی الفاسد“ سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ ایک عصا کا انڈیا بن جانا تو خلاف قانون قدرت قرار دیا جاتا ہے اور بندر کا انسان بننا جائز رکھا جاتا ہے۔ ”ان هذا الاشیء عجاب“۔

قانون ارتقا کے انو خیال میں ابھی ہیں کہنا بہت کچھ باقی ہے مگر مقتضائے مقام میں اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔



احسان

عقل و نقل

صحیح علم حاصل کرنے کا ذریعہ تجربہ و مشاہدہ ہیں مگر یہ صرف اسی حد تک محدود ہیں کہ کوئی واقعہ بلا واسطہ
 سامنے نہ آئے جس سے چمکانہ کے سامنے موجود ہو۔ ایسے امور جنہیں ہمارے حواس بلا واسطہ احساس نہیں کر سکتے۔ یا
 ہمارے حواس میں آنے کی قابلیت نہیں رکھتے تجربہ و مشاہدہ کی حد سے خارج ہیں۔ ایسے واقعات کی
 تحقیق کے لئے ہم کو پاس عقل سلیم اور نقل صحیح دو ذریعہ موجود ہیں جنکی ضرورت سے کوئی عامل آدمی
 انکار نہیں کر سکتا۔ صرف اسلام مقدس ہی ایک ایسا مذہب ہے جو عقل سلیم اور نقل صحیح کو معیار تحقیق
 قرار دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب اس خوبی سے قطعاً محروم رکھے گئے ہیں کیونکہ دنیا کے تمام
 مختلف مذاہب میں محققات اور منقولات کا بمقابلہ اسلام پاک کے عشر عشیر کے برابر بھی خیر نہیں ہے۔
 اسلام پاک میں ہمیں ایک بھی ایسا مسئلہ معلوم نہیں ہو سکا جس کو عقل اور نقل کے معیار پر نہ
 جانچا گیا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ ہم خود کسی وقت اس معیار کی صداقت کا صحیح موازنہ نہ کر سکیں کیونکہ
 گفتگو نفس الامر کی بابت ہے نہ زید و عمرو وغیرہ کی تحقیق کے متعلق۔ بہر صورت جب مقدس اسلام نے
 بنی آدم کی اصلاح دینی و دنیوی کا ذمہ لیا تو اس فرض کی بنیاد ایک ایسی مضبوط چٹان پر قائم کی
 جو دنیا کی مدد العمر تک کسی بیرونی صدقات سے کبھی منہم نہ ہو سکیگی۔ ”لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ
 يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ“ ذرا غور سے دیکھو اور تھوڑی دیر کے لئے خالی الذہن ہو کر اس مسئلہ کی
 حقیقت میں اعیان نظر سے کام لو کہ کس زور کے ساتھ ایک ایسا عظیم الشان دعویٰ کیا گیا ہے
 جس کی نظیر روئے زمین پر کے تمام مذاہب میں ملنی محال ہے۔ یہی وہ حقیقی نور ہے جسکو خدا نے طاعت

کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ انسانی توہمات باطلہ کا جو بظاہر دلبر یا مگر ناپائیدار ذخیرہ ہے
ہرگز کام نہیں ہو سکتا۔ یہ خدائے خالق السموات والارض کا لازوال سر چشمہ نور ہے جو ایدہ الایاد تک
قائم ہے۔

بندہ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است - ورنہ لطف شیخ وزاہد گاہ بہت گاہ نیت
آج جو لوگ تہذیب مغربی پر مرٹے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام پاک نے خود ان کے
گھروں میں ایک ایسی برقی روشنی کا دائمی نور پھیلا رکھا ہے جسکو وہ بوجہ شہر چشتی کے دیکھ نہیں سکتے
اور ادھر ادھر کو نور کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ یہیں آج تک مغرب کی طرف سے کوئی ایسی
آواز سنائی نہیں دی (بشرطیکہ وہ آواز واقعی انسانی فطرت کی حکایت ہو) جو قبل ازیں سرزمین عرب
کے وسیع بیابانوں میں ایسے نازک وقت میں بلند نہ کی گئی ہو جبکہ نیلگوئی آسمان اور دوسے زمین کے
بلا و امصا راظہا برحق سے خاموش ہو رہے تھے۔ مگر یہ بچاے معذوریں کیونکہ جب قرآن کریم کو
کبھی اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو تو وہ ”پدر راسل بسیار است لیکن سپر گرمی و راست“ کے مصلوق ہیں۔

آفتاب اندرون خانہ و ما - ویدر میر ویم فوہ مثال
علماء اگر کسی مجلس میں کسبِ خیال کو ظاہر بھی کریں تو انہیں یہ خیال رہتا ہے کہ شاید یونہی لفظی
جمع و تخریج دکھائے ہیں مغربی روشنی ہمارے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس عبارت سے
ہمارا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ مغربی ممالک کی نو ایجادات ایسی نئی باتیں نہیں جن سے انسانی دنیا میں ایک
حیرت خیز ترقی کا نقشہ ہمارے سامنے موجود نہیں کیونکہ نفس الامر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا
صرف اس امر میں ہے کہ ہمارے بعض نوعِ تعلیم یافتہ بوجہ تا واقعیت بسا اوقات اس قدر تجاؤ کر جاتے
ہیں کہ سرے سے اسلام پاک ہی کی ضرورت سے انکار کرنے لگ جاتے ہیں اور غور کر تو وہ
ترقیات بھی تعلیم قرآن ہی کا نتیجہ ہیں کیونکہ وہ تھائق موجودات میں غور و پرداخت کرنے سے حاصل ہوتی
ہیں جس کی قرآن مجید جابجا تاکید کرتا ہے۔ انہیں نو ایجادات کے استغاب نے ہمارے بعض واقفوں
کو یہاں تک گرویدہ کر رکھا ہے کہ اگر یورپ میں کوئی سائنس دان یا فلاسفر یا مخالف چھوڑ دے تو

ہمارے بعض خوش ماغوں کے مشام جان میں نافذ تار کا کام دیتا ہے۔ ہمارا یہ مطلب یہ ہے کہ اہل یورپ کی کسی امر میں بھی تقلید نہ کی جائے کیونکہ جو باتیں بمقتضائے ضرورت زمانہ لازم قرار دی گئی ہیں بشرطیکہ وہ منافی شریعت نہ ہوں ان کے لئے لینے میں کیا فباہت ہے؟ آخر شروع آفرینش سے تو میں لین دین کرتی چلی آئی ہیں مگر ضروریاتِ زمانہ اور احکامِ مذہب میں ایک حد فاصل قائم ہونی چاہئے ہر دو کو گریڈ کر دینا موجب ضلالت ہے اور تعجب یہ ہے کہ احکامِ مذہب میں کوئی ایسی بات داخل نہیں جو موجودہ علوم و فنون سے روکتی ہو۔ اگرچہ ایک علوم ایسے بھی ہیں جن کا اثر طبائع پر الحاد و کفر کا رنگ چڑھا دیتا ہے تو ان کا خوف اسی صورت میں ہے جبکہ تعلیم قرآن سے بالکل غفلت اختیار کر لی جاتی ہے۔ آخر یہ علوم پہلے بھی تو مروج ہی تھے گو کسی دوسری صورت میں بھی۔ مگر چونکہ عام طور پر تعلیمِ مذہب کا حاصل کرنا لازم قرار دیا گیا تھا اسلئے ان کا کچھ ڈرنہیں تھا۔

اب ہم اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ کسی واقعہ کی حقیقتِ اصلہ دریافت کرنے کے لئے جو بلا واسطہ یا تو ہمارے حواس کے ادراک سے بالاتر ہے یا اس موجودہ حالت میں ہمارے حواس سے غائب ہے، صرف دو ہی طریق ہو سکتے ہیں جن کو عقل سلیم و نقل صحیح کے عنوان سے ظاہر کیا گیا ہے بعض امور میں صرف عقل اور بعض میں صرف نقل اور اکثر میں عقل و نقل ہر دو ذریعہ حصولِ علم ہوتے ہیں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے موقع پر استعمال میں لانا اور ہر ایک کی حد مقررہ کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس اصلِ عظیم کی خلاف ورزی سے ہمیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ عقل ایک محدود طاقت ہے یعنی وہ ایک خاص حد سے آگے تجاوز نہیں کر سکتی (خواہ یہ کوئی مذہب یا نہ ہو) نہ ہر چلے مرکب ان تناقضات - کہ جاہا سپر باید انداختن

اس لئے ایسے امور میں جو مافوقِ عقل ہیں ہمیں سولے نقل صحیح کے کوئی چارہ نہیں اور محض نقل اگر وہ صحیح ہو تو بہ نسبتِ محض عقل کے اقرب الی الصواب ہے اور اگر غلط ہو تو موجبِ ضلالت۔ مگر جب کوئی امر بذریعہ نقل صحیح پائے ثبوت تک پہنچ جائے اور عقل سلیم اس کی شہادت دینے میں متردد نہ ہو تو اس کے قطعی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ داخل نہیں ہو سکتا۔ اور یہی طریقِ علوم حقیقیہ کے

حاصل کرنے کے لئے قطعی اور حجت سمجھا گیا ہے۔ واضح ہو کہ کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ وہ ہر دو معیار مذکورہ بالا پر صحیح اور درست تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ اس کا منقول ہونا تو اس درجہ استحکام کو پہنچ چکا ہے جسکو مخالفین اسلام نے بھی مجبوراً تسلیم کیا ہے اور دنیا میں اگر کوئی صحیح صحیح کتاب جسکی صحت پر ہر زمانہ کے کروڑوں آدمی شاہد ہوں ممکن ہے تو وہ یہی قرآن مجید ہے اور اس کتاب کا معیار عقل پر صحیح ہونا اس وقت ثابت ہوتا ہے جبکہ ہم پہلے حقیقت عقل پر غور کر لیں *

نقطہ عقل کا استعمال عموماً دو طرح پر آیا کرتا ہے (۱) عقل مطبوع یہ وہ نور فطرت ہے جو انسان کی خلقت کے ساتھ ہی خداوند کریم کی طرف سے بطور ودیعت رکھا جاتا ہے۔ یہ نور فطرت مختلف لوگوں میں ایک ہی درجہ پر موجود نہیں ہوتا۔ (۲) عقل مسموع یعنی وہ نور علم جو انسان بذریعہ تعلیم و تعلم حاصل کرتا ہے اور جو تجربہ و مشاہدہ سے زیادہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ جس قدر تجربہ و مشاہدہ زیادہ وسیع ہوگا اسی قدر نور عقل زیادہ ہوگا۔ عقل مطبوع کم و بیش نہیں ہو سکتی اور عقل مسموع کثرت الکتاب پر زیادہ ہو سکتی ہے *

عقل مطبوع یعنی نور فطرت اور عقل مسموع یعنی نور علم کے متعلق احادیث نبوی میں شانہ آچکا ہے چنانچہ نور فطرت کے متعلق یوں آیا ہے ”ما خلق الله خلقا کرم علیہ من العقل“ یعنی خدا نے عقل سے بڑھ کر کوئی گرامی تر مخلوق پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ حقائق موجودات اور اسرار و معارف کے حاصل کرنے کا اصلی منبع یہی نور فطرت ہے اور نور علم کے متعلق جناب علی کرم اللہ وجہہ کو یوں ارشاد فرمایا ”اذا تقرب الناس الى الله تعالى بالانواع البسمة فتقرب انت بعقلک“ یعنی جب اور لوگ اپنی نیکیوں کے ذریعہ خدا کے ہاں تقرب حاصل کرنا چاہیں تو اے علی تو اپنے نور علم سے تقرب حاصل کر۔ یہاں عقل سے نور فطرت مراد نہیں کیونکہ صرف نور فطرت بلا حصول اسرار معرفت موجب تقرب نہیں ہو سکتا جس طرح نور علم بلا نور فطرت کچھ مفید نہیں ہوتا۔ اس کی مثال عینہ نور آفتاب اور نور خیم کی سی ہے کیونکہ اندھا آدمی آفتاب کی روشنی سے کیا فائدہ

اٹھا سکتا ہے؛ چونکہ انبیاء علیہم السلام نور فطرت اور نور علم ہر دو سے بدرجہ اتم و اکمل بہرہ یاب ہوتے ہیں لہذا ان میں بدایع مختلفہ ہیں اس لئے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عقل والے شمار کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ نور فطرت انہیں فطرۃً حاصل ہوتا ہے اور نور علم بندگیہ وحی والہام جو بجائے خود قطعی اور حجت ہوتے ہیں اس لئے عقل سے مراد عقل کلی ہے نہ عقل جزئی۔ اور یہی عقل کلی معیار اور اک حقائق ہے۔ اور اسی کا حکم حکم ناطق سمجھا جاتا ہے۔ عقول جنہ جو غیر انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہیں کبھی کسی حقیقت کے لئے معیار قطعی نہیں ہو سکتیں چنانچہ حسامی اصل فقہ میں لکھا ہے ”وان العقل لا ینفک عن الصوی فلا یصلح حجة بنفسہ بحال“ یعنی عقل جزئی نفس کی خواہش سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی اور اس لئے صرف عقل کبھی حجت قطعی قرار نہیں پاسکتی پس کسی ایسے شخص کا قول جو وحی والہام سے ممتاز نہ ہو کبھی حجت نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی دربارہ معتقدات اور احکام شرعیہ قابلِ سماعت ہے اور اگر ایسا شخص کسی امر شرعی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر لگا تو وہ اسکی رائے نفس کا نتیجہ سمجھا جائیگا نہ کتاب و سنت کا۔ جو لوگ شب و روز عقل عقل پکار رہے ہیں اور بغیر عقل کے ایک قدم بھی نہیں اٹھاتے انہیں سب سے اول عقل کی حقیقت سمجھنا چاہئے اور اس جلد پر کافی غور کرنا چاہئے کہ جب کہا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت جو معتقدات اور احکام کا مجموعہ ہے فطرۃ اللہ سے کسی طرح بھی مخالف نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ عقل کلی جو انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے دریافت حقائق کا معیار صحیح ہے۔ عقول جزئیہ جو علما اور حکماء کو حاصل ہیں اپنے اپنے مدار

سہم اپنے موجود زمانہ میں ہزاروں قسم کے اختلافات میں ہے جن کی کوئی انتہا نہیں مگر حق ہی ہے جو اہل ایمان کے نزدیک آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہے جو لوگ کتاب و سنت سے واقف نہیں ہوتے جھٹ ایسے بدعتی لوگوں کی خوش کامی پرا کرتے ہیں اور علمائے امت کو عرصہ مطلق و شیعہ بتا لیتے ہیں اور عوام ان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو قرآن شریف کی عبارت بھی صحیح طور پر چڑھیں جانتے مگر اجتہاد کرنے میں امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ سے بھی چارہ قدم آگے نکل جانے کے مدعی ہیں۔ جب انکا منہج علم معلوم کیا جائے تو بجز چند مروجہ علوم کی استغنی کتابوں اور نادلوں کے کچھ نہیں رہتا اور طاعت یہ کہ وہ نبی اکمل صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں دھتور ڈال رکھا ہے کہ خدا پناہ دے اور باہیں ہمہ شوریہ احکام شریعت کی تکذیب اور علمائے دین کی مذمت انکے لئے قابلِ فخر ہے مگر یہ سب خرابیاں جس کتاب اللہ کی تعلیم سے ناواقف ہونیکا نتیجہ ہیں جس کا اللہ اولیٰ نظر نہایت ہی شہوار نظر آتا ہے۔ ۱۲۰

سے آگے نجاؤ نہیں کر سکتیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ بعض امور جن کی حقیقت کو محض عقل کلی دریافت کر سکتی ہے علماء اور حکماء کے مدارعقول سے بالاتر ہوں۔ اگر کوئی جاہل بیوقوف اپنی مغالبت سے اس ضرورت کا انکار کر دے تو یہ اس کی ثقافت کی دلیل ہے۔ ایک مٹی سی بات ہے کہ جب ظاہری علوم و فنون میں لوگوں کے کمالات مختلف ہوا کرتے ہیں تو علوم نبوت کے متعلق بدرجہ اولیٰ ان کا مختلف ہونا ضروری ہے۔

یہی سراسر حقیقت ہے کہ کسی حقیقت کا محض اس وجہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقت مشرکین کے افہام سے بالاتر ہے جن لوگوں نے مجبوراً دلائل جن و شیطاں کا انکار کیا ہے انہوں نے اسی ایک غلط فہمی کی بناء پر مرکز حق سے انحراف کیا ہے۔ انہیں جب مروجہ علوم کے اصول پر ان امور کا کوئی ثبوت نہ ملا تو سخت مضطرب ہوئے کہ کیونکر ایسے امور کا اقرار کریں جن کے ماننے کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے پس انہوں نے طرح طرح کی تاویلیں اور دوراز قیاس توجہیات بیان کرنا شروع کر دیں اور الفاظ قرآن مجید کو خلاف اصول توڑ مروڑ کر اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ہوائے نفس نے انہیں گمراہ کر دیا۔ الخضر اگر عقل جزئی ہر ایک حقیقت کے لئے حجت قطعی ہوتی تو ہمیں آج شریعت کی ایک بات بھی صحیح طور پر نہ پہنچتی کیونکہ جب عقل کو میدیہ قطعی تسلیم کر لیا جاوے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ کس کی عقل؟ آیا کھونان فروش کی یا فرانسس بیکن کی؟ غالباً اس شکل کو دنیا بھر کے تمام فلاسفہ بھی مل کر حل نہ کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ کے اقدار ان ایک ایسی روش اختیار کر چکے ہیں کہ وہ کسی بات کو بھی بلا ان اصول کے جو معلوم مروجہ کے دوسرے مسلم ہو چکے ہیں تسلیم نہیں کرتے اور اسی ضرورت پر زمانہ حال کے بعض مصلحان قوم نے قرآن مجید میں غور کر کے حتیٰ الوسع مسائل کو انہیں اصول پر جانچنا چاہا اگر وہ کامیاب ہوئے یا نہ ہوئے (مگر چونکہ علوم مروجہ کی تحقیقات عقول جزئیہ کا نتیجہ ہے اور اس میں صحیح اور غلط حیات لا ملے ہوئے ہیں اس لئے ہم یہ نظر احتیاط اس امر کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں گے کہ جہاں ہمیں بظاہر کسی مسئلہ اسلامی اور اصول مروجہ میں اختلاف نظر آئے۔ کتاب اللہ کو مقدم سمجھا جائیگا کیونکہ وہ وحی ناطق ہے اور بایں ہمہ منتظر رہیں گے کہ آئندہ کبھی کسی زمانہ میں مطابقت پیدا ہو جائے گو وہ

زمانہ کتنا ہی طویل ہو یہ ہماری سراسر غلطی ہوگی کہ موجودہ تحقیقات کی ہر ایک بات کو ایسا قطعی سمجھ لیں کہ اس میں غلطی کا کسی طرح بھی احتمال نہیں۔ ہزاروں مسئلے علم ہیئت کے اسی ایک ہی صدی میں ثابت بھی ہوئے اور پھر ان کی غلطی بھی تسلیم کر لی گئی۔ اگر ہم کسی علمی تحقیق کو قطعی** ثابت ہو جانے پر ہمیں از سر نو الفاظ قرآن میں تحریف کرنے کی ضرورت داعمی ہوگی اور اس طرح کتاب اللہ ایک باز یچھٹا حلقہ قرار پائے گی۔

یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو اصول علوم مروجہ کے قطعی تسلیم کئے گئے ہیں کتاب اللہ کہیں ان کے مخالف تعلیم نہیں دے گی مگر ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو علوم مروجہ کے ساتھ علوم دینیہ میں بھی کامل مہارت رکھتے ہوں۔ آج تک جن لوگوں نے علوم مروجہ اور تعلیم آسمانی میں مطابقت کی کوشش کی ہے وہ سب کے سب ایک ہی جانب کے آدمی تھے یا ہر دو جانب میں نامکمل تھے اور تا حال ہندوستان میں ایسا جامع آدمی پیدا نہیں ہوا۔ شاید آئندہ کسی زمانہ میں کوئی مرد خدا ایسا نکل آئے جو اس ہم منزل کو طے کر سکے لیکن اس مشکل کا پورا کرنا نہ تو کسی خالص مولوی کا کام ہے اور نہ کسی علوم مروجہ کے ماہر کا۔

بہر صورت جب یہ امر مسلم ہے کہ بلا مذہب مسلمانوں کی قومیت ناممکن ہے تو قوم اگر اپنی زندگی قائم رکھنا چاہتی ہے تو اسے ایک آن کے لئے بھی تعلیم قرآن و سنت سے علیحدہ ہو کر اپنا نام و نشان قائم رکھنا محال سمجھنا چاہئے۔ اور اگر بلا مذہب ممکن ہے تو موجب تنگ و غار۔ ذرا غور کرو اور دیکھو کہ بغیر مذہب کے ہماری کیا عزت ہو سکتی ہے؟ اور وہ کونسی چیز ہے جو ہمیں ایک وحدت کی ریخیر میں جکڑ کر ایک فرد واحد کی صورت میں قائم رکھ سکتی ہے۔ صرف اسی قرآن و سنت کی طفیل ہم نے دنیا میں خیر الامم کا لقب پایا۔ کیا فلسفہ و ہیئت و ریاضی و غیرہ قبل از اسلام مختلف ممالک کے حکماء و علمائے جانتے تھے؟ یہ علوم تو ہیں اور رہیں گے کیونکہ دنیا کے کاروبار اور انسانی

۱۔ مہد صاحب کے متعلق نواب محسن الملک کا یہ خیال نہایت صحیح ہے جو انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں کہ کہیں تو آپ نے قانون قدرت کو الٹا سمجھا اور کہیں آیات قرآنیہ کو - ۱۲ - منہ

معیار تسلیم کر کے کتاب اللہ کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اسے مطابقت کر دکھائے۔ تو بعد میں اس علمی تحقیق کے غلط

زندگی کی دنیوی بہولتوں کا زینہ ہیں۔ پھر ان کی ضرورت سے کوئی انکار کر سکتا ہے؛ مگر گفتگو تو صرف یہ ہے کہ آیا عیوبیت اور الوہیت کی علیحدہ علیحدہ حد مقرر کرنے اور ہر دو کے درمیان حقیقت تعلق کے سمجھنے اور آئندہ زندگی کی اصلاح کے لئے یہ علوم ہیں کیا کام دے سکتے ہیں؟ اس کا جواب بحر نفی کے کوئی شخص مثبت الفاظ میں نہیں دے سکتا۔ فرض کرو کہ ہم اعلیٰ ریاضیات کو پڑھیں اور علم ہیئت کے مسائل سے خوب واقف ہو جائیں اور طبیعیات کے تجربوں میں کافی دستگاہ بہیم پہنچالیں یا دیگر علوم عقلیہ کی شناختوں میں سے کسی ایک کو کامل طور پر سیکھیں مگر ان کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیونکہ نجات اخروی کا حصول تو یقیناً ان علوم پر مبنی نہیں۔ رہا دنیوی فائدہ سواس سے کسی کو انکار نہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص صرف علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی سمجھ کر یہ گمان کر لے کہ وہ علوم عقلیہ یعنی تفاسیر و احادیث سے مستثنیٰ ہے تو وہ ایک بھاری غلطی کے اندر مبتلا ہے۔

مذہب جس کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا صرف منقولات صحیحہ کے دائرہ میں محدود ہے۔ ہاں عقل سلیم کسی مذہب کے معتقدات اور احکام کے متعلق ایسے دلائل اور وجوہ کا ذخیرہ بہیم پہنچا سکتی ہے جو کسی پابند مذہب کیلئے اس امر کے اطمینان کے ضروری ہوتے ہیں کہ جو مذہب اس نے اختیار کر رکھا ہے وہ صحیح ہے ورنہ عقل بدین تعلیم و وحی بجائے خود محقق کو کسی حقیقی منزل تک پہنچنے کیلئے ہرگز یاوری نہیں کر سکتی۔ یہ صرف اسلام پاک ہی کا خاصہ ہے کہ اس نے نہ تو عقل کو صحیح اور قطعی معیار قرار دیا ہے اور نہ ہی اُسے عقل مطلق چھوڑا ہے بلکہ عقل کے چراغ میں تعلیم و وحی کا روشن ڈال کر انسانی فطرت کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کی ہے اور یہی کسی مذہب کی اصلیت کا قطعی معیار ہے۔

یہی ایک حق واضح ہے جس کی طرف ائمہ محققین گئے ہیں۔ حامی اصول فقہ میں لکھا ہے۔
 "فمن جادل عقل علّة موجبةً یمتنعُ الشّرعُ بخلافہ فلا دلیل له لیعتمد علیہ ومن انّاء

لہ چونکہ عقل کو کسی امر کی علت موجبہ یمتنعُ الشّرعُ بخلافہ قرار دیتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ شرعیّت برخلاف عقل ہرگز نہیں ہو سکتی سوائے اس کے پاس کوئی یقینی دلیل اس دعویٰ پر نہیں اور چونکہ عقل کو بالکل بیکار رکھنا پابستہ ہے اس کے پاس ہی کوئی دلیل نہیں۔ ۱۲۰ منہ

من کل وجه فلا دلیل له ایضاً۔ الحاصل ایک محقق فطرت کیلئے اسلامی شریعت سے بڑھ کر کوئی امر زیادہ موجب استعجاب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا طریق تمام شرائع سے بڑھ کر اسلم اور اصوب ہے۔ اسی امر کو حجۃ الاسلام غزالیؒ نے اپنی احیاء العلوم میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ حیث قال:-
 "قال داعی المخلص التقليد مع عزلی العقل والکلیة جاهل والمکتفی بحد العقل عن الاولی القرات والسنة معروء فایا ان تكون من احدا القریین وکن جامعاً بین الاسلین فان العلوم العقلیة کالاعتدایة والعلوم الشرعیة کالادویة والشخص المریض لیتقرب بالعداء منی فاته المداء فکذلک الامراض القلوب لا یمکن علاجها الا بالادویة المستفادۃ من الشرعیة وحی وظائف العبادات ولا عبادات التي سربها الانبیاء صلوات الله علیهم کلا صلاح القلوب ومن لا یدری قلبه المریض بسعالجات الصادة الشرعیة واکتفی باده لیسر العقلیة المستغیر بها کما لیتضر المریض بالعداء۔"

یعنی جو شخص عقل کو بالکل محفل کر کے صرف تقلید ہی کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے وہ جاہل ہے اور جو شخص انوار تعلیم قرآن و سنت کو چھوڑ کر صرف عقل ہی کو کافی سمجھتا ہے وہ مغرور ہے۔ سوائے مخاطب اکہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تو ان ہر دو فریق میں سے کسی ایک فریق میں داخل ہو بلکہ ہر دو اصل عقل و نقل کا جامع ہو چکیں کہ علوم عقلیہ بمنزلہ غذا اور علوم شرعیہ بمنزلہ دوا کے ہیں۔ اگر دوا نہ ہو تو مریض فنا سے ضرر پائیگا۔ اسی طرح بجز پابندی احکام شریعت کے دلوں کی بیماریاں دفع نہیں ہو سکتیں۔ سو جو شخص عبادات و اعمال شریعیہ کی پابندی نہیں کرتا علوم عقلیہ اسکو ضرر و ضرر دینگے۔
 ابن جریم تلماری شمس فرقہ رائے اہل بدعت کا ذکر کر کے کہتے ہیں:-

"قال الله ایها المسلمون تحفظوا ابداً منکم وعن جمیع لکمہ یعون الله الکلام فی ذلک"

لہذا ہمیں وجہ زائد میں سے کوئی چیز نہیں ہو چکی کہ اکثر اصحاب مرید علوم میں کچھ واقفیت حاصل کر کے بلا پابندی کتاب و سنت مذہب میں اجتہاد کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور جس قدر آج بعض دہریہ مذہب میں ترمیم کرنا چاہتے ہیں سب کے سب ایسے ہیں جن میں مطلقاً علم نہیں کہ قرآن شریعت میں کیا لکھا ہے؟ نہایت افسوس ہے۔ ۱۲ منہ۔

الترمو القرآن وسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم وما مضى عليه الصحابة رضی الله عنهم
والتابعون واصحاب الحديث عصرًا عصرًا الذين طلبوا الاثر ودعوا كل محدثة قفل محدثة
بدعة وكل بدعة ضلالة وكل ضلالة في النار۔

یعنی اے مسلمانو! اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو اور اپنے دین کی حفاظت کرو اور تمہیں
ایک جامع ظل اس بارہ میں بتلاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت رسول اور روش صحابہ تابعین
عالمین بالحدیث کو لازم ملزوم ہے جو مختلف زمانوں میں صحت حدیث نبوی کے پیچھے لگ رہے ہیں اور
ہر ایک قسم کی نئی بات کو جو مخالفت شریعت ہو چھوڑ دو کیونکہ نئی بات بدعت ہے اور بدعت گمراہی
گمراہی سیدھی جہنم کی راہ دکھاتی ہے۔ خدا ہر ایک مسلمان کو توفیق بخشتے۔ امین

التعلیلات الدیانات

کیا یہ ہر دو نقطہ کسی ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں یا ان کا مفہوم ایک دوسرے سے
علیحدہ ہے؟ اس سوال کا جواب غالباً اس مسئلہ کو زیر بحث لاسنے پر دیا جاسکتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب
کی تعلیم میں اہم کیا نسبت ہے؟ ہمیں مسئلہ زیادہ پیچیدہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ بالکل سادہ اور واضح ہے
فلسفہ تہ اسلامی دنیا میں آج تک جو کچھ کیا ہے اس کو مقابلہ مذہب دیکھنا چاہئے تلخ جہان تک
قوموں کی ترقی و تنزل کا پتہ دیتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ ہمیشہ مذہب کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے
اور ہمیشہ اپنی نقاریں مذہب سے جدا رہا ہے اور کہیں اس نے اس کو اپنا متفق نہیں بنایا بلکہ بسا
اوقات ہر دو میں مخالفت جڑھا کی حتیٰ کہ سلاطین وقت کو کسی نہ کسی کی حمایت میں متوجہ ہونا پڑا۔
جہان تک ہمیں معلوم ہے ان دونوں کا کسی زمانہ میں بھی اتفاق نہیں ہوا جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے
کہ فلسفہ اور مذہب میں اتحاد کی ناممکن ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ فلسفہ کا کوئی صحیح معیار کسی قوم اکیسی
زمانہ میں آج تک قائم نہیں ہوا بلکہ ہر ایک زمانہ کے عقلاً اور واقعات عالم میں غور کرنے والے لوگ
اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نیا فلسفہ تیار کرتے رہے اور یہی بہت بڑی وجہ ہے کہ کسی ایک ہی مسئلہ کی

بابت مختلف فلسفیوں کے اقوال اس قدر متناقض واقع ہوئے ہیں کہ ان میں سے کسی کی صحت تسلیم کر لینے کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں عالم کو بعض نے قدیم کہا اور بعض نے حادث تسلیم کیا۔ اسی طرح بعض نے صلاح عالم کے وجود کو تسلیم کیا اور بعض نے اسکی نفی کی بعض نے ذات باری کو وجود مطلق بشرط اطلاق تسلیم کیا اور بعض حلول کے قائل ہوئے بعض نے صفات کی نفی کی بعض نے اس کی صفات کو ثابت کیا بعض نے اس کو عالم کلیات تسلیم کیا اور عالم جزئیات ہونے کی نفی کر دی بعض نے اس کے افعال کو مقتضائے ذات قرار دیا جیسے حرارت شمس بالارادہ شمس ظاہر ہوتی ہے بعض نے اس کو فاعل بالارادہ تسلیم کیا بعض نے اس کے افعال کو کسی غرض پر مبنی کیا اور بعض نے غرض کی نفی کر دی بعض نے اس کو ایک جسم مانا اور بعض نے مستقل کہا یعنی ایک ہی وقتہ سب کچھ پیدا کر کے الگ ہو بیٹھا۔ بعض نے ملائکہ کے وجود کو تسلیم کیا اور انہیں رباب الانواع کہا اور بعض نے ملائکہ سے قویٰ طیبیہ مراوئے بعض نے افلاک کو ایک جسم صفات محیط عالم مانا اور بعض نے اس کی کالی نفی کر دی بعض نے ارواح النسانیہ کو باجد مرگ باقی قرار دیا اور بعض نے کہا کہ موت کیساتھ روح بھی فنا ہو جاتی ہے کیونکہ وہ صرف ترکیب جسمانی کے اعتدال کا نام ہے بعض نے عالم آخرت کے حساب و کتاب کو مانا اور بعض نے حشری کا انکار کر دیا بعض نے حشر کو جسمانی ٹھہرایا اور بعض نے صرف روحانی ثواب و عذاب پر ہی قناعت کر لی بعض نے انقلاب حقیقت اشیا کو صحیح مانا اور بعض نے محال بعض نے نبوت کی ضرورت کو تسلیم کیا اور بعض نے انکار کر دیا بعض نے اجرام فلکیہ کو مختلف تاثیرات کا مصدر سمجھا۔ اور بعض نے اس کو غلط قرار دیا بعض نے روح کو ابدی و انسانی قرار دیا اور بعض نے حادث و ابدی مانا بعض نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو محض تنبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں سمجھا اور کہا کہ عوام الناس کے سمجھانے کے لئے مصلحتاً ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور بعض نے یہ کہا کہ شریعت صرف جاہلوں کے لئے ہے اس لئے جو لوگ خود فہم و فراست رکھتے ہیں انہیں انبیاء علیہم السلام کے اتباع کی چنداں ضرورت نہیں وغیرہ وغیرہ ہم کہاں تک ایسے لاتنہای اختلافات کو بیان کرتے چلے جائیں ہیں تو اہل فلسفہ کی اس قسم کی تعلیمات کے دیکھنے سے معلوم ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی گمراہی میں صرف اس لئے

ڈالے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے اتباع سے اپنے تئیں مستغنی قرار دیا ہے اور غضب الہی کے موربہ بن گئے اور تعجب ہے کہ چند جُہال اور سفہائے گردہ کو جو بیٹھے بیٹھے عقلی دھوکو سے چلایا کرتے ہیں۔ حکماء کے لفظ سے نافرور کیا جاتا ہے۔ افلاطون۔ ارسطو۔ سقراط اور ان کے بعد اسلامی زمانہ کے محققین ابونصر فارابی۔ بوعلی سینا۔ یعقوب کندلی۔ ذکریا رازی وغیرہم جن کی عمریں الحاد و زندقتہ میں پوری ہوئیں آج ان لوگوں کے نزدیک جنہیں فلسفیانہ خیالات سے بڑی دلچسپی ہے فلک تحقیق کے چمکتے ستارے سمجھے جاتے ہیں مگر ایک ایماندار عالم باعل کو جو اتباع نبوی سے مقامات عالیہ تک رسائی حاصل ہوتی ہے اور جس حقیقی سرور و شادمانی کا وہ اس عالم میں مالک ہوتا ہے اور جس کی اُسے آئندہ زندگی میں اُمید ہے اُس کا عشرِ عشر بھی ان نابھکلوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ سب سے بڑا حجاب جو فلسفی کو قبولِ حق سے مانع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے پختہ یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ سمجھ چکا ہے حق ہے اور دیگر کتبِ نبویہ۔ دانی کے پایہ کو نہیں پہنچ سکتے پس ہی ایک ایسا حجاب ہوتا ہے جو اُسے تمام عمر اتباعِ نبوت سے برگشتہ رکھتا ہے اور بالآخر ذلیل و نامکام دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اسلامی زمانہ کے فلاسفہ نے مذہب اور فلسفہ میں تطبیق دینے کی بہت کوشش کی ہے مچلے ان کے شیخ الرشید بوعلی سینا ہے جس نے فلسفہ ارسطو کو فروغ دیا اور اس کی کتابوں پر شرح و حواشی لکھے اور خوبت سی کتابیں تصنیف کیں مگر ملاحظہ یونان کا فلسفہ یا سفہائے یورپ کا مذہب سے تا قیام قیامت بھی مطابقت نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ اس صدی کے بعض جہلانے یورپ کے علوم جدیدہ کی منہ زور ترقی کو دیکھ کر یہ دعویٰ کیا کہ وہ علوم جدیدہ اور مذہب میں تطبیق دے سکتے ہیں اور قریباً قریباً یہ خیال کئی کورڈ مغز لوگوں کے دماغ میں جاگزین ہو چکا ہے مگر انہوں نے جب ان میں سے بعض کی تطبیق کا حال دیکھا اور پڑھا تو معلوم ہوا کہ سرے سے حقائق ہی

۱۔ سقراط کی تعلیم کا اکثر حصہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے ہی ماخوذ تھا۔ اور بہت پرستی کو برا سمجھتا اور لوگوں کو جزا و سزا کی بابت وعظ کیا کرتا اور یہی وجہ ہے کہ بالآخر اُسے جامِ نہرِ بیزاریا پر ۱۲۰۰ء میں ۱۲۰۰ء

کا انکار کرنے لگ گئے مثلاً معجزہ کوئی چیز نہیں شیطان قوائے ہمسیمہ کا نام ہے۔ آسمان کوئی چیز نہیں بلکہ قوائے فطریہ سے مراد ہے جسٹر صرف روحانی ہوگا وغیرہ لاک۔ سو اس صورت میں ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ علوم جدیدہ اور مذہب میں تطبیق آسان کام ہے لیکن اگر مذکورہ بالا امثلہ میں حقیقت الامر کچھ اور ہے جس کو عرصہ قریباً ڈیڑھ ہزار سال سے مسلمان برابر مانتے چلے آئے ہیں اور مانتے چلے جائینگے تو ہمارے خیال میں نہایت موزوں ہوگا کہ ہمیں تطبیق محمد عربی (فداہ رُوحی) کے سوا کسی اور کو اپنا پیغمبر قرار دے لیں اور قرآن مجید کے سوا کسی اور فلاسفر یا بدتر ملکی کے اقوال کو اپنا دستور العمل بنالیں کیونکہ بصورت اس امر کے کہ مذہب اسلام میں مذکورہ بالا امور اسی طریق پر تسلیم کئے گئے ہیں جس طرح تمام مذاہب تسلیم کرتے چلے آئے ہیں تطبیق کا افسوس کا گریہ نہیں ہونی چاہیے۔ اور نہ ہی یورپ کے محققین اُن دورِ از کاہ باتوں کو پہلے باندھیں گے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ مذہب اسلام میں معجزہ، قیامت، ملائکہ، شیطان وغیرہ امور کی کیا حقیقت ہے؟ اور یہ نئے مدعیان تطبیق محض فلسفہ و سائنس کے بظاہر دندناتے گوہوں کی بھی بھر مار سے ڈر کر اپنی جھوٹی پٹری کی خیر مینا ہے ہیں ورنہ امور مذکورہ بالا کی حقیقت مسئلہ ہی ہے جسکو شارعی علیہ السلام نے پیش کیا۔ اور وہی مسلم بہرگی۔ فلسفہ و سائنس بگڑ جائینگے مگر اسلام کے مسائل حقیقیہ بدستور اسی طرح پیش کئے جائینگے جس طرح آج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ فلسفہ و سائنس نے دنیا میں آج قدم نہیں رکھا بلکہ شروع سے یوں ہی چلا آیا ہے۔ ہاں یہ مسلم ہے کہ اپنی ہی وضع میں جدوہ افزہ ہوا ہے سو ہر ایک زمانہ کا ہمیشہ اپنا مقتضا ہوا کرتا ہے۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اہل اسلام میں عام طور پر یہ بات زبان زد ہے کہ مذہب اسلام عین فطرت الہیہ ہے اور اہل فلسفہ و سائنس بھی قانون فطرت کے محقق ہوتے ہیں۔ پھر یہ کیونکر صحیح ہوگا کہ مذکورہ بالا حقائق کو اسی معنی میں علوم جدیدہ پر موازنہ نہ کیا جائے جس میں اہل اسلام تسلیم کرتے ہیں کیونکہ علوم جدیدہ میں تا حال کوئی ایسے اصول وضع نہیں ہوئے جن سے معجزہ اپنے اصلی معنی میں ثابت کیا جاسکے یا جسٹر چمائی پر دلائل از روئے تحقیقات جدیدہ قائم کئے جائیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بات کہ مذہب اسلام میں کوئی بات عقل کے متافی نہیں درحقیقت صحیح ہے مگر

منافی عقل نہ ہونا اس امر کا مسلمہ نہیں کہ وہ خارج از عقل بھی نہ ہو۔ سو جو امور کہ ایسے مقدمات سے تعلق رکھتے ہیں جو عالم برزخ یا عالم اخروی سے شمار کئے گئے ہیں وہ بیشک خارج از عقل ہیں مگر منافی عقل نہیں کیونکہ کسی حقیقت کے عدم علم سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ درحقیقت مخالف عقل ہے پس مذکورہ بالا خیال ہر ایک حالت میں صحیح ہے کہ مذہب اسلام ہرگز منافی عقل نہیں کیونکہ اس کے تمام احکام و عہد حکمت پر مبنی ہیں اور ان میں مصالح عباد مضمون ہیں۔ اسی سوال سے ملتا جلتا ایک اور سوال اس مقام سے تعلق رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مدت سے بعض تعلیم یافتوں کا خیال ہے کہ نیا علم کلام ملک میں رواج دیا جائے یعنی علوم جدیدہ کے رُوسے جو جو اعتراضات مذہب کے متعلق پیدا ہوئے ہیں ان کو علوم جدیدہ کے اصول ہی سے رد کرنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اس سوال کے جواب میں دو احتمال پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ ہم علوم جدیدہ کے رُوسے مسائل اسلامی کو انہیں منوں میں ثابت کرنے کی کوشش کریں جن معنی میں زمانہ نبوت سے آج تک اہل اسلام میں مسلم چلے آئے ہیں کیونکہ یہی صورت حقیقی اسلام کی اشاعت منظور ہو سکتی ہے اور متقدمین اہل کلام نے بھی اسی طریق کو بقابلہ فلسفہ یونان اختیار کیا تھا مگر گفتگو یہ ہے کہ اس قسم کے لوگ کہاں ہیں جو علوم دینیہ میں استقدر وسیع ہمارے رکھنے کے علاوہ علوم جدیدہ کے بھی تسلیم استاد کہنا میں۔ ہیں تو آج تک ہندوستان بھر میں کوئی شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا۔ ہاں ادھارتترا و صاحبشیر کے مصداق بہترے موجود ہیں۔ اور بظاہر ایسے لوگوں کا پیدا ہونا ناممکن نہیں تو قریباً ناممکن ضرور ہے کیونکہ موجودہ تصائب تعلیم میں طلبہ کے لئے کوئی ایسا موقع نہیں رکھا گیا کہ وہ ہر دو قسم کی تعلیم کے جامع بن سکیں گو ایسا ہونا ناممکن نہیں۔ دوم یہ کہ مسائل کی حقیقت مسلمہ کے سوا ان کی کوئی تاویلی صورت اختیار کی جائے جیسے بعض نیا چہرہ زمانہ حال کا قاعدہ ہے مگر ہمارے خیال میں اس قسم کی کوشش مذہب اسلام کو بجائے فائدہ کے سراسر نقصان رساں ثابت ہوگی کیونکہ امور کی ہلکت کم ہونگی اور شرع علیہ السلام کی طرف (محاذ اللہ) جھوٹی باتیں منسوب کرنا پڑے گی اس کی نسبت یہی بہتر ہے کہ کچھ نہ کیا جائے کیونکہ لائق کی بجائے قواعد فطریہ کا سبق دینا مسیح کو یوسف بخار کا بیٹا کہنا۔

سمندر کے پھٹ جانے کو مدو خیر کی حالت بیان کرنا اگر تکذیبِ قرآن نہیں تو اور کیسا ہے؟ غور کرنے کا مقام ہے کہ ملاحظہ نے ہر چند اصل مسائل کو اسی غلط تاویلی صورتوں میں پیش کیا مگر خداوند تعالیٰ شاہد حال ہے کہ از شرق تا غرب امور مذکورہ بالا کے متعلق اہل ایمان کا وہی اعتقاد ہے جو ڈیڑھ ہزار سال سے چلا آتا ہے اور جو کبھی بھی نہیں بدلیگا۔ ”ولو كره الملاحدة النيا حرة“

چراغِ کذب را بنود فرو مین

چند ایک جہلاً و سہماً کا الحاد بھلا کیا وقت رکھ سکتا ہے کیونکہ اس قدر ملاحظہ تو ہر ایک زمانہ میں موجود رہے ہیں *

ہم نے بعض ملاحظہ حال کی تقریروں میں یہ چڑھایا ہے کہ مسلمانوں میں جب تک علومِ حکمیہ کا زور شور رہا اور ان کی تعلیم بالادھن ٹوک جا رہی تھی تب تک ان میں ہر ایک قسم کی ترقی کا گنّ موجود تھا۔ بعد میں متعصب علماء نے علومِ فلسفہ و منطق کے پڑھنے کو کفر بتلایا اور علماء اسلام کو چن چن کر مروا ڈالا تو مسلمان روز بروز پستی کی طرف جھکتے چلے گئے حتیٰ کہ ان سے ترقی کے تمام کمالات چھن گئے اور کوروں کے کوروں رہ گئے۔ عکس ہے کہ یہ خیال کسی نادانِ وقت کے نزدیک قابلِ وقت ہو مگر ہمارے نزدیک اسی خیال کے لوگوں نے واقعات سے اُٹنا نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہ نہیں سمجھا کہ سب سے کامل اتباعِ مشرطیت کا زمانہ قرونِ اولیٰ (صحابہ و تابعین و تبع تابعین) کا زمانہ تھا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایسی فلسفہ و غیرہ کیواسات کی ہو ابھی مسلمانوں کو نہیں لگی تھی۔ جو نہی کہ دورِ عباسیہ میں مخرجاتِ اہل یونان نے اہل اسلام میں دخل پایا اعتقادات کی جڑ کھوکھلی ہونے لگی اور روز بروز بدعات کا بازار گرم ہونے لگا۔ پھر تیسری صدی میں کیا تھا؟ یہی کہ فلسفہ نے گھر گھر اپنا دخل و تصرف کر لیا اور تمام افراد پر اس کا کم و بیش اثر پڑا۔ کوئی استدلالی رنگ میں جلو افروز ہوا اور کوئی الہامی وضع میں۔ الغرض ”اذا نزل بساحتهم فساء صباح المساکین“ رجبِ فلسفہ مسلمانوں کے گھروں میں نازل ہوا تو ان کا ہر زمانہ آگیا (وہ جن عصیت جو کتاب اللہ میں غور و تدبیر کرنے سے دلوں میں پیدا ہو سکتی ہے وہ استدلالِ فلسفہ سے بالکل زائل ہو گئی۔ اور

وہ لذت عبادت اور تقویٰ ایمانی جو اتباع سنت نبوی سے دلوں کو مسرور و محفوظ کر سکتی ہے قبول اور بیہودہ علوم کی طرف متوجہ ہونے سے یک قلم منقطع ہو گئی۔ کٹ جاتی کو تحقیق اور الزام خصم کو نصرت حتی گردانا جانے لگا۔ ایمان بالحبیب اور عظمت قرآن و سنت اور اخلاص نے قوم کے دلوں سے کنارہ کر لیا اور بال کی کھال اُٹا کر دکھانے والے لوگوں نے بے طرح حقیقت پر شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول فروع میں فلسفہ و منطق کے بغیر ایک قدم اٹھانا بھی دو بھر ہو گیا۔ معتقدات میں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں ورغے پیدا ہو گئے اور عملیات میں کثرت اختلافات کی وجہ سے صنعت اور سستی باہ باگئی اگر کسی شخص کو ہماری اس تقریر کی تصدیق کرنا ہو تو کتب تواریخ اور کتب علم کلام کا مطالعہ کر کے دیکھئے۔ مگر کیا کوئی انصاف پسند محقق ایک ان کے لئے بھی تسلیم کر لے گا کہ یہ سب کچھ علوم حکمیہ یونانیہ کی اندرونی رہنمائی کا نتیجہ نہیں تھا۔ بے شک یہ سب کچھ انہیں خبیث، مُردار، نجس اور ملعون علوم کے دخل و تصرف سے ظہور میں آیا۔ اور اب بھی انہیں علوم کے ذریعہ سے مسلمانوں کی اعتقادی اور عملی حالت متزلزل ہو رہی ہے ممکن ہے کہ وہ لوگ جواب بھی فلسفہ اور دیگر علوم حکمیہ کی سرزمین میں نشو و نما پانچکے ہیں ہماری مذکورہ بالا رائے سے التعلق ظاہر نہ کریں اور منہ بند کر انکار کر دیں مگر حق یہ ہے کہ جن دلوں میں ان خبیث علوم کو دخل نہیں ہوا وہی مقدس اور مظہر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اسلام پاک کی پاک تعلیم کا اہم مقصد یہ ہے کہ انسان کا ظاہر باطن پاک ہو کر اللہ تبارک و تعالیٰ کے زیر فرمان ہو جائے اور خضوع و خشوع جو منجملہ لوازم ایمان ہیں دل میں پیدا ہوں اور برباب رب العزت ہر دم اپنے تئیں ایک مطیع فرمانبردار غلام کی طرح حاضر رکھے اور ہر وقت توبہ و استغفار اور مناجات با درود دل بھنور جل شانہ پیش کرتا رہے اور دنیا کو دین کے تابع رکھ کر عالم آخرت کے لئے زاویر راہ تیار کرے اور محبت الہی کی کشتی پر سوار ہو کر با دبان شوق کے سارے ساحل نجات پر پہنچ جائے اور خوفِ عذاب اور جائے ثواب کی حالت میں منزل مقصود کو طے کرتا چلا جائے۔ ناظرین اپنے ایمان سے کہہ دیں کہ آیا یہ دولت بے بہا بجز خالص ایمان عاشقانِ جناب محمدؐ ہی کے کسی فلاسفر کو بھی حاصل ہے؟ ہم مانتے ہیں کہ ایک بڑا فصیح و بلیغ

فلو سفران کی آن کے لئے اپنی پُزدور اور پرستندال تقریر و تحریر سے ایک عارضی را اثر پیدا کر سکتے ہیں مگر لذت ایمان سے جیسے وہ غور و بے بہرہ ہوتا ہے اسی طرح اسکے مستفیدین بھی اس کی تحریر و تقریر سے کچھ مستفیع نہیں ہو سکتے یہی ایک بات ہے جس کی بنا پر ہم نے علم کلام کے طرد و گان کی خام خیالیوں پر بسا کرتے ہیں جو حقیقتاً رونا ہے ورنہ نہ تو ہم مسلمانوں کو تعلیم دیتے ہیں کہ وہ علومِ مروجہ کو چھوڑ بیٹھیں اور زمانہ کا سا تونہ دیں اور نہ ان علوم کے مسئلہ آنا کار آمد ہونے کے قائل ہیں۔ کون کہتا ہے کہ انسانی دنیا کے معاملات بدون علوم و فنونِ مروجہ کے کسی اور طرح بھی چل سکتے ہیں؟ ہماری مخالفت کی صورت نہایت صاف اور صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ سب سے تعلیم دین کے مسلمانوں و جوانوں کی دینی حالت کی اصلاح کا خیال رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے لئے صرف **لا الہ الا اللہ** کافی ہے وہ بیکارے خود اس دینی نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں اور ایک محال خیال کے پیچھے لگے ہوئے ہیں فلسفہ اور دیگر علوم حکمیہ بے شک دانائے روزگار بنا دیں گے مگر اہل ایمان ہرگز ہرگز نہ بنا سکتے کیونکہ اہل ایمان صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو کتاب و سنت کا علم رکھتے ہوں اور ان پر عامل ہوں کچھ عرصہ ہو کہ دہلی کے ایک منشی صاحب کا جو شمس العلماء بھی تھے بعض اخبارات میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بچوں کو ابتدائیں تعلیم مذہبی سے بالکل برطرف رکھنا چاہیے۔ بڑے ہو کر وہ خود اپنی اپنی مرضی کے مطابق دین حق کی تلاش کر لیں گے ہر حید شخص مذکور کی رائے کسی علم و عقل کے آدمی کے ہاں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتی کیونکہ وہ خود دین کی ہر لحاظ مستقیم سے اسی قدر آشنا ہیں جس قدر اُجکل کے اہل جا پان مگر اب یہ ایک نام کے مسلمان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظِ با اوقات نادانوں کو دھوکا دے جاتے ہیں۔ اس لئے ہم نہایت زور سے مذکورہ بالا رائے کا ابطال کرتے ہیں کیونکہ یہ کہنا کہ مسلمانوں کو سچیں میں مذہبی تعلیم نہیں ہونا چاہیے اور وہ جوان ہو کر خود ہی مذہبی تعلیم میں ماہر بن جائیں گے محال ہے کیونکہ جوان ہو کر ضروریاتِ معاش سے کس کو اتنی فرصت ملتی ہے کہ وہ مسلمان ہونے کے لئے از سر نو کوشی ہی شخص سے تعلیم حاصل کرتا پھر سے ہم تو اپنے فانی تجربہ سے ویکہہ رہے ہیں کہ جن طلباء کو ابتدائے تعلیم

سے انتہائی تعلیم تک مذہبی تعلیم کے کسی حصہ کے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ ان میں سے فیصدی تیناٹھ^{۹۶} محض نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے جن غلبہ انگلو کسی قدر مذہبی تعلیم کا موقع ملا ہے^{۹۷} ضرورت کے سبب اپنی اعتقادی اور عملی حالت میں نسبتاً نمایاں فرق رکھتے ہیں اللہ اعلم ان شاء اللہ۔ تعجب ہے کہ مذہبی تعلیم جو صداقت حق پسندی، عدل و انصاف، رحم و کرم، فراخ حوصلگی اور سچی بہادر دی کا بیج انسانی طبائع میں بونتی ہے اس کو ناکارہ اور بے سود نظر کر کیا جاتا ہے اور مروجہ علوم کو جو صرف انسانی تمدن و معاشرت میں کارآمد ہو سکتے ہیں اور اصلاح نفس سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں ضروری قرار دیا جاتا ہے غالباً اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ شخص مذکور نے مذہبی تعلیم کی غرض و غایت کو مطلق نہیں سمجھا تعلیم کی اصلی غرض یہ ہے کہ انسان کے جمیع تواء فطریہ اپنے اپنے کام کرنے لگیں اور جذبات حیوانیہ کو استیلاں پر لایا جائے لیکن مذکورہ بالا رائے پر عمل کرنے کی صورت میں کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ علی الاطلاق یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے؟ اور یہ مسلم ہے کہ جب تک انسان میں صداقت اور عدل و دیانت و فیہ اخلاق پیدا نہیں ہوتے تمدن و معاشرت میں ترقی کا حقیقی رُوح ہرگز پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں اگر ترقی تمدن و معاشرت کے معنی محض حیوانی لذت پروری کے لئے جائیں تو پھر دیانت و تقویٰ کی بھی کچھ ضرورت نہیں جیسا کہ اہل مغرب کی حالت ہے کہ بچہ پیمہ کمانے اور نفس پروری اور سبابت نعم و توش میں مشغول رہنے کے انسانی زندگی کا کوئی خاص مقصد ان کے ہاں قرار نہیں دیا گیا۔ ان کی تمام ایجادات تحقیقات کی بنیاد بالواسطہ یا بلاواسطہ حظوظ نفسانی پر مبنی ہے۔ مابعد کی زندگی پر یا تو انہیں ایمان ہی نہیں اور اگر ہے تو اس کی اصلاح کے لئے ان کی زندگی کا کوئی جز بھی وقف نہیں کیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑی بڑی ایجادیں بڑے بڑے نام پیدا کر کے بالآخر حسرت و اندوہ و الحزن ہو جاتے ہیں مگر اسلام پاک کی تعلیم کا منشا اس روشن ترقی کو ہرگز پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کرنا چاہئے کیونکہ اسلام نے انسان کو تمام ایسی تعلیمات حقیقیہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس کو انسان ہونے کی حیثیت سے دنیا و آخرت ہر دو میں کارآمد ثابت ہوں۔ اقوام کی ترقی و منزل کی تاریخی فلاسفی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا کہ کسی قوم کے ادب کا سلسلہ اسباب یہی علم فلسفہ ہے میں کیونکہ یہی علوم مادہ پرستی سمجھا کر انسان کو مغرور

اور خود میں بنا دیتے ہیں اور انہیں کے آثار قیحہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان شکوک و اوہام کی دلدل میں پھنس جاتا ہے اور اہستہ اہستہ خدا اور اس کے فرستادہ لوگوں کے حق میں سوء ظن پیدا کر لیتا ہے جس سے انسان اپنے تئیں کامل اور مکمل سمجھ کر انبیاء علیہم السلام کے اتباع سے ستغنی قرار دینے لگ جاتا ہے حتیٰ کہ انکار و عصیان تک نویتا پہنچ جاتی ہے۔ کیا کوئی شخص یہ بتلا سکتا ہے کہ دنیا میں کس قدر اہل فلسفہ نے تعلیم و وحی کی تصدیق کی؟ غالباً اس کا جواب نفی میں دینا پڑے گا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ وہ اپنے تئیں صاحب کمال گردانتے رہے اور انبیاء علیہم السلام کو صرف فرقہ عوام الناس کے واسطے مُصلح خیال کرتے رہے۔ یہ خیال کسی شخص یا شخص خاص سے مخصوص نہیں

پہلے یہ خیال کہ علوم طبعیہ مادہ انسان کو متربل الا یان اور تدریج کا فروغ دینا چاہتے ہیں بالکل صحیح اور واضح ہے۔ علماء ہنر و صنعت ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی سنت ہے کہ لوگ جب تعلیم و وحی سے اعراض کر لیتے ہیں تو وہ علوم مادیہ کی طرف جھٹک پڑا کرتے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ تدریجاً انہیں ذلت و ادویہ کی طرف کھینچ لاتا ہے۔ بنی اسرائیل نے نفوس قورات کو ترک کر کے علوم مادیہ کو مقدم سمجھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مغلوب کر کے ان کے مخالفین کو ناپسند کر دیا اور ان کی شان و شوکت نازل ہو گئی اور نصاریٰ ان پر سرزمین مغرب میں غالب گئے اسی طرح سرزمین مشرق میں جبکہ ایرانی و یونانی فلسفہ نے روم و ایران وغیرہ ممالک میں مادہ پرستی قائم ہو گئی تو اہل اسلام کے ہاتھ سے نیست و نابود کر دیئے گئے۔ علی ہذا القیاس تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں جب قرامطہ باطنیہ لوگوں نے اصول فلسفہ کی پابندی سے السجادہ زندقہ پھیلا کر شروع کر دیا۔ اور قومیں مادہ پرستی کا مرض پڑھنے لگا تو مغرب اور مشرق کی اسلامی سلطنتیں تنہا اور بامداد ہوئیں۔ الزعم بنی اسرائیل کے تعلیم و وحی سے اعراض کرنے پر مسیح علیہ السلام مبعوث ہوئے جنہوں نے مادہ پرستی کا قلع و قمع کیا۔ اور ان کا دین دُور دراز ملکوں میں پھیل گیا اور مسیح علیہ السلام کے بعد قریباً تین ہزار سال تک تعلیم و وحی کا لوگوں میں متبع رہا۔ پھر دین مسیح میں تخریب و تہلیل ہونے لگا حتیٰ کہ دین مسیح میں فلسفہ نے پورا پورا رُسرُور پیدا کر لیا اور انہیں بن پرستی کی طرف کھادیا یعنی فلسفہ کے اصول عقل و فاعل مقول کے عقیدہ بونیکے خیال سے انہیں یاب و یابا روح القدس کے اتحاد کی طرف توجہ دلائی مگر کچھ کچھ اتباع و تبع کی کان میں جاری رہا۔ تاہم انہوں نے عدو دلسلہ یعنی طائفہ و عوام وغیرہ احکام کو توڑ ڈالا اور اصلیت دین کی بالکل بے تامل و نشان ہو گئی۔ چنانچہ مسیحی اُمرت کے بڑے بڑے علماء نے قریباً اسی ماباس متجہن غریب مقام کے اور اس قدر اختلاف پڑھا کہ ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ اور یمن و یمن و یمن و یمن کی طرح یہ بات اس نامہ میں ضرب النشل ہو گئی تھی کہ اگر دین پوری جمع ہوں تو یہ مذهب عیسائی کے گیارہ طریق ثابت ہونگے آخر غنطیس شاہنشاہ روم نے اطراف و جہان کے تین لاکھ استاد استغفر کو جمع کیا اور حکم دیا کہ تدریس و تفسیر کی ایک صحیح صورت قائم کرو۔ چنانچہ بہت سی مجلسیں کے بعد بھی اتفاق کی صورت قائم نہ ہو سکی کیونکہ فلسفہ و اصول پر بحث کا خاتمہ ہونا تو کرنا کہ کوئی مفہوم محصل ہی ممکن نہیں۔ آخر غیرت الہی نے تجوڑ ڈالا اور بنیاد پرستی ختم ہو گئی۔ اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر تعلیم و وحی کی حقیقت کو اہل دنیا پر واضح کر دیا مگر عائدہ اللہ *

بلکہ اسلامی زمانہ میں بھی تاریخ ایسے لوگوں کا پتہ دیتی ہے جو عمر بھر عبادتِ حق کی اُسی طرف سے لگے رہے اور
 بزرگِ خودِ عالمِ فطرت کے راز و انوار اور مہرِ شمس بنے رہے مگر وہ حقیقت اعداءِ اللہ اور اعداءِ الرسول تھے۔
 یقیناً ان نامجاہلوں کو ایک دن بھی اخلاص کے ساتھ محض رسولِ عالمینِ مشرّع و مخلص کا موقوفہ نہیں ملا
 ہوگا اور نہ انہوں نے درودِ بھرے دل سے بالفاظِ ذیباغضِ ربی خطبائی اور اللہ دین کی کبھی مناجات
 کی لذت اُٹھائی ہوگی۔ اور یقیناً "لا اُستعصى شئاً علیا علیا انت کما اثنیت علی نفسك" کے
 دریائے حیرت میں ڈوب دینے والی کیفیت سے کبھی متاثر نہیں ہوئے ہونگے اور نہ انہیں دینا اُتاماں اللہ
 رحمةً وحیٰ لنامن امرنا رشداً کے لامتناہی خزانہ رحمت کے کچھ نصیب ہوا ہوگا اور نہ کبھی
 آیاتِ نعید و آیاتِ لستعین کی تعلیمِ توحید سے حقیقتِ عبودیت ان پر منکشف ہوئی ہوگی کیونکہ
 جس شخص کے دل و دماغ سببِ سبب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں وہ کبھی کج بخشنی اور
 سو غطن سے باہر نہیں نکل سکتا اور یہ ہر دو امرِ دل سے اخلاص کی بڑا اکھیر ڈالتے ہیں جو عبادت
 کے لئے رُوحِ ورہان ہے پس نفسی ہرگز خدا کا مخلص بندہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ اسکی
 عام اخلاقی حالت حسبِ اقتضائے عقل ایسی بُری نہ ہو مگر خداے تعالیٰ کی اطاعت میں وہ سخت
 کمزور اور ضعیف ہوتا ہے۔ ایسا اوقات ایسے لوگوں کے دل میں جہالت کی وجہ سے یہ سما جاتا
 ہے کہ جب شریعت کی پابندی سے عرض یہ ہے کہ انسان کی اخلاقی حالتِ دلت ہو
 اور وہ بنی نوع انسان کی ہمدردی کرے تو جب چندی احکامِ شریعہ کے بغیر اصلاح حاصل کر سکتا

۱۲۵ کے مطابق تیسری صدی ہجری میں فلسفہ نے اہل دین میں ایسا زہر پھیلا دیا کہ پھیلا کر بیسیوں فرشتے پیدا کر دیئے۔
 نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ غروب ہو گیا۔

ہم آج موجودہ زمانہ میں سرزمینِ مغرب میں مادہ پرستی روز بروز مہمّی حلّی جاتی ہے اور قریباً قریباً علومِ فلسفہِ مادہ
 نے اس قدر صوبہ حاصل کر لیا ہے کہ تعلیم و وحی کا کوئی جز بھی ان میں باقی نہیں رہ گیا۔ ہمدی قومِ فطرۃ اللہ فطرۃ اللہ بکار
 کر آسمان کا مغر جات جاتی ہے۔ ان کی ترقیات کو دیکھ کر ہمدی قوم کے لوگ دنگ ہو رہے ہیں اور انھوں پر انکی تقلید کا
 سبقِ نوم کو سکھاتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کی حجت ان پر کوری ہو رہی ہے اور عنقریب وہ لوگ حراوتِ طبع میں
 مبتلا ہو کر ملکات کے گڑھے میں جا پڑیں گے تیار ہو رہے ہیں اور ایسا ہی ہو گا کیونکہ وہ آثار پیدا ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

ہے تو اسے کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ تکلیف میں پڑے۔ اور اگر مرضی سے کبھی کسی حکم کی پابندی
کرائی جائے تو بھی کوئی بری بات نہیں اور اگر نہ کی جائے تو بھی کوئی حرج نہیں چنانچہ عموماً مسلمانوں
کے قومی لیڈروں کی شرعی حالت بالکل ایسی ہی ہے۔ ہم نے چند ایک موٹے موٹے اور مشہور قومی
لیکچراروں اور شاعروں اور مصنفوں کی نسبت معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ وہ نماز کی پابندی نہیں
کرتے اور اگر کسی مجمع میں موقع مل بھی جائے تو طوعاً و کرہاً رسمی طور پر ادا کر لیتے ہیں ورنہ دیگر اوقات
میں انہیں ہرگز کبھی خیال تک بھی نہیں آتا۔ مگر یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ علوم خبیثہ کے مسائل
کا ان کے طباع پر اس قدر زنگ پڑھ جاتا ہے کہ علوم شرعیہ اور ان کے احکام سے انہیں طباعاً
نفرت آنے لگتی ہے اور وہ لائق پابندی سنت بالکل نہیں رہتا۔ بلکہ متبعان سنت کو حقارت کی
نگاہ سے دیکھتے اور ان کو تسمیہ تمیز الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمیں کئی ایک ایسے لوگوں کے
دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جو مجمع میں کھڑے ہو کر بڑے بڑے فصحاء و بلغاء کے کان کترتے ہیں اور
لوگوں کے دلوں پر اپنی قابلیت علمی اور وسیع النظری کا پورا پورا سکھ و خطبہ جما دیتے ہیں مگر احکام
شرعیہ کی پابندی میں سب سے پیٹے اور نکمے ہوتے ہیں۔ ہم مذکورہ بالا شمس العلماء صاحب سے
دریافت کرتے ہیں کہ آیا آپ نے تمام عمر علوم مروجہ میں بسر کرنے کے بعد کبھی کبھی دینی پابندی کی ضرورت
کو محسوس کیا ہے؟ جسکی دیگر فوجوالوں سے آپ توقع رکھتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے
غالباً آپ کو باجماعت نماز اور کرائے تو بجا لائے خود اپنے مکان پر بھی فرضیہ ادا کرنے کا موقعہ نہیں ملا ہوگا
اسکی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ کسور اعشاریہ اور تجارت اور مساوات جبریہ اور تناسب اضلاع
و نواہی اور تجارتی اور مومن سون ہواؤں اور ہائیڈروجن اور آکسیجن و خرافات مسائل نے آپکے
دماغ کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ علوم دینیہ کی ضرورت اور ان کی حقانیت اور عالم آخرت کی حوالہ دہی
اور تزکیہ و تصفیہ نفس اور اتباع سنت بنوی اور مناجات وغیرہ کا بھولے سے بھی خیال آ سکے بلکہ
کچھ تعجب نہیں کہ آپ ان امور کو محض ملازموں کی حماقت و جہالت یا مینوں یا کسی ضرورت وقتی پر محمول
کرتے ہوں۔ کتنا بڑا افسوس ہے کہ مسلمانوں کے سربراہان و درجہ اولیاء کی زبان و قلم سے اس قسم کے

و اسی خیالات سے وہ سب چسپک پہلیں ایمانی غیرت کے منافی جہل جم ایسے خیالات کی کافی اور مکمل و
مفصل تفسیل کرتے مگر انہیں کہ یہ موضوع ہمارے مضمون زیر بحث سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتا
یہ بالکل سچ ہے کہ فلسفہ و منطق اور علم النفس وغیرہ علوم حکمیہ ذہن کے صاف کرنے کا آلہ
ہیں۔ حقائق موجودات کی طرف توجہ کرنے میں معاون ہیں حق تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سب تک
علوم شرائع و دیانات کی ضروری تعلیم سے طلبہ فارغ نہ ہوں تب تک مذکورہ بالا علوم حکمیہ کی طرف
توجہ دلانا ان کی طبیعت میں مادہ شرک و ادبھی زیادہ کرنا ہے۔ اصول طب میں اطباء لکھتے ہیں۔
”البدن الذی لیس بالنسقی کما عانی دتہ فقد اذنتہ مشراً“ یعنی جو بدن اخلاط فاسدہ
سے پہلے صاف نہیں کیا جاتا غذا اس کے لئے اور بھی مادہ فساد کو زیادہ کر دیتی ہے اور یہ مسلم ہے
کہ علوم عقلیہ بمنزلہ غذا کے ہیں اور علوم شرعیہ بمنزلہ دوا کے۔ سو ریض آدمی کو غذا بدون استعمال دوا
کے کیا مفید ہوگی بلکہ الٹا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ برخلاف اس کے جب دوا مناسب استعمال
کر کے مرض کو روکا جائے اور غذا کا استعمال حسب ضرورت جاری رہے تو مرض یقیناً کم ہوتا
ہوتا بالکل رفع ہو جائیگا مگر ہمارا موجودہ نظام تعلیم غذا تک ہی محدود ہے جس میں دوا کا نام تک
بھی نہیں۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ مرض اسی لئے اور بھی ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ ہمارا یہ
ذاتی تجربہ ہے۔ کوئی سنی سنائی بات نہیں کہ ایسے طلباء ہمیشہ بجائے تصدیق کے تکذیب کیا کرتے
ہیں اور شاذ و نادر ہی مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

الاسلام والاستدلال

وہ علما جو ان مباحث پر تفصیل کے ساتھ واقفیت حاصل کرتے ہیں اور ان پر ان سب
کی باریکیاں۔ اسرار و حکمتیں ظاہر ہوتی ہیں اس بات کے مستحق ہیں کہ عالم کے لئے ذی علم مدبر با حکمت
پیدا کرنے والے خدا کا تمام لوگوں سے اور بھی زیادہ یقین کریں اور اگر ہم کہیں کہ یہ لوگ ان علما علم
کلام سے بھی جو خدا کے وجود پر اجمالی دلیلیں قیام کرتے ہیں بڑھ کر خدا پر ایمان لائے اور اس کے

وجود کو مانتے کے مستحق ہیں تو کچھ متبعین میں معلوم ہوتا کیونکہ یہ لوگ تو عالم کے پیدا کر نیوے کی مصنوعات میں عجیب سے عجیب اشیائے کے تفصیلی حالات پر واقف ہوتے ہیں اور کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ خدائے پاک کے وجود پر سوائے اس کے کہ اس کی مصنوعات اور عجائبات قدرت سے استدلال کیا جائے اور بھی کوئی عقلی دلیل ہو سکتی ہے؟ پس جب کوئی انہیں مصنوعات میں غور کر لگا اور انکی تفصیلی حالات پر اسے اطلاع ہوگی ان کا استحکام اسیہ امر کہ ان کے بنائے ہیں جزوِ ارادہ و حکمت سے کام لیا گیا ہے اس پر ظاہر ہوگا اور ضرورت اور اتفاق اس کے نزدیک ماسقط اللہ اعتبار قرار پائینگے تو اس وقت آپ دیکھیں گے کہ ایسے شخص کے دل میں ایمان نے پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنا قدم جمالیا ہے اور انکو نظر آئیگا کہ وہ ضلالت و گمراہی کی درست درازیوں سے کوسوں دور جا پڑا ہے اس پر اس کا جادو گر نہیں چل سکتا۔

اور اگر کوئی یہ کہے کہ جو لوگ ان کالجوں میں داخل ہوتے ہیں جن میں کہ علوم کائنات کی تعلیم ہوتی ہے خصوصاً جن میں کہ علم طب وغیرہ کام آنے کی غرض سے علم نباتات یا حیوانات پڑھایا جاتا ہے تو ان میں سے اکثر کی ہم یہ حالت دیکھتے ہیں کہ ان علوم کے حاصل کرنے کے بعد وہ کالج سے نکلتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی دائرہ اسلام سے بھی خارج ہو جاتے ہیں ان کے عقائد اسلامی عقائد سے کوسوں دور معلوم ہوتے ہیں اور تمام موجودات کے آثار کو مادہ اجزا کی حرکت طبیعت۔ قوانین قدرت فطرت وغیرہ اشیاء کے حوالہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کوئی چیز ہی نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ہے تو نیچر ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے اسی بے شعور سے ہو جاتا ہے۔ پس جب انہیں نے اتنا بڑا اسلامی ٹرگن منہدم کر دیا تو انہوں نے دین اسلام میں سے اعتقاد ہی کو نسی بات کا کیا ہے؟ کہ اب ان سے عبادت کی امید ہو سکتی ہے اور ان کی کو نسی خصلت اور کونا ادب قابل ستائش ٹھہر سکتا ہے؟ خصوصاً جب وہ فن طبعیات بھی پڑھ لیتے ہیں۔

جب انہیں کائنات کے قوانین قدرت پر اطلاع حاصل ہو جاتی ہے اور جب وہ ان کے اثر کرنے کی کیفیت سے واقف ہو جاتے ہیں تب تو ان کے لہانہ خیالات کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہوتا پس

جب ایسی کیفیت ہو تو یہ کہنا کہاں رہا کہ جو لوگ ان علوم کو تفصیل کے ساتھ حاصل کرتے ہیں وہ خالق کائنات کے وجود کے یقین کرنے اور اس کے وجود کے نہایت ہی قوی قضا اور کھنے کے زیادہ مستحق ہیں؟ اس اشکال کا جواب ہم سے سنئے۔ انشاء اللہ العزیز ہم اس سوال کا کافی جواب دینگے اور ہم اپنے جواب سے اپنے اسلامی بھائیوں کو متنبہ کر کے اس امر کی طرف متوجہ کرینگے کہ وہ اس بلائے بے درمان کے دور کرنے کی جانب غائب ہوں جو کہ ان کی نسل کے نوجوانوں میں سرایت کرتی چلی جاتی ہے درو آئندہ نسلوں میں جا کر اس کا علاج قریباً ناممکن ہو جائیگا اس لئے بہتر ہے کہ اس باوقفت اور قابل قدر زمین کی عاقبت کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور اس کے تدارک کی طرف ابھی سے نہایت سرگرمی کے ساتھ متوجہ ہو جائیں پس سنئے کہ یہ علوم مذکورہ یعنی علم نباتات و عظیم حیوانات اور اسی طرح علم فلکیات۔ علم کائنات جو ایسے ہی علوم طبعیہ جن میں کہ کائنات کے قوانین قدرت سے بحث کی جاتی ہے جن میں کہ روشنی۔ پانی۔ ہوا۔ حرارت۔ قوت کبرائی وغیرہ کے خواص بیان کئے جاتے ہیں اس میں تو فوراً ابھی شک و شبہ نہیں کہ ان علوم کے مباحث خالق کائنات کے اُپر جن کے احوال سے ان علوم میں بحث کی جاتی ہے نہایت قوی دلیلوں کے ساتھ دلالت کرتے ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بنانے والا بہت ہی بڑا صاحب قدرت اور اعلیٰ درجہ کی حکمت رکھنے والا ہے کیونکہ ساری کائنات اسی خالق کے آثار ہیں۔ اور مؤثر پر اس کے آثار کو دیکھ کر ہی استدلال کیا جاتا ہے اور پھر چونکہ ان علوم کے مباحث میں عقل پر کائنات کے اسرار و حکمتیں منکشف ہو جاتی ہیں اور اس کے نزدیک یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں مزدکی ذی اختیار نے اپنے قصد و ارادہ سے بنائی ہیں اور ان کے بنانے میں اعلیٰ درجہ کی تدبیر و انتظام سے کام لیا گیا ہے اس لئے ان مباحث سے جو خدا پر بخوبی استدلال ہو سکتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ مؤثر پر استدلال کرتا بالکل آسان امر نہیں ہے۔ اس استدلال کے طریق میں بسا اوقات بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ یہاں قدم و راستہ سے چھٹے پاتے ہیں اس موقع پر عقل کا تشریح سے بچا رہنا بڑا کام رکھتا ہے کیونکہ انسانی عقل جب آثار کو دیکھتی ہے اور ان کے اسباب کو دریافت کرنے کے واسطے ہوتی ہے اس وقت اگر اس نے باریک بینی سے کام نہیں لیا

ہے تو وہ ظاہری سبب تک پہنچ کر رہ جاتی ہے اور اسی کو مؤثر حقیقی اور سبب واقعی گمان کرنے لگتی
 ہے اور پھر اپنی عقیدہ کو دین ختم کر دیتی ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ علوم طبعیہ میں مشغول ہوتے ہیں ان میں
 سے بعض کو جب ان آثار پر جن سے کہ ان علوم میں بحث کی جاتی ہے اطلاع حاصل نہ ہوتی اور وہ بجائے
 اس کے کہ باریک بینی سے کام لیتے اور بحث میں غور و فکر کرتے ان آثار کے اسباب پر بحث کرنے
 لگے اور چونکہ انہیں کسی سچے دین کا اعتقاد یا ایسا ہی کوئی اور امر جو ان کی فکروں کو مستنبہ کرتا اور مؤثر
 حقیقی اور سبب واقعی تک ان کی راہنمائی کرتا حاصل نہ تھا۔ اس لئے ان کی عقلیں مادہ اور قوانین قدرت
 تک جو ان آثار کے ظاہری اسباب تھے پہنچ کر گھٹیں۔ اور انہوں نے فرض کر لیا کہ مادہ کے اجزائے
 بسیط کی حرکت ہی سب کچھ کرتی ہے پس وہ اسی کے وجود کے معتقد ہو کر رہ گئے اور چونکہ ان کی
 نظریں باریک بینی سے قاصر تھیں اس لئے ان کی عقلیں اس امر پر متنبہ نہ ہو سکیں اور انہوں نے اسباب
 میں غور نہ کیا کہ آیا مادہ اولین قوانین میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ان تمام عجائبات کے حقیقی سبب
 قرار پائیں۔ یا ایسا نہیں ہے اور نہ ہی انہوں نے اس کو سوچا کہ دیکھیں مادہ میں یہ قابلیت موجود بھی ہے کہ
 اُسی سے مادی چیزیں صادر ہوں۔ اور وہ مادہ خود کسی سے صادر نہ ہوا ہو یا اس کو اس وجہ سے کہ
 اس کا حدوث لازمی امر ہے کسی دوسری شے کی ضرورت ہے جس سے کہ وہ صادر ہوا ہو۔ اس لئے وہ
 یہیں آکر ٹھہر گئے اور انہوں نے اپنی عقلوں سے اس سے آگے کچھ کام نہ لیا جس کا نتیجہ ہوا کہ انہوں
 نے اس امر کا تو اعتقاد کر لیا کہ تمام کائنات کے صادر ہونے کا حقیقی سبب مادہ قوانین قدرت اولین
 کے ذات بسیط کی حرکت ہے اور خالق عالم کے وجود کے منکر ہو گئے۔ اور اس انکار کے ایسے
 عادی ہوئے کہ عالم میں جس اثر کو انہوں نے دیکھا مادہ اس کی حرکت اور ان قوانین قدرت کی
 جانب جو پائے جاتے ہیں منسوب کرنے لگے۔ پھر اس کو انہوں نے مختلف عنوانات سے تعبیر کرنا
 اختیار کیا جس سے وہ صرف اپنی من سمجھتی کہیتے ہیں پس کبھی تو کہتے ہیں کہ یہ اثر طبیعت کے فعل
 سے ہوا۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ قوانین قدرت کا فعل ہے۔ اسی طرح پر اور مختلف عنوانات بھی ہیں قصہ
 یہ کہ وہ اپنی اس ناقص تحقیقات کے بڑے شہد و مدد سے معتقد بن گئے۔ پھر بعض کی یہاں تک

نوٹ پہنچی کہ انہیں علوم کی تنگ آمیزشوں کی وجہ سے ان مباحث میں جن میں ان علوم کی تعلیم ہوتی ہے کسی مدرسہ کے مندرجہ ہو گئے اور ان کے پاس نوجوانانِ نادان طالب علم ان علوم کے حاصل کرنے کیلئے آئے جنہیں اسلام کے سچے اعتماد کی اطلاع تک نہیں اور نہ ہی انہوں نے یہ واقعیت حاصل کی کہ کائنات کے بننے اور ان آثار و حادثات کے واقع ہونے کی کیفیت کی نسبت مسلمانوں کو کیا اعتقاد کرنا چاہیے اور نہ انہوں نے یہ ہی سمجھا کہ ساری کائنات زمین و آسمان موجود کے پیدا کرنے سے موجود ہوئی ہے۔ اب ان علوم کے پرمسحانے والوں کو موقع ملا کہ اپنے ان نادان شاگردوں میں اپنے باطل خیالات اور غلط اعتقادات جو ان کے دلوں میں ناتمام تحقیقات کی وجہ سے جم کر رہ چکے ہیں۔ علمی تحقیقات کے پیرایہ میں پھیلائیں پس جب کبھی انہیں غائبیات میں سے کسی چیز پر اطلاع ہوئی یا اسرار کائنات میں کوئی راز ان کو معلوم ہوا یا مصنوعات کی حکمتوں میں سے کسی حکمت پر ان کو واقعیت حاصل ہوئی تو بجائے اس کے کہ اپنے شاگردوں سے یہ کہتے کہ اس عجیب اثر کے اکیلا کرنے میں خدا کی حیرت انگیز صنعت کو دیکھو اور اس کی اعلیٰ درجہ کی حکمت میں غور کرو انہوں نے ان سے یہ کہا کہ تم نے دیکھا طبیعت کا کیسا تعجب خیز فعل ظاہر ہوا اور فلاں قدرتی قانون کا کیسا عجیب و غریب اثر ہے! علیٰ ہذا العیاس الیہی ہی اور غریب عقائد باتیں کہنا شروع کیں گاش اس موقع پر وہ یوں کہتے کہ تم نے فلاں قدرتی قوانین کو دیکھا کیسا عجیب و غریب ہے۔ اب اس سے سمجھ لو کہ جس نے عالم میں ایسے قدرتی قوانین جاری

کئے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر ظاہر کر دیا جائے کہ قدرتی قانون کس پیر کا نام ہے۔ ہمارے نزدیک ذوقِ فطرت کسی بات اختیار کا نام کرنے والے کے طرزِ عمل کا نام ہے اور اس کی مثال ریل کی پٹری کی ہی ہے کہ نہ کوئی کم و بیش ہے نہ جیل ملتی ہے وہ اسی طرزِ عمل کا نام ہے جس طرح عالم میں عوارض ظاہر ہوتا ہے وہ قانونِ قدرت کے مطابق ہی ظاہر ہوتا ہے اور جیسے ریل کے چلتے کے لئے فرسٹ پٹری کا ہونا کافی نہیں بلکہ کسی قدر تھکی بھی ضرورت ہے جو گاڑی کو آگے چلانے اسی طرح ریل بھی کوئی یا اختیار ہونا چاہیے جو اپنے افعالِ قانونِ قدرت کے مطابق کرے۔ اور جیسے کہ ریل کی پٹری بچھانے والے کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے اس کا رُخ بدل دے اسی طرح قانون کائنات کو بھی اختیار ہے کہ جیسے کہ اس نے اپنا طرزِ عمل ایک طور پر مقرر کر لیا تھا جس کو کہ قانونِ قدرت کہتے ہیں وہ بچائے اس کے کوئی دوسرا قانون مقرر کر دے پس جیسے ریل کے چلنے میں موٹر سیم یا ڈرائیور سمجھا جاتا ہے اور پٹری کو

کہے ہیں وہ کیا باحکمت اور قادر مطلق ہو گا لیکن انہوں نے یہ تو کیا نہیں بلکہ قوانین قدرت تک پہنچ کر رہ گئے اور اسی کی طرف تمام چیزوں کو مستند کیا کئے اور پراسی طریقہ کا ان کے ساتھ برتاؤ کرتے رہے یہاں تک کہ یہی کیفیت ان کے دلوں میں بھی بخوبی جاگزیں ہو گئی اور اسی قسم کے خیالات ان کی غفلت پرستوش ہوتے چلے گئے غرض یہ کہ ابھی مدخل میں پہننے کا زمانہ ختم بھی نہیں ہونے پاتا کاس سے پہلے ہی ان کے دلوں میں یہ خیال عم جاتا ہے کہ عالم میں ملے طبیعت مادہ کے ذرات بسطہ کی حرکت اور قوانین قدرت کے اور کوئی قائل ہے ہی نہیں اور ان کا یہ اعتقاد کہ عالم کا پیدا کرنے والا کوئی خدا ہے بالکل زائل ہو جاتا ہے پس جیسا کہ وہ مدرسہ کو چھوڑتے ہیں ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ ہی بلکہ اس سے پہلے ہی آباؤی دین کو بھی تیرا بدکہ مچھتے ہیں اور اہل اسلام کلن سے یہ امید ہوتی ہے کہ جماعت اسلام میں تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد میں ترقی ہوئی یہ لوگ دین سے واقف ہو گئے اور ان سے اسلام کو نفع پہنچا گئے شریعت محمدیہ کی حمایت کرینگے۔ اپنے ہونٹوں کے کام آئینگے ان کے کامیاب ہونے کی تدابیر بتائینگے لیکن حقیقت میں ان کی یہ ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ ان کی کوششیں بے سود ثابت ہوتی ہیں اور ان کو ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے جن کی نسبت وہ تو یہ خیال کہتے ہیں کہ یہ بھی ہیں لوگوں میں سے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ دینی بھائی ہیں اور واقعہ میں دیکھئے تو وہ دین سلطنت اور وطن سب کے پتے دشمن ہوتے ہیں۔ ان کے عقائد اہل اسلام کے خلاف ہوتے ہیں اور ان کی طرز۔ رفتار۔ گفتار۔ برتاؤ وغیرہ میں دیکھئے کسی میں اسلامی بوسہ تک نہیں پائی جاتی ان کے مقاصد اور ارادے اسلامی شان کے بالکل خلاف ہوتے ہیں ان کی حالت دیکھ کر تو بڑا عجیب و غریب ہے اور میا ختمہ منہ سے۔ "ان اللہ وانا الیہ راجعون" نکل جاتا ہے۔ خدا ان کو ہدایت کرے پس یہی عقائد اسلام کے ذمہ فرض ہے کہ اس مصیبت عظمیٰ کا تدارک کریں خصوصاً

کہ کوئی مؤثر نہیں کہتا اسی طرح اہل اسلام کے نزدیک حقیقت میں خدا نوشتہ ہے اور قانون قدرت کا طرز عمل ہے جس کو کہ اُسے اپنے اختیار سے مقرر کیا ہے اسے تو ان قدرت حقیقی مؤثر نہیں کہتے۔ اہل اسلام کے نزدیک قانون قرآن کا نام عاقہ اللہ ہے۔

ان لوگوں کو اس کا پورا انتظام کرنا چاہئے جو عامین اسلام میں سے صاحب حکومت اور ذمی اختیار بھی ہیں ان کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ان طبیس کیلئے حتی المقدور صرف ایسے ہی انتظام معلوم قرار دیئے جائیں جن کے عقیدے اسلام کے موافق صحیح صحیح ہوں طبیعت میں سلاست ردی پائی جائے اسلامی حیانات کے صدق و دل سے متعلق ہوں۔ صرف نام ہی کے مسلمان نہ ہوں بلکہ علاوہ درستی عقائد کے شریعت محمدیہ کے آداب و اخلاق سے بھی آراستہ ہوں اور حتی الامکان شریعت کے پورے پورے پابند ہوں۔ کیونکہ شاگرد کی مثل اپنے استاد کے اعتبار سے باطل آئینہ کی سی ہے پس جیسے کہ آئینہ کے سامنے جو چیز آتی ہے اسی کی صورت اس میں منعکس ہوجاتی ہے اور نظر آنے لگتی ہے اسی طرح جو استاد کی حالت ہوتی ہے وہی شاگردوں میں بھی سراپا کر جاتی ہے۔ استاد کے خیالات کا شاگردوں پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسرا یہ امر بھی ضروری ہے کہ طالب علم ان مدارس (علوم طبیعیہ کے مدارس) میں اس وقت تک ہرگز داخل نہ کئے جائیں جب تک کہ وہ پہلے ایک کافی زمانہ تک دینی مدارس میں قیام نہ کر چکے ہوں اور وہاں رہ کر انہوں نے اپنے اسلامی عقائد پورے طور سے صحیح نہ کر لئے ہوں تاکہ اس کے بعد بظہار لا یعنی سے ان میں تزلزل نہ آئے اور لوگوں کی بے نظریاں اور رنگ آمیزیاں ان کو شش و پنج میں نہ ڈال دیں۔ آداب حسنہ سے ان کی اصلاح ہو جائے اور وہ عبادتوں کے بجالانے کے عادی ہو جائیں اور اگر یہ خیال ہو کہ اس امر کے التزام کرنے سے وہ وقت جو ان دنیوی علوم کی تحصیل کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ ہاتھ سے جاتا رہ گیا تو پھر یہ امر نہ صرف ضروری بلکہ نہایت ضروری ہے کہ انہیں مدارس میں ایسے علمائے مکمل جائیں جو ان کو اسلامی عقائد اور احکام کی تعلیم دیا کریں اور اس ضرورت کا مقابلہ کر سکیں۔ ان مدارس میں داخل ہونے کے وقت سے لیکر ان کے پھوڑنے کے وقت تک دینی عقائد اور احکام کی تعلیم کا سلسلہ برابر جاری رکھا جائے۔ چاہے عورت ہی ہی دیر کیوں نہ ہو مگر ہو بلاناغہ۔ اور جب تک احکام ان مدارس میں قیام ہے اس زمانہ تک یہاں یہ علماء ان کے عقائد۔ آداب۔ عبادات وغیرہ کے نگران رہیں اور انکی اصلاح کرتے رہیں اور جہاں کہیں وہی احکام بظاہر ان عقلی علوم کے مخالف معلوم ہوں

ان میں باہم تطبیق دیں اور دینی امور کو عقلی دلائل سے طلبہ کو ثابت کر دکھائیں پس اگر دونوں شلوں کی رعایت کی جائیگی جن میں **اول** تو یہ کہ جو اساتذہ ان مدارس کیلئے انتخاب کئے جائیں وہ اسلام کے پابند ہوں اور ان کے عقائد اسلامی تعلیم کے موافق صحیح صحیح ہوں اور وہ یہ کہ ان طالب علموں کو اسلامی احکام کی عموماً اور عقائد اسلام کی خصوصاً کافی تکرار کے ساتھ تعلیم دی جائے عام ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس کا انتظام کیا جائے یا عقلی علوم کی تحصیل کیساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی جاری رکھی جائے تو پھر یہ تعلیم یافتہ اشخاص کج روی سے محفوظ رہیں گے اور ان کے دینی خصائل وقادیں متورنہ آنے پائیگا۔ عبادات میں ان سے بے پرواہی ظاہر نہ ہوگی۔ بلکہ ان کے عقیدے یکے اور نہایت ہی سچے ہونگے خصوصاً اس وجہ سے کہ ان عقلی علوم کی تحصیل کے زمانہ میں ان کو خداوندی مسنوعات اسکے حیرت انگیز افعال اور عجائبات قدرت کا مشاہدہ بھی حاصل ہوتا جائیگا کیونکہ اس تقدیر پر جب کبھی وہ کوئی عجیب صنعت یا عجائبات قدرت میں کوئی بارہ مشاہدہ کریں گے تو اپنے مسلمان اساتذہ کو یہی کہتے ہوئے سنیں گے کہ خداوندی صنعت کو دیکھو اور اس عجیب و غریب مسنوع میں جو اس نے اپنی اعلیٰ درجہ کی یادگار اور محکم حکمت سے کام لیا ہے اس میں غور کرو۔ پس اس وقت بلا تامل ان کی زبان سے خدائے تعالیٰ کی حمد و ثناء نکلیگی اور اس کی تسبیح اور تہنیز میں مشغول ہو جائیں گے اس طرح ان کے دلوں میں خداوندی عظمت افزوں ترقی کرتی رہے گی اور اس کی قدرت ان کی آنکھوں میں نہایت ہی عظیم معلوم ہوگی پس ان مدارس میں ان کے قیام کا زمانہ گندے پر بلکہ پہلے ہی اعلیٰ درجہ کے مسلمان اور موحدین میں سربراہ اور وہ اور افضل شمار کئے جانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ اس وقت بیشک مسلمانوں میں ایسے تعلیم یافتہ اشخاص پیدا ہو سکیں گے جو اسلامی دین کی حمایت کریں اور اپنی قوم ملک اور سلطنت کے کام آویں اور جب تک یہ کمینیت نہ ہوگی اس وقت تک ہم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ علوم عقلیہ حاصل کر کے تعلیم یافتہ اشخاص میں شمار کئے جاتے ہیں ان سے اسلام یا مسلمانوں کو کچھ بھی نفع پہنچ سکتا ہے کیونکہ جب ان کے عقائد جو اسلام کا رکن و اعظم ہیں ہی درست نہ ہونگے تو اہل اسلام

کو ان سے کیا اُمید ہو سکتی ہے؟ جب وہ خود ہی اسلامی تعلیم سے نا آشنا ہو رہے ہیں تو اہل اسلام کو بحیثیت اسلام کے کیا نفع پہنچا سکتے ہیں۔ دنیاوی فوائد تو دین کے مقابل میں اس شخص کی نظروں میں ہرگز کچھ وقعت نہیں رکھ سکتے جو مسلمان ہے۔ یہ امر اسلامی مقتضی کے برخلاف ہے بغرض مثال اگر ان سے اس حال میں دنیاوی نفع کی اُمید کی بھی جائے تو دینی ضرر کے مقابلہ میں جو ان سے پہنچا اس کی کوئی قدر نہیں کی جاسکتی۔ علاوہ بریں اس امر میں ان کی خصوصیت ہی کیا ہوئی؟ دنیاوی نفع کے پہنچانے میں انسانی ہمدردی کے موافق تو غیر قویں بھی برابر ہیں۔ ہمارے ہی اس تقریر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمارا مقصود اعتراض ہے۔ ہماری اسلامی ہمدردی ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو متنبہ کر دیں۔

معیار حق و باطل

مختلف علوم کے مسائل میں جیسا کہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلے کی تحقیق میں لوگ غلط استدلال اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ صورت مذہبی مسائل میں عموماً پیش آیا کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے استدلال کی بنا غلط اصل پر قائم کرتے ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ قضایا جو استدلال میں استعمال کئے جاتے ہیں منطقی طور پر صحیح نہیں ہوتے۔ اس لئے ان سے نتیجہ غلط اخذ کیا جاتا ہے اور اس وجہ سے حق باطل اور باطل حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ عوام الناس کا تو کیا ذکر غلط استدلال میں اکثر بعض تعلیم یافتہ لوگ بھی مبتلا ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ مذہب عقائد احکام کے مجموعے کا نام ہے اس لئے ضروری ہے کہ عقائد و احکام کی صحت کا مدار کوئی قطعی امر ہو جائے اس ضرورت کو رفع کرنے کے لئے ہمارے پاس وحی اور نبوت کے سوا کوئی امر ایسا نہیں جو حق و باطل میں امتیاز کر سکے صحیح معیار قرار پاسکے کیونکہ شخصی رائے یا جمہور کی رائے کبھی یقینی طور پر حق و باطل کا فیصلہ نہیں کر سکتی اسکی وجہ یہ ہے کہ ایسی آرا ہمیشہ واقعات کے تغیر و تبدل پر یا تو غلط ثابت ہوتی ہیں۔ یا غیر ضروری یا قابل ترمیم۔ مگر وحی اور نبوت کی تعلیم کی نسبت یہ خیال صحیح نہیں عقائد

تو ہمیشہ غیر متبدل ہے۔ یہ البتہ بعض احکام جزئیہ میں کسی حد تک تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جو صرف علمائے
 الماسخون فی العلم کے اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے۔ اہد صرف ان احکام کی نسبت جن کی نسبت یہاں حسب شریعت
 سے کوئی نقص وارد نہیں ہوئی۔ ضرورت اجتہاد کے متعلق ہم آئندہ اوراق میں انشاء اللہ مفصل
 بحث کرینگے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر ہر ایک شخص کو اس کی رائے پر چھوڑ دیا جائے تو تقریباً دنیا
 میں اتنے ہی مذہب پیدا ہو جائینگے جتنے نوری انسان کے افراد دنیا پر موجود ہیں وحی اور نبوت
 کے قطعی ہونے پر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ معفوات میں بحث ہوگی اور یہ ثابت کیا جائیگا کہ لصوص
 شریعہ کے برخلاف کسی جماعت کی متفقہ رائے یا شخصی رائے کی کوئی وقعت نہیں بعض جہلا کا
 خیال ہے کہ لصوص شریعہ بھی ضرورت زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلنی چاہئیں جس کا مطلب
 یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آئیگا کہ مذہب کا کوئی حکم بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں
 رہیگا۔ درحقیقت یہ لوگ وحی اور نبوت کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لئے
 انہیں معذور خیال کرنا چاہیئے۔

الماسخون فی العلم

نور انسان میں انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی شخص فاضل نہیں کیونکہ یہ مقدس گروہ
 باہر گاہ لب العزت سے علتہ الناس کی ہدایت کا درخان بیکر اہل دنیا پر تمام حجت کیا کرتا ہے
 ان کی تعلیمات کا ماننے والا نجات پاتا ہے۔ اور نہ ماننے والا مورد عذاب ہوتا ہے۔ یہ ظاہر
 ہے کہ نبوت جیسے جلیل القدر منصب کیلئے ایک ایسی پاک اور زبردست فطرت کی ضرورت
 ہے جو اللہ روحی کے مقل ہونے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اور تمام اخلاق حسنہ مثلاً دیانت۔ تقویٰ
 خشیت۔ عبادت۔ استقلال۔ صبر و رضا۔ حلم و غیرت۔ رحم و مروت میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ
 ہو تاکہ عوام الناس کو اس کی پاک تعلیمات سے مستفید و امان پر محال ہونے کی رغبت پیدا
 ہو سکے۔ انبیاء علیہم السلام کی حیات طیبہ اسی قسم کے کارناموں کا مرتع ہوتی ہے۔ اہد

یہی وجہ ہے کہ لوگ جو بلادِ اوسطین کی تعلیمات سے متغنیف ہوتے ہیں۔ دین حق کی اشاعت اور حمایت میں اپنی جان توڑ کوششوں کو مستل میں لاکر مراطِ مقیم شریعت کو شلوک وادھام اور بدعات کے خس و خاشاک سے بالکل پاک صاف بنادیتے ہیں۔ ان انبیاءِ علیہم السلام کے جو صاحبِ شریعت گھڑے ہیں۔ انصار۔ حواریین۔ صحابہ کے حالات اور کارناموں پر ایک عمیق نظر و التوبہیں مطلوب ہو جائیگا۔ کہ وہ تعلیم و حق کی حفاظت و اشاعت میں کس قدر ماسعی جلیلہ بجالاتے تھے۔ گو ان کے بعد زیادہ لوگوں نے اختلاف پیدا کئے اور فرقہ بنیدیاں شروع کیں مگر ان بزرگوارانِ عالی ہمت نے احکامِ البیہ کی تبلیغ کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ اس حد تک تمام انبیاءِ علیہم السلام کے انصار و جاثین ایک ہی تہ اور پایہ کے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ اسلام دنیا کا آخری اقطعی مذہب تھا اسلئے مشیتِ الہی نے جنابِ ختمیت مآب کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک ایسی با عظمت جماعت عنایت دیں کہ انہوں نے عطا فرمائی جس کی مثال دنیا بھر کے مذاہب میں ملنی محال ہے۔ یہ وہ علی پایہ لوگ ہیں جن کے وصف میں جابجا قرآن مجید مطلق ہے:-

محمد و سبل اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم ترشد
اکثاہم یتقون فضلہ من اللہ و رضوانہ علیہم فی وجہہ
من انوار السجود و لک مشاہد فی التورۃ و مشاہد فی الانجیل کثر د
اخراج شطائرہ فاذرہا فاستقلظ فاستولی علی سوقہ یحبہ لشرائع
لیغیظ بہم الکفار و عد اللہ الذین امنوا و عملوا الصالحات منهم
مغفرۃ و اجر عظیم

قانونِ الہی جب کسی نبی اللہ کو صاحبِ شریعت مبعوث کیا کرتا ہے۔ تو اس کی اشاعت و تعلیم کے تمام قرائع اور دفع موانع کے وسائل ہم پہنچا دیا کرتا ہے۔ منجملہ ان ذرائع اور وسائل کے مذکورہ بالا مقدس جماعت کا وجود گریہی ہے جو نبی اللہ کے دست و بانو قرار پا کر سعادت و امین کی مستبارگاہ رب العزت سے حاصل کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس جماعت کے افراد میں سے

ملاحظہ فرمائیے کوئی ایک معین شخص بذریعہ وحی آسمانی نصرت دین حق کے لئے مبعوث نہیں ہوتا مگر کچھ
 شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی یہ مقدس جماعت من جانب اللہ مبعوث ہوا کرتی ہے۔ آئیہ کنتہ
 خیر ائمتہ اخر حجت للناس نامہ من بالمعصوف وتنصون عن المتکسر الخ میں غور
 کرو کہ لفظ اخر حجت کس زور کے ساتھ طے مذکورہ بالا دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے۔ جناب
 ختمیت مآب (روحی فدا ہو) کے انصار و اعداؤں یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم اگر یہ ایسے لوگ
 تھے جو جاہلیت میں پیدا ہوئے۔ اور جاہلیت میں ہی ایک حصہ عمر کا گذار چکے تھے مگر تعلیم
 حق نے ان میں دھام بھاک کی وہ رُوح پھونک دی تھی کہ از خود تمام مہنیاں سے علیحدہ ہو کر
 اہل دنیا کے لئے دین و معرفت الہی کا کل ہونہ بن گئے ایک بے تعصب فطرت کے آدمی
 کے لئے اس سے بڑھ کر جناب پیغمبر عرب کی صداقت کا اور کیا ثبوت ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ یہ لوگ
 اس وقت کی دیگر اقوام کے دنیا کے مقابلہ میں نہ تو علم حساب و ہندسہ جانتے تھے نہ اقوام عالم
 کی تاریخ سے واقف تھے۔ نہ علم ہست و جر ثقیل کے اصول کا انہیں پتہ تھا۔ نہ فلسفہ و منطق و
 طب و دیگر علوم و فنون میں انہیں کچھ دستگاہ تھی۔ اور نہ ہی وہ بمقابلہ وحی ان علوم و فنون
 کی چنداں ضرورت ہی محسوس کرتے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان علوم و فنون میں بعض تو
 محض فضول ہیں۔ اور بعض اقوام کی دنیوی ترقی کے لئے مفید بھی ہیں اور ان کے جاننے اور
 سکھانے والے لوگ اخرا زمانہ اپنی ضروریات کے مطابق از خود مہیا کرنا بہت سہ ہے مگر علوم
 آخرت اور شرائع و دیانات اور اسرار وحی کے حاصل کرنے میں ان بزرگواران دین نے وہ
 ترقی دکھائی جس کو تمام مذاہب کے انصار و اعداؤں دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ غور کرو کہ آیا
 روئے زمین پر آج کوئی مذہب بمقابلہ اسلام اس قدر شریعت کا مالک ہے جو اہل اسلام کو حاصل
 ہے اور عالم آخرت اور معرفت ذات باری کی تحقیق کے متعلق قرآن مجید و احادیث نبویہ سے بڑھ
 کہ کسی قوم کے پاس کوئی مجموعہ موجود ہے؟ ہمارے زمانہ کے بعض ملاحظہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی
 مساعی جلیلہ کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں اور ان کے آثار کی پیروی کر نیکو زادان دین بتلاتے ہیں۔

حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں گم نام آئے والی سلسلوں کے آبا و اجداد کہلانے کے مستحق ہیں اور ان کے بارہ
احسان کی وجہ سے کوئی شخص اس کی گردن اُپر نہیں اٹھا سکتا۔ کیونکہ ان بزرگواران کو جناب پیغمبر
علیہ السلام کیساتھ خللا و ملائیں حاضری کا موقع ملا انہوں نے موردِ روح کو اپنی آنکھوں سے دیکھا
اور کانوں سے سنا۔ جناب پیغمبر علیہ السلام کے ارشادات سے مستفیض ہو کر ان پر عامل ہوئے۔
حقیقت سنت کو بالمشافہ سمجھا۔ اور اس کو اپنے فالوں کے لئے بطور امانت کے محفوظ رکھا۔
اور جب تک ہر ایک نے جو کچھ اس کے پاس امانت تھا۔ دوسری جماعت (تابعین) تک نہیں
پہنچایا۔ دنیا سے رخصت نہیں ہوا۔ گویا ہر ایک نے اپنے فرائض تبلیغ کو نہایت وفاداری کے
ساتھ پورا کر کے اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مغفرت اور اجرِ عظیم کا استحقاق پیدا کیا۔ اور وہ کہیں ایسا نہ
کرتے جبکہ انہوں نے اپنے ہاوی برحق کا فرمان واجب الاذعان سن رکھا تھا۔ انشاء اللہ
امرء سمع منا مقالة فحفظها حتى يسلم غيري۔ یعنی اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ اس شخص
کو جس نے ہم سے کوئی بات سیکر ضبط کر لی حتیٰ کہ کسی غیر تک اس کو پہنچا دیا۔ جو لوگ ان بزرگواران
دین کی دی ہوئی نعمتوں کی تحقیر اور کفران کرتے ہیں۔ وہ حقیقت پیغمبر علیہ السلام کی شان مقدس
کو عیب لگاتے ہیں اور حضور کی عظمت اور عزت کو کم کرتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ حضور کے ارشادات
عالیہ کو سعادۂ طاعت کہنے سے (جس کے بغیر کوئی مسلمان خالص ایمان نہیں ہو سکتا) سرتلی کر کے
مغضبِ الہی کے موردِ بنیت ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سچے اخلاص اور تعاضل اور ات
کے ساتھ اس میں پاک کی اشاعت و حفاظت کا بیڑا نہ اٹھاتے تو یقیناً ہمیں سلامِ عیسیٰ بے بہا
نعمت سے بہرہ یاب ہونے کا کبھی موقع نہ ملتا۔ کیسے ناہرا و اور فخر و پشت ہیں وہ لوگ جو
ان بزرگواران دین کی اسپاسی کر کے نمک خوردن و ٹھکان شکن کا مصداق بنے ہیں۔ حاکم
ابن تیم جزیہ رحمہ اللہ اپنی کتاب ہدایۃ الحیاری من الیہود والنصارى میں لکھتے ہیں:-
وكلهم من اولهم الى اخرهم لغير الصحابة بالعلم والفضل ومحترف بان علمه
بالنبة الى علومهم كعلومهم بالنبة الى علم نبيهم۔ یعنی تمام شعبے

علمائے اہل سے آخر تک صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضل کے معترف چلے آئے ہیں اور اپنے علوم اور صحابہ کے علوم میں ہی نسبت قائم کرتے ہیں جو صحابہؓ اور جنابؓ خیر علیہ السلام کے علوم میں نسبت تھی۔ قال الشافعی وقد اثنی اللہ علی الصحابة فی التوراة والا انجیل والقرآن وسبق لہم علی لسان نبیہم صلی اللہ علیہ وسلم من الفضل ما لیس لاحد بعدہ۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے تورات اور انجیل اور قرآن مجید میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف فرمائی ہے۔ اور جنابؓ پیغمبر علیہ السلام کی زبان مبارک سے ان کے وہ فضائل ثابت ہیں جو کسی غیر کو ان کے بدستیب نہیں ہوئے۔ تمام ائمہ مجتہدین کا قاعدہ تھا کہ کسی حکم شرعی میں اگر آثار صحابہ رضی اللہ عنہم مل جاتے تو اپنے اجتہاد پر انہیں مقدم رکھتے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انہیں اپنے قدوہ اور حاملین سنت نبوی تسلیم کرتے تھے چنانچہ حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

اذا جاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فعلی السراہن اذ جاء عن الصحابة فمما قرین لہم لم یخرج یعنی جناب خیر علیہ السلام سے کوئی امر ثابت ہو جائے تو ہمارے لیے برسوخیم۔ اور جب صحابہ سے کوئی قول مل جائے تو ہم انکے مختار قول کو لے لینگے۔ اور اس سے باہر نہیں جائینگے۔ اسی طرح ابن قاسم حضرت امام مالک سے یوں روایت کرتے ہیں :- لما دخل اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الشام نظر الیہم رجل من اهل الکتاب فقال ما کان اصحاب عیسیٰ ابن مریم الذین قطعوا بالناسیر وصلبوا علی الخشب یا شذا اجتہاد امن ہو کلام یعنی جب صحابہ رضی اللہ عنہم ملاقات شام میں داخل ہوئے تو اہل کتاب میں سے ایک شخص نے انہیں دیکھ کر کہا کہ سچ علیہ السلام کے ساتھی جو آندوں سے چیرے گئے اور سولی چڑھائے گئے دین کے بارے میں وہ ان لوگوں سے زیادہ مضبوط نہیں تھے۔ یہی حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کتاب مذکور میں لکھتے ہیں :- وهو لا الالة الا سرة الذین طبق علیہم الا من شرقا وغربا۔ ہم قدامین ہمد و خیاسر ہمد ما کان وجہ الفقه ما کان عنہم واضح التفاسیر ما اخذ عنہم۔ یعنی ائمہ اربعہ (ابو حنیفہ۔ مالک۔ شافعی۔ احمد) رضی اللہ عنہم

ہن کے علم فضل نے مشرق اور مغرب کی دنیا کو پر کر دیا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے شاگردوں کے شاگرد تھے۔ اوفقہ اور تفسیر میں جو کچھ صحابہ سے ہیں کتاب۔ اسی کو صحیح اور قابل عمل سمجھتے ہیں۔

فہم الذین کفھوا البیاد والجماد والقلوب بالعلم والقرآن
فملاؤ الذین خیرا وعلما۔ والناس الیوم فی بقایا اثر علیہم

یعنی صحابہ ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کر کے اسلام مقدس کی اشاعت کی اور قلوب کے دلوں کو اپنے علوم اور معارف قرآنیہ سے فتح کیا۔ سوائے انہوں نے خیر اور علم سے دنیا کو بھر دیا۔ اوتاج انہیں کے بقایا علم علماء امت کے ہاتھ میں موجود ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان بندگانِ دین کی علمی نصیلت کا موازنہ کرنے کے لئے علوم شرائع اصولیات پر حاوی ہونا شرط ہے۔ اور جو لوگ علوم شریعہ سے ناواقف ہیں اور جن کا مبلغ علم مرئین و آں کی بیودہ آرا کا مجموعہ ہے۔ ان کے ایمان کا انحصار مدعیان کاذب کی مچنی چڑی باتوں پر ہے۔ ان کے دلوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظمت اور عظمت بھلا کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ اوروہ ان کے علوم سے کیسے مستفید ہو سکتے ہیں۔ عام طور پر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم علوم قرآن اور سنت کے ماہر تھے مگر ان میں سے بعض اکابر ایسے تھے جن کی علمی قابلیت آفتاب سے بھی زیادہ روشن تھی اور جن سے اسلامی دنیا کا ایک کثیر حصہ علوم دینیہ سے مستفیض ہوا حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے باوجودیکہ ابھی نوجوان تھے اپنے علم اور فضل سے مالمسلمیٰ دنیا کو بھر دیا۔ اور آپ کے فتاویٰ قریباً تیس جلدوں میں جمع کئے گئے تھے بعض علماء امت نے ان کی نسبت لکھا ہے :- کان مجرلا ینزل لہ نزل بلہ اھل کادریٰ لاوسعہم علماء

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ بھرنا پیدا کرتا تھے۔ اگر تمام روئے زمین کے لوگ آپ کے ہاں نازل ہوتے تو سب کو اپنے علم سے متمتع کر سکتے۔ آپ حلال حرام ومسائل فرائض کو جب بیان فرماتے تو سامعین کو یہ گمان ہوتا۔ کہ اس علم کے سوا انہیں کسی دوسرے علم میں اس قدر دسترس نہیں ہوگی اور جب قرآنی اسرار و معارف کو بیان فرماتے تھے تو لوگوں کو لیتن ہو جاتا

کہ جس علم تقیہ انہیں کی غلات تھیں اور جب علم سنت نبویہ اور روایات کی طرف متوجہ ہوتے تو
سننے والوں کو یہ خیال گندہ کہ یہ علم انہیں کے لئے وضع ہوا ہے۔ علیؑ اہل التقیاس جب قصص النساب
عرب اور اشعار جاہلیت کے میدان میں اترتے تو بڑے بڑے مایہ ناز فن اپنی استاوی پر فخر کرنے لگتے
جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ رحلت قریب ہوا تو لوگوں نے آپ سے وصیت کی
استاذ علیؑ۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اشعار مجھاؤ۔ تب آپ نے فرمایا کہ سنو علم و ایمان چار آدمیوں
یعنی عوف بن مالک اور سلمان فارسی اور عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہم
کے پاس محفوظ ہے۔ حضرت امیر المومنین علیؑ بن ابیطالب رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آپ
جناب پیغمبر علیہ السلام کے صحابہ کی بابت ہم سے کچھ ارشاد فرماویں فرمایا کہ عبد اللہ بن مسعود پر قرآن اور
سنت ختم ہے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ صحابہ میں سے منافقین کے حالات سے سب سے بڑھ کر واقف
ہیں اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ علم سے سچے ہیں۔ اور عمار کے رگ و پے میں ایمان سرایت کر گیا ہے۔
اور ابو موسیٰ علم میں رنگے جا چکے ہیں اور سلمان بھر تاپیدا کنار ہیں۔ جو علوم اربعہ میں ادا آخرین کے
مالک ہیں لوگوں نے سوال کیا کہ آپ اپنی نسبت کچھ فرماویں۔ فرمایا کہ جب مجھ سے پوچھو تو
میں جواب دوں گا۔ اور جب چپ رہوں تو انہیں علم میں ابتداء میں ہی کہتا ہوں۔

مسروق تابعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے علوم کو چھ آدمیوں
میں موزع پایا۔ علیؑ۔ عبد اللہ عمر۔ زید بن ثابت۔ ابی الدرداء۔ ابی بن کعب اور ان چھ کا
علم علیؑ و عبد اللہ میں محدود پایا۔ ایک صحیح حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بابت وارد ہے
جناب پیغمبر علیہ السلام کو آپ نے ایک روایاں ایک دوسرے کا پیالہ بھرا ہوا دیا جس میں سے
آپ نے پیالہ آپ فرماتے ہیں۔ کہ اس کی سیرابی کا اثر مجھے ناخوں تک محسوس ہوتا تھا۔
کا کچھ بقیہ آپ نے حضرت عمر کو عنایت فرمایا۔ صحابہ نے اس کی تاویل کی بابت کہا تو آپ نے کہا
اس سے علم شریعت یعنی معرفت ذات باری مراد ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے
ہیں کہ حضرت عمر کے دنیا سے اٹھ جانے سے تو حصہ علم دنیا سے اٹھ گیا۔ پھر انہیں کی

روایت سے مروی ہے کہ حضرت عمر کا علم بمقابلہ تمام اہل ارض کے علم کے گراں باب ہے (علم سے مراد علم شریعت ہے) اسی طرح حذیقہ ابن ایمان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کے علم کے سامنے دوسرے لوگوں کا علم بل یعنی سلسلہ میں جاگمسا یعنی آپ کے علم کے سامنے کچھ حقیقت نہ رکھتا تھا علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ قاضیان شریعت چار صاحب ہیں۔ عمر۔ علی۔ زبیر۔ ابو موسیٰ قبصہ بن عامر فرماتے ہیں کہ میں نے معرفت ذات باری اور کتاب اللہ اور علم فقہ کا کوئی عالم حضرت عمر سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے مجھے اہل میں کی طرف قاضی کر کے بھیجا۔ میں ابھی نوجوان ہی تھا۔ مجھے علم فقہ میں ہمارے نہ تھی۔ میں نے اپنی ناواقفگی کا غدار کیا حضور نے اپنا ہاتھ سینہ پر مار کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت فرمائے گا۔ اور قلب کو مضبوط مستقیم پر چلائیگا اور تیری زبان کو ثابت رکھیگا۔ سو ایسا ہی ہو گا کہ مجھے کسی کوئی وقت پیش نہ آئی۔ عقبہ بن عامر فرماتے ہیں کہ شریعت کا ماہر عبد اللہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں ہم سے زیادہ مولا پر رہتے تھے مسروق تابعی فرماتے ہیں کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر میں نے علم فرائض کا ماہر کسی کو نہیں پایا۔ بڑے بڑے اکابر صحابہ آپ سے مسائل دریافت فرمایا کرتے تھے۔ ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ جو حدیث صحابہ سے لایا جاتی تھی حضرت عائشہؓ اس کو حل فرمادیا کرتی تھیں۔ شہرا بن حوشب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ جب کبھی کسی مسئلہ میں گفتگو کیا کرتے اور محاذ رضی اللہ عنہ ان میں موجود ہوتے۔ تو ان کی علمی ہیبت ان پر غالب آجایا کرتی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ علم کا ایک ظرف ہیں جو بند پڑا ہے اور اس کے اندر سے کچھ نہیں نکلا۔ حتیٰ کہ وہ دنیا سے رخصت ہو گئے مسروق فرماتے ہیں کہ میں ۷۰۰۰ نبی میں آیا تو دیدہ بن ثابت کو اس میں فی العلم سے پایا ادیب ابو داؤد نے عبد اللہ بن مسعود کی وفات کی خبر سنی تو فرماتے لگے۔ ما امانہ لم یحلت بعدہ مثله۔ یعنی لوگوں کو سنو کہ اس نے اپنا مثل اپنے بعد نہیں چھوڑا۔ ابو داؤد فرماتے ہیں کہ

بعض لوگ علم کے مالک ہوتے ہیں اور بعض عقل کے۔ قتادہ بن ادس علم پر وہو کے مالک ہیں۔
 زید ابن ثابت کے مرنے کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباس ان کی قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے تھے
 ھٰکذا ینذہب العلم (علم یوں ہی دیتا ہے اٹھ جایا کرتا ہے) جناب پیغمبر علیہ السلام حضرت
 عبداللہ ابن عباس کو اپنے سینہ مبارک سے نکال کر فرمایا۔ اللھم علمہ الحکمۃ وتاویل
 الکتاب (خدا یا اس کو علمت اور تفسیر قرآن کا علم عطا فرما) محمد بن حنفیہ جب عبداللہ ابن
 رجاء کر گئے فرماتے تھے۔ ھذا صامت ربانی ھذا ہذا الائمة یعنی اس امت مرحومہ کا
 عارف باللہ چل بسا۔ عبداللہ بن عتبہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس سے بڑھ کر کوئی شخص
 میں نے عالم سنت صحیح الرئیۃ دقیق النظر نہیں دیکھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے
 فرمایا کرتے کہ ہمارے سامنے بڑے بڑے مشکل مسائل پیش ہوئے جن کے حل کرنے کے
 لئے آپ ہی نمایاں ہیں۔ عطاء بن ابی ریحان فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عباس رضی
 اللہ عنہ کی مجلس سے بڑھ کر کوئی عظیم الشان مجلس نہیں دیکھی جس میں فقہاء اور مفسرین اور
 بڑے بڑے ادبا سیر ہو کر اٹھتے تھے۔ عبداللہ ابن مسعود فرماتے تھے کہ اگر عبداللہ بن
 عباس ہمارے ہم عمر ہوتے تو ہم میں سے کوئی ایک بھی ان کے دسویں حصہ علم تک نہ پہنچ
 سکتا۔ اور آپ عبداللہ بن عباس فرمایا کرتے کہ جب کسی شخص نے مجھ سے کوئی مسئلہ
 دریافت کیا ہے تو میں نے اس کے فقیہ اور غیر فقیہ ہونے کو خوب سمجھ لیا ہے۔ طاؤس
 تابعی فرماتے ہیں کہ میں قریباً پچاس صحابہ سے ملا ہوں۔ جب کبھی ابن عباس کسی مسئلہ کو بیان فرماتے
 اور کوئی ان میں مخالفت کرتا تو آپ اُسے قائل کر کے چھوڑا کرتے۔ اعمش رضی اللہ عنہ
 فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ ابن عباس کو تمام آدمیوں میں خوبصورت فصیح اور عالم پایا۔ مجاہد
 رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس جیسے کبھی قرآن مجید کی تفسیر فرمایا کرتے تو ان پر ایک
 نور سا چمکتا نظر آتا تھا۔ سعید ابن مسیب تابعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا
 کے بعد عمر ابن خطاب سے زیادہ علم والا نہیں کوئی شخص معلوم نہیں۔ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں۔

کہ میں نے علم فتویٰ اور تاریخ جاہلیت اور فتنہ خرد اور علم قرآن اور طب میں حضرت امام المؤمنین
عائشہ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ عطا فرماتے ہیں کانت اعلم الناس وافقه الناس
یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تمام لوگوں سے بڑھ کر عالم اور فقیہہ مانی گئی ہیں۔ امام
بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے قریباً آٹھ سو
آدمیوں نے علم اُخذ لیا ہے۔ عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم کے
قلب میں نظر کی لمانت رسالت کے لئے جناب پیغمبر علیہ السلام کے سوا کسی کا قلب نشانیاں
نہ پایا اور آپ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کو علوم نبوت کا وارث بنادیا۔ تاکہ وہ اہل دنیا
تک اس کی تبلیغ کریں۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ تم لوگ ستر امتوں میں سے
سب سے آخری امت ہو اور سب میں افضل والکم ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تصدیق فرمائی
ہوئی:۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ لِيَكُونَ الرَّسُولُ
عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔ مفسرین نے لفظ وسطا کی تفسیر میں عدلاً یا را لکھا ہے جس کا مطلب یہ
ہے کہ تمام علمی اور عملی قوتیں ہم نے عطا کی ہیں اور تمہیں دوسری قوموں کے لئے راہنما
اور ایک گونہ ترقی کا کامل نمونہ بنا دیا ہے۔ درحقیقت یہی لوگ تھے جنہیں اللہ تبارک
تعالیٰ نے علم حکمت کے بیش بہا خزانوں سے مالا مال کر کے دنیا کی ہر ایک نعمت سے
بے نیاز کر دیا تھا۔ یہ لوگ بڑی طاقتوں کے مالک اور نفع انسان کی ہر ہنگ محفل کے
صد نشین تھے۔ جو کچھ ان کے ہاتھوں پر بنی آدم کے لئے وقوع میں آیا اس کی نظیر دنیا
بھر میں ملنی مشکل ہے انہیں صفات کاملہ کی رو سے ہم نہایت زور کے ساتھ دعویٰ کرتے
ہیں کہ یہی لوگ صحیح معنی میں ورثۃ الانبیاء تھے یہ وہ مضبوط دعویٰ ہے جس کے برخلاف
نافعین زبان تک نہیں بلا سکتے چونکہ ان بزرگواران دین کا ورثہ الانبیاء ہونا مسلم ہے۔
اس لئے ان کا واجب الاتباع ہونا شرعی حکم ہے۔ قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں علما
ایسی ہدایات کا پتہ ملتا ہے جن سے ہمارے اس دعویٰ کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔

ہمارا موجودہ زمانہ نہایت غور سے دیکھا جائے جس میں جاہلان کتاب و سنت بھی نہیں بچواں کا جاہ
پہنکر لوگوں کو دھوکے دے رہے ہیں۔ حالانکہ دین کے معاملہ میں صرف وہی مقدس حضرات پیشوا
ہو سکتے ہیں جنہوں نے کتاب و سنت کو صحیح طور پر اچھا کیا۔ اور دوسراں تک اس کو پہنچا دیا۔ سو
اس صفت کے لوگوں کا سلسلہ قرونِ ثلاثہ تک ختم ہو جاتا ہے بعد میں مختلف فرقوں کے اختلافات نے
اس قدر زور پکڑا کہ ایک سادہ مسلمان کو دین کی حقیقت سمجھنا و متواریکہ محال ہو گیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ
ان اختلافات کا علم تھا۔ اس لئے یہ امر بھی قابل غور ہے۔ قرونِ ثلاثہ کے انقطاع تک
اسلامی تعلیم کے معتدات و احکام نہایت صاف کر دیئے گئے تھے۔ اور کوئی امر اسندہ لوگوں
کے تصفیہ کا محتاج نہیں رہا تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تمام نئے نئے محمدیوں اسلام مقدس
کے ذریعہ چہرہ کو بدعات کے بدنام و صیہ سے تیرہ و تاریک بنا دیتے۔ اسی خیال پر اب بعد کے بڑے
بڑے ائمہ اسلام نے فیصلہ کر دیا ہے کہ شخص دین کی حقیقت کو سمجھنا چاہے اسے چاہئے
کہ علی الترتیب صحابہ و تابعین و تبع تابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال و آثار میں تلاش کرے
اور نئے نئے محققین و مدعیان مذہب کی تحقیقات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ کیونکہ
یہ لوگ ہوائے نفس میں گرفتار اور بندہ درہم و دینار ہیں۔ ان سے حق کی توقع رکھنا عبث
ہے۔ عوام الناس کی بڑی بھاری غلطی یہ ہے کہ وہ کسی امر شرعی کے متعلق صرف تابعین
کی تحقیق کا علم حاصل نہیں کرتے اور دیکھا و سنی جھوٹے مدعیان کی فلسفیانہ تقریریں کے
دام میں آ جاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کا کوئی عقیدہ یا علم صرف صالحین کے لئے نہیں چھوڑا۔ جو
بالتحقیق ہو۔ ہمارا زمانہ تو بہت بعید پڑا ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں:-

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُسْتَنًا فَلْيَسْتَنْ بِمَنْ قَدْ هَدَى فَاِنَّ الْحَى لَا يُؤْمِنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ
اُولَئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ اَبْرُ هَذِهِ الْاُمَّةُ تَلُوْا بِاَوْ اَعْمَقُهَا سَلَامًا و
اَقْلَهَا تَلْكَ قَوْمُ اخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لَا قَامَةَ دِيْنِهِ وَصَحْبَةَ بَنِيهِ
فَاعْرِضُوْا لَهُمْ حَقَّهُمْ وَتَسْكُوْا بِهِمْ فَاِنَّهُمْ كَالْوَعْلِ الْهَدَى الْمُسْتَقِيْمُ

یعنی تم میں سے جس کو یہ مطلوب ہو کہ وہ سنت کی پیروی کرے تو اسے چاہئے کہ وہ سلف صالحین کی سنت کو اختیار کرے۔ کیونکہ جو لوگ زندہ ہیں وہ فتنہ سے امان میں نہیں ہو سکتے۔ سلف صالحین سے مراد ہے جناب خمیر علیہ السلام کے صحابہ جو امت مرحومہ میں سب سے بڑھ کر نیکو کار اور سب سے بڑھ کر عین علم کے مالک تھے اور جو بناوٹ اور تکلف سے دور تھے یہ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اقامتہ دین اور صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ سو تم لوگ ان کی قدر و منزلت کو سمجھو اور ان کی سیرت کو مضبوط پکڑو۔ کیونکہ وہ عین ہدایت کی صراطِ مستقیم پر تھے۔

یہ بالکل صحیح ہے۔ کہ اولاً اور بالذات شریعت اسلامی میں دشتہ الانبیاء کے معزز لقب کے اہل حضرت صحابہ کبار ہیں جنہوں نے بلا واسطہ جناب خمیر علیہ السلام سے وراثتِ ظاہر و باطن کو حاصل کیا۔ اور مابعد کے علماء امت و حقیقت و دشتہ الانبیاء کے وارث ہیں اور جو ان جوں جوں مورث اعلیٰ حضرت امی عرب علیہ السلام سے زمانہ دور ہوتا چلا گیا اس وراثت کی مقدار میں فرق آتا چلا گیا کیونکہ قاعدہ ہے۔ کہ جس قدر مورث اعلیٰ کے بشتیں زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہر ایک وارث کے حصہ میں نسبتاً کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے بطور نتیجہ ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں۔ کہ جو کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ملا تھا وہ مابعد کے علمائے امت کی نسبت بہت کچھ زیادہ تھا۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ اس وراثت کی نوعیت کیا تھی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شریعت اسلامی کو جس طرح انسانی ہستی کے ظاہری مراتب زندگی کی اصلاح مد نظر ہے اسی طرح و انسان کے باطنی کمال اور ترقی روحانی کی تکفل ہے۔ مگر اس تقریر سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ظاہر و باطن علیحدہ علیحدہ غایت پر مبنی ہیں۔ بلکہ ہر دو کی غایت ایک ہی ہے۔ اس لئے یہ کہ دینا بالکل امر واقع ہے۔ کہ وراثت مذکورہ کے دو حصے تھے اوپر دو کے وارث مختلف الفطرت لوگ تھے بعض نے سنت و فقہ کا بیڑا اٹھایا۔ اور بعض نے تزکیہ و تصفیہ نفوس کا امر اہم اپنے ذمہ لیا۔ اور بعض حضرات ہر دو پہلو میں کامیاب نکلے۔ حامیان سنت و فقہ علماء امت

کے نام سے موسوم ہوئے۔ اور تصفیہ باطن کی مندر پر بیٹھنے والے اولیاء اللہ کہلائے۔ شیخ
البرمکی الدین بن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فتوحات میں ورثۃ الانبیاء کے متعلق ایک بحث
لکھی ہے جس میں سے ہم سب ذیل انتخاب ناظرین کے پیش کر کے مذکورہ بالا مصنفوں کی توضیح
کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

اعلم ان ورثۃ الانبیاء علیہم السلام اولیاء فلاولیا حفظ الاحوال والاحکام الباطنۃ التي
تدق عن الافهام والعلماء حفظوا الاحکام الظاهرۃ التي تقصر بادی الوری قدایش
خولا ما لبنا الانبیاء فی احوال الباطنۃ کان علیہ السلف الصالح فکانوا اولیاء
علماء فلما تخلف الناس عن العمل کل ما یعلمون سموا علماء فقط وسلموا اسم
الاولیاء فالعلماء حقیقۃ ہذا الاولیاء فعلم ما علیہ الناس الیوم کل
ولی عالم عامل بلانشک ولس کل عالم ولیالہ قد یتخلف عن مقام
العمل بما علم فالفقہاء علی الحقیقۃ ہذا الاولیاء لزیادۃ العلم الاحوال علیہ المقل
یعنی وارثان انبیاء علماء اور اولیاء اللہ ہیں۔ اولیاء تو باطنی حالات اور حقیقی احکام کے پاسیان
و نگارن ہوتے ہیں جو عوام کے افہام سے بالاتر ہوتے ہیں اور علماء شریعت کے احکام ظاہریہ
کے محافظ ہوتے ہیں۔ جو بذریعہ افہام اور استقامت سمجھیں آسکتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی انہیں علماء میں
سے بعض حضرات ایسے نکل آتے ہیں۔ جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت باطنی کے بھی مالک ہوتے ہیں
چنانچہ سلف صالحین میں ایسے عالمی رتبہ حضرات تھے جو علماء بھی تھے اور اولیاء اللہ بھی مگر
جب لوگوں کی علمی حالت میں فتور آنے لگا۔ تو من علماء ہی پیدا ہونے لگے۔ والا علماء در حقیقت

۱۔ نام لوگ اولیاء اللہ کی اصطلاح سے یہ خیال کرتے ہیں کہ سب لوگ حقیقی عبادت یعنی کرامات دکھلایا
کرتے تھے۔ حالانکہ کرامت نفس ولایت میں داخل نہیں بلکہ ایک امر زائد ہے جو اللہ تعالیٰ بعض مخلصین
فی الدین کو بطور انعام و کرم کے دیتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے بہت سے گمراہ حق کی طرف جھک آتے
ہیں۔ اور معجزات بناب پیغمبر علیہ السلام کی تصدیق کرتے ہیں۔ کیونکہ کرامت کسی ولی کی در حقیقت بنی اللہ
کے معجزات کا ضمیمہ ہوتی ہے۔ جس سے اس کا شیخ سنت ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۲ منہ

اولیاء اللہ ہی ہیں۔ سو موجودہ حالت میں ہر ایک دلی التذقیناً عالم کہلا سکتا ہے۔ مگر ہر ایک عالم دلی التذقی نہیں ہو سکتا کیونکہ علماء تمام علم کتابیت و سنت پر عامل نہیں ہوتے۔ اس لئے فقہاء و حقیقت اولیاء ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ علم ظاہر کے ساتھ علم باطن کے بھی یہ لوگ مالک ہوتے ہیں۔ پھر اسی کتاب کے ایک دوسرے مقام پر یوں لکھتے ہیں:-

المرا د بجمہ کل من کان علمہ لا تستقل بہ العقول ولا الحواس بل تحیلہ العقول
من حیث نظرہا ولیس المراد بجمہ ما تستقل العقول والحواس بادرک علمہ فان الذل لیس منہ ارتقا
یعنی وارثان انبیاء سے تمام وہ لوگ مراد ہیں جن کے علم کو عقول و حواس اور آگ نہیں کر سکتے
بلکہ عقول اپنی نظر میں اسے محال سمجھیں اور وہ لوگ و شیعہ الانبیاء ہیں جن کے علم کا احاطہ
بندلیہ عقول و حواس کے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے علم میں وراثت نہیں مل سکتی *

ضرورت نبوت و مذہب

انسان اپنی فطری حالت میں دیگر حیوانات سے کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتا۔ کیونکہ جس طرح
دیگر حیوانات اپنی جسمانی تربیت کے جلب منفعت و دفع مضرت کے متعلق ہر ایک حالت میں
ایک صحیح رفتار پر چل رہے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی اس عمل میں ان کے ساتھ شریک ہے اس
لئے اگر انسان اپنی مادی زندگی میں صرف جسمانی تربیت کی حد تک محدود رہے تو یقیناً اس کو
اشرف کائنات کہلاتی کافر کوئی حق محال نہیں لیکن ہم ثابت کر گئے ہیں کہ انسان اشرف کائنات
ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی وجہ غراف کا پتہ لگائیں۔ گزشتہ بیانات میں یہ واضح
ہو چکا ہے کہ انسان کے علمی کمالات کی کوئی حد معین نہیں۔ مادی طور پر وہ تمدنی و معاشرتی
اور سیاسی پہلو میں ترقی کرتے کرتے خواہ کسی حد تک بڑھتا چلا جائے مگر اس سے وہ اپنی
غایت مقصودہ کو محال نہیں کر سکتا۔ وہ اس لی یہ ہے کہ اس قسم کی ترقیات ضرورت نانہ کے
ساتھ ساتھ متبیل ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس لئے وہ خالی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غیر ضروری

ہیں کیونکہ ان کا ضروری ہونا انسان کی فطری احتیاج پر مبنی ہے۔ مگر چونکہ ہماری احتیاج کی کیفیت و کمیت میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس لئے ان ترقیات کی نوعیت بھی ساتھ ساتھ متبدل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی سلسلہ نوع انسان کی مادی زندگی کے ساتھ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس لئے کوئی اہل بصیرت کبھی یہ تجویز نہیں کر سکتا۔ کہ ان فانی ترقیات کو انسان کا مقصود یا لذات قرار دے۔ ہم مقصود یا لذات اور مقصود یا العرض میں فرق ظاہر کر چکے ہیں۔ انسان کا مقصود یا لذات معرفت ذات باری ہے۔ جو اسے حیات ابدی اور بقائے دوام کا دارت بنا دیتی ہے۔ اور مادی تنگی کے جتنے مراحل ترقی انسان طے کرتا ہے۔ وہ رب کے سب اس کے مقصود یا لذات کے حاصل کرنے میں سہولت پیدا کرنے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں دے سکتے انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اپنے مقصود یا لذات کی طرف متوجہ ہو اگرچہ مقصود یا لذات کے سمجھنے کی استعداد ہر ایک فرد انسانی میں ولایت رکھی گئی ہے۔ مگر اکثر حالات میں دیکھا جاتا ہے۔ کہ مادی زندگی کے لوازم اور ضروریات بشری کے حصول میں اسے اس درجہ تک استغراق اور اشتغال ہوتا ہے کہ وہ اس اہم فرض کے سمجھنے سے عمر بھر غافل رہتا ہے۔ اور یہ غفلت اس کے لئے خسار الدنیا والآخرہ کا موجب ثابیت ہوتی ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سی صورت ہے جس سے انسان اپنے مقصود یا لذات کو سمجھ سکے اور وہ کونسا طریق ہے جس پر چل کر وہ منزل مقصود پر پہنچ جائے۔ یہ دو سوال ہیں جن کا ہم علیحدہ علیحدہ جواب دیتے ہیں۔

ضرورت نبوت

وہ صورت جس سے انسان اپنے مقصود یا لذات کو سمجھ سکتا ہے اس کے متعلق ہمیں حقیقت نبوت میں غور کرنا چاہیے۔ واضح ہو کہ حکمت خداوندی اس بات کی متنی ہے کہ انسان کو اس کی غایت کی طرف متوجہ کرنے کے لئے مختلف قوموں میں انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت پر مبعوث فرما کر سلسلہ ہدایت قائم کیا۔ نبی اللہ اگرچہ نوع انسان کا ایک فرد ہوتا ہے۔ مگر اس کی صفت ہم انسانوں کی صفت سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا وجود انسان اور ملک (فرشتہ) کے درمیان بمنزلہ ایک

برنخ کے ہے۔ اور اس کی ذات ہر دو کے خواص اور آثار کا مصدقہ ہوتی ہے کیونکہ وہ عالم قدس سے
 الٰہی حقائق و معارف کو جن کے حصول کی صورت تعلیم و تعلم پر مبنی نہیں اور نہ تجربہ اور مشاہدہ کی وہاں تک
 رسائی ہو سکتی ہے۔ یہ طور فیضان الٰہی حاصل کرتا ہے۔ اور ایسے قوائے عظیمہ کا مالک ہوتا ہے
 جو علمی اور علمی پہلو میں صحیح طریق پر حق سبحانہ و تعالیٰ کی عین رضا کے زیر اثر عمل کرتے ہیں اس پہلو
 میں وہ عالم ملکوت کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے۔ مگر چونکہ عام افراد انسانی کی ہدایت کے منصب پر
 مامور ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نظر بسہولت تبیین و تفسیر دیگر انسانوں کے ساتھ ضروریات بشری میں
 شریک ہوتا ہے۔ ایسے گرامی قدر مخلوق کے نظائر کائنات کی دیگر اشیاء میں بھی موجود ہیں۔
 مہر جان کو دیکھو کہ وہ باوجودیکہ ایک جمادی مخلوق ہے مگر اس میں نباتی خواص موجود ہیں خرمائے
 دشت کو لو وہ نباتی مخلوق ہے مگر بعض خواص و آثار میں حیوان کے ساتھ مشابہ ہے۔ مثلاً
 مذکر و مؤنث کے اجتماع سے بار آور ہونا اور سر کاٹ دینے سے باطل بھلا سیطرح نبی اللہ
 اگرچہ نوع انسان کا ایک فرد ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی روحانی جہت سے کمالات علمی کا تحمل ہوتا
 ہے۔ اور وہ روح القدس سے تائید یافتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا
 وائیدنا بروح القدس اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسبت ارشاد فرمایا نزل بہ الروح
 الامین علی قلبہ لتکون من المتذین بلسان عربی میں چونکہ نبی اللہ عالم ملکوت
 اور نوع انسان کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ اس لئے روحانی جہت سے وہ عالم ملکوت
 فیضان قبول کرتا ہے۔ اور اپنی جسمانی جہت سے اس فیضان کا القاء اپنی نوع کے دوسرے
 انسانوں پر کرتا ہے۔ چنانچہ کفار کے اس خیال باطل کو کہ ہماری ہدایت کے لئے فرشتہ
 کیوں نہیں آتا رد کرنے کے لئے فرمایا۔ ولوجعلنہ مالا لجعلنہ رجلاً وللبسنا علیہم
 ما یلبسون یعنی اگر ہم نبی اللہ کو فرشتہ کی صورت میں مبعوث کرتے تو پھر بھی وہ ایک انسان
 ہی کی شکل میں آتا۔ اور اس پر ان لوگوں کو یہی اشتباہ رہتا۔ اس آیت میں اس امر کی
 طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ عامۃ الناس کی فطری استعداد اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ ہجرت

کسی انسان کامل کے برابر راست غوث ملک روحانی سے ہدایت حاصل کر لیں چونکہ کفار حقیقت نبوت کے سمجھنے سے عاری اور مقام انبیاء علیہم السلام سے بیخبر تھے اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام کو یوں کہتے: - اِنْ اَتَمَّ الْاَبَشَرُ مِثْلَنَا تَوَدُّوْنَ اَنْ نَقْصِدَ وَنَعْمَا لَنْ يَجِدَ اَبَا نَافَا تَوْنَا لِبِسُلْطَانٍ مَبِينٍ یعنی تم تو ہماری طرح ایک انسان ہی ہو۔ اور ہمیں اپنے باپ دادا کے راہ و رسم سے ہٹانا چاہتے ہو۔ سو قطعی حجت پیش کرو۔ کفار کی نظر انبیاء اللہ کی صرف جہت جسمانی تک محدود تھی جس میں سب افراد انسانی نیکیاں طور پر شریک ہیں اور وہ ان کے کمالات باطنی کے دیکھنے سے عاری تھے اور اس لئے وہ کہا کرتے: مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَشْرَبُ فِي الْأَسْوَاقِ یعنی یہ کیسا رسول ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے۔ ہمسری یا انبیاء پر دانتند - انبیاء راہچو خود پنداشتند

انبیاء علیہم السلام کو دیگر افراد انسانی سے وہی نسبت ہوتی ہے جو افراد انسانی کو حیوانات سے یا یوں کہو کہ جو نسبت قلب کو دیگر اعضاء بدن سے ہوا کرتی ہے۔ بنی اللہ کی مثال آفتاب کی سی ہے اور عامہ الناس کی مثال چاند کی سی۔ اگر کرہ آفتاب چاند کے کرہ پر اپنی روشنی کا افاضہ نہ کرے تو چاند کا کرہ بے اندر رہ جائے۔ سو جس طرح آفتاب قمر پر روشنی کا فیضان کرتا ہے۔ اسی طرح حضرات انبیاء علیہم السلام علوم حقہ کا افاضہ دیگر افراد انسانی پر کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام دنیا میں مبعوث نہ ہوتے تو تزکیہ نفوس اور اصلاح آخرت جیسے اہم فرائض سے افراد انسانی محروم رہ جاتے۔ انبیاء علیہم السلام خدا تعالیٰ کی طرف سے خود تزکیہ پاکر دوسروں کے تزکیہ کے متکفل ہوتے ہیں۔ جہر کن پہلے ہر میں حروف کندہ کرتا ہے۔ پھر اس کے ذریعہ ویسے ہزاروں نفوس حروف قائم ہو سکتے ہیں +

انجول حقیقت نبوت سے بے خبر ہیں عموماً یہ کہا کرتے ہیں نبوت امر وہی ہے کیسی کہ آدمی مجاہدت اور ریاضت اور پریز گاری سے تدریج

نبوت کے درجہ تک ترقی کر سکتا ہے مگر خیال نہ صرف غلط ہے بلکہ موجب ضلالت ہے اور توہین نبوت ہے۔ ان لوگوں کے خیال میں نبی اللہ کا مفہوم ریفارمر (مصلح قوم) کے مفہوم سے زائد نہیں۔ اگر اس خیال کو صحیح تسلیم کیا جائے تو مختلف زمانوں اور مختلف اقوام کے ریفارمر خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں انبیاء کہلانے کے مستحق ہیں اور جب کتب سیر و تواریخ سے ایسے ریفارمروں کے عقائد کا پتہ لگایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی ایک مشترکات عقائد کے لوگ تھے جو ہائے نفس میں اسی طرح مبتلا تھے جس طرح عوام الناس حالانکہ انبیاء علیہم السلام سب کے سب علمی و علمی کمالات میں تمام اور انسانی سے اکمل اور افضل سمجھے گئے ہیں۔ اور وہ ہر ایک صغیرہ اور کبیرہ سے خدائے تعالیٰ کی طرف سے معصوم پیرائے گئے ہیں اور توحید و ذات باری اور احوال آخرت کے متعلق لوگوں کو ایسے علوم کا افادہ کرتے ہیں جن سے علماء اور دیگر علوم و فنون کے جاننے والے آدمی بالکل جاہل ہوتے ہیں۔ تمدن و معاشرت یا سیاسیات کے متعلق چند ایک اصلاحات کر کے اگر کوئی شخص نبی ہو سکتا ہے تو یوں سمجھو کہ دنیا میں اس وقت بھی تبارز انبیاء علیہم موجود ہیں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ نبی اللہ مامور من اللہ ہو کر اعلیٰ عالم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتا ہے جو لوگوں کو توحید و عبادات کی طرف دعوت کرتا ہے۔ اور اخلاق فاضلہ کی ترغیب اور فاضل نفسانی سے ترمیم اس کی تعلیم کا امتیازی نشان ہوتا ہے۔ اور اس طریق پر لوگوں کو بالبد الموت کے خدایہ ثواب سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ باتیں سولے انبیاء علیہم السلام کی پاک تعلیم کے ہم نئے کسی حکیم یا مصلح قوم کے کارناموں میں نہیں دیکھیں اس لئے مذکورہ بالا خیال سراسر جہالت اور ناواقفیت پر مبنی ہے۔ قرآن مجید میں منصب نبوت کی نسبت یوں ارشاد ہے۔
 اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رَسُولًا لَّهُ إِنَّهُ أَعْلَمُ مَنْ يَرْضَىٰ لِحُكْمِهِ
 اب میں اس سوال کا جواب دینا چاہیے کہ وہ کون سا طریق ہے جس پر چل کر انسان منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

ضرورتِ شریعت

میش شریعت میں وارد ہوا ہے۔ من یراد اللہ یہ خیراً

یلفقہ فی الدین یعنی جس شخص کے حق میں اللہ تبارک

و تعالیٰ بصلاتی کا ارادہ کرتا ہے اس کو دین کی سمجھ عطا فرمادیتا ہے اور ایک دوسری حدیث

یہ کہ ایک شخص کے اس سوال پر کہ عقل مند کون ہے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ عقل مند ہے

جس کا دین درست ہو۔ عوام الناس عقلمند اس شخص کو کہا کرتے ہیں جو معاملات و دنیا میں اپنے نفع

و نقصان کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ اور کل امور کے پیش آنے پر مناسب تدابیر سوچ سکے۔ ہر ایک

شخص جانتا ہے کہ ایسے عقلمند دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں جن کے کارنامے روزمرہ

ہم دیکھتے سنتے رہتے ہیں۔ مگر ایسے عقلمندوں سے اصلاح آخرت کی توقع رکھنا عبث

ہے۔ و نبوی علوم میں کمال پیدا کرنا کوئی انوکھی بات نہیں مگر اس قسم کے کمالات کا خاتمہ

انسان کی موت کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے فی الحقیقت عقلمند وہی شخص ہے۔ جو

اصلاح آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اصلاح آخرت بجز اتباع شریعت حقہ ناممکن ہے

اس لئے ہمارے لئے شریعت کا جاتا فرض ہے۔ کیونکہ یہی وہ علم ہے جس کا نتیجہ بعد الموت

انسان پر منکشف ہوگا۔ مگر شریعت کیا ہے۔ انسان کی تکمیل ہدایت کے لئے دو قسم

کی عقل کی ضرورت ہے۔ اول عقل فطری جو ایک قسم کا نور ہے جو ہر ایک انسانی فطرت میں

مختلف مدارج پر ودیعت رکھا گیا ہے جس سے انسان نیک و بد میں امتیاز کر سکتا ہے۔ قرآن مجید

میں اس عقل کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:- فطرۃ اللہ الّتی فطرہا اللّٰہ علیہا لا تبدل

لخلق اللّٰہ ذلک الدّین القیّم۔ اس آیت میں عقل فطری کو دین کے لفظ سے

تعبیر کیا گیا ہے۔ دوم عقل شرعی یہ وہ نور ہے جو بواسطہ نور نبوت ہم تک پہنچتا ہے اس

نور سے ہمیں عقائد صحیحہ اور اعمال حسنہ کی حقیقت پر آگہی حاصل ہوتی ہے۔ جس کا اشارہ آیہ

قد جاءکم من اللّٰہ نور و کتاب مبین میں کیا گیا ہے گویا عقل فطری ایک نور داخل ہے

اور شریعت نور خارجی اور ہر دو مل کر ایک دوسرے کی معاون بلکہ متحد ہیں۔ چونکہ شریعت عقل

خارج کا نام ہے۔ اس لئے قرآن مجید نے کئی مواقع پر کفار کو لا عقل قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
 صمد بکم عیٰ فہم لا یعقلون۔ اور چونکہ عقل نورِ داخل کا نام ہے اس لئے آیہ
 مذکورہ بالا میں فطرت اللہ کیساتھ اسے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ دونوں متحد ہیں اس لئے نور
 شریعت اور نور عقل کو بالفاظِ نور علیٰ نور کیا بیان فرمایا کہ ارشاد فرمایا یدٰی اللہ لنورہ
 من یشاء جس سے ہر دو کو متحد ظاہر کرنا مقصود ہے *

اس سے یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ امور دین میں عقل فطری بجز عقل شرعی کے کچھ مفید
 نہیں۔ اور عقل شرعی عقل فطری کے بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔ عقل کو بمنزلہ اساس کے سمجھاؤ
 شریعت کو بمنزلہ عمارت کے اساس بجز عمارت کے کچھ مفید نہیں اور عمارت بجز اساس کے
 پائدار نہیں۔ یا یوں کہو کہ عقل بمنزلہ قوتِ باصرہ کے ہے اور شریعت بمنزلہ شمعِ نور کے۔
 قوتِ باصرہ بجز شمعِ نور کے بے سود ہے اور اسی طرح شمعِ نور قوتِ باصرہ کے دوسرے
 الفاظ میں اس کو یوں بھی ظاہر کر سکتے ہیں کہ عقل بمنزلہ ایک چراغ کے ہے اور شریعت بمنزلہ
 روغن کے۔ چراغ بغیر روغن کے اور روغن بغیر چراغ کے کیا مفید ہو سکتے ہیں *

یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عقل بذاتِ خود ممکن ہے کہ امور کلیہ کی
 معرفت کا ذریعہ ہو سکے مگر امور جزئیہ کی معرفت کے متعلق وہ صحیح فیصلہ نہیں دے سکتی۔ مثلاً یہ کہ
 ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے نورِ عقل سے اس بات کو سمجھ سکے کہ سچ بولنا اور انصاف کرنا
 اور پاکدامن رہنا اور کسی کو دکھ نہ دینا اچھی باتیں ہیں مگر یہ عمل دشوار ہے کہ وہ ان کلیہ امور کو
 ہر ایک ایسے مواقع پر جہاں ان امور کلیہ کو عمل میں لانے کی ضرورت پیش آئے استعمال
 میں لاسکے۔ برخلاف اس کے شریعت امور کلیہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ اور وہ یہ بتلاتی ہے
 کہ ہر ایک ایسے موقع پر جہاں میں کسی عملی حالت کی طرف رجوع کرنا ہو کس طرح امور کلیہ پر
 کاربند ہو سکتے ہیں مثلاً خمر پر کاشت اور خون اور شراب کے استعمال کے متعلق ہمارے عقل
 ملت و حرمت کا کچھ فیصلہ نہیں دے سکتی۔ اور اسی طرح ہم اپنی عقل سے اس امر کا فیصلہ نہیں

سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا: **وَكُنْ لَكَ وَحِينًا لِّكَ** روحان امرنا۔ اور اس جہت سے کہ وہ امراض باطنی کا ازالہ کرتی ہے۔ اسے شفا کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: **شَفَاءُ لِّمَا فِي الصُّدُورِ**۔ اور اس جہت سے کہ وہ نفسانی ہنگاموں سے پاک کرتی ہے۔ اسے ماسطہ پاک کرنے والا پانی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: **أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهٖ**۔ یہ ایک ایسی نفس اور متیز تھیل ہے جس سے بہتر فضیلت شریعت کے متعلق کوئی تمثیل تجویز نہیں ہو سکتی اور اس جہت سے کہ وہ حیرت و بہالت و تاریکی کو دور کرتی ہے اس کے لئے لفظ نور تجویز کیا ہے چنانچہ فرمایا: **قَدْ حَبَا كَرَمٌ مِنَ اللّٰهِ نُوْرًا وَكِتَابٌ** میں اور اس جہت سے کہ وہ بارگاہ ربانیت کی طرف وصول اور قرب حاصل کرنے کا واسطہ ہے اس کو لفظ وسیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے چنانچہ فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ** اور نیز فرمایا: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا** اور اس جہت سے کہ انسان شاہراہ زندگی میں بخوف و خطر منزل مقصود پہنچ سکتا ہے۔ اسے مراط مستقیم کہا گیا ہے چنانچہ فرمایا: **وَإِنَّ هَذَا عَمَلٌ مُّسْتَقِيمٌ**۔

نبی اور نبی میں فرق

دنیا میں کئی ایک امور ایسے ہیں کہ جن میں تشابہ پایا جاتا ہے۔ مگر ان کی حقیقت ایک نہیں ہوتی لیکن جب معیار صحیح پر ان کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ تو حقیقت اصل یہ واضح ہو جاتی ہے۔ اگر حق و باطل کا کوئی صحیح معیار ہمارے پاس نہ ہوتا تو صداقت و نیا سے مفقود ہو جاتی اور اہل دنیا ہمیشہ ضلالت اور بطالت میں مبتلا رہتے ہم اہل اسلام کے پاس کتاب اللہ اور سنت صحیحہ دو ایسے قطعی معیار ہیں۔ کہ جب تک دنیا میں موجود ہیں۔ دین حق میں کسی قسم کے باطل کو قطعاً دخل نہیں ہو سکتا۔ زمانہ رسالت میں چند ایک لوگ ہوائے نفس میں مبتلا ہو کر مدعیان نبوت بن بیٹھے تھے۔ مگر جلد ہی ایسے مٹے کہ مرث تاریخ میں ان کا نشان باقی نہ رہا۔

یہی حشر ماجد کے درعیان کا وہ کاہن کا پتہ کتب النواخ سے چلتا ہے۔ نبی اور متنبی (نبی کا نبی) میں ایسا واضح فرق ہے کہ جس پر زیادہ بحث کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ حکیم ابوعلی احمد المعروف بلبن سکویہ نے اپنی کتاب الفوائد الخضر کے آخر پر ایک فصل نبی اور متنبی کے فرق میں لکھی ہے۔ یہاں ہم اس کا ترجمہ کر دیتا کافی سمجھتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

”نبی اور متنبی میں بل حکمت اور صابان بصیرت کے نزدیک جو فرق ہے وہ باوجودیکہ بالکل واضح ہے مگر لمبا اوقات عوام الناس بلکہ بعض درعیان علم و فضل پر بھی مخفی رہتا ہے۔ اسلئے ہمیں ضروری معلوم دیتا ہے۔ کہ ہم اس کے متعلق مختصر طور پر کچھ قلمبند کریں۔

نبوت اور اس کی خصوصیات کے متعلق ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں جنکی تبا پر نبی اللہ کو کبھی یہ ضرورت پیش نہیں آتی کہ وہ لذائذ و خواہشات نفس کے پیچھے لگے۔ کیونکہ اس کا نفس عالم قدس کے ساتھ اس طرح مانوس ہوتا ہے کہ اسے اس قسم کی ہوائے نفس کی طرف سے طبعاً نفرت ہوتی ہے۔ اور اس کو عالم قدس کی لطائف و حقائق کے ساتھ انس اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور اس کی سمع و بصر معانی لطیفہ کو سیداری کی حالت میں سنتی اور دیکھتی ہیں اور اسی کا نام حالت وحی ہے۔ اور یہ حالات عالم قدس سے اس کی قوت عاقلہ پر فائز ہوا کرتے ہیں اور اس درجہ تک ان کا اثر قوی ہوتا ہے کہ وہ اس کے حواس سمع و بصر محسوس ہوتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کی سمع محسوس کر سکتی ہے اور بصر کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ ایسی حالت کو قرآن مجید میں من وراء حجاب (پس پردہ) کہا گیا ہے جب اسکی سمع میں وہ معانی آجاتے ہیں تو اس کے دل پر ایک تم کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے جس کے بعد اس کو ایک قسم کا سکون حاصل ہوتا ہے جس کے ساتھ یقین بھی شامل ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے ابنائے جنس کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور اداب کی تلقین کرتا ہے جن سے عامۃ ناس رذائل سے پاک ہوتے ہیں۔ اور خطا اور گمراہی سے محفوظ ہوتے ہیں اور اس کی تلقین کا نام شریعت قرار پاتا ہے اور اس فرض کے سرانجام دینے میں وہ ہر ایک

قسم کی مصیبت حتیٰ کہ موت کو بھی آسان خیال کرتا ہے۔ اور مختلف قسم کی اذیت و تکلیف کا تحمل ہوتا ہے۔ اور اسے ایک ایسی زبردست قوت عطا کی جاتی ہے جس سے وہ لوگوں کو ہمت و دانش کے کلمات سے اپنی پیش کردہ رائے پر کہنچ لاتا ہے اور مخالف و معانی کو مثال کر موت میں بیان کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور چالیس سے کچھ زیادہ حقائق میں وہ عوام الناس سے ممتاز ہوتا ہے۔

تنبی کا حال مذکورہ بالا صوت سے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ کیونکہ بن امور سے بنی اللہ کو نفرت ہوتی ہے۔ تنبی ان کا طالب ہوتا ہے۔ اور ان امور کے حاصل کرنے میں یقیناً رسوا ہوتا ہے۔ سو وہ اگر مال یا حکومت یا نجات یا دیگر لہذا کا طالب ہو تو اس کی خواہش کے آثار و علامات اس سے ظاہر ہو کر رہتے ہیں اور بالآخر اس کی پروہ دری ہو جاتی ہے ایسے شخص کی حالت بسا اوقات بہال پر مخفی رہتی ہے بالخصوص جبکہ وہ شخص تکلف و نصیحت کے ساتھ فروتنی زہد و معیشتی اور جو و کرم کا اظہار کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہو۔ وہ بسا اوقات تعبیرہ کاری اور حروافسوں سے بھی کام لیتا ہے۔ جس پر اکثر جاہل لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور اگر اس سے ایسے حقائق و معارف کی نسبت سوال کیا جائے جن کی صلیت پر صرف حضرات انبیاء ہی آگاہ کر سکتے ہیں تو چونکہ وہ خود ایسے سوالات کے جواب سے عاری ہوتا ہے۔ اس لئے یا تو وہ کتب سماویہ کے الفاظ ہی کو ان کے سامنے دہرا دیتا ہے اور اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا اور یا اپنی طرف سے کچھ جملہ وضع کر لیتا ہے جن میں تناقض پایا جاتا ہے یا بالکل بھل ہوتے ہیں کیونکہ معانی لطیفہ کو کاہم وحی کے سوا اگر کوئی شخص اپنے لفظ میں بیان کرے تو یقیناً اختلاف اور تضاد کے نقص سے محفوظ نہیں رہ سکتا (انہی) فرقہ باطنیہ۔ لورنجشیہ۔ بابیہ۔ بہائیہ وغیرہ کی تواریح میں غور کرو تمہیں مدعیانہ کا ذہن کی حقیقت بخوبی سمجھ میں جائیگی۔

ملا علی قاری شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں والد غوی النبوتہ لید نبینا صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کفر کیا۔ یساع یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دوسری نبوت کفر ہے اور اس پر تمام علماء امت کا اتفاق ہے۔

ادیان عرب قبل اسلام

ایک محقق مؤرخ کے لئے تاریخ عرب میں عنوان مذکورہ بالا سے بڑھ کر زیادہ دلچسپ اور کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس مسئلہ کے متعلق جس قدر تحقیق بردہ سے واقعات ہم پہنچائی جائے اس سے ہمیں اسلامی صداقت اور ضرورت کا نہ صرف یقین حاصل ہو جاتا ہے بلکہ ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اسلام تمام اقوام عالم کے لئے گویا البرزخیت تھا جس نے اپنی پاک تعلیم سے بیکار سوکھے سڑے چشتان کو ہر ابر بھر کر دیا۔ قبل از اسلام اہل عرب بہ اعتبار مذہب کے چار قسم کے لوگ تھے۔ خدا پرست، بت پرست، لاد مذہب، صابئین۔ اہل عرب میں خدا پرست لوگ موجود تھے جن میں بعض تو ایک نہ معلوم اور محض قدرت کو اپنا خالق سمجھتے تھے لیکن دیگر امویں ان کے

خدا پرست

عقائد لاد مذہبوں سے ملتے جلتے تھے اور بعض ایسے لوگ بھی تھے جو خالق عالم اور بقائے روح اور حشر و نشر کے قائل تھے اور نیک و بد اعمال پر جزا و سزا کے عقیدہ کے پابند تھے۔ اگرچہ یہ لوگ ان عقائد پر قائم تھے۔ مگر علما ان کے پاس کوئی ایسا دستور العمل موجود نہیں تھا جس پر کاربند ہو کر وہ نجات ابدی حاصل کر سکیں۔ اس لئے دیگر مذاہب کی کچھ کچھ باتیں انہوں نے اخذ کر لیں تھیں۔ عموماً چار قسم کے مختلف مذاہب کے لوگوں سے انہیں سابقہ پڑتا اور انہیں کی بعض تعلیمات سے وہ متاثر ہوئے۔ اول مذاہب اہل عربی کے ماننے والے۔ دوم صابئین یہ ستارہ پرستوں کے ایک قوم تھی۔ سوم یہود چہام مسیحی ان مذاہب کو اہامی مذاہب خیال کیا گیا تھا۔

بت پرستی کا آغاز کیوں کر ہوا انسان چونکہ ایک مددگار ہے اس لئے قوت

اور اک فطر اس کو اس امر کی طرف کھینچ لاتی ہے کہ وہ موجودات عالم کو چورہ زمرہ اس کے گرد پیش ظاہر
 بناتے رہتے ہیں کسی زبردست غالب اقدت ہستی کی طرف منسوب کرے اور اس حد تک اس کی
 رسائی ایک امر فطری ہے مگر جب وہ ایسی ہستی کو اپنے حواس سے محسوس نہیں کر سکتا تو وہ کسی نہ کسی
 صورت میں مادی مخلوق کو حوادث کا مصدر قرار دے لیتا ہے۔ بہت پستی کا منبع ہی خیال
 فاسد ہے۔ ابتدا آفرینش میں قاعدہ تھا کہ جب کوئی عمل بخ اور نیک آدمی جاتا تو دل کا ایک
 مجسمہ تیار کر کے اس کی پرستش کیے لگتے۔ آہستہ آہستہ یہ طریقہ قریب دنیا کی تمام اقوام میں رواج
 پا کر مستحکم ہو گیا۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان فطرۃً مذہب کو ماننے والا پیدا ہوا ہے اگر وہ معبود
 حقیقی سے ناواقف ہو کر اپنے منہ سے مجازی معبود بنا لیتا ہے۔ اور سب سے پہلے اس کی توجہ
 صحیفہ فطرت کے چہرے سے منہ منہ ہوتا ہے۔ چاند سورج۔ ہوا۔ برف۔ باران۔ آگ کی طرف
 منتطبت ہوتی ہے۔ اور انہیں عالم کائنات کا مدبر اور متصرف تسلیم کر کے ہر ایک قسم کے خیر و شر
 کو ان کی طرف منسوب کر دیتا ہے اور اپنے جلی صفحہ کی وجہ سے ان کی عظمت کا خیال
 اس کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اور یہی غیر اللہ پرستی ہے جس کو بت پرستی کہتے ہیں۔
 جس کا پتہ دنیا کی تمام اقوام میں ملتا ہے۔ تمام غیر اللہ پرست اقوام اپنے معبودوں کی نسبت
 یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ ان کی بر قسم کی خوشی اور آسائش کے عطا کرنے اور عیبوں اور عیادوں کے
 ٹال دینے کا اختیار رکھتے ہیں اور ان کی پرستش کو ترک کر دینے پر وہ انہیں افلاس و باری
 لاؤندی ناگہانی موت وغیرہ میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اہل عرب بھی اپنے مجازی معبودوں کی نسبت
 ایسے ہی باطل عقائد کے قائل تھے۔ چنانچہ عاو۔ مٹو۔ جدیس۔ جرم۔ عقیق وغیرہ
 وغیرہ باشندگان عرب سب کے سب بت پرست قوین تھیں۔ گو بالتفصیل اس امر کا دلالت
 کرنا دشوار ہے کہ ان کے ہاں بتوں کی پرستش کا کیا طریقہ تھا۔ اور وہ علیحدہ علیحدہ کون سے معبودوں
 کی طرف کس قسم کے حوادث کی نسبت کیا کرتے تھے۔ مگر یقیناً اور اسماعیل کی اولاد کی نسبت
 جو عرب عاربہ اور عرب تحریرہ کہلاتے ہیں یہ معلوم ہے کہ ان کے بت دو قسم کے تھے۔ ایک

قسم کے تو وہ بُت تھے جو بلائیں اور ارواح اور غیر محسوس طاقتوں سے جکڑی ہوئی خیال کیا جاتا تھا نسبت رکھتے تھے۔ اور دوسری قسم کے وہ بُت تھے جو ان نامی گرامی اشخاص کے ناموں پر وضع کئے گئے تھے جنہوں نے عمدہ کارناموں میں شہرت حاصل کی۔

ان مشرک عقائد کے ساتھ اہل عرب نے اکثر اپنے ہموطنوں کے الہامی مذہبوں سے بھی کچھ عقائد اخذ کر لئے تھے۔ اور ان کو اپنے توہمات باطلہ سے ایسا خلط ملط کر دیا تھا۔ کہ مشرک عقائد سے انکا امتیاز و شواہد تھا۔ البتہ یہ فرق ضرور تھا۔ کہ وہ دیوی اموروں کے متعلق تمام اختیارات کا مالک اپنے معبودوں کو قرار دیتے تھے۔ اور عقوبت کے اختیارات کی نسبت وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے۔ کہ ان کے معبودان کے گناہوں کی معافی کے لئے خدا تعالیٰ سے سفارش کریں گے۔ یہ غیر اللہ پرستی عموماً عرب کے تمام قبائل میں مروج تھی۔ بحران چند قبائل کے جو اہل کتاب تھے +

لاندھی | قبل از اسلام اہل عرب میں ایک ایسا فرقہ موجود تھا۔ کہ تہ تو بت پرستی ان کا مذہب تھا اور نہ وہ کسی الہامی مذہب کے پیرو تھے۔ بلکہ وہ خدا کے وجود اور مشرک افعال کے منکر تھے۔ عموماً ان لوگوں میں کسی امر کو گناہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے جہنم و سزا کے بھی قائل نہیں تھے وہ اپنے تئیں ہر ایک قسم کی قیود سے آزاد خیال کرتے تھے اور اپنی آزاد مرضی پر کار بند ہوتے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ انسان کا وجود ایسے ہی ہے۔ جیسے ایک درخت یا جانور کا وجود وہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اپنی طبعی عمر کو پورا کر کے نباتات یا حیوانات کی طرح نیست و نابود ہو جاتا ہے +

صابئین | صابئین مذہب کو قوم سامری نے اہل عرب میں رواج دیا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو قدیم مذہب کے پیرو خیال کرتے تھے۔ اور حضرت شیث اور ادریس کو اپنا نبی مانتے تھے۔ ان کے ہاں ایک کتاب بھی تھی جس کو صحیفہ شیث کہتے تھے۔ ان لوگوں کے ہاں سات وقت کی نمازیں تھیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی نماز کا وہی طریق

تھا جو مسلمانوں کی نماز کا ہے۔ وہ نماز جنازہ بھی پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک قمری مہینہ کا روزہ بھی رکھا کرتے تھے۔ مگر تہیج ستارہ سہتی کی طرف مائل ہوتے چلے گئے حتیٰ کہ انہوں نے اس کو اپنے مذہب کے لئے اصل عظیم قرار دے لیا۔ چنانچہ ستاروں کے لئے انہوں نے سات ہیکل قرار دے لئے اور جس ستارہ کا جو معبد تھا اسی معبد میں اس ستارہ کی پرستش کرتے تھے۔ حیران کے معبد میں یہ لوگ حج کی نیت سے جمع ہوا کرتے تھے اور نانہ کعبہ کی تعظیم بھی لازم سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں بڑے مذہبی تیوہار کا وہ دن تھا جبکہ آفتاب بروج حمل میں داخل ہوتا تھا یعنی موسم بہار کے شروع پر یہ تیوہار منایا جاتا تھا۔ اسی طرح زحل مشتری۔ مریخ۔ زہرہ۔ عطارد کے بعض بروجوں میں انتقال کرنے پر بھی تیوہار منائے جاتے تھے۔ وہ ان سیاروں کے سعد اور نحس کا اثر انسان کی قسمت اور دیگر امور دنیا پر تسلیم کرتے تھے۔ وہ پہاڑوں اور غاروں میں اعتکاف اور مراقبہ بھی کیا کرتے تھے۔

یہود عرب میں قبل از اسلام یہودی بھی بکثرت تھے مگر ان میں شرارت اور شومی مزہ کمال تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے بہت تکلیفیں دیں کتاب الہی (تورات) کو فراموش کر کے من گھڑت باتوں اور روایتوں پر چلتے تھے۔ اور علماء یہود نے اپنا مطلب سیدھا کرنے کے لئے تورات میں بہت سی تحریف کر لی۔ یحییٰ بن زکریا عن مواضعہ ولیقولون ہذا من عند اللہ میں اسی امر کا اشارہ ہے۔

عیسائی چونکہ عرب روم کے عیسائیوں سے تجارت کرتے تھے اس لئے ان میں سے بعض نے دین عیسوی کو قبول کر لیا تھا مگر اس زمانہ کی عیسائیت موجودہ عیسائیت سے بھی ردی حالت میں تھی۔ پوپ خدا کا نائب مانا جاتا تھا۔ اس کا قول فعل منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ دوزخ کا ٹھیکیدار تھا جس کو چاہتا تو نقد مقررہ لے کر ہمیشہ کا پروانہ لے دیتا وغیرہ وغیرہ۔ حرام کاری۔ دغا بازی اور شراب خوری کا رواج عام تھا۔ غرضیکہ کوئی فعل بد ایسا نہ تھا جو کفارہ کے بھروسہ پر نہ کیا جاتا تھا۔

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشلیث الوصیت صیحہ اوصلیب پستی کے خلاف وعظ فرمایا تو ان کے متن بدن میں آگ سی لگ گئی اور مباحثہ کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر کچھ فہمی اور تھصب کی وجہ سے ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر آیت میا بلہ نازل ہوئی۔ وہی حدیث۔
فمن حادھا ذیہ من بعد ما جاءک من العلم فقل تعالیٰ اذع ابناء ذابناءکم ولساءنا ولساءکم والنساء والنساء ثم یفصل فجعل لعنة اللہ علی الکذابین۔

آخر تمام مذاہب باطلہ کیلئے بعد و دیگر سے مدغم ہو گئے اور اللہ اکبر کی صدا ہر رو و دیوار سے گونجنے لگی۔ مہر ایت آخر صداقت ہی ہے۔ قل جاء الحق و زہق الباطل ان الباطل کان زہقاً
انشاء اللہ العزیز وہ دن قریب ہے جبکہ تمام مذاہب باطلہ مروجہ زمانہ حال دنیا کے صفحہ سے حروف غلطی طرح مٹ جائیں گے۔ اور ہم مسلمانانِ فخر سے یہ کہنے کے قابل ہونگے کہ سہ
اقلت شمس و کلاولین و شمسنا۔ ابد اعلیٰ فوق العلیٰ لا تغرب

مذکورہ بالا مذاہب کے علاوہ اہل عرب میں بعض تنویر اور محسوس فرقوں کے بھی پابند تھے۔
ان کا عقیدہ تھا کہ نور اور ظلمت دو صالح ہیں۔ نور سے افعال حیر صادر ہوتے ہیں اور ظلمت سے افعال شر۔ یہ دونوں قدیم ہیں اور ہمیشہ تک رہیں گے۔ یہ
مذہب سمیع بصیر اور قوی ہیں۔

دونوں نفس صورت سیرستا فعل اور تدبیر میں متضاد اور مختلف ہیں۔ نور نہایت خوبصورت اور حسن منظر ہے اس سے خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں۔ اس سے ہرگز کوئی بُرا کام صادر نہیں ہوتا۔
ظلمت اس کے خلاف ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے چار بدن ہیں اور پانچویں روح۔
ابدان نور کو ملائکہ اور ابدان ظلمت کو شیاطین و عفاریت سے تعبیر کرتے تھے۔

بعض کا قول ہے کہ ملائکہ نور کی اولاد ہیں اور شیاطین ظلمت کی۔
اس دین کے پیر کسی ذی روح کو ایذا دینا گناہ سمجھتے تھے۔
احکام شریعت میں سے ضروری ضروری یہ تھے۔

(۱) ایک دن کی قوت سے زیادہ ذخیرہ جمع نہ کرو ۔

(۲) جھوٹ بچل ۔ بھرت پستی ۔ زنا اور چوری اسے بچے رہو ۔

مجوس اس شہر کی ابتدا قابیل سے شروع ہوئی ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب قابیل ہابیل کو قتل کر کے بھاگ گیا تو راستہ میں شیطان ملا ۔ تو کہنے لگا کہ ہابیل

کی قربانی قبول ہوئی وجہ صرف آتش پرستی ہی ہے ۔ اگر تو بھی جین چاہتا ہے تو آگ کی پرستش کیا کر ۔ اس نے اس کی بات مان لی اور ایک مکان بنا کر آگ کی پرستش کرنے لگا ۔

آہستہ آہستہ انہوں نے بہت سے آتشکدہ بنائے جہاں ہر وقت آگ روشن رہتی تھی ۔ سلاطین ایران نے بڑے بڑے ہالیشان آتشکدہ بنائے ۔ یہ لوگ آگ کو مٹی ، فضیلت دیتے تھے ۔ اور اس کی تعظیم کرتے تھے ۔ چنانچہ بشار بن برد شاعر کا قول ہے ۔

الارض مسافة سوداء مظلمة - والنار معبود ذواته وكانت النار

ان کا قول تھا کہ آگ سب عناصر سے زیادہ مفید ہے اقصیم و جہ میں شریعت اور طبیعت ہے تمام شہنائے عالم میں بنو اسی کی برکت سے ہے ۔

عبادت کا طریق یہ تھا کہ ایک مربع گڑھا کھود کر اس میں آگ روشن کر کے اس کے گرد بچھا کرتے تھے ۔ ان کے بہت سے فرقے تھے ۔

(۱) بعض آگ جلا کر سال کے کسی مقررہ دن میں وہاں سن کیا کرتے تھے اور خوبصورت ہاکرہ لڑکی کو لباس فاخرہ پہناتے تھے اور اُسے غطرتوشبول کر گاتے بجاتے وہاں لاتے تھے ۔ اور گڑھے کے کنارہ پر کھڑے ہو کر وہ لڑکی اپنے آپ کو آگ میں گرا دیتی ۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس کی روح واپس آکر آتش پرستی کی ترغیب دیتی ہے اور حصول جنت کے وعدے دلاتی ہے ۔

(۲) بعض مجوسی اس فعل کو صبر شریعت حرام سمجھتے تھے ۔

(۳) ان میں سے بعض زہد اور عابد تھے جو ہر وقت آگ کے گرد بیٹھے رہتے تھے ۔ اور

لوگوں کو اخلاق جمیلہ مثلاً صدق و صفا۔ ایماندارى و عفت اور عدل کی تعلیم دیتے تھے ۔

ختم نبوت

ختم نبوت کا مسئلہ ایسا واضح ہے۔ کہ اس میں کسی قسم کی بحث کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ ہر دوسے سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے مبعوث ہو چکنے کے بعد اخیر زمانہ میں مبعوث ہوئے ہیں آپ کے بعد کسی شخص کا مبعوث من اللہ ہو کر آفاقی قرآنہ کی تکذیب کرنا ہے۔ آیہ۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ ابًا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولُ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ۔ کے ذیل میں تمام مفسرین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ سلسلہ نبوت آپ کی ذات گرامی پر بالکلیت منقطع ہو گیا۔ اس آیت شریفہ کے الفاظ ایسے واضح ہیں کہ جن کے سمجھنے میں کسی کو کسی قسم کی وقت پیش نہیں آسکتی۔ اور آیہ۔ الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي کے الفاظ پر غور کرو کہ اکمال اور اتمام دین کے بعد کوئی کمی رہ جاتی ہے جس کی تکمیل کسی دیگر نبی اللہ کے مبعوث ہونے پر موقوف رکھی گئی ہو۔ ختم نبوت کے متعلق حدیث ذیل میں غور کرو۔

عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انّ مثلی و
مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بنا فاحسنہ واجملہ
الاموئع لبنۃ من زاویۃ من زوایا فجعل الناس یطوفون یتعجبون
لہ ویقولون هل لہذہ اللبنۃ فانا اللبنۃ وانا خاتمہ النبیین ہ

یعنی میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال بعینہ اس شخص کی سی ہے جس نے ایک عمارت نہایت عمدگی کے ساتھ تعمیر کی ہو۔ ادیکھیں اس کے کسی گوشہ میں ایک اینٹ جگہ خالی چھوڑ دی ہو جسے دیکھ کر لوگ متعجب ہوں اور یوں کہنے لگیں کہ اس خالی جگہ میں اینٹ کیوں نہیں رکھی گئی۔ سو میں ہی اینٹ ہوں (جس سے ایوان نبوت مکمل ہو گیا) اور مجھ پر انبیاء علیہم السلام کا خاتمہ

ہو گیا۔ اور ایک دوسری حدیث میں یوں وارد ہوا ہے :-

عن جابر بن مطعم قال قال رسول الله صلى الله عليه واله وسلم لي خمسة اسماء أنا محمد وانا احمد وانا الماحي الذي يمحو الله الكفر بي وانا الحاشر الذي يحشر الناس على قدمي وانا العاقب والعاقب الذي ليس بعده نبي ۞

اس حدیث میں حضور علیہ السلام نے اپنے اسماء مبارکہ میں اسم عاقب کا ذکر فرمایا ہے جس کی تفسیر بھی خود ہی فراموشی یعنی وہ شخص جس کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئیگا۔ اور ایک حدیث میں حضور علیہ السلام نے اپنے اسماء مبارکہ میں اسم مکفی کا بھی ذکر فرمایا ہے جس کی تفسیر میں لکھتے ہیں :-
هو المولى الطاهر يعني اخر الانبياء المتبع لهدى فاذا كفى فلا نبى بعده اوليك اور حدیث میں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تفصیل میں وارد ہوئی ہے فرمایا اكا انه لا نبى بعدى ایسے لفظوں شریعہ کے موجود ہونے پر بھی اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کی نبوت کا قائل ہو۔ تو پھر اس کے لئے ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہیں اس مسئلہ کو زیر بحث لانے کی کچھ ضرورت نہ تھی مگر چونکہ یہ مسئلہ عقائد کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اور عقائد میں تقلید حرام ہے۔ بلکہ حجت قطعی کے بدون کوئی عقیدہ صحیح نہیں تسلیم کیا جاسکتا اور یہ مسئلہ مسائل اجتہاد میں داخل نہیں اس لئے ہم نے چند سطور لکھ دیئے ہیں تاکہ علوم الناس اپنے عقیدہ کی تصحیح کر سکیں۔ والتوفيق من الله تعالى ۞

ولایت تابع نبوت ہے

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی توضیح اس لئے ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اکثر لوگ ولایت اور نبوت میں کچھ امتیاز نہیں کرتے بلکہ بعض منصفانہ کا خیال ہے کہ درجہ ولایت درجہ نبوت سے افضل ہے مگر یہ خیال ہر ایک پہلو میں صحیح نہیں۔ نبوت ایک منصب عطیہ خداوندی ہے۔ اور

اسی طرح ولایت بھی۔ بنی اللہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جو خدا کے تعالیٰ کی طرف سے خلق خدا کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوتا ہے اس کو بذریعہ وحی خدا کے تعالیٰ کی طرف سے ایسے فضائل و کمالات دیئے جاتے ہیں جن سے وہ دیگر عوام الناس سے ممتاز ہوتا ہے۔ دیکھو اور اسم علیہ السلام اپنے باپ کو خدا کے تعالیٰ کی طرف سے یوں ارشاد فرماتے ہیں :-

يا ابت اني قدما جاني من العلم والهدى اناك وانت بنى اهداك صراطا سويا۔

یعنی اے باپ مجھے خدا کے تعالیٰ کی طرف سے ایسا علم حاصل ہے جو تجھے حاصل نہیں۔ سو تو میری پوری پیروی کر میں تجھے راہِ راست کی ہدایت نہ کرو نکاح بنی اللہ ان ہدایات کی تبلیغ پر خدا کے تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتا ہے۔ اور اس پر تبلیغ کی بجا آوری فرض ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کو ارشاد ہوتا ہے یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک فان لم تقبل بلغته رسالتہ۔ یعنی جو کچھ تجھ پر خدا کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے لوگوں کو پہنچا دے۔ اور اگر تو ایسا نہیں کر لیا تو تو نے فرائض رسالت کو ادا نہیں کیا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعثت بنی اللہ کی غرض ہدایتِ خلق ہوتی ہے اور تبلیغ اس کا فرض منصب ہے۔ یہ منصب نبوت و وجہت رکھتا ہے۔ جہت باطنی اور جہت خارجی جہت باطنی کے رُوح سے وہ خدا کا ولی ہوتا ہے اور اس لئے اصطلاح میں اس کو انسانِ کامل سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ وہ معاملات و حقائقِ علمیہ پر بروہ کمال حاوی ہوتا ہے۔ اور اس کا تعلق براہِ راست عالمِ قدسی سے ہوتا ہے اور عالمِ کون و فساد میں مشیتِ انزلی کی حکمت و مصلحت پر نگاہ ہوتا ہے۔ جہت خارجی کے رُوح سے وہ بنی نوعِ انسان کے ساتھ ایسا تعلق رکھتا ہے جس کے رُوح سے وہ ان کے عبادات و معاملات کے متعلق احکامِ بارگاہِ ربِ آخرت سے حاصل کرتا ہے اور لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ یہ احکام انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو پر حاوی ہوتے ہیں۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ معاشرتی۔ سیاسی امور میں اس کے ہدایات ایک قانونِ قطعی کا حکم رکھتے ہیں۔ تمام شرائع و دیانات بنی اللہ کی جہت خارجی سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ ہے نبی اللہ کی حقیقت۔ دلی النکس حقیقت جہت باطنی میں نبی اللہ کی جہت باطنی کے تابع ہوتی ہے یعنی وہ انوار معرفت با تبلیغ نبی اللہ حاصل کرتا ہے اور جہت خارجی میں بھی وہ پابندی احکام شریعت کے رُوسے نبی اللہ کے تابع ہوتا ہے یعنی وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے کوئی نئی شریعت نہیں لاتا بلکہ نبی اللہ کے احکام کی تبلیغ و تجدید کرتا ہے۔ مگر تبلیغ اس پر شرط غرض نہیں۔ دلی اللہ کے کمالات کا سرچشمہ نبی اللہ ہی کے کمالات ہوا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دلی اللہ کے ہاتھ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے اگر خرق عادت (کرامات) ظاہر ہوں تو وہ نبی اللہ کی حقیقت اعجاز کا لہجہ بقیہ سمجھا جاتا ہے۔ بعض اکابر کے کلام میں وارو ہوا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے بظاہر یہ جملہ بالتفاق جمہور اہل اسلام صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اور فی الحقیقت ہے بھی یوں ہی۔ مگر بعض اہل معرفت نے اس کی یوں توجیہ کی ہے کہ دلی اللہ کی جہت باطنی نبی اللہ کی جہت خارجی سے افضل ہوتی ہے اس توجیہ کو بعض اکابر نے صحیح تسلیم کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ مدارج معرفت میں اس قدر تفاوت ہے کہ بحر اولیا کا ملین کے کوئی شخص انکا حصر نہیں کر سکتا۔ اس لئے اسلم طریق یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل دقیقہ میں بحث کرنا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے۔

الوحی والالہام

وَمَا كَانَ لِشَيْءٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ رِسٍّ
وَسُؤْلًا فَيُوحِي بَأْذَنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ

(۱) وحی اور الہام منجملہ ان قوانین الہیہ کے شمار کئے جاتے ہیں جن پر سلسلہ نظام کائنات

لہ خدا تعالیٰ کسی بشر سے ہر کلام نہیں ہوتا مگر بصورت وحی یا پردہ کے پیچھے سے یا اپنے کسی ایلی کے ذریعہ
اپنے ایلی (فرشتہ) حکم خدا اس نبی پر خدا کا پیغام وحی کرتا ہے۔ بیشک خدا برتر اور صاحب حکمت ہے۔ ۱۲ منہ

جاری ہے۔ اور ان کی ضرورت اسی وقت سے سمجھنی چاہیے جب سے افراد انسانی کا سلسلہ
دنیا میں قائم ہوا۔ خداوند کریم اپنی حکمت کاملہ سے انسانی فطرت کو اس قابل پیدا کیا کہ وہ ہو جب :-
و علیہ آدم کلا سماء کلہا۔ تمام اشیاء عالم میں تعریف کر کے معرفت حقیقی کی اس غایت کو
حاصل کرے جس کی قابلیت اس کی ذات میں ودیعت رکھی گئی تھی۔ اس کا حضرت انسان اور
کوئی مخلوق ایسا نظر نہیں آتا۔ جو موجودات عالم میں اشیاء کی حقیقی قابلیتوں سے بذریعہ قوائے
فطری فائدہ اٹھا سکے۔ کیونکہ محاذات محض اپنے حفظ وجود کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ملائکہ کا کمال
فطری ہے جس میں نقصان و زیادت کو مطلقاً دخل نہیں۔ اور دیگر حیوانات اپنی فطرت کے مطابق
ایک خاص حد تک محدود رہتے ہیں۔ مگر انسانی کمالات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ہم
اس کو کبھی محدود نہیں کر سکتے۔ یوں سمجھو کہ وہ اسرار الہیہ اور کمالات روحانیہ کی ایک ایسی
جامع کتاب ہے جس میں تمام افراد موجودات کی قابلیتوں کے آثار موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
حضرت رب العزت نے بمضمون :- انی جاعل فی کلام من خلیفۃ۔ مرث انسان ہی کو
اپنے اسما و صفات کاملہ کا مظہر بنا کر انتظام عالم کے لئے اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ تلاوت قرآن مجید
کے وقت عوام الناس آیۃ انی جاعل الخ کو سرسری پڑھ جاتے ہیں۔ مگر ایک عارف
کامل اور عالم راسخ سے اس کی حقیقت پوچھنا چاہیے کہ وہ اس آیت شریفہ کو کس طرح کارخانہ
فطرت کے لایحل اسرار کا خزانہ سمجھتا ہے۔ لفظ خلیفہ اس موقع پر انسان کی اس شرافت کمال
کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کو حدیث ان اللہ خلق آدم علی صورتہ میں ظاہر کیا
گیا ہے۔ بہر صورت انسان کو خداوند کریم نے ایک نہایت گرامی قدر مخلوق پیدا کیا ہے
جس کا مقابلہ کوئی دوسرا مخلوق نہیں کر سکتا۔ آیۃ ولقد کہنا بنی آدم مذکور بالا دعویٰ کیلئے جہت قابل ہے

۱۵ خدا نے آدم علیہ السلام کو تمام اشیاء کے ناموں کی تعلیم دی۔ ۱۲ منہ +

۱۶ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کر دوں گا۔ ۱۲ منہ +

۱۷ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ ۱۲ منہ +

۱۸ ہم نے بنی آدم کو ایک گرامی قدر مخلوق بنایا۔ ۱۲ منہ +

(۲) یہ امر بالکل واضح ہے کہ ہر ایک چیز اپنی فطرت کے مطابق ہمیشہ اپنے کمال کی طرف میلان رکھتی ہے البتہ اس کمال کے لئے خارجی امور کی ضرورت ہوتی ہے جکے بدون فطرت اپنا عمل پورا نہیں کر سکتی اور درحقیقت وہ امور اس چیز کے حصول کمال کے لئے بمنزلہ ترقی کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ علت ہی فطرت ہے جس کا عمل امور مذکورہ پر موقوف ہوتا ہے۔ مثلاً دانہ گندم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ڈنٹھل پٹپا خوشہ کی صورت میں نمودار ہو اور یہ امر اس کی فطرت کا نتیجہ ہے مگر ایک جاہل آدمی بھی اس امر کو جانتا ہے کہ جب تک زمین میں لہیانہ جائے اور ابود کے تدابیر مناسبہ ہوں۔ پانی حرارت شمس وغیرہ سے وہ منتفع نہ ہو بار آور نہیں ہو سکتا۔ آئیہ۔ (عطیہ کل مشی خلقہ شہ ہدیٰ میں لفظ خلقہ مذکورہ بالا صلاحیت فطریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور لفظ شہ ہدیٰ بہ واسطہ اسباب و شرائط ضروریہ اس کا اپنے کمال کی طرف میلان کرنا مراد ہے۔ یہی مثال لطفہ انسانی کی سمجھو۔ کیونکہ لطفہ کی ذات میں انسان بننے کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے اور یہ اس کی فطرت ہے۔ مگر جب تک قویٰ طبعیہ اس میں اپنا عمل نہیں کرتی۔ بچہ نہیں بن سکتا۔ ادبچہ سے انسان کامل کے درجہ تک ترقی نہیں کر سکتا۔ الغرض ہر ایک چیز ایک ایسے عام قانون فطرت کے تابع ہو کر اپنے کمال کو حاصل کرتی ہے کہ اس میں ہم اپنے روزمرہ تجربہ و مشاہدہ کے رُوسے کوئی استثنائی صورت قائم نہیں کر سکتے۔ یہی وہ قانون ہے جس پر تمام عالم کائنات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ و درحقیقت آئیہ۔ کامل لہدایت اعطاء کل مشی خلقہ شہ ہدایٰ میں خداوند کریم نے تمام سلسلہ موجودات کے لئے ایک قانون کلی کا پتہ دیا۔ جس سے اہل بصیرت اس صلح حقیقی کی لامتناہی قدوتوں کا اندازہ لگاتے ہیں۔

(۳) اسلامی تعلیم کا دار و مدار اس امر پر ہے کہ انسان صرف اس محسوس پہل جسمانی کا نام نہیں بلکہ مجموعہ ہے دو چیزوں کا۔ نمبر اولیٰ یعنی جسم۔ نمبر ۲۔ غیر مادی یعنی رُوح۔

لہ ہمارا رب وہ ذات ہے جس نے ہر ایک چیز کو اس کی فطرت دی اور اس کو فطرت کے مطابق حصول کمال کی ترقی

اور یہ ایک ایسا امر ہے کہ جس کے نہ تسلیم کرنے سے تمام سلسلہ بعثت انبیاء علیہم السلام اور کتاب آسمانی اور وعدہ وعید کا باطل ہو جاتا ہے انسان کی اس حقیقت کے نہ تسلیم کر لیا لے دہر یہ فرقہ کے لوگ ہیں جن کے نزدیک انسان ایک جاندار مخلوق کا نام ہے جو مادی فعل و انفعالات سے دیگر اشیاء کی طرح موجود ہو گیا۔ اس لئے اسے کوئی شرف و فضیلت و گیرا فرد و موجودات پر حاصل نہیں وہ تاثیرات مادیہ کا نتیجہ ہے۔ اور بالآخر جب قوائے طبیعیہ اپنے عمل سے رک جاتے ہیں تو اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ مایہ میں کوئی چیز نہ باقی رہتی ہے اور نہ کوئی ثواب و عقاب اس پر عائد ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائیگا۔ واضح ہو کہ اکثر موجودہ اہل یورپ اسی رنگ میں رنگے گئے ہیں۔

اس موقع پر مجھے اس باطل مذہب کی تخلیط میں دلائل پیش کرنا مقصود نہیں کیونکہ اس غلط خیال کی تخلیط کسے لئے کوئی دوسرا موقع ہونا چاہیے۔ یہاں صرف اسی قدر کافی ہے کہ اس خیال کے البطل میں تمام کتب آسمانی مستحق ہیں۔ اور عقل سلیم اس کی تکذیب کرتی ہے میں نے کئی ایک ایسے لوگوں سے گفتگو کی جس میں انہیں لا جواب پایا۔ اور حقیقت انہیں گولٹا ہر خدا اور روح وغیرہ سے انکار ہوتا ہے۔ مگر غور سے جب دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ انہیں اس پر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیشہ حالت شک میں رہتے ہیں اور نہایت بد زندگی بسر کر کے بالآخر دلیر ہو جاتے ہیں۔

(۳) گذشتہ سطریں اس امر کا بیان ہو چکا ہے کہ سلسلہ کائنات کی تمام اشیاء اپنے اپنے قطری کمال کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ اور حصول کمال میں وہ اسباب و شرائط کی محتاج ہیں اس عام قانون کی رُو سے انسانی کمال کے دو پہلو ہو سکتے ہیں (۱) جسمانی (۲) روحانی۔ جسمانی کمالات سے مجھے اس وقت بحث کرنا منظور نہیں کیونکہ اس پہلو میں انسان بالکل دیگر حیوانات کی طرح سمجھنا چاہیے۔ جس طرح ایک حیوان کو اپنے قوام بدن کے لئے عناصر (رہبرہ اور دیگر ضروریات زندگی کی طرف) احتیاج ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنے

جہانی کمال میں ان ہشتیاء کا محتاج ہے۔ اور اس کی زندگی بدون اسبابِ معیشت بسر نہیں ہو سکتی ماس موقع پر انسان کے روحانی کمال کے اسباب و شرائط سے بحث ہے جس کے لئے مسئلہ وحی اور الہام کی تحقیق ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جب یہ امر بذریعہ واکل ثابت چکا ہے کہ انسان اپنی غایت حقیقی کو صرف علمی مراتب کے طے کرنے پر حاصل کر سکتا ہے۔ تو اب دوسوال پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) علم سے کیا مراد ہے (۲) علم کا ماخذ کیا ہے۔

سوال اول کا مختصر جواب یہ ہے۔ کہ علم سے یہاں معرفت ذاتِ باری مراد ہے جسکی نسبت حضور علیہ السلام کو جنابِ باری میں استمداد کرنے کا یوں حکم ہوتا ہے۔ قل دبت زِ دُنِّیٰ علما ءُ صافات ظاہر ہے کہ علوم سے یہاں علومِ دنیویہ ہرگز مراد نہیں۔ کیونکہ ان علوم سے تمام افرادِ انسانی کو یکساں نسبت ہے۔ اور نیز یہ علوم ایک نبی اللہ کے لئے ہرگز موجبِ کمال نہیں ہو سکتے کیونکہ نبی امت کے لئے ان امور کی تعلیم کا امام ہوتا ہے جن کو کسی موجدِ طریقِ تعلیم پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ان علوم میں کسی نبی صاحبِ شریعت کا دوسرے لوگوں سے مشارک ہونا موجبِ نقص ہے اور ممکن ہے کہ اس صورت میں اس کی تعلیم افرادِ امت کے نزدیک کوئی محبت تسلیم نہ کی جائے۔ چنانچہ ہر ایک نبی صاحبِ شریعت علومِ دنیویہ سے مستفید نہیں ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیم نے بڑے بڑے علماء و فضلاء اور ماہرانِ فنون کے علوم و فنون پر غلبہ پایا۔ بہر حال یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم دنیوی علوم و فنون کی تعلیم نہیں ہوتی +

(سوال) تو ایخ سے ثابت ہے کہ کتابِ سماویہ سے بھی اس امر کا پتہ ملتا ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام نے فنونِ دنیویہ کی تعلیم بھی اُمت کو دی۔ مثلاً حضراتِ ادیس۔ لقمان۔ سلیمان علیہم السلام نے فنِ حدادی۔ سنخاری۔ اصولِ فنِ تعمیر وغیرہ کو دنیا میں

لے آئے نیز جنابِ خدا میں یوں استمداد کرو گے کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم میں درجہ +

رواج دیا اور خود قرآن مجید کی تعلیم بعض علوم دنیویہ مثلاً اصول سیاست ملک اصول تمدن وغیرہ پیش کرتا ہے۔

(جواب) یہ واقعی صحیح ہے۔ مگر گفتگو اس امر میں ہے کہ انبیاء جو صاحب شریعت گذرے ہیں۔ ان کی بعثت کی حقیقی غرض صرف تعلیم روحانی تھی اور ان کا افراد امت کو بعض علوم و فنون کی طرف توجہ دلانا یا ان علوم و فنون کے اصول سے آگاہ کرنا بالعرض تھا اور اس بالعرض سے بھی غرض اصلی یعنی تربیت روحانی کی تکمیل مقصود تھی پس انبیاء علیہم السلام کا ان علوم کی طرف متوجہ ہونا ان کی بعثت کا مقصود اصلی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اصول سیاست و تمدن و معاشرت پر بھی تعلیم روحانی کا رنگ چڑھایا گیا ہے۔ اور سب میں وعدہ و وعید کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جو صاف اس امر پر دلالت ہے کہ انبیاء علیہم السلام صرف روحانی معلم ہوتے ہیں۔ اور ان کی ایسی تعلیم کے مالک ہوتے ہیں جو کسی غیر سے حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر دنیویہ تعلیم انبیاء کا مقصود اصلی ہوتی۔ تو تمام ایجادات جو دہرہ بردہ ترقی پذیر ہیں۔ بزمانہ نبوت درجہ تکمیل کو پہنچ گئی ہوتیں +

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کی تعلیم کا ماخذ وحی آسمانی ہوتی ہے کیونکہ اگر دیگر علوم و فنون کی طرح ان کی تعلیم بھی اکتسابی ہو جو بتدریج کسی بشر سے حاصل کی جاسکتی ہو تو ان کی تعلیم کو کبھی حجت قطعی قرار نہ دیا جاتا۔ کیونکہ اس صورت میں یہ سوال قائم ہوتا ہے کہ جب تمام اکتسابی علوم کی بنیاد انسانی تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے۔ تو پھر اس نبی کی تعلیم کا مان لینا کیوں حجت ہوا کیونکہ ہر ایک انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ فلاں رائے صحیح نہیں۔ اور فلاں رائے درست ہے۔ اس طرح کسی کی بات بھی حجت نہیں ٹھہر سکتی۔ مگر جب یہ مان لیا جائے کہ نبی کی تعلیم اکتسابی نہیں ہوتی۔ بلکہ بذریعہ وحی یا رگاہ رب العزت سے بنی کو دی جاتی ہے تو پھر مذکورہ بالا سوال کا بالکل قلع و قمع ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں اگرچہ کسی شخص کو تعلیم نبی کے بعض امور کی تفصیلی شرح نہ بھی معلوم ہو سکے تو بھی اس پر وہ تعلیم حجت ہوتی ہے جس کے انکار کی صورت

میں وہ حکم خدا کا نافذ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ نفوذ باندھنا مگر سوال یہ ہے کہ وحی کیا چیز ہے؟
(۵) حقیقت وحی کے بیان کرنے میں محققین نے دو مسلک اختیار کئے ہیں۔

(۱) نظر و استدلال یعنی براہین عقلیہ

(۲) کشف و شہود

طریق اول کا سمجھنا مشکل نہیں۔ مگر اس طریق سے جو علم انسان کو حاصل ہو سکتا ہے وہ صرف حقیقت وحی کے اقراء تک ہی محدود ہوتا ہے۔ طریق ثانی کا سمجھنا دشوار ہے مگر جو علم اس طریق پر انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ اسرار و معارف روحانیہ پر مشتمل ہوتا ہے گویا طریق اول اور طریق کشف میں خیر اور معاینہ کی نسبت ہے۔ طریق استدلال میں اظہار خیالات سادہ اور حقیقی الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ مگر طریق کشف میں عموماً معانی کو بر طریق تمثیل و استعارہ بیان کیا جاتا ہے جس کے سمجھنے کے لئے خاص خاص لوگ ہوتے ہیں۔ اس طرز بیان میں بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ جن کی تشریح کے لئے کوئی دوسرا موقع ہے۔ طریق اول مزاوت علوم رسمیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اور طریق ثانی مجاہدت و ریاضت سے حقیقت وحی کو پہلے نظر و استدلال کے قواعد پر جانچنا چاہیے۔

(۶) ہم لکھ چکے ہیں کہ انسانی کمالات کی دو صورتیں ہیں۔

جسمانی کمالات کی رُو سے انسان دیگر حیوانات سے کسی امر میں امتیاز نہیں رکھتا مگر روحانی کمالات ایک ایسا امر ہے جو انسان کے لئے مابہ الامتیاز ہو سکتا ہے۔ چونکہ کل موجودات دو قسم پر منقسم ہے۔ مادی۔ غیر مادی۔ اس لئے فطرتاً ہی اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی مخلوق مادی اور غیر مادی کا مجموعہ بھی ہونا چاہیے۔ سو وہ حضرت انسان ہے۔ اس کی

مجاہدت و ریاضت سے یہ مراد نہیں کہ کوئی اندھا و عذر عبادت شروع کر دی جائے بلکہ سب سے پہلے قرآنِ مجید کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اعمال نادان خلوت نشین۔ بہم برزند عاقبت کفر و دیون۔ بعد ازاں یہ تعلیم عادت کامل اعمال تصنیف و تزکیہ باطن کی پابستہ کی ہے۔ ۱۲۔ منہ +

ایک جہت تو عالم مادی سے تعلق رکھتی ہیں اور دوسری عالم غیر مادی سے ہے
آدمی زادہ طوطہ سمجھتے ہیں۔ کتہ فرشتہ سرشتہ و ز حیوان

جس طرح حادوات میں بعض ایسی اشیاء نظر آتی ہیں جو بعض دیگر حادوی اشیاء سے اپنے کمالات
فطریہ میں بڑھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح نباتات میں اور پھر اسی طرح حیوانات میں مثلاً پتھر کے مختلف
اقسام یکساں خاصیت اور یکساں قدر قیمت کے نہیں ہو سکتے اسی طرح افراد حیوانات نباتات
اپنے اپنے کمالات کی رُو سے یکساں رتبہ نہیں رکھتے۔ ان کو جامع کمالات صرف اس حیت
سے کہا جاتا ہے کہ وہ تمام حادوی نباتاتی حیوانی کمالات کا مالک ہوتا ہے لیکن وہ صرف مادی
موجودات کے کمالات کا جامع نہیں بلکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس میں غیر مادی مخلوقات
کے کمال حاصل کرنے کی استعداد بھی دولت رکھی گئی ہے۔ جنکو روحانی کمالات سے تعبیر کیا جاتا
ہے۔ یہ روحانی کمالات کچھ تو کسی رتبے میں جن کے حاصل کرنے کی قابلیت اس کی ذات میں
موجود ہوتی ہے اور بذریعہ تعلیم و تعلم حاصل کئے جاتے ہیں اور کچھ وہی یعنی خداوند کریم کی محض
حنایت کاملہ پر مبنی ہوتے ہیں مگر وہی کمالات، مبادی فیاض یعنی ذات باری کی طرف سے دیں
عائد ہوتے ہیں جہاں قوی فطریہ آغاز وجود ہی سے قابل فیضان الہی پیدا کئے جاتے ہیں چنانچہ
نبوت کو ائمہ متحققین کمالات وہی پر مبنی کرتے ہیں مگر بعض اہل فلسفہ جو حقیقت ملائکہ کا انکار
کرتے ہیں انہوں نے نبوت کو فطرت الہی کی ایک علیٰ سے اعلیٰ حالت پر محمول کیا ہے
جو مبدع معارف و حقائق ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال اکثر ان متکبرین کا ہے جنہوں نے حقیقت
نبوت کو کفار یورپ کی فلاسفی سے موازنہ کیا ہے اور تعلیم قرآن کی طرف توجہ نہیں کیا اسے
نہیں سمجھا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی گفتگو میں اکثر لفظ ملکہ نبوت کا استعمال کرتے ہیں۔ خود کرنے
سے معلوم ہوگا کہ یہ لفظ ہیبت سی خرابیوں کا مستلزم ہے۔ اور کسی ایک ایسے امور کے انکار پر
یعنی ہے جن کے بغیر کوئی مسلمان خالص الایمان نہیں ہو سکتا۔

(۷) علماء کا خیال ہے کہ انسانی قوی کی ترتیب میں اور اک کے لحاظ سے تفاوت ہے

یعنی ہمارا ادراک پہلے پہلے حواس خمسہ ظاہری سے شروع ہوتا ہے مثلاً ہماری قوت باصرہ پہلے کسی چیز کا ادراک کرتی ہے اور جو صورت حس مشترک میں منتقل ہوتی ہے وہ بذریعہ تخیل قوت متفکرہ تک پہنچتی ہے اور قوت متفکرہ سے قوت عاقلہ تک قوت عاقلہ میں حقائق و معانی کلیہ جو لوازم مادہ سے پاک ہوتے ہیں جمع ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ بیرونی اشیاء کا ادراک ہیں اس صورت سے ہوتا ہے جو کسی شے کی اصلی صورت ہوتی ہے۔ مگر قوت عاقلہ میں اس شے کی حقیقت آتی ہے جس میں وضع مکان رنگ طول عرض عمق وغیرہ لوازم مادہ نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس وہ حقائق جو لوازم مادہ سے بری ہیں قوت عاقلہ سے قوت متفکرہ اور قوت متفکرہ سے تخیل و تخیل سے صورت مثالیہ مادیہ میں آتی ہیں۔ گویا پہلی ترتیب نیچے سے اوپر کو جاتی ہے اور دوسری اوپر سے نیچے کو آتی ہے۔ طرح مکان کے صحن سے کوٹھے کی سطح پر جانے اور کوٹھے کی سطح سے صحن میں آنے کا فاصلہ ایک ہی ہے۔ مگر ترتیب نزول اور صعود کے لحاظ سے تفاوت ظاہر ہے قوت عاقلہ جب اپنے سے نیچے قویٰ کو کچھ افادہ کرتی ہے۔ تو اسے مثالی صورت میں افادہ کرتی ہے۔ اور جب خود ان قویٰ سے کسی چیز کو لیتی ہے۔ تو لوازم مادہ سے بالکل مجرد کر کے اخذ کرتی ہے۔ نیچے سے اوپر کی طرف صعود اہل نظر و استدلال کا کام ہے اور اوپر سے نیچے کی طرف اتالیقی حقائق کو ان کی مثالی صورت میں لا کر دوسروں کو افادہ کرنا ان لوگوں کا خاصہ ہے جن کے نفوس قدسیہ کو عالم غیر مادی سے بلا واسطہ تعلق ہے +

(۸) حکماء جس طرح عالم مادی میں سلسلہ موجودات کی ایک ترتیب قائم کرتے ہیں اسی طرح قویٰ ذہنیہ میں سلسلہ ترتیب کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ کا آغاز محسوسات خارجیہ سے ہوتا ہے اور اس کا خاتمہ قوت عقل پر + ان کا خیال ہے کہ جو لوگ نفوس قدسیہ کے مالک ہیں انہیں عالم غیر مادی سے بلا واسطہ اتصال ہوتا ہے۔ اس اتصال سے وہ حقائق کو اخذ کرتے ہیں وہی حقائق جوں جوں نیچے قویٰ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں لوازم مادیات آتے چلے جاتے ہیں اور چونکہ حقائق کا افادہ دوسروں تک اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مادی مثالی صورت

میں آئیں اس لئے بعض اوقات وہ حقائق کو اذکار کی صورت میں سنتے ہیں اور بعض اوقات کسی شخص کی صورت میں دیکھتے ہیں جو ان سے ہم کلام ہوتا ہے اور سننے والے یا دیکھنے والے کو یقین ہوتا ہے۔ کہ اس کو عالم غیر مادی سے ان کا افادہ ہو رہا ہے۔ ایسے حقائق عام ہیں۔ خواہ وہ زمانہ گذشتہ سے متعلق ہوں یا زمانہ حال یا مستقبل سے یہی وجہ ہے کہ نفوس قدسیہ والے اصحاب اکثر امور غیبیہ کی خبر دیا کرتے ہیں اور جب یہ لوگ غیر کو ان حقائق کا افادہ کرتے ہیں تو غیر کی طبیعت کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اور اسی قابلیت کے مطابق یہ مضمون تکلمہ والناس علی قدر عقولہم فیضان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ بصورت دیگر بعینہ وہی مثال ہوگی جیسے نئے شیر خوار بچہ کو جو سوا دودھ کے کچھ کھانا نہیں سیکھا کوئی تھقیل غذا کھلا دی جائے اور وہ بیمار ہو جانے بلکہ بسا اوقات اس کے مر جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ مگر ایک زمانہ گزرنے پر وہ خود بخود ایسی غذا کا عادی ہو جاتا (۹) حکمائے نفس ناطقہ انسانی کا اتصال عالم غیر مادی سے اس طرح پرتابیت کیا ہے کہ ہم عالم کائنات میں ایک سلسلہ دیکھتے ہیں جو اصول تشابہ پر قائم ہے یعنی اشیائے عالم کو اس طرح پر خداوند کریم نے ترتیب دیا ہے کہ جو اشیاء بہت سے خواہ میں مشترک ہیں وہ ترتیب میں متصل رکھی گئی ہیں مثلاً جادوی اشیاء کا اعلیٰ درجہ نباتی اشیاء کے پچلے درجہ سے اور انسان کا اعلیٰ درجہ حقائق غیر مادیہ یا ملائکہ سے متصل ہے اور جس طرح سیط اشیاء مادیہ ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کی طرف متغلب ہو جاتی ہیں مثلاً پانی بمثل ہوا متغلب ہو جاتا ہے۔ اور علیٰ ہذا باقی عناصر میں بھی کون و فساد و بدمقہ جاری ہے۔ اسی طرح نفس ناطقہ انسانی میں حقیقت ملائکہ کی طرف متغلب ہو جانیکی استعداد و ولایت رکھی گئی ہے۔ اسی انقلاب سے وہ ان حقائق کو محال کرتا ہے جن کا بواسطہ جو اس خمسہ ظاہری ادراک نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو اس ظاہری صرف مادی اشیاء یا ان کے متعلقہ امور کا ادراک کر سکتے ہیں مگر جب نفس انسانی بصورت ملائکہ متغلب ہو جاتا ہے تو اس وقت محض ادراک و تعقل بن جاتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں وہ لوازم جسمانی سے جو ادراک خالص سے مانع ہوتے ہیں بالکل پاک و صاف ہوتا ہے۔

اور یہ حالت صرف نفوسِ قدسیہ سے مخصوص ہے اس حالت میں نفس کو بغیر وساطتِ حواسِ خمسہ کے ادراک ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کو ملاءِ اعلیٰ یعنی عالمِ ملائکہ کے اعلیٰ اُفق یا بالاترین درجہ تک ترقی ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اس پر تمام حقائق کا انکشاف کلی طور پر ہو جاتا ہے انہیں حقائق کو جب مداحِ جہانی کی طرف رجوع کرتا ہے تو مثالی جسمانی صورتوں میں جو ان حقائق سے مناسبت یا مشابہت رکھتی ہیں ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ وہ حقائق اپنی اصلی کیفیات میں ناگاہی کی جاسکتیں۔ بہر حال علماء کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ نفسِ انسانی کو عالمِ غیر مادی سے تعلق پیدا ہوتا ہے جس سے وہ ان معارف و حقائق کو محال کرتا ہے جن کے ادراک کے لئے حواسِ کام نہیں کر سکتے کیونکہ حواس صرف مادیات تک مسوس کر سکتے ہیں۔

درحقیقت جس شخص نے تعلیمِ انبیاء میں پورا پورا غور کیا ہو اس پر واضح ہو جائیگا کہ خداوندِ کریم کی حکمتِ کاملہ اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی معرفتِ اہل دنیا کو اصلاحِ معاد و معاش کی تعلیم دے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو انسان دیگر حیوانات سے زیادہ فیضیلت کا مالک نہیں تھا۔ کوکلا العلمہ لصار الناس کالبھائم۔ درجہ اس کی یہ ہے کہ دیگر علوم و فنونِ جہانی آسائش اور تربیت اور انتظام کیلئے ہیں۔ جن سے انسان معرفتِ ذاتِ باری کے منازل تک ترقی نہیں کر سکتا۔

مذکورہ بالا سطوریں لکھا گیا ہے۔ کہ نفسِ انسانی کو عالمِ ملائکہ سے اسی طرح اتصال حاصل ہے جس طرح محسوسات میں ایک کرہ عنصر دوسرے کرہ عنصر سے ملا ہوا ہے۔ اور اسبابِ مناسبہ پر جب ایک عنصر دوسرے عنصر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے مگر انقلابِ مذکورہ بلحاظ صعود و نزول کے متفاوت ہے۔ بعض نفوس کو بدرجہ غایت صعود ہوتا ہے اور بعض کو اس سے نیچے درجہ تک اور بعض دیگر کو اس سے بھی کم علیٰ ہذا القیاس۔ بہر صورت اس انقلاب کو حکمائے تسلیم کیا ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اس مقام پر حسب ذیل لکھا ہے:-

بلکہ اگر علمِ معرفتِ ذاتِ بذلیہ دینی اہل دنیا کو دلتا تو اہل دنیا چوپائے سمجھے جاتے۔ ۱۲ منہ +

انبیاء کا گروہ فطرتاً ایسا ہوتا ہے کہ ان میں بشریت سے ملکیت کی طرف منتقل ہونے کا خاصہ موجود ہوتا ہے وہ ایک ن کی آن کیلئے مالک کی حقیقت کو روحانیت کے افق اعلیٰ میں پہنچ کر چل کر لیتے ہیں اور کلام انسانی اور خطاب الہی کو سنتے ہیں۔ اسی حالت کا نام حالت الوحی ہے۔ خدا نے ان لوگوں کو شروع پیدائش ہی میں ایسا پیدا کیا ہوتا ہے۔ کہ لازم مادیات جو انسان کو بوجہ تعلق بدن گھیرے ہوئے ہیں۔ انہیں ملکیت کی طرف منتقل ہونے سے مانع نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ان کی فطرت سے اعتدال و استقامت و رغبت عبادت وغیرہ جو لازم ملائکہ ہیں لازم ہوتے ہیں اور اسی اعتدال و استقامت کی وجہ سے ان کے نفوس قدسیہ کا میلان حقیقت ملکیت کی طرف ہوتا ہے۔ یہ حالت کسی نہیں اور نہ محنت اور کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے۔ بل ذالک فضل اللہ یؤتیه من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب پھر لکھتا ہوں کہ اکثر اہل فلسفہ نے حقیقت نبوت کو ملکہ فطری سے تعبیر کیا ہے۔ گویہ خیال قدیم سے چلا آتا ہے کیونکہ رسائل تسعہ شیخ بوعلی سینا میں اسکی تشریح بخوبی کی گئی ہے۔ اور اسی مقام پر شیخ نے حقیقت ملائکہ پر بھی بحث کی ہے جس میں اس نے واضح الفاظ میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ کہ عرف شریعت میں قونی کو ملائکہ کے نام سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں۔ اور نبوت کو ملکہ استعداویہ لکھا ہے اور صرف شیخ ہی نہیں۔ بلکہ دیگر اہل فلسفہ بھی جنہوں نے یونانی لافانیوں کی کاسہ لمبی کی ہے ایسا ہی لکھتے ہیں اور ہے زمانہ میں سید احمد خان صاحب بالقابہ نے اس خیال کو خواہ بہ تقلید فلاسفہ یونان خواہ باتباع ملحدان یورپ اپنی مختلف تحریرات میں شائع کیا ہے۔ مگر مجھے سخت تعجب ہے سید صاحب کے اس قول پر کہ وہ اپنے رسالہ تحریر فی اصول تفسیر میں اس امر کے مدعی ہیں کہ یہ مسلک صرف انہیں کا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس مقام پر اپنا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

زنجبر ل میں قرآن بہ پیچائے نمی خواہم - ہمہ گفتار مشوق است قرآن کہ من دارم
جس شخص کو سید صاحب کے مذکورہ بالا قول کا ماخذ معلوم کرنا ہے اسے لازم ہے کہ

وہ رسائل شیخ رئیس اور رسائل اخوان الصفا کا مطالعہ کرے۔ یہ وہی خیال ہے جو دیگر بہت سے امور کا انکار اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ اگر نبوت کو ملکہ فطری تسلیم کر لیا جائے۔ تو پھر ملائکہ اور معجزات اور شجرہ جانی وغیرہ امور کی ان حقیقتوں سے انکار کرنا لازم ہو جاتا ہے جبکہ پورے نصوص آیات و احادیث آج تک جمہور علماء سلف و خلف تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اسی غرض کی پیش رفت کے لئے سید صاحب نے اس خیال کو کتب فلاسفہ سے اخذ کیا۔ اور اسے غلیط سمجھ کر تمام معتقدات صحیحہ کی مخالفت شروع کی۔

اہل اسلام اور محدان فلاسفہ کے درمیان اس مسئلہ کی حقیقت کا اختلاف کیا ہے بلکہ ان فلاسفہ تو ہمیں تک محدود رہتے ہیں کہ بعض نفوس ان نیا فطرتا ایسے پاکیزہ اور لطیف ہوتے ہیں کہ ان میں دیگر نفوس کی نسبت بہت سی خصوصیات ہوتی ہیں جس طرح ایک ہی قسم کی مہنی اشیاء کہ ان کا مادہ تو ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر خصوصیات میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اور اسی فطری کمال پر انبیاء علیہم السلام حکمت و دانش کا منبع ہوتے ہیں۔ اور کوئی چیز خارج سے ان کے نفس پر انعقاد نہیں کی جاتی بلکہ وہ اندہی سے پیدا ہو کر بصورت الفاظ نبی کے دل پر نقش ہوتی ہے جن کو وہ دوسروں تک پہنچاتا ہے اور یہ جو احادیث میں آیا ہے کہ فرشتہ شکل ان میں مشتمل ہو کر جناب پیغمبر علیہ السلام کو وحی سناتا تھا۔ اس کی نسبت سید صاحب بتقلید دہریان یورپ یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ محض قوت و اہمہ کے غلبہ کا اثر ہے مثلاً جب کوئی خیال کسی شخص پر غالب آ جاتا ہے تو اسی کی صورت ذہن کے سامنے پیش ہو کر آ موجود ہوتی ہے اس حالت کو وہ ایک دیوانہ کی سی حالت سے تعبیر کرتے ہیں جو خوبط الحواس ہوتا ہے۔ خیر یہ تو ملاحظہ

لے ہر ایک ملان کا فرض ہے کہ اپنے معتقدات کو درست کرے اور کبھی کسی غیر شخص کی تقلید میں کسی اعتقاد کو صحیح نہ سمجھے خواہ وہ کوئی ہو۔ بلکہ قرآن مجید و سنت صحیحہ کو معیار مقرر کر کے جمہور علماء امت کا طریق اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ معتقدات کا فاسد ہونا بہت بڑا خطرناک مرض ہے۔ چنانچہ بعض خرافہ کتب احادیث میں لکھا ہے کہ اعمال ناسدہ سے ان کو خود فی اللہ نجات نہیں ہوگا۔ مگر معتقدات باطلہ سے وہ عذاب دائمی میں گرفتار رہیں گے۔ لیکن جو لوگ سالہا سال سے اس مرض میں مبتلا ہیں۔ ان کا راہ راست پر آنا واقعی سخت و تنہا امر ہے۔ ۱۲ منہ +

یورپ کے خیالات ہیں جنکو گاہ و بیگاہ محض بوجہ تعصب انہوں نے اپنی تصنیفوں میں شائع کیا ہے مگر افسوس کہ سید صاحب نے مسلمان ہو کر ان کی پیروی کر لی اور اکابر ائمہ محققین پر عجائب پرستی کا الزام لگایا۔ یا ایک موقع پر بطور طنز آپ لکھتے ہیں کہ خدا ایسے عجائب پرستوں سے بچائے مگر میں کہتا ہوں کہ خدا آپ جیسے منکرین سے بچائے۔

جہور ائمہ مذہب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نبی کی فطرت واقعی تمام انسانی فطرتوں سے اشرف و الطیف ہوتی ہے جس میں قبول فیضان وحی کی استعداد مضمر ہوتی ہے۔ اس کی فطرت میں طبعاً توحید اور عبادت اور اعمال حسنہ کی صلاحیت بطور ولایت رکھی جاتی ہے۔ چنانچہ صاحب فتح الباری شارح صحیح بخاری باب بدر الوحی کے ایک مقام پر ابی عبد الملک بونی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔ ان الله تعالى فطر محمد على التوحيد ولقبى اليه الاوثان ووهب له اسباب النبوة..... الخ (خداوند کریم نے جناب پیغمبر علیہ السلام کی فطرت توحید پر پیدا کی اور بت پرستی کو آپ کے دل میں مبغوض بنادیا اور آپ کو نبوت کے اسباب عطا کئے) مگر کمالات نبوت اور دیگر لوازم جو اس منصب حلیل سے خاص ہیں بطور مہبت الہی بعد میں جناب باری سے عطا کئے جاتے ہیں جس طرح خالص سونا کان میں اسی طرح پیدا ہو رہا ہے جس طرح ناقص سونا مگر اس خالص کو سنار نے اپنے طریق معبود پر بالکل پاک و صاف کر لیتا ہے اور یہی معنی ہیں۔ آیہ۔ و علمنه من لدنا کے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم نے فطرتاً اس کو پیدا کیا ہے کہ خود بخود اس کے اندر سے بلا تعلیم وحی اسرار و معارف ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ کمال فطری اور چیز ہے اور کمال وحی اور۔ یہ ایک بھاری غلطی ہے جو سید صاحب سے وقوع میں آئی۔ اور غالباً انہوں نے قرآن مجید کی آیہ "وَرَفَعْنَا عَلَى نُورٍ كَافٍ" طور پر غور نہیں کیا۔ قال الشيخ الاکبر فی تفسیرہم الایہ۔ هذ المشرق بالاصناء مِنَ الکمال الحاصل نُورٌ دَائِدٌ عَلَى نُورٍ لَا اسْتِقْدَادَ الثَّابِتِ الْمَشْرِقِ فِي الْاَصْلِ كَانَهُ نُورٌ مُتَصَاعَفٌ۔ اس

لہ یہ نور جو بذریعہ اشراق وحی بصورت کمال نبوت آپ کو حاصل ہوا ہے۔ اس قدر استقلالیٰ فطری نور سے زائد ہے۔

عقیدہ کو اچھی طرح سے سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اسی پر تمام منازل روحانی کی بنیاد قائم کی گئی ہے اور اہل فلسفہ کی لغات میں پر نہیں جانا چاہئے جو کلام الہی کو توڑ مروڑ کر ایک ایسی بات پیدا کر لیتے ہیں جس کو وہ بہ اتباع نفس چھوڑ نہیں سکتے۔ آیہ افرأیت من اتخذ الہہ ہواہ کا بخیر اس کے کچھ مفہوم نہیں ہو سکتا۔ کہ کوئی شخص کسی حکم شریعت کو خواہ وہ معتقدات کے متعلق ہو یا عملیات کے اپنی ہوائے نفس کے مطابق موازنہ کرنا چاہئے۔ اور درحقیقت یہ ایک بڑی خطرناک حالت ہے جو موجب سلب ایمان ہو جاتی ہے اور اس سے بہت کم لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص تسلیم نہیں کرتا کہ وہ اہل بدعت و ہوا میں سے ہے بلکہ وہ دوسروں کو ایسا خیال کرتا ہے۔ اس لئے از الہ مرض و شوار ہو جاتا ہے۔ اللہم احفظنا۔

۱۱۔ لفظ وحی لغت میں حسب ذیل معنی میں مستعمل ہوا ہے :-

پوشیدہ طور پر کسی کو آگاہ کرنا۔ لکھنا۔ لکھا ہوا۔ بھیجنا۔ کسی بات کا دل میں ڈال دینا۔ امر۔ ایما۔ اشارہ۔ بتدبیر آواز نکالنا۔ کوئی چیز جس کے ذریعہ کسی دوسرے شخص کو کسی بات کا پتہ دیا جا سکے۔ مگر اصطلاح شریعت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی پر شریعت کے نازل کر نیکے لئے لفظ وحی کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اور جو کلام اس طرح نازل ہو اس کو بھی وحی بول دیتے ہیں یعنی مصدر کو بمعنی اسم مفعول استعمال کر لیتے ہیں۔ جو محاورہ عرب میں عام طور پر جاری ہے۔

۱۲۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو مختلف طریق سے وحی ہوتی تھی۔ اور ہمارے جناب رسول مقبول علیہ السلام تمام اقسام وحی کے مورو تھے۔ بعض اشخاص نے وحی کی چھالیں صوفیوں میں قائم کی ہیں اور علیحدہ علیحدہ ان میں فرق ظاہر کیا ہے۔ غالباً یہ خیال حدیث الروایۃ الصالحۃ جزء من سنیۃ و اسرار عین جنۃ من النبوت سے ماخوذ ہے

۱۱۔ ہے جو آپ کی فطرت میں دولت رکھا گیا تھا۔ گویا دہر الود ہے ۱۲۔ منہ +

۱۳۔ ناظرین پر واضح رہے کہ تمام اہل فلسفہ کا یہ منہ نہیں ہے بلکہ ایک گروہ اہل فلسفہ کا ہے۔ اس سب کی تصدیق کرتا ہے ۱۴۔ منہ +
۱۵۔ وہاں صاف لکھی سچا خواب مجملہ چھالیں اجزا نبوت کے ایک جزو ہے +

کچھ ہو میں بہر صورت حقیقت روحی یہ یہاں شرعاً بحث کرنا مقصود ہے۔ قبل اس کے کہ وحی کی مشق
 صورتوں کو زیر بحث لایا جائے اس امر کا ظاہر کر دینا ضروری نظر آتا ہے کہ روئے انسان ایک حقیقت
 مجردہ لطیفہ کا نام ہے جس کو خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے لینے اسماء و صفات کا کامل مظہر
 پیدا کیا ہے۔ اور اس راز کی اصلیت سے آگاہ ہونے کے لئے علم نبوت کا حاصل کرنا ضروری ہے
 اور وہ بدون پابندی کتاب سنت کے کسی شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلی اور ضروری شرط
 یہ ہے کہ اس شخص کے معتقدات بدعات و ہوا کی آلائش سے بالکل پاک و صاف ہو۔ چونکہ یہ اہم
 شرط اکثر لوگوں میں مفقود رہی ہے اس لئے وہ علم نبوت سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے بلکہ بسا
 اوقات قبول حق سے محروم رہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقائق معارف کو علوم
 رسمیہ کی ذیل میں لانا چاہتے ہیں اور عقل جزئی کے محدود عمل کو اس قدر وسیع خیال کرتے ہیں کہ
 کسی حقیقت کا بدون اس کی امداد کے تسلیم کرنا عبث خیال کرتے ہیں مگر قبل ازیں لکھا جا چکا
 ہے کہ چرلغ عقل بشیک انسان کو راہنمائی کا کام ولیکتابہ مگر صرف اسی وقت جبکہ نور وحی
 کا روشن اس میں ڈالا جائے۔ ورنہ عقل جزئی محض ظلمت ہی ظلمت ہے۔ اسی ایک اصل عظیم کی غفلت
 سے مسلمانوں میں بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے۔ متزلزلہ نچر یہ وغیرہ سب ایک ہی تھیلی کے باٹ ہیں اور
 سب کے سب گمراہ۔

یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ نبی جہت بشریت کی رُو سے بالکل دیگر افراد انسانی کے
 ساتھ شریک ہوتا ہے یعنی وہ تمام ضروریات بشریت مثلاً کھانا۔ پینا۔ سونا۔ قضائے حاجت
 آرام۔ تکلیف۔ مرض و صحت وغیرہ امور کا اسی طرح محتاج ہوتا ہے جس طرح دیگر افراد انسانی
 چنانچہ آیہ ما انا الا بشر مثلكم میں اسی جہت بشریت کو بیان کیا گیا ہے بعض نچریوں کو
 میں نے کمالات نبوت اور خرق عادات کے انکار پر یہی آیت پڑھتے سنا۔ یہ لوگ اتنا بھی نہیں
 سمجھتے کہ یہ الفاظ حضور علیہ السلام کے مقام عبودیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کے متصل
 ہی یوحی الیٰ لکھا ہے جس سے حقیقت نبوت کو علیحدہ کر کے دکھایا گیا ہے۔ مگر یہ انکار کوئی

نئی بات نہیں خود زمانہ نبوت میں شکر لیں گے کہا کوئی تھے۔ ما لفظ الرسول یا کل الطعام ویشی فی الا سواق۔ نبی کو دوسری جہت ملکیت کی حامل ہوتی ہے اور اسی جہت پر اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ افق ملائکہ تک ترقی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ حضور علیہ السلام کا اس سے بھی آگے ترقی کرنا ثابت ہوتا ہے کیونکہ معراج میں آپ کو مقام جبرائیلی سے بھی آگے کی سیر کرائی گئی جس کی کیفیت پر سوائے آپ کی ذات مبارک کے کسی کو بھی اطلاع نہیں۔ یہی وہ باتیں ہیں جن کی نسبت بار بار لکھا جاتا ہے۔ کہ علوم رسمیدولے اس میں بحر کوٹھار کے کوئی حید نہیں پاسکتے۔

دریں مشہد کہ انوار تجلی است ۴ سخن درام دلے نا گفتن اولی است
(۱۳) اس امر کو یاد رکھنا چاہئے کہ تمام قوائے عقلیہ انسان کی جہت بشریت سے متعلق ہیں اور وحی نبی کی جہت ملکیت سے تعلق رکھتی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے۔ کہ عینک قوائے عقلیہ اپنے کمال حقیقی کو نہ پہنچ جائیں اور وحی کا حصول فیضانِ نامکمل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حقائق بسیطہ مجردہ یعنی امور روحانیہ غیر مادیہ کو جب تک انسانی فطرت کے سامنے اقبال میں نہ پیش کیا جائے جس کو محسوسات میں فطرت احساس کرنے کی عادی ہے تب تک تعلیم وحی کا افادہ غیر تک نہیں کیا جاسکتا۔ جہت بشریت سے نبی اللہ کو تمام عوارض بشریت لازم ہوتے ہیں۔ منکرین اسی جہت کو مد نظر رکھ کر انکار کر لیا کرتے تھے۔ جس طرح موجودہ زمانہ میں فرقہ شیخریہ اور جہت ملکیت سے بنی ان تمام کمالات روحانیہ کو حاصل کرتا ہے۔ جو قوی عقلیہ کے عمل سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی قوت عقلی سے کیفیات مجردہ اور حقائق بسیطہ کا کچھ تپہ نہیں لگا سکتے۔ ہمارا فرض حقیقت نبوت کی تصدیق کرنے پر صرف ان امور کی اجمالی حقیقت کا اقرار کرنا ہے۔ اور کسی قسم کی محبت بازی نہ کریں ورنہ ہمارا ایمان ایک صحیح الاعتقاد اور خالص موجد کا مسا ایمان نہیں ہوگا۔ ان حقائق کے سمجھنے کیلئے یقین رکھنا چاہئے کہ ہمارے مروجہ علوم فلسفہ سائنس

۱۔ یہ کیسا نبی ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور نازا عدل میں چلتا پھرتا ہے۔ ۱۲۔ البتہ ۴

وغیرہ کچھ کام نہیں دے سکتے۔ اور جن لوگوں نے ان امور پر ان محتاج کو جاننا چاہا ہے وہ باتو انکار تک پہنچ گئے ہیں اور یا انہوں نے ظان واقعہ کسی حقیقت کو اپنی تسلی کے لئے کچھ اور سمجھ لیا شیخ اکبر آیہ لا تحترک بہ لسانک کی ذیل میں فرماتے ہیں ولکن قواک ہا واثۃ ولفسک غائبۃ عن سوسر والوحی یعنی تعلیم وحی کے متعلق اپنے تمام قومی کو ساکن بنے دو اور نفس کو عمل پرورد وحی سے غائب کیونکہ یہ وقت عمل قومی کا نہیں بلکہ قلب پاک پرورد و فیضان الہی کا وقت ہے اسی امر کی طرف اس سے آگے اشارہ کرتے ہیں۔ وقلیلت ما لہا عن صفاتہا الصافی التوجہہ کامل عن حرکت النفس یعنی قلب جو مورد وحی ہے صفات نفس سے پاک رکھو کیونکہ بشریت اپنے قومی طبعیہ کی رو سے متانی قبول وحی ہے اور قلب آئینہ ذرات احدیت ہے۔ اس مضمون کو ایک حدیث قدسی میں یوں ظاہر کیا گیا ہے۔ مَا وَسَعَتِ اَرْضُی وَلَا سَمَآئُی وَلٰکِنْ وَسَعَتِ قَلْبُ عِبْدِی الدِّیْنِ یعنی میری مخلوقات میں سے آسمان اور زمین با آں وسعت بھی میری گنجائش نہیں رکھتے۔ البتہ میرے عباد میں کا قلب میری گنجائش رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کا نزول قلب نبی پر ہوا۔ چنانچہ آیات قرآنیہ سے واضح ہے۔ نہ نفس پر جس سے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ قوائے طبعیہ کو جن کی بحث علم النفس والے کیا کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے سمجھنے میں کچھ خل نہیں لحدان یورپ نے اس نکتہ کو نہیں سمجھا۔ بلکہ وہ قوائے طبعیہ کے عمل کے سوا کئی دوسری حقیقت کے قائل نہیں۔ مگر مقدس اسلام کی رو سے یہ خیال زندہ اور کفر ہے۔ افسوس کہ ان کی تقلید میں اس زمانہ کے بعض مسلمان بھی ملحد بن گئے۔ اِنَاللّٰہُ وَاِنَالِیْہِ سَلٰجِعُوْنَ ۝

اس دعویٰ کی تصدیق سورہ والنجم کی آیت اَتَمَّارَہُ سے کر لو۔ کیونکہ مخالفین کمالات نبوت کا انکار محض اپنی محدود عقول اور علوم حکمیہ کی بنا پر کرتے تھے اور قوی طبعیہ کے عمل میں حجب نہیں کوئی ایسی بات جو مافوق العادۃ ہو نظر نہیں آتی تھی تو جھٹ اِخْبَارِ عَنِ الْعِیْبِ

اے جب ہم تجھ پر وحی کریں تو جب تک فرشتہ پورا نہ پڑھ ستائے زبان کو مت حرکت دیا کرو۔ جناب پیغمبر بعض غلط غلطایا کیا کرتے۔ خداوند کریم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ۱۲۱۳ھ ۝

حشر جہانی معجزات وغیرہ امور کا انکار کر دیا کرتے۔ اور حجت بازی سے کام لیتے۔ مگر علمائے تعالیٰ کی طرف سے انہیں یوں سنایا جاتا تھا بل کذب و الباطل مجبیطو العلمیہ یعنی ان لوگوں نے محض نادانی اور حقیقت الامر کے مافوق الافہام ہونے کی وجہ سے کمالات وحی کا انکار کیا ہے کیونکہ ان کی عقلیں عالم مادی کے روزمرہ قوانین جاریہ فطرت میں اس قدر منہمک ہو گئی ہیں کہ روحانیات اور لذات روحانیہ سے انہیں کچھ حصہ بھی نہیں ملا اور چونکہ یہ لوگ حقائق و معارف سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے اور اپنے فرضی توہمات فلسفیانہ کو حجت قطعی سمجھ بیٹھے ہیں جن کی حقیقت میں باطل کا حصہ شامل ہے اور حق بہت کم یا بالکل مفقود ہے۔

انہیں تعلیم وحی کے انکار کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہو سکتا۔ الناس اعداء مصلحہوا الانسان جس چیز کی حقیقت سے بے خبر ہوتا ہے اس کا دشمن ہوا کرتا ہے۔ یہی حال ہمارے زمانہ میں ان لوگوں کا ہے جو علوم مروجہ کو تعلیم وحی کا معیار قرار دے لیتے ہیں اس لئے تنگدو کے موقع پر جھٹ بول اٹھا کرتے ہیں کہ وہ دین ہی کیا ہے جس کی بنا عقل لسانی پر قائم نہیں لگائی مگر محض صفت یہ ہے کہ جن لوگوں کی عقل کو بطور معیار پیش کیا جاتا ہے ہم سے حجت تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ان میں سیکڑوں ایسے بھی ہیں جو نماز و روزہ وغیرہ ارکان اسلام کو نہ صرف غیر ضروری کہتے ہیں بلکہ ان احکام اور ان کے بجالانے والوں کی اہانت کرتے ہیں پس عقل سے مراد وہی عقل ہو سکتی ہے جو شریعت محمدیہ کے صحیح معتقدات اور عملیات سے تربیت یافتہ ہو۔ اور اگر کسی کافر فلاسفہ باز مذہب نچری کی رائے کو تم پیش کرو گے تو ایسی رائے اور صاحب رائے پر ہم ہزار ہزار لعنت بھیجنے کو تیار بیٹھے ہیں اور اسے ہم اپنا ایمان سمجھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ جارا خاتمہ اسی جہیت اور غیرت پر ہو جس کو ایک جاہل بے خالتصب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہ۔ کلامیہ ۴

شیخ اکبر نے بھی مذکورہ بالا رائے کی تصدیق کی ہے چنانچہ آیۃ اقسام وفتہ کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ افتخار صمودہ علی شئی لا تھمونه ولا یسکنکم معرفتہ و تصورہ تکبیر

یہ کہ تم قیامت الحجۃ علیہ وانہا المخاصمة حیث یسکن تصودہ للامر المختل فیہ
ثم لا احتیاج علیہ بالتفی والاثبات فحیث لا تصورہ فلا مخاصمة حقیقۃ
اس عبادت سے منکرین وحی کا پورا پورا استیصال ہو جاتا ہے اس لیے جن ملحدین نے وحی کو
قوائے طبیعہ کے عمل تک محدود رکھ کر مکمل نبوت سے تعبیر کیا ہے انہوں نے اللہ اور اللہ کے
رسل پر ایک ایسا ہمتان باندھا ہے (عبدالکائن اذ خطا) جس کی مثال نہیں +

(۱۲) اور آئیے وہاں کائنات پر مشتمل الخ میں خدا کے عزوجل نے اپنے بندوں سے
کلام کرنے کے تین طریق بتائے ہیں (۱) وحی - (۲) من وراء حجاب (۳) ارسال رسول +
ان الفاظ کی تفسیر میں علمائے اختلاف کیا ہے مگر صاف دوہتین تفسیر یہی ہے کہ لفظ وحی
سے روئے صادقہ اور الہام مراد ہیں جو کمالات نبوت کے لیے ابتدائی مراتب ہیں۔ مثلاً
ابراہیم علیہ السلام کا خواب۔ اور لفظ وراء حجاب (پیدہ کے پیچھے) اسے یہ مراد ہے کہ صرف
سنانی سے اور آواز دینے والا نظر نہ آئے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو فاستمع لہا یوحی
کا حکم ہوا تھا +

تیسرے طریق ارسال رسول ہے مثلاً جبرائیل علیہ السلام کا جسور بنی اللہ تشریف لاکر دینے
اس طرح ہر کلام ہونا جس طرح دواوی آپس میں بالتقابل گفتگو کرتے ہیں۔ یا ایک کہنے والا
اور دوسرا سننے والا ہو۔ چنانچہ جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں جبرائیل علیہ السلام وحی کلمی جانی
کی صورت میں تشریف لایا کرتے +

اس سے منکرین انکار تم جناب پیغمبر علیہ السلام سے ایسے امر (وحی) کی بات جھگڑتے ہو جس کو تم نہ تو سمجھتے ہو اور نہ
ممکن ہے کہ تمہیں اس کا تصور بھی ہو سکے۔ جب یہ حال ہے تو اس کے دعویٰ کے برخلاف تم کیا دلیل قائم کر سکتے ہو۔ کیونکہ
مناظرہ کی صورت تو دین قائم ہو سکتی ہے جہاں امر مختلف فیہ کی حقیقت کا تصور ممکن ہو۔ پھر اس کے برخلاف نفی و
اثبات کا حکم لگایا جائیگا۔ اور یہاں اس کی حقیقت کا ہی یہ نہیں وہاں کوئی دلیل بھی نہیں مل سکتی۔ ۱۲ منہ +
اسے معلوم نہیں منکرین ملائکہ اس تیسرے طریق کی کیونکر تاویل کرتے ہیں اور وہ ہر طریق میں کیونکر تمیز کرتے ہیں جابکہ
وہ ملائکہ کا وجود تسلیم نہیں کرتے + ۱۳ منہ +

واضح ہو کہ وحی کا لفظ بعض افقات عام معنی میں اس طرح استعمال کر لیا کرتے ہیں جس میں ہر سر
طرفی مذکورہ بالا دو غل ہو سکیں چنانچہ آیات قرآن مجید میں یہ استعمال عام ہے۔ مگر چونکہ اس آیت میں
کیفیت اقسام وحی کا پیش کرنا مطلوب تھا۔ اس لئے بطور ترتیب تدبیر کی نیچے سے اوپر پیرف
ترقی کر کے کیفیت وحی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ہر سر اقسام مذکورہ بالا میں سے ہر ایک بجائے خود
علیحدہ علیحدہ تشریح کا محتاج ہے۔

جب سے اہل یورپ نے مادی دنیا میں اپنا دائرہ علم وسیع کر کے علوم طبیعیات کے نیچے
بڑے اعلیٰ درجہ کے اصل وضع کئے ہیں اور سلسلہ سبب و مسبب کی ضرورت پر اپنی تمام توجہ
کو مبذول کر دیا ہے تب سے یوں سمجھنا چاہیے کہ علوم نبوت کی طرف سے ان کی توجہ بالکل
ہٹ گئی اور جہاں جہاں وہ علوم پہنچے عوام الناس کی طلبائے پر ان علوم نے اپنی پوری
پوری حکومت قائم کر لی ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ انسان چاروں طرف سے مادی غیرت
و انقلابات میں گھرا ہوا ہے اور بغیر مادی مشاہدات کے اس کے سامنے کوئی چیز موجود نہیں
اس لئے مادیات کے تاثرات اس کے نفس پر اس قدر باؤ اس قدر ڈالتے ہیں کہ وہ ان سے اپنے
تئیں کبھی علیحدہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض لوگ مادیات کے تاثرات میں اس قدر مہمک ہوتے ہیں
کہ وہ حقیقت روح کو بھی انکار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لاندہ سبب ہو جاتے ہیں کیونکہ حقیقت
روح کے انکار سے تمام کمالات نبوت اور منازل روحانی کا انکار امر لازم ہے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ
روح اور اس کی عجائبات جو روحانی لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں ایسے امور ہیں جن کی کیفیت کا ادراک
ہم سے حواس ظاہری کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ حواس ظاہری اور ان سے جو ادراکات ہمیں
عطا ہوتے ہیں وہ تو دیگر حیوانات کو بھی حاصل ہیں۔ چنانچہ ہمارا تجربہ کافی شاہد ہے اس لئے انسانی
کمالات روحانی کا دائرہ صرف ہمیں تک محدود نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اپنی معاشرت اور معیشت
میں چند ایک مسئلہ امور پر آگاہ ہو جائے۔ بلکہ حقیقت روح مجردہ کے تسلیم کر لینے پر یہ بات
ضروری ہے کہ اس کے کمالات کو لامتناہی تسلیم کر لے کیونکہ جس طرح مادیات محدود ہیں۔ ان

کے متعلق انسانی علم بھی محدود ہے مگر انسانی رُوح کسی دوسرے عالم سے تعلق رکھتی ہے جبکہ عجائبات کی حد کا اندازہ بجز خدائے خالق السموات والارض کسی کو نہیں۔ اے وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ میں انہیں عجائبات کی رُوح سے انسانی علم کو محدود قرار دیا گیا ہے۔ سو دیا ہے صاوتہ۔ الہام۔ وحی ملائکہ وغیرہ امور اسی عالم کے متعلقہ امور کا نام ہے۔ جن کی کیفیت کا سمجھنا علم نبوت کا حاصل کرنا ہے۔

ہم جن اصول کو عالم مادہ کے متعلق دریافت کرتے ہیں وہ عالم روحانی کے متعلقہ کیفیات کا ادراک حاصل کرنے کے لئے معیار قرار نہیں پاسکتے۔ اسی ایک اصل عظیم کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ مروجہ علوم کے پُرچے لکھے لوگ علوم نبوت کے متعلقہ امور کا انکار کر دیتے ہیں۔ یہ ایک موٹی ٹہنی بات ہے۔ کہ کسی حقیقت کا ادراک ہمیں ایسوقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہمارا طریق ادراک وہی ہو جو اس حقیقت کے لئے ہونا چاہیئے۔ اس لئے حقیقت سوج اور اس کے عجائبات کے ادراک کیلئے بھی یہی طریق ادراک کی تعبیر کرنا ضروری ہے۔ سو محققین بالاتفاق اسی امر کو تسلیم کر چکے ہیں۔ کہ وہ طریق ادراک صرف الہام و وحی ہیں۔ اس لئے جو شخص الہام و وحی کا انکار کرتا ہے۔ وہ درحقیقت نبوت کا انکار کرتا ہے۔ اس موقع پر کسی فلسفی کی بات کو مت سنو جو حقیقت وحی و الہام کی تشریح علوم فلسفہ کے اصول پر کرنا چاہتا ہے۔ اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نبوت ملائکہ فطری کا نام ہے۔

فأفکروا فی دل بحت المعرفة یو۔ یہ ابو صدراہ تفتائے فلسفہ

نہاں کہ اس علم نبی چوں زندہ یو۔ بیشتر راہ دل الگاہ زندہ

اس دلچسپ بحث میں ناظرین اس امر کو ہرگز نظر انداز نہ کریں کہ علوم نبوت کا سمجھنا بدون پابندی شریعت حقہ ممکن نہیں۔ کیونکہ یہ علوم محض تزکیہ تصفیہ باطن پر مبنی ہیں جو ممکن ریاضت و مجاہدت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ فطرت سلیم کو ریاضت و مجاہدت کی صورت میں بہت جلد فیضان الہی حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری نہیں۔ کہ تمام اصحاب

شخصیت کے پابند ہو کر زمرہ محاشنین و ملہین میں داخل ہو جائیں۔ بل ذلک فضل اللہ
 یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم روئے صادق کی حقیقت سے مادی فلسفی انکار
 کرتے ہیں ان کے ہاں روئے صادق کوئی معیار نہیں جس سے حقائق و معارف کا دروازہ
 انسانی رُوح پر کھولا جاتا ہے۔ بلکہ وہ اسے محض اضطراباتِ حلام (حالتِ خواب کے پراگندہ
 خیالات) کہتے ہیں اور حالتِ خواب کے محسوسات اور حالتِ بیداری کے واقعات میں
 کسی قسم کا تعلق نہیں تسلیم کرتے مگر یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جنہیں رُوح کے عجائبات
 کا کچھ علم نہیں۔ اس نحو اور یہودہ خیالی کی تخلیط ہر ایک پہلو سے بخوبی کی جاسکتی ہے۔
 (۱) تمام آسمانی کتابیں حقیقت و یائے کی تصدیق کرتی ہیں اور یہ سب سے بڑھ کر
 مضبوط اور کافی دلیل ہے۔ قرآن مجید میں سورہ یوسف اور سورہ فتح اور سورہ بنی اسرائیل
 کے آیات اس دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں۔ احادیثِ صحیحہ میں بڑے ترور کیساتھ روئے
 صادق کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ آئینہ سطور میں انشاء اللہ اس کا مفصل
 ذکر آئے گا۔

(۲) ذاتی تجربہ ہر ایک شخص کا کسی امر کے یقین کرنے کیلئے حجت کافی ہے۔ روئے
 صادق کا معاملہ بھی اسی قبیل سے سمجھنا چاہئے۔ گو اس امر کا یقین دوسرے کے لئے حجت
 نہ ہو مگر کم از کم جو شخص خود ایک کیفیت سے متاثر ہوتا ہے اس کے لئے اس کیفیت کا یقین
 کر لینا ایک امر واقع ہے۔ روئے صادق کے متعلق کتبِ متقدمین میں اس قسم کے قطعی ثبوت
 موجود ہیں۔ کم کم کبھی کسی صورت میں ان سے انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ ایسے سلفِ صالحین
 سے منقول ہیں جنکا بیان ہی صداقت کی دلیل قاطع ہے خاکسار کو خود اپنی ذات پر اکثر روئے
 کا تجربہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہر ایک شخص اپنی ذات کے اس کا ثبوت طلب کر سکتا ہے
 ہاں یہ بات ضرور ہے کہ علمِ تعبیرِ روئے سوا خاص خاص لوگوں کے کسی کو حاصل نہیں۔
 محمد بن سیرین اس فن کے امام گذرے ہیں جن کی کتاب تعبیرِ الرویا مشہور ہے۔

(۳) حکماء انبیاء نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ عجائبات رُوح لائق تباہی ہیں مگر چونکہ ہر وقت ہم مادی ہستی کے تاثرات سے گھرے ہوئے ہیں اس لئے رُوح کو تجرّد حاصل نہیں ہو سکتا۔ خواب کی حالت میں چونکہ اس نچکا نہ اپنے عمل سے محفل ہو جاتے ہیں اس لئے مادیات کا تاثر کچھ کم ہو جاتا ہے اور اگر کوئی شخص زیادہ متقی اور پابند شریعت ہو تو اس کی رُوح کو دوسروں کی نسبت زیادہ تجرّد حاصل ہوتا ہے جس سے اس پر واقعات گذشتہ اور آئندہ کا انگشتاں نہ ہونے لگتا ہے۔ مگر مقررین کے زمرہ کا آدمی ہو تو اکثر واقعات ہو بہو نظر آتے ہیں۔ نہیں تو کسی مثالی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جس کی تعبیر کوئی صاحبِ دل آدمی کر سکتا ہے۔ الغرض رویائے صالحہ کا انکار ہم کسی صورت میں نہیں کر سکتے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبوت منقطع ہو چکی مگر بشرات باقی ہیں۔ حضور علیہ السلام نے بشرات سے رویا۔ صالحہ مراد لی ہے۔ اور ایک حدیث میں رویائے صالحہ منجلیہ چھائیں اجزائے نبوت کے ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ بہر صورت منکر کے پاس بحیر انکار کے کوئی دلیل نہیں ایسے لوگ خود بھی محروم رہتے ہیں۔ اور عوام کا لانا نام کو بھی محروم رکھتے ہیں۔ اللہم اھدنا الصراط المستقیم۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضور علیہ السلام کی ابتدائے وحی پہلے پہل رویائے صادقہ سے ہوئی تھی۔ اور یہ امر بالکل ایک طبعی دستور کے مطابق ہے۔ کیونکہ رویائے صادقہ کا اقسام وحی میں سب سے اوئی درجہ ہے اس لئے حضور علیہ السلام کا بتدریج قبل وحی کیئے مستعد ہونا بعینہ اسی طرح ہے جس طرح ابتدا میں بچہ کو حروف ہجائی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اسے کمال علمی کا درجہ نصیب ہوتا ہے قبل از بعثت ہی رویائے صالحہ سے حضور علیہ السلام کو سرفراز کیا گیا۔ چنانچہ حدیث ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رویا صبح کی روشنی کی طرح آپ کو نظر آیا کرتا تھا۔ چنانچہ آپ کے دل میں خلوت میں عبادت کرنیکا شوق غالب آگیا جس پر آپ نے غارِ اکو اپنے اس مقصد کے لئے موندن سمجھا بڑا بیت ابن اسحاق آپ کی

اس خلوت گزینی کا زمانہ رمضان شریف کا پورا مہینہ تھا۔ اس خلوت گزینی کی وجہ بھی بالکل طبی فائن کے مطابق ہے کیونکہ بدون خلوت کوئی شخص حقائق و معارف الہیہ میں تفکر و تدبیر نہیں کر سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ معمولی مسائل علمیہ کے حل کرنے میں علماء و فضلاء عوام الناس کے احتکاط سے بچتے ہیں اور جس قدر علوم حکمیہ کی تدین ہوئی ہے۔ سب ان لوگوں کی طفل ہے جنہوں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ خلوت نشینی میں گزارا ہے۔ جو لوگ ہمیشہ مجالس عامہ میں بیٹھنے کے عادی ہیں وہ کبھی محقق نہیں ہو سکتے اور علم باللہ ہونا تو نتیجہ ہی قطع تعلق کا ہے۔ آیہ۔ وبتسل الیہ تنبتلہ کا مفہوم بحر قطع تحقیقات کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے۔ کہ ایسا شخص غیر خدا یعنی ماسوائی اللہ کا نقش محبت بلکہ اس کا خیال بھی اپنے منہ و دل سے بالکل محو کر دے۔ بس یہی ایک بڑی بات تھی جس کی تعلیم جناب امی عرب علیہ السلام کے وجود مقدس سے خداوند کریم نے وابستہ کی تھی۔ عقل سلیم شہادت دیتی ہے کہ جب تک خود جناب پیغمبر علیہ السلام کی ذات پاک تمام آثار بشریت سے صاف نہ ہو جاتی تعلیم وحی جیسا فرض الہم جس کی نسبت حکیم مطلق خود قرآن مجید میں۔ اذ اسئلنی علیک قولا ثقیلا ارشاد فرماتے ہیں۔ آپ کے ذمہ نہ ڈالا جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس عبارت سے ناظرین معلوم کر گئے ہوں گے۔ کہ جس شخص کی حالت بیداری عقل تفکر سے ایسی صاف ہو گئی ہے کہ اسے خارجی اشیاء کے نظاویں سوائے آثار توحید الہی اور کچھ نظریات اور پھر اس نظارہ کی تکمیل ہمیشہ بذریعہ ذکر الہی کرتا ہے تو اس کے نفس پر ماسوائی اللہ کے تاثرات اپنا رنگ نہیں جاسکتے۔ اس لئے ضرور ہے کہ حالت خواب میں بھی ایسا شخص سبب و واقعات صادقہ اور کچھ نہ دیکھے۔ اور جن لوگوں کو یہ حالت نصیب نہیں ہوتی بلکہ تاثرات مادیہ تک ان کے اور اکات محدود رہتے ہیں وہ حالت خواب میں بھی اکثر ایسی اشیاء کو دیکھتے ہیں جنکی کوئی اصل حقیقت معین نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید میں انہی امور کو اضطغات احلام کہا گیا ہے *

لہ ہم تجھ پر ایک قول ثقیل کا الفاظ کرنے والے ہیں۔ قول ثقیل سے آیات قرآنہ مراد ہیں جو احکام شریعت اور اسرار و معارف الہیہ پیش کرتے ہیں اس لئے قول ثقیل کے معنی ایسے قول کے ہیں جو بڑا ذہنی اور قابل اعتبار ہو۔ ۱۲ منہ +

حکیم ابو علی مسکویہ المتوفی ۴۲۸ھ جو علماء اسلام میں بڑے پایے کے محقق ہیں اپنی کتاب
 الفوز الاصغر میں ایک فصل بعنوان فی المنام المصاوق وانه جزء من النبوة میں لکھتے ہیں (ترجمہ) نیند
 کی حالت میں جب کہ جو اس اپنے اپنے کام سے رہ چکے ہیں نفس انسانی برابر اپنا عمل کرتا رہتا ہے
 چونکہ جو اس کے معطل ہو جانے پر (اسے) باہر کی اشیاء جزئیہ کا ادراک نہیں ہوتا اس لئے وہ ان
 اشیاء مدد کہ کی طرف رجوع کرتا ہے جن کا بحالت بیداری اس نے ادراک کیا ہوتا ہے۔ اور جن کے
 اشکال قوت حافظہ میں جمع ہوتے ہیں۔ تب ان مددکات کو لیکر مختلف طریق پر انہیں ترکیب دیتا
 ہے۔ جن سے عجیب و غریب اشکال کا وہ مشاہدہ کرتا ہے (مثلاً ایسی شکل جو ان کا دیکھنا جسکی
 جسمانی بنیاد مختلف حیوانات کے اعضاء سے تیار ہوتی ہو۔ اور جو عالم خارجی میں کہیں موجود نہیں (غیر)
 سو اس قسم کے خواب کو اصغرات احلام میں داخل سمجھا جاتا ہے (عوام الناس کو سو مادی
 تاثرات کے کچھ ادراک نہیں ہوتا عموماً سوتے وقت ہر روز اسی قسم کی وہی تباہی خوابیں دیکھتا
 کرتے ہیں) مگر جب نفس انسانی کو حالت خواب میں تجربہ و محال ہو جاتا ہے اور وہ جو ہر عقل کی طرف
 رجوع کرتا ہے۔ تو جس قدر اس کو بحالت بیداری محققات سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اسی قدر
 خواب کی حالت میں محجرات یعنی غیر مادی اشیاء کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اگر بحالت بیداری ہر وقت
 فکر و ذکر میں مشغول رہا ہو تو واقعات اپنی اصلی صورت میں نظر آئیں گے۔ یہ واقعات خواہ زمانہ ماضی
 کے متعلق ہوں۔ یا زمانہ مستقبل کے متعلق بات ایک ہی ہے اور اگر فکر و ذکر میں اسے زیادہ مشغول
 نہ رہتا ہو تو واقعات کسی مثالی صورت میں دکھائی دینگے۔ جو تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں۔ یہی وہ
 خواب ہیں جنہیں یز و نبوت کہا گیا ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کو یہاں واقعات بحالت بیداری میں
 بھی واقعات ماضیہ و مستقبلہ اپنی اصلی صورت میں نظر آتے ہیں کیونکہ مادی تعلقات کے
 تاثرات سے ان کے نفوس قدسیہ بالکل پاک و صاف ہوتے ہیں اور غیر انبیاء مثلاً اولیاء عظام
 کو اکثر بحالت خواب ایسے واقعات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی بحالت بیداری بھی ہوتا ہے
 الغرض روایا کا معاملہ کسی شخص کی روحانی قوت و ضعف پر موقوف ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اگر

بالفرض کسی شخص کو عمر بھر میں ایک ہی رویا و صادقہ نصیب ہوا تو اس کے لئے اس امر کی کافی حجت ہے کہ وہ مرنے کے بعد آنے والی کیفیات کی تصدیق کیسے۔ اور اگر وہ اس کی حقیقت میں غور کر کے تصدیق نفس کی طرف رجوع کیسے تو وہ سعادت ابدی کا کچھ نہ کچھ حصہ لے لیتا ہے۔

امام حجت الاسلام غزالی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں حقیقت رویا پر ایک مبسوط بحث لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حقیقت رویا کا جتنا بجز تصدیق و تزکیہ باطن امر محال ہے اور جو لوگ تعلقات نفسانیہ میں شب و روز غلطیاں و پیمیاں رہتے ہیں وہ اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ عوامیہ قلب کی کوئی تھوڑی سی حقیقت رویا بھی بخیر نہیں وقایف و حقائق کے ہے جن کا تعلق علوم منکشفہ سے ہے نہ علوم ظاہری سے پھر تیسری جلد کے ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

وَأَمَّا اقْتِنَاحُ بَابِهِ الدَّرَاجِلُ إِلَى عَالَمِ الْمَلَكُوتِ وَمُطَالَعَةُ اللُّوحِ الْمَحْفُوظِ
فَتَعْلَمُهُ عِلْمًا يَقِينًا بِالتَّامِلِ مِنْ عَجَائِبِ الرُّوْيَا وَاطْلَاعِ الْقَلْبِ فِي التَّوَهُّمِ
مَا سَيَكُونُ فِي الْمُسْتَقْبَلِ أَوْ كَانَ فِي الْمَاضِي مِنْ غَيْرِ اقْتِنَاسٍ مِنْ جِهَةِ
الْحَوَاسِّ وَلَيْفَ تَمَّ ذَلَالَةُ الْبَابِ لِمَنْ الْقُرْوَيْنُ كَرَأَى اللَّهُ تَعَالَى وَقَالَ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ سَبَقَ الْمُفَرِّدُونَ قَبْلَ مَنْ هُمْ بِأَرْسُولِ اللَّهِ
قَالَ الْمُتَنَسِّرُ هُوْنَ يَذْكُرُ اللَّهُ الخ۔

(ترجمہ) مگر قلب کے عالم ملائکہ اور لوح محفوظ ربانی کی طرف رجوع کرنے کی حقیقت کا معاملہ ایک ایسا امر ہے جس کا تجھے یقینی علم اس وقت حاصل ہوگا جبکہ تو حقیقت رویا اور قلب کے ان واقعات ماضیہ اور مستقبلہ پر مطلع ہونے کی کینیت میں غور و خوض کرے جن کے اور اک میں جو اس ظاہری کو کچھ دخل نہیں اور اس غور و خوض کی قابلیت صرف اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جو ہمیشہ دیہ پابندی و فرائض و سنن (اذکر الہی میں مصروف رہتا ہے۔ چنانچہ جناب پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ صاحبان تفرید سب سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جب پوچھا گیا کہ صاحبان تفرید کون لوگ

ہیں تو آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو اللہ کے ذکر میں ثابت قدم رہ کر اپنے نفسوں کو ہر ایک قسم کے آشکار لغتائیت سے پاک و صاف بنا لیتے ہیں *

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ روایئے صادقہ کا ہر ایک شخص کو اس کی روحانیت کے مطابق موقع ملتا ہے۔ جو لوگ ظاہری اور باطنی جہاد کرتے اور اکل حلال و صدق مقال کے زیادہ پابند ہیں وہ عوام الناس کی نسبت اس نعمتِ عظمیٰ سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں اللہ اس نعمتِ عظمیٰ سے زیادہ مستفید ہوتا ہے۔ روایئے صادقہ کے بعد وحی کی زیادہ واضح صورت الہام کی ہے۔ الہام لغت میں کہتے ہیں کسی شخص کے دل میں کسی نیک امر کے والدینے کو۔ عرب اپنے محاورہ میں بولا کرتے ہیں :-
 اللہ خیراً۔ یعنی خدا نے اس کے دل میں نیک امر کا انکشاف کیا مگر اصطلاح علم نبوت میں اس کے معنی نہایت دلچسپ اور قابل غور ہیں چونکہ حقیقت روح اور اس کے اسرار پر ظاہر بنی لوگ بہت کم غور کر سکتے ہیں اس لئے مناسب نظر آتا ہے کہ اس مضمون کو ذرا کسی قدر واضح اور آسان صورت میں بیان کیا جائے۔

الہام کیا ہے؟

واضح ہو کہ علم مروجہ یعنی بدہشیات کا علم ہر ایک انسان کو بغیر کتاب کے حاصل ہوتا ہے مثلاً زید کا ایک ہی وقت میں دو مختلف مقاموں میں موجود ہو سکتا ایک ایسا صریح البطلان امر ہے جو کسی دلیل کا محتاج نہیں اور علم نظری وہ علم ہے جو قواعد نظر و استدلال کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً کسی مثلث کے دو ضلعوں کا مجموعہ تیسرے سے بڑا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امر ایسا صریح نہیں کہ ثبوت اثبات کے ہر ایک شخص اس کو سمجھ سکے۔ سو نیز یہ الہام جو علم کسی شخص کو حاصل

ہو روایئے صادقہ خواب کی حالت میں افاداتِ امنیہ یا مستقبلہ کو انکی اہلی یا کسی مناسب حالتی صورت میں دیکھنے کو کہتے ہیں۔ اور الہام حالت بیداری میں بلا کسی طریق نظر و استدلال کے جو اہل فلسفہ کا کام ہوتا ہے۔ دفعہ کسی امر خفیہ کے متعلق خدا کی طرف سے صحیح علم کے وارو ہونے کو بولتے ہیں کشف اور الہام میں یہ فرق ہے کہ الہام صرف علمی ارتقا کا نام ہے اور کشف بعینہ رؤیا صادقہ ہے مگر فرق یہ ہے کہ روایا حالت خواب کا واقعہ ہوتا ہے اور کشف حالت بیداری کا قوت و ضعف کے دو سے ان میں درج کی ترتیب یہ ہے (۱) روایا۔ (۲) الہام (۳) مکاشفہ۔ ۱۲ منہ *

ہو وہ انہی علم نظری ہوگا۔ کیونکہ امور بدیہی کے متعلق الہام کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے وہ اس کی یہ ہے کہ ایسے علوم ان کو بمقتضائے فطرت از خود حاصل ہوتے ہیں۔ علوم بدیہی کی حد بندی ہم یہ آسانی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ علم بدیہی ایک اضافی مفہوم ہے ممکن ہے کہ جو امر ایک شخص کی نسبت نظری ہو وہ کسی دوسرے لطیف الفطرت آدمی کی نسبت باطل بدیہی ہو۔ مگر یہاں اس وقت صرف ایسے علوم بدیہی سے بحث ہے جو عام طور پر عوام الناس میں بدیہی سمجھے گئے ہیں۔ مگر یہ خلاف اس کے علوم نظری کے حاصل ہونیکے دو طریق ہیں اول وہ عام طریق ہے جو عام اہل برہان و قیاس میں مسلم ہو چکا ہے اور جس کی بنا پر سینکڑوں علوم دنیا میں مروج ہو چکے ہیں اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دوم وہ خاص طریق جس کو اس وقت قابل بحث قرار دیا گیا ہے یعنی الہام۔ طریق اقل قواعد مخصوصہ کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ اور طریق ثانی تصفیہ و تزکیہ باطن سے۔

امام ابو حامد غزالی اپنی کتاب احیاء العلوم کی جلد ثالث کے آغاز میں حقیقت قلب

لے علماء اسلام میں یوں تو علوم ظاہر اور علوم باطن کے جامع ہزاروں ایسے بزرگ گئے ہیں۔ جن کے حالات کتب التواریخ میں مرقوم ہیں۔ مگر صرف امام حجت الاسلام غزالی علیہ الرحمۃ المتوفی شہ ۵۰۵ھ ایک ایسے بقیہ فاضل گئے ہیں جنہوں نے علوم ظاہری میں یدِ طولیٰ پیدا کر کے حقیقت باطن کے سمجھنے میں بڑا پایہ حاصل کیا اور نہ صرف اپنے علم خدا و لو کو اپنی ذات تک محدود رکھا بلکہ اپنے صدی خزان کو کاغذوں کی پڑیوں میں مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا۔ علم ظاہر کے علوم کی خاک چھانی۔ اور بالآخر فلسفہ اور اہل فلسفہ کے طریق نظر و استدلال سے جی کٹھا ہو گیا اور ایک بڑا حصہ عمر کا علوم رسمہ کی قدس و تدبیس میں ضائع کر کے آخر کار ادھر سے منہ موڑا اور اللہ والوں کی تلاشِ صحبت کی ایسی دھن لگی۔ کہ پھر عمر بھر ان کا دامن نہ چھوڑا سچ جو لوگ بڑی بڑی تحقیق کے مدعی بیٹے پھرتے ہیں اور حقائق و معارف کے دریا بہا دیتے کا یقین لوگوں کو دلالت ہے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ گھر کے سبیلوں کے سامنے ان کی دال نہیں گتی۔ شیخ کبیر غزالی رازی و غیرہ بزرگان قوم اتنا کچھ کر گئے ہیں کہ ہاں ہی موجودہ لوگوں کی تحریریں صحیح نہیں۔ کیونکہ ان کا اعتقاد نہیں بزرگوں کی کتابیں ہاں جن لوگوں کو ان کتب پر نظر نہیں نہیں اپنی نبوت یا ربیعہ رمی متوالیں تو متوالیں مگر علمائے قوم کیونکر ماننے لگے؟

۵۔ بروایں دام بر مرغ و گمرہ۔ کہ عتقار بلند است آشیانہ ۱۲۔ منہ ۵

پر بحث کرتے وقت کہتے ہیں۔ کہ علم نظری کبھی کبھہ بالجمہد قواعد استدلال طلب میں پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی بطریق استدلال جس کو استنباط کہتے ہیں۔ صورت اول میں اگر حصول علم کا سبب نامعلوم ہو۔ یعنی اگر نہ معلوم ہو سکے کہ وہ کیوں مکروں میں پیدا ہوا تو وہ الہام ہے اور اگر سبب حصول کا علم مثلاً ملک (فرشتہ) کو کھل انسان متمثل دیکھے جو اس شخص سے حکام ہوتا ہو تو ایسے علم کو وحی یوں کہتے ہیں۔ الہام عام ہے جو خدا کے برگزیدہ بندوں کو ہوتا ہے مگر وحی صرف انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے۔ الہام کو نفث فی الروح بھی بولتے ہیں۔ یہ لفظ ایک حدیث صحیح میں آچکا ہے *

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ قلب مومن نہایت شقیق اور وسیع حقیقت کا نام ہے اور اس میں خداوند کریم نے فطرتاً یہ قابلیت و ولایت رکھی ہے کہ وہ لاشعاری حقائق و معارف حاصل کر سکتا ہے۔ مگر مادیات کے تاثرات کی وجہ سے وہ ان حقائق و معارف کے مشاہدہ سے محروم رہتا ہے۔ جب مادیات اور ان کے لوازم کے تاثرات سے قلب بے تعلق ہو جاتا ہے۔ تو لوح محفوظ پر قلب مومن کی آنکھیں کھول دی جاتی ہیں جن سے وہ حقائق علمیہ حاصل کرتا ہے۔ بذریعہ نظرو استدلال اور بذریعہ الہام و وحی علوم کے حاصل کرنے کی مثال بعینہ ایسی ہے۔ جیسے آئینہ پرے کبھی تو گرد و غبار کو ہم خود صاف کر کے اشیا کی صورتوں کا اس میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قفسی ہواؤں کے چلنے یا بادش کے ہونے سے آئینہ کی سطح پاک و صاف ہو جاتی ہے اور اشیا کی صورتیں اس میں محسوس ہونے لگتی ہیں سو یہ حالت کبھی تو بحالت خواب پیش آتی ہے اور کبھی بحالت بیداری۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ علم بذریعہ کتاب اور علم بذریعہ الہام میں یہ فرق ہے کہ کتاب میں

۱۔ پیچھے لکھا گیا تھا۔ کہ وحی کے لفظ کو کبھی کبھی عام معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں مگر وحی بیکل فرشتہ صرف انبیاء علیہم السلام کیلئے مخصوص ہے۔ ۲۔ منہ ۱۲ منہ ۱۳ لفظ کے معنی تھوکنے کے ہیں مگر یہاں لیں لقا کرنا مراد ہے۔

تو ہم خود تمہید قواعد کے رُوسے کسی علمی حقیقت کو حاصل کرتے ہیں۔ اور الہام میں حجاب جو قلب اور کسی حقائق علیہ میں مائل ہوتا ہے از خود مرتفع ہو جاتا ہے۔ یعنی تصنیف و تترکیہ باطن کے بعد علمی حقائق کے محل کرنے میں ہیں کسی نظر و استدلال کی پابندی ضروری نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تصوف ریاضت و مجاہدت بطریق سنت کو لازم ٹپکتے ہیں اور مختلف قسم کے فغروں کی رونق گردانی سے بکلی بیہوشی اختیار کر لیتے ہیں اور اس امر پر بڑا زور دیتے ہیں کہ بحیثیت خالص انتشار نہ آنے پائے۔ اور وسوسوں و شکوک کو جو نظر و استدلال کیساتھ لازم ہوتے ہیں مطلق دخل نہ ہے۔ مگر یہ بات وہاں ذکر اور لزوم خلوت کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

پھر ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ علم بذریعہ استدلال اور علم بذریعہ الہام کی مثال یوں سمجھنی چاہیے۔ کہ ہمیں تمام ادراکات حواس چمکانہ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں اور قلب ان ادراکات کا جامع ہوتا ہے بعینہ اسی طرح جس طرح کہ ایک گڑھے میں مختلف نالیوں کے راستہ سے پانی آکر جمع ہوتا ہے کیونکہ اگر نالیوں سے پانی آتا بند ہو جائے تو گڑھے میں پانی زیادہ جمع نہیں ہو سکے گا بلکہ آہستہ آہستہ خشک ہو جائیگا۔ لیکن اگر کوئی شخص گڑھے کو اتنا گہرا کھودتا ہے کہ زمین کے اندر سے خود بخود پانی پھوٹ نکلتا ہے تو وہ گڑھا ایک ایسا چشمہ بن جاتا ہے۔ جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔ بلکہ جوں جوں اس سے پانی نکالو گے اس میں اور پانی آتا جائیگا اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جو پانی چشمہ کے اندر سے پھوٹا ہو گا وہ اس پانی کی نسبت زیادہ صاف و شفاف ہو گا۔ جو باہر سے آکر گڑھے میں جمع ہوتا ہو۔ سو نظر

لہ وسوس و شکوک سے بچنے کے لئے قواعد ہیں جن کی پابندی ایک طالب حق کے لئے ضروری ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ القلب المؤمن اشد ثقلیا عن القدر فی علیانہا۔ یعنی قلب ایماندار ہانسی کے اُبال سے بھی پٹ جانے میں بڑھا ہوا ہے۔ ۱۲ منہ۔

و اسللال کا طریق آمیزش شک و ہم سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا اور وہ علم جو بذریعہ الہام و وحی حاصل ہوا قطعی و یقینی ہوتا ہے۔ ادیبی وجہ ہے کہ بقابلہ کسی عقل و دلیل کے وہ حجت قطعی تسلیم کیا گیا ہے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اپنی تفسیر میں آیہ وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهٖمَ بِالْبَشْرِی کی ذیل میں لکھتے ہیں کہ نفس ناطقہ انسانی جو فطرانِ نہایت لطیف واقع ہوا ہے جب بذریعہ مجاہدت و ریاضت تصفیہ و تزکیہ حاصل کر لیتا ہے۔ تو اسے مبادی مجرودہ عالیہ (عالم ملائکہ) کے ساتھ اتصال ہو جاتا ہے۔ پھر حقیقہ یہ اتصال قوی و ضعیف ہوتا ہے اسی مناسبت سے خداوند کریم ایسے خزان علم حقیقیہ کا دروازہ اس پر کھول دیتا ہے جنہیں دیگر افراد انسانی نہیں جان سکتے اور نہ اُنہیں یہ قدرت ہوتی ہے کہ کسی طریق سے انہیں حاصل کر سکیں۔ ایسی حالت میں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ نفس شریف بدن سے بالکل علیحدہ ہو کر بیرونی جہت یعنی عالم مادیات کے تعلق سے منقطع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس حالت میں وہ مجرد محض ہوتا ہے۔ اور تعلق مادی جو بمنزلہ حجاب کے ہوتا ہے اٹھ جاتا ہے تو اس کے علوم غیبیہ کے حاصل کرنے کے پانچ طریق ہیں۔ (۱) الہام اور القافی القلب (۲) ہتاف و اہتار (۳) صحیفہ مکتوبہ جسکو نفس شریف دیکھ کر پڑھ سکتا ہے (۴) اس کی قوت متخیلہ میں صورت غیبیہ کا منتقل ہو کر جس مشرک میں منتقل ہوتا ہے (۵) قوت متخیلہ کل میں صورت غیبیہ کا منتقل ہونا۔ اور اس شخص کی قوت متخیلہ کا متخیلہ کل کے مقابل ہو کر اس صورت سے منعکس ہو جاتا جس طرح کہ دو آئینہ ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں اور ایک کی صورت کا انعکاس دوسرے میں بھی منعکس ہو جاتا ہے یہ حالت بعینہ خواب کی حالت سے مشابہ ہوتی ہے کیونکہ گویہ واقعہ بیداری میں ایسے شخص کو

لے آواز دینا ادا گاہ کرنا ۱۱ انسان کو عالم ضمیر بولتے ہیں اور عالم خارجی کو عالم کبیر۔ اہل لغت و تاجرتے ہیں کہ عالم ضمیر عالم کبیر کا پورا نمونہ ہے اور جو کچھ کہ عالم کبیر میں موجود ہے اس کی مثال عالم ضمیر میں بھی موجود ہے بطرح عالم ضمیر میں قوت متخیلہ ہے اسی طرح عالم کبیر کی قوت متخیلہ ہے جس کو متخیلہ کل بولتے ہیں + ۱۲ - منہ ۱۰

پیش آتا ہے مگر جس طرح عالم خواب میں خود ناپا ہری سے قطع تعلق ہو جاتا ہے اسی طرح متخیلہ کل کا مشاہدہ کرتے ہوئے بھی ظاہر الیک گونہ پیشکش طاری ہو جاتی ہے اور یہ رتبہ نہایت ہی اعلیٰ اور شرف نفوس کیلئے ہے اور ہو کرتا ہے۔ اسی حالت کو جناب پیغمبر علیہ السلام کی نسبت مخالفین ایک قسم کی دیوانگی پر محمول کیا کرتے ہیں۔ (بیچ ہے دیوانہ ہو تو ایسا ہی ہو جو دنیا بھر کو فرزانہ بنا دے) وہ حقیقت رقیلئے صاوقہ اور یہ حالت (خلع بدن) ایک ہی میں صرف ان میں خواب و بیداری کا فرق ہوتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ کبھی قوت متخیلہ ہر دو حالت خواب و بیداری میں لوازم کی طرف انتقال کر جاتی ہے یعنی جس حقیقت علمی کو قبول کرتی ہے اس کو کسی مناسب مثالی لباس میں تکمیل دیتی ہے پس صورت میں تعمیر اور تاویل کی حاجت پڑتی ہے۔ اور جب نفس نہایت اعلیٰ مقام تک ترقی کر جاتا ہے۔ اور ایسے حالات بار بار پیش آکر اس کو مضبوط و مستحکم کر دیتے ہیں یعنی اس کی روحانیت بڑی اعلیٰ طاقت کے ساتھ مستقل ہو جاتی ہے تو اس میں عالم مادیات میں تصرف کرنے کی قابلیت آ جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ معجزہ یا کرامت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ الفاظ یہ ہیں :-

وقد يظهرون على تلك النفس المتدريّة بملكة الاتصال المتصرفه
فيها من خوارق العادات والنواع الكراماة والمعجزات لوصول المدد من عالم

۱۔ بدن سے روح کا علیحدہ ہو کر عالم ملائکہ سے اتصال پانا۔ ۱۲ سنہ +
۲۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو نفس ماطقہ انسانی عالم ملائکہ کے ساتھ اتصال پیدا کرنے میں خوب مشق پکچا ہوا اس کی قوت اتصال مستحکم ہو چکی ہو اس سے امور خرق عادات اور مختلف قسم کی کرامات و معجزات سرزد ہوتے ہیں کیونکہ اسی حالت میں اسے عالم قدرت الہی سے تائید ہوتی ہے ایسے امور خرق عادت کا وہ لوگ جو ناقص عقل اور دہم کے پائے اور امر حقہ کے دیکھنے سے قاصر ہوتے ہیں انکار کر دیا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کے قلب نور ہدایت سے روشن ہو چکے ہوں اور گہری سے اور بیدار عقادی سے محفوظ رہ کر بصیرت اور یقین حاصل کر چکے ہوں یا فطری تائیدی اور کثرت دینی سے پاک صاف پیدا ہوئے ہوں اور جہالت سے خالص ہو کر انبیاء علیہم السلام کی تطہید و ایمانی تقویت

مذکورہ بالا سطور میں غور کرنے سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ ایک نفس شریف کیونکر علوم حقیقہ اور امور خرق عادات کا منظر قرار پاتا ہے۔ مجھے ان لوگوں کی سمجھ پر سخت تعجب آتا ہے جو کمالات روحانی کا انکار محض اپنے فضول توہمات باطلہ کی بنا پر صرف اس لئے کر دیتے ہیں کہ انہیں کمیتات کا خود علم نہیں ہوتا۔ بل کہ ذیوبہا المرحیطو بالجہلہ کسی انسان کی سعادت اور فلاح اخروی کا مداریہ ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کو بلا کسی قسم کے شک شبہ کے قبول کر لے کیونکہ یہی ایمان حقیقی کا نشان ہے ورنہ اہل بدعت وہو اکا کیا ٹھکانہ ہے۔ آج ہزاروں قسم کے الحادات اور بد اعتقادات محض ہوئے نفس کی پیروی کرنے سے پھیل رہی ہیں لیکن یہ کیسی نامعقول عادت ہے۔ کہ ایک ریاضی کا مسئلہ جب کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ مجبوراً اپنی کم فہمی کا یقین کر لیتا ہے اور کسی اپنے سے افضل و اعلم سے دریافت کرتا ہے۔ مگر علوم نبوت کے پیچیدہ اور باریک مسائل کی نسبت بلا سوچے سمجھے انکار کر دیتا ہے۔ اے سبحان اللہ کیا یہ بھی کوئی بھان متی کا تماشہ ہے جس پر ہر کس و نا کس قہقہہ اڑانے لگے۔ صاحبویہ تو حقائق ہیں جن پر دو اثنان علوم انبیاء علیہم السلام کے سوا کسی غیر کو دسترس نہیں ہوتی۔ خدا کے لئے کیوں دہریہ اور پیچیدہ کی باتوں پر نذر ایمان سے محروم رہ کر اپنی عاقبت کو خراب کرتے ہو؟ تم ہمیں سے کیوں حق و باطل کا اندازہ نہیں لگا لیتے کہ آج تک کسی لائندہ بے نیچری اور بدعتی آدمی کو بھی صحابی مقامات عالیہ اور معارف حقیقیہ کا جاننے والا کبھی کسی نے دیکھا سنا ہے؟ یہ لوگ خالص ملحد اور ذلیل ہوتے ہیں۔ اور کبھی دروغ و نجات الہی کی بولٹاک ان کے نجاست خیر و مانعوں میں نہیں پہنچتی۔ معاویہ اللہ کہاں جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سچے عاشق اور ولد ارادہ بزرگان دین جن کے سینے نور معرفت و یقین سے فیضان الہی کا سرچشمہ بن گئے ہوتے ہیں اور ایک عالم بھر کو اپنے فیض تربیت سے حلقہ مقربان بارگاہ الہی میں جا بٹھاتے ہیں اور کہاں

وہ ناپاک و پلید شخص و خبیث دل جو مختلف قسم کے توہمات باطلہ اور اعتقادات فاسدہ سے انکار
والحادی کہلک بیماریوں میں گرفتار ہوتے ہیں۔

ہیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

الہام کے متعلق اس قرطبی کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بجز نبی مبعوث من اللہ کے کسی شخص
کا الہام قابل حجت نہیں ہو سکتا یعنی اس کا ماننا کسی پر شرعی احکام کی رو سے لازم نہیں آتا۔
کیونکہ از روئے عقائد اسلام صرف نبی ہی محصوم ہوتا ہے یعنی صرف نبی کا الہام خطا سے پاک
ہوتا ہے۔ نہ کسی غیر کا خواہ وہ ولایت سے کسی درجہ تک پہنچ گیا ہو۔ البتہ یہ بات ضرور قابل لحاظ
ہے کہ غیر نبی کا الہام بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ وہ شخص واقعی صاحب الہام ہے صرف اس
صورت میں قابل تسلیم ہوتا ہے۔ جبکہ کسی اعتقاد یا حکم شرعی کے مخالف نہ ہو مگر اس صورت میں
بھی اس کا ماننا شرعی فرض نہیں۔ اور اسی لئے وہ غیر کے حق میں حجت نہیں ہو سکتا۔ حضرت مجدد
الف ثانی علیہ الرحمۃ نے مختلف مواقع پر اس امر کی بحث کی ہے کہ اگر کسی مقام پر کسی ولی کا
الہام ظاہر احکام شرعی کے مخالف ہو تو فتویٰ ظاہر شریعت کا مسلم ہوگا۔ کیونکہ احکام شرعیہ
کتاب و سنت سے قطعی ثابت ہو چکے ہیں۔ اور الہام درجہ ظن سے کبھی باہر نہیں جاسکتا۔
اس لئے محض ظن کی پیروی میں بض کتاب و سنت کو کبھی متروک نہیں کیا جائیگا۔ صرف مجدد
صاحب ہی نے یہ تصریح نہیں کی بلکہ تمام بڑے بڑے اکابر کشف والہام اس اصلیت پر عمل
فرماتے ہیں۔ چنانچہ ایک قول مشہور یہ ہے۔

کشفی کہ مخالف شریعت است مابراں کشف کفش مینیم و این چنین الہام را اہتمام میدانیم۔
اس لئے ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ بعض کسی شخص کے دعویٰ کشف والہام پر دھوکا
نہ کھائے۔ کیونکہ ایمان بڑا نازک امر ہے۔

ناظرین اس امر کو ہرگز نظر انداز نہ کریں۔ کہ لفظ وحی قرآن مجید میں مختلف طور پر استعمال
کیا گیا ہے۔ مثلاً کسی چیز کے اپنی فطرت کے مطابق عمل کرنے کو بھی قرآن مجید میں لفظ وحی

کے ساتھ تفسیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ شہد کی مکھی کی نسبت خداوند کریم نے وحی کا لفظ ارشاد فرمایا: حیث قال وادھی ریلک الی النخل یعنی تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں لفظ وحی سے مقتضی فطرت پر عمل کرنا مقصود ہے۔ اور اگر فرشتہ مراد لیا جائے تو آیہ فالدبر ابرأت امرا کے ذیل میں لفظ وحی کو لا سکتے ہیں اور اس میں کوئی تباہی لازم نہیں آتی بلکہ یہ معنی قوی معلوم ہوتے ہیں۔ وحی یعنی فرشتہ کا امتیاء علیہم السلام کے پاس آنا آیات قرآنیہ و احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور ان میں تاویل کرنا تحریف قرآن ہے گو فرشتہ کے شکل انسانی میں آنیکے اسباب دریافت کرنے کے لئے ہمارا تجربہ و مشاہدہ یا وریٰ نہ کہے مگر از بسکہ ہمارے پاس تاویل الفاظ کے متعلق کوئی قرینہ نہیں اس لئے ہم اس مذہب میں جہور ائمہ اسلام کے مذہب کو محبت ناطق قرار دیتے ہیں اور تاویل کرنے والے کو خدا کے حوالے کرتے ہیں۔ ہر چند ہمارا ایسا لکھنا ایک محقق فلسفی مزاج کی تسکین کے لئے کافی نہیں ہو سکتا مگر ہم معتقدات کے بارے میں شخصی تقلید کو بموجب اصول اسلام ممنوع قرار دیتے ہیں اس لئے ایک مسلمان تقلید کنندہ کے مقابلہ پر ہم نہایت آسانی سے عہدہ برآ ہو سکتے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ اور صحابہ اور تابعین کے اقوال ہمارے دعویٰ کو ثابت کرتے ہیں نہ مخالفت کے دعویٰ کو مثلاً سید صاحب نے اس وجود ملائکہ کا جو قرون ثلاثہ کے جہور علماء کے نزدیک مسلم ہے انکار کیا ہے۔ لیکن بعض موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ ہم کسی ایسی موجودات کا انکار نہیں کر سکتے جو محسوس نہ ہو۔ مگر چونکہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں اس لئے یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ خیر یہ ان کی شخصی رائے ہے۔ پس ہم بمقابلہ جمیع علماء اُمت ان کے اس قول کو قابل قبول نہیں سمجھتے۔ مگر وجود

لے ملائکہ کے وجود سے بعض لوگوں نے انکار کیا ہے اور جہاں ملائکہ کا لفظ قرآن مجید میں آیا ہے۔ وہاں قوائے طبعیہ مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ وجود ملائکہ کی بحث اس موقع پر خارج از مطلب ہے اس لئے مذہب ائمہ اسلام کے مطابق ہم وجود ملائکہ کو اپنے مضمون میں تسلیم کرتے ہیں۔ ۱۲۷ منہ +

ملانگہ کے متعلق صحیح مذہب جو خاکسار کا یہی مذہب ہے یہ ہے کہ موجودات ذات باری کی آغوش
 ممکن نہیں۔ و ما یجلہ جنودہا یث الاھو۔ اور ہر گاہ کہ ملائکہ ایک ایسا الطیف جسم رکھتے
 ہیں جو قوت باصرہ کے احساس سے بالاتر ہے۔ چنانچہ آجکل کے سائنس دان (ایمپیر)
 کو بھی ایسا ہی تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے گو بذریعہ دلیل عقلی۔ ان کے وجود کا یقین حاصل
 نہ ہو مگر انکار بھی نہیں ہو سکتا پس جب انکار نہیں ہو سکتا اور عقل ایسے وجود کو محال باور نہیں
 کرتی۔ اور شائع کی تعلیم سے صریح طور پر فرشتوں کا بشکل ان انبیاء علیہم السلام پر آنا ثابت
 ہے۔ تو ان حالات سے جانب وجود کو یقین کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ورنہ کٹ جیتی کا تو
 کبھی بھی خاتمہ نہیں ہے۔

نزول قرآن یا کیفیت القاء وحی کا مسئلہ نہایت ہی دقیق مسئلہ ہے۔ فوس ہے کہ
 جو لوگ علم نبوت سے بے خبر ہیں وہ اس مسئلہ میں سخت بد اعتقاد ہیں۔ چونکہ یہ مسئلہ علوم نبوت کا روح و
 ہے اس لئے سوائے علوم باطنیہ کے جو علوم شریع و دیانات کے بعد بطور نتیجہ حاصل ہوتے
 ہیں یقینی طور پر قابل فہم نہیں یہ رتبہ صرف خواص یا رگاہ کا ہے۔ مگر ایک جاہل دہریہ فطرت
 کا آدمی اس جملہ کو یونہی ہنس کر ٹال دینگا۔ اور سوا انکار کے اس سے کچھ بن نہیں آئیگا۔ یا
 اگر تسلیم بھی کر لیا تو کسی لمحہ نہ صورت میں مثلاً یہ کہ وحی ایک ملکہ فطری کا نام ہے جو حسب
 ضرورت موقعہ جوش میں آکر الفاظ کی صورت میں نبی کے دل پر جلوہ گر ہوتا ہے اور اس کی
 مثال بعینہ وہ لوگ یوں دیتے ہیں کہ جس طرح شاعری کا ملکہ کسی کی طبیعت میں موجود ہوتا
 ہے اور جب اسباب مناسبہ پیدا ہوتے ہیں تو اسے تحریک کرتے ہیں۔ اسی طرح ملکہ نبوت
 بھی خاص خاص حالات کے عائد ہونے پر عمل کرتا ہے۔ مگر یہ خیال بعینہ ایک دہریہ آدمی
 کا خیال ہے جس کی تائید کسی طرح نہیں ہوتی۔ آیہ نزل بہ الروح الامین علی قلبک

لشکون من المندین سے صاف ثابت ہوتا ہے۔ کہ قلب اور پیر ہے اور روح الامین اور۔
 اگر روح امین کو نبوتِ مملکہ فطری سے تعبیر کیا جائے تو یہ خرابی لازم آگئی کہ ایک فصیح بلیغ حکیم کے
 اخلاقی کلمات جو اپنے طبعی ملکہ کے زور سے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے وہ بھی کلام
 الہی کہلائیں چنانچہ کئی ایک کتابوں میں علماء سلف کے نہایت قیمتی اقوال موجود ہیں اور ان
 میں اکثر عین قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق بھی ہیں اور موثر بھی پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انہیں کلام الہی
 نہ سمجھیں۔ مدعی کا فرض ہے کہ کلام الہی اور حکماء کے کلمات حکیمی میں ماہ الامتیاز ظاہر کرے غالباً
 مدعی فصاحت و بلاغت کو ماہ الامتیاز قرار نہیں دیکھا کیونکہ اس مدعی کا مدعی فصاحت و بلاغت
 کو وجہ اعجاز تسلیم نہیں کرتا پس جس صورت میں تعلیم حقہ پر مشتمل ہونا ماہ الامتیاز ہے تو کلمات حکماء
 بھی تعلیم حقہ پر مشتمل ہیں۔ اس لئے جو کلمات حکماء ایسے ہونگے۔ انہیں بھی کلام الہی ماننا پڑیگا۔ یہ
 ایسا اعتراض ہے جس کے جواب وہ فرقہ نیچر کے لوگ ہیں۔ دوسرے موقع پر قرآن شریف
 میں یوں وارو ہے :- فانه نزلہ علی قلبک باذن اللہ یعنی جبرائیل نے تیرے قلب پر
 اللہ کے ارادہ سے نازل کیا ہے۔ اگر جبرائیل نبوت کی قوت فطری کا نام ہے اور کوئی ایسی
 شے نہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے درمیان واسطہ ہو جیسا کہ جمہور آئمہ اسلام یعنی صحابہ اور
 تابعین اور تبع تابعین اور دیگر فقہاء اور محدثین اور مفسرین اور متکلمین تسلیم کرتے ہیں تو پھر لفظ باذن اللہ
 کی قید لگانے کا کیا فائدہ ہے۔ کیونکہ بموجب عقائد اہل اسلام تمام امور اللہ ہی کے حکم و ارادہ
 یا اذن سے ہوتے ہیں۔ اس لئے لامحالہ ہر ایک ایسا کلام جو اخلاق و حکمت پر مشتمل ہوگا۔ بموجب

۱۔ جبرائیل نے تیرے قلب پر قرآن شریف کو نازل کیا تاکہ تو عدلیا ہی سے ڈراؤ۔ ۱۲ منہ *

۱۳ سید صاحب پنیر کی تعریف یوں کرتے ہیں ”جو شخص روحانی امراض کا طبیب ہوتا ہے۔ اور جس میں اخلاق
 انسانی کی تعلیم و تربیت کا مکمل مقتضی اس کی فطرت کے خدا سے عنایت ہوتا ہے۔ وہ پیغمبر
 کہلاتا ہے۔“ ۱۲ منہ *

تعریف نبوت کے جو سید صاحب نے کی ہے کلام الہی میں نخل ہونا چاہیے کیونکہ ایسا کلام بھی
ملکہ فطری سے حسب ارادہ و حکم الہی کہنے والے کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر وجہ امتیاز کیا
ہے۔ مگر ایک اور قباحت بموجب تعریف سید صاحب کے لازم آتی ہے اور وہ یہ ہے۔ کہ جب
وحی ایک قوت فطریہ کا نام ہے تو سورہ نجم میں جو الفاظ علمۃ شدید القوی ذومرۃ
وحی رساں کے حق میں وارد ہوئے ہیں کیا معنے رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وحی ایک قوت ہے
تو قوت کی تعریف میں یہ کہنا کہ بڑی قوتوں والی ہے ایک ایسی لحو بات ہے جس کو ایک عقل
فہم و عقل کا آدمی بھی جائز نہیں رکھتا۔ کیونکہ ملکہ نفسانی کی ایک کیفیت راسخہ کا نام ہے تو
گو یا معنے یہ ہوئے۔ کہ نفس کی کیفیت راسخہ میں بڑی بڑی مضبوط کیفیات راسخہ موجود ہیں۔ مگر
ہیں اس کلام کے کوئی معنی صحیح معلوم نہیں ہوتے علاوہ بریں ملکہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو
بار بار کسی امر کی مشق کرنے سے مستحکم ہو جاتی ہے جس طرح نماز کی عادت کیونکہ ایک مدت تک
اس کی پابندی کرنے سے انسان اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسا امر جو عادت
سے اختیار کیا جاتا ہے بتدریج طبیعت ثانیہ میں جاتا ہے اگر نبوت کو ایک ملکہ کہا جائے تو اس کا
مطلب یہ ہو گا کہ پیغمبر علیہ السلام بذریعہ مشق اور کثرت مزاوالت کے آہستہ آہستہ نبی بن گئے تھے
مگر اس خیال کے الباطل ہیں سب سے بڑی زبردست اور قاطع حجت آیہ ذیل ہے :-
انہ لقول رسول کہ یرید ذی قوۃ عند ذی العرش میکن مطاع شہامین و ما
صاحبکم مجنون ولقد ساء بالافق المبین ۛ

۱۔ سبھلایا اس کو (پیغمبر کو) مضبوط قوتوں والے صاحب حکمت نے۔ ۲۔ منہ ۛ

۳۔ بیشک یہ قرآن ہمارے تک پہنچانے والے معزز۔ صاحب قدرت۔ صاحب رتبہ۔ مطاع امانتدار کا
قول ہے اور تمہارا صاحب یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مجنون نہیں۔ اور قسم ہے کہ بالحق حق و کیا ہے اسنے
خدا کے پیغام رساں کو افق سبین میں۔ ۱۲۔ منہ ۛ

اس آیت کے الفاظ سید صاحب کے خیال کی پوری پوری تفسیر کر رہے ہیں کیونکہ ملکہ فطری کے لئے صفات مذکورہ بالا کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتے۔ اور اگر ہو سکتے ہیں تو کوئی صاحب کر دکھائیں پیغام رساں کو رسول کریم اور صاحب قوت وغیرہ کہنا تو بجا مگر قوت فطری کو رسول کریم اور صاحب قوت کہنے کا مطلب میرے ذہن میں تو کچھ نہیں آتا۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کا نازل ہونا بخمّا بخمّا (حسہ حصہ کر کے) بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ وہ مقتضائے اپنی فطرت کے نازل ہوا۔ سید صاحب نے اپنے خیال میں انجیل کو اپنے دعویٰ کا مثبت گروانا ہے۔ مگر ایک شخص جو قواعد نظر و استدلال سے واقف ہے۔ بخوبی جانتا ہے کہ ان کی دلیل کس قدر کمزور اور زاپا افتادہ ہے کیونکہ سید صاحب نے مسئلہ وحی کی تحقیق میں فطرت انسانی اور فطرت نبوت دو لفظ استعمال کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر مذکورہ بالا دلیل میں فطرت سے فطرت انسانی مراد لیں تو چونکہ فطرت انسانی تمام انسانوں کی ایک ہی ہے۔ اس لئے سب کا نبی ہونا ضروری ہے اور یہ بالکل باطل ہے اس لئے ضرورتاً فطرت سے سید صاحب نے فطرت نبوت ہی مراد لی ہے۔ مگر اس صورت میں یہ خرابی لازم آتی ہے کہ اگر فطرت نبوت کے مطابق قرآن مجید بخمّا بخمّا نازل ہوا ہے تو چونکہ فطرت نبوت تمام انبیاء علیہم السلام کی ایک ہی ہے۔ اس لئے پہلے انبیاء علیہم السلام پر جو کتابیں دفعۃً واحدہً نازل ہوئیں وہ بالکل خلاف فطرت نبوت قرار پائیں گے۔ اور اس لئے ان پر ایمان لانا بھی واجب نہ ہوا۔ حالانکہ قرآن مجید بجا کتب سابقہ پر ایمان لانے کو واجب ٹھہرتا ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی ایک ایسی آیت پر بھی ایمان لانا واجب نہ ہو ایں میں کتب انبیاء پر ایمان لانا واجب قرار پایا ہے۔ اور قرآن مجید کی ایسی آیات پر نہ ایمان لانا لو فتن بعض و نکفر بعض کا مصداق ٹھہر گیا۔ یا لوں کہو کہ قرآن مجید کی تکذیب لازم آگئی۔ سبحان اللہ! کیا مضبوط دلیل ہے جس کا نتیجہ کہاں سے کہاں تک مسلم فساد ہے۔

نہ عشق نیست در سر تو نہ رو کہ تو مست آب انگوری

پھر سید صاحب لکھتے ہیں کہ ہم مقتضائے فطرت انسانی یہ بات دیکھتے ہیں کہ تمام ملکات انسانی کسی حرکت یا کسی امر کے پیش آنے پر اپنا کام کرتے ہیں ماسی طرح پر ملکہ نبوت بھی جب ہی اپنا کام کرتا ہے جبکہ کوئی امر پیش آتا ہے ۔

معلوم نہیں کہ سید صاحب ملکہ کے کیا منہ سمجھتے ہیں ۔ اگر ملکہ سے قابلیت مراد ہے تو قبل از نبوت وہ ملکہ کہاں تھا ۔ حالانکہ سید صاحب نے خود ہی لکھا ہے ۔ النبی نبیؐ ولو کان فی بطن امہ ۔ (نبی ماں کے پیٹ ہی میں نبی ہوتا ہے) مح ہذا ۔ قابلیت کو ملکہ نہیں بولا جاتا ۔ اور اگر یوں کہو کہ قبل از نبوت وہ ملکہ درخ طور پر موجود نہیں تھا ۔ تو ہم کہیں گے کہ ملکہ تو کیفیتِ راسخہ کا نام ہے پھر ملکہ نبوت کا لفظ نہ بولو ۔ قابلیت کہو اور صرف قابلیت تو کوئی شے نہیں ۔ کیونکہ ایک ناخواندہ جاہل میں بھی لکھنے پڑھنے کی قابلیت موجود ہے ۔ مگر وہ فی الحال لکھ پڑھ نہیں سکتا ۔ اس لئے قبل از نبوت لفظ ملکہ کا استعمال کس قدر بھاری غلطی ہے اور کسی امر کے پیش آنے پر ملکہ نبوت کا اپنا کام کرتا بالکل بے معنی بات ہے ۔ کیونکہ کئی ایک مواقع پر جناب پیغمبر خدا کو نزول وحی کی حد سے زیادہ آندو رہی ۔ مگر وحی نازل نہ ہوئی ۔ مثلاً جنگ بدر کے قیدیوں کے یاب میں کئی دن تک وحی کا انتظار رہا یا ۔ قضیہ افک (واقعہ جناب ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا) کے بارہویں کئی دنوں انتظار رہا ۔ اور توہل قبلہ کے متعلق مدتوں آپ منتظر رہے ۔ ہر سہ سوالات مشہورہ (حقیقت روح ۔ قصہ اصحاب کہف ۔ قصہ ذوالقرنین) کے متعلق کئی دن آپ وحی کے منتظر رہے ۔ علیٰ القیاس اگر نبوت مثل دیگر ملکات کے ہوتی تو بالضرورت بروقت ارادہ کے اپنا کام کرتی ۔ دیکھئے جس شخص میں لکھنے کا ملکہ نہ تھا ہے یہ مجرور ارادہ کی بات وہ ملکہ کام دیتا ہے ۔ اس لئے یہ خیال ہرگز قابلِ وقعت نہیں کہ نبوت ایک ملکہ فطری کا نام ہے ۔ بلکہ امر وہی ہے اور یہی تمام ائمہ اسلام کا مذہب صحیح ہے ۔ الخضر خاکسار نے سید صاحب کے سسکہ تحقیق وحی میں جس قدر غور کیا اس کو قابلِ اتمام نہیں پایا ۔ چونکہ بحث وحی و الہام کی شروع تھی اس لئے ضمیمہ سید صاحب کی تحقیق پر مجبوراً مجھے نظر کرنا پڑی تاکہ بعض اصواب جو سید صاحب کی تفسیر کا مطالعہ کر چکے ہوں یا

آئندہ کریں انہیں یہ بات مد نظر ہے کہ وہ سید صاحب کے مذہب پر محض اس جن نطن سے کہ انہوں نے تفسیر قرآن لکھی ہے نہ جھک پڑیں۔ مگر یا اینہم ہم اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے کہ ہدایت ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جو شخص اپنے اعتقاد سے ہٹا اور اپنے مخالف کی کسی بات کو سننا پسند نہیں کرتا۔ ہمارے مضامین اس کے سامنے بالکل لغو اور بے معنی ہیں۔ مگر کسی بات کا فیصلہ یہ ہوتا ہے۔ جبکہ کسی واقعہ کے سامنے پیش ہو جس شخص نے تفسیر و حدیث اصول وغیرہ کو نہیں پڑھا اور مروجہ تعلیم سے فائدہ نہ ہوتا ہے ہی سید صاحب یا مزار صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا اور پھر اس کے کہ وہ چند ایک فلسفیانہ مباحث سے آگاہ ہو جائے اور کیا چل کر گیا۔ آہم بر سر مطلب کہ کیفیت نزول وحی کی حقیقت منجملہ علوم مکاشفہ کے ہے جس کی حقیقت کلیہ پرالتان نہ رہا پھر ریاضت و مجاہدت اس وقت آگاہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ تصفیہ و تزکیہ باطن کے بہت سے مسائل روحانی طے کر چکا ہو۔ اس جملہ سے کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ اس صورت میں تو وحی ایک گورکھ دھندہ ہے جس پر انسانی طبیعت قانع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ خیال بالکل ایک لغو بات ہے کہ ایک عام تعلیم کا آدمی جس نے علوم باطن میں ابھی قدم بھی نہیں اٹھایا حقیقت وحی کو یونہی لفظوں ہی لفظوں میں سمجھنے لگے۔ یہ تو وہ مرحلہ ہے جہاں بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ کے جگر پر خنجر لگتے ہیں کسی لٹو پنچو کا کیا ٹھکانا ہے۔ ایک معمولی بات ہے کہ ایک پرتگیزی سکول کا بچہ ایم۔ اے کلاس کی ریاضی حل کرنے کا دماغ نہیں رکھتا۔ پھر خبر افیہ اور سائنس پڑھ کر حقیقت وحی کا پتہ کیسے لگ سکتا ہے۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ہمارے بعض تعلیم یافتگان کو صرف اسی وجہ سے انکار کا موقع ملا ہے۔ کہ انہوں نے دہریان یورپ کے خیالات کو اپنی تحقیقات مذہبی کا معیار بنا رکھا ہے۔ مگر میں بار بار یہ لکھ چکا ہوں کہ فلسفہ اور سائنس کے لکھنے والے سوائے مادیت کے کسی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان کے اقوال علوم نبوت کی تحقیق میں ہرگز قابل سماعت نہیں علوم نبوت کو سینہ نبوت ہی سے لینا چاہیے۔ مزاح سانچے میں مدد اینٹ کبھی تیار نہیں ہوگی۔ یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب نبی کی روح ملک روحانی سے انصال پیدا کر کے وحی خدا کو اخذ کرتی ہے۔ تو بعد میں وہ صورت الفاظ کیونکر اختیار کر لیتی ہے اس کا جواب کچھ مشکل نہیں کیونکہ اگر ہم

وہے کو آگ میں رکھیں تو لوہا اس درجہ تک کیفیت حرارت سے متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ آگ کا کام دینے لگتا ہے۔ حالانکہ خود وہ لوہا ہی رہتا ہے۔ اور یہ خیال کہ وہ الفاظ کس زبان کے ہیں سوا اس کا جواب ہے کہ جو زبان اس قوم کی ہوگی جس میں وہ بنی مبعوث ہوا ہے اور جو خود وہ بنی بولتا ہے۔

چونکہ خدا کے لئے سب زبانیں ایک ہی ہیں۔ اس لئے دنیا کی زبانوں میں سے جس زبان میں کوئی نبی مبعوث کرنا چاہے۔ اس میں اس کو وحی کیا کرتا ہے۔ کوئی نئی آسمانی زبان وحی کیلئے مخصوص نہیں۔ کیونکہ اگر دنیا کی زبانوں سے کوئی علیحدہ زبان وحی کے لئے ہوتی تو تعلیم وحی کو لوگوں تک پہنچانے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ بلکہ ناممکن تھا۔ کہ کوئی نبی مقصد تبلیغ کو پورا کرتا۔ اور بعض متکبرین نبوت کا یہ کہنا۔ کہ اگر آسمانی تعلیم دنیا میں آسکتی تو کسی دنیا کی زبان میں کبھی نہ آتی باطل لغو اور لمے معنی ہے۔ کیونکہ ہر طرح سطح سمندر پر سے تجارت اٹھ کر اوپر کھجاتے ہیں اور پھر پانی کی شکل میں اتر کر زمین مرعہ کو سیراب کرتے ہیں اسی طرح انہیں دنیوی زبانوں کے الفاظ میں آسمان پر سے کسی نبی پر بابانِ وحی نازل ہوا کرتا ہے۔ مناسبت مقام سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سچے نبی اور جھوٹے نبی میں چند وجوہ امتیاز کو قلم بند کیا جائے ممکن ہے کہ بعض کم استعدادوں کو مفید ثابت ہو۔ واضح ہو کہ حق و باطل میں امتیاز کو شکل بھی ہے اور آسان بھی جس شخص کی جیسی فطرت ہوتی ہے ویسے ہی امر کو قبول کر لیتی ہے۔ اہل حق حق کو اور باطل باطل کو مان لینے میں تامل نہیں کیا کرتے اور بالابینہ ہر دو گروہ مدعی حق بھی ہوتے ہیں پھر فیصلہ ہوتا تو کیونکر؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فیصلہ ممکن ہے کیونکہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہر دو فریق سے ایک فریق حقیقی جواب سے عاجز ہو جائے مگر اس کا فریق ثانی کے مذہب کو مان لینا اگر محال نہیں تو اس کے النادر کا لعدم ہونے میں شک نہیں وہ لوگ جو کوئی باطل طریق اختیار کر لیتے ہیں ان کی ایک بڑی وصف یہ ہے کہ بیہودہ بگو اس اور ہر ایک قسم کی دھوکا دہی اور منصوبہ بازی اور اپنی جمیعت پر ہم پہنچانے میں پورا پورا زور دھکتے ہیں مگر چونکہ صرف ظاہری ظاہر ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ بجائے حقیقت کے لمبے لمبے دعاوی ہوتے ہیں اس لئے اہل حق ایسے لغویات کی طرف مطلقاً متوجہ نہیں ہوتے

اور بالآخر باطل کچھ مدت کے لئے اپنی نمائشی چمک نکدھلا کر کرک شب تاب کی طرح آفتاب حق کے نکلنے سے پہلے ہی زلویہ عدم میں جا بیٹھتا ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قلیل عرصہ میں بھی وہ لوگ جو علوم سے مطلقاً بے بہرہ یا ہوائے نفس میں گرفتار ہوں نام باطل میں ضرور پھنس جاتے ہیں۔ جہاں سے ان کا نکلنا قریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اعاذنا للہ منہ۔

حکیم ابو علی مسکویہ التوفی ۷۲۱ھ نے اپنی کتاب الفوز الاصغر کی آخری فصل میں الخیزان فی الفرق بین البتی والمبتی۔ (سچے اور چھوٹے) بنی میں فرق بحث کی ہے۔ وہیں سے چند وجوہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں +

وہ لکھتے ہیں کہ اہل حکمت و نظر پر تو یہ معاملہ مخفی نہیں ہوتا۔ مگر عامۃ الناس کیلئے دشوار رہے کہ خدا کا سچا نبی تمام فضائل و کمالات نبوت کا جامع ہوتا ہے وہ بلا تعلیم ایسے علوم کا مالک ہوتا ہے جو دوسروں کے مدار عقل سے خارج ہوتے ہیں وہ فطرتاً لذات جسمانیہ حیوانیہ سے نفرت کرتا ہے۔ وہ آداب و شرائع دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس پر ہر ایک مشکل امر آسان ہوتا ہے اور وہ موت سے نہیں ڈرتا اور قوم کی طرف سے تمام اذیتوں اور سختیوں کو برداشت کر نیکی طاقت رکھتا ہے۔ اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ دوسروں کو ان کے اختلاف فطرت کی رُو سے مختلف پیرایہ بیان سے حق کی طرف کیھنے لے اور حقائق شکہ اور معانی دقیقہ کے بیان کرنے کے لئے خدا نے اس کو ایک ایسی قوت عظیمہ دے رکھی ہوتی ہے۔ کہ وہ انہیں ضرب الامثال اور مختلف طریق نظر و استدلال سے بآسانی واضح کر سکتا ہے اور جہاں خرق عادات کی ضرورت ہو۔ خدا اس میں اس کو کامیاب کرتا ہے +

اور حقیقتاً نبی مذکورہ بالا صفات کے متضاد ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ حقیقت وہ جاہ اور لذت و نیرو کا طالب ہوتا ہے اور اس کی تمام کوشش انہیں باتوں کے حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے کہ وہ

اچھے سے اچھے کھانے کھاتے اور نائٹینوں کے تاج کا طالب رہتا ہے بعض حالات میں ان خصوصیات شروع شروع میں ممکن ہے کہ یہ معاملہ اکثر لوگوں پر مخفی رہے مگر باآخراً سمجھنے والے سمجھ جاتے ہیں اگرچہ چند بوقوت اس کے پیچھے لگ ہی جائیں۔ ایسے جھوٹے نبی کو بظاہر کسی قدر فروتن اور متواضع ہونا ضروری ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ زہد و ورع کے آثار بہ تکلف اپنے اندر پیدا کر لے وہ کچھ پیشین گویاں یا دیگر تشبیہ بھی دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ جن پر عوام الناس عموماً دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اگر اس سے حقائق و معارف کی بابت سوال کریں تو بسا اوقات اپنا کلام انبیاء علیہم السلام کے کلام کے طرز پر القا کرتا ہے۔ اور انہیں کے کلام سے مضامین کو لیکر اپنی عبارت میں بیان کرتا ہے اور کبھی کبھی اپنی رائے کو بھی ساتھ شامل کر دیتا ہے۔ مگر چونکہ بناوٹ ہوتی ہے اس لئے جا بجا اس کے کلام میں تناقض اور مخالفت موجود ہوتا ہے +

ناظرین ذرا متفہمی دیر کے لئے اس فاضل کے مذکورہ بالا فقرات میں غور کریں اور سمجھیں کہ کس قدر زیرکی اور دانشمندی کیساتھ وجوہ اتیان کو چھانٹ کر دکھایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں آجکل کسی منہ پر بیٹھا حقیقت حال کا مشاہدہ کر رہا ہے +

الوحی والفیلسفہ

اب ہم تعلیم وحی اور تعلیم فلسفہ کا مقابلہ بلحاظ ان کے نتائج اور آثار کے کرتے ہیں اور ناظرین پر اس امر کا اظہار واجب سمجھتے ہیں کہ ان ہر دو قسم کی تعلیم میں کون سی تعلیم واجب الاتباع ہے یہ مضمون بہت اہم ہے اُمید ہے کہ ناظرین کے لئے موجب دلچسپی ہوگا +

تعلیم وحی اور تعلیم فلسفہ میں وجہ امتیان یہ ہے کہ تعلیم وحی کا منبع خود ذات باری ہے اور تعلیم فلسفہ انسان کی محدود عقل کا نتیجہ ہے۔ عقل ان فی خواہ حقائق اشیاء کے مطالعہ میں

لے لفظ محدود عقل سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ انسان بذریعہ فکر کے خواہ کسی قدر وسیع معلومات کا +

کسی وجہ تک ترقی کر جائے مگر پھر بھی وہ اپنے ادراج پر واز سے آگے ترقی نہیں کر سکتی اور یہ کوئی مخفی امر نہیں بہر ایک ذی ہوش اس کی تصدیق کرتا ہے۔ موجودہ محققین نے ثابت کیا ہے۔ کہ پانی کو ایک خاص حد تک گرم کرنے سے حرارت غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ یعنی جب پانی سو درجہ تک گرم ہو جائے پھر خواہ کسی قدر اسے حرارت پہنچائی جائے زیادہ گرم نہیں ہو سکتا وجہ اس کی یہ ہے۔ کہ پانی میں اس سے زیادہ حرارت قبول کرنے کی استعداد نہیں اور اگر خیال صحیح ہے تو کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون قطعی ہے۔ اسی طرح ربڑ کا چمڑہ ایک خاص مقدار سے زیادہ کھینچنے سے کھینچ نہیں سکتا بلکہ اگر زیادہ کھینچنے کی کوشش کی جائے تو ٹوٹ جائیگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں صرف اپنی استعداد کے مطابق کھینچنے کی قابلیت ہے بعینہ یہی مثال عقل انسانی کی ہے کہ وہ صرف مادیات میں غور و پرداخت کرنے سے بعض امور کی تحقیق تک پہنچ سکتی ہے جن سے وہ اپنی معاش میں مستفید ہو سکتی ہے ورنہ ذات باری عز و جل کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں دیکھ سکتی کہ ہر ایک مصنوع کے لئے ایک صالح کی ضرورت ہے اور بس۔ مگر برخلاف اس کے تعلیم وحی نہ صرف حقائق اشیاء کا پتہ دیتی ہے بلکہ صفات باری عالم آخرت اور نعیم و عذاب بعد الموت وغیرہ مسائل سے بحث کرتی ہے جن کا پتہ لگانے سے عقل انسانی بالکل عاجز ہے۔ مگر عقل انسانی ان مشکلات مسائل کی عقدہ کشائی نہیں کر سکتی اگر لایا ہوتا تو حکمت ذات باری تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی متقاضی نہ ہوتی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ جن لوگوں نے علوم عقلیہ میں زیادہ شغل رکھا ہے اور اس کے حبش میں مدتوں غلطان اور بیجاں رہے ہیں تاؤ و تادہ ہی حقیقی ایمان کی منزل تک پہنچ سکے ہیں اور یہ کچھ اسلامی زمانہ کے لوگوں سے مخصوص نہیں بلکہ قبل از اسلام بھی علوم عقلیہ کے ماہرین انبیاء

کا مالک ہو جائے مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جان سکتا کہ ہر مصنوع کے لئے کسی صالح کی ضرورت ہے اور یہ بات تعلیم وحی کا پہلا سبق ہے۔ جو اسلام قبل کرنے والے کو جملہ الاموال اللہ میں سکھایا جاتا ہے۔ ۱۲ منہ۔

علیہم السلام کی پیروی سے مخرف ہے ہیں۔ ان لوگوں کے خیال میں نبوت کی ضرورت صرف عوام الناس کی ہدایت کے لئے ہوتی ہے۔ جو لوگ علوم عقلیہ میں ماہر ہو جائیں انہیں تعلیم وحی کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہ تو صاحب کمال ہو کر دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ آج کل یورپ کے بڑے بڑے ذہین خیال کے لوگ بھی اسی ضلالت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اور جن کا مذہب دہریت یا لاندہریت ہے بلکہ ان کی تصانیف سے واضح ہوتا ہے۔ کہ وہ نبوتِ تعلیمِ نبوتِ وحی۔ جزا و سزا حشر۔ جنت و جہنم۔ ملائکہ و شیاطین وغیرہ معتقدات کو مجنونانہ خیالات سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہیں شیاطین کی کتابوں کے مطالعہ سے مسلمانوں کے لاکھوں تعلیم یافتہ محض برائے نام اسلام سے وابستہ ہیں۔ اور اگر کوئی بڑی سمجھ کا نخل آئے تو اس سے زیادہ نہ ہوگا۔ کہ وہ نچریت کو اپنا شعار بنا لے گا۔ جو انکار کی ایک بدنام صورت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ تاریخِ انبیاء یا کتبِ سماویہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمِ وحی نے ہر ایک زمانہ میں اس کے ماننے والوں کو متحرک یا معاندین پر غلبہ دیا۔ اور لوگوں کی ہدایت اور دینی اور دنیوی بہبود کا ذریعہ ہوتی رہی اور اب بھی ہے اور ہوگی۔ مگر فلسفہ اور الہیات کی تحقیق نے بحرِ فتنہ و فساد کے دنیا میں کیا کام کیا ہے اور لوگوں کی صلاحِ دینی و دنیوی میں کہاں تک مفید ثابت ہوئی۔ اہل تاریخ جانتے ہیں کہ جب کبھی کوئی فتنہ مکی پیدا ہوا ہے تو اس کی بنا ہمیشہ اہل فلسفہ کے معتقدات باطلہ پر قائم ہوتی ہے نصاریٰ اور اہل اسلام کی تاریخِ سلاطین و خلفائے یثنا بت ہوتا ہے کہ شریعتِ حقہ کے معتقدات اور احکام میں بے اعتدالیاں پیدا کرنے والے ہمیشہ علوم عقلیہ کے ماہر بن ہوئے ہیں۔ کیونکہ جب ان لوگوں نے دیکھا کہ شریعت کا مقابلہ تو ناممکن ہے تو انہوں نے شریعت کے لباس میں اگر شریعت میں رختہ اندازی کرنا اپنا شیوہ بنا لیا جس کی صورت یہ تھی کہ شریعت کو بظاہر قائم رکھ کر معتقدات کی تاویلی صورت اختیار کی جاتی تھی اور اپنے پیروان میں یہ خیال پھیلایا جاتا تھا کہ عوامِ جہال کیلئے دقیق امور کا سمجھنا چونکہ دشوار تھا۔ لہذا شریعت نے ان امور کو تشبیہ و استعارہ کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ اس خیال کی آڑ میں ان ناہنجاروں نے مذہبی دنیا میں ہزاروں ایسے انقلابات

پیدا کئے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تمام ہونے والے ترین میں کوئی مذہب ایسا نظر نہیں آتا جس میں کثرت
 اختلاف کی وجہ سے سینکڑوں فرقے پیدا ہو چکے ہوں۔ غور کر کے دیکھ لو کہ یہ خرابی انہیں مشیاطین فلسفہ
 اور باہرین علوم عقلیہ کی ہے۔ دور کیوں جاتے ہو۔ پہلے اپنے گھر میں دیکھ لو کہ حضرات تابعین کے
 اخیر زمانے میں کچھ کچھ عقل اسلامی معتقدات میں ہونے لگا۔ اور بالآخر دوسری صدی کے اخیر میں تو
 عقلیات کے بنیہ قدم اٹھانا عار سمجھا جاتا تھا۔ صرف ایک مسئلہ جو وقت میں مسیوں مذہب قائم
 ہوئے اور خلقِ قرآن کے مسئلہ نے تو خرن کی ندیاں بہا دیں۔ ہر فرقہ کا علم کلام جدا جدا قرار پا گیا۔ اور
 ایک کو دوسرے کا مخالف ہونا ضروری سمجھا گیا۔ حالانکہ قرآن ایک اور صاحبِ شریعت ایک مگر
 لطف یہ کہ جس آیت کو ایک شخص اپنے اثبات و دعویٰ میں پیش کرتا ہے۔ اسی کو اس کا مخالف جو ٹوٹ
 کر کے اس کے متضاد مفہوم میں پیش کرتا ہے۔ یہی صورت بعینہ نصاریٰ میں واقع ہوئی جبکہ ان کی
 مخالفت محاسن نے جو مسطوطینہ کے عیسائی بادشاہوں کے زیرِ اہتمام قائم ہوئیں حقیقت مسیح کی
 تیسرین میں اس قدر شور و غلب کیا کہ کشت و خون کی نوبت پہنچی اور بعض نے بعض کو ملعون قرار دیا چنانچہ
 حقیقت مسیح کے متعلق کج عیسائی ملت کے مختلف طوائف کا خیال باہم اس قدر متضاد ہے کہ ان کا
 متضاد خیال ہونا ناممکن ہے ہم ان مختلف واقعات کو بالتفصیل لکھتے مگر چونکہ موجودہ بحث سے چن چل
 مربوط نہیں۔ اس لئے ان کو ملتوی رکھا جاتا ہے۔ ہاں اس قدر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ان سب
 اختلافات کی بنا صرف اس فلسفی تعلیم پر تھی جس کو مصروفینان کے فلسفہ دانوں نے مذہبی اصول کے
 ساتھ اسی طرح مخلوط کر دیا تھا جس طرح فلاسفہ اسلام نے فلسفہ یونان کو اسلام کے سادہ اور صاف
 معتقدات میں گڑبڑ کر کے فضول علم کلام کی بنیاد ڈالی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ لوگوں کو کتاب و سنت
 کی طرف تحقیق مسائل کی رغبت نہ رہی اور قسم قسم کی بد اعتقادات میں مبتلا ہوئے۔ انہیں وہ بزرگ
 خود تحقیق و تدقیق سمجھا کئے اور اب ہمارے موجودہ نا، بنامہ زمانہ میں بھی مسلمانوں کا ایک گروہ ہمیشہ اس
 امر کے درپے رہتا ہے کہ مذہبی مسائل کو عقلیات کے ساتھ مطابقت کرنے کی کوشش کرے اور
 آیات و احادیث کو خلافِ منشاء سنت صحیحہ جو شمار بزرگانِ ملت تھا اپنے معتقدات فاسدہ کے

اثبات میں پیش کر دیا کرتے ہیں چنانچہ ایک اسلامی رسالہ کے کسی نمبر میں ہم نے ایک نیچری کامیونیشن ہونے
 ملحد ڈارون فلاسفر کے مسئلہ ارتقاء کے انسان کے اثبات میں پڑھا جس میں اس نے یہ ثابت کرنے
 کی کوشش کی ہے کہ انسان کی ابتدا فطرت بندہ سے ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ تہذیب پا کر وہ
 انسان بن گیا۔ چنانچہ قرآن مجید بھی اس خیال کی تصدیق کرتا ہے۔ حیث قال اللہ تعالیٰ و
 قد خلقکم اطواراً اور نیز فرمایا آنبتکم من الارض نبتاً ممکن ہے کہ وہ لوگ جو جنی نمی تحقیق کے
 سننے کے عادی ہیں اور جن کا مذاق فلسفی تعلیم نے فاسد کر رکھا ہے اور جنہیں آیات و احادیث پر
 جو قطعی حجت ہیں قناعت نہیں ہوتی۔ اس قسم کے فضول استدلال کو سن کر واہ واہ پکارا اٹھیں۔ مگر
 حق یہ ہے کہ علماء و را سخن فی اعلم جو کتاب و سنت کے حامی اور ناصر ہیں اس قسم کے ہدیان کو
 سن کر ہنس دینگے یا یوں کہوں کہ جن جاہلوں کے علم و عقل پر رو دینگے۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہمارے تمام
 خارجی افعال میں خواہ تمدنی ہوں یا ملکی ہمارے معتقدات کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ جب معتقدات
 حقہ کتاب و سنت سے اخذ کئے جائیں۔ تو یقیناً ہمارے خارجی افعال بھی شریعت اسلامی کے
 دائرہ سے باہر نہیں جائیں گے۔ چونکہ تعلیم یافتہ گروہ کے عقائد کا کثیر حصہ ملاحدہ یورپ کی تحقیق
 و تدقیق پر مبنی ہے اس لئے موجودہ اسلامی اُمت کے افعال سب کے سب خلافت شریعت کہنے
 جاتے ہیں جن میں اخلاص کی پوچھ نہیں پائی جاتی بلکہ بغض وہ امور جو بظاہر حکم شریعت کے مطابق
 سمجھائے جاتے ہیں کسی یا ایک پہلو میں محض نفس پرستی یا نمائش یا بناوٹ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور
 ان کے فاعل کو اپنی اس غیر مخلصانہ حالت کا علم ہوتا ہے مگر بظاہر نہایت تکلف سے وہ اس
 کو زیور اخلاص سے مزین کر رہا ہوتا ہے۔

اور قوم کے لئے یہ ایک ایسا عذابِ عظیم ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی دردناک عذاب
 نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ سزا ہے اس ناہنجارانہ حرکت کی جو کتاب اللہ اور سنت سے اعراض کر لینے پر
 مترتب ہوا کرتی ہے۔ بھلا اس سے بڑھ کر اور کونسی خسارت ہوگی کہ ایک شخص اپنے وقت
 مال و محنت کو صرف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں بمقدار پر کاہ بھی اس کی وقعت نہیں۔ غور

کر کے دیکھو کہ اس عذاب میں امت کا ایک جم غفیر مبتلا ہے۔ صدق اللہ تعالیٰ الدین معلل
 سیدہم فی الحیوة الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعاً یعنی ان لوگوں سے
 بڑھ کر اور کوئی شخص اپنے اعمال میں ناکام نہیں ہو سکتا جو محسن بنیادی نبی کی خاطر اپنی کوشش کو کھو دیتے
 ہیں اور اپنے زعم میں نیک کام کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اہل فلسفہ و عقل میں سے ہم نے آج تک کوئی صاحب ذکر دیکھا ہے اور نہ
 شاہجہان اور نہ یحییٰ بن جابر کہ ایسے شخص کو یہ عالمی رتبہ بھی نصیب نہ ہو بلکہ اطمینان قلب و عقلیات کے ساتھ
 کبھی جمع نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ ہمیشہ شکوک و ادھام کی دلدل میں پھنسے رہتے ہیں اور اسی پران
 کا خاتمہ ہو جاتا ہے برقعات اس کے سلسلہ میں کتاب سنت کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ ہر وقت نفس
 کی نگرانی اور اپنے اعمال کی کیفیت کو معیار شریعت پر جانچتے رہتے ہیں۔ اور کسی ایک سنت پر
 عمل کر لینے سے دوسرے ان کو محال ہوتا ہے اس کا مقابلہ دنیا کی کسی نعمت سے نہیں ہو سکتا۔ یہ
 لوگ ہمیشہ صاحب ذکر ہو۔ نہ ہیں اور کسی وقت عقلت کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے۔ ان کا
 ظاہر باطن کے مطابق اور باطن خوف ورجا اور محبت و شوق سے پُر ہوتا ہے۔ ان کا دل مر بالمرہ
 اور ہنسی عن النکر اور خیر خواہی خلائق میں بسر ہوتا ہے اور بات اپنے مولیٰ کی بارگاہ میں مناجات
 اور اظہار شوق و محبت میں گزار دیتے ہیں جبکہ دیگر نفس پرست اور ناز و نعمت کے پرورش یافتہ
 لوگ عقلائے شہوت میں لگے ہوتے ہیں یا عقلت کی نیند میں مردوں کی طرح پڑے پڑے ات
 گزار دیتے ہیں اور آفتاب نکلنے پر کفار کی طرح تھوڑا سا پانی لیکر منہ صاف کر لیتے ہیں اور آرائش
 و بناوٹ کی تیاری میں گھنٹوں ضائع کر دیتے ہیں اور قیام لیل اور ذکر و تسبیح کی بے بہا نعمت سے
 غم بھر محروم رہتے ہیں۔

اور حقیقت غور سے دیکھو تو یہی شان تھی جناب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی جن کو
 اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین کر کے مبعوث فرمایا عبداللہ بن رواحہ نے حضور کی شان والا کو
 الفاظ ذیل میں ظاہر فرمایا ہے۔

یہیبت بجا فی جنبہ عن فراشدہ - اذا استقلت بالمشرقین المضاجع
یعنی حضور علیہ السلام رات بھر لیتر خواب سے علیحدہ ہو کر اپنے مولیٰ حقیقی کی بارگاہ میں مناجات کرتے
گزارتے ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جبکہ مشرکوں کو اپنی خوابگاہوں کا چھوڑنا وبال جان ہوتا ہے *
قیام سبیل اور مناجات ایک ایسی زبردست سلطنت ہے جو صرف حضور علیہ السلام کے حصہ میں چلی
سکتی اور اسی سلطنت میں سے حضور کے دیباہیوں کو بھی کچھ کچھ حاصل گیا۔ البوسلیمان دارانی رحمہ اللہ
فرماتے ہیں لولا اللیل ما اجبت البقاء فی الدنیا یعنی اگر قیام سبیل اور مناجات و ذکر و تسبیح
کا لطف نہ ہوتا تو ہم اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے *
دیکھو ایک اہل دل بچھلی رات اٹھ کر بارگاہ ذوالجلال میں حاضر ہو کر کن الفاظ میں عرض
حال کرتا ہے

ومالی لا انوح علی خطائی - وقد باسہزت جبار السماء
یعنی کیا وہ ہے کہ میں اپنے گناہوں پر آٹھ آٹھ آنسو نہ روؤں جبکہ میں اللہ تعالیٰ کے
مقابلہ میں انواع و اقسام کی گستاخیوں کا مرتکب ہو چکا ہوں؟ *
قرأت کتابہ وعصیتُ سیرا - لعظم بلیتی و لشوم رائی
یعنی میں نے اس کی کتاب کو چڑھا اور چھپ کر گناہ کا ارتکاب کرتا رہا اور یہ بات
میری اپنی بدبختی اور بدرائی کا نتیجہ تھی *
بلائی لا یقاس بہ بلاء - وافاقی تدل علی شقائی
میری مصیبت (گناہان) پر کسی اور مصیبت کو قیاس نہیں کیا جاسکتا اور میرے مصائب
میری بدبختی پر طالع ہے *
فیاذلی اذا ما قال دبی - لی النیران سو قوا ذالمرائی
آہ میری ذلت جبکہ میرا پروردگار یہ حکم دیگا کہ اس ریاکار کو جہنم کی طرف

فہذا کان یحصینی مرارا - ویزعمرائہ من اولیائی
کیونکہ بیشخص بار بار ہمارے سرکشی کیا کرتا تھا اور اپنے دل میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ میں
اولیاء اللہ کی جماعت میں داخل ہوں *

تصنع للعباد ولم یردنی - وکان یرید بالمعنی سوائی
یہ شخص لوگوں کے سامنے اعمال میں بناوٹ کیا کرتا تھا یعنی بظاہر اپنے اعمال اللہ
تعالیٰ کے لئے کرتا نظر آتا اور دل میں کچھ اور مد نظر ہوتا *

مسطورہ بالا اشعار ایک نئی کمال کا کلام ہے جس سے ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے
کہ حقیقتِ عبودیت کو سوا سالکانِ حق کے جو حقیقتِ لفظ انسان کا مصداق ہوتے ہیں اور کوئی
شخص نہیں سمجھ سکتا۔ بھلا ایک فلسفی کو جس کو اپنے خیالاتِ باطلہ پر بڑا گھمنڈ ہو کر رہا ہے اور
شب و روز نفسِ ظالم کے پیچ میں گرفتار ہے اور لذتِ ذکر و عبادت سے کبھی بے بہرہ ہے
یہ رتبہ کیونکر نصیب ہو سکتا ہے؟ ہمارے اس خیال کی تصدیق میں ذیل کی رباعی نہایت
موزون اور مفید مطلب ہے۔ ناظرین غور فرمادیں۔

اس نعمتِ بیدلی بہر دل ندہند - ویں نزلِ نجفگان منزل ندہند
در عالمِ عشق آنچہ بے عقلاں است - یک ذرہ بصد ہزار عاقل ندہند
یعنی محبتِ الہی کی نعمت ہر ایک کو نہیں ملا کرتی۔ قاعدہ ہے کہ جو شخص مسافت طے کر کے
منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے۔ ماحضرِ مہمانی کا مستحق ہوا کرتا ہے۔ اور جو لوگ راستہ ہی میں غائب
خفقت میں پڑے سوتے ہیں وہ اس مہمانی سے محروم رہا کرتے ہیں۔ عالمِ عشق میں جو کچھ ان
اہلِ محبت کو ملا کرتا ہے جو بظاہر بے عقل ہوتے ہیں مگر جن کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے صاف ہوتا
ہے۔ اُس کا عشرِ عشیر بھی ان لوگوں کو نہیں مل سکتا جو عقل و علم کے مدعی ہو کر صراطِ مستقیم سے
دور پڑے رہتے ہیں *

ناظرین اس امر کو ذہن نشین کر لیں کہ خاکسار نے عمر بھر کے مطالعہ کتب کے بذریعہ نتیجہ نکالا ہے

کہ کوئی شخص درجہ کمال انسانی کو بجز اتباع کتاب و سنت کے حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اتباع کتاب و سنت سے میری مراد یہ ہے کہ علوم کتاب و سنت کا مقتضی شخص متبع کے ظاہر و باطن پر پیدا ہو گیا ہو۔ ورنہ صرف کتاب و سنت کو رسم کے طور پر پڑھ لینے اور سناٹوڑ و جمل کے لئے اختلاف مذاہب کو مضطرب کر لینے سے یہ عقدہ کشائی نہیں ہو سکتی۔ میں اپنے یقین کی رو سے کہہ سکتا ہوں کہ کتاب اللہ اور سنت کے سوا باقی جس قدر علوم دنیا میں مروج ہیں اور جن پر بعض اہل زمانہ کو بڑا غر و مانہ ہوا کرتا ہے ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو لفظ علم سے تعبیر کیا جائے کیونکہ علم درحقیقت وہی ہے جو دنیا میں صراط مستقیم اور مرئیے یوں ان اس سے منتفع ہو سکے۔ غور کر کے دیکھ لو کہ مرتے وقت ہجر معتقدات حقہ یا ان اعمال کے جو کسی نے کئے ہوں آدمی کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا۔ دنیوی علوم سب کے سب یہیں رہ جاتے ہیں بلکہ بسا اوقات معتقدات باطلہ مرتے وقت موجب تنویش اور توضیح الایمان ہو جاتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ معتقدات صحیحہ یا غیر صحیحہ نفس میں راسخ ہو گئے ہوتے ہیں اور قطع تعلق بدن کے وقت جبکہ معاملہ محض اللہ تبارک تعالیٰ سے ہوتا ہے موجب اذیت ہو کر بصورت عذاب ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اس قسم کی سینکڑوں نظیریں شاہد میرا کلی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرنے والے مرتے وقت وہی بکواس کرتے رہے جن کا انہیں اپنی زندگی میں خیال غالب رہا۔ یا جس چیز کی انہیں خواہش رہی اور کلمہ توحید جو موجب مغفرت ہے ان کی زبان پر جاری نہ ہو سکا۔ لغو ذل اللہ من ہون الخاتمہ حق یہ ہے کہ وہ علوم جو محض دنیوی زندگی کی اصلاح سے تعلق رکھتے ہیں فی الحقیقت علوم کہلانے کے مستحق نہیں۔ اور ان میں بھی دو قسم کے علوم ہیں۔ اول تو محض بے سود اور بے ایمان بنانے کا آلہ ہیں۔ جیسے فلسفہ۔ الہیات۔ نجوم۔ سحر۔ شعبہ وغیرہ اور قانون ملکی بھی ایک حد تک اسی جماعت میں داخل ہے اور دوسرے وہ علوم جو شرعاً ممنوع تو نہیں مگر زائد از ضرورت ان میں وقت ضائع کرنا موجب حسرت و وبال ہے مثلاً حساب۔ طب۔ تاریخ۔ ادب وغیرہ۔ ممکن ہے کہ میری اس رائے سے بعض اصحاب کو اتفاق نہ ہو مگر ایک مسلم الغفر

شخص جو حقیقت انسان کے مال سے واقف ہے اور زندگی کی غایت پر اسکی نظر ہوہرگز نہ مخالفت نہیں کریگا۔ قال بعض العارفين فلا علم الا ما كان من كشف وشهودا عن نظم وفكر وطن وتحمين *

یعنی علم وہی ہے جو اتباع کتاب و سنت سے بطور کشف و شہود کے انسان کو حاصل ہو نہ وہ علم جس کی بنا دلائل عقلیہ اور ظنیات پر ہو کیونکہ وہ علم جو ایمان بقول نبی سے حاصل ہوتا ہے وہی حقیقی علم ہے جو حقائق اشیا کا پتہ دے سکتا ہے۔ اور جو علم محض تجربہ و مشاہدہ سے بطور ظن غالب کے حاصل ہو اہو وہ چنداں مفید نہیں ہوتا۔ دیکھو قرآن مجید میں خود کیسا تھا اس تحقیق کی تصدیق کرتا ہے۔ قال الله تعالى لو ان اهل القرى امنوا والتقوا الفتحنا عليهم بركات من السماء و الا لاسرن۔ یعنی اگر مسیتوں والے لوگ ایمان لے آتے اور اتفاقاً اختیار کرتے ہم ان پر زمینی اور آسمانی برکتوں کا دروازہ کھول دیتے۔ اس آیت میں برکات سے جس طرح جہانی تربیت کے اسباب کا فرخ ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ اسی طرح روحانی اسباب تربیت کی کثرت کا پتہ بھی لگ رہا ہے۔ آیت کا حامل یہ ہے کہ ایمان اور اتفاقاً جہانی اور روحانی ہر دو قسم کی نعمتوں پر مشتمل ہے جہانی نعمتیں تو یہی دنیا کے مال دولت وغیرہ ہیں اور روحانی نعمتوں سے وہ علوم تھے اور معرفت و اسرار مراد ہیں جو عالم سفلی اور عالم علوی کے متعلق ہو سکتے ہیں۔ پھر فرمایا۔ والتقوا الله وعلیکم الله۔ اس آیت میں بھی صاف وعدہ ہے کہ اتفاقاً جو کتاب و سنت کے اتباع پر مبنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے علوم معرفت کے حصول کا موجب ہے۔

مذکورہ بالا بحث سے ہماری غرض صرف یہ ہے کہ علوم عقلیہ میں غلطان و پیمان نہ ہونے والے اشخاص اصل مقصود سے عموماً غافل رہ کر خسر الدنیا والآخرة کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ بلکہ باوقاف حقیقت امر سے جاہل ہونے کی وجہ سے اہل اللہ اور ان کے طریق کے جو مراط مستقیم حقیقی ہے۔ تکذیب کر دیا کرتے ہیں۔ الناس اعداء ما جہلوا۔ یعنی جو لوگ جس امر کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اس کی مخالفت کر دیا کرتے ہیں۔ بھلا کفار قریش

کی مخالفت کی وجہ سے اس کے اور کیا تھی کہ وہ حقیقت نبوت سے جاہل تھے اور اپنے مبلغ علم سے
نیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتے تھے۔

امام حجتہ الاسلام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب المقصد الاسمی میں لکھتے ہیں :-
ولکن العلم لا شرف ما معلومہ اشرف واشرف المعلومات هو اللہ
تعالیٰ فلذلك كانت معرفة اللہ تعالیٰ افضل المعارف بل معرفة
سائر الاشياء ايضا لها شرف لانها معرفة لافعال اللہ تعالیٰ او معرفة
للطریق الذی یقرب العبد من اللہ او الامر الذی یسهل به الوصول
الی معرفة اللہ والقہب منه وكل معرفة خارجة عن ذلك
فليس فيها كثير شرف -

یعنی شریف تر وہ علم ہے جس کا معلوم شریف تر ہو اور یہ مسلم امر ہے کہ سب معلومات سے
شریف تر ذات باری سبحانہ و تعالیٰ ہے اسلئے ذات باری کی معرفت دیگر معارف سے بڑھ کر
شریف ہوگی بلکہ دوسری اشیاء کی معرفت بھی شریف ہے مگر صرف اس حد تک کہ ان کی معرفت کو
افعال ذات باری کی معرفت کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ یا اس کو صراط مستقیم و معرفت کا ذریعہ
قرار دیا جائے جو موجب قرب ہے۔ یا کسی دوسرے طریق پر معرفت ذات کی سہولت کا موجب ہو
اور جس معرفت (علم) کو ان امور سے کچھ تعلق نہیں وہ شریف نہیں کہلا سکتی۔ اب غور کر کے دیکھو کہ
موجودات کے خالق کا علم جس کا دعویٰ عقلیات والے کیا کرتے ہیں انہیں معرفت ذات باری میں
کہاں تک مفید ہو سکتا ہے۔ تجربہ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ اکثر فلسفہ و طبیعیات کے جاننے والے
متکبرین خدا اور متکبرین رسالت ہوا کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی مرد خدا ان میں سے ایسا نکل بھی آئے
جو توحید و رسالت کا قائل ہو۔ تو اس کو ملاوت و ذکر اور تقویٰ النصیب نہیں ہوتا۔ اور ایمان بالغیب
کی حقیقت سے محض جاہل ہوتا ہے۔ بلکہ بات بات میں شک و دوسوسہ کے عادی ہونے کی
وجہ سے وہ علوم نبوت میں بھی شک کرنے لگتا ہے اور تعلیم نبوت کے ایک کثیر حصہ کو بے وقعتات

کے متفق ہوتا ہے۔ یا تو کسی تجویلی صورت میں مانتا ہے یا دل میں اس کی نسبت سونٹن پوشیز رکھ کر بظاہر
 بخوف اتہام خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس کی سینکڑوں نظیری دنیا میں موجود ہیں ہاں اگر
 کسی کو توفیق الہی یاوری کرے تو کسی صاحب کمال کے فیضان صحبت سے مستفیض ہو کر اپنے
 ایمان کو بچا لیتا ہے ورنہ خشک عقلیات والے پناہ بخدا انھیں الشیاطین ہوتے ہیں جو نہ صرف تو گمراہ
 کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ بنا دیتے ہیں۔

دیو یا مہرود یا میند مہترس - بل ہر بل زمران دیوسار

ہیں تو جس قدر عقلیات کے ماہر دیکھتے ہیں آئے ہیں ان میں اکثر جاہل مغرور۔ غافل
 عن الآخرت۔ طالبان نام و نموس۔ حریص۔ شہوت بازو تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ صرف ان
 علوم سے واقف ہوتے ہیں جو انسان کی ظاہر زندگی کی اصلاح تک محدود ہوتے ہیں اور ان علوم
 سے جو انہیں غفلت الہی اور اس کے صفات کاملہ اور عبودیت حقیقی کا پتہ دیں باطل بے بہرہ ہوتے
 ہیں۔

علم کثر تو ترانہ بستاند - جہل ازاں علم بہ بودیار

مکاشفہ

اے کہ آگاہ نہ عالم و لیشاں را - تو چہ دانی کہ چہ سوا و سرست ایشان
 لفظ مکاشفہ کے عنوان پر سید صاحب نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے جس کو وہ جب ذیل
 شروع کرتے ہیں:-

”گو ہم کو کشف و مکاشفہ نہ ہو مگر ہم کو سمجھنا تو چاہئے کہ یہ کیا چیز ہے۔ جاہل طب کو نہیں جانتا
 مگر یہ جانتا ہے کہ طب سے کیا ہوتا ہے اور کینہہ کرتا ہے پس اگر ہم سچی کشف و مکاشفہ سے جاہل ہیں
 تو بھی ہم کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ہے کیا چیز۔ حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ روح اور جسم

میں جو حجاب نہ اس کے اٹھ جانے کو مکاشفہ کہتے ہیں۔ مگر حجاب کے لفظ نے ہم کو گھبرا دیا۔ کہ وہ پردہ کیسا ہے جو رُوح اور جسم کے بیچ میں ہے۔ نہ پردہ ٹاٹ کا ہو سکتا ہے نہ کپڑے کا نہ ٹاٹ بچڑا پردہ ہے تو کاہے کا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ عطاء کا لفظ آیا ہے جس کے معنی بھی حجاب کے ہیں۔ جہاں خدا نے فرمایا ہے: فَكشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَلَتْ أَيْدِيكَ فَالْيَوْمَ مَحْذُودٌ۔ ہم نے جب تفسیروں کو دیکھا۔ تو ان میں عطاء کے معنی غفلت کے لکھے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جو پردہ انسان کے جسم اور رُوح کے درمیان میں ہے۔ وہ غفلت کا پردہ ہے۔ اور اس غفلت کا دور ہونا پردہ کا اٹھ جانا ہے پس انسان مشاغل دنیوی سے جو اس پر پردہ غفلت ڈال دیتے ہیں علیحدہ ہو کر سیدہ حقیقی یا ذات باری کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے خیال کو اسی طرف گاتا ہے تو غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔

پس مکاشفہ ایک حالت ہوتی جو خود انسان کے خیال میں پیدا ہوتی ہے پس جو کچھ کہہ اپنے نفس میں پاتا ہے اور فرض کر کہ وہ اس حالت میں کچھ دیکھتا بھی ہے تو بجز اس کے خیال کے اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے اور اس لئے مکاشفہ کی حقیقت بجز اس کے کہ جس کو خود انسان نے اپنے خیال میں لپکایا ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ الخ

ناظرین خط کشیدہ الفاظ سے بخوبی سمجھ گئے ہونگے کہ سید صاحب کے نزدیک مکاشفہ کی کیا حقیقت ہے مگر گفتگو صرف یہ ہے کہ یہ خیال سید صاحب کا کہاں تک صحیح ہے۔ سید صاحب کا خاصہ تھا کہ وہ ہر ایک علم میں بحث و تحقیق پر آمادہ ہو جایا کرتے تھے اور پھر جو تحقیق وہ کر چکے تھے اس کی نسبت انہیں یہ بھی یقین ہو جاتا تھا کہ وہ عین وحی منزل ہے۔ کچھ تو یہ بات ہر حالت میں یقینی ہے کہ ہر ایک شخص اسی قدر چل سکتا ہے جس قدر کہ اس میں چلنے کی طاقت ہو۔ اور نیز اسی راستے میں چل سکتا ہے جس کا اسے علم ہو۔ سید صاحب نے متعدد جہ سطو میں جو کچھ ممکن ہے کہ ان کے مسلمہ اصول فطرت کے مطابق درست ہو۔ اور ان کے تقلیدین کے لئے حجت بھی ہو مگر ہم تو ان کے انصاف و ایمان کہتے ہیں کہ اگر سید صاحب اس مضمون پر کچھ نہ لکھتے تو یہ بات ان کی متانت و

سنجیدگی سے زیادہ بعید نہ تھی۔ ایک مشہور شاعر ہے۔
ہر کسے را بہر کارے ساختند

دنیا میں کبھی کوئی شخص تمام علوم و فنون کا جامع نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ
جميع کمالات کا جامع ہونا صرف ذات باری کا خاصہ ہے۔ انسان بمقتضائے و ما اذیتہ من
العلم الا قلیل کہ کبھی کامل العلم نہیں ہو سکتا سید صاحب کو جو کمال خدا نے باشندہ گان
ہندوستان میں دیا تھا۔ وہ صرف یہی تھا کہ انہیں اپنی عمر کے پچھلے حصہ میں مسلمانوں کی دینی اصلاح
و فلاح کی دھن سی لگا گئی۔ چنانچہ اس میں انہوں نے وہ کمال پیدا کیا۔ کہ جس کی نظیر کم از کم ہندوستان
کے اس صدی کے مسلمانوں میں شاید ہی مل سکے۔ ان کے اخلاق ان کی معاملہ فہمی ان کی عالی ہمتی
اداسان کی عام ہمدردی ایسے واضح اور بین امور ہیں۔ کہ جن سے کبھی جاہل و بوقوف ہی منکر ہو تو ہو۔
کیسے ظالم ہیں وہ لوگ جو سید صاحب کی مذہبی خوشنوش کو بد نظر رکھ کر ان کے نمایاں کارناموں پر
بھی پانی پھیر دیتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی اسکے میں یہ بھی یقین ہے کہ سید صاحب سے تحقیق مذہب
کے بارہ میں ایسی فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ جن کی بظاہر کوئی ایسی تاویل نہیں ہو سکتی جس سے
کم از کم گروہ علمائیں انہیں مقبولیت کی نظر سے دیکھا جائے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے انہیں
یہ ضرورت بھی نہ تھی۔ کہ علمائے اسلام کے گروہ میں عزت حاصل ہو اور ان کی تحقیقات مذہبی سلم سمجھی
جائیں۔ علماء ہمیشہ انہیں کوستے رہے اور وہ علماء کو ۴

مذکورہ بالا عنوان ایک ایسا عنوان ہے جس پر حضرات شہلی جنید۔ ابو یزید علیم الرحمت جیسے
واعلان بارگاہ نیروانی اور مقبولان حضرت سجانی اگر کچھ اشارہ فرماتے۔ تو حجت قرار پاتا۔
صاحب البیت اعرفت بما فی البیت (گھر والا گھر کی چیزوں سے خوب واقف ہوتا ہے)
صرف یہ کہہ دینے سے کہ مکاشفہ کی حقیقت بجز اس کے جس کو کہ خود انسان نے اپنے خیال میں پکایا
ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں ہوتی۔ بات کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ ہر ایک سلم کی تحقیق اسی فن کا
آومی کر سکتا ہے جس فن سے وہ مسئلہ تعلق رکھتا ہو۔ طبیب سے کسی مسئلہ فقہ کا جواب لینا یا فقیہ سے

کسی مرض کی تشخیص کرانا ایک ایسا امر ہے جس کی نوعیت کا کچھ ٹھکانا نہیں سید صاحب اس امر کے شایاں تھے کہ وہ کسی سیاسی مسئلہ میں گورنمنٹ کو مشورہ دیکر یا علیحدہ حکام کے متعلق تجاویز ترقی سمجھتے خواہ مخواہ حقیقت پر کا شفق پر بحث کرنے بیٹھ گئے اور ان صوفیائے کرام کی تائید شروع کر دی جن کی وساطت سے زمین و آسمان کا سلسلہ قائم ہے جنکی خیر و برکت سے بعضوں حدیث آسمان پر سے پانی بہتا ہے جنکی طفیل مخلوق خدا کو روزی ملتی ہے جنکی پاک انفاس کے اثر سے دلوں سے مادہ کفر و شرک کا قلع و قمع ہوتا ہے جن کی تعلیم حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بالفاظ لادیشی بہم جلیسہم فرمائی ہے اور جن کی توجہ باطنی سے گم گشتگان باطنیہ ضلالت کو بارگاہ رب العزت میں نہایت اعزاز کے ساتھ فیکہ ملتی ہے۔

بحقارت منکر سوے فقیراں ز نہار - کہ رسول عربی سرورِ دولت ان است
 سید صاحب یا کسی دوسرے منکر کے انکار سے طریق صوفیائے کرام کی نہ تو تزیین ہو سکتی ہے اور نہ ہونی ممکن ہے کیونکہ یہی لوگ ہیں جو دے زمین پر رحمت اللہ ہو کہ مدائے خالق اسماوات والارض کے منصب خلافت کے تمام فرائض کو مکمل طور پر ادا کرتے ہیں۔ وہ دیکوں جاتے ہو یا رنجی سلسلہ میں اسی بات کو دیکھ لو کہ ہندوستان جیسے کمزور ملک میں اسلام پاک کی تعلیم کن لوگوں کی مہرت پھیلی اور مقدس اسلام کے انوار کن زندگواروں کی وساطت سے ہم مسلمانوں تک پہنچے۔ صرف ہندوستان ہی کی خصوصیت کیا ہے جہاں جہاں اسلام پہنچا ان ہی مردانِ خدا کے دم قدم کی برکت تھی۔ وہ دینیوی علوم و فنون کے جاننے والے صدیوں بعد اصول ترقی قوم پر بحث کیا کرتے ہیں۔ ہمہ شیران جہاں بستہ این سلسلہ اند - روبرو از حیلہ چہاں بگسلد این سلسلہ را
 یہ لوگ حقیقی طور پر قرآن و سنت کے مالک ہوتے ہیں اور اخلاص و توحید جو دینیوی علوم و فنون

۱۔ صوفیائے کرام سے وہی لوگ مراد ہیں جنہوں نے کمال اتباع سنت و وجہ کلائیات حاصل کیا۔ ۱۲۔ منہ *

۱۳۔ یہ ایک لمبی حدیث کا کڑا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس بچنے والا بھی محروم نہیں ہو سکتا۔ ۱۴۔ منہ *

کے جاننے والوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتے۔ ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے ہوتے ہیں۔ اور اللہ ان کا ہوتا ہے۔ وہ حکم خدا سے الگ ہو کر ایک مانس بھی نہیں لیتے اور خدا سے بچھڑے ہوؤں کو خدا سے ملا دینا انہیں کا کام ہوتا ہے۔

آنکہ زرشوار پر لورالہ قلب سیاہ۔ - کیمیائے است کہ در صحبت و ایشان است

مکاشفہ علم تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔ اس لئے انہیں لوگوں کی لئے اس باب میں حجت ہو سکتی ہے۔ جو اس علم کے وارث ہیں جس طرح کتب فقہ میں جابجا ائمہ اربعہ (ابو حنیفہ - شافعی - مالک - احمد بن حنبل) کے اجتہادات کا ذکر آتا ہے۔ یا کتب فلسفہ میں فارابی - بوعلی سینا وغیرہ علماء کا اسی طرف کتاب تصوف میں ائمہ تصوف کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں اور انہیں کی تعلیمات حقہ سے حقائق و معارف قرآنیہ کا علم ہو سکتا ہے وہی نفس کی اندرونی بہرہ منوں کو بیان کر کے ان کا طریق استدلال بتلاتے ہیں۔ وہی اسماء صفات الہیہ کی تجلیات کو سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو بذریعہ ریاضت و محاببت اس درجہ تک کھینچتے ہیں سید صاحب عبث اس مسئلہ میں دخل دینے بیٹھ گئے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقت امر سے نا آشنا رہ کر منکر ہو گئے اور اسی تحقیق تک پہنچ سکے۔ کہ فقط ایک خیال کو پکا لینے کا نام مکاشفہ ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ کیونکر سید صاحب یہ لکھتے ہیں کہ گو ہم کو کشف و مکاشفہ نہیں ہوتا۔ لیکن میں سمجھنا تو چاہئے کہ وہ ہے کیا چیز اگر حقیقت مکاشفہ یونہی باتوں ہی باتوں میں طے ہو جاتی تو پھر مشکل ہی کیا تھی۔ ہر ایک شخص صاحب مکاشفہ ہو سکتا ہے بلکہ سید صاحب نے جو حقیقت قرار دی ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک وہم کے غالب آجانیکا نام مکاشفہ ہے خواہ غلط ہو یا صحیح ورنہ دراصل کوئی بات نہیں جو قابل اعتماد ہو بیشک ہم مانتے ہیں کہ ایک جاہل طبیب نہیں جانتا۔ مگر یہ جانتا ہے کہ طب سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جاہل اس قدر جاننے سے اصول طب اور تشخیص مرض اور طریق معالجہ کا بھی واقف ہو جائیگا۔ اس کا صحیح جواب یہی ہے کہ ہرگز نہیں۔ پھر کیسے سید صاحب کہتے ہیں۔ کہ گو ہمیں کشف و مکاشفہ نہیں ہوتا۔ مگر میں یہ تو سمجھنا چاہئے کہ وہ ہے کیا چیز۔ پس اس سمجھنے کا نتیجہ

تو اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ آپ مجھیں کہ مکاشفہ مروان تھلکی ایک حلی حالت کا نام ہے اور بس اگر کوئی پوچھے کہ اس سے آپ کو کسی کیفیت روحانی کا بھی اور اک ہوا۔ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہونا چاہیے یہ تو ایک موٹی سی بات ہے کہ ایک شخص کو درود ہو رہا ہے۔ دیکھنے والے کو سوا اس کے کہ فلاں شخص کو درود ہو رہا ہے اور وہ اس سے تکلیف پایا ہے اور کچھ بھی حاصل نہیں مگر جس شخص کو درود ہوتا ہے۔ اسے کیفیت درد کا احساس ہوتا ہے جس سے وہ متاثر ہو رہا ہے۔ ہاں کسی منکر کو حق ہے کہ کہہ دے کہ اس شخص کو کوئی درود نہیں۔ جب جسمانی کیفیات کی یہ حالت ہے کہ ایک شخص کی کیفیت اور اک کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ تو روحانی کیفیات مثلاً مکاشفہ کو ایک عام تعلیم کا آدمی کیا خاک سمجھ سکتا۔

پرسید کسے کہ عاشقی چسیت۔ گفتہ کہ چو ماشوی بہ دانی
مکاشفہ کی حقیقت کو امام حجت الاسلام ابو حامد محمد غزالی قدس اللہ سرہ الغری نے اہیالہکم کی جلد اول میں حسب ذیل ظاہر کیا ہے کہ
”علم آخرت کی دو قسمیں ہیں علم مکاشفہ۔ علم معاملہ۔“

علم مکاشفہ ظہر باطن کا نام ہے اور یہ تمام علوم کا نتیجہ اور غایت ہے۔ چنانچہ بعض اہل اللہ نے لکھا ہے کہ جس شخص کو اس علم سے کچھ بھی حصہ نہیں ملا۔ جس کے خاتمہ بالا بیان کا وہ ہے اور اس علم سے کم از کم بہرہ و یاب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے اور جن بندگوارن خدا کو حاصل ہے ان پر ظن و تشنیع نہ کی جائے اور بعض دیگر نے فرمایا ہے کہ جس شخص میں بدعت اور منکر ہو وہ اس علم سے قطعاً دور رکھا جاتا ہے۔ اور نیز یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص دنیا میں اس قدر مستغرق ہو کہ محبت الہی سے باطل قائل رہ کر ہوائے نفس میں گرفتار ہو جائے اس علم سے بے بہرہ رہتا ہے اور بے پہلی سزا جو منکر مکاشفہ کو خدا کی طرف سے ملتی ہے یہ ہے کہ وہ اس خزانہ حقائق و معارف سے بے نصیب رکھا جاتا ہے۔ علم مکاشفہ صدیقین اور مقربین بانگاہ لم یزلی کا حصہ ہے۔ اور وہ ایک نور ہے جو نفس کے تمام صفات ذبیہہ سے پاک صاف

ہو جانے پر قلب مومن میں پیدا ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے ان حقائق و معارف کی حقیقت کا
 انکشاف ہوتا ہے جن کا پہلے اسے صرف سماعی علم تھا۔ اور غیر واضح طور پر ان کو سمجھتا تھا۔ اس
 مقام میں ان تمام مشکلات کے عقد سے حل ہو جاتے ہیں جنکو وہ اپنے علوم کسبیہ کی وساطت سے
 نہیں سمجھ سکتا۔ اسی مقام کا نام معرفت حقیقی ہے۔ کیونکہ اللہ جل شانہ کی ذات اور اس کے صفات
 و افعال اور باقیات یعنی حقیقت افعال اور دنیا اور آخرت کے پیدا کرنے کی حکمت اور ان کے
 ذات باری سے صادر ہونے کی کیفیت اور عالم موجودات کے صادر ہونے کی وجہ ترتیب اور
 حقیقت نبوت نبی وحی اور حقیقت ملائکہ اور شیاطین اور کیفیت عداوت شیطان با آدم اور انبیاء
 علیہم السلام پر ظہور فرشتہ اور نزول وحی کی کیفیت اور موجودات عالم پر خدا کی بادشاہت اور حقیقت
 قلب اور فلق ملائکہ اور شیاطین یقرب اور الہام ربانی اور خطرات شیطانی اور عذاب قبر اور
 جنت و نار و عذاب و مراد و میزان و حساب و غیرہ امور اسی مقام میں واضح ہوتے ہیں اور
 آیہ اقل کتابت کفی بنفسک الیوم علیک حسباً اور آیہ ان الدار الاخرۃ لایحی الحین
 کی حقیقت کھلتی ہے اور رویت ذات باری اور نزول و قرب حق اور عالم آخرت میں حصول سعادت
 بمصاحبت ملائکہ و انبیاء اور نقاد و درجات کا پتہ لگتا ہے۔ الغرض عارف کامل اسی مقام پر امور
 عجیبہ و غریبہ کا مالک ہوتا ہے اور جو اسے حاصل ہوتا ہے ظاہر پرستوں کو اس کا عشر عشر بھی
 حاصل نہیں ہوتا۔ اس علم کی تصدیق اصول کے بعد عارفین کے مختلف مقامات ہیں۔ بعض تو حقائق
 مذکورہ بالا کو ان کی مثالی صورتوں میں حاصل کرتے ہیں اور جو دعائیت کو پہنچ جاتے ہیں وہ ان حقائق
 کو ان کی اصلی اور حقیقی صورت میں مشاہدہ کرتے ہیں +

الحاصل علم کا شفعہ سے مراد یہ ہے کہ لوازم بشریت کا حجاب دور ہو کر مذکورہ بالا امور کی حقیقت

۱۔ ہر ایک شخص کو نامہ اعمال دیتے وقت کہا جائیگا کہ لو اپنا نامہ اعمال پڑھو آج تو خود ہی اپنا کافی مجاہد ہو
 ۲۔ و آخرت حقیقی زندگی کا شفعہ ہے۔ ۱۲۰ منہ +

اصلیہ ایسے واضح طور پر عارف کامل کیلئے کھول دی جاتی ہے کہ وہ انہیں بالکل حکم کھلا دیکھ دیتا ہے جس میں شک شبہ کو کسی قسم کا مطلقاً دخل نہیں ہوتا۔ اور اس حالت کا پیدائہ ہونا۔ بالکل قانون طبعی کے مطابق ہے کیونکہ آئینہ قلب سے جب مختلف قسم کی بد اعتقادیوں اور نفسانی خباثتوں کا رنگارنگ بدلیہ مجاہدات دریا ہفت اُٹھ جاتا ہے۔ تو حقائق و معارف منجلی ہوتی ہیں۔ اور یہ بات بالکل انبیاء علیہم السلام کے رنگ میں رنگے جانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی وہ علم ہے جس کو بدلیہ تحریر و تقریر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ وہ کیفیات ہیں جو ماورائے لغت و تشبیہ ہیں اور یہی وہ علم خفی ہے جس کا اشارہ حضور علیہ السلام نے الفاظ ذیل میں کیا ہے :-

ان من العلم کھیات المکتون لا یعلمہ الا اهل المعرفۃ باللہ تعالیٰ فاذا انطقوا
بہ لم یجھلہ الا اهل الاعتقاد باللہ تعالیٰ فلا تحقرہا عالمہا انتہ اللہ تعالیٰ
علما منہ فان اللہ تعالیٰ لم یحقرہ اذا انتہ العلم۔

مجھے یقین ہے کہ ناظرین حقیقت مکاشفہ کے معنی بخوبی سمجھ گئے ہونگے اس لئے امام
ہمام کی تشریح کے بعد مجھے ضرورت نہیں کہ میں پرکھ زیادتی کروں۔
فان القول ما قالت حد ام

اے سید صاحب نے بھی لکھا ہے کہ بدن اور دھوکے درمیان جو پردہ ہے اُسے جالب ہے مگر وہ آئندہ کسی
انحشاف حقیقت کا اقرار نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ محض ایک خیال ہوتا ہے - ۱۲ منہ *
علم بیشک ایک حمد علم کا وہ ہے جو بطور اسرار خفیہ رکھا گیا ہے جس کو صرف اللہ کی معرفت والے لوگ حاصل
کر سکتے ہیں جب وہ لوگ ان علوم کو الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں تو صرف جاہل و مغرور آدمی اس کا انکار کیا کرتے ہیں
تم ایسے عارف کی تحقیر مت کرو جس کو خدا نے یہ علم دیا کیونکہ جب خدا نے اس کو علم دیا ہے تو اس کو حقیر نہیں ہے۔ ۱۳ منہ *
سے بات یہ ہے کہ جو خدام (ایک عورت کا نام ہے) کہہ دے۔ یہ ایک ضرب التل ہے جس کا ایک لمبا قصہ
ہے ایسے موقع پر پولا کرتے ہیں۔ جہاں کسی کی بات کو آخری فیصلہ سمجھا جائے۔ ۱۴ منہ *

ہاں یہ بتلا دیتا ضروری علوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں جابجا لفظ علم کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے ذکر میں آیا ہے۔ سو ایسے مواقع پر علم سے یہی علم معرفت الہی مراد ہے۔ حساب و خراج نہیں جو روزمرہ معاملات زندگی میں کارآمد ہوتے ہیں۔ اور آیہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استفتنا متنزل علیہم المائدہ..... الخ میں اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔ فہم من فہم۔

میرے پاس اور بھی بعض کتب ایسی موجود ہیں جن میں حقیقت مکاشفہ پر بحث کی گئی ہے مگر ان میں اکثر اسی دقیق باتیں جنہیں غالباً سنا ظہر نہ سمجھ سکیں۔ اس لئے صرف احیاء العلوم کی عبادت پر جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے کفایت کی جاتی ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا مقصود تھا کہ جب سید صاحب اس کو چپ کے آدمی نہ تھے تو کہیں خواہ مخواہ اس میں دخل و مقولات کا مصلوق نہ ہو۔ کیا اس سے آپ کا یہ منشا ہے کہ سلسلہ اہل معرفت کی تکذیب کریں۔ اگر یہی منشا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا کے ساتھ جنگ کرنے کی پٹائی ہے۔ معاذ اللہ منہا۔ اور اگر مسئلہ کی تحقیق کرنا مقصود تھی تو جس علم کا مسئلہ تھا اس کے اصول پر گفتگو کی ہوتی۔ لمحدان پر آپ کے اصول پر آپ مذہب کی کس کس بات کا انکار کرتے جائینگے۔

یہ ملک نورزاں روناختی در کشور ظلمت - کہ صحن چنیاں را در لباس تنگیاں بینی
کسی قومی مجلس میں کھڑے ہو کر کسی امر کی تحریک یا تائید و مخالفت پر دھول دھلا
لکچر دنیا اور چیز ہے اور محارف و حقائق عارفانہ جیکو انوار شمع نبوت سے بذریعہ مجاہدت ریاضت
اور تصفیہ و تزکیہ نفس حاصل کیا جاتا ہے اور چیز و لالچ و بربال ہے

ورکھے جام شریعت در کفنہ سندان عشق - ہر بوسنا کے چہ و اندام و بدن ملحق
مقامات مکاشفہ کا بیان کرنا صرف انہیں حضرات کا کام ہے جو مصائب مکاشفہ ہیں اس لئے
ہم اپنے علوم رسمہ کی بنا پر کوئی بحث نہیں کرتے البتہ تعلیم قرآن مجید سے ہم استفادہ سمجھ سکتے
ہیں کہ یہ مقامات اہل معرفت کو حسب قابلیت علی امتلاف مراتب حاصل ہوتے ہیں اور ان کا حصول بالکل
اصول فطرت پر مبنی ہے بھلا اس قدر تو عام اہل ایمان بھی اپنے ذاتی تجربہ سے جانتے ہیں کہ کثرت

ذکر سے جب قلب حرب فہوا الا ینکر اللہ تطہی القلوب کلمۃ اعتدال پر جم جاتا ہے تو ذکر کو ایک گونہ ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔ اور ایک ایسا سرور و انبساط حاصل ہوتا ہے کہ اس کے مقابل کوئی چیز بھی قابل قدر معلوم نہیں ہوتی۔ یہیں سے خیال کر لیا جائے کہ جب شیخ کامل کے اتباع میں جس سے وحییت حضور علیہ السلام کے ساتھ اپنی نسبت قائم کی جاتی ہے بمضمون و جہاد فی اللہ حتی جہادہ۔ پوری ریاضت و مجاہدت کی جائے تو کیا نتیجہ پیدا ہوگا۔ مگر ایک مختصر لفظ شکر اس راز کو کیا سمجھے گا۔ ایجا تا ارادے نیا درسی سادت نہری۔

شرف خواہی گردِ مقبلان مگرد۔ کہ زود از مقبلان مقبل شود مرد
میں منکرین سے صرف یہی پوچھتا ہوں۔ کہ بتاؤ کہ نازکس طریق پر ادا کرتے رہتے ہو تو تکیہ تحریمہ کے وقت بھی حضور قلب نہیں ہوتا جو قبول نماز کا سچا درجہ ہے بھلا حضور و خشوع جو دالذین صد فی صلواتہم خاشعون کا حکم ہے کہاں نصیب ہوگا۔ تم مدد دیتے ہو جس میں ریا و نمود کی آمیزش برابر لگی ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات صرف بغرض ریا و نمود ہی دیتے ہو۔ تم ہر وقت محبت زوریم میں بنی اندر کے برخلاف منصوبہ بازی کرتے ہو۔ اور اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تمہیں یہی دھن لگی رہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ منصوبہ یا فریب چل نکلے۔ اور کامیابی ہو۔ اور اس پیش رفت میں تمہیں کبھی بھولے سے بھی رضائے مولیٰ اور اتباع سرور کائنات صلعم کا خیال نہیں آتا۔ تمہارے معتقدات ایک مجموعہ ہے شکوک و اوہام کا جس میں کوئی امر بھی اذعان اور تصدیق حق کے درجہ پر ثابت نہیں ہوا۔ تمہیں شیطانی خطرات اور نفسانی خواہشات ہمیشہ بغیر و مضطرب رکھتے ہیں جن سے محبت الہی اور محبت رسول پاس تک نہیں بچ سکتی۔ تمہیں استغفار اور سچی توبہ نصیب نہیں ہوتی جو نفس کیلئے کیسا کام دیتی ہے۔ تمہیں پچھلی رات گریہ کی توفیق نہیں ملی جو صفائے قلب کا بھاری ذریعہ ہے۔ تم حلقہ و دوستان میں بیٹھے تمام خلاف مشروع افعال

کے قریب ہوتے ہو اور مسجد تک جانے میں تاخیر ہوتا ہے یا بسا اوقات نہیں جاتے تمہارے پڑوس
 میں ایک بیوہ کنکال یا ایک یتیم بیکس بھوکا مریا اور تم قورما اور پلاؤ کھا کر میٹھی میند سو جاتے ہو
 اور صبح کے اٹھ بیجا دیتے ہو تمہیں جو بیس گھنٹہ میں تفکر و تدبیر کیلئے جو حقائق و معارف کا دروازہ ہے
 ایک منٹ بھی نہیں ملتا۔ تم اپنے بڑے کاموں کے چھپانے اور اچھے کاموں کے شہرت دینے میں
 کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تم اپنی مدح و تعریف سے خوش ہوتے ہو گو بھوت ہی ہو اور جو
 مذمت سے ناامین ہوتے ہو۔ گو سچ ہی ہو۔ وغیرہ وغیرہ ایسے حالات میں تم خود ہی انصاف کو
 اور اپنے ایمان سے فیصلہ لو کہ تم کس طرح صحیح الایمان کہلانے کا استحقاق رکھتے ہو۔ اور کس طرح الہی
 عبادات و معاملات پر خدا کے حضور میں سرخرو کرنے کی امید رکھے بیٹھے ہو۔ جس کو اگر کسی
 کھانے کی صورت میں محرم کیا جائے تو کتا بھی سونگھ کر چھوڑ دے۔ اور اگر پودا رجز کی صورت
 میں لایا جائے تو کوئی دود آدمی ملکر نہ بیٹھ سکے۔ اور یا اس خست و نامت ان لوگوں پر زبان
 طعن دراز کرتے ہو۔ جن کا ظاہر و باطن مبغضون و ذر و اظہار لاشعور و باطنہ۔ آلائش
 گناہ سے بالکل پاک و صاف ہوتا ہے جو خشیت الہی سے ہر وقت سر نیاز و استاں تسلیم پر رکھے
 رہتے ہیں جن کا معاملہ خدا اور خلق خدا کیساتھ محض للہیت پر مبنی ہوتا ہے جن کے پر الواعیزوں
 کے دیکھتے ہی دلوں میں نجات الہی کی ٹوہ سی لگ جاتی ہے۔ جن کے دم قدم کی برکت سے
 باوجود اہل عالم کے کثرت فسق و فجور کے آسمانی عذاب ٹلا رہتا ہے جن کے زیر سایہ آنے
 خدا کے غضب کی آگ سرد پڑ جاتی ہے۔ جن کے کلمات قدسیہ سے دلوں میں نور ایمان پیدا
 ہوتا ہے اور جن کی نظریں وہ برقی طاقتیں بھری ہوئی ہوتی ہیں کہ عمر بھر کے خستہ عصیان کو
 سجادہ عبادت پر جا بٹھاتے ہیں۔

اے دل کہ زو دست و گیراں بربودم - ہرگز بے کے نہ داوم و نمودم
 جانناں تو بیک نظر چناں بربودی - گوئی کہ ہزار سال بے دل بودم
 مکاشفہ جس کا انکار کیا جاتا ہے وہ علم خفی ہے جو دنیا میں انبیاء علیہم السلام کی معرفت انکے

سچے متبعین کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ یہی وراثت ہے جس کا اشارہ حدیث
 العلماء و شیعۃ الانبیاء میں کیا گیا ہے۔ کہ مکہ علم سے مراد علم شریعت و طریقت ہے نہ علوم مروجہ
 اہل دنیا۔ مکاشفہ ہی تھا کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجیب کے واقعہ قتل کو
 جو کفار کے ہاتھ سے مکہ میں واقع ہوا تھا بوقت قتل مدینہ منورہ میں ہو یہو صحابہ کے سامنے بیان کر دیا
 اور حضرت نجیب نے آپ کو السلام علیکم کیا۔ اور آپ نے وعینکم السلام ارشاد فرمایا۔ اور
 کعبہ کی طرف چہرہ پھیر لینے کا حکم دیا چنانچہ یہ سب واقعات عین ایک ہی وقت میں واقع ہوئے
 جن کی لوگوں نے بعد میں تصدیق کی۔ اور بہتوں کے لئے موجب ایمان ثابت ہوئے۔ مکاشفہ ہی
 تھا کہ کیفیت معراج پر جب مشکین نے اعتراض کیا کہ بھلا ہمارے فلاں قافلہ کے حالات جو
 شام سے آئیں اللہ بیان کر دو تو حضور نے عین وہ باتیں جو ان کے مکہ معظمہ میں داخل ہوتے
 تک پیش آنیوالی تھیں کہ سنائیں اور شہر میں داخل ہونے کی کیفیت بھی بتادی چنانچہ مخالفین نے
 تصدیق کی اور آپ کو ایک بھاری جاوہر گر کہنا شروع کر دیا۔ مکاشفہ ہی تھا کہ حضرت عمر
 رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں منبر پر عین خطبہ پڑھنے کی حالت میں اپنے سپہ سالار ساریہ کو
 جو شام میں مقابلہ کر رہا تھا۔ زور سے کہا کہ یا سادیۃ الجبل (ساریہ پہاڑ کی جانب اختیار
 کرو) چنانچہ اوہ ساریہ نے بھی آپ کی وہی آواز سنی اور اس پر عمل کیا اور دشمنوں پر فتح پانی اور
 بعد میں اس کی تصدیق کی گئی۔ اور مکاشفہ ہی تھا کہ حضرت عثمانؓ تلاوت قرآن فرما رہے تھے کہ ایک
 صاحب داخل ہوئے۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ تم زنا کر کے آئے ہو۔ کہا کہ ہرگز نہیں۔ اپنے
 فرمایا کیا تو نے راستہ میں کسی اجنبی عورت پر نظر کی ہے اور تیرے نفس میں اس کے متعلق کچھ
 وسوس پیدا ہوئے ہیں۔ اس نے جواب دیا ہاں الیا تو ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کیسی مذہب ہے۔
 کیونکہ حضور نے فرمایا العیدان تزنیان یعنی آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں۔ اس نے کہا کہ کیا حضور کے
 بعد یہ وحی نازل ہونے لگی جس سے آپ کو یہ اطلاع حاصل ہوئی۔ آپ نے جواب دیا۔ کہ نہیں
 وحی تو حضور کے بعد منقطع ہو چکی ہے۔ مگر آپ نے ارشاد فرمایا ہے ان تقوا قرۃ المؤمن قاتلہ

ينظر ہنور اللہ یعنی مومن کے نور فراست سے بچو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نور سے اشیاء کا
 معائنہ کرتا ہے۔ علیٰ ہذا اس قسم کے ہزاروں واقعات خاصان بارگاہ ربانی سے منقول ہیں۔
 اور یہ سب کے سب خزانہ نبوت سے درشتا حاصل کئے جلتے ہیں۔ اب اگر کوئی جاہل منہ بنا کر
 ان واقعات کا انکار کر دے تو اس کا انکار کیا حجت ہو سکتا ہے اور ماننے والوں کو جو دلائل عقل و نقل
 سے انہیں ثابت کرتے ہیں اگر عجیب پرستی کا الزام دیکے تو اس کا الزام دینا ان واقعات
 کی حقیقت میں کیا نقص عائد کر سکتا ہے۔ انکار کر دینا آسان بات ہے مگر خصم کے سامنے
 حجت میں عہدہ برآ ہونا مشکل۔ ہم تو ایسے انکار کو ایسا ہی انکار سمجھیں گے جیسے کوئی نادان
 کہدے کہ قسطنطنیہ محض ایک فرضی شہر کا نام ہے۔ درحقیقت اس نام کا کوئی شہر دئے زمین پر
 موجود نہیں یونہی اخباری دنیا نے جھوٹ موٹ ایک نام تجویز کر لیا ہے۔ مگر جو شخص قسطنطنیہ کو
 دیکھ چکا ہے اور وہاں سلامت ہوش و حواس رہ کر کچھ عرصہ بسر کر آیا ہے وہ اسے کہیگا کہ
 اے یوقوت تو کیا ہدیٰ بنا رہا ہے۔ میں تو وہاں مدتوں رہا ہوں۔ اور ایک حصہ عمر کا
 وہاں بسر کیا ہے تو کیسے یہ کہتا ہے کہ قسطنطنیہ کوئی شہر دئے زمین پر موجود نہیں۔ اب اگر
 دونوں اپنے اپنے دلائل بیان کرنا شروع کر دیں تو گو بظاہر خیر ایک ناواقف اس منکر کیساتھ
 ہو جائیں اور اس کی سائے کی تائید کرنے لگیں تو کیا سچ مچ قسطنطنیہ دنیا میں موجود نہیں ہوگا
 نہیں بلکہ جو شخص اصلیت کو معلوم کرنا چاہتا ہے اسے ضروری ہوگا کہ وہ ممکنہ وسائل کو استعمال
 میں لا کر اپنا اطمینان کرے جن میں سب سے عمدہ وسیلہ یہ ہے کہ وہ خود سفر کرے اور اگر استطاعت
 سفر نہ ہو تو ثقہ لوگوں کے بیان پر اعتماد کرے۔ اور اگر خود جانے کی توفیق نہیں رکھتا اور اسے
 ثقہ آدمیوں کے بیان پر بھی وثوق نہیں تو اسے کہنا چاہیے کہ تم اللہ کی طرف سے فضل و رحمت کے
 منتظر رہو ممکن ہے کہ تمہیں کوئی یقین کی بیل مل جائے کیونکہ اب بھی ہوا ہے کہ ایک شخص عمر بھر
 ایک غلطی میں مبتلا رہا ہے اور عالم اسباب سے خداوند کریم نے ایک دفعہ کوئی ایسا سبب پیدا
 کیا ہے جس سے اس کی غلطی کا ازالہ ہو گیا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ شخص قسطنطنیہ پہنچ کر

بھی یہی کہتا ہے کہ میں تو کچھ دیکھ رہا ہوں محض دھوکہ ہی دھوکہ ہے حقیقت میں کوئی شے نہیں سوائے
شخص کو کیا کہنا چاہیے کہ کم بخت بچہ روم پاس ہی ہے۔ جاؤدب مرے

تو نہ مرد عشق بازی ما - بروائے خواجہ کار دیگر کن

بہر صورت کسی چیز کے یقین کے مراتب ہوا کرتے ہیں۔ اور ہر ایک مرتبہ میں یقین کرنے کے
وجہ ضرور موجود ہوتے ہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ صرف تجربہ اور مشاہدہ ہی وجہ یقین ہیں کیونکہ اگر
ایسا ہوتا۔ تو تمام علم تاریخ ایک افسانہ باطل قرار پاتا۔ حالانکہ کوئی عاقل یہ تجویز نہیں کر سکتا کہ علم تاریخ
کے ذریعے سے ہیں صحیح واقعات کی خبر نہیں پہنچتی۔ کذب آسمانی ہیں صرف بذریعہ سلسلہ روایت پہنچی
ہیں نہ بذریعہ ذاتی تجربہ و مشاہدہ اور اگر غور کرو تو بوقت نزول وحی بھی وحی پر یقین کرنا نبی کی تصدیق
بیان پر موقوف ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے دلیل سمعی کو دلیل عقلی پر مقدم رکھا ہے۔ چنانچہ
کفار کی زبانی فرمایا ہے۔ وقالوا لو کنا نسمع او نعطل ما کنا فی اصحاب السعیرین پس بعض اصحاب
کا ان روایات صحیحہ کو جبکی چھان بین میں علماء اسلام نے مافوق العادت تحقیق و تدقیق کی ہے صرف
اپنی ہوائے نفس کے تابع ہو کر غلط کہہ دینا ایسا صحیح ظلم و عدوان ہے جسکی نظیر نہیں ہو سکتی۔

ناظرین پر اس امر کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مجھے سید صاحب کی مخالفت یا موافقت میں کچھ
لکھنا ہرگز نہ نظر نہیں غرض صرف بعض اصحاب کی غلط فہمی کا رفع کرنا ہے جو سید صاحب کی ہر ایک
تحریر کو کالوجی من السہاء سمجھ کر بہت سے مسائل مذہبی کا اٹھارہ کر دیا کرتے ہیں اور انہیں خود کچھ
بھی تحقیق نہیں ہوتی یہی اندھی تقلید ہے جس نے ہزاروں ادلاکھوں کو ترقی اور تحقیق سے روک
دیا۔ سید صاحب اپنے مشرب کئے آدمی تھے اور سیاسی اور اطلاقی مضامین میں فاضلانہ تحریر کے
مالک مذہبی مسائل میں وہ ہمیشہ کچھ تو فلاسفہ یونان کی تقلید کرتے اور کچھ منکران یورپ کی یہی
وجہ ہے کہ اکثر ان کی تحقیق سلف و خلف کے بر خلاف نظر آتی ہے۔ سید صاحب کو روحانی مسائل کا

لے کفار قیامت کو کہیں گے کہ اگر ہم انبیاء علیہم السلام کی باتوں سننے یا آیات اللہ میں غدی غور کرتے تو آج اہل فتنہ میں نہ ہوتے۔

نہ تو کچھ تپہ تھا اور نہ اس میدان میں ان کا کبھی گذر ہوا چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ہم تو راتوں جاگے مگر ہمیں تو کوئی مکاشفہ نہ ہوا۔ اب اصل حقیقت اس جملہ کو پڑھ کر سوائے اس کے کہ ہنس دیں اور کیا کہہ سکتے ہیں اس جملہ کا سید صاحب جیسے عاقل آدمی کے قلم سے نکلنا واقعی محل تعجب ہے کہ انہوں نے بے اصول باتوں جاگنے سے بے پرواہی سے کو طریق مشائخ عظام کی تکذیب پر دلیل گردان لیا۔ آپ نے کب کسی مرد خدا کے حضوریں بیٹھ کر طریق شغل و ذکر کو سیکھا۔ آپ تو تمام عمر جی کرتے رہے بعد ازاں علیگر ٹھکانہ کے معاملات میں غلطان و بچان ہے اور اسی میں آپ کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ کو موقع ہی کب ملا کہ اصول تصنیف و تزکیہ باطن کو بر طریق ریاضت و مجاہدت لازم کہلاتے اور مقامات عالیہ کو طے کرتے غلط و صحیح نظر و استدلال سے نہ تو آپ یاہر آئے اور نہ کوئی اور طریق آپ کو سوجھا آپ تو بمضمون سے

چو آن کرے کہ درگندم نہاں است - زمین و آسمان او ہماں است
صرف قانون قدرت کے زندان میں پڑے ہے فضائے دلکشانی مع اللہ وقت میں
آپ کو چلنا نصیب نہیں ہوا پھر آپ تکذیب مشائخ کس خیال پر کرنے لگ گئے۔ ان ہذا
الاشیٰ عجب آپ مسلمانوں کی دنیوی اصلاح و فلاح کی تدابیر میں ہمیشہ ہمہ تن سرگرم
ہے اور ایک اچھا کام کیا۔ اور موجودہ زمانہ کی ضرورتوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا اور انہیں کئی غلطیوں
سے بچالیا۔ کیا آپ کے مصلح یا رفاکار ہونے کیلئے یہ معمولی باتیں تھیں بلکہ ایک پہلو میں
یہ نہایت ہی ضروری تھیں۔ مگر آپ نے طریق مشائخ میں کیوں خواہ مخواہ دخل دینا شروع کر دیا
کیا تکذیب مشائخ کو سبھی تحمل مقاصد کالفرن میں کچھ دخل تھا۔ افسوس کہ آپ نے قول مشہور
اذالم تستطع امر اعداء - و جاوزه الی ما تستطیع
پر عمل نہ کیا اور ناحق بزرگان اسلام رحمہم اللہ اجمعین کی پاک رحوں کو اذیت پہنچائی جس کی بابت

لے جب کسی امر کو بجا نہیں لاسکتا تو اسے چھوڑ دے اور کسی ایسے کام میں لگ جے تو بجا لاسکتا ہے۔ ۱۲ منہ

بجھیر جناب رسول علیہ السلام وہ آپ پر قیامت کو استغاثہ خائر کرینگے مشائخ عظام کا سلسلہ نہ تو آپ سے اور نہ آپ کے بعض ان متبعین سے جو ہمیشہ لکچروں میں اس کی تکریب کیا کرتے ہیں ٹٹ سکتا ہے اور نہ ٹوٹنا چاہئے مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے کہ دین کو دنیا پر ہمیشہ مقدم رکھو اور دنیا کو شریعت پاک کے تابع ہو کر محال کرو۔ اس لئے وہ کبھی دین کے پہلو کو کمزور نہیں ہوتے دینگے۔ اور نہ انہیں دنیا بلا دین کی ضرورت ہے۔

ما احسن الدین والدینا اذا جمعا۔ لا بارک اللہ فی الدینا بلا دین

حقیقت الروایہ

حقیقت روایہ سے انکار نہیں ہو سکتا | روایہ یعنی خواب کی حقیقت بھی منجملہ عجائبات موع ہے اور بجز علماء ربانی کے اس حقیقت سے اور کوئی شخص واقف

نہیں ہو سکتا جن لوگوں نے اصول فلسفہ پر اس کی تشریح کی ہے انہوں نے اس کے سمجھنے میں غلطیاں کیں ہیں اور اسی فلسفی تو سرے سے روحانی حقائق کا ہی انکار کر دیا کرتے ہیں۔ اور اس مسئلہ کے اشکال کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت روایہ کو منجملہ علوم نبوت کے شمار کیا گیا ہے اور جب تک کوئی شخص حقیقت وحی سے آگاہ نہ ہو ممکن نہیں کہ روایہ کی حقیقت کو بخوبی سمجھ سکے یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ روایئے صالحہ چھپا لیس اجزاء نبوت میں سے ایک جزو ہے۔

بقول بعض علماء چھپا لیس کی قید محض اتفاقی ہے مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقت روایہ منجملہ علم نبوت کے شمار کی گئی ہے جن کی بنا روحی آسمانی پر ہوتی ہے بعض اہل فلسفہ جنہیں علوم نبوت سے کچھ تعلق نہیں اور اپنے دساوس کے پابند رہتے ہیں حقیقت روایہ کا انکار کرتے ہیں اور نقلیات کو پایہ اعتبار سے ماقط کرتے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ جس حقیقت کی تصدیق میں صحیح کتب سماویہ اور انبیاء علیہم السلام اور حضرات اکابر دین بالاتفاق ناطق ہیں اس سے انکار کرنا

محض حماقت اور عین سفاہت کی دلیل ہے اور ہر ایک بان کا اپنا ذاتی تجربہ اس متفق علیہ مسلکی صداقت میں
حجت قاطعہ ہے بیکر کا انکار ناقابل اعتبار ہے ۔

الناس اعداء معاجہلو یعنی لوگ جس چیز کی حقیقت سے نا آشنا ہوتے ہیں اس کی مخالفت
کیا کرتے ہیں ۔

روایا کے اقسام | اخبار و احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ روایا کے تین اقسام ہیں ۔ (الف) وہ
روایا جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے (ب) وہ روایا جو شیطان کی طرف سے
ہوتا ہے (ج) وہ روایا جو جسکو حدیث النفس کہتے ہیں ۔ مگر ایک حدیث میں روایا کی تقسیم یوں کی
گئی ہے (ا) وہ روایا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو (ب) وہ روایا جو ملک روحانی کی طرف سے
ہو (ج) وہ روایا جو شیطان کی طرف سے ہو ۔

اقسام مذکورہ بالا میں وجہ امتیاز | (الف) وہ روایا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے وہ کسی واقع
کی عین اپنی اصلی حالت میں بحالت قوم ظاہر ہو سیکو بدلتے

ہیں اور واقعہ مذکورہ اس قدر بلی اور واضح ہوتا ہے کہ اس کو اس حالت سے جو بیلدی میں بوقت
وقع ہوتی ہے کچھ امتیاز نہیں ہوتا اور اس میں تاویل کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ یہ مقام اعلیٰ درجہ کے
مقربین باگاہ کے سوا دوسروں کو حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اگر ایسا روایا انبیاء علیہم السلام کو نظر آئے تو اس
کو حکم وحی میں شمار کیا جاتا ہے جس میں ظن کو دخل نہیں ہوتا ۔ بلکہ وہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے جیسے ابراہیم علیہ السلام
کا روایا دوبارہ فوج و لد جس کا ذکر قرآن مجید میں وارد ہے ۔ ایسا روایا اولیاء اللہ کو بھی ہو سکتا ہے
چنانچہ کئی ایک روایات صحیحہ سے ثابت ہے ۔ مگر غیر نبی کا روایا حجت نہیں ۔

(ب) وہ روایا جو ملک روحانی کی طرف سے ہوتا ہے وہ عموماً کسی تشبہی صورت میں ہوتا ہے
جس میں تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے ۔ یہ ہر وہ روایا جو محض ہوتے ہیں ۔ اولیٰان سے روح کو ایک گونہ
انسا ط اور سرور ہوتا ہے ۔

(ج) وہ روایا جو شیطان کی طرف سے ہوتا ہے روح کے لئے موجب وحشت و خوف ہو کرتا

ہے اور کسی امر ناگوار کی خبر دیتا ہے خواہ دینی فساد کے متعلق ہو یا دنیوی امور کے متعلق ۔

(د) حدیث نفس کی صورت یہ ہے کہ انسان کو بیداری کی حالت میں جن امور کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ یا جن کے ساتھ اس کے نفس کو زیادہ تعلق ہوتا ہے ان کی مثالی صورتیں یا وہی خیالات کسی علی صورت میں متشکل ہو کر نظر آتے ہیں۔ یہ صورت حقیقت میں رویا نہیں بلکہ قوی و مافیہ کے عمل کا نتیجہ ہے کیونکہ بیداری کی حالت کے خیالات قوت حافظہ میں جمع ہوتے ہیں اگر قوت واہمہ ان خیالات جزئیہ میں اپنا عمل کرے تو عجیب عجیب صورتیں نظر آتی ہیں ۔

رویا صحیحہ کے مختلف اقسام | رویا صحیحہ کی ایک صورت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ قلب عبد میں القا کرتا ہے جو بصورت کلام ہوتا ہے جس سے وہ

بحالت خواب اللہ تعالیٰ سے مکلام ہوتا ہے عیساکہ عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ طاک روحانی کو اللہ تعالیٰ اس امر پر مقرر کر دیتا ہے کہ وہ کسی واقعہ کو تشبیلی صورت میں دیکھا دیتا ہے جس کی تعبیر کوئی متقی اہل العلم سلیم الفطرت کر سکتا ہے۔ اور ایک صورت یہ ہے کہ سونے والے کی روح سے مرووں کی رو میں ملاقات کر کے بعض امور کی خبر دیتی ہیں۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ سونے والے کی روح کو بارگاہ رب العزت میں لیجاتے ہیں۔ اور وہاں اس کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ سونے والے کی روح جنت میں داخل ہو کر وہاں کا مشاہدہ کرتی ہے ان مختلف صورتوں کی توجیہ میں اہل علم نے اختلاف کیا ہے۔

ایک گروہ اہل علم کا خیال ہے کہ تمام علوم و معارف نفس میں فطراناً مضمون ہیں جو تعلق جسمانی کی وجہ سے محبوب ہوتے ہیں۔ چونکہ خواب کی حالت میں روح کو ایک گونہ تجرّد حاصل ہوتا ہے اس لئے وہ بوجہ مناسبت طبعی ارواح مجرّدہ سے ملاقات کرتی ہے اور اس حال میں اس کے علوم و معارف کا جو اس میں مضمون تھے انکشاف کامل ہوتا ہے۔ اس توجیہ میں صرف یہ امر قابل غور ہے کہ گو تجرّد روح انکشاف علوم کا موجب ہوتا ہے۔ مگر یہ جمیع علوم و معارف کا انکشاف ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ علوم و معارف

جو بخت نبوت کے ساتھ مخصوص بن بجز تعلیم نبی اللہ کے حامل نہیں ہو سکتے مثلاً گذشتہ امتیں کے حالات یا قرب قیامت کے علامات اور شرائع و دیانات وغیرہ ایسے امور ہیں جن کو کوئی شخص بجز تعلیم نبوت کے کسی دوسری صورت میں ہرگز حاصل نہیں کر سکتا۔

اور ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ روایا صحیحہ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک حانی کو حکم دیتا ہے سو وہ سوتے والے کی استعداد و فطرت کے مطابق کبھی تو کسی امر کو مثیل صورت میں دکھا دیتا ہے اور کبھی عین اصلی صورت میں جو وقوع میں آئے والے واقعہ کے ساتھ باکلیت مطابق ہوتی ہے یہی مذہب اقرب الی الصواب ہے۔ مگر اس میں اس قدر اور اضافہ کرنا چاہئے کہ روایا کی صرف یہی دو صورتیں (مثیلی اور اصلی) نہیں بلکہ اور صورتیں بھی ہیں۔ جیسے ارواح کی ملاقات وغیرہ جن کا اور ذکر ہوا۔

طبرانی نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے امیر المؤمنین مجھے آپ سے چند امور کی بابت کچھ پوچھنا ہے آپ نے فرمایا کہ جو تو

روایا صحیحہ اور کاذبہ کی وجہ احادیث سے

چاہتا ہے پوچھ۔ کہا کہ کیا وجہ ہے کہ انسان کبھی کسی امر کو بحول جاتا ہے اور پھر اس کو یاد کر لیتا ہے۔ اور روایا کیسے صادق ہوتا ہے اور کیسے کاذب؟

آپ نے فرمایا کہ قلب پر ایک تم کا پردہ چھا جاتا ہے جس کی مثال بھینہ ایسی ہے جیسے ہلکا سا بادل چاند کے سامنے آجاتا ہے سو اس حالت میں کسی چیز کا نشان ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ پردہ اٹھ جاتا ہے تو وہ چیز فی الفور یاد میں آ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے اللہ یتوفی الانفس حین موتہا ہمتی لم تمنت فی منامہا یعنی اللہ تعالیٰ رحوں کو ان کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور جو نہیں مرنے والے ہیں نیند کی حالت میں قبض کرتا ہے اس آیت کے متعلق ایک قول نبوی میں وارد ہوا ہے کہ خواب کی حالت میں رحوں کو آسمان کی طرف عروج حاصل ہوتا ہے۔ سو جو رحوں عالم ملکوت تک پہنچ جاتی ہیں ان کا روایا صحیح ہوتا ہے اور جنہیں نہیں

تک سلی نہیں ہوتی انکا رویا کاف ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ابن طبع سے بروایت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ جب انسان سو جاتا ہے تو اس کی رُوح کو عرش کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر وہ پاک بین رکھتا ہو تو اس کو سجدہ کا حکم ہوتا ہے اور اگر جب کی حالت میں ہو تو سجدہ کا حکم اسے نہیں دیا جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ اسی حکمت پر مبنی ہے سوتے وقت با وضو سونا ۛ

ارواح کا باہم ملنا | یہ سلسلہ اسلامی کتابوں میں بڑی متانت کے ساتھ پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے حتیٰ کہ کسی کو انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اگر کسی نحری طبیعت کو

اس کا انکار کرتے سنو تو سمجھ لو کہ وہ شخص علوم روحانیہ اور عجائب کیفیات روح سے حلی حقیقت و اصلیت پر تمام اکابر مشائخ اسلام بالاتفاق شہادت دیتے ہیں بالکل بے بہرہ ہے درحقیقت جس طرح رُوح کی ماہیت کے سمجھنے سے عوام الناس قاصر ہیں۔ اسی طرح اس کے عجائبات حالات کی بھی انہیں کچھ خبر نہیں۔ چونکہ یہ مقام بحر کامل تصفیہ قلب کے حامل ہونا نامکن ہے اس لیے ایسے لوگوں کو جو اس مقام تک رسانی نہ رکھتے ہوں خاموش رہنا قرین مصلحت ہے اور اسی میں ان کی بھلائی ہے۔

واضح ہو کہ میں طرح زندہ آدمیوں کی رُوحیں مردوں کی رُوحوں سے بحالت خواب باہم ملتی ہیں اسی طرح زندہ آدمیوں کی رُوحیں دوسرے زندہ آدمیوں کی رُوحوں سے خواب میں ملاقات کرتی ہیں۔ مگر اس کی توجیہ بیان کرنے میں علما کا اختلاف ہے بعض کا خیال ہے کہ ایک زندہ شخص کی رُوح کو سونے والے شخص کی رُوح کے سامنے بحالت خواب ملک رُوحانی متشکل کر دیتا ہے اور سونے والا بعینہ اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح بحالت سیداری ایک شخص کی رُوح دوسرے شخص کی ملاقات سے متاثر ہوتی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ جب دو شخصوں کی رُوحوں میں مناسبت ہوتی ہے اور ان میں علاقہ محبت قوی ہوجاتا ہے۔ تو ایک کی رُوح دوسرے شخص کے حالات سے آگاہ ہوجاتی ہے اور اس آگاہ ہوجانے کی علت یوں بیان کرتے ہیں کہ رُوحیں باہم ملاقات کرتی ہیں اور ملک روحانی اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ان امور پر آگاہ ہو کر جو کسی ایک پر عائد ہوئے ہوتے ہیں دوسرے کو آگاہ کر دیتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم غیب کا ایک شمع لوح محفوظ سے جس میں آنے والے حوادث خیر و شر کا وقوع مرقوم ہوتا ہے سوئی والی روح کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور یہ کبھی تو مین واقع کی صورت میں دکھایا جاتا ہے اور کبھی اس واقع کی مثالی صورت میں۔ چنانچہ بڑے بڑے مشائخ کرام کے مشاہدات اس بارہ میں بطور حجت نقل کئے گئے ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگوں نے محض کسی زندہ یا مردہ شخص کے بحالت خواب نصیحت کرنے یا ڈرنے پر توبہ کی یا کسی مدفن چیز کا پتہ دیا۔ یا کسی آئینہ کے حادثہ کی خبر سنا دی اور بعد میں وہ واقعہ بعینہ اسی طرح وقوع میں آیا جس طرح سوئے ہوئے پر بحالت خواب ظاہر کیا گیا تھا۔ الخ من لافقات ارواح کی اصلیت میں تو شک نہیں خواہ اس کی توجیہ کچھ ہی ہو اور یہ امر فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے اور اس کا ایک احسان ہے جس سے وہ جب مصلحت اپنے بعض ایسے بندوں کی اصلاح کر دیتا ہے جن کی اصلاح کے لئے اور کوئی تدبیر مفید نہیں ہو سکتی تھی۔

اضغات احلام

اسوتے وقت جو خیالات مختلف بحالت بیداری خزانہ حافظہ میں جمع ہوتے رہیں بسا اوقات انہیں کے مطابق متفرقہ اشیا سوئے ہوئے کو دکھائی دیتی ہیں انہیں اضغات احلام (خواب ہائے پریشان) کہتے ہیں۔ روح جس قدر تصفیہ قبول کر لیتی ہے اسی قدر اس کو ایسے پرآگندہ خواب کم دکھائے جاتے ہیں۔ اور عموماً یہ امر درحقیقت کسی شخص کی حالت تصفیہ کے موازنہ کا ایک عمدہ معیار ہے۔ عموماً عوام الناس اپنے اپنے تعلقات بیلاری کے لحاظ سے اکثر امور کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور نہ انہیں تحقیقاً رویا کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ روئے صادق یا کاذب کے اسباب میں ایسی کوئی صورت داخل نہیں۔ مگر عام طور پر کل ہے کہ روئے صادق اور اس قسم کے خوابوں میں لوگ امتیاز کر سکیں۔ اس مسئلہ کے متعلق زیادہ تشریح کے لئے علم تعبیر الروایہ کی کتابوں کا دیکھنا ضروری ہے۔ اس موقع پر پہلے موضوع سے مسئلہ متعلق نہیں یہاں صرف حقیقت روایہ کی ضرورت اور اس کے اقسام

پر بحث کرنا مقصود ہے جو لوگ عجائباتِ لوح اور آثارِ دیوارِ روح سے واقفیت رکھتے ہیں انہیں روایات کی حالت میں عجائبات کے مشاہدہ کرنے سے کچھ انکار نہیں ہوگا *

روایات کے متعلق چند واقعات | علامہ ابن قیم نے کتاب الروح میں بہت سے واقعات

صحیحہ روایات کے متعلق نقل کئے ہیں۔ ہم چند ایک کو ذیل

میں نقل کرتے ہیں۔ ہر چند کہ انسان کا اپنا ذاتی تجربہ کافی ہے کہ وہ روایات کی حقیقت کا قائل ہو مگر بطور توضیح ضروری ہے کہ دوسروں کے واقعات سے اپنے تجربات کی تصدیق کر لے۔

(۱) ابو محمد عبداللہ بغدادی ایک صلح آدمی تھے جو مروں کی روحوں سے ملاقات کرنے اور ان سے بعض حالات کے استفسار کرنے میں بہت مشہور تھے۔ چنانچہ ایک بڑھیا عورت

مرگئی۔ اور ایک دوسری عورت کے سات وینار اس کے ذمہ تھے۔ وہ عورت ابو محمد کے پاس آئی اور حال بیان کیا۔ انہوں نے مرنے والی عورت اور اس کے باپ کا نام دریافت کیا

اور کہا کل آنا۔ جب وہ دوسرے دن ان کے پاس آئی تو انہوں نے کہا۔ کہ مرنے والی نے کہا ہے کہ میرے گھر کی چھت کی سات کڑیاں فلاں جانب سے شمار کرو۔ ساتویں کڑی میں

ایک پارچہ کے اندر دینار بندھے رکھے ہیں۔ چنانچہ تلاش کرنے پر سات وینار برآمد ہوئے۔ اور ابو بکر احمد بن مروان مالکی اپنی کتاب المجالستہ میں لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے جس کے

بیان پر مجھے پورا اطمینان تھا۔ بیان کیا کہ ایک عورت نے مجھے اپنے گھر کی دیواریں کھودنے پر اجیر (مزدور) مقرر کیا۔ جب میں نے کام شروع کیا تو ایک صلح مرد جو مجھے جانتے تھے

گلتے اور دریافت کیا کہ کیا کر رہے ہو۔ اس عورت نے کہا کہ میرا باپ مالدار آدمی تھا۔ اور اس کا مال میں نہیں ملا۔ اودہ وہ پتہ دے سکا ہے۔ اب ہم گھر کے کونوں میں تلاش کر رہے

ہیں انہوں نے کہا کہ اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت ہے فلاں صاحب کے پاس جاؤ وہ بہتیں جھٹ پتہ بتا دیں گے۔ چنانچہ وہ عورت گئی اور اس نے باہر بیان کیا۔ انہوں نے اس کا اور اس

کے باپ کا نام دریافت کیا۔ دوسرے دن جب وہ عورت گئی تو انہوں نے بتلایا کہ تیرے

باپ نے کہا ہے کہ جہاں میری کمان پڑی ہے اس کے نیچے سے جگہ کھدواؤ۔ چنانچہ ایسا کرنے پر مال بڑا بد ہو گیا۔ لوگ تعجب کرتے تھے اور وہ بڑھیا کہتی تھی کہ میرے باپ نے سنا سے مال کا پتہ نہیں دیا۔ کیونکہ وہ بڑا مالدار تھا۔ دوبارہ ان سے دریافت کرنے کے لئے کہا چنانچہ دوسرے دن انہوں نے پتہ دیا کہ حوض کی فلاں جانب مال مدفون ہے جا کر نکال لو۔ جب وہ جگہ کھودی گئی تو مال کثیر برآمد ہوا۔

(ب) ابو جعفر کہتے ہیں کہ میں نے بشر حافی اور معروف کرخی رحمہما اللہ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ آپ ہر دو کہاں سے آئے ہیں۔ فرمایا کہ جنت فردوس میں موسیٰ کلیم اللہ کی ملاقات کے لئے گئے ہوئے تھے۔ پھر انہیں سے مروی ہے کہ مرنے کے بعد انہوں نے بشر حافی رحمہ اللہ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ اے ابوالفضل آپ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا سلوک ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس نے مجھے اپنے لطیف رحمت سے عزت بخشی ہے اور فرمایا ہے کہ اے بشر اگر تو دنیا میں آگ کے جھگڑوں پر بھی سجدہ کرتا تو پھر بھی تو ہماری اس عزت کا شکریہ ادا نہ کر سکتا جو ہم نے تیری طرف سے لوگوں کے دلوں میں ڈالی ہے۔ اور اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ جو لوگ تیرے جنازہ پر حاضر ہوئے ہیں۔ میں ان سب کو مغفرت دوں گا۔ پھر میں نے پوچھا کہ اے ابوالفضل تمہارا کیا حال ہے جواب دیا۔ کہ وہ صبر کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے برتر رتبہ پر ہیں۔

(ج) اشہل علیہ الرحمۃ کو ایک صالح مرد نے خواب میں دیکھا کہ وہ بغداد کی مجلس صاۃ میں حسب معمول نہایت فائزہ لباس پہنے بیٹھے ہیں۔ میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور دریافت کیا کہ آپ اصحاب میں سے زیادہ مقرب کون سے لوگ ہیں۔ فرمایا کہ وہ لوگ جو ذکر پر زیادہ متوجہ اور متوق اللہ کو زیادہ ملحوظ رکھتے اور اس کی رضا مندی حاصل کرتے ہیں۔

ابو عبد الرحمن الساعلی کہتے ہیں کہ میں نے میسر بن سلیم کو مرنے کے بعد خواب میں دیکھا میں نے پوچھا کہ آپ مدت سے غائب ہیں فرمایا کہ بہت بڑا مہاجر ہے۔ میں نے پوچھا

کہ کیا حالت گزری فرمایا کہ ہیں آسانی دی گئی کیونکہ ہم لوگوں کو مسائل شرعیہ میں سائیاں بتلایا کرتے تھے جن سے انہیں دین کی پابندی نکلوا رہی ہوتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کچھ مجھے بھی اللہ شاد فرمائیے فرمایا کہ سلف صالحین کی پیروی کرو۔ اور نیک لوگوں کی مصاحبت نہ چھوڑو۔ کیونکہ یہ ہر دو باتیں دوزخ سے بچاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے مقرب بنا دیتی ہیں۔

اس قسم کی سینکڑوں نظیریں کتب میں مذکور ہیں اور اگر کوئی شخص انکا انکار کرنے لگے تو اس کے انکار کی کوئی وقت نہیں ہو سکتی کیونکہ ہمارے پاس اس قسم کے صحیح روایہ بھی ہیں جن کی نسبت کذب یعنی خیال باطل کہے ہونے کا گمان تک بھی نہیں ہو سکتا مثلاً کوئی شخص اپنے کسی قریبی یا کسی دوست کو خواب میں دیکھتا ہے اور وہ اسے ایک ایسے امر کا پتہ دیتا ہے جس کا علم بجز اس مرنے والے کے کسی کو نہیں تھا۔ چنانچہ کسی گم شدہ چیز کا پتہ دیدینا یا کسی کے مر جانے یا کسی حادثہ یا قحط کے واقعہ ہونے کی خبر سننا یا اس کو کسی آنے والے امر کی بابت تدبیر بتانا جس سے وہ خواب دیکھنے والا اس امر کی شر سے محفوظ ہے یہ سب اس قسم کے امور ہیں جن کی نسبت کوئی گمان نہیں ہو سکتا کہ محض خیال کا نتیجہ ہوں۔ اور تجربہ میں آچکا ہے کہ خواب دیکھنے والے کے بیان کے مطابق وہ امر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کہ خواب دیکھنے سے پہلے بیداری کی حالت میں ان کا گمان تک بھی نہ تھا۔

نتیجہ ہے کہ بعض وہ لوگ جو روح اور اس کے عجائبات کی حقیقت سے بالکل نا آشنا ہیں کیونکہ مگر بے سوچے سمجھے ایک ایسے امر کی اصلیت سے انکار کر دیا کرتے ہیں جس کی تقدیر میں کتاب اللہ نہایت زور کے ساتھ مطلق ہے۔ کیا یوسفؑ کا رویا اور عزیز مصر کا رویا اور یوسفؑ کے دو ساتھیوں کا رویا جو ان کے ساتھ مجوس تھے اور جو خواب رسالتاب کا رویا و دخول مکہ کے متعلق اور ابراہیمؑ کا رویا و ذبح فرزند کے متعلق ایسے واقعات ہیں جن کو کوئی عقل و ہوش کا آدمی سرسری طور پر ٹال دے۔ اگر مصلحت مانع نہ ہوتی تو خاکسار مولف اپنے چند ایک رویا جن کی نسبت مجھے یقین ہے کہ وہ منجملہ انہیں مبشرات کے تھے۔ جن کا ذکر حدیث میں آچکا ہے

اور جن کا یہی ایسی کی حالت میں کبھی خیال تک بھی نہیں گذرتا تھا اور جو صحیح طور پر پورے اُترے +

عصمت انبیاء علیہم السلام

اختلاف ساریج انبیاء علیہم السلام | اصاح انلی نے دنیا میں بیشمار انواع موجودات پیدا کئے ہیں جن میں ایک حضرت انسان بھی ہے جس کا شرف الخوقات ہونا دلائل عقل و نقل سے پایہ یقین تک پہنچ چکا ہے اور جس طرح دیگر انواع موجودات کا بلحاظ کمالات کے مختلف سلیج پر ہونا ایک بن امر ہے اسی طرح افراد انسانی بھی اپنے اپنے فطری اور کسی اور دینی کمالات میں مختلف سلیج پر دیکھے جاتے ہیں۔ ہم ہر سہ اقسام کمالات مذکورہ بالا کا کوئی خاص معیار قائم نہیں کر سکتے کیونکہ قدرت کے لامتناہی عجائبات کی کوئی حد مقرر نہیں کیا جاسکتی مگر یہ امر نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ کمالات انسانی میں جو سب سے اعلیٰ

حاشیہ متعلق صفحہ نمبر ۲۷۲ :- ۱۔ حضرت نے فرمایا کہ وحی منقطع ہو چکی ہے ہاں مبشرات باقی رہ گئیں۔ پوچھا گیا کہ مبشرات کیا مراد ہے آپ نے فرمایا کہ وہ کیا صالحہ جو عین کو دکھایا جاتا ہے یا کسی من کو کچھ مرسے میں کی نسبت دکھایا جاتا ہے ۲۔ وہ ۱۔ کمالات انسانی کے تین اقسام ہیں فطری جو انسان کو فطرۃً حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ کمالات جو کسی شخص کی لطافت طبع اور اعتدال ترکیب جہانی پر موقوف ہیں کہیں یعنی وہ کمالات جو انسان کو بذریعہ تعلیم و تربیت اور بذریعہ مجاہدہ و ریاضت حاصل ہوتے ہیں وہی یعنی وہ کمالات جو انسان کو بمقتضائے ذلالت فضل اللہ یطیہ من یشاء خزائن رحمت ایزدی سے بطور انعام و مہبت عطا کئے جاتے ہیں لیکن لوگ خصوصاً بنجر یہ صرف اہل اللہ و دو قسم کے کمالات کے قائل ہیں اور تیسری قسم کا انکار کرتے ہیں۔ وجہ انکار یہ ہے کہ انہیں قسم ثالث کے لئے کسی سلسلہ اسباب معلوم کا علم نہیں ہوتا۔ مگر حقیقت ایسا نہیں کیونکہ اسباب معلوم کا علم نہ ہو گا اہم امر کا مستلزم نہیں کوئی واقع خدا تعالیٰ نے ایسے کمالات کے لئے کوئی اسباب قائم نہیں کئے ۱۲۔ ائمہ +

اور اشرف رتبہ ہو سکتا ہے۔ وہ صرف رتبہ نبوت ہے۔ نبی اللہ حبیب نبی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوتا ہے تو اس کو مرسل بولتے ہیں اس لئے رسالت نبوت کے اعلیٰ سے اعلیٰ کمال کی ایک صورت ہے۔ اگرچہ رسالتیں بھی مقام قرب کے لحاظ سے مختلف مدارج بروئے نفس قرآنی ثابت ہیں مگر ہمیں اس وقت نبوت کے صرف عام مفہوم سے بحث کرنا مدنظر ہے۔

نبوت کمال فطری یا کسبی یا پوی [پنچمیریہ اور نبض دیگر اہل بدعت وہ ہوا یہ مانتے ہیں کہ نبوت ایک کمال فطری کا نام ہے یعنی کسی شخص کی فطرت ہی

میں پیدائش کے وقت مادہ نبوت و ولایت رکھا جاتا ہے۔ اور جب عقل انسانی درجہ کمال تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے آثار و لوازم کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی مادہ نبوت جوش میں آکر نبی کو دہشت اور تبلیغ پر آمادہ کرتا ہے چنانچہ اس کے متعلق وہ یہ حدیث پیش کیا کرتے ہیں۔ النبی نبی فی بطن امہ یعنی نبی ماں کے پیٹ ہی میں ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال نہ صرف غلط ہے بلکہ اس کے ماننے والا محمد و زینب ہی ہے اور شرعاً قابل تخریب ہے۔ اور حدیث مذکور بالا سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ نبی کے نطفہ میں صرف نبوت کی قابلیت و ولایت رکھی جاتی ہے جو بتدریج ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ اور بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور مہبت الہی علوم کا اضافہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کا اللہ تعالیٰ کے علم میں بنی ہونا پہلے ہی موجود ہوتا ہے جیسے ایک دوسری حدیث میں وارد ہے السعید سعید فی بطن امہ والشفی شفقی فی بطن امہ یعنی نیک ماں کے پیٹ میں ہی نیک ہوتا ہے۔ اور بدمل کے پیٹ ہی میں بد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے ہی سے نیک کا نیک اور بُرے کا بُرا ہونا مقدر ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نبی کی فطرت کی قابلیت دیگر افراد انسانی سے بدرجہ کمال قبول حق کے لئے مستعد ہوتی ہے۔ مگر ملک روحانی سے تعلیم کا حاصل کرنا ایک امر زائد ہے جس کو محض انعام خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھو اس راز کو کس طرح خداوند کریم نے کس لطافت کیساتھ ایہ نویدیں واضح فرمایا ہے۔ حیث قال کیا وشریفاً یضی ولولہ تمسہ

نار نور علی نور۔ اس کی تفسیر محققین ائمہ کتاب سنت نے یہ کی ہے کہ نبی اللہ کی فطرت اس قدر لطیف اور قبول حق کے لئے مستعد ہوتی ہے کہ بغیر تعلیم و وحی کے وہ صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے گویا وہ ایک قسم کا روشن ہوتا ہے جس میں لازمِ نوریت کے قبول کر لینے کی استعداد اس قدر مضمحل ہوتی ہے کہ خود بخود شعلہ زن ہو جائے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کی فطرت بجائے خود اپنے اندر ایک نورِ صداقت خفی رکھتی ہے مگر تعلیم و وحی کے فیضان سے اس میں ایک غیر معمولی روشنی پیدا ہو جاتی ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ نورِ فطرت کے ساتھ ایک دوسرا نور یعنی نورِ وحی منضم ہو جاتا ہے یعنی نبی اپنی فطرتِ سلیمہ سے تمام لوازمِ معرفت کا جامع ہوتا ہے۔ مگر ملکِ روحانی سے تعلیم حاصل کر کے ان لوازم کی تکمیل کر لیتا ہے۔ اور اس لئے اس واقعہ کی تصدیق کرنے میں اس کو کسی قسم کا التباس و اشتباہ واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو کچھ اس کی فطرت کا تقاضا تھا اس کو ملکِ روحانی سے اقد کر تا ہے۔ اور اس لئے نور علی نور ہے میری اس تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے نبوت کو صرف نورِ فطرت تک محدود رکھا ہے اور نورِ وحی کو نورِ فطرت سے علیحدہ نہیں سمجھا۔ انہوں نے اپنی نچر یا نہ روش میں قرآن کریم کی نص صریح کی تکذیب کی ہے اور ان کا مذہب سراسر باطل اور اس کے ملنے والا بلا ریب و شک محدود و ضیق ہے ۔

مذکورہ بالا تقریر سے معلوم ہو گیا۔ کہ نبوت نہ تو کمالِ فطری ہے نہ کسی بلکہ محض مہبتِ الہی ہے جو مقتضائے اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ خاص خاص بندگانِ خدا کو عطا ہوتا رہا ہے اور ایک اور بڑی زبردست دلیل اس دعویٰ کی یہ ہے کہ ہر فطریہ کے لئے کسی خاص زمانہ کی تخصیص کرنا خود قانونِ فطرت کی مخالفت کرنا ہے پس نبوت اگر نورِ فطرتی کا نام ہوتا اور نورِ وحی

لے سید صاحبِ نبوت کو نورِ فطرت سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ وحی ایک قسم کا فطری ملک ہے جیسے طبعی یا لوہا یا شکر کو اپنے فن میں حاصل ہوتا ہے ۔ ۱۲ منہ +

نور فطرت سے کوئی علیحدہ چیز ہوتی تو کیوں جناب محمد رسول اللہ کے بعد اس کا دواڑہ بند ہو گیا۔ چونکہ
ہو فطر یہ اپنی نوعیت کی رو سے کبھی محدود الوقت نہیں ہو سکتے اس لئے کسی خاص زمانہ تک ان
کا محدود کرنا خود خلاف فطرت ہے اسی بنا پر اور لخصوص آیات و احادیث پر ہم یہ کہتے ہیں کہ نبوت
کمال فطری نہیں بلکہ نور نبوت کی قابلیت نبی اللہ میں ودیعت رکھی ہوئی ہوتی ہے جس سے وہ نور
وحی کو قبول کرتا ہے حاصل یہ ہے کہ نور وحی ایک امر خارج از فطرت انسانی کا نام ہے جس کو
کسی خاص انسان کی فطرت پر بند لیہ ملک القا کیا جاتا ہے یہی صحیح مذہب ہے جس کو تمام اہل
حق نے قبول کیا ہے

وَهَذَا الْحَقُّ لَيْسَ بِمُخْفَاءٍ - فِدَعْنِي عَنْ بِنَايَاتِ الطَّرِيقِ

انبیاء علیہم السلام اور عامۃ الناس میں بالامتياز | یہ امر بالخصوص قابل ذکر ہے کہ نبی اللہ
کو قبل از نبوت دیگر افراد انسانی سے کوئی

امتياز نہیں ہوتا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دیگر افراد کی طرح تمام نیک بد افعال کا مرکب ہوتا ہے
نہیں بلکہ جس طرح بعض دیگر افراد انسانی بالطبع نیک ہوتے ہیں اور شر کی طرت انہیں مطلقاً میدان
نہیں ہوتا۔ اسی طرح نبی اللہ بھی اپنے نور فطرت کی وجہ سے قبل از نبوت ہر ایک قسم کی ظاہری اور
باطنی عبادتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ کسی نبی کی نسبت آج تک یہ نہیں کہا گیا کہ وہ قبل از
نبوت زانی۔ شراب خور۔ راہزن۔ وغا باز۔ کاذب وغیرہ تھا۔ بلکہ باوجود اس امر کے کہ وہ بت پرستوں
میں مہجوث ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بتوں کی پوجا نہیں کی۔ اور نہ مشرکین کی رسم اختیار
کی۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے اس امر پر اجماع کیا ہے کہ نبی اللہ قبل از نبوت تمام کبار سے
معصوم ہوتا ہے۔ اور صفائے اوہ سہو میں ان کا اختلاف ہے مگر حق یہ ہے کہ قبل از نبوت صفائے
ارتکاب ناممکن نہیں۔ مگر بعثت کے بعد وہ تمام صفائے کبار سے معصوم ہوتے ہیں البتہ سہو جو

لے یہ وہ حق ہے جس میں کسی قسم کا خفا نہیں سو تو مجھے اور خدا و صری کی گنجینوں سے معاف رکھ۔ ۱۲ منہ +

مخملہ لوازم بشریت ہے اور جس پر فی الفور بذریعہ وحی انہیں آگاہ کیا جاتا ہے بعض جزئیات
 امور میں ان سے صادر ہونا ممکن ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کے لئے سہو کا تسلیم کرنا ہرگز ان کی عصمت
 کا مائع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عصمت ایک قوت ہے جو نفس کو خلاف رضائے الہی حرکت نہیں کرنے
 دیتی۔ یعنی ارادہ اور ارتحباب تو بجائے خود نفس میں گناہ کے لئے حرکت اور سی قسم کا میلان بھی
 نہیں ہوتا۔ اھدیہ امرا بکل صحیح اور قریں قیاس ہے۔ کیونکہ جس طرح بعض دیگر طاقتیں بعض لوگوں
 میں اس قدر قوی ہوتی ہیں۔ کہ دوسرے لوگ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح نفس انسانی
 کا فطرانہ خیر و سعادت پر پیدا ہونا بکل امر واقع ہے چنانچہ مذکورہ بالا آیہ نور یکاد ذہبتہا۔۔۔ الخ
 میں سی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے بطریق صہیب شامی رضی اللہ عنہ کی نسبت حضور علیہ السلام
 فرماتے ہیں۔ لعمد الجبد صہیب لولم یخف اللہ لمد یحصہ یعنی صہیب بہت اچھے
 آدمی ہیں۔ اگر بالعموم انہیں شریعت کی پابندی میں وعید آخرت کا خوف نہ بھی ہوتا تب بھی وہ
 خدا کی سرکشی نہ کرے۔ پس جب بعض غیر انبیاء کے لئے طبعاً خیر و سعادت پر پیدا ہونا ممکن ہے
 تو انبیاء علیہم السلام کے لئے بدرجہ اولیٰ یہ امر تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور جب تعلیم وحی انہیں دیگر افراد
 نوع سے ممتاز کر دیتی ہے تو ان کی فطری لہارت شریعت الہیہ کی پابندی سے درجہ کمال کو
 پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ تعلیم ان کی فطری لہارت سے ایک علیحدہ حقیقت ہے اور یہی ان کیلئے
 مابہ الامتیاز ہے۔ اس مقام میں بحر انکسار و خضوع و خشوع کے جو مقام عبودیت کے لوازم ہیں
 ان کا اور کوئی شعار نہیں ہوتا۔ درحقیقت عبودیت کا اصلی مقام بحر نبی اللہ کے کسی غیر کو حاصل
 نہیں ہو سکتا۔ ہاں بعض کا اکابر است کو یہ تبعیت انبیاء علیہم السلام مقام عبودیت تک
 گزرتا ہے مگر ان کا رتبہ بہر حال انبیاء علیہم السلام کے رتبہ سے نیچے رہتا ہے۔ اس مقام
 کی حقیقت کو خوب سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ عام لوگوں کو حقیقت عبودیت کی کچھ خبر نہیں ہوتی حالانکہ
 یہ وہ مقام ہے جس پر بحر جماعت انبیاء علیہم السلام کے کسی غیر کو قیام کا موقع نہیں مل سکتا۔
 اور سچر جمیع انبیاء علیہم السلام سے جو مقام عبودیت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا

ہے وہ کسی کو بھی نہیں ملا رہا اب اُدھم تہیں قرآن مجید سے اس دعویٰ کا قطعی ثبوت دیں۔ سنو! قرآن مجید کی آیات میں شور کر کے دیکھو کہ حضور علیہ السلام کو وصف عبودیت کے ساتھ کس کس موقع پر یوں کیا گیا ہے قال اللہ تعالیٰ (۱) وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنْ مَا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا اس آیت میں حضور کو وصف عبودیت کا مقام تحدی پر ذکر کیا گیا ہے۔ تحدی سے منکر پر بطریق غلبہ و قہر تمام حجت مقصود ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نبی اللہ کی تمام روحانی طاقتیں جن پر حقیقی توحید کے انوار غالب ہوتے ہیں منکرین کو اس طرح مغلوب کرتی ہیں کہ نبی اللہ کا غالب آنا اور منکرین کا مغلوب ہونا اس کی صداقت کا ایک زبردست نشان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ کُتِبَ اللَّهُ لَا غُلْبَةَ أَفْنَا وَسُخْرَىٰ۔

(ب) سُخْرَىٰ الَّذِي اسْمُهُ يُعْبَدُ ۝ الْآیۃ۔ اس آیت میں حضور کی وصف عبودیت کو مقام قرب کے نگاہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ ورنہ لفظ عبد کی جگہ کئی اور ایسے الفاظ کا ذکر بھی ہو سکتا تھا جن سے حضور کی ذات کا اشارہ پایا جاتا۔ مگر یہ اشارہ کسی لفظ سے نہیں سمجھا جاتا تھا کہ حقیقت عبودیت ہی اس قرب کے لئے علت ہے یہی وجہ ہے کہ سورہ النجم میں بھی نگاہ قرب کے موقع پر لفظ عبد ہی کا ذکر فرمایا۔ حِثَّ قَالَ فَوَجَّهْ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ بِكَ اس آیت میں مہبط وحی ہونے کی علت بھی عبودیت قرار دی۔ کہا لا یخفی۔

(ج) اِنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدَ اللَّهِ يَدْعُوهُ..... الْآیۃ اس آیت میں حضور کی وصف عبودیت کو مقام تبلیغ رسالت پر ذکر کیا گیا ہے جس سے صاف اشارہ پایا جاتا ہے کہ کمال عبودیت منصب رسالت کے لئے بمنزل اساس کے لازم تھا۔

(د) اَنْزَلَ عَلَىٰ عَبْدِهِ الْكِتَابَ اَوْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ۔ میں حضور کی وصف عبودیت کو تبلی کلام کے موقع پر ذکر فرمایا جس سے اس تجلی کی علت کا ہدایت لطیف پیرائے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور وہ کمال عبودیت ہے۔

آیات مسطورہ بالا میں ایک حقیقت میں طالب حق اس نکتہ سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ کہ مقام

عبودیت تمام مقامات سے اعلیٰ ہے اور بجز انبیاء علیہم السلام کے بروجہ اکمل دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ وہ مقام ہے جس میں تمام آثار بشریت بالکل محو ہو کر بنی اللہ کی روح انوار لوحید میں رنگی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقام بشریت کے انہار پر لفظ عبد کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ لفظ بشر کا استعمال ہوتا ہے۔ حیثیت قال قل انما انا بشر مثلكم۔ کیونکہ یہ ہرگز دنیا نہیں تھا کہ کہا جاتا انا عبد مثلكم اور اگر عبودیت اور بشریت میں کچھ تفاوت نہ ہوتا۔ تو کچھ شک نہیں کہ جناب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل ایک ہی پایہ کے آدمی ہوتے۔

مذکورہ بالا تقریر سے ناظرین معلوم کریں گے کہ وصف عبودیت تمام کمالات روحانہ کے معقوٰم پر تکیہ ہے اور بنی اللہ بروجہ اکمل اس وصف سے موصوف ہوتا ہے اس لئے بطور لزوم ہم نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ کسی بنی اللہ کا مقام عبودیت میں ہستقل حاصل کر لینا اس کی عصمت کی ایک یقینی شہادت اور قطعی دلیل ہے۔ اور جن لوگوں نے نگاہ و بیگاہ انبیاء علیہم السلام کی ذوات مقدسہ کے متعلق ممکنہ چینیاں کیں ہیں۔ انہوں نے بنی اللہ کی حقیقت کو مطلقاً نہیں سمجھا بلکہ وہ تمام افراد انسان کو جمعیت اور ملعون نفسوں پر قیاس کرتے ہیں۔ جو وسوس اور شکوک کی دلدل میں پھنسے ہیں اور مختلف قسم کی ہوا پرستی اور شہوت طلبی کے تفریق بنے ہوئے ہیں۔ اور جنہیں حصول لذائذ کے سوا روحانیت کی کچھ خبر نہیں ہوتی اور شیطان شب و روز ان کے آگے پیچھے اور واپس بائیں اپنے وسیع و اہم پھیلائے مسند کھڑا رہتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام جہت بشریت کی رو سے کھاتے پیتے سوتے اور خانہ داری کرتے ہیں مگر حسب اقصائے شریعت لیکن جہت عبودیت سے افراد انسانی سے انہیں ایک نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ جس شخص کی جہت بشریت کی اصلاح بروجہ شریعت نہ ہوئی ہو۔ وہ مدارج عبودیت پر ترقی کر سکے چاہے کہ وہ مہبط وحی اور مقرب بارگاہ رب العزت اور محبت اللہ علی الخلق کے عالیشان منصب کا حق سمجھا جائے۔ ابو جہل بھی وہی کچھ کھاتا پیتا تھا۔ جو حضور علیہ السلام کر رہے۔

ابن خرد گرد و دلپیدی زو جُدا - داں خور و گرد و ہمہ نور خدا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر قرآن شریف کی بعض ان آیات کریمہ کی حسب ضرورت تفسیر کی جائے جن کی بناء پر بعض معتزین انبیاء علیہم السلام کی عصمت پر اعتراض عائد کیا کرتے ہیں مگر تفسیر آیات سے پہلے یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عوام الناس جو علوم عربیہ سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور صرف اوصاف اور معرکے اور دتر جوں کو دیکھ کر قرآن دنی کا دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں۔ عموماً بعض الفاظ کے مفہوم اصلی اور متعال صحیح کے سمجھنے میں غلطی کر جاتا کرتے ہیں۔ عالم کائنات میں کئی ایک اس قسم کی اشتیاء بیٹنگی جو بظاہر ایک ہی لفظ سے تفسیر کی جاتی ہیں مگر انکی حقیقت ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ مثلاً لفظ فرج کے معنی مشہور ہیں جن کو سب عربی خوان جانتے ہیں مگر آیہ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا میں خداوند کریم نے اس کو مقام فرج میں ذکر کیا ہے اور آیہ فَرَحُوا اِذَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ میں فرج کی ندرت کی ہے وہ اس کی یہ ہے کہ ہر دو مقام میں متعلق فرج ایک چیز نہیں۔ پہلی آیت میں نعمت ایمان پر اظہار فرج مقصود ہے اور دوسری میں نعمت دنیا پر غرور کرنا مراد ہے۔ مگر لفظ ایک ہی ہے جو اختلاف مقام کے لحاظ سے بالکل متضاد معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس لفظ ذنب کے معنی ہر ایک ایسے فعل کے ہیں جن کا انجام اچھا نہ ہو یعنی اس کا نتیجہ کوئی وبال ہو۔ امام رابعی مفرات القرآن میں لکھتے ہیں۔ وَاسْتَعْلُ فِي كُلِّ فِعْلٍ لِيَسْتَوْحِمْ عُقْبَاهُ اِعْتَبَارًا بِذَنْبِ الشَّيْءِ (لفظ ذنب ہر ایک ایسے فعل پر اطلاق کیا جاتا ہے جس کا انجام کوئی عل ناگوار ہو اور یہ لفظ ماقوذ ہے ذنب سے جس کے معنی دھم کے ہیں جو کسی حیوان کا پچھلا حصہ ہوتا ہے) عوام الناس بالعموم قرآن مجید کی بعض آیات میں انبیاء علیہم السلام کے متعلق لفظ ذنب کو دیکھ کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ ان آیات میں لفظ ذنب سے مراد وہی ذنب ہے جو کفار و فساق کی طرف نسبت کیا جاتا ہے۔ اور یہ ایک بڑی بھاری غلطی ہے جس میں خوب غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس غلطی سے عام نادانوں کو انبیاء علیہم السلام کے نفوس قدسیہ کے متعلق کئی قسم کے شکوک پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ یوں سمجھنے لگتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بھی (معاذ اللہ) ان کی طرح بعض مواقع پر مغلوب النفس ہو جایا کرتے تھے اس

نقطہ غمی نے کئی ایک لوگوں کے ایمان کو باطل کر کے انہیں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ روحانی نسبت قائم کرنے سے محروم رکھا۔ اور وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ جو امر زید کی نسبت جرم کبیرہ ہو سکتا ہے وہی امر عمر و کی نسبت موجب تحمیں و آفرین سمجھا جاتا ہے۔ حسنات الابرار سیئات المقربین۔ ایک مشہور جملہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نیک بندوں کی نیکیاں مقربین با نگاہ کے حق میں گناہ شمار کی جاتی ہیں۔ ایک عامی و دنیا دار کو ترک نماز فریضہ پر عذاب ہو گا۔ مگر ایک بساط قرب پر عزت پانے والے کو ایک آن بھر کی غفلت ذکر پر اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ عتاب ہے بلکہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک ترقی نہ کرنے پر وہ جھٹ مور و عتاب ہو جاتے ہیں اور مقام عبودیت میں شاہدہ بشریت ان کے ہاں عصیاں سمجھا گیا ہے۔ اور یہی ان کے حق میں ذنب عظیم قرار پا کر انہیں متوجیب عقوبت بنا دیتا ہے ان کی عقوبت بھی اسی قسم کی عتاب ہے جو ان کے شان شایاں ہے یعنی کہ وہ بساط قرب پر کچھ دیر کے لئے لذتِ جمال محبوب سے محجوب ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ثانی الحال میں انابت کرنے سے اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں اور یہ نماز عبودیت کا مقام ہے جس کی حقیقت کے سمجھنے سے فلسفی اور کٹ جھی کرنے والے کو سول دور پھینکے گئے ہیں۔ بلکہ وہ ان غائر اور دقیق حقائق کو نہ سمجھ کر ان کا انکار کر دیا کرتے ہیں۔ مگر میرے اس کلام میں اصلیت ہے جس کو سمجھنے والے سمجھتے ہیں۔ ان مقربین بارگاہ کیلئے تو برائے نام بشریت گناہ عظیم ہوا کرتی ہے۔ کیا قیل ۵

آں کہ عین لطف باشد بر عوام - قہر شد بر عشق کیشانِ کرام
شیخ اکبر فتوحاتِ مکیہ میں لکھتے ہیں

استغفار الانبیاء لایکون عن ذنب حقیقاً کذا نوبنا و انما هو عن امر یدق عن عقولنا

رانہ کاذوق لنا فی مقام ہم فلا یجوز حل ذلوقہم علی ما تتعقلہ نحن من الذنب -

یعنی انبیاء علیہم السلام کا اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا مالک ہونا۔ فی الحقیقت کسی ایسے

گناہ کی بابت نہیں جس کا دیگر عوام ارتکاب کیا کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسے دقیق امور روحانیہ کی

بابت استغفار کیا کرتے ہیں جن کا سمجھنا ہمارے عقول سے بالاتر ہے کیونکہ وہ اُسور محض ذوق و وجدان سے تعین رکھتے ہیں جن سے ہم لوگ قاصر ہیں۔ یہاں کے ذنوب کو تو یہ اپنے ذنوب پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

عاصیاں از گناہ تو یہ کنند - عارفان از عبادت متعفار

لفظ ذنوب کی اس مختصر مگر کافی تشریح کے سمجھ لینے پر غالباً اب واقفان و دوز قرآنی پر یہ راز منکشف ہو جائیگا کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کی نسبت جن آیات میں ذنوب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ان میں وہی مذکورہ بالا حقیقت ذنوب ملحوظ رکھنی چاہیے۔ نہ معاذ اللہ بعض موحین یا مخالفین اسلام کے خیال کے مطابق ذنوب سے ایسا امر مراد ہے جس کا ارتکاب عوام الناس کیا کرتے ہیں کیونکہ انبیاء و عہم السلام کے نفوس قدیمہ ہر ایک قسم کی آلائش سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اہل عالم کے لئے رحمت اور رحمت اللہ بننے کا درجہ پاتے ہیں۔ آیۃ و ما ارسلناک الا رحمة للعالمین صاف کہہ رہی ہے۔ کہ ایک گناہ کرنے والا آدمی کیسے واسطہ رحمت ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہ تو خود ہی رحمت سے محروم ہوتا ہے۔ ان سرحدہ سرابلہ قریب من المحسنین اس قسم کے خیالات محض ان لوگوں کے تراشے ہوئے ہوتے ہیں جو نبوت کا انکار کر کے شرعیت کی پابندی سے اپنے تئیں آزاد کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس رکوش سے انہیں مختلف قسم کی خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کا موقع مل جائے۔

سورہ فتح کی آیۃ لیغفرلک اللہ ما لقتام من ذنباک و ما تاخر کے متعلق مفسرین نے کئی ایک جواب دیئے ہیں۔ اور منجملہ ان کے ایک جواب وہ بھی ہے جس کو اکثر مفسرین نے تسلیم کیا ہے کہ استغفار سے استغفار اُمت مراد ہے کیونکہ صاحب شریعت ہونے کی وجہ سے جس طرح اُمت مرحومہ کے اعمال صالحہ آپ کے ذات والا کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے معاصی بھی آپ کی ذات والا کی طرف نسبت کئے جاتے ہیں۔ گویا جواب غلط نہیں مگر سورہ محمد کی آیۃ و استغفر لک ذنباک و للمؤمنین... الخ سے مناسبت نہیں لکھا ہے

کیونکہ اس میں اہمیت کیلئے علیحدہ طور پر استغفار کا حکم آپ کو دیا گیا ہے۔ سچ اور سچی بڑا ب دی ہے۔ جو اوپر نہ کر ہو چکا ہے۔ کیونکہ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ حقیقت استغفار نام عبودیت کی تکمیل کے لئے ایک قوی سبب ہے اور یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں: **إِنِّي لَا اسْتَغْفِرُ اللَّهَ فِي الْيَمِّ وَالْأَمَلَةِ مَا يَدْرِي مَنَ يَخْلُقُ مِنَ السَّمَاتِ أَمْ دُونَ ذَلِكَ**۔ استغفار کرتا رہتا ہوں حضور علیہ السلام کو اس فعل سے اول تو امت مرحومہ کو تین استغفار مد نظر تھی۔ تاکہ یہ لوگ بھی بکثرت استغفار کیا کریں۔ دوم محض مقام عبودیت کی تکمیل کے لئے ایسا کرنا غرضی تھا۔ جو ایک گونہ منافی ذکر ہے اس لئے کچھ نہ کچھ حجاب اور خفیت ہی کہورت قلبی کی نسبت آپ نے فرمایا۔ **إِنَّهُ لِيَتَنَزَّلَ عَلَى قَلْبِي** یعنی میرے قلب پر ایک خفیت سی تار کی آجاتی ہے اور یہ وہی تار کی تھی جس کو **اسر حنا بالصلوة** یا بلال سے دور کیا جاتا ہے۔

ناظرین اس موقع کو نہایت غور سے سمجھیں کیونکہ یہ واقعی بڑی ابتلا کا مقام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لمحہ بین کی ادھر ادھر کی فضول باتوں پر اپنا ایمان ضائع کر بیٹھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرومنزلت کا اندازہ عوام الناس ہرگز نہیں لگا سکتے اور مسترضین کی باتوں پر قسم قسم کے وساوس و شکوک کو دل میں جگہ دے لیتے ہیں جو ایمان کو چڑے سے کاٹ ڈالتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کے متعلق جس قدر اعتراضات کئے جاتے ہیں ان سب کے حجاب میں اس قاعدہ کلیہ کو مد نظر رکھنا چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام سے عداوت تو مغیرہ اور نہ کبیرہ گناہ سرزد ہو سکتا ہے البتہ سہوا ورتبیان سے وہ ہرگز خالی نہیں ہو سکتے۔ سوان کے حق میں سخاوت و دیگر لوگوں کے سہوا ورتبیان بھی قابل مواخذہ ہیں۔ اور اسی قابل مواخذہ ہونے کی وجہ سے ان کی ایسی برائیوں کو عصیان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر بالانہمہ جب کسی نبی اللہ سے کوئی سہوا ورتبیان ہو تو

۱۔ جب تعلق باسراوی کی وجہ سے حضور والا کا قلب صافی بیقرار ہوتا تو بلال رضی اللہ عنہ کو پچارتے کہ اٹھو اذان کہو تاکہ جمال محبوب حقیقی کے دیکھنے سے سرور حال ہو اور یہ قلوب واضطرب و دہرجلئے ۱۲ منہ ۲

توفی الغور اس کو اس پر آگاہ کر دیا گیا۔ مثلاً جناب پنہیر علیہ السلام کا بعض مواقع پر نماز میں سہو کر جانا یعنی چار رکعت کی بجائے پانچ کا اور اگر جانا چنانچہ صرف پانچ دفعہ حضور علیہ السلام سے نماز میں سہو ہوا جبکہ کتب احادیث میں مروی ہے اور غور کرو تو اس میں ایک حکمت مضمر تھی یعنی ایک قاعدہ شرعی سجدہ سہو کا قائم کرنا مقصود تھا اس لئے بارادہ الہی آپ سے سہو ہوا کئے تاکہ امت مرحومہ کے لئے ایک گتہ نہ توسیع ہو جائے اور یہ بعینہ وہی حکمت ہے جو حضرت ام المؤمنین زینب رضی اللہ عنہا کے فحاح میں مد نظر تھی یعنی کہ امت کے لئے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے فحاح کر لینا مشروع قرار پایا جس کو میرا اپنے جنت باطن سے نہایت پر زور الفاظ میں بصورت اعتراض یوں پیش کیا کرتے ہیں کہ آیۃ و تحفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ کا یہ مطلب ہے کہ معاذ اللہ جناب پنہیر علیہ السلام زینب رضی اللہ عنہا پر فریقہ ہو گئے تھے اور اس لئے اس کو اپنے نکاح میں لانے کے لئے بہت کوشش کرتے تھے۔ مگر ان نا اہل ظالموں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ زینب حضرت کی پھوپھی کی بیٹی تھیں اور شروع سے آپ انہیں اور وہ آپ کو خوب جانتے تھے اور خود حضور نے اپنی مرضی سے آپ کو زید کے نکاح میں دیدیا اور ایک مدت اس کے گھر میں رہ کر جوانی کا زمانہ گذار چکی تھی آخر کار جب ناموافقیت ہو گئی تو حضرت کو مجبوراً دوبارہ طلاق زینب رضی اللہ عنہا زید کا بھینال ہونا پڑا کیونکہ اتفاق کی کوئی صورت ممکن نہ تھی۔ مگر طلاق ہو جانے کی صورت میں حضور کو یہ خیال بھی سوجھتا تھا کہ زینب رضی اللہ عنہا کی حالت کی آئندہ نگرانی کے لئے بظاہر اور کوئی ایسی سیل نظر نہیں آتی جس سے انکا جبر خاطر ہو سکے حضور نے بمقتضائے اپنی پاک فطرتی

لے اور تو اپنے دل میں بات پر بند رہ کر مکتا تھا جسکو اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا چاہتا تھا۔ حضرت زینب پہلے زید کے گھر میں تھیں۔ مگر سہو میں ماسا زب ہو گئی حضور علیہ السلام نے بہت کوشش کی کہ ہر دو میں موافقت ہو جائے مگر بات نہ بن پڑی۔ جناب پنہیر علیہ السلام کو بند رہ دجی یہ علم تھا کہ زینب طلاق ہو کر آپ کے نکاح میں آئے گی۔ مگر چونکہ زید کو عرب کے دستور کے مطابق آپ بیٹا کہا کرتے اسلئے آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ گو آسمانی وحی دوبارہ *

کے محض بہ نظر رحم پر یہی باتیں اپنے نواح میں لینا پسند فرمایا مگر منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکل کر لینے کو رسم جاہلیت کے یہ خلاف سمجھ کر دل میں چرچ و تاب کھاتے کہ ایک طرف وحی آسمانی و بار بارہ نواح نازل ہو چکی ہے اور دوسری طرف لوگوں کے طعن کا خوف ہے چنانچہ کچھ مدت اسی حالت میں گزرتی تھی جس پر مذکورہ بالا آیت بصورت غنا نازل ہوئی۔ کہ جس کو خداوند تعالیٰ بطور قانون شرعی قائم کرنا چاہتا ہے تم اس سے کیوں جھجکتے ہو۔ لوگوں کی طعن اور تشبیح کی پرواہ کچھ نہ کرو چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے پر حضور نے زینبؓ کو اپنے نواح میں سے لیا یہ ہے مختصر تفسیر اس آیت کی جسکو عیسائی مشنریوں نے اپنے خبثت باطن سے ایک بہانہ شرمگ صورت میں پیش کیا ہے اور جو الفاظ قرآن مجید سے ہرگز مستنبط نہیں ہو سکتی۔ اس واقع میں اگر حضور کے متعلق کسی امر کا خیال ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسی قدر ہے کہ جیسے وحی آسمانی و بار بارہ نواح ہو چکی تھی تو پھر کیوں آپ نے تردد و توقف کیا سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حضور کا اپنا اجتہاد تھا جو اللہ تعالیٰ کی مراد کے برخلاف تھا۔ چنانچہ اسی وجہ پر عتاب بھی نازل ہوا۔ چنانچہ کوئی امتدادی نہیں کہہ سکتا کہ یہ امر بہ نیت مخالفت حکم الہی کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس قسم کی اجتہاد وحی غلطی کا انبیاء علیہم السلام سے سرزد ہونا ممکن ہے۔ مگر وہ

✽ نواح ہو چکی ہے۔ مگر عام لوگ طعن کرینگے کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نواح کر لیا۔ ۱۲ منہ ۴

۱۔ حضور کا رجوع اللہ العالین ہونا مسلم ہے چنانچہ تینامی اور راند خوردوں کیلئے حضور کا وجود ابر رحمت تھا۔ دیکھو کہ باوجود متعدد نواح کے سوائے حضرت عائشہ صدیقہ کے سب کے سب مشکوحات یہ وہ تھیں جس سے ایک صد ایشیاء آدمی یہ غیہ خال کر سکتا ہے کہ امت مرحومہ کو بیکان کی حالت پر رحم کی تعلیم دینا مقصود تھا۔ ہم عیسائی مشنریوں سے پوچھتے ہیں کہ اے ظالموں تم خدا کا خوف کر کے جواب دو کہ جس شخص کو شہوت پرستی مد نظر ہو کیا وہ بوڑھی اور بوڑھو عورتوں سے نواح کرنا پسند کرے گا۔ ۱۲ منہ ۴۔ یہ ہے یہ تفسیر حضرت امام زین العابدین جن میں بن علی علیہ السلام کی تقریر سے اخذ کی ہے ۱۲ منہ ۴۔ امام بن جنم ظاہری نے اسکا جواب نہایت ہی عمدہ میں بیان فرمایا ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کے توقف کی وجہ سے کہ

فی النور اس غلطی پر آگاہ کئے جاتے ہیں۔ اس کی کئی ایک مثالیں خود قرآن مجید میں مذکور ہیں چنانچہ سورہ عبس و قوئی کی شان نزول اسی قسم کی اجتہادی غلطی پر مبنی ہے جس کا مختصر بیان یہ ہے کہ عرب کے چند ایک قبائل کے بڑے بڑے لوگ بغرض تخریق دین حضور علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں ابن ام مکتوم جو نابینا تھے حاضر ہوئے۔ اور بیٹھ گئے اور کوئی مسئلہ دریافت کرنے لگے۔ حضور نے یہ اجتہاد کر کے کہ یہ تو ہمیں ہر وقت پاس موجود ہیں پھر لپچھ لپٹ گئے اور یہ لوگ جو دوسرے آئے ہیں انہیں اسلام کی طرف اگر سیلان ہو جائے تو بڑی بات ہے ابن ام مکتوم کی بات کی طرف توجہ نہ کی چونکہ حضور علیہ السلام کا یہ خیال مرضی خدا تعالیٰ کے برخلاف تھا جھٹ بھرت عتاب سورہ مذکور بالا کی آیات نازل ہوئیں کہ تمہارا ایسا کرنا صحیح نہ تھا۔ اسی طرح غزوہ بدر میں بعض مشرکین کے قتل کرنے یا فدیہ لیکر چھوڑ دینے کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا سوا حضرت عمر کے سب نے فدیہ لیکر چھوڑ دینے کی رائے پیش کی جس پر حضور علیہ السلام راضی ہو گئے مگر یہ فعل مرضی خدا تعالیٰ کے برخلاف تھا۔ جھٹ بالفاظ لو کہ کتب من اللہ سبق لمسلم فیما اخذتم عذاب عظیم۔ عتاب نازل ہوا۔ اسی طرح حضور علیہ السلام نے یہود کے ان سوالات کے جواب میں جو در بارہ وراثت حقیقت یسع اور قعد اصحاب کہف اور ذوالقرنین انہوں نے کئے تھے یہ فرما دیا تھا کہ میں تمہیں کل بتاؤں گا بدیں الفاظ عتاب نازل ہوا۔ وَلَا تَقُولُنَّ لَیْسَ اِیْنِی فاعِل ذلک عذابا لکان لیشاء اللہ۔ یا غزوہ تبوک میں بعض لوگوں کے کچھ عذر پیش کرنے پر غزوہ میں نہ شامل ہونے کی آپ نے اجازت فرمادی

✽ وہ ایمان سے جواب لے بیٹھے۔ ۱۲ منہ ✽

لے اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت انہی اسی نہ ہوتی تو فدیہ لے لینے کے بارے میں تم پر عذاب عظیم نازل ہوتا اس آیت میں خطاب مسلمانوں کو کیا گیا ہے نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ ۱۲ منہ ✽
 سنے کسی امر کی بابت یوں مت کہا کرو کہ میں کل کو کرؤں گا۔ بلکہ انشاء اللہ تعالیٰ کا لفظ ساتھ بولا کرو۔ کیونکہ انسان کل کی نسبت ہرگز ذوق نہیں رکھتا کہ وہ اسے کر سکے گا یا نہیں ممکن ہے کہ ارادہ الہی قتل کے برخلاف ہو۔ ۱۲ منہ ✽

جس پر پیر عفا اللہ عنہ لہذا فت لہم نازل ہوئی۔ علیٰ ہذا التیاس۔ مگر ایسے امور کی نسبت بالکلیت
 یہی صحیح جواب ہے کہ یہ امور از قلم اجتہادی غلطی یا سہو و لسانی کے شمار کئے جاتے ہیں۔

نزدیکیاں را بیش بود چیرانی

پس کسی نابجا آدمی کے اعتراض کو بلا سوچے سمجھے قابل وقعت خیال کر کے انبیاء علیہم السلام
 کے حق میں سوچن کر لینا خبت باطن کی دلیل ہے ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں صحیح
 معتقدات پر قائم رکھے جن پر خاتمہ بالخیر کا مدار ہے اور دعا کرتے ہیں کہ انہیں اعتقادات صحیحہ پر
 کل کو خدا کے حضور میں پیش ہو کر سرخرو ہوں کیونکہ حدیث صحیح میں یوں آچکا ہے یحشر ائمتہ اس
 علی ما ماتوا یعنی لوگ قیامت کو اسی حالت پر اٹھائے جائیں گے جس پر وہ دنیا سے رخصت
 ہوئے اور قرآن مجید میں بدیل الفاظ اشارہ وارد ہے۔ یوم ندعو اکل اناس بامام ہم یعنی قیامت
 کے دن ہم لوگوں کو ان کے پیشرو اماموں کے ساتھ میدان حساب میں اکٹھا کریں گے۔ جو شخص جس
 کے معتقدات کا تابع ہوگا اسی کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو حضور صلی اللہ
 علیہ وسلم کے لوے حمد کے سایہ تلے آرام کئے ہوں گے۔ اور بد خبت ہیں وہ لوگ جو قرآن و سنت
 کے مخالف معتقدات والے ائمۃ الکفر کے ساتھ اس کس پرستی کی حالت میں ذیل ہوتے پھریں گے
 فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

مذکورہ بالا بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام ہر ایک صغیرہ اور کبیرہ گناہ
 سے معصوم ہوتے ہیں البتہ سہو و لسانی کا جو مقتضائے بشریت ہے یا کسی قسم کی ایسی اجتہادی غلطی
 جو مرضی الہی کے برخلاف ہو سرزد ہونا ان سے ممکن ہے مگر ایسا واقعہ ہونے کی صورت میں بھی
 محض انہیں بذریعہ وحی آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ فی انفسہ رجوع کر لیتے ہیں۔ سو یہ صورت
 خصمت انبیاء علیہم السلام کے لئے کسی طرح بھی موجب نقص نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ سہو و لسانی مفہوم

لہذا تجھے ممانعت قرآن سے نہیں کیوں نہ شامل ہوئی کی اجازت دی کہ کیونکہ ان لوگوں کا عند صحیح نہیں تھا۔ ۲۰۱۰ منہ

گناہیں داخل نہیں مگر یا نبیہ انبیاء علیہم السلام کو یا مخصوص اور ائمہ اہل ایمان کو بالعموم استغفار کثیر کی طبع
توجہ دلائی گئی ہے کیونکہ استغفار فی حد ذاتہ بموجب کمال عبودیت ہے اور غور کرو تو اس اعتبار ہی پر
بتدہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان رابطہ حقیقت و مخلوقیت کا پتہ دیتا ہے اور جب استغفار تہ ہو تو
یوں سمجھو کہ انسان علما اپنے تئیں خالق سے نیاز کے سامنے نیاز مند مخلوق ثابت نہیں کرتا کیونکہ
جس طرح ہماری ظاہری اور باطنی فطرت ہمارے مضطر لی الشہر نے پر دل ہے اسی طرح ہر
شرعی فرض میں ارادی صورت میں خالق سے نیاز کی عبادت پر مجبور کرتا ہے جس کا نتیجہ کمال عبودیت
ہو سکتا ہے پس قرآن مجید کے آیات میں جہاں انبیاء علیہم السلام کی تسبیح استغفار آیا
رجوع یا توبہ یا انابت وغیرہ الفاظ کا ذکر آیا ہے وہاں ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ معاذ اللہ وہ
طیکر لوگوں کی طرح گناہ گار تھے کیونکہ یہ نہایت موٹی نظر کے لوگوں کا خیال ہے جنہیں عبودیت
اور نبوت کے اعلیٰ مقامات کی حقیقت اور ان کے لوازم کی کچھ خبر نہیں۔ اس مقام پر مناسب نظر
آتا ہے کہ بعض ان آیات کے متعلق ان اعتراضات کو برنچ کیا جائے جو گاہ و بیگاہ عیسائی مشنری
لوگ مختلف انبیاء علیہم السلام کی نسبت عائد کیا کرتے ہیں اور ناواقفوں کو دھوکا دے کر خدا کی
لعلت کے مستوجب قرار پاتے ہیں۔

حضرت ابوالبشر علیہ السلام | آپ کے متعلق مستحقین آیات ذیل سے تمسک کیا کرتے
ہیں (الف) عصی آدم (بہ فتویٰ (ب) وکلا

تقرباً ہذا الشجرۃ فتکونان من الظالمین (ج) قلب علیہ (د) فازلحم الشیطن
وجہ استدلال یہ ہے کہ آیہ الف سے آپ کا عصی ہونا اور آیہ ب سے ظالم ہونا اور آیہ ج
سے تائب ہونا اور آیہ د سے شیطان کے بہکانے پر کسرشی گریا ثابت ہوتا ہے جواب یہ
ہے کہ بیشک ظاہر الفاظ سے یہی امور ثابت ہوتے ہیں مگر خود قرآن مجید نے اس امر کا فیصلہ
دیدیا ہے کہ یہ سب کچھ آدم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی کا نتیجہ تھا جو خدا صریحاً فرمایا تھا۔

لے غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ آدم علیہ السلام سے بغدیر انالی الساق و فرع میں نالیک قسم کا پیش خیمہ تھا

جو شخص شیطان کو اپنا خیر خواہ تصور کرنے اور اس کی بات کو اپنے حق میں مفید سمجھنے سے واقع ہوا۔
 حاشا وکلا کہ کسی آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اس حال میں کہ انہیں جانست کا حکم
 دیا گیا تھا اور باوجود اس کے انہیں یقین تھا کہ ایسا کرنا گناہ ہے شجرہ ممنوعہ کے کھانے پر اذم
 کیا ہو کیونکہ نبی اللہ سے ایسی حالت میں کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ آیات ذیل سے یہ جواب
 مستنبط ہوتا ہے فقال للہ تعالیٰ قال لہما ما نھا کما ریکما عن حدہ الشجرۃ لا لکما
 تکنوا صالکین او تکنوا من الخالذین وقاسمہما انی لکما لہن الناصحین فذلہما بعد التعمد
 اس آیت کا لایک ایک لفظ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو مع ان کی یہ بوی
 کے شیطان کی طرف سے دھوکا دیا گیا یعنی شیطان نے انہیں جائت لاکہ میں داخل ہو جانا
 اور بہشت میں ہمیشہ زندہ رہنے کا حکم دیا۔ اذم کھا کر بیان کیا۔ کہ درخت ممنوعہ کا کھالینا
 تمہارے حق میں موجب صلاح و فلاح ہو گا۔ اسوقت آدم علیہ السلام کے لئے حسب فرمان انبوی
 مزدبئی تھا کہ آپ ابلیس کے دم تزدیر میں نہ آتے مگر بوجہ نسیان عہد کے آپ سے بطور
 سہو فعل ممنوع کا ارتکاب ہو گیا کیونکہ عہد کا فراموش ہو جانا اور شیطان کے بظاہر مفید مشورہ
 پر عامل ہونا آپ کے لئے کافی محرک تھے۔ چونکہ ارتکاب فعل میں صورت عمدہ گزرتی تھی نہیں بلکہ
 آپ نے منظر اصلاح اس کا ارتکاب کیا۔ اس لئے کسی طرح بھی بغل حقیقی معنی میں گناہ نہیں
 ہو سکتا۔ قال اللہ تعالیٰ ولقد عھدنا الی ادم من قبل نفسی ولعہم بخلالہ عنہ ملاس
 آیت سے صاف طور پر واضح ہے کہ آدم علیہ السلام کو ارتکاب نفس کے وقت حکم ذاتی باری سے

بواقعہ حاشیہ:- نزول رحمت باری کا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انابت اور خشیت اور جوع الی اللہ کے لئے
 حضرت انسان کو کوئی موقع نہ دیا جاتا۔ اور اس لئے وہ عبودیت کے مراتب کمال پر کبھی ترقی نہ کر سکتا کیونکہ
 نزول رحمت کسی نہ کسی سبب سے واجب ہے۔ سو انکسار نفس اور انابت کے اور کوئی قوی سبب جب حصول
 رحمت باری نہیں ہو سکتا امدید باتیں صرف اسوقت پیدا ہوتی ہیں جبکہ انسان اپنے لئے اللہ تعالیٰ کی نصیحت پر غور کرے اور نہ

نیا نہ ہو گیا تھا۔ اور ہرگز آپ کا فعل بہت اکتاب جرم نہیں تھا کیونکہ جرم کی نفی کر دینے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ نے غیل اس علم اور نیت سے نہیں کیا تھا کہ وہ فعل عند اللہ جرم سمجھا جائیگا اور جس فعل میں علم اور نیت ثابت نہیں وہ ہرگز تعریف جرم میں داخل نہیں ہو سکتا۔ البتہ بظاہر جرم کی صورت بیشک ثابت ہے اس لئے اس پر عصیان غواہیت ظلم وغیرہ الفاظ کا اطلاق کیا گیا پس وحقیقت آدم علیہ السلام کو جو مواخذہ ہوا وہ کسی حقیقی ارتکاب جرم پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس غلطی اور غلطی کی لاش میں تھا جو آپ سے ابلیس کے حق میں حسن ظن قائم کر لینے پر مصادم ہوئی جیکہ انہیں شیطان کے دشمن ہونے کا واقعہ پہلے سے معلوم تھا۔

نوح علیہ السلام | آپ کے متعلق مفسرین آیہ: وَلَا تَسْلُنْ مَأْسِیَ لَکَ بِهِ عِلْمٌ اِنِیْ اَعْلَمُ ان تکون من الجاهلین پیش کیا کرتے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کے اہل کے بچا لینے کا وعدہ ہو چکا تھا آپ نے قرابت ظاہری کو مد نظر رکھ کر بیٹے کو اپنے اہل میں داخل سمجھا اور یہ ایک اجتہادی غلطی تھی نہ جرم جس پر آپ کو کہا گیا اندہ لیس من اهلک یعنی یہ تیرے اہل میں داخل نہیں بلکہ ناظف ہے۔ مگر چونکہ مقام نبوت کی رفعت شان کی رو سے ایک بنی اللہ کے لئے ایسی اجتہادی غلطی کوئی سرسری بات نہیں تھی اس لئے الفاظ مذکورہ بالا میں ڈانٹ ہوئی چنانچہ آپ نے فی الفور رجوع کر کے توبہ کی اور صائے الہی کو اپنا قدوہ سمجھا پس صورت مذکورہ بالا میں نہ تو کوئی گناہ ہے اور نہ ارتکاب گناہ کے لئے کوئی عہد۔

ابراہیم علیہ السلام | آپ کے متعلق مختلف اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں ہم ہر ایک کو مع جواب علیحدہ علیحدہ بیان کرتے ہیں:-

۱۔ جبر اور ادا بابت تجھے معلوم نہیں اسکی بابت مجھ سے سوال ذکر میں تجھے بطور وعظ کہتا ہوں کہ جاہل مت ہو۔
نوح علیہ السلام نے طوفان کے وقت خدا تعالیٰ سے اپنے بیٹے کے بچا لینے کی استدعا کی تھی پس آپ کو ان الفاظ مذکورہ بالا میں کیا براہ راست

(۱) آپ نے ستاروں کے اوضاع میں خور کر کے اپنے بلیہ ہونے کا استدلال کیا۔ قال اللہ تعالیٰ قطر نظرتہ فی النجوم فقال انی سقیم۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے اس فعل سے ہرگز ستارہ پرستی نہیں پائی جاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عالم کائنات میں تمام اشیاء کے لئے فوہیں قائم کئے ہیں جن سے خاص خاص نتائج کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں مثلاً قمر کے طلوع و غروب اور دیگر اوضاع سے سمندروں کے مد و جزر پر استدلال کرنا اہل طبیعات کا مشہور مسئلہ ہے۔ آفتاب کا مختلف اشیاء پر جادہی۔ نباتی۔ حیوانی میں موثر ہونا ایک ایسا تین اور بدیہی امر ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تو اگر آپ نے اوضاع نجوم سے اپنی بیماری کا استدلال کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آگئی۔ کیونکہ جہاں سیاروں کے مختلف اشیاء پر آثار مختلفہ کا مشاہدہ ایک یقینی امر ہے تو ان میں سے بعض سیاروں کے کسی خاص وضع میں ہونے سے آثار بیماری کے وجود کا کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ ابر۔ برق۔ مد و جزر وغیرہ کے بعض کیفیتوں یا پھلوں پر جو آثار مخالف یا موافق مترتب ہوتے ہیں۔ اخوان میں بھی تو کوئی نہ کوئی وجہ ربط قائم کرنی پڑتی ہے۔ پھر صورت متنازعہ فیہ کو کیوں قابل اعتراض سمجھا گیا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض سیارات کے اوضاع مخصوصہ کا نتیجہ بیماری یا صحت ہو سکتی ہے۔ افسوس میں نہ تو شرعاً کوئی بات قابل گرفت ہے اور نہ عقلاً۔ بیشک شریعت اسلامی نے لوگوں کو اخراج نجوم کے متعلق آثار کے استدلال کرنے سے روک دیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ صابی فرقہ کے لوگ ستارہ پرست تھے جو نجوم کو فاعل اور مدبر یا علت متقلد باور کرتے تھے ادنیٰ عین شرک ہے لیکن اگر کسی ستارہ کی کسی خاص وضع کے متعلق کسی خاص اثر کو اس طرح تسلیم کیا جائے جس طرح نباتی اشیاء میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کا مد سے خواص قائم کئے ہیں جن سے ہم روزمرہ متقید ہوتے ہیں۔ تو اس میں کیا خرابی لازم آتی ہے بلکہ اس سے حکیم مطلق کی حکمت بانہ پر استدلال بلغان کو موجود خالص بنا دیتا ہے۔ کوئی مسجد راہمی تسلیم نہیں کرے گا کہ اس قدر بیشمار سیاروں کا پیدا کرنا محض عبث ہے جبکہ یہ مسلم ہے کہ سلسلہ کائنات کی کوئی چیز بھی عبث نہیں۔ ربنا ما خلقت هذا باطلا۔

مسترض اگر انہی تعلید کو ترک کر کے غم کرتا تو ہرگز اس کے دل میں اس قسم کا کوئی طبعان پیدا نہ ہوتا۔

(ب) آپ نے بت خانہ کے پچھلوں کی غیر حاضری میں بتوں کو توڑ ڈالا اور جب ان لوگوں نے دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا۔ بل خلدہ کی دھم یعنی بڑے بت نے انہیں توڑ ڈالا تاکہ یہ جھوٹ تھا اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جھوٹ نہیں بلکہ آپ نے اس سے استدلال توحید کی طرف ان لوگوں کو نہایت لطیف پیرائے سے متوجہ کرنا چاہا جس سے ان پر ایک قسم کا الزام قائم ہو جائے اور وہ بت پرستی کو غلط مذہب سمجھ کر دین حق کی طرف رجوع کریں۔ چونکہ وہ لوگ بتوں کو قائل خیر و شر سمجھتے تھے اس لئے جب انہیں ابراہیم علیہ السلام کے اس جواب سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک جادو نے جس حرکت جو اپنی ذات کے خیر و شر کا مالک نہیں ہو سکتا وہ کسی غیر کے لئے کب مفید و مضر ہو سکتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہیں خالق الخیر و الشر کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملتا۔ گویا ابراہیم علیہ السلام نے الفاظ میں تو بیخ اور سرزنش کرنے کی بجائے انہیں علی طور پر سمجھا دیا کہ یہ بچا ہے جب خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تو تمہارے لئے کیا مفید ہونگے۔ اور حقیقت اس جواب سے بہتر اور کوئی جواب ممکن نہیں تھا۔ سو یہ کسی طرح بھی جھوٹ کی تہمت میں داخل نہیں کیونکہ جھوٹ خود ہر نفسانی کا نتیجہ ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی کا اضرار مخفی ہوتا ہے (ج) آپ نے اپنی بیوی سارہ کی نسبت ایک ظالم کے اس سوال پر کہ یہ کون ہے فرمایا کہ میری بہن ہے اور یہ جھوٹ تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جواب بالکل صحیح ہے اس میں کسی قسم کا جھوٹ نہیں عربی زبان میں ایسے کلام کو معاریض الکلام کہتے ہیں یعنی متکلم ایسا کلام کہے جو دو مختلف معنی کا افادہ کر سکے جن میں ایک تو قریب الغم ہو اور دوسرا قدر اغور کرنے پر موقوف ہو۔ اس قسم کا کلام باتفاق علماء ہرگز جھوٹ میں داخل نہیں بلکہ کسی شخص کی بلاغت اور ذہانت کا نتیجہ ہے۔ اور بعض مواقع پر ایسا کلام

نہایت مفید ثابت ہوتا ہے اس اصل کے رو سے ابراہیم علیہ السلام کا اپنی بیوی کی نسبت یہ کہنا
 کہ میری بہن ہے ہرگز جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ درحقیقت آپ کا مطلب یہ تھا کہ ملت حق نے
 میرے ادا اس عودت کے درمیان بہن بھائی کا رشتہ قائم کر دیا ہے چنانچہ اسی خیال پر مسلمانوں
 کو انما المؤمنون اخوة کی تعلیم دی گئی ہے۔ حالانکہ کوئی حقیقی اخوت باہم نہیں ہوتی ایک
 حدیث میں آیا ہے لا یخطب احدکم علی خطبۃ اخیه یعنی جب تمہارا بھائی کسی عورت
 سے نکل کر نا قرار دے چکا ہو تو دوسرے کو اس سے نکل کر نکلنے کے لئے سعی نہیں کرنا چاہئے
 جیسا کہ عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے کہ حیلہ حوالہ کر کے ایک شخص کسی دوسرے کی تنگنی کو فریاد
 ہے اور یہ سخت گناہ ہے۔ اس حدیث میں بھی بھائی کا لفظ محض دینی اشتراک کی رو سے اطلاق کیا
 گیا ہے۔

ایک اور توجیہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ سارہ آپ کی بیوی اور آپ کا خاندان
 ایک ہی تھا۔ اور خاندان کے مردوں اور عورتوں کو عام طور پر باہم بہن بھائی کہہ دینا
 عام دستور ہے۔ اس کی مثال قرآن مجید میں آیہ والی مدینۃ اخاھم شعیبا میں موجود ہے
 کیونکہ شعیب علیہ السلام کو محض ان لوگوں کے ہجوم ہونے کی وجہ سے ان کا بھائی کہا گیا حالانکہ
 آپ ان کے حقیقی بھائی نہ تھے۔

(د) آپ نے پہلے ستارہ کو پھر چاند کو پھر سورج کو علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو اپنا
 رب قرار دیا اور یہ شرک ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ مقرر نے قرآن مجید کے طرز استدلال کو نہیں سمجھا اور ظاہر

۱۔ جناب پیغمبر علیہ السلام مع صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مکہ سے نکل کر بیل توڑیں جا چھپے تھے تو راستے
 میں مخالفین کے آدمی نے صدیق اکبر سے سوال کیا من محل یعنی تیرے ساتھ کون ہے۔ تو آپ نے فرمایا۔
 رجل معی الی بیل یعنی یہ ایک آدمی ہے جو ساتھ ساتھ ہے وہ شخص شکر پڑا گیا کہ تیرے بیل کی انکی شکلیں موجود ہیں ۱۲۲

ترکیب سے محل مدعا کو اخذ نہیں کر سکا۔ کیونکہ یہ بالکل غلط بلکہ سخت اتہام ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ابراہیم ساویہ کو واقعی اپنا معبود سمجھا۔ اور پھر رجوع کیا کیونکہ اس واقع کے وقت سے پہلے اللہ تعالیٰ آپ کی نسبت ارشاد فرماتا ہے۔ ولقد اتینا ابراہیم رشداً من قبل وکنایہ علمین جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے صلح و ہدایت پا چکے تھے۔ پھر کیونکر ان کے مشرک ہو جانے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہوتا تو آپ کے رجوع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضرور کوئی عتاب نازل ہوتا جسکے یہ مسلم ہے کہ نبیاً علیہم السلام کو صفائیں میں سہو ہو جانے پر بھی عتاب ہوتا رہا ہے اور شرک تو ظلم عظیم ہے پھر ایک ایسے حلیل القدر مرسل سے بلکہ بجائے عتاب کے اللہ تعالیٰ بطور انعام کے یوں ارشاد فرماتا ہے۔ قلک حجتنا اتیناھا ابراہیم علی قومہ وترف درجات من نشاء جس سے ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ آپ کا ستارہ اور چاند اور مسیح کو علیحدہ علیحدہ پروردگار تسلیم کر کے پھر علیحدہ علیحدہ ہر ایک کے لئے نفی ربوبیت کرنا ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا لطیف استدلال ہے جس سے مابنی فرقہ کے لوگوں کو توبیخ ادا ان پر الزام قائم کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ وہ لوگ نجوم پرستی کے مرض میں مبتلا تھے یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کو پہلے معبود تسلیم کر کے نفی ربوبیت کی وجہ بھی بتلا دی اور فرمایا کہ احب الالفین یعنی ایسے معبود جن کی حالت میں تغیر و زوال آتا رہتا ہے بھلا کیونکر معبود قرار پاسکتے ہیں اھ یہ طریق استدلال بعینہ اس قسم کا ہے جو مذکورہ بالا سطریں تبوں کے توڑ ڈالنے پر بغرض الزام آپ نے مشرکین کے سامنے پیش کیا تھا اور غالباً تعلیمی افتہ اصحاب اس طریق استدلال کی لطافت اور موثریت سے خوب واقف ہو گئے۔ کیونکہ خصم کے دعویٰ کو تسلیم کرتے ثبوت دعویٰ کے برخلاف نتیجہ کے اخذ کرنے پر خصم کے لئے حجت بازی کے

لہ ہاں حجت باہر ہے جو ہے ابراہیم کو اسکی مشرک قوم کے برخلاف یہی ہے جسکے لئے چاہیں سکے مدعا کو عملی کل میں مبتلا کر دیں ۱۸۱۸

نام الواب کو سد و کرو یا جاتا ہے۔ اس طریق استدلال اصطلاح اہل فن میں بہان خلف
بولاکرتے ہیں افسوس کہ معترض نے اصل استدلال کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اُلٹا نتیجہ اخذ کر لیا۔

(۴) آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ خدایا میں مُردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت
کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم ہماری قدرت پر ایمان نہیں
رکھتے آپ نے عرض کیا کہ بیشک میرا ایمان ہے کہ تو اپنی قدرت کاملہ سے مُردوں کو زندہ
کر سکتا ہے مگر میں طمینان حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس واقعہ سے معترضین یہ نتیجہ نکال کر تے
ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو احیائے موتی میں شک تھا۔ نفوذ باشد +

اس کا جواب یہ ہے کہ الفاظ قرآن مجید سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ نے رفع شک
کے لئے سجناب باری تعالیٰ کیسے سوال کیا تھا۔ کیونکہ ابراہیم جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ پر جو مخلوق
کو عدم سے وجود میں لاتا ہے مرنے کو زندہ کر دکھانا ایک معمولی بات ہے مگر آپ نے محض
بغیر من انکشاف حقیقت احیاء سوال کیا کیونکہ یقین درجہ علم میں ویسا انکشاف نہیں رکھتا جیسا درجہ
عیال میں مشنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اس کی مثال جینے ایسی ہے جیسے بلو شاہ ملک کے
وجود کا یقین ہر ایک شخص کو بر وجہ کامل ہوتا ہے مگر با اینہم اسے آنکھوں سے دیکھنے کا شوق
ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی شخص کو انگلستانی ولیعہد کے ہندوستان
میں آنے سے پیشتر اس کے وجود میں شک تھا۔ مگر جب وہ اس ملک میں ادھر ادھر گھومتا
پھرا تو متاثرینوں کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا کہ کھوسے سے کھو اچھلتا تھا جو شخص فطرت انسانی
کی غریب پسندی کو خوب سمجھتا ہے اس کے نزدیک سجناب ابراہیم خلیل اللہ کا مذکورہ بالا
سوال بالکل ایک معمولی سوال تھا جو پورا کر دیا گیا۔ اس اعتراض کو ایک صحیح حدیث میں بالفاظ
نحن احق بان شک من ابراہیم رفع کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام
کے لئے قدرت کاملہ ذات باری میں شک کرنے کا کوئی موقع ممکن ہوتا۔ تو ہم ابراہیم سے زیادہ
شک کرنے کے مستحق ہوتے۔ مگر جبکہ ہم بلا مشاہدہ کیفیت احیاء قدرت ذات باری پر کامل

ایمان رکھتے ہیں جس میں کسی قسم کا شک نہیں تو ابراہیم علیہ السلام کیسے شک کر سکتے تھے یعنی آپ کا سوال کرنا بغرض رفع شک نہیں تھا۔

(۹) آپ کے متعلق یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے باپ کے لئے جو کافر تھا جناب الہی میں مغفرت کی دعا کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس بارہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کوئی مانعت نہیں ہوئی تھی اھ آپ باپ کی مدت حیات تک اس کے لئے استغفار کرتے رہے اور جب وہ مر گیا تو آپ نے استغفار کو ترک کر دیا۔ کیونکہ ایمان لانے کی امید اس کی موت پر منقطع ہو گئی۔ چنانچہ خود قرآن شریف میں بالفاظ فلما تبین له أشد ولله تبرأ منه آپ کی بریت کو واضح کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ اعتراض سخت کمزور ہے۔

آپ کی نسبت یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنی قوم کو فرمایا لو ان لوط علیہ السلام

لی بکرمۃ اذادی الی کن شدید۔ آپ کے اس قول پر حدیث میں یوں وارد ہے۔ رحمۃ اللہ اخی لوط اذ کان یا دی الی کن شدید جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کا مذکورہ بالا قول صحیح نہ تھا۔ کیونکہ ان کے قول سے غیر اللہ سے طلب مدد کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معترض نے نہ تو آیت کا مطلب سمجھا ہے نہ حدیث کا کیونکہ غیر اللہ سے بروجہ مجاز لغت طلب کرنا ہرگز منع نہیں۔ خود جناب رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہماجرین

سے زیادہ متقی ہوئے کا لفظ حضور علیہ السلام نے محض بطور انکسار کے فرمایا۔ اور نہ مطلب صرف اتنا ہے کہ اگر

کوئی نبی اللہ شک کرتا۔ تو میں بھی شک کرتا۔ ۱۲ منہ

۱۳ جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے تو اس سے ہزار ہو گئے۔ ۱۲ منہ

۱۴ اگر خود مجھ میں طاقت ہوتی یا کسی زبردست صاحب قوت کی مجھے مدد ملتی تو میں تمہارا مقابلہ کرتا۔ ۱۳ منہ

انصار یعنی اللہ عنہم سے مدد طلب کی اور مسیح علیہ السلام نے فرمایا من النصاری الی اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کی بابت میری نصرت میں کون کون شخص شریک ہوگا بلکہ اس طرح نصرت کا طالب ہوتا عین قانون الہی ہے جس کو قرآن مجید میں یوں ظاہر کیا گیا۔ ولولا دفع اللہ الناس بعضهم ببعض لفسدت الارض..... الخ۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ سے بعض اقوام کو دیگر اقوام کے ذریعہ سے نہ روکتا یعنی ایک کو غالب اور دوسری کو مغلوب نہ کرتا تو دنیا میں ایک عام خرابی پھیل جاتی۔ اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جناب رسول علیہ السلام نے لوط علیہ السلام کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت کے منتظر تھے جو بذریعہ ملائکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے لی جاتی نہ کسی اور نصرت کے۔ کیونکہ یہ محال عقلی ہے کہ ایک نبی اللہ اپنے تئیں خدا کی نصرت سے محروم سمجھنے لگے بلکہ یہ صحیح کفر ہے۔

آپ کے متعلق یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ آپ نے قوم کے اوباشوں کو فعل شیخ سے روکنے وقت جبکہ وہ غالب آ رہے تھے فرمایا ھو لا ھو لا بنتی ھن اطمیرو لکم یعنی میری بیٹیاں تھامے استعمال کے لئے موجود ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خوف لفظ اطہر سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ بر طریق شریعت تم ان سے متمتع ہو سکتے ہو۔ کیونکہ بطریق زنا متمتع ہونے کی صورت میں اطہر کا لفظ بیکار ہوا جاتا ہے اور یہ ایسا ہی محاورہ ہے جیسے کوئی کسی کو یوں کہے کہ تم نے میرا سو روپیہ ہضم کر لیا۔ کیا کوئی عاقل یہ سمجھ لے گا کہ سو روپیہ حلق کے راستہ سے اس شخص کے پیٹ میں اتر گیا۔ نہیں بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم نے میرا سو روپیہ اپنے حواج ضروریہ میں بر طریق معبود صرف کر لیا۔

یوسف علیہ السلام | (۱) آپ کے متعلق یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ آپ نے اپنے بھائی بنیامین کو دوسرے بھائیوں سے علیحدہ کر کے اپنے پاس رکھ لیا اور باپ کو ان کے فراق میں مبتلا کیا جس سے وہ سخت گھبرا گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا یہ فعل عین صواب تھا کیونکہ یہی امر ان کے لئے باپ کی ملاقات کا موجب ہو گیا۔ اور اگر بھائی

کو اپنے پس نہ رکھ لیتے تو دوسرے بھائیوں کو پھر مصر واپس آنے کا خیال پیدا نہ ہوتا۔ اس لئے بطور یہ خیال آپ نے ایسا کیا۔ اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔

(ب) آپ نے اپنے بھائی کے بار غلہ میں اپنا ایک برتن مخفی رکھ دیا اور بوقت کوچ نقیب کو حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر لو چنانچہ ان لوگوں کو چور کہہ کر پکڑا گیا۔ حالانکہ وہ درحقیقت چور نہ تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انہیں چور کہہ کر پکڑنا ان کی اس فریب دہی پر مبنی تھا جو انہوں نے اپنے باپ کے ساتھ برتی اور یوسف علیہ السلام کو چر کر لے گئے اور کنوئیں میں پھینک دیا۔ کیونکہ اس کارروائی سے وہ درحقیقت چور تھے اور آپ کا انہیں چور کہنا بجا تھا۔ کیونکہ ان کی ذات پر یہ معاملہ گذرنا تھا اور وہ خوب واقف تھے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ چور کہنے سے خصوصاً ان لوگوں کو یہ علم نہ ہوا کہ ہمیں کس جرم پر چور کہا گیا ہے اور جب برتن بوجھ سے برآمد ہوا تو انہوں نے یوں سمجھ لیا کہ شاید اس فعل کے جرم میں ہمیں چور کہا گیا ہے۔ سو اس راز کے ان پر نہ کھٹنے سے واقعہ کی صداقت میں کچھ فرق نہیں آتا۔

(ج) آپ نے اس زمانہ کے فرعون مصر کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جو کافر تھا۔ اور ایک بنی اللہ کو کافر کی اعانت کرنا ہرگز جائزہ نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا خدمت شاہی کو قبول کر لینا صرف اس غرض سے تھا۔ کہ بادشاہ اور دیگر خواص سلطنت کو دین اسلام کی طرف توجہ دلا سکیں۔ اور درحقیقت آپ کا یہ فعل ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی حکمت عملی پر مبنی تھا۔ چنانچہ مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بادشاہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ قاضی رفیعاوی آیہ قال اجعلنی علی خزانہ الامون کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ وفيہ دلیل علی جواز طلب التولیت واطہار دانہ من شوائبها ولولی من یکفر اذا علم انه لا میل الی اقامۃ الحق وسیاست الخلق ولا استظہار دینہ۔ یعنی اس آیت میں کافر کے ہاتھ سے ملازمت قبول کر لینے پر میل موجود ہے۔

جبکہ معلوم ہو کہ بجز اس طریق کے حق کی اثبات اور عدل کی ترویج ناممکن ہے۔

(د) آپ کے والدین نے آپ کو سجدہ کیا جو عبادت غیر اللہ پر مطلق ہے۔

جواب یہ ہے کہ جس شریت کے وہ تابع تھے اس میں والدین کے لئے سجدہ توحیت بیکار و ناجائز نہیں تھا بلکہ فعلِ ثواب سمجھا گیا تھا۔ اور نیز اس سے آپ کے خواب کی تصدیق مقصود تھا جبکہ حکم الہی ایسا کرنے پر مجبور تھی یا اس کی مثال سجدہ ملائکہ کی سی سمجھو جو وہ آدم علیہ السلام کے لئے بیکار تھے۔

(۴) آپ نے ایک قیدی کو جو زندان سے رہا ہوا کہا کہ بادشاہ کے سامنے میری بابت کچھ تذکرہ کیجو جس سے مقصود یہ تھا کہ آپ نے بنی اللہ ہو کر غیر کی طرف التجالی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہ کیا۔ بلکہ آیہ فالسائہ الشیطان ذکر ربہم سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے سے غافل ہو گئے۔ جواب یہ ہے کہ آپ کا یہ فعل عینِ مواب تھا کیونکہ دفع ظلم کے لئے حیلہ کرنا فرض ہے۔ مع ہذا اس شخص کو ایک امر خیر کی طرف بھی توجہ لانا مقصود تھا۔ تاکہ وہ صاحبِ حسنات ہو جائے۔ کیونکہ وہ اسلام لایچکا تھا۔ اور آیہ فالسائہ الشیطان الخ کا ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف راجع نہیں بلکہ اس رہائی پانے والے شخص کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص یوسف علیہ السلام کی بابت بھنور بادشاہ ذکر کرنا بھول گیا یا اس نے اللہ تعالیٰ کے ذکر کو بھلا دیا کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتا تو یوسف علیہ السلام کی حاجت کا اسے خیال رہتا اور بادشاہ کے حضور میں آپ کی بابت ضرور ذکر کرتا چنانچہ آیہ واؤکمل اجدامۃ (ایک مدت گزرنے پر اس کو یوسف علیہ السلام کی بات یاد آگئی) سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔

(و) آیہ ولقد همت به وهم بها لولا ان رابرهان ربہ کے متعلق بعض لوگ

۱۔ فقط رب سے بادشاہ اور اللہ تعالیٰ ہر دو مراد ہو سکتے ہیں ۱۲۔ منہ

یہ کہا کرتے ہیں کہ آپ نے زلیخا سے امر شنیع کا قصد کیا تھا۔

اس آیت کے ذمہ دہی ہو سکتے ہیں اور ہر وہ صورت میں الزام مذکورہ بالا نبی اللہ پر عائد نہیں ہوتا۔ اول یہ کہ زلیخا نے ارتکاب امر ممنوع کی بابت آپ کی طرف قصد کیا اور آپتے مارپیٹ سے اُسے روکنا چاہا۔ مگر آپ نے اپنی عصمت فطری کو جو منجملہ لوازم نبوت ہے مد نظر رکھ کر اپنے آقا کی بیوی سے ایسا سلوک پسند نہ کیا اور اس کو مارپیٹ کرنے سے باز رہے۔ گویا ہم بھاگے محض ہم لضم بھایا بد فتحا اور یہ محاورہ قرآن مجید نے استعمال کیا ہے قال اللہ تعالیٰ وھمت کل امة برسولھم لیاخذوہ اس تفسیر کو ملحوظ رکھ کر لو کہ ان را برہان دیہ کے یہی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بریت ثابت کرنے کے لئے ایک برہان قاطع پر آپ کو آگاہ کر دیا اور وہ یہ تھی کہ آپ باہر نکل بھاگے جب آقا نے دروازہ سے نکلتے دیکھا تو زلیخا نے آپ کو اُلتا متہم کرنا چاہا مگر گواہی دینے والے نے گواہی دی کہ پیرا میں دیکھنا چاہیے چنانچہ پیرا میں دیکھا گیا اور یہ امر آقا کے نزدیک آپ کی بریت کے لئے ایک برہان قاطع ثابت ہوا۔ آیت مذکورہ بالا کی اس تفسیر میں کوئی کسی قسم کا تکلف نہیں بلکہ بالکل صاف اور واضح ہے۔

ووم آیہ ولقد ھمت بہ وھم یھا لولا ان را برہان دیہ میں ھمت بہ تک کلام کو ختم سمجھو اور ھم بھا لولا ان را ائمہ کو علیحدہ رکھو اس صورت میں یہ معنی ہونگے کہ زلیخا نے امر ممنوع کے لئے آپ کی طرف قصد کیا اور آپ بھی قصد کر ہی ڈالتے اگر برہان رب کو ملحوظ نہ رکھتے یعنی منصب نبوت اور عصمت فطری آپ کو مانع نہ ہوتے۔ کیونکہ نبوت یا عصمت فطری سے بڑھ کر اور کوئی چیز عفت اور صداقت پر قائم رہنے اور مرکز رُوح سے خشن نہ کرنے کے لئے دلیل نہیں ہو سکتی۔ مگر ہمیں یہ توجیہ پہلی توجیہ کی نسبت چنداں قابل التفات معلوم نہیں ہوتی کیونکہ لو کہ جزا کے مقدم آنے کا سوال پیش آتا ہے جس کو بعض ائمہ نحو جائز نہیں رکھتے مع ہذا قرأت مشہورہ کے مطابق ھم ابھار وقف کیا گیا ہے علاوہ ازیں زلیخا کا ماجد میں اپنے گناہ کا اقرار کرنا اور آپ کی بریت پر کامل شہادت دینا صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپ نے امر شنیع کے ارتکاب کا

عزم بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ عزم کرنے اور خارجی حرکات قبل ارتحاب کے وقوع کے آنے کی صورت میں آپ برسی نہیں ہو سکتے اور علم بلاغت کے قواعد کو مد نظر رکھتے ہوئے آیہ مذکورہ بالائی ترکیب نحوئی اس امر کا افادہ کرتی ہے کہ چونکہ ہر فعل ہمت اور حمہ کے مستدالیہ علیحدہ علیحدہ ہیں اس لئے ہم لفظ حمہ کا معنی وہی تجویز کر سکتے ہیں جو بمقتضائے حال ہر ایک مستدالیہ کے لئے مناسب ہو سکتے ہیں۔ مقتضائے حال یہ ہے کہ عورت اپنے حظ نفس کی طالب تھی اور یوسفؑ اس سے گزریاں تھیں جیسا کہ سیاق و سباق آیت اس پر دال ہے۔ مادہ یحییٰ اسی قسم کی ترکیب ہے جو بنی اسرائیل کے حق میں آیہ ان عدتم عدنا میں ملحوظ رکھی گئی۔ یعنی اگر تم سرکشی کی طرف عموماً رو گے تو ہم عذاب کرنے کی طرف عموماً کرنگے۔ اور اسی معنی کی تائید آیت کے اگلے حصہ سے ہوتی ہے کیونکہ اگر یوسفؑ کی طرف سے بھی وہی قصد فعل صادر ہوا ہوتا جو اس عورت سے ہوا تھا تو اسلوب کلام یوں ہونا چاہیے تھا۔ لَئِنْ لَمْ يَنْصَرِفْ عَنِ السُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ اس طرح پر لے صرف عنہ السوء والفسشاء کیونکہ سوء اور فسشاء یوسفؑ سے ہمارے کہنے سے یہ صاف پایا جاتا ہے کہ سوء اور فسشاء کا مصدر یوسفؑ کی ذات نہ تھی بلکہ غیر کی طرف سے صادر ہو رہے تھے اور عدلے تعالیٰ نے انہیں روک دیا۔ اگر یوسفؑ سوء و فسشاء کے مصدر ہوتے تو پھر پہلی ترکیب کے مطابق معنی یوں ہونگے کہ ہم نے یوسفؑ کو سوء و فسشاء سے روک دیا۔ اس تو مجھ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یوسفؑ کو موعظہ واقعہ کے متعلق کسی قسم کا دخل نہیں تھا۔ یہ وہ تقریر ہے جس پر خود آیت مذکورہ بالائی ترکیب شہادت دے رہی ہے اور بلاغت قرآن کی شان اسی ترکیب کی مقتضی ہے سوء اور فسشاء ہر دو کی نفی کرنے سے اس امر کا اشارہ مقصود ہے کہ یوسفؑ نہ تو ابتدائی مراحل فعل شنیع کے مرتکب ہوئے اور نہ فعل شنیع کے ۔

مُوسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَام | آپ نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو عتاب کرتے وقت سرے پکڑ کر کھینچا جس پر انہیں نے فرمایا۔ یا ابن ام لا تاخذ بلحیبتی ولا برأسی یعنی میرے سر و پیش کو ہمت پکڑ۔ چونکہ ہارون بنی تھے اس لئے آپ کا یہ فعل ایک بنی اللہ کی

بے حرمتی پر دلالت کرتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ آیت کے الفاظ صرف یہ ہیں فاخذوا من اخیہ
 یحجر الیہ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو سر سے پکڑ کر کھینچا۔ اس سے ہرگز بابوں سے پکڑ کر
 کھینچنے کا ذکر نہیں بلکہ موسیٰ نے غصہ میں آ کر جیسے کہ عتاب کنندگان کا قاعدہ ہے ہارون
 کو سر سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور کہا کہ تم نے قوم کی طرف سے کیوں عقلت کی یا بنی اسرائیل
 نے جب آپ کی غضب کی حالت کا مشاہدہ کیا تو اس خیال پر کہ کہیں عتاب علی طور پر بصورت
 ضرب ظاہر نہ ہو۔ فرمایا کہ میرے سر اور ریش کو آپ نہ پکڑیں۔ کیونکہ انہیں حالات کی رو سے
 یقین ہو گیا تھا کہ شاید سروریش کے پکڑنے کی نوبت آپہنچے الفاظ لا تاخذ بلحیتی سے
 ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ کہ درحقیقت موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی واڑھی پکڑ لی
 تھی اور آپ کی بے حرمتی کا قصد کیا تھا۔ دیکھو آیہ ولا تلعن منہم انما اوکفوا من خباب
 پیغمبر علیہ السلام کو ارشاد ہو کہ اثم اور کفوا کی بات کو مت مانو۔ اس آیت سے ہرگز یہ لازم
 نہیں آتا کہ جناب پیغمبر علیہ السلام کفار کی اطاعت کیا کرتے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے ممانعت
 کی بلکہ محض بطور احتیاط ایسا فرمایا جس سے دین کے بائے میں عوام الناس کو استقلال اور
 تشدد برتنے کی تعلیم دینا مقصود ہے۔ ایک عام عقل کے آدمی کو جملہ لا تاخذ سے یہ گمان پیدا ہوتا
 ہے کہ پس حج موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی واڑھی پکڑ لی تھی حالانکہ یہ محض غلط ہے۔
 العرض لا تاخذ ضیفہ انہی سے امر ممنوع کا صدور ثابت نہیں ہوتا اور اس قدر سلوک بھی موسیٰ
 کی طرف سے محض محبت و مہربانی تھا جس میں قصد معصیت کو ہرگز دخل نہیں ہو سکتا سو عرض
 کا اعراض محض اسکی عدم تدبیر پر کانیجہ ہے۔

(ب) آپ نے ہاں کہہ خضر علیہ السلام نے قبل از مصاحبت آپ کو کہہ دیا تھا کہ میرے
 کسی فعل پر اعتراض نہ کرنا۔ ان کے مختلف احوال پر اعتراض کیا۔ حالانکہ قبل از سفر یہ بات بطور
 معاہدہ قرار پا چکی تھی اور معاہدہ کی خلاف ورزی ایک بنی الشک کی شان سے بعید ہے۔
 جواب یہ ہے کہ آپ کا اعتراض کرنا بعض عہد کی نیت سے نہیں تھا۔ بلکہ محض بطور نسیان آپ

ایسا واقع ہوا۔ اولیایان کا انبیاء علیہم السلام سے وقوع میں آنا ان کی عصمت کے ہرگز مانع نہیں جیسا کہ صفحات گذشتہ میں ظاہر کیا جا چکا ہے۔ ہاں یہ خلاف عوام الناس کے انبیاء علیہم السلام کو لیایان پر بھی مواخذہ ضرور ہوتا ہے اور یہی ان کے حق میں بمنزلہ جرم سمجھا جاتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے مذکورہ بالا اعتراض کی نسبت خود قرآن مجید نے یہ فیصلہ دیدیا ہے کہ محض ان کے لیایان کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ فرمایا کہ لا تلخذنی بما نسیت یعنی آپ (خضر علیہ السلام) مجھے ایسے امر پر مواخذہ نہ فرمادیں جو بصورت لیایان مجھ سے سرزد ہو رہا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا معترض ہونا ظاہر حال پر مبنی تھا کیونکہ لڑکے کا مار ڈلنا (گو اس میں عین مصلحت تھی) ایسا سرسری امر نہیں تھا۔ کہ آپ چپ رہتے۔ اس مقام پر چند ایک اور دلچسپ احکامات باقی ہیں لیکن ہم انہیں لکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ معارف قرآنیہ کو قلمبند کرنے پر عموماً کم استفادہ لوگ چونک پڑا کرتے ہیں۔

(ج) آپ نے فرمایا فاعلموا انما من الضالین یعنی مجھ سے یہ فعل (قطبی کا قتل) بحالت ضلالت سرزد ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ ضلالت میں تھے۔

جواب یہ ہے کہ آپ کا مذکورہ بالا فعل قبل از نبوت تھا اور ضلالت سے صرف عدم معرفت احکام مراد ہے کیونکہ نزول شریعت سے پہلے اتمام حجت نہیں ہوا کرتا اور جب اتمام حجت نہیں تو آپ کا فعل مذکورہ حد جرم میں بھی داخل نہیں ہو سکتا اور ضلالت بمعنی عدم معرفت احکام عام طور پر متعل ہے ویکھو آیہ ووجدت ضالاً فهدیٰ میں ضلالت بمعنی عدم معرفت احکام مراد ہے۔ کیونکہ قبل از نزول شریعت عدم معرفت احکام ایک امر واقعی ہے۔ ضلالت کے یہ معنی کہ احکام شریعت کے علم ہونے پر کسی حکم کی آپ نے خلاف وندی کی بالکل باطل ہے۔ اس لئے آیہ وانما من الضالین کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے ایسی حالت میں فعل مذکور کا ارتکاب کیا کہ دروئے شریعت مجھے اس کے جواز یا عدم جواز کا علم نہیں تھا۔ ادنیٰ معنی ووجدت ضالاً فهدیٰ میں ماخوذ ہیں۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام احکام شریعت کی معرفت نہیں رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ پر شریعت نازل فرمائی جس سے آپ کو ملامت مستقیم

کا پتہ چلا۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر آپ کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔ ماکنت تدری کتاب
ولا الایمان یعنی تو قرآن اور ایمان سے بالکل بے خبر تھا۔

اس اعتراض کا ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضلالت بمعنی نسیان بھی متعلیٰ ہوا کرتا ہے۔
چنانچہ آیہ۔ ان تضل احدھما میں ضلالت بمعنی نسیان بھی ہے کیونکہ مطلب یہ ہے کہ اگر
ایک عورت کو ادا کے شہادت میں نسیان ہو جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلائے چنانچہ
فتدکر احدھما الاخریٰ میں ضلالت کے معنی نسیان کی کافی شہادت موجود ہے اور
اسی توجیہ کی تائید میں سورہ یوسف میں آیہ لغی ضللت القدیم موجود ہے۔

(د) آپ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا۔ رب ارنی النظر الیلث یعنی خدایا مجھے اپنا
آپ دکھا۔ حالانکہ حبیبی اسرائیل نے آپ کے سامنے یہی استدعا پیش کی اور کہا ارنی اللہ
جمہورۃ یعنی اے موسیٰ میں خدا تعالیٰ کو کھلم کھلا دکھا دے۔ تو ان لوگوں پر صاعقہ کا عذاب
نازل ہوا۔ اس لیے اس واقع کے ہو چکنے کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایسا سوال
پیش نہیں کرنا چاہیے تھا۔

جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا واقع ان لوگوں کے واقع سے پہلے تھا۔ اس لیے یہ
اعتراف عائد نہیں ہو سکتا کہ آپ نے ایسا سوال کیوں پیش کیا۔ نیز آپ کا سوال کرنا حصول ثروت
و سعادت کی غرض سے تھا جو تصدیق یقینی کے بعد پیدا ہوا تھا جس طرح ابراہیم علیہ السلام کا
احیاء موتی کی بابت باوجود تصدیق قدرت کے سوال کرنا۔ اوہی اسرائیل کا سوال بطور طعن
انکار کے تھا۔ اور وہ لوگ توحید کی بابت شکوک و ادہام میں پڑے ہوئے تھے۔ سو ہر قسم
کے سوال کی نوعیت مختلف ہے۔

یونس علیہ السلام (الف) و ذالنون اذ ذهب مغاضبا فظن ان لن نقدر علیہ
فنادی فی الظلمات ان لا اله الا انت سبحانک انی کنت من
الظالمین سے آپ کے متعلق یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ ذالنون یعنی یونس علیہ السلام نے اپنے

ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت نہیں ہوگی۔ حالانکہ کسی جاہل سے جاہل آدمی بلکہ ضعیف الخلق عورت کا بھی یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا تعالیٰ کی تقبہ قدرت سے باہر ہے۔
 معترض قد رعلیہ کے معنی جو اس مقام پر چسپان تھے نہیں سمجھ سکا۔ اور ایک ایسے معنی پر جو غیر چسپان تھے۔۔۔۔۔ اعراض کر دیا۔ اس آیت میں قدر رعلیہ بمعنی ضیق علیہ کے واقع ہوا ہے۔
 اور یہی قرآن مجید میں کئی ایک مواقع پر مذکور ہیں قال اللہ تعالیٰ واما اذا ما ابتلہ فقد ر علیہ رزقہ ای ضیق علیہ اس تفسیر کے رُوسے آیت مذکورہ بالا کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ یونس علیہ السلام نے یہ خیال کر لیا۔ کہ ان کی قوم پر اس طرح غضب آوہ ہونے سے اللہ تعالیٰ ان پر کسی قسم کی گرفت نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ نے سخیال خود محض حمیت اور ثورت سے ایسا کیا تھا۔
 معترض کا ذکر بالا بحث کے متعلق ایک یہ اعراض بھی ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جناب خیر علیہ السلام کو ایوں خطاب فرماتے ہیں وکالتن ک صاحب لحت یعنی مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح مت ہو۔ سو اس قول سے بھی یونس علیہ السلام کے برخلاف استدلال ہو سکتا ہے جواب یہ ہے کہ اس آیت کے الفاظ سے صرف اس قدر واضح ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ جناب خیر علیہ السلام کو قرآن مجید میں بار بار صبر و استقلال اور اتمال اذیت کی تاکید فرماتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی وہی تاکید ہے یعنی یونس علیہ السلام کی طرح صبر کو مت چھوڑو اور قوم کی اذیت پر اظہار غضب مت کرو۔

الغرض یونس علیہ السلام کا فعل مذکورہ بالا سخیال خود خیر محض تھا مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں تھا۔ اس لیے خیر محض ہونے کی حیثیت سے وہ گناہ نہ ہوا۔ مگر بوجہ خدا تعالیٰ کو ناپسند ہونے کے قابل مواخذہ سمجھا گیا۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو اس قسم کے سہولتیاں پر بھی مواخذہ ہوا کرتا ہے۔ اور اسی کو ان کے حق میں ظلم محصیت قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ شروع مضمون میں اس پر یومی بحث ہو چکی ہے۔

واؤد علیہ السلام | معترضین کی طرف سے آپ کے متعلق ایک ہر شان عظیم بطور اعراض کے

مشہور ہے جس کو ایک ایماندار کی طرف بھی مشروب کرنا صریح ظلم ہے۔ چہ جائیکہ ایک نبی اللہ صاحب کتاب اور صاحب معجزات اور والے ملک کی نسبت اس کو صحیح تسلیم کیا جائے معترضین نے یہودی کی پیروی میں صرف اسی پر قیادت نہیں کی بلکہ اس کو قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہا ہے۔

اعتراض یہ ہے کہ آپ اور یا نام ایک ہمسایہ سپاہی کی عورت پر عاشق ہو گئے۔ اور دعا اور

فریب سے اس کو مرداؤ والا اور اس کی بیوی کو اپنی بیویوں میں جن کی تعداد ننانوے تھی۔ شامل کر لیا۔

آپ مسجد میں تھے کہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ مدعی اور مدعا علیہ کی وضع میں آپ کے پاس جائیں اور اپنے جھگڑے کا آپ سے فیصلہ لیں جھگڑے کی صورت یہ تھی۔ کہ مدعی نے

کہا کہ میری ایک بھیڑ تھی اور اس شخص نے جس کے پاس ننانوے بھیڑیں تھیں زبردستی چھین کر

اپنے ریوڑ میں شامل کر لیا اور اس پر قابض ہو گیا ہے جب فرشتوں نے جواب دیسوں کی شکل میں پیش

ہوئے۔ اپنے مقدمہ کی کیفیت آپ کے سامنے پیش کی۔ تو آپ کو جھٹ اپنا واقعہ یاد آ گیا۔

اور آپ سمجھ گئے کہ خدا تعالیٰ کو میرا فعل ناگوار تھا جس پر بطور تنبیہ کے مجھے مدعی اور مدعا علیہ کے

واقعہ سے نادم کیا گیا ہے پھر آپ نے اللہ تعالیٰ سے طلب مغفرت کی۔ جس پر آپ کا گناہ معاف

ہوا معترضین اہل کتاب اس واقعہ کو قرآن مجید کی آیات سورہ ص سے مطابقت دیا کرتے ہیں

جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا قصہ جھوٹ ہے جس کی کوئی اصل نہیں یہود اہل کتاب کی فرائز پر زبوں

کا یہ ایک ادنیٰ ساموئہ ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں دیگر انبیاء علیہم السلام کے متعلق بھی اسی قسم کی غلط

روایات مروی ہیں۔ انفس کہ بعض مصنفین اسلام نے بھی ایسے زبان زد قصوں کو کہیں کہیں اخذ

کر لیا ہے۔ مگر علم روایت کے بڑے بڑے اکابر ائمہ نے روایات کی خوب چھان بین کر کے کتاب اللہ

کو ایسے اکاذیب سے بالکل پاک وصاف ثابت کیا ہے۔ وهو الحق اصل واقعہ صرف اسی قدر

ہے کہ چند آدمی ملکر آپ کی خدمت میں مذکورہ بالا جھگڑے کی بابت فیصلہ لینے کو حاضر ہوئے۔ اور

وہ لوگ فی الحقیقت معاملہ مذکورہ بالا کی بابت یا ہم نزاع کرتے تھے۔ یہ یا کل غلط ہے کہ فرشتوں نے آدمی کی شکل میں اگر بطور تمثیل کے ایک جھگڑا آپ کے سامنے پیش کیا جس سے آپ اپنے واقعہ پر مطلع ہو کر توبہ و استغفار کرنے لگے اور عرض کا آیہ و ظن داؤد انہما افتناہ الخ

نہضنا لہ ذلث سے اپنے اعتراض کی تائید کرنا یا کل باطل ہے۔ کیونکہ ان ہر دو آیات کا صرف یہ مطلب ہے کہ داؤد علیہ السلام نے خیال کیا کہ یہ ملک و حکومت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے عنایت ہوئی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لئے ابتلا و امتحان ہو جس پر اللہ تعالیٰ کی جناب میں بار بار یہ التجا کرتے تھے۔ کہ خدایا اس ملک و دولت سے میرا امتحان نہ کیجو۔ اور مجھے اپنی اطاعت و رضا کے مرکز پر قائم رکھیو۔ چونکہ مجھ کو دولت کا عطا ہونا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور ابتلا کے نہ تھا بلکہ محض عنایت ازلی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس ظن کو آپ کے حق میں گناہ جانا۔ چنانچہ اس بنا پر آپ کو مغفرت نصیب ہوئی۔ کیونکہ ایسا ظن و حقیقت ایک قسم کا سو ظن تھا جو ایک نبی اللہ کی شان سے بید ہے۔ الغرض الفاظ قرآن مجید سے ہرگز مذکورہ بالا بیتان کا اشارہ نہیں پایا جاتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے۔ من حدثت مجدیث داؤد علی ما یرویہ العتصام جلد ۱۰ مائۃ و ستین یعنی شخص داؤد کا واقعہ اس طریق پر بیان کر گیا جو عام قصہ خوالوں میں مشہور ہے تو میں اسے ایک سوساٹھ تازیانوں کی سزا دینگا۔ جو انبیاء علیہم السلام پر بیتان قائم کرنے کی سزا ہے۔

سلیمان علیہ السلام | متضمنین آیہ انی اجبت حب الخیر عن ذکرہ فی حتی تو رات بالحجاب سے آپ کی نسبت یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ آپ ایک دن

اپنے اصطل کے گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے اور اس کام میں اس قدر مستغرق ہو گئے کہ آفتاب غروب ہو گیا اور عصر کی نماز فوت ہو گئی جس پر آپ نے غضب میں آکر گھوڑوں کی گردنیں اور لاتیں کٹوا دیں۔ جس کا اشارہ آیہ سر دوھا الی فطقق مسحاً بالسوق والا عناق میں کیا گیا ہے جو اب یہ ہے کہ یہ روایت از سر تا پا غلط ہے جو بعض زمانہ قیہود کی تراشی ہوئی ہے۔

کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہرگز اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایک نبی و مرسل کا نام نہ
 جیسے ضروری فرض سے ایسی حالت میں عقلت کرنا کہ کوئی شرعی عذر نہ ہو محال عقلی ہے جس کے
 امکان کا بخیر ایک جاہل بد اعتقاد کے کوئی شخص قائل نہیں ہو سکتا۔ آیت مسطور بالا کا مطلب
 یہ ہے کہ آپ نے اپنے مال یعنی گھوڑوں کا شاہی طریق پر معائنہ کیا جس سے مقصود یہ تھا کہ
 اللہ تعالیٰ کی اس نعمت عظمیٰ کا شکریہ ادا کریں۔ گھوڑے سامنے سے گذر گئے۔ اور ایک طرف
 گذر کر دوسری طرف آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ آپ نے دوبارہ اسی طریق پر ان کی
 واپسی کا حکم دیا چنانچہ آپ نہایت شغقت اور پیار کی وجہ سے جیسا مالکوں کا قاعدہ ہوتا ہے ان
 کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیر دیتے اور خوش ہوتے۔ آیت کے الفاظ مذکورہ بالا سے
 اعراض کی ہرگز تائید نہیں ہوتی۔ بات صرف یہ ہے کہ لفظ تورات کا تفسیر بعض نے آفتاب کیطرت
 پھیر لیا ہے جو پہلے کہیں مذکور نہیں ہوا اور مسحاء بالسوق والا عناق سے تلوار کے ساتھ ان کی
 گردنیں مار دینے کا مفہوم اخذ کیا ہے۔ مگر ایسا مجنونانہ فعل ایک بادشاہ کی طرف جو نبی مرسل ہو
 منسوب کرنا سراسر غلطی ہے۔ کیونکہ بلا وجہ مال کا تلف کرنا کسی عاقل کا کام نہیں بلکہ شرعاً گناہ ہے
 اور اگر الفاظ عن ذکر دینی کو عام وظائف اور نوافل پر محمول کیا جائے تو بھی مطلب صاف ہے
 کہ آپ کو گھوڑوں کے معاملہ میں نوافل سے سہو ہو گیا۔ پھر صورت صلوٰۃ العصر کے فوت ہو جانے
 کا خیال نہ تو کتاب اللہ میں مذکور ہے۔ اور نہ کسی حدیث صحیح میں اس لیے ہم کسی ایسے اعراض کو ہرگز
 صحیح نہیں تسلیم کرتے جو کتاب اللہ اور سنت سے اخذ نہیں ہو سکتا۔

جناب ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم | غیر مذاہب کے بعض متضیین نے گاہ و بیگاہ
 جناب پیغمبر علیہ السلام کی نسبت بھی چند ایک

مطامع تراشے ہیں جن کی نہ تو کوئی اصل ہے اور نہ کوئی دلیل جس سے ان کے خیال باطل کی
 تصدیق ہو سکے۔ صرف بعض ایسی روایات کی بنا پر جو اصول روایت کے رد سے کبھی پایہ محنت
 کو نہیں پہنچ سکتیں معاذ اللہ یا جاسدہ پہلو میں نکتہ چینی کی ہے اگر یہ لوگ انصاف اور راستی سے

کام لیتے تو انہیں اس قسم کے بیہودہ خیالات کے اظہار کا کبھی موقعہ نہ ملتا نہ اہمیت تعجب کا مقام ہے
کیونکہ لوگ ایک ایسے مقصد ہی کی طرف جس کی عصمت و عفت پر صراحتاً قلعہ منقطع موجود ہیں کیونکہ
ایسے امور کی نسبت کر دیا کرتے ہیں جو انبیاء و اولیاء و دیگر عام بزرگان مذہب کی طرف بھی نسبت
نہیں کئے جاسکتے۔ خدا تعالیٰ کا ستیا ناس کرے جو انسان کو حق اور باطل میں امتیاز کرنے سے
اندھا کر دیتا ہے۔

کرار سد کہ کند عیب و امن پاکت۔ کہ بچو قطرہ کہ بر برگ گل چلہ پاکی
(۱) منجملہ مطاعن کا ذوق کے ایک طعن وہ ہے جو نکاح زینبؓ کے متعلق بعض عیسائی
مشرقی پیش کیا کرتے ہیں جس کا ذکر سورہ انزاب میں آچکا ہے اور جس کی مختصر کیفیت یہ ہے
کہ زینبؓ کا نکاح جو آپؐ کی بھوپھی کی بیٹی تھیں آپؐ نے زید بن حارثہ سے جو آپؐ کا بیٹا یعنی
ممتعہ بولایا تھا کر دیا تھا۔ آپؐ کسی ضرورت سے زینبؓ کے گھر تشریف لے گئے اور آپؐ
کی نگاہ زینبؓ پر پڑی اور آپؐ نے اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر فرمایا سبحان اللہ مقلب
القلوب۔ اور آپؐ کے دل میں زینبؓ کی محبت جاگزن ہو گئی اور دل میں اس کے ساتھ
نکاح کرنے کا خیال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ آپؐ نے بالآخر اس سے نکاح کر لیا اور اہم منصبیات
کے لئے ہرگز نشانیاں نہ تھیں۔ سو یہ ہے اعتراض کی صورت۔

اس اعتراض کا جواب جو محض مخترع کی کج فہمی کا نتیجہ ہے خود الفاظ قرآن سے واضح
ہو رہا ہے کیونکہ زینبؓ اپنے حسب و نسب میں خاندان قریش میں ایک ممتاز عورت تھیں اور زیدؓ
ایک آزاد شدہ غلام تھے اس لئے ہر دو میں ہمیشہ گھر میں کچھ نہ کچھ کشمکش رہا کرتی اور زیدؓ
اس امر کا اظہار جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں کیا کرتے۔ کچھ عرصہ ایسا ہوتا رہا اور
آپؐ زیدؓ کو ہمیشہ باہمی اتفاق اور محبت سے رہنے کی فہمائش کیا کرتے۔ مگر بائینہم ہر دو میں
موافقت کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ آخر زیدؓ نے تنگ آکر دل میں زینبؓ کو طلاق دیدینے
کا غم کر لیا جس پر آپؐ نے انہیں روکا جس پر یہ الفاظ قرآنیہ امسک علیک زوجک و اتق اللہ

شاہد ہیں۔ آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس امر پر گاہ کر دیا گیا تھا کہ زینہ طلاق دے کر رہینگے۔ اور آپ زینہؓ کو اپنے نکاح میں لائینگے۔ مگر آپ لوگوں کے اس طعن و تشنیع کے خیال پر کہ اپنے بتنی کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے لیا ہے جس کا دل و اہل جاہلیت میں نہیں تھا دل ہی دل میں ارادہ نکاح کے اظہار سے اپنے نہیں روکا کئے۔ چونکہ یہ امر عدائے تعالیٰ کو ناپسند تھا اس لئے بطور عتاب آپ کو بدیں الفاظ وحی ہوئی۔ و تخطی فی نفسك ما اللہ میدیہ و تخطی الناس واللہ احق ان تختشاه۔ یعنی تم اپنے دل میں اس چیز کو مخفی رکھے ہو جس کو بالآخر اللہ تعالیٰ ظاہر کرے۔ رہیگا اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ عدائے تعالیٰ سے ڈرنا کہیں زیادہ اولیٰ اور اہم ہے۔ چنانچہ اس عتاب پر حضور علیہ السلام نے زینہؓ کے طلاق دینے کے بعد ایام عدت گزرنے پر ارادہ نکاح کا اظہار کر دیا۔ اور مصلحت بھی اسی میں تھی کہ آپ زینہؓ کو نکاح میں لے لیتے کیونکہ اس کے مطلقہ ہو جانے پر آپ کو اس کی عصمت و عفت اور بار معشیت کا خیال الہم نظر آتا تھا اور بجز نکاح کے کوئی اور چارہ نظر نہیں آتا تھا۔ مع هذا اس نکاح میں بڑی بھاری مصلحت یہ تھی کہ بتنی کی بیوی سے نکاح کرنے کا حکم شریعت اسلامی میں منجملہ ایک قانون شرعی کے قرار پائے اور خود نبی اللہ سب سے پہلے بحکم و انا اول المسالین اس حکم کی تعمیل کرے تاکہ آئندہ کسی کو ایسے نکاح پر طعن و تشنیع کا موقع نہ رہے۔ امام زین العابدین علی بن جعفر رضی اللہ عنہما کی ایک صحیح روایت میں یہی مروی ہے۔ بتلایئے اس میں ایک نبی اللہ کی شان کے منافی کو نہی بات پائی جاتی ہے؛ کیا معاذ اللہ آپ نے کسی فعل ممنوع کا ارادہ کیا تھا۔ جس پر مخالفت کو ایک یہودہ وہم کرنے کا موقع ملا۔ حضرت ام المؤمنین عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام اگر قرآن کے کسی حصہ کو امت سے مخفی رکھتے تو سب سے زیادہ مخفی رکھنے کے قابل یہی آیت تھی۔ دیکھیئے اس قول سے کس حد تک حضور علیہ السلام کی صداقت کا پتہ چلتا ہے! کیونکہ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو اپنے دل میں دو مخلوق کا سامنا نظر آ رہا تھا۔ ادھر تو عوام الناس کے طعن کا خیال اور ادھر

حکم خداوندی کی اطاعت۔ کیا مخالفت کا یہ خیال کسی صورت میں بھی صحیح ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے زینبؓ کے حسن و جمال پر پرفیض ہو کر اس کی محبت کا خیال اپنے دل میں بٹھال لیا تھا کیونکہ اس صفت میں آیہ مذکورہ بالا کے یہ معنی ہونگے کہ تم اپنے دل میں زینبؓ کی محبت چھپائے بیٹھے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر کے رہیگا جس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ تم نے زینبؓ کے متعلق ایک ناجائز خیال اپنے دل میں پیدا کر لیا ہے مگر خدائے تعالیٰ تجھے رسوا کر کے رہیگا۔ مگر کیا کوئی عقل و ہوش کا آدمی یہ باور کر سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک نبی اللہ کو جس کی معصومیت پر ہزاروں دلائل موجود ہیں یوں خطاب کرے اور یہ خیال صحیح بھی کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ زینبؓ آپ کی سچو سچی مٹی تھیں اور لڑکپن سے آپ اسے دیکھا کئے اور وہ آپ کو دیکھا کرتی۔ مگر مذکورہ بالا روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا زینبؓ کو دیکھنا بالکل پہلی بار واقعہ ہوا۔ جس سے آپ نے اس کے حسن و جمال کا اندازہ لگایا اور اگر یہ خیال صحیح مانا جائے تو سوال یہ پیدا ہو گا کہ آپ نے پہلے ہی زینبؓ سے نکاح کیوں نہ کر لیا تھا؟ زید کے ساتھ نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر ہر دو کی ناچاقی پر آپ کا زید کو بار بار مصالحت موافقت کی تلقین فرمانا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور اگر بالفرض ہم روایت مذکورہ بالا کو درست بھی تسلیم کر لیں تو ناگہاں کسی اجنبی عورت پر نظر پڑ جانے سے اس کے حسن و جمال کا خیال دل میں پیدا ہونا کسی ارادی حالت کے ذیلی میں نہیں آ سکتا بلکہ یہ ایک طبعی امر ہے۔ ہاں اس صورت میں یہ امر واقعی قابل اعتراض ہو سکتا ہے جبکہ اس خیال کے ساتھ کسی امر ممنوع کی طرف میلان ہو جائے بلکہ اس روایت سے تو صاف معلوم ہو رہا ہے کہ آپ بھروسہ دیکھنے کے کلمہ سبحان اللہ زبان پر لائے اور واپس تشریف لے گئے۔ صرف اتنی ہی بات سے مخالفت کا ایک ظن فاسد کچھ وقت نہیں رکھنا۔

۱۱۰۰

(۲) مخالفین آیہ واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات سے حضور علیہ السلام

کے انتخاب ذنوب کا مفہیم اخذ کیا کرتے ہیں حالانکہ اس آیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سراپا رحمت ہونے کا مفہوم مترشح ہوتا ہے مگر مخالفین کی کج فہمی انہیں غیر مقصود معنی کی طرف متوجہ کرتی ہے مگر یہ لوگ ہیں بھی محدور کیونکہ قرآن مجید کے معانی موقیفہ تک ان کے عقول ناقصہ کو رسائی حاصل نہیں اور نہ ہی یہ لوگ قرآن مجید کے طرز بیان سے آگاہ ہیں۔ اس آیت شریفہ سے حضور علیہ السلام کے استغفار کے یہ معنی نہیں کہ آپ کسی قسم کے گناہ کے مرتکب ہوئے کیونکہ لفظ ذنب کی حقیقت تمام افراد انسانی کی طرف یکساں طور پر منسوب نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان کا ماہر اس امر کو بخوبی جانتا ہے کہ ایک لفظ کسی خاص مقام پر ایک خاص مفہوم پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرے مقام پر کسی دوسرے مفہوم پر۔ وہ کیسے لفظ فرج آیت فریحہ خود میں مقام مذمت میں مستقل ہوا ہے مگر آیت مینذ للث فلیفرحوا میں وہی لفظ مفہوم مدح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہی حال لفظ ذنب کا ہے جب اس کا ذکر عوام الناس کے لئے ہو گا تو اس میں ہر ایک قسم کے ذنب کا مفہوم پایا جائیگا مگر انبیاء علیہم السلام کی طرف یہ معنی منسوب نہیں کئے جاسکتے اس آیت میں لفظ ذنب سے حضور علیہ السلام کی وہ حالت قلبی مراد ہے جو رجوع الی اللہ کی حالت کے علاوہ تلیقین و تبلیغ احکام اور جماعت مسلمین کے حالات کی نگرانی اور انتظام میں پیش آیا کرتی تھی۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے انہ لیغان علی قلبی حتی استغفر فی الیوم مائة مرة یعنی میرے دل پر ایک نہایت خفیف پر وہ چھا جاتا ہے حتیٰ کہ میں ایک دن میں نو بار استغفار کرتا ہوں ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک حال تو وہ ہے جس میں غیر اللہ بالکل فانی اور محو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے حال میں دیگر انسانوں کی طرح حجاب میں آجاتے ہیں مگر اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کسی صاحب مقام سستی کی ضرورت ہے۔ نفوس خبیثہ اس حقیقت کو کیا سمجھیں۔ ایک بنی اللہ کے منصب نبوت کے غیر اللہ کی طرف رجوع کرنا ایک قسم کا ذنب ہی خیال کیا جاتا ہے۔ کسی ایک بزرگ کے اس قول سے

وجود ذنب لا یقاس بہ ذنب

میں اسی مذکورہ بالا حالت رجوع الی غیر اللہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور یہ حال تمام

حضرات انبیاء و اولیاء کے لئے یکساں طور پر مہربان ہے چونکہ منہ رب ثبوت کے لئے ایسی حالت کا پیش آنا کسی حد تک جوع الی اللہ کی حالت سے مانع ہوتا ہے۔ اس لئے اظہار عبودیت کے مقام میں استغفار ایک امر لازم ہے مگر عامہ ناس کے حق میں اس قسم کے حالات لفظ ذنب کے مفہوم میں داخل نہیں اس جملہ مشہورہ کے معنی میں غور کرو۔ حسنات کا پورا سیاقا المقترہین یعنی نیک لوگوں کی نیکیاں ان لوگوں کے حق میں جو مقرب بارگاہ ہیں گناہ بھی جاتی ہیں میرے خیال میں مقترہن اگر کچھ بھی انصاف اور سستی سے کام لیتا تو ایک آن کے لئے بھی اس قسم کا بیہودہ وسوسہ اس کے دل میں پیدا نہ ہوتا۔

مذکورہ بالا اعتراض کا جواب یوں بھی دیا کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی ذات اقدس بموجب نص لفظ کان لکن فی رسول اللہ اسوہ حسنۃ امت مرحومہ کے لئے ہر ایک امر میں کامل نمونہ اخلاق و آداب شرعیہ کا تسلیم کی گئی ہے اور جب تک حکم و انا اول المسلمین خود کسی حکم کی تہدی کر کے علمی نمونہ نہ پیش کرتے امت مرحومہ کو اس پر عمل کرنے کا صحیح موقعہ ہرگز پیش نہ آتا۔ چنانچہ اس حکم استغفار میں بھی حضور علیہ السلام کو نمونہ بن کر اپنے تئیں امت کے سامنے پیش کرتا عرضی تھا تاکہ افراد امت بھی ہمیشہ کثرت استغفار کے پابند رہیں گویا آپ کے عمل سے اس حکم کی تلقین امت مرحومہ کو کی گئی ہے نہ آپ کو کیونکہ آپ متعبد و مرحوم ہیں اور یہ وہی معنی ہیں جو آیہ لکن من الخافین میں مد نظر رکھے گئے ہیں حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ حضور سلام کبھی غفلت کے مرتکب نہیں ہوئے یا دوسری جگہ حکم ہوتا ہے ولا تطع منہم اشبا کفولاً حالانکہ آپ نے کبھی کسی اثم اور گنہگار کی کوئی بات نہیں مافی بہر صوت مذکورہ بالا اعتراض کی بنیاد محض ایک نئے غم باطل پر ہے جس کی تائید کسی آیہ قرآنی سے نہیں ہوتی یہی جواب سورہ فتح آیہ لیعظرنک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخرا کا سمجھو واللہ اعلم بحقیقۃ الحال +

بعض مخالفین نے حضور علیہ السلام کے متعلق ایک اعتراض یہ بھی کیا ہے کہ آپ سورہ نجم

میں نام غزنی وغیرہ بتوں کی مذمت کرتے وقت بتوں کی تعریف میں یہ دو جملے بھی زبان سے پڑھ دیئے تھے۔

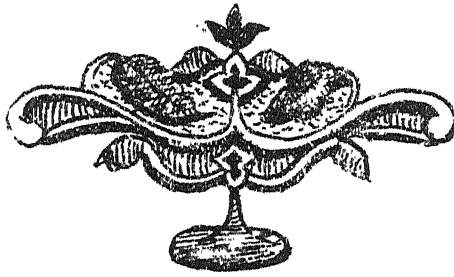
ثَلَاثُ الْغُرَانِيقِ الْعَلٰی - اِنْ شَقَاعَتِهِنَّ لَمَسَتْ حِجِّي

غزانیق غزنی کا صیغہ جمع سے جس کے معنی ایک دراز گردن سیاہ رنگ آبی جانور کے ہیں بعض نے اس کے معنی گناہ کے لکھے ہیں مگر یہاں غزانیق کے لفظ سے تشبیہاً بت مراد لئے گئے ہیں جنکو مشرکین پوجا کرتے تھے ان ہر دو جملوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ ریت جو بڑے بلند ہیں مذک کے سامنے ان کے پوجنے والوں کے لئے ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے جب حضور علیہ السلام یہ ہر دو جملہ پڑھ چکے تو بعد میں بذریعہ وحی آپ کو اس غلطی پر آگاہ کیا گیا جس پر سورہ حج کی آیہ وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا اتى الفی الشیطان فی امتیہ الخ۔ نازل ہوئی یعنی تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول یا نبی نہیں بھیجا جس کے تبادلات کے وقت شیطان نے اتفاقاً کیا ہو مگر میں اس آیت سے یہ مفہوم پیدا کرتا ہوں کہ حضور علیہ السلام پہلے دو جملوں کے بعد اپنی غلطی پر آگاہ ہوئے اور چھپتے لئے جس پر آیہ مذکورہ بالا شاہد ہے اور جس سے آپ کا قرآن مجید میں سہواً یا عمداً تصرف کرنا ثابت ہوتا ہے۔

یہ ہے حاصل اعراض

اس کا جواب مفسرین نے کئی ایک طرح پر دیا ہے مگر سب سے صحیح اور قوی جواب یہ ہے کہ یہ قصہ سراسر لغو اور باطل ہے اور ملاحظہ کا کلمہ اٹھا ہے۔ حدیث کی کتب معتبرہ میں کہیں اس کی کچھ اصل نہیں۔ ابن کلبی اس قصہ کا راوی ہے جو فن روایت میں نہایت ضعیف اور غیر معتبر تسلیم کیا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ سورہ نجم کے شروع ہی میں آیہ وما ینتطق عن الہویٰ آپ کی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ پیغمبر خدا اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ اور پھر بتوں کی مذمت اگلی آیات میں بدستور موجود ہے اور قرآن مجید خود شاہد ہے کہ لا یتبع الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ یعنی قرآن مجید میں نہ اب نہ بعد میں کبھی باطل کو دخل

پھر کوئی عقلمند کیسے تسلیم کر سکتا ہے کہ پیغمبر خدا جو عمر بھر باطل محبوبوں کی خدمت و تکذیب فرماتے رہے مذکورہ بالا دونوں جملوں کو تبلیغ کے مقام میں ارشاد فرماتے۔ ان ہذا الاہمات عظیمہ۔ بہر صورت حضرات مفسرین نے اس اعتراض کی کوئی اصل قرار نہیں دی کیونکہ قرآن مجید خود اس کی تکذیب کے لئے مشاہد عدل ہے۔ بخوف طوالت ہم نے دیگر بعض جوابات کا قلمبند کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔



پانچم

قوانین فطرت اور محبت

قانون فطرت کیا چیز ہے | عام استعمال میں لفظ فطرت کو انگریزی زبان کے لفظ نیچر کا مترادف خیال کیا گیا ہے۔ لغت کی رو سے گوہر و الفاظ کی وسعت مفہوم میں کچھ فرق ہو۔ مگر اصطلاحاً ہر دو ہم معنی سمجھے گئے ہیں اس لئے قانون فطرت اور لاف نیچر کا مفہوم ایک ہی ہے۔ لفظ کائنات کے مفہوم میں ہر ایک قسم کی موجودات مادی اور غیر مادی داخل ہے۔ اس لئے وہ تمام مجبوء قوانین جو افراد کائنات پر حاوی ہوتا ہے اور جس کو خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے اس سلسلہ موجودات کے قیام کی خاطر معین کیا ہے۔ قوانین فطرت کے نام سے موسوم ہے۔

قوانین فطرت سے اس امر کا استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اس قانون کا کوئی واضح ہے جو ایک مستقل اور بلا قید ارادہ پر اس قانون کو اپنے قبضہ قدرت میں سمجھ لے ہوئے ہے

قوانین فطرت سے صلح
مطلق کی ہستی کا ثبوت

اگر ہم ایسے وجود کی ضرورت کا اقرار نہ کریں تو سلسلہ کائنات ایک ایسا گورکھ دھندلا ہو جاتا ہے جس کے حل کرنے کے لئے یا لوں کہو کہ انسانی فطرت کے اطمینان کے لئے کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں نبشت انبیاء علیہم السلام اور ایک آئندہ ہستی اور اس کے ثواب عقاب وغیرہ امور کی تعلیم محض عبث تسلیم کرنا پڑے گی۔ مگر ہم ایک غیر متبدل ارادی ہستی کے وجود کا یقین اسی قانون فطرت سے حاصل کرتے ہیں اس لئے قوانین فطرت ہماری ایک قطعی استدلال کا

ماخذ ہیں *

قوانین فطرت کی نوعیت

قوانین فطرت میں ایک زبردست مخفی طاقت ہے جس کا مقابلہ کوئی طاقت نہیں کر سکتی بلکہ یہ خود دیگر تمام طاقتوں پر ہمیشہ غالب

رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان قوانین کا منبع وہی ہستی مطلق ہے جس کو ذات باری کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان قوانین فطرت کو قوانین الہیہ بھی بول دیا کرتے ہیں *
قوانین فطرت ہر ایک چیز کے وجود کے ساتھ ہی موجود ہوتے ہیں اور فطرتِ معلّم اول ہے یہ قاعدہ کلیہ ہر ایک قسم کی موجودات پر کیاں عالم ہوتا ہے۔ اس لئے

ہر ایک چیز اپنے مقصد سے فطرت کے مطابق اپنے کمال کو حاصل کرتی ہے۔ آیہ قل کل یصل علی شاکلۃ کا یہی مطلب ہے۔ چونکہ ہر ایک چیز کی فطرت اس کے وجود سے علیحدہ نہیں ہو سکتی اس لئے وہ قوانین جو اس کی فطرت میں دلچیت رکھے گئے ہیں اس چیز کے لئے آغاز وجود ہی سے معلّم کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ فطری امور میں کبھی کسی خارجی معلّم کی ضرورت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس چیز کا وجود ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ قوانین فطرت کا تابع ہے دیکھو کس ذور کے ساتھ آیہ اعطی کل شئ خلقہ شہد ہدیٰ میں مذکورہ بالا یقینی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے *

کیا فطرت میں کسی قسم کی

بعض جہاں فلاسفہ یہ خیال کرتے ہیں کہ قوانین فطرت کے عمل میں کبھی ایک غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی سچے کا شکم داور سے اڑھایا یا بیج پیدا ہوتا قانون فطرت کی غلطی کی نمایاں مثال

غلطی داخل ہو سکتی ہے

ہے۔ مگر درحقیقت یہ ایک قسم کا دھوکا ہے۔ کیونکہ قانون فطرت کو اس خدائے خالق السنوٰت والارض نے وضع کیا ہے جو کامل علم اور کامل حکمت کا مالک ہے اس لئے نفس قانون میں

سہ ہر ایک چیز اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتی ہے *

کسی قسم کی غلطی کا ہونا اس کے علم و حکمت کا منافی ہے کیونکہ قوانین فطرت کا فیضان تمام کائنات
 کو یکساں پہنچ رہا ہے جس کے قبول کرنے میں سب اشیاء بلا تفاوت شامل ہیں بالبتہ محل
 قابلیت یعنی اشیاء استعداد میں یکساں نہیں جیسا کہ ضروری نتیجہ یہ ہے کہ قانون فطرت کا فیضان
 تمام اشیاء پر یکساں نتیجہ پیدا کرے مثلاً بارش بجائے خود مفید بنی ہے مگر مختلف قسم کی ارضی
 میں اس کا ایک ہی نتیجہ نہیں ہوتا پس جس امر کو یہ لوگ قانون فطرت کی غلطی پر محمول کہتے ہیں۔
 درحقیقت استعداد اشیاء کی طرف منسوب ہونا چاہئے مگر اس اعتراض کا ایک اور باریک جواب
 بھی ہے جس کی حقیقت کو کم لوگ اور کم کر سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جن اشیاء کو ہم ناقص نام کامل
 کہتے ہیں ان میں نقصان یا کمال کا اعتبار محض ایک اضافی امر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر
 ہم اشیاء کے اعتبارات یا اوصاف کو بالکل نظر انداز کریں تو ان کی حقیقت میں کچھ فرق نہیں آتا
 کیونکہ اوصاف یا اعتبارات اشیاء کی حقیقت میں داخل نہیں بلکہ امور خارج از حقیقت کا نام
 ہے اس لئے کوئی چیز فی حد ذاتہ ناقص نہیں و نہ ذات باری کا وصف نقصان سے متصف ہوتا
 لازم آتا ہے۔ مگر چونکہ اس کی ذات محض خیر ہے اس لئے جو چیز اس کے علم و ارادہ پر وجود
 پذیر ہوتی ہے وہ بھی محض خیر ہوتی ہے اس کا ناقص و کامل ہونا ہمارے اعتبار و لحاظ پر موقوف
 ہے نہایت باریک غور میں اس امر کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ جن اشیاء کو ہم ناقص خیال
 کرتے ہیں وہ بھی وصف کمال سے متصف ہیں۔ کیونکہ کمال کا ہم صرف کسی خاص حالت میں
 حصر نہیں کرتے بلکہ اس کو ایک وسیع معنی میں لیتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے
 ہیں کہ جس وصف کو ہم کسی چیز کے لئے موجب نقصان سمجھتے
 ہیں وہ کسی دوسری اسی صورت میں کمال کہلا سکتی ہے جس کو ہم نے اپنے ناپسند طبیعت سمجھ
 کر موجب نقصان سمجھا ہے لیکن ہم کیا جانتے ہیں کہ صلاح کی حکمت کاملہ کا اظہار اس معین صورت
 میں اس طرح پر ہو سکتا ہو۔ کہ کوئی دوسری صورت اس کے لئے کافی نہ ہوتی۔ غور کر دو کہ خداوند
 تعالیٰ کے اسما حسنی کس طرح متضاد معانی کا پتہ دیتے ہیں جہاں وہ اول ہے آخر بھی ہے۔

جہاں ظاہر ہے یاطن بھی ہے علی ہذا القیاس مگر ہر دو متضاد اسم مختلف اعتبارات سے اس کے کمال ذات کا اظہار کرتے ہیں۔

انسان صرف قانون فطرت کی پیرائی | حدیث کل مولود یولد علی الفطرۃ میں لفظ فطرت سے انسان کی وہ طبعی حالت مراد ہے جس سے میں کمال حقیقی کو پاسکتا ہے

انسان ہر ایک امر کی علت دریافت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چونکہ علم سے انسان اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب کمال کو حاصل کر سکتا ہے اور علم حقائق اشیاء کے جاننے کا نام ہے چنانچہ حضور علیہ السلام کی ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں۔ اللہم ادرنا حقائق الاشیاء کما سہی (اور حقائق اشیاء کا علم بدوں سلسلہ علت و معلول کی پیروی کرنے کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور سلسلہ علت و معلول میں قانون فطرت کا نام ہے۔ اس لئے منطقی طور پر نتیجہ حاصل ہو کہ انسان صرف قانون فطرت کی پیروی میں کمال حقیقی کو حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ طریق استدلال کو حاصل نہیں کرتے کبھی علمی کمالات میں محقق نہیں ہوتے۔

قوانین فطرت لا تنابہیں | قوانین فطرت کو ہم محدود ہیں کر سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے قومی محدود ہیں اور قوانین فطرت چونکہ ذات باری کی قدرت کا بلکہ کا

نتیجہ ہیں اور قدرت ذات باری غیر محدود ہے اس لئے محدود شے غیر محدود شے کا کبھی احاطہ نہیں کر سکتی۔ ہاں یہ بات ضرور قابل لحاظ ہے کہ ہم قدرت کو غیر محدود صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں۔ جبکہ عقل جزئی سے جو عام باتوں کو حاصل ہے ہم اس کا انداز کرنا چاہیں

۱۔ اس تقریر کے سمجھنے کے لئے ذرا زیادہ غور و غوض کی ضرورت ہے اور جب تک منکر صفات کی حقیقت کو نہ سمجھا جائے چند اداطینان نہیں ہو سکتا۔ مگر بات نہایت معقول ہے۔ ۱۲ منہ ۷

۲۔ ہر ایک بچہ ایک خاص فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ۱۲ منہ ۷

۳۔ خدا یا ہم حقائق اشیاء کا اصلی علم عطا کر۔ ۱۲ منہ ۷

۴۔ علت و معلول سلسلہ سبب و مسبب مراد ہے۔

مگر عقل کئی جو انسان کامل یا بالفاظ دیگر انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے فطرت کی تمام جہات پر حاوی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ آسمانی تعلیم و حکمت ناطق و ساجی جاتی ہے۔ اگر بعض احکام کی علت ہمیں مطلقاً معلوم نہ ہو مگر اس کا تسلیم کر لیں ہمارا فرض ہے ♦

قوانین فطرت میں تضاد یہ نہایت قابل غور مسئلہ ہے کہ قوانین فطرت میں حقیقی طور پر تضاد نہیں پایا جاتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قوانین فطرت کا منبع ذات باری تعالیٰ ہے جو حقیقی وحدت کا مالک ہے پس جس طرح ذات باری تعالیٰ

کے اسما حسنیٰ میں ایسے اسماء ملتے ہیں جو متضاد ہیں اسی طرح ممکن ہے کہ قوانین فطرت میں بھی بظاہر تضاد موجود ہو مگر جس طرح اسما حسنیٰ میں مختلف اعتبارات کے رُوسے تضاد حقیقی کا وجود ممکن نہیں اسی طرح قوانین فطرت میں بھی مختلف اعتبارات کے رُوسے تضاد حقیقی نہیں پایا جاتا۔ مثلاً جس اعتبار سے ذات باری کو اول کہہ سکتے ہیں اسی اعتبار سے آخر نہیں کہہ سکتے علیٰ ہذا القیاس تمام اسماء میں بھی اعتبار ملحوظ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے اپنے مناجات اللہ ہونیکا ثبوت علم اختلاف بتایا ہے۔ اس لئے اگر کہیں کوئی قانون فطرت بظاہر کسی دوسرے قانون فطرت کا مخالف نظر آئے تو اختلاف اعتبارات کے رُوسے ان میں تطبیق دی جاسکتی ہے۔ اسی اصل عظیم پر خرق عادات یعنی معجزہ وغیرہ کا مسکہ مبنی ہے مگر اس کی حقیقت کے سمجھنے کے لئے ایک نہایت دقیق اور لطیف فطرت کی ضرورت ہے جو اندھی تقلید اور تعصب کے رنگ سے بالکل پاک و صاف ہو ♦

جو لوگ حقیقت فطرت آگاہ ہوتے ہیں انہیں تعلیم انبیاءؑ یہ امر مسلم ہے کہ فطرت ہمیشہ ایک عام میلان سے طبعاً کوراستی کی طرف کھینچ لاتی ہے اس میں ایک مخفی طاقت ہوتی ہے جو تمام

مولخ پر غالب آجاتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا سر شمع چونکہ وحدت حقیقی کے منبع سے پھوٹتا ہے اس لئے وہ ویسا ہی خوشگوار ہے جیسے قوانین فطرت۔ چنانچہ ایسے ہزاروں دنیاوی گنہگار ہیں

جہتوں نے اسرافِ فطرت کو تعلیمِ انبیاء سے جا مل گیا ہے بلکہ یوں کہو کہ اسرافِ فطرت سے آگاہ ہونا یعنی معرفتِ ذاتِ باری کا درجہ پانا سوائے اتباعِ تعلیمِ نبوت ممکن نہیں ہے۔

اسلام عین فطرۃ اللہ ہے | یہ جملہ قدیم الایام سے مختلف عبارات میں زبانِ زدِ چلا آتا ہے اور صحیح ہے چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام کے اصولِ تعلیم ایک

ہی تھے اس لئے وہ سب کے سب اسلامِ پاک کی تعلیم دیتے رہے اور چونکہ قرآن مجید تمام انبیاء علیہم السلام کے اصولِ تعلیم کا جامع ہے اور آخری اور مکمل کتاب ہے اس لئے وہ ہر ایک قسم کے طریقِ استدلال کو پیش کرتا ہے جس سے اسرافِ فطرت کا پتہ چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ معرفتِ ذاتِ باری کا بحرِ ناپیدائنا رہے جس کی وسعت اور عمق کی انتہا کسی کو معلوم نہیں ہو سکی۔

یوں سمجھو کہ وہ ہر ایک قسم کی کائناتِ مادی - غیر مادی - ارضی - سماوی - ظاہری - باطنی کو مختلف پیراؤں میں بطورِ استدلال بیان کر کے ایک قطعی حکم یا نتیجہ پیدا کرتا ہے جس سے عبودیت اور الوہیت کی حقیقت کھلتی ہے اور بدوں اس کے دنیا میں کوئی تعلیم نہیں جو کسی کو یائے حقیقت کے لئے موجبِ اطمینان ہو سکے یہی حقیقتِ قوانینِ فطرت میں جلوہ گر ہے کہ وہ کسی صورت میں جلوہ گر ہوں۔ ہمارے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب ہم اسلام کو اصولِ فطرت کے معیار پر جانچتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصولِ کلیہ جو اسلامِ پاک میں تسلیم کئے گئے ہیں اصولِ فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں مثلاً مطلق مفہومِ عبادت کی ضرورت ہیں قوانینِ فطرت سے معلوم ہوتی ہے جس کے جزئیات کو شارعِ علیہ السلام نے بذریعہ وحیِ والہام وضع کیا۔ مگر نہایت دقیق غور میں اس امر کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ ان جزئیات کی وضع بھی اصولِ فطرت پر مبنی ہے۔

مذکورہ بالا سطروں میں جو بحث کی گئی ہے وہ صرف قوانینِ فطرت سے متعلق تھی جس کا بطورِ تیسرے

معجزات کی بحث کے لئے ذکر کرنا ضروری تھا۔

قانون فطرت کے مفہوم کی توسیع | قانون فطرت کا مفہوم جیسا کہ ہم نے پیچھے لکھا ہے ہر ایک قسم کی موجودات مادی اور غیر مادی کے سلسلہ

نظام پر مبنی ہے۔ یہ محض غلط ہے کہ ہم صرف انہیں چند محدود قوانین کو قانون فطرت سے تعبیر کریں جو بذریعہ روزمرہ انسانی تجربہ و مشاہدہ کے پایہ ثبوت تک پہنچ چکے ہیں جس طرح کائنات مادی میں ہم ایک سلسلہ نظام کا عین رکھتے ہیں اور اپنی عقل جرنی سے اس سے ایسے قوانین کا استنباط کرتے ہیں جن پر ہمیں اپنے روزمرہ معاملات کی سرانجام دہی میں اعتماد رہتا ہے اسی طرح کائنات غیر مادی میں ایک سلسلہ نظام قوانین موجود ہے جس پر روحانی کمالات انسانی کا دار و مدار ہے اگر ہم اس سلسلہ کی ضرورت سے انکار کر دیں تو حلاوت و نبوت و الہام و وحی وغیرہ امور محض ایک فرضی و حکو سلا سمجھے جائیں گے جن کی تصدیق کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ روحانی سلسلہ قانون کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ تمام کائنات مادی کا سلسلہ نظام اس کے مقابلہ میں ایک ذرہ کی حقیقت بھی نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ ایک پیش پا افتادہ بات ہے کہ مادی کائنات بہر صورت محدود اور متناہی ہے اس لئے اس کا سلسلہ قوانین بھی محدود ہی ہونا چاہئے گو کہ انسان ضعیف البیان اس محدود کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا مگر خالق غیر مادیہ جو اشیائے مادیہ سے اشرف و اعلیٰ میں ایک لامتناہی سلسلہ قانون کے تابع ہیں جس کی کیفیت بحر انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے کوئی دوسرا نہیں پاسکتا یہی وجہ ہے کہ مولیٰ عقل اور کشف فطرت کے آدمی جنہیں صرف علوم ظاہری پر نظر ہے بسا اوقات ان خالق کے متعسر الادب اک ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا کرتے ہیں اس سلسلہ کی ضرورت پر مفصل بحث کرنے کے لئے اگر دفتروں کے دفتر سیاہ کر دئے جائیں تو بھی ہم پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ دراصل اس سلسلہ قانون کو سمجھنے کے لئے مسئلہ توحید ذات باری میں پورا پورا غور کرنا چاہئے کیونکہ مسئلہ توحید ایک ایسا بحر ناپید الکنائے جس میں لاکھوں اور کروڑوں کائنات مادی کے سلسلہ ملتے

قوانین منہج میں چنانچہ آیہ و مایہ کلمہ جنود ربانہ کا حصہ میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔
 یہ امر مسلم ہے کہ سلسلہ کائنات مادی حلقے تمام ترقیات روحانی کی بنیاد ہے کیونکہ سلسلہ
 اور اک کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن شریف نے بار بار مظاہر قدرت کی طرف توجہ
 دلائی ہے۔ اور فی الحقیقت یہی طریق تعلیم انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے پس جس قدر
 ہم حسیہ بات سے معنویات کی طرف ترقی کر کے چلے جاتے ہیں اسی قدر کمالات روحانی کے متعلق
 ہمارا دائرہ علم وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور جس طرح عالم مادی میں ہم اپنے حواس خمسہ کے مدد کرات
 سے جمائی کیفیتیات کا ادراک کرتے ہیں اسی طرح عالم روحانی میں اپنے حواس باطنی سے اس امر کے
 اور اک کی معیت سے لذت پاتے ہیں کہ کس طرح ذات باری کو اس عالم مادی کی اشیاء سے تعلق
 حاصل ہے۔ اور اس کے آثار صفات کے ظہور میں کیا اسرار و معارف مخفی ہیں۔ اور کیوں نکر اشیا موجودات
 ایک سلسلہ قافلوں و معات کے اندر مقید ہیں کہ ایک ذرہ کائنات بھی اس سے خارج نہیں ہو سکتا
 اور اشیا و اور ان کے خواص میں جو ربط حقیقی ہے اس کی اصلی حقیقت کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ
 یہ وہ معارف و حقائق ہیں جن کو ہم اپنے علوم و فنون مروجہ کے رو سے ہرگز طے نہیں کر سکتے۔ بلکہ
 یہ انہیں پاک فطرت ان لوگوں کا حصہ ہے جو انبیاء علیہم السلام اور اولیاء عظام کی جماعت میں منک
 ہیں۔ عارف کامل شیخ عبدالکریم بن ابراہیم جیلانی اپنی کتاب انسان کامل کی جلد دوم صفحہ ۳۴
 میں لکھتے ہیں۔ و هذا سر عجیب لا یکاد العقل ان یقبلہ بل لا یطیقہ لان العقل
 منوط بالحکمة و الکشف منوط بالقدرۃ فلا یحرفہ الا صاحب کشف۔ اگر
 عامہ ناس پر جو عموماً کمالات روحانیہ کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان امور کا انکشاف ہو گیا ہوتا۔ تو کبھی ان
 صداقتوں کا انکار نہ کرتے جن کی شہادت آیت اللہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
 بڑے زور کے ساتھ مل رہی ہے مثلاً حقیقت معجزہ کو جو مقابلہ کمالات نبوت ایک معمولی بات ہے

لے تیرے رب کے شکر موجودات کو ہی جانتا ہے ۱۲ منہ ۱۲ یعنی عالم روحانی ایک سر عجیب ہے تیرے رب کے

عوام الناس عرف اس بے تسلیم نہیں کرتے کہ انہیں اس کی کیفیت مدد کی حقیقی علت کا پتہ نہیں لگتا۔ مگر جو شخص مبلغ ولایت کو مبتلا ہے کمالہ سنت رسول حاصل کر چکا ہے اس امر کا یقین لگتا ہے کہ اس طرح نبی اللہ یا ولی اللہ اسما صفات ذات کے آثار کا کامل منظر ہو گیا ہوتا ہے اور اسے کینہ گران کا منتقلی پیدا ہو کر عالم کائنات میں تصرف کرنے کی قابلیت آ جاتی ہے شیخ عبدالکریم رحمہ اللہ ایک مشہور صحیح حدیث سے اقتباس کر کے اس مطلب کی حسیل توضیح کرتے ہیں:-

فاذا ظهر بالحكامه وتحقق العبد بحقيقة كنه سمحه الذي يسبح به
ويعصره الذي يبصر به ويده القيد يطيش بهما ووجهه الذي يمشي
بهما ظهر الحق تعالى في وجود هذا الانسان فيمكن من الصفات في عالمه
الا كوان

الاعين انبياء واولياء عليهم السلام کے کمالات کا عوام الناس نہ تو اندازہ لگا سکتے ہیں اور نہ ان کی زبردست طاقت سے باخبر ہو سکتے ہیں جو بالگاہ رب الغزت سے انہیں بطور انعام دی جاتی ہیں۔ یہ لوگ بظاہر زمینی ہوتے ہیں مگر ان کی پاک رُوح عالم ملائکہ سے بھی بالاتر ہوتی ہے وہ جس طرف نگاہ اٹھاتے ہیں اسی طرف خدا کا منہ پھر جاتا ہے۔ جہاں قیام کرتے ہیں وہیں خیر و برکات کا نزول ہونے لگتا ہے چونکہ بارگاہ منعم حقیقی سے خزانہ رحمت کے مالک ہوجاتے

یہ معمولی عقول قبول نہیں کرتیں بلکہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ ان خالق کا ادراک کر سکیں۔ کینہہ قتل جبر و مشاہد کی تجزیہ میں جکڑتی ہیں اور ان امور کا ادراک نہ کر سکتے۔ اگشتان ہونے پر مبنی ہے پس کوئی ایسا ہی شخص ان امور کو حاصل کر سکتا ہے۔ امامہ ۱۱۔ جب انسان کامل میں احکام صفات ظاہر ہوتے ہیں اور حقیقت کے ساتھ اس کی ذات کو پورا قلب پیدا ہو جاتا ہے تو خداوند کریم فرماتے ہیں کہ میں انسان کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ حملہ آور ہوتا ہے اور اس کی پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے ایسے بلا

ہیں اس لئے عوام الناس کے حق میں سراپا شفقت و مرحمت بن جاتے ہیں ان کا ہر ایک کام اللہ کا کام ہوتا ہے بظاہر وجود بشر کی صورت رکھتے ہیں مگر باطن میں قوی الہیہ کی معاونت و وسیم ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ ویکھو کہ آیہ و ما رمیت اذ رمیت ولكن الله رمى کس طرح باواز بلند ان کے اغال کو افعالی الہیہ ثابت کر رہی ہے جس میں شک و شبہ کو کچھ بھی گنجائش نہیں۔ اگر تمہیں ان امور کی تصدیق کرنے میں تردد ہو تو تمہاری عقل مندی اس میں ہے کہ تکذیب نہ کرو۔ کیونکہ ان کی تکذیب خدا کی تکذیب ہے اور خدا کی تکذیب موجب ذلت و ایرین ہے۔ فانقسم لا یکذبون ان ولكن الطمین بالیت الله یجحدون۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دائرہ امکان میں ہزاروں ایسے امور ہیں جن کی تہ تک انسان نہیں پہنچتا مگر ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ افلاطون الہی کا قول اس باب سے میں نہایت قابل قدر ہے و کہتا ہے قد شیخ لی الوف من المسائل لیس لی علیہا برہان اسی خیال پر ایک اور فلاسفہ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو غالباً شیخ بو علی سینا کہتا ہے۔ و اذا جاملت امور مالمه یقع سمحاً من قبل فذہ فی بقعة الامکن بہر صورت انکار کمالات ولایت و نبوت نشان شقاوت و خسارت ہے اس امر عظیم میں انسان کو بڑا محتاط رہنا چاہئے کیونکہ بسا اوقات اپنے محدود علم کو کسی چیز کا معیار کامل سمجھ کر حقیقت الامر سے محروم رہ جاتا ہے۔

ہر کہ شد محرم دل در حرم یار باند۔ و اس کہ اس کارند آنت در انکار باند
خداوند کریم نے مراتب کمالات کو ہر ایک طبقہ موجودات میں تقسیم کیا ہے جن میں سے بعض کا علم عوام الناس کو حاصل ہوتا ہے اور بعض کا خواص الناس کو اور دیگر بعض انبیاء کو کماد و دنی

لا انسان کے وجود میں ذات حق کا ظہور ہوتا ہے تب وہ عالم کائنات میں تعریف کرنیکی قدر پاتا ہے ۱۲ منہ
۱۳ ایسے پیغمبر مت نگر نیرہ کفار پر تو نے نہیں پسکئی بلکہ اللہ نے پسکئی ہے بعض اہل حق اسکا ترجمہ کائنات ۱۴ منہ
۱۵ مجھے ہزار ہا اس قسم کے مسائل کا یقین ہے جن پر میرے پاس کوئی عقلی دلیل موجود نہیں ۱۶ منہ +

بعض الاخبار ان للعلماء سرّاً وللخلفاء سرّاً والانبیاء سرّاً واما سرّاً والله تعالیٰ من
 بعد ذلك کل سر۔ اور اس سر کا تسلیم کر لیا کہ انسان عقل خربی سے امور روحانیہ کی حقیقت کو ہرگز
 نہیں سمجھ سکتا بالکل واضح ہے کیونکہ ہم اپنے روزمرہ تجربہ و مشاہدہ میں اس سر کا یقین رکھتے ہیں کہ ایک
 پیشہ و دوسرے پیشہ ور کے پیشہ کو جب تک کہ وہ کچھ مدت اس پیشہ کی تعلیم حاصل نہ کرے
 ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ پس کیونکر ایک شخص جیسے مرت علوم ظاہری میں اپنی عمر کو کھو دیا ہے اور میلان
 قنک اقلیم من ذکرہا میں قدم نہیں رکھا اپنے ناچیز اور بیچ معلومات خسیہ پر کمالات ولایت
 و نبوت کا انکار کر سکتا ہے جو مکتب خانہ علمنا من لدنا میں حاصل کئے جاتے ہیں ۔
 اس عنوان کو میں نے کسی قدر زیادہ طول دیا ہے تاکہ ناظرین بخوبی آگاہ ہو جائیں کہ انبیاء
 کے کمالات کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ انہیں اپنی طرح ایک معمولی انسان نہیں سمجھ سکتے
 کیونکہ اسی خیال نے کفار کو حضور علیہ السلام کی تصدیق سے باز رکھا تھا۔ چنانچہ وہ آپ کے
 حق میں کہا کرتے۔ ما یحذر الرسول یا کل الطعام ویشی فی الا سواق دلیل عقلی
 سے معجزات کا اثبات ممکن ہے۔ کہ کسی ظاہرین کے لئے موجب تسکین نہ ہو سکے۔ اور اس کو کسی
 نہ کسی پہلو میں کلام کی گنجائش باقی ہے۔ مگر جو لوگ کمالات روحانیہ کے مالک ہیں۔ اور اسما و صفات
 و افعال ذات باری کی حقیقت کو علم کلام کی کتابوں سے نہیں بلکہ بلا واسطہ تعلیم وحی سے اخذ
 کرتے ہیں معجزہ و کرامت کو بمقابلہ کمالات نبوت و ولایت ایک معمولی بات سمجھتے ہیں۔ اور ان

لہ جب تم کوئی ایسا عیب امر سنو جو پہلے نہ سنا ہو تو اسے دائرہ امکان میں رہنے دو یعنی تکذیب نہ کرو۔ ۱۲ منہ
 لہ علماء و محدثین فی العلم کچھ سرسار کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ان کے بعد اولیاء اللہ اور ان کے بعد انبیاء علیہم السلام
 اور ان کے بعد ائمہ صلوات اللہ علیہم احوال کے بعد خدائے خالق سموات و الارض و صحیحہ اسرار کا عالم ہے ۱۲ منہ
 سے جس نے نفس کو پاک کر لیا۔ وہ رستگاری پا گیا۔ ۱۲ منہ

لہ ہم نے پیغمبر علیہ السلام کو اپنے مکتب خانہ میں خود تعلیم دی ہے ۱۲ منہ

لوگوں کا تو ایمان ہے کہ نبی صاحب شریعت کا رتبہ ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اس امر سے کہ اس کو چاند کے پھٹ جانے یا غصہ کے اٹھنا ہاں جانے یا انگلیوں سے پانی جاری ہونے تک محدود کیا جائے بلکہ یہ رتبہ تو خاص خاص متبعان شریعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی حاصل ہوا ہے۔ رہا نہ ماننا اور حجت بازی کرنا سو اس کا کبھی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

قانونِ قدرت کے رُخ سے بعض نہکین معجزہ نے اس امر پر زور دیا ہے کہ لفظ آیت کا لفظ آیت کا استعمال قرآن مجید میں تین طرح پر ہوا ہے۔
استعمال قرآن مجید میں صرف حکم شرعی کے لئے ہوا ہے۔ مگر یہ خیال جیسا کہ کلام اللہ نے زمین پر موجود ہے اس قابل نہیں کہ کوئی سمجھ را آدمی اس کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے

لفظ آیت تحت میں کسی شے کے نشان یا علامت کو کہتے ہیں مگر کلام الہی میں اس کا استعمال تین معنی میں ہوا ہے۔ البتہ لفظ معجزہ بجائے لفظ آیت کے زمانہ نبوت سے بعد کا استعمال ہے سو یہ ایک اصطلاح جس میں مناقشہ نہیں ہو سکتا۔

(۱) کلام مجید کے الفاظ کا ایک ٹکڑا جس کے انجام پر ایک نشان بصورتِ دائرہ دیا جاتا ہے یہ الفاظ ایک آیت کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ چونکہ ہر ایک آیت قرآن مجید کی بجائے خود معجزہ ہے جس کا معارضہ خارج از امکان ہے اس لئے وہ اپنے خجائے اللہ ہونے کا نشان ہے جس سے تصدیقِ نبوت پر دلیل قائم کی جاتی ہے پھر چونکہ انہیں الفاظ میں احکام شرع موجود ہوتے ہیں اس لئے مجازاً لفظ آیات بھی احکام لیا جاتا ہے۔

(۲) آیات بھی مظاہر قدرت جو زمین و آسمان میں نظر آتے ہیں اور جن کی طرف حاجا قرآن مجید میں توجہ دلائی گئی ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سب چیزیں علیحدہ علیحدہ اپنے صالح حقیقی کے وجود پر دلالت کرتی ہیں گویا اس کی توحید کا نشان ہیں لہذا قبل سے

لے یہ ایک غیر ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا ہے اور باز اعلیٰ میں چلتا پھرتا ہے ۱۲ منہ +

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَّهٗ اٰیَةٌ - تدال علی انہ واحد

مثلاً وکامین من ایتہ فی السموات والارض یسرون علیہا وھم عنہا معہ نہ ہوں۔
 (۳) آیت یعنی معجزہ بنی حرق عادت جو کسی نبی اللہ کے ہاتھ پر اس غرض سے حکم خداوند علی وعلیٰ
 صلور ہوتا ہے کہ عوام الناس اس سے نبی کے منجانب اللہ ہونے پر دلیل قائم کریں۔ وجہ تسمیہ خود ظاہر
 ہے۔ مثلاً قَالَ اِنْ کُنْتَ جِئْتَ بِاٰیَةٍ فَاتَّ بِہَا اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ فَالْقَىٰ عَصَا
 فاذا ہی تعبان مبین ووزع یدہ فاذا ہی بیضاء للناظرین۔ ناظرین انصاف پسند
 ذرہ غور فرمادیں کہ میں نے (۳) میں جو آیت لکھی ہے اس میں لفظ آیت آیا یعنی معجزہ ہے یا حکم شرعی۔
 سخت تعجب ہے کہ کس طرح مخالف اس آیت اور دیگر ایسی آیات میں حکم شرعی کے معنی چسپان کر سکتا ہے
 سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ آیا فرعون کا طالب نشان ہونا بغرض تصدیق نبوت تھا یا کسی حکم شرعی کے
 حصول کے لئے مگر وہ تو ابھی ایمان ہی نہیں لایا تھا حکم شرعی کا طالب کس طرح ہو سکتا تھا اور ایک تعجب
 کی بات اور ہے کہ فرعون تو بہ خیال مخالف حکم شرعی کا طالب ہوتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام عصا کا
 اڑو ہاتا دکھاتے ہیں اور ید بیضا پیش کرتے ہیں۔ معاذ اللہ یہ کسی نامعقول بات ہے پر حق تو یہ
 ہے کہ جب انسان کو کسی امر کا خطبہ ہو جاتا ہے تو اسے ہر ایک بات میں اسی امر کا خیال و امنگیر رہتا
 ہے مخالف کو انکار معجزہ نے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خواہ مخواہ قرآن مجید کی تحریف معنوی پر
 آمادہ ہو گیا۔ لغو ذبا اللہ ۞

۱۔ ہر ایک چیز میں نشان موجود ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ خدائے برتر ایک ہے۔ ۱۲ منہ ۞
 ۲۔ زمین و آسمان میں بہت سے نشانات قدرت موجود ہیں جنہیں غافل لوگ سرسری دیکھ کر ٹال دیتے ہیں
 اور غور نہیں کرتے۔ ۱۲ منہ ۞

۳۔ فرعون نے موسیٰ کو کہا کہ اگر تیرے پاس کوئی نشان اپنی صداقت کا موجود ہے تو لا پیش کر۔ تب موسیٰ نے اپنا عصا
 پھینکا اور وہ کھلم کھلا اڑو ہاں گیا۔ اپنے اپنا ہاتھ گریبان سے باہر نکالا تو تمام دیکھنے والوں کو چھٹا نظر آیا۔ ۱۲ منہ ۞

تسمیہ بعض مفسرین سے ایت کے معنی بعض مواقع پر حیرت کے بھی لئے ہے مثلاً آیہ فالیوم نبخیات
 میدانک لتکون لمن خلقت ایۃ میں مگر یسعیف نہ ہا ہے کیونکہ اس آیت میں بھی لفظ
 آیت بمعنی حجت و دلیل ہے۔ چونکہ ہر معنی مذکورہ بالا میں یہ خیال مشترک ہے کہ آیت ایک دلیل ہے
 جس سے ہم دلائل کے اثبات کا یقین حاصل کرتے ہیں اس لئے تینوں معنی بالکل اس قانون طبعی کے مطابق
 ہیں جس پر فطرت انسانی پیدا کی گئی ہے ۔

کیا معجزہ جز نبوت ہے یا لازم نبوت
 یا غیر لازم نبوت ؟

معجزہ حقیقت نبوت کی جز نہیں ہے کیونکہ جز ہوتا ہے
 مطلب یہ ہے کہ بدول اس کے نبوت کا تحقق نہیں
 ہو سکتا جس طرح انسان کی تعریف میں کہا کرتے ہیں۔

کہ وہ حیوان ناطق ہے اس لئے حیوان انسان کا ایک جز ہے اور اسی طرح ناطق ایک دوسرا جز۔
 اگر ان ہر دو سے کسی ایک کا عدم فرض کریں تو انسان کی حقیقت کا بھی عدم ہو جائیگا۔ پس نبوت کے
 متعلق ہم ہرگز معجزہ کا جز ہونا تجویز نہیں کر سکتے۔ مع ہذا اگر جز مانا جائے تو ایک اور جز ہی لازم آتی
 ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی ہر وقت وصفت نبوت سے متصف ہوتا ہے یعنی وہ بلا توقف ہر لمحہ نبی ہے
 اگر معجزہ جز نبوت ہوتا تو اسے بھی بالفضل ہر وقت موجود ہونا چاہئے مگر ایسا نہیں ہوتا اس لئے معجزہ
 جز نبوت نہیں ہو سکتا اور ایک دلیل جز نبوت نہ ہونے پر یہ ہے کہ معجزہ دلیل ہے اور دلیل دلائل کی ذات
 سے ایک علیحدہ حقیقت کا نام ہے ۔

معجزہ کو ہم غیر لازم سمجھیں کہ سکتے کیونکہ اکثر حالات میں تصدیق نبوت کے لئے اس کا وجود
 ضروری ہے ورنہ عام طور پر محبت قطعی دوبارہ نبوت مفقود رہے گی۔ جب اس کی یہ ہے کہ بدول
 خرق عادت اکثر صعدوں میں ہم کسی اور امر کو دلیل نبوت تجویز نہیں کر سکتے۔ کیونکہ معارف و عقائد
 خاص خاص لوگوں کے لئے حجت ہو سکتے ہیں نہ ہر ایک کے لئے۔ نیز ان کا کوئی خاص معیار جو نبوت

لے لے فرعون ! خرق کے بعد آج ہم تیری انش کو ٹیلہ پہ پھینکتے ہیں تاکہ پھیلے آنے والوں پر حجت بن جائے
 کہ خدا کے سرکشوں کا کیا حال ہوتا ہے ۔ علامہ ۔

کے لئے ضروری ہے ہم قرآن میں دے سکتے اخلاقی حالت بھی معیار نہیں ہو سکتی کیونکہ میں یقین نہیں کہ وہ حالت ہمیشہ قائم ہے انحراف منکرین سے بطور سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ تم لوگ کسی نبی کے دعویٰ نبوت کو کس دلیل سے تسلیم کر لے گے؟ کیونکہ فرض کرو کہ ایک نبی جو صاحب شریعت نہیں اور حقیقت وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوا ہے لوگوں کے سامنے حکم وحی آسمانی اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے۔ اب لوگ کیونکر یقین کریں کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے؟ پس بجز خرق عادت جواز نم منصب نبوت ہے۔ کوئی قطعی دلیل جائے پاس موجود نہیں اس کی مزید تشریح آگے آتی ہے *

کس طرح محرم منصب نبوت سے منکرین اعتراض کیا کرتے ہیں کہ نبوت اور معجزہ میں کسی قسم کا دلیل و مدلول کا تعلق رکھتا ہے؟ تعلق نہیں۔ سید صاحب نے اس اعتراض کی تائید میں قاضی ابن رشد کی ایک طویل عبارت کا حوالہ دے کر

یہ ثابت کیا ہے کہ معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کا تعلق نہیں اور اس لئے وہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔ سید صاحب ہوں یا ابن رشد اس سے ہیں کچھ غرض نہیں کیونکہ منکرین کا گروہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ اور چلا جائیگا مگر بابت عرف یہ ہے کہ جس امر کو کتاب اللہ اور سنت رسول اور اجماع طبقات ثلاثہ یعنی صحابہ و تابعین و تابعین صحیح تسلیم کرتے چلے آئے ہوں اس کا کسی شخص کی تقلید میں ترک کرنا یا انکار کرنا موجب سلب ایمان ہے اور حق یہ ہے کہ ایک خالص الایمان سے تو ایسا ہونا ممکن نہیں بلکہ سمجھ دار منکرین کا بھی یہ دتیرہ رہا ہے کہ اگر انہیں مخالف کی تصدیق میں کوئی قطعی دلیل نہیں ملی تو انہوں نے صاف غفلتوں میں یہ نہیں کہا کہ یہ غلط ہے بلکہ اس پر امکان کا حکم لگا کر اسے معلق چھوڑا۔ گو وقوع کے بارہ میں انہیں کوئی دلیل نہ ملی ہو *

دلیل کی تعریف یہ ہے "ما یلزم من العلم به العلم بشئ آخر" یعنی دلیل وہ شے ہے جس کے علم سے ہیں کسی دوسری شے کا علم حاصل ہو اب ہم دیکھتے ہیں کہ آیا یہ تعریف معجزہ پر صادق آتی ہے یا نہیں؟ پس اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ معجزہ کے علم سے ہیں نبوت کا علم حاصل ہو جاتا ہے تو ہم معجزہ کو دلیل نبوت کہنے میں ہرگز مدیغ نہیں کریں گے گو محمدان اور پیاسکا انکاری کریں۔

معجزہ نام ہے ایک ایسے ناقض عادت کا جو کسی نبی اللہ کے ہاتھ پر ظاہر ہو یعنی جس کا وقوع کسی ایسے قوانین کے ذیل میں نہیں ہوا جو ہمارے ہاں تجربہ و مشاہدہ سے قوانین کلیہ عادیہ کہلاتے ہیں یا ایوں کہو کہ ہم اس کے وقوع کا کوئی ایسا سبب قرار نہیں دے سکتے جو ہمارے نزدیک معمولی سلسلہ اسباب میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس تعریف سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس امر کے واقع ہونیکا و حقیقت کوئی سبب نہیں کیونکہ یہ اصل کالوچی من السماء ہے کہ کسی واقعہ کا ظہور بلا سبب ممکن نہیں۔ اس تعریف میں صرف مفہوم داخل ہے کہ ہم اس سبب کی اپنے مسلمہ روزمرہ اصول پر تشریح نہیں کر سکتے۔ یہ تو حقیقت معجزہ ہے اب نبی مبعوث من اللہ کی حقیقت کو سمجھنا چاہئے۔ معمولی الفاظ میں تو لفظ نبی کا یہی مفہوم ہے کہ الیہ انھیں نبی کہلاتا ہے جو خدا کی طرف سے تبلیغ وحی پر مامور ہو اور یہ صحیح ہے۔ مگر وہ حقیقت نبی وہ فرد کامل نوع انسان کا سمجھا جاتا ہے جس کے قولئے علمیدہ و علیہ بتائید ذات باری اس درجہ کمال کو پہنچ گئے ہوتے ہیں کہ اس سے زیادہ ترقی کرنا محال ہوتا ہے کیونکہ منصب نبوت سے کوئی درجہ کمال انسانی کا نہیں ہو سکتا۔ وہ خدا کی طرف سے ان معارف و حقائق پر آگاہ ہوتا ہے جن کو بدن تعلیم وحی کوئی شخص حاصل نہیں کر سکتا اور وہ ایسی روحانی طاقتوں کا مالک ہوتا ہے کہ تمام حکیم افراد اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بعض حکمائے انبیاء کے حق میں اس خیال کو یوں ظاہر کیا ہے۔ ہمد اصحاب القدری العظیمة الفالقة یعنی یہ لوگ بڑی زبردست اور برتر توانائے مالک ہوتے ہیں۔ الغرض نبی اللہ ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کو خداوند تعالیٰ سے ایک مضبوط تعلق ہوتا ہے۔ اور وہ اس کے حکم سے تعلیم وحی کو افراد امت تک پہنچاتا ہے۔ شیخ بوعلی سینا جو حکمائے اسلام میں بڑا زبردست حکیم گذرا ہے اپنی کتاب شفا کے الہیات میں حقیقت نبی پر بحث کرتے ہوئے حسب ذیل لکھتا ہے:۔ فہذا الانسان اذا وجد یجب ان یسئل للناس فی امورہم ستا باذن اللہ وامرہ ووحیہ وانزال روح القدس علیہ ویکون الاصل الاول فیما ینبئہ تعریفہ ایاہم لان لہم صانعا واحدا قادرا وانہ باللسان العلانیة ولا ینبئ ان یشغلہم شیء من معرفة اللہ فوق

مصرفتہ انہ واحد حق لا شبہ لہ شیخ کے اس قول کی کہ اس عظیم تعلیم نبی کا توحید ذات باری ہوتی ہے خود قرآن مجید تصدیق کرتا ہے جس کے آیات بینات تعلیم توحید سے مملو و مشحون ہیں اور یہ امر بہ حکم انا اول المسلمین سلم ہے کہ نبی اللہ خود تعلیم وحی کا کامل نمونہ ہوتا ہے جس کی تقلید دیگر افراد امت پر حجت ہو جاتی ہے اور حقیقت توحید کا اعلیٰ کمال یہ ہے کہ جس قدر سلسلہ اسباب عالم کائنات میں نظر آتے ہیں نبی اللہ کی نظر سے اٹھ جاتے ہیں اور یہی عارف کامل کی غایت منتہا ہے کیونکہ اس مقام میں وہ افعال کو بلا واسطہ ذات باری سے صادر ہوتے دیکھتا ہے اور تمام اسباب غایہ میں ارادہ ذات باری کو علت مستقلہ سمجھتا ہے جب نبی اللہ اسما و صفات ذات باری کے اس مقام پر ترقی حاصل کرتا ہے تو جمیع اشیائے کائنات اس کی تابع فرمان ہو جاتی ہیں کیونکہ کمال توحید کے ایک ایسے مقام پر اس کو عروج حاصل ہوتا ہے جہاں سے سلسلہ اسباب غایہ کا آغاز ہوتا ہے اس لئے خداوند جل و علی کا ارادہ نبی اللہ کے ارادہ کے لئے بطور علت تامہ موثر ہو کر عالم کائنات میں تصرف کرتا ہے۔ اسی مقام پر تمام راز سرستہ کی حقیقت اصل میں منکشف ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ جو اس حقیقت کو نہیں پاسکتے ان آثار مافوق العادۃ کے منکر رہتے ہیں۔ ایک عارف کامل کا مقولہ ہے ”لو کلا الاسباب لہا ارتباب مرتاب“ چونکہ نبی اللہ توحید کے درجہ غایت کو حاصل کر لیتا ہے اسلئے برارادہ الہیہ

سلہ جیسا انسان (نبی اللہ) موجود ہو تو اس پر واجب ہوتا ہے کہ عوام الناس کے لئے خداوند تعالیٰ کے ارادہ حکم وحی نزول صوح القدس کے ذریعہ سے ان کے دینی و دنیوی معاملات میں قوانین وضع کرے اور سب سے پہلا اصل رحب پر اس کی ماری تعلیم کا اور مدار ہے (یہ ہوتا ہے کہ وہ انہیں آگاہ کرتا ہے کہ موجودات کا ایک صانع حقیقی ہے جو اعداد و احوال کامل للقدرة ہے اور وہ تمام ظاہر و باطن امور کا جاننے والا ہے۔ اور وہ نبی اللہ انہیں معرفت ذات باری کے اس ہندوی اصل سے رکھ دے گیجانہ پائیدار ہے نظیر ہے) بٹا کر کسی زائد امر کی طرف نہیں لگا تا۔ ۱۲ منہ ۱۰
 لہٰذا یعنی اگر وہ اس سلسلہ اسباب میں ان کے پیش نظر ہوتے تو حقیقت کے سمجھنے میں کبھی ٹکناؤں کا سام نہ ہوتا۔ ۱۲ منہ ۱۰

ایسے امور جن کی نسبت ہمارے عقین ہے کہ سوا ذات باری کے معمولی سلسلہ اسباب کے ذریعہ سے وقوع پذیر نہیں ہوتے اس کے ہاتھ پر جاری ہونے لگتے ہیں جن میں ایک صاحب بصیرت کے لئے نہایت لطیف پیرائے میں یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ شخص ہمارا برگزیدہ اور مقبول بارگاہ بندہ ہے اور اس کو ہم بغرض تبلیغ عوام الناس کی طرف منصب نبوت کے لئے منتخب کر کے اور کمالات ظاہری اور باطنی سے آراستہ کر کے اہل دنیا کے پاس بطور اتمام حجت ارسال کرتے ہیں۔ اور اہل دنیا پر اس کی اطاعت واجب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام کائنات کے تابع فرمان ہونے کی سند ہماری عطا کی ہوئی اس کے پاس موجود ہے اس سند میں ہم نے اس کو بعض اختیارات دیئے ہیں جن کو وہ ہمارے استقواب پر نافذ کرتا رہیگا گویا اس کا حکم ہمارا حکم ہوگا۔ اس لئے ہر ایک چیز جو انسانی زور و طاقت کے درجہ سے بالاتر ہے اس کے سامنے بجز اطاعت کوئی چارہ نہیں رکھتی اور یہی اس کے خلیفہ ہونے کی دلیل ہے جس کے ذریعہ وہ دیگر افراد انسانی پر ممتاز ہے اس لئے کسی کو بھی اس کی اطاعت سے مجال انکار نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس کو نہ ماننا ہماری خدائی کا انکار کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ منہا۔

اس تقریر سے ناظرین پر یہ امر صاف واضح ہو جائیگا کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اور خیال کی تصدیق میں قرآن مجید ناظم ہے حیث قال: **وہا نازن من دلائل الی فرعون و ملائکہ** یعنی عصا اور دیدہ بینہ افرعون۔ اور اس کی جماعت کے لئے تجھے بطور حجت کے دیئے جاتے ہیں کیا ایسی صریح نص کہہ سکتے ہوئے متکرر یہ کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں * مذکورہ بالا حقیقت معجزہ اور نبی اللہ میں غور کرنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ ایک ایسا شخص جھوٹ اور جہانم کا عادی نہ ہو معجزہ اور نبوت میں دلیل و دلیل ہونے کا پورا پورا اطمینان حاصل کر سکتا ہے *۔

۱۰۔ مجھے متکین معجزہ پر سخت تعجب آتا ہے کہ وہ ایک عاجز مخلوق بادشاہ دنیا کے مقرر کردہ نائب ہو

کیا معجزات تو ہیں فطرت

کی حد سے خارج ہیں؟

معجزات تو ہیں فطرت کا حد سے خارج نہیں البتہ قوانین فطرت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ انسانی قوتی نہ تو اس کا حصر کر سکتے ہیں اور نہ حصر کرنا ممکن ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قوانین فطرت

صفات باری تعالیٰ کے آثار کا نام ہے اور صفات اس طرح لامتناہی ہیں جس طرح ذات کیونکہ اگر صفات کو ہم محدود اور متناہی تسلیم کریں تو غیر محدود ذات کا وصف متناہی سے موصوف کرنا لازم آتا ہے۔ اور یہ بالکل باطل ہے اس لئے قوانین فطرت لامحدود ہیں پس کوئی معجزہ قانون فطرت سے خارج نہیں ہوتا۔ البتہ ایسے قوانین فطرت جن پر معجزہ کا احضار ہے سلسلہ مادیات کے قوانین سے بالاتر ہیں یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے خرق عادات کی علت انسان کے دائرہ علم سے خارج ہے۔

کیا معجزہ انقلاب مہیت | یہ امر بالخصوص قابل غور ہے کہ حکماء انقلاب مہیت کو محال مانتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ کڑی کی حقیقت کا ازودھا کی حقیقت میں منقلب ہو جانا ناممکن ہے اور اس کے برخلاف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر ایسا ہونا ممکن ہو تو انسان

کو اشیا پر اعتماد باقی نہیں رہ سکتا کیونکہ ابھی ہم ایک آدمی کو آدمی دیکھ رہے ہیں کہ وہ فی الفور آدمی سے گدھا بن گیا۔ اور صندوق میں زلیورات لکھیں اور وہ مٹی ہو گئے۔ تو یہ امر انتظام عالم میں خلل عظیم کا موجب ہے مح ہذا قرآن مجید میں کہ بتدلیل یخلق اللہ آپکا ہے پس انقلاب مہیت ناممکن ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ میں انقلاب مہیت ان قوانین فطرت پر مبنی ہے جو قوائے روحانیہ نبوت سے مخصوص ہیں۔ اور وہ ایسے عام نہیں کہ روزمرہ ان کا وقوع ہو۔ اور یہی غلط انتظام ہوں

کے حق میں تو اسے تسلیم کرتے ہیں کہ حکم بادشاہ ملک یا ہی اختیارات کو نافذ کرتا ہے مگر خدائے حکم الحاکمین کے فرستادہ کے حق میں اختیارات کی نفی کرتے ہیں اور اس کو اپنی ہی بساط پر بنانا چاہتے ہیں یہ بیینیہ ایسی بات ہے کہ کیا انسانی آدمی میں کہنے لگے کہ چونکہ میں زید مجرم کو جس میں بزرگ شہر کی سزا نہیں دیا سکتا اس لئے کسی یا اختیار جج کو بھی یہ اختیار عطا نہیں ملتی ہونی غدار کے حق میں کہتے ہیں ہمسری یا انبیاء و شہداء یا نبیاء و شہداء خود بخود پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ان کے لئے غنائے چوہدری پیش ہو جتنا بتائی ہے اس میں تخریب و تبدل نہیں ہو سکتا۔ ۱۱۷

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایسے قوانین فطرت کا عمل خاص شرائط کے ساتھ خاص زمانہ میں مخصوص اسباب کے پیدا ہونے پر جاری ہوتا ہے۔ وہی قوی خاص خاص اوقات کے پیدا ہونے پر اسباب ضروریہ کو جو بسا اوقات مخفی ہوتے ہیں وقوع میں لاتے ہیں۔ اگر ایسے ہی عام طور پر ان کا وقوع مان لیا جائے تو ان میں نہ تو خرق عادت کی کوئی بات موجود ہوگی نہ وہ حجت قرار پا سکتے ہیں معلولات کے علل کا حصر ناممکن ہے اور نیز علت و معلول میں رابطہ حقیقی کا پتہ لگانا اور اس امر کا مدعی ہونا کہ معلول اپنے علت سے کبھی کسی حل میں علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ قطعی اور یقینی امر نہیں یہ صحیح مان لیا جائے تو آج ہزاروں گذشتہ تحقیقات باطل قرار نہ پاتیں بلکہ روزمرہ معلولات کے علل میں انسانی تجربہ و مشاہدہ کا مختلف ہونا ہمارے اس دعویٰ کی پوری پوری تائید کرتا ہے اس لئے ہم کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ جل امر کو ہم خرق عادت دیکھ کر متعجب ہوتے ہیں اس کی واقعی کوئی علت نہیں۔ گو وہ علت سلسلہ اشیاء مادی کے قانون میں مندرج ہو۔ یا اشیاء غیر مادی کے سلسلہ قانون میں۔ ہاں اعتراض اس صورت میں مضبوط ہو سکتا ہے کہ ہم خرق عادت میں معلول کا بلا علت وقوع میں آنا تسلیم کر لیں۔ مگر ہم ایسا نہیں مانتے ہمارا قویہ دعویٰ ہے کہ خرق عادت ایک معلول ہے اور اس کی حقیقی علت مشیت الہیہ ہے جس سے اسباب خفیہ ایسے طور پر عمل کرتے ہیں کہ روزمرہ تجربہ و مشاہدہ کے سلسلہ میں ہم انہیں نہیں لا سکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایسے امور کے لئے کوئی سلسلہ قانون نہیں زیادہ سے زیادہ مخالفت یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ اس سلسلہ قانون کا اسے علم نہیں سونہ ہو اس کے عدم علم سے اس سلسلہ کا بطلان لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جہاں اور بھی ہزاروں امور کی علت انسان پر مخفی ہے ان میں خرق عادت کی علت بھی نامعلوم ہے مگر ہم کہتے ہیں کہ اس علت کا علم خواہ انسان کو حاصل ہوتا ہے اور ہر ایک شخص جو ایسے مقامات پر ترقی کرے حاصل کر سکتا ہے اور مخالف کا آئیہ لا تبدیل الخلق اللہ سے متک کرنا اسے کچھ بھی مفید نہیں کیونکہ اس آیت کا حقیقت معجزہ سے کسی قسم کا تعلق نہیں۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی غیر برگزیدہ قدرت نہیں رکھتا کہ فطرت اللہ کو بدل دے۔ تعجب ہے کہ مخالف نے کہاں سے یہ مطلب اخذ کر لیا کہ اللہ بھی

اسے نہیں بدل سکتا فطرت اسی کا قانون ہے اس لئے وہ حکم فعال لمبا یرید جب چاہے اپنے قانون کو بدل سکتا ہے اور اس مرکا دعویٰ ہونا کہ خدا ایسا نہیں چاہتا ہرگز قابل تسلیم نہیں کیونکہ یہ محض ایک دھوکا ہے جو مخالفین نے اپنی طرف سے بلا دلیل تراش لیا ہے۔ آیہ کل یوم ہونی نسان سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر حوادث وقوع میں آتے ہیں وہ سب کے سب اس کی قدرت عامہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور آیہ ولا یحیطون بشئ من علمہ بأوارز بلند پکار ہی ہے کہ ہم مقصور و ذات باری کا جو اس کے دائرہ علم سے خارج نہیں ہیں کسی طرح بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہ کہنا کہ قدرت ذات باری صرف انہیں قوانین کے اندر محدود ہے جن کو انسان ضعیف البیان نے بذریعہ تجربہ و مشاہدہ معلوم کیا ہے محض نادانی اور کم عقلی ہے۔ بھلا وہ خدا ہی کیا ہوا جو انسانی عقل کے تابع ہو کر چلنے لگا۔ ولو اتبع الحق أهواءهم لفسدت السموات والأرض ومن بهن۔ حق یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کا دائرہ قوانین فطرت غیر محدود ہے اور یہی ہمارا ایمان ہے۔ اگر ہم منکرین کی تصدیق کر لیں تو ہم کسی صورت میں خداوند تعالیٰ کو کامل الصفات تسلیم نہیں کر سکتے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں ان الوجوه اوسع من ان یحاط بہ اویسنونی احوالہ بجملة روحانیا او جسمانیا

۱۔ خواجہ جبریل کا ارادہ کرتا ہے اسے بلاروک ٹوک کر گزرتا ہے۔ ۱۲ منہ ۷

۲۔ ہر ایک دن وہ اپنی قدرت کی ایک نئی نشان رکھتا ہے۔ ۱۲ منہ ۷

۳۔ ذات باری کے علم میں سے لوگ کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ ۱۲ منہ ۷

۴۔ اگر حق ان منکرین کی خواہشات کا تابع ہو جاتا تو نظام عالم و رحم برہم ہو جاتا۔ ۱۲ منہ ۷

۵۔ سلسلہ کائنات اس امر سے بالاتر ہے کہ کوئی اس کا احاطہ کر سکے یا عالم روحانیات یا جسمانیات کو جتاہتا ادراک کر سکے۔ ۱۲ منہ ۷

نوٹ:- بعض مفسرین نے آیہ لا تبدیل لخلق اللہ میں لغتی کو مجھے نہی لیا ہے یعنی اللہ کی فطرت کو مرت بلو اس صورت میں مخالفت کا استدلال بالکل اڑ گیا۔ ۱۲ منہ ۷

منکرین کا خیال ہے کہ خدا
نے اپنے تئیں قوانین
فطرت کا پابند کیا ہے۔

یہ خیال کہ خدا نے اپنے تئیں قوانین فطرت کا پابند کر رکھا ہے
عموماً نیا چہرہ کی تحریرات میں نظر آتا ہے اور یہ ایک ایسی غلطی ہے جو
بہت سے مفاسد کی جڑ ہے نیا چہرہ ہر یکب آسمان سے وحی
نازل ہوئی تھی کہ خدا ان کے مجوزہ قانون فطرت کا پابند ہے یا

کب خدا نے ذوالجلال نے نیا چہرہ سے مشورہ کیا تھا کہ تو مجھے قانون سے باہر نہیں چلنے
میں اس دعویٰ کے مدعی کے ساتھ مباہلہ کرنے پر تیار ہوں کہ یہ خیال محض ذات باری پر ہتھام ہے
اور ایک ایسا افتراء ہے جس کی بنیاد پر خدائے قادر مطلق کی ذات ہر ایک عجیب سے متصف بتعلیم
کرنا پڑتی ہے قانون فطرت جس کو نیا چہرہ پیش کرتے ہیں ان کی اپنی محدود عقل جزئی کا نتیجہ
ہے۔ اللہ جل شانہ کی ذات بری ہے۔ کہ وہ ایسے ناچیز قانون فطرت کی پابند ہو جس کا مطلب یہ ہے
کہ وہ پابند ہو چکنے کے بعد عالم کائنات ہے بالکل علیحدہ ہو کر محفل ہو بیٹھا ہے۔ اس پر سوال یہ عائد
ہوتا ہے کہ ذات باری پر کونسی مجبوری عائد ہوئی تھی کہ وہ اس پابندی کو اپنی مشیت کے مطابق
وہ نہیں کر سکتا؟ اگر یہ مجبوری کسی خارجی امر سے عائد ہوئی ہے تو اس کا تسلیم کرنا باطل ہے کیونکہ
کوئی چیز ذات باری پر موثر نہیں ہو سکتی بلکہ وہ خود تمام اشیاء ممکنات میں موثر ہے اور اگر مجبوری
اس کی اپنی ذات کی طرف سے ہے تو یہ بھی مسلم نہیں کیونکہ اس صورت میں صفات کا حدوث لازم
آتا ہے حالانکہ صفات ذات باری قدیم ہیں۔ پس ہر دو صورت باطل ہیں اس لیے خداوند تعالیٰ کا
اپنے تئیں نیا چہرہ کے قانون مجوزہ کا پابند کرنا بھی باطل قرار پایا واللہ الحمد۔

منکرین آیہ ولن یجدوا عند اللہ
تبدیل سے بھی متکبر کرتے ہیں

جو شخص معجزات کے برخلاف آئینوں بتجدد عند اللہ
تبدیل سے متکبر کرتا ہے۔ میرے خیال میں وہ قرآن
شریف کے حقیقی مقصود کے سمجھنے سے بالکل بے بہرہ

ہے حاشا وکلا کہ اس آیت کو وقوع یا عدم وقوع معجزات سے کسی قسم کا تعلق ہو۔ اسکی آیت میں
خداوند کریم نے امم سابقہ کے عصیان پر عذاب بھیجنے کے قانون کو ذکر کیا ہے۔ چنانچہ یہ آیت

جایا ایسے ہی مواقع پر قرآن مجید میں آئی ہے مثلاً سورہ احزاب میں اسی آیت کے ذیل میں صاحب تفسیر کبیر لکھتے ہیں ہذا آلیس بدعا نکم بل ہوسنتہ جاریۃ وعاوۃ مستمرۃ تفعل بالملکذین ولن تجد لسنة اللہ تبدیلاً۔ اور اگر بالفرض اس آیت کو عام رکھا جائے تو پھر بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم سنتہ اللہ کا حصر کو نہ کر سکتے ہو؟ ہم اس امر کو بھی سنتہ اللہ کہتے ہیں کہ خدا الصدیق ابنیا علیہم السلام کے لئے ان کے ہاتھوں پر خرق عادت ظاہر کیا کرتا ہے تم کسی دلیل سے اس کی نفی نہ کرو۔

معجزات کی تقسیم
حسی اور عقلی میں

چونکہ انسان کامل ہر دو عالم یعنی عالم جسمانی اور عالم روحانی میں دیگر تمام بنی نوع سے ممتاز ہے اس لئے اس کے غیر معمولی کمالات کے آثار ہر دو صورت میں ظاہر ہوتے ہیں یعنی وہ باروۃ الہی اشیاء محسوسہ

میں تصرف کرتا ہے اور خالق و معارف الہیہ میں بھی۔ انسان کامل کا اعلیٰ سے اعلیٰ فرد نبی اللہ ہوتا ہے جس کے وجود کے ساتھ تمام زمینی و آسمانی کائنات وابستہ ہوتی ہے اور تمام منازل کے طے کرنے کے بعد اسے کائنات مادی و غیر مادی کی بادشاہت کے تخت پر بٹھایا جاتا ہے تب وہ حکم خدا تمام موجودات میں تصرف ہوتا ہے اس لئے اس کے کمالات مافوق العادۃ کا عالم محسوسات اور عالم معقولات ہر دو میں ظہور ہوتا ہے اور انہیں مافوق العادۃ آثار کمالات کا نام معجزہ حسی اور معجزہ عقلی ہے معجزات حسی سے وہ امور خرق عادت مراد ہیں جنکا ادراک حواس خمسہ ظاہری سے تعلق رکھتا ہے۔ اور معجزات عقلی سے وہ مافوق العادۃ امور مراد ہیں جنکو انسان اپنے مسلک اصول علوم و فنون پر ہرگز نہیں ادراک کر سکتا مثلاً بعض امور عیسٰی کی خبر دینا یا امور مبدیہ و معاد عالم کی حقیقت کو کھولنا وغیرہ۔

لہٰذا نبی اس عذاب کا نازل نہ ہاں ہی دعا کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ عادیۃ اللہ ہے جو انبیاء کے مخالفین کے ساتھ خدا کی طرف سے ہمیشہ جاری ہے اور یہ نہیں بدسے لگی۔ ۱۲۰

کیا صرف عقلی معجزات نبوت کے لئے کافی حجت نہیں؟

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ معجزات کو عقلی اور حسی میں کیوں تقسیم کیا گیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت عام ہوتی ہے جس میں جاہل سے جاہل اور حکیم سے حکیم تک شامل ہوتے ہیں اور سب کے سامنے خدا کی وحی کو بطور اتمام حجت پیش کیا جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس وحی کی تصدیق پر جو دلیل پیش کی جائے وہ بچائے خود ایسی ہو کہ نبوت دعوت کی مستلزم ہو سکے ورنہ تعلیم وحی حجت نہیں ٹھیر سکتی مگر ہم اپنے ذاتی تجربہ سے اس امر کا یقین رکھتے ہیں کہ عوام الناس حقائق و معارف کو بوجہ تصوفیم یا ضعف فطرت سمجھنے سے مطلقاً عاری ہوتے ہیں اس لئے عقلی معجزات ان کے لئے ہرگز حجت نہیں ہو سکتے بھلا ایک پہاڑی جاہل یا تعلیمیات قرآن مجید کے بحرہ ہونے کو کیونکر تسلیم کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہرگز اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت یا معارف و حقائق کس طرح انسانی طاقت سے بالاتر ہیں پس ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسا امر اس کے سامنے بطور حجت پیش کیا جائے جو اس کے حواس خمسہ کے مدارکات میں آ سکے اور جس کو وہ اپنے روزمرہ قانون عادت کے رو سے طاقت انسانی سے بالاتر یقین کر لے ورنہ بدول اس کے ایسے شخص کے لئے تصدیق وحی کی کوئی ممکنہ صورت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کے حالات میں ہیں یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ وحشی اور بدوی بلکہ بسا اوقات اچھے اچھے تعلیم یافتگان نے بھی انبیاء سے معجزات طلب کئے اور تعلیم وحی کی تصدیق کی چنانچہ احبار یہود نے بارہا حضور علیہ السلام سے معجزہ طلب کیا انہیں جواب ملا کہ کذب تمہارا شیوہ ہے تمہیں نشان نہیں ملیگا۔ برخلاف اس کے معجزات عقلی صرف ایسے لوگوں کے لئے ہو کر تھے ہیں جنہیں اپنے علوم و فنون پر پڑا گھمنڈ ہو اور وہ اس امر کے مدعی ہوں کہ انسانی عقل تحقیق حقائق کے لئے کافی ہو سکتی ہے اس لئے انہیں کسی غیر کے اتباع کی مطلقاً ضرورت نہیں چنانچہ ایسے لوگ اگر نہایت غور و غوض سے خالص انصاف کو مدنظر رکھ کر تعلیم وحی کی طرف رجوع کریں تو انہیں اس کے مان لینے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔

اس قسم کے واقعات کتب تاریخ میں سینکڑوں موجود ہیں کہ بڑے بڑے مخالفین نے بالآخر تعلیمِ حسی کو تسلیم کیا *۔

تعجب ہے کہ جو لوگ منکرِ معجزہ ہیں بسا اوقات قرآن مجید کو معجزہ تسلیم کرتے سنے جاتے ہیں مگر سوال ان پر یہ عائد ہوتا ہے کہ جب حقیقتِ معجزہ تھا ہے ہاں سلم نہیں تو تم قرآن مجید کو کیوں معجزہ تسلیم کرتے ہو؟ اگر اس سوال کے جواب میں یوں کہا جائے کہ ہم صرف عقلی معجزات کو تسلیم کرتے ہیں اور حسی کو نہیں مانتے تو یہ سوال عائد ہوگا کہ یہ خیال محض مکارہ ہے کیونکہ جو شخص عقلی معجزات کو تسلیم کرتا ہے اس جیسی معجزات کا تسلیم کر لینا بھی لازم آتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کلی اپنے جزئیات پر یکساں صادق آیا کرتی ہے یہاں معجزہ کلی ہے اُورسی اور عقلی اس کے جزئیات ہیں اس لئے قاعدہ منطقی کی رُو سے حسی خرقِ عادت بھی معجزہ میں داخل ہیں *۔

معجزاتِ حسی کیلئے ممکن امور کا تسلیم کرنا ضروری ہے؟ | معجزاتِ حسی کے لئے مفصلہ ذیل امور کی تصدیق ضروری ہے (۱) ہر ایک فعل جو عالم کائنات میں وقوع پذیر ہوتا ہے اللہ جل شانہ کے ارادہ سے صادر ہوتا ہے

اس لئے معجزہ کا ظہور بھی خداوند تعالیٰ کے ارادہ پر مبنی ہے (۲) نبی خدا کا فرستادہ ہوتا ہے جس کی تصدیق کے لئے عموماً خدا کی طرف سے اسے کوئی ایسا نشان دیا جاتا ہے جو انسانی طاقت کے دائرہ سے خارج ہوتا ہے (۳) ظہورِ معجزہ میں نبی کی ذات کو صرف اس قدر تعلق ہوتا ہے کہ وہ صدورِ فعل ذاتِ باری کے لئے واسطہ بنتا ہے۔ ان ہر سہ امور پر غور کرنے سے مخالفین کا وہ اعتراض بھی جاتا رہا کہ خدا کسی آدمی کے لئے خواہ وہ کوئی ہو قانونِ فطرت کو نہیں بدل سکتا۔ کیونکہ وہ آدمی اسی کا فرستادہ ہوتا ہے اور قانونِ فطرت اس کا اپنا قانون ہے پس ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ واقعی خدا کسی آدمی کے لئے اپنا قانون نہیں بدلتا چنانچہ معجزہ اس کا اپنا فعل ہے جو بعض تصدیقِ وحی اس کے ارادہ سے صادر ہوتا ہے قرآن مجید اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔ وَمَا

کان لرسول ان یأتی بایة الا باذن اللہ *

معجزات اقتراحیہ و غیر اقتراحیہ
 معجزات کی قسمیں ہیں (۱) معجزات اقتراحیہ (۲) معجزات غیر اقتراحیہ -
 معجزات اقتراحیہ وہ خرق عادات امور ہیں جو کسی مخالف کی استدعا پر نبی اللہ
 کے ہاتھ پر جاری ہوں مثلاً کفار کا حضور علیہ السلام سے شق القمر کا مستدعی
 ہونا جس کی تصدیق میں قرآن مجید مطلق ہے۔ قال اللہ تعالیٰ اقتربت الساعة والنشق القمر۔

لہ بعض منکرین اس آیت میں دلیل تاویل کرتے ہیں کہ الشق فعل ماضی ہے جو یہاں معنی استقبال متعل ہے کیونکہ
 جس امر استقبال کا وقوع یقینی ہو اس کو بصیغہ ماضی تعبیر کر دیا کرتے ہیں۔ یہ واضح ہو کہ ان لوگوں نے اہل فریبی
 سے کام لیکر ایک قسم کی ڈھٹ بندی قائم کی ہے جو سراسر باطل اور مبنی برالحاد ہے کیونکہ جس قانون فطرت
 کے رُو سے ان کے خیال میں شق القمر کا وقوع بزمانہ نبوت بطور معجزہ محال ہے اسی قانون فطرت کے رُو
 سے زمانہ مستقبل میں بھی محال ہے پھر تاویل سے کچھ قائدہ؟ علاوہ ان آیات مابعدہ ان یأتی بایة
 لیحضرنا ولیقولوا سمعنا مستمرا وکذبا واتبعوا الهواء ہمد کل امر مستقم۔ (یہ کفار لوگ اگر کوئی
 نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو بڑا مضبوط پائدار جاو و ہے انہوں نے اس نشان
 عظیم کو جھٹلایا اور اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی اور تمام امور اپنے اپنے موقع پر ہو کر رہتے ہیں) ان
 منکرین کے منہ توڑنے کے لیے حاضر کھڑی ہے۔ خدا تعالیٰ سے کوئی بات طے نہیں ہوتی۔ کیونکہ آیت
 مذکورہ بالا صاف بتلا رہی ہے کہ کفار نے شق القمر کو دیکھ کر انکار کیا اور کہا کہ پہلے معجزات تو جو تھے سو تھے
 مگر یہ معجزہ واقعی ایک ایسا جادو ہے جس کی نظیر کہیں ممکن نہیں یہی وجہ ہے کہ کفار نے بنصرہ مزید اطمینان ملک
 شام سے آئے والے قافلہ کے لوگوں سے بھی شق القمر کی بابت سوال کیا جنہوں نے کہا کہ ہاں بے شک ہم
 نے ایسا مشاہدہ کیا ہے تب ان کی صدا دہیسی بڑھ گئی اور اس کو سحر سحر کہنا شروع کیا جس پر مذکورہ بالا آیت نازل
 ہوئی کہ ان لوگوں نے ایک نشان عظیم کی تکذیب کی ہے اور محض خواہش نفسانی کی پیروی میں ایسی ویسی باتیں
 منہ سے نکالتے ہیں۔ اب منکرین پر یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ اگر شق القمر زمانہ استقبال میں وقوع پذیر ہوگا تو کفار نے

یا فرعون کا موسیٰ علیہ السلام سے نشان کا طالب ہونا اور آپ کا یہ بیضیا یعنی کھپتا ہوا ہاتھ گریبان سے

لاکس چیز کو جاو کہا اور کس امر کی تکذیب کی؟ کیونکہ جو امر بھی وقوع میں نہیں آیا اس کی نسبت تکذیب کی خبر دینا بالکل بے معنی بات ہے۔ بلکہ جملہ ”وان یروا.....“ الخ بہ آواز بلند پکار رہا ہے کہ خداوند کریم نے کفار کی ایک قدیم عادت انکار کا ذکر کیا ہے کہ وہ ایسے ایسے نشانات بارہ دیکھ کر ہمیشہ انکار کر دیا کرتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کفار قیامت کے آنے اور سلسلہ کائنات کے درہم برہم ہونے کا انکار کرتے تھے اور محال سمجھتے تھے کہ یہ تمام اجرام زمین اور فکلی کس طرح بالکل نیست و نابود ہو جائیں گے؟ خداوند کریم نے انہیں بطور اتمام حجت حضور کے ہاتھ شق القمر کا معجزہ دکھلایا جس میں قرب قیامت کی ایک زبردست دلیل مضمون تھی کہ جس طرح ایک کرم غظیم یعنی قمر تہارسی آنکھوں کے سامنے پھٹتا ہے اسی طرح زمین و آسمان کا سلسلہ بھی درہم برہم ہو جائیگا۔ چنانچہ تحریف سلسلہ زمین و آسمان کے متعلق قرآن شریف میں جایا آیات موجود ہیں۔ گویا آیت مذکورہ بالا تصدیق قیامت کے لئے بطور حجت ہے یہی وجہ ہے کہ آیت کا آغاز جملہ ”اتھربت الساعۃ“ سے ہوا ہے۔ اگر انشق بمعنی مستقبل ہوتا تو گو ہم دیگر علامات قرب قیامت کی طرح اس کو وقوع قیامت کی ایک علامت قرار دیکتے ہیں مگر اس صورت میں اسے معجزہ نہیں کہہ سکتے حالانکہ کفار کی تکذیب اور اسے سحر کہنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بصورت معجزہ واقع ہو چکا۔ نیز کتب احادیث سے متواتر اس معجزہ کا ثبوت ملتا ہے اور وہ احادیث صحیحہ ہیں اور نہ صرف کتب احادیث اہل السنۃ والجماعت میں اس کا مذکور ہے بلکہ کتب شیعہ میں ائمہ معصومین اہل بیت سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور صاف لکھا ہے کہ حضور مشرکین کو وقوع قیامت کی تلقین فرما ہے تھے جس پر انہوں نے فساد آسمان زمین کے متعلق آپ سے یہ نشان طلب کیا۔ صاحب تفسیر کبیر اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ ”والقہان اول دلیل واقوی مثبت لہ وامکانہ لایشت فیہ و قد اخبر عنہ الصادق فیجب اعتقاد وقوعہ وحدیث امتناع الخرق والالتیام حدیث المسامۃ“ یعنی قرآن شریف شق القمر کے بارہ میں ایک زبردست دلیل ہے جو اس کو ثابت کرتی ہے اور جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ اور خبر صادق کی خبر ہے اس لئے اس پر اعتقاد واجب ہے اور یہ قول کہ

محال کر پیش کرنا جس کا ذکر بارہا قرآن مجید میں آچکا ہے اور اس قسم کے معجزات عموماً ان لوگوں کے لئے حجت ہوتے ہیں جو بنی اللہ سے ایسے نشانات کی استدعا کیا کرتے ہیں اس لئے بصورت انکار ان کے لئے اکثر موجب ہلاکت ہو جاتے ہیں چنانچہ اس امر کا اشارہ قرآن مجید میں بالفاظ ذیل کیا گیا ہے۔ "وما نرسل بالکلیات الا متحولینا" (ہم آیات یعنی معجزات اقتراحیہ کو بغیر متحولیت عذاب صاویہ کیا کرتے ہیں) تو ریت میں آیا ہے کہ خدا کا امتحان مت کرو۔ اسی طرح ذیل میں مسیح علیہ السلام کا قول ہے کہ اس زمانہ کے شریر اور فاسق لوگ نشان مانگتے ہیں مگر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان نہیں دیئے جائینگے۔ یعنی ان پر عذاب نازل ہوگا وجہ اس کی یہ ہے کہ بنی اللہ صرف اتنا حجت کے لئے امت کی طرف مامور ہوتا ہے تاکہ مختلف لوگوں کی فطرت کا امتحان کرے کہ کون قائل تعلیم وحی ہے اور کون نہیں مگر لوگ انسا اس کا امتحان شروع کر دیتے ہیں جبکہ مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ نشاناتِ باری کو توڑتے ہیں اور حکمتِ تبلیغ وحی کو انہیں سمجھتے بھی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بارہ بار اس قسم کے نشانات سے جو محالات عادیہ ہیں کفار کو روکا گیا ہے۔ اور ان کو تعلیم وحی کی طرف بذریعہ نظر و استدلال توجہ دلائی گئی ہے چنانچہ سورۃ النعام میں اس کے متعلق دو ارشاد ہوئے ہیں۔ "قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک ان اتبع الا ما یوحی الی قل هل لیسئوۃ الا عینی والبصیر افلا تتفکرون" اس آیت

(یقیناً حاشیہ) ابراہیم مادی کا پھٹنا اور پھر آپس میں مل جانا محال ہے سو یہ لیموں جاہلوں کا خیال ہے بالضرع شق القمر کا انکار بالکل ایک بدیہی بات کا انکار ہے جو مستلزم تکذیب قرآن ہے۔ ہم ایسے فلسفہ کو جو موجب نکال آیات اللہ ہو بقایہ خصوص قرآنہ عین کفر والحاد سمجھتے ہیں۔ ۱۲ منہ *

۱۔ اسے پیغمبر! ان جاہلوں سے کہ دو کہ میں تو تمہیں یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس مال و دولت کے خزانے ہیں اور میں تو حیبِ جاہلوں اور نہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف خدا کی وحی کی پیروی کرتا ہوں۔ انہیں کہ دو کہ اندھا اور کوکبتا رہے نہیں کیا تم دلائل توحید الہی میں غور نہیں کرو گے؟ ۱۲ منہ *

سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ حقیقت نبوت میں داخل نہیں۔ ہاں لازم نبوت ہے کیونکہ حقیقت نبوت صرف شریعت الہی کی تبلیغ کا نام ہے جو حکم خداوند تعالیٰ کسی شخص پر واجب ہو مثلاً عدو کے مفہوم میں یہ بات داخل نہیں کہ وہ جنت بھی ہے ہاں جنت ہونا اس کو لازم ہے اور اگر اس کی حقیقت میں داخل ہوتا تو اور کوئی عدو جنت نہ ہوتا۔ یا میں سمجھو کہ اگر کوئی شخص کسی منصب پر اپنے تقرر کا دعویٰ کرے تو وہ لوگوں کو بادشاہ کا حکمنامہ دکھائیگا مگر یہ کبھی نہیں ہوگا کہ لوگ اسے یوں کہیں کہ ہم تمہارے حاکم مختار ہوئے تو اس وقت تسلیم کرینگے کہ تم اپنے اختیارات حاصلہ کو عمل میں لاؤ ورنہ نہیں۔ ہر چند اس حاکم کو وہ اختیارات متعلقہ حاصل ہیں جو اس منصب سے لازم قرار دیئے گئے ہیں مگر وہ نہیں بروقت ضرورت اپنے اپنے موقع پر استعمال کرینگا نہ یہ کہ جب کوئی دوسرا کہے تو جھٹل میں لائے۔ اسی طرح معجزہ منصب نبوت سے لازم ہے۔ اور حکم خداوند تعالیٰ نبی کے مقدرات میں ہے۔ مگر نفس دعویٰ نبوت سے معجزہ کا دکھانا لازم نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر کفار کی استدعا پر معجزہ دکھلایا گیا اور بعض مواقع پر یوں کیا گیا۔ قل سبحان ربی هل کنت الا بشراً رسولاً اس موقع پر جہاں لمحیں نے یہ استدلال کیا ہے۔ کہ یہ آیت عدم وقوع معجزہ پر دلالت کرتی ہے مگر بخیر لازم ال کہ یہ خیال بالکل الحاد اور دجل ہے جس کی تائید کتاب اللہ اور سنت رسول سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ایسے شخص نے محض جہالت کی وجہ سے حقیقت الامر سے انکار کر دیا ہے۔ ورنہ اس آیت سے ہرگز نفی معجزات پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس میں صرف کفار کو اکھڑن اور سیکڑی سے ہٹا کر اصل مقصود میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ تمہارے مختلف قسم کے سوالات متعلقہ معجزہ حقیقت نبوت سے وہ تعلق نہیں رکھتے۔ کہ تم اس کے انتظار میں حصول مقصود اور استفادہ سے بٹے رہو۔ بلکہ یہ تو ایک امر زائد ہے۔ جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی سے نبی اللہ کے ہاتھ پر بغیر اظہار قدرت کاملہ و مزید الطینان بطور اتمام حجت جاری ہو لگا رہا ہے اس لئے

یہ اپنے غیر کرد کہ میرا خدا پاک ہے میں تو مرنے والی آدمی ہوں جو خدا کی طرف سے بھیجی ہو کر آیا ہوں۔

تہیں استدعا سے باز رہنا چاہئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استدلال کرنیوالے نے لفظ بشر پر غور کیا ہے۔ اور لفظ رسول سے استدعا قبول و قنول ہو گئی ہے۔ کیونکہ لفظ رسول میں ہم معجزہ کو گوہر جزو نبوت فرض نہیں کر سکتے مگر لازم نبوت جزو کہتے ہیں۔ پھر کیونکر یہ استدلال اس آیت کو نفی معجزات میں پیش کرتا ہے۔ اگر استدلال اس نکتہ سے آگاہ ہوتا تو جان لیتا کہ اس کا استدلال از قسم جمع بین المتضادین ہے۔ کیونکہ اگر ادھر تو وہ کہتا ہے کہ یہ آیت نفی معجزات پر دال ہے۔ اور ادھر لفظ رسول مستلزم حقیقت معجزہ ہے۔ لہذا اخیط محقق و جہل صرفت پس حتیٰ کہ استدلال یہ ثابت نہ کرے کہ معجزہ لازم نبوت نہیں تب تک اس آیت سے استدلال نہیں کر سکتا ورنہ ایک منطقی پڑھا ہوا آدمی جانتا ہے کہ اس استدلال میں دو لازم آتا ہے کیونکہ نفی معجزات منحصر ہے اس آیت سے استدلال کرنے پر اور استدلال موقوف ہے نبوت سے نہ وہ معجزہ کے نفی کرتے پر او یہی دوسرے جو باطل ہے۔

مذکورہ بالا تقریر سے ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا کہ معجزات اقتراحہ جہال کی طرف سے بغرض متانہ بنی اللہ طلب کئے جاتے ہیں اور چونکہ اس قسم کا امتحان منافی حکمت ذات باری ہوتا ہے جو لیت نبی میں محفوظ ہوتی ہے اس لئے انہیں نہ جبر کیا جاتا ہے۔ کہ ایسی استدعا مستحکم کر دے۔ ورنہ بصورت وقوع تہا ہے منکر ہو جانے سے قوم کی قوم ہلاک کر دی جائیگی۔ چنانچہ صالح علیہ السلام کا معجزہ ناقہ کہ با آنکہ خود کفار نے استدعا کی اور پھر انکار کر دیا جس پر عذاب نازل ہوا۔ قلذلوہ فحقم وہا عذابہم علیہم ربہم بذنہم فسوھا یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات کفار کی استدعا پر معجزات اقتراحہ کا وقوع خدا کی طرف سے نہیں ہوا۔ کیونکہ خدا علیم جانتا تھا کہ یہ لوگ دیکھ کر بھی انکار کر دیں گے۔ اس لئے عذاب کا یہی ناظر و روی ہو جائیگا۔ مگر یہ رکاوٹ محض اللہ قدیر و حکیم کی عین مصلحت رحمت عامہ پر مبنی تھی۔ نہ

۱۔ کفر نے صالح علیہ السلام کو جھٹلایا۔ اور اذنتی کی کوپیں کاٹ ڈالیں خدا نے انہیں ان کے گناہ کے بدلے عذاب نازل کر کے محاکمہ کیا۔ ۱۲ منہ

اس امر پر کہ ان کی استدعا، مقابلہ قدرت ذات باری محال تھی۔ دیکھو قرآن مجید کس زور کے ساتھ
 امر کی تصدیق کرتا ہے۔ **وَأَنصُرُوا بِاللَّهِ وَحَدَّائِهِ لِيُمَهِمَّنَّ لَكُمْ حَاجَاتُ هُمَا يَدْعُو تَتَضَرَّعُونَ**
قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا يُشْعُرُ سَمْعُكُمْ إِذَا احْتَجَّ إِلَيْهِ لَكُمْ آيَاتُ اس آیت سے
 مفصلہ ذیل امور کا پتہ لگتا ہے (۱) کفار قیس کھاتے ہیں کہ معجزہ دیکھنے پر ایمان لائیں گے۔ (۲) معجزات
 صرف اللہ کے ارادہ پر مبنی ہیں۔ کیونکہ اصول توحید کی رو سے بدوں ارادہ الہی کوئی امر وقوع
 پذیر نہیں ہو سکتا (۳) خدا کو علم تھا کہ وہ معجزہ دیکھنے پر بھی ایمان نہ لائیں گے اس لئے انہیں نشان
 نہیں دیا گیا (۴) بصورتِ ظہور معجزہ ان کے انکار کرنے پر عذاب نازل ہوتا۔ کیونکہ خدا کے ساتھ
 قسم اور پیمان کو مضبوط کر کے توڑنا موجبِ زوالِ عذاب الہی ہوتا ہے (۵) نشان کا نہ دیا جانا
 صرف اسی لئے ہے کہ یہ لوگ دیکھ کر بھی منکر بنیں گے۔ وگرنہ بمقابلہ قدرت ذات باری ایک معمولی
 بات ہے اور صرف اتنے میں طے ہو جاتی ہے کہ انہما امرنا اذا دنا شياؤنا نفعل لہ کن فیکون
 اس ضمن کی تائید سورہ نمل کی یہ آیت ہے **وَمَا مَتَّعْنَاهُ نُرْسُلَ بِالْآيَاتِ الْآلَاءِ**
لَذَابِ بَعَالٍ أُولَٰوْنَ (تنبیہ) واضح ہو کہ یہ آیت صرف معجزات اقتراجیہ کے متعلق ہے اسے
معجزات غیر اقتراجیہ سے کوئی تعلق نہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی منکر اس کو عام معجزات کے متعلق قرار دے دیتے۔
منکرین برہمنی طور پر تمام حجت خرقِ عادت کے منکر یہ ہم حسب ذیل الزام قائم کر سکتے
 ہیں کہ آیا وقوعِ خرقِ عادت کا انکار کرتے ہو؟ کس
 بنا پر؟ اگر منکر یوں کہے کہ خرقِ عادت دائرہ قدرت ذات باری سے خارج ہو تو اس صیرت میں

لے اور وہ منکرین بڑے زور سے قیس کھاتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی نشان اپنی معجزہ ملا تو وہ ضرور ایمان لے لیں گے
 اچھے پیچھے انہیں کہہ دو کہ نشان تو اللہ کے قبضہ قدرت میں (یعنی خدا ان کو ہر گزرتا ہے) بھلا یہ نہیں کیا معلوم
 ہے کہ یہ لوگ نشان دیکھنے پر بھی ایمان نہیں لائیں گے؟ ۱۲ منکر ۵
 لہٰذا معجزات دیکھنے سے بجز اس چیز سے کسی چیز نے نہیں کہا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات کو دیکھ کر بھی لوگ تکار کرتے ہیں ۱۲ منکر

وہ مرتجع کافر اور بدایب مرتد ہے۔ کیونکہ ایسے امر کا انکار کرنا جس کو عقل محض عادتاً بید الوقوع سمجھتی ہو ایک امر ممکن کی قدرت باری سے نفی کرنا ہے اور اگر وہ یوں کہے کہ میں خرق عادت کا امکان تو ماننا جس گمراہ کے وقوع کا قائل نہیں ہو سکتا۔ تو اسے کہنا چاہئے کہ جب امکان ثابت ہے اور روایات صحیحہ ثابۃ شاہد ہیں تو تمہارا انکار نہیں کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر یہ بات یعنی سلسلہ روایات خرق عادت صرف اسلام ہی سے مخصوص ہوتا۔ تو پھر بھی ایک بات تھی۔ مگر تمام دنیا کے مذاہب اس امر پر متفق ہیں کہ پیغمبروں اور مقبولوں کے ہاتھ پر خرق عادت جاری ہوئے۔ اور کسی خاص خرق عادت کا انکار کر دینا موجب قبح نہیں کیونکہ یہ امر اس خرق عادت کی روایت کی اصلیت پر موقوف ہے مگر مطلق خرق عادت کا انکار سراسر ضد اور تعصب ہے۔ کیونکہ تمام کتب آسمانی جن امر کی تصدیق کرتی ہوں اس کے صحیح مان لینے میں صرف اس وجہ سے انکار کر دینا کہ وہ امر عادتاً وقوع میں نہیں آیا کرتا ایک نہایت حماقت اور جہالت ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ خرق عادت کا مصدر یا منبع صرف نبی اللہ یا ولی اللہ کی ذات ہو سکتی ہے اور وہ حجت علی المنکر قائم کرنے کے موقع پر بارادہ الہی ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اگر ایسے ہی روزمرہ عادتاً وقوع میں آیا کرتا تو پھر کیا حجت ہو سکتا تھا۔ یا اگر غیر نبی یا غیر ولی کے ہاتھ پر بھی جاری ہو سکتا تو تب بھی کیونکر حجت سمجھا جاسکتا تھا۔ کیونکہ اگر کوئی نبی اپنے دعویٰ کی صداقت میں یوں کہے کہ میری دعا سے اس سال بارش ہوگی اور بارش ہو جائے تو اس کو کون آدمی خرق عادت سمجھیں گے گا ہاں اگر نبی کسی برتن میں ہاتھ دھوئے اور اس کی انگلیوں سے پانی جاری ہونے لگے جس سے حاضرین سیراب ہو جائیں تو بیشک یہ امر خرق عادت ہے اور لفظ خرق عادت ہی خود پتہ دے رہا ہے کہ وہ عادتاً واقع نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ بطور معجزہ یا کرامت بھی واقع نہ ہو سکتا تو سچائے خرق عادت کے محال کے لفظ سے تفسیر کیا جاتا کیونکہ خرق عادت کے صرف یہی معنی ہیں کہ کوئی امر خلاف طریق مہو و وقوع میں آیا ہے۔ اور محال اس امر کو بولتے ہیں جس کے وقوع کو عقل کسی صورت میں بھی جائز نہیں رکھ سکتی جیسے کوئی کہدے کہ وہاں دو پانچ ہوا کرتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ معجزہ یا کرامت کبھی کسی محال عقلی کے متعلق نہیں ہوا کرتے۔ مثلاً

ایسا معجزہ یا کرامت کہ دو چار سے بڑے بالکل بے معنی بات ہے کیونکہ یہ قانون الہی غیر متبدل ہے
 بر خلاف انگلیوں سے پانی جاری ہونے کے کیونکہ یہ قانون الہی متبدل میں داخل ہے اور جو شخص مادہ
 اور اس کی مخلوق ہوئے اور قدرت و ارادہ ذات باری کے متصرف ہوئے کا یقین رکھتا ہے وہ جانتا
 ہے کہ یہ ایک ممکن الوقوع امر ہے۔ مگر صرف بطور خرق عادت نہ بطور دوام و لزوم کیونکہ متضرعین
 کے جب قدر اعتراضات قائم ہوتے ہیں وہ واقع ہوئے کو ضروری خیال کر لیتے ہیں اسی ایک غلط فہمی
 پر مبنی ہیں۔ یعنی کہ وہ لوگ ایسے امور کو بطور دوام و لزوم واقع ہونے کو ضروری خیال کر لیتے ہیں
 مگر یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس صورت میں تو وہ خرق عادت ہی نہیں ہوئے۔

اس مضمون کی دوسری دفعہ | مذکورہ بالا استدلال کی توضیح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ خرق عادت کا
 لغظوں میں توضیح | عدم وقوع یا تو نفس قدرت ذات باری کے رُوسے تسلیم کیا جائیگا۔
 یا کسی خارجی امر کے رُوسے۔ مگر نفس قدرت کے رُوسے اس کا

وقوع محال نہیں بلکہ ممکن ہے اور اس مکان میں کسی شخص کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ اور اگر عدم وقوع
 کی علت کوئی امر خارجی ہے تو اس صورت میں ذات باری کا یا بقول بعض دیگر صفات باری کا
 محصل ہونا لازم آئیگا حالانکہ اس کا قائل کوئی فلسفی نہیں ہوا کیونکہ ذات یا صفات باری کسی
 علت سے کسی طور پر بھی محصل نہیں۔ اس لئے وقوع خرق عادت نہ تو بالنسبتہ نفس قدرت محال
 ہے اور نہ بالنسبتہ امر خارجی۔ پس جب ہر ایک صورت میں امکان ثابت ہے تو محض اس کی عدم
 رویت پر وقوع کا انکار کر دینا سراسر جہالت ہے۔ الخضر قاضی ابن رشد اندلسی جس کی تتبع میں
 سید صاحب نے انکار معجزات کیا ہے کوئی دلیل خرق عادت کے محال ہونے پر قائم نہیں کر سکے
 مگر تعجب ہے کہ سید صاحب نے ایک قاضی اندلسی کے قول کو تو جھڑپ عرض استدلال میں پیش
 کر دیا اور ہر راہ ائمہ متکلمین کے استدلال امکان کو بالکل نظر انداز کر دیا اور لطف یہ ہے کہ سید
 صاحب نے اپنی تفسیر جلد اول میں حرف ابن بود سے اعتراضات پر بس کر دی ہے جو قاضی
 اندلسی نے قلمبند کئے ہیں اور متبیین کے دلائل کا پورے طور سے رد نہیں کیا۔ اور جہاں تک

مجھے معلوم ہے سید صاحب کا ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس سے خرق عادات کا عزم امکان ثابت ہو اور وہ اعتراضات جن کی بنا پر قاضی اندلسی نے انکار کیا ہے سب کے سب اس امر پر مبنی ہیں کہ وقوع معجزات سے ثبوت ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ ان کے خیال میں ان ہر دو امور میں بظاہر کوئی تعلق نہیں مگر قاضی صاحب اس امر کو مطلق نہیں سمجھ سکے کہ جس امر کو وہ انکار کی دلیل گردانتے ہیں یہی اثبات کی دلیل بن سکتا ہے کیونکہ نفس خرق عادات اس امر کی کافی حجت ہے کہ وہ فوق العادت ہیں اور ان کا فرق اعادہ ہونا اس امر کے یقین کے لئے کافی ہے کہ انسانی اصول معہودہ متعلقہ تجربہ و مشاہدہ سے خارج ہیں اس لئے وہ انسانی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ براہ راست ذات کامل الصفات حضرت رب العزت کے ارادہ کا نتیجہ ہیں جو تصرف فی الکائنات ہے اور اسی لئے وہ حجت ہے ۔

آجکل کے بعض سائنسدان جنہیں ہر ایک امر کی لم (کاؤ) دریافت کرنے کا چسکا ہے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ معجزات کو اصول تجربہ و مشاہدہ پر موازنہ کریں اور یہ ان کی محض ہوسناکی ہے کیونکہ اس پر وہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں ہم ایسے امور کو خرق عادت نہیں کہہ سکتے

بعض قادیانوں نے خرق عادات کو اصول تجربہ و مشاہدہ کے ذیل میں لپی کوشش کی ہے

کیونکہ فرض کرو کہ خیال سید صاحب موسیٰ علیہ السلام کے عمدہ سے گذرتے وقت مدو جزر کی کیفیت تھی تو اس کو خرق عادت کو بن یوقوت کہیگا کیونکہ مدو جزر ایک ایسا قانون ہے جس کا تجربہ بارہا کیا جا چکا ہے اور تعجب ہے کہ یہاں تو سید صاحب کو مدو جزر کی کیفیت کا سہارا مل گیا اور خیال خود سرخرو ہو پٹھے گو الفاظ قرآن صاف صاف اس خیال کی تکذیب کرتے ہیں مگر بعض دیگر مواقع پر جہاں کوئی بھی گنجائش نہیں مثلاً لاضی کا اردو ہاں جانا ہاں کیا کہیں گے؟ کیونکہ الفاظ قاذی ہی حیاہ تسمیٰ سید صاحب کو کہیں بھاگنے کا موقع نہیں دیتے اسی طرح ایک شخص نے یہ بیضا کی توجیہ میں یہ بیان کیا کہ فاسفورس سے موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ چمکتا تھا قصہ یہ اور اسی قسم کے سیکڑوں کہاسیں منکرین کی طرف سے سنی جاتی ہیں جنہیں کوئی تسلیم عقل کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔

مگر میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ کوئی خرق عادت کبھی اصول تجربہ و مشاہدہ کی ذیل میں داخل نہیں ہو سکتا اور مجھے وہ رد لا شرکائیہ کی قسم ہے کہ یہی حق ہے اور اسی پر اولین اور آخرین کا اتفاق ہے جو لوگ ارادہ ذات باری کو تصرف کل مانتے ہیں انہیں ہرگز اس امر کا مان لینا دشوار نہیں معلوم ہو گا کہ ارادہ باری اسباب مجہودہ اور اسباب غیر مجہودہ ہر دو صورت میں عمل کرتا ہے پس زیادہ سے زیادہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ خرق عادت اسباب غیر مجہودہ سے وقوع میں آیا مگر اسی کو ہم دلیل اعجاز دیتے ہیں کیونکہ اگر مجہودہ اسباب سے وقوع پذیر ہو تو وہ اعجاز نہیں ہو سکتا اور اس لئے تحت بھی نہیں "ذمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر"۔

امام فخر الدین رازی نے بھی بالانکہ خفقت خرق عادت کو مانتے ہیں کہیں کہیں معتزلہ کے دہلی کر امت کو اصول تجربہ و مشاہدہ کے ذیل میں لانے کی کوشش کی ہے مگر بحث ۴ ہاں اصول فلسفہ نبوت کے ذیل میں ایسے امور کا از حد یقین پیدا ہو جاتا ہے اور تب منطقی صغریٰ و کبریٰ کی کچھ ضرورت نہیں رہتی۔ سید صاحب ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ خرق عادت ایک قسم کی عجائب پرستی ہے جو ہر ایک مذہب کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور جس کو عقل ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ اسے سبحان الشہید صاحب نے مختصر الفاظ میں فیصلہ دیدیا اور متینین پر بھیجے کہ واقعی خرق عادت محال عقلی ہے۔ اسے حضرت جس امر کو آپ دلیل نفی گردان رہے ہیں وہ عین دلیل اثبات ہے کما ترم۔ اور لطف یہ ہے کہ سید صاحب نے یہ نہ بتلایا کہ کس شخص کی عقل معیار صداقت ہو سکتی ہے؟ اگر آپ کی عقل تسلیم نہیں کرتی یا آپ کے ہم مشرب فلسفہ دانوں کی تو الحمد للہ کہ اس سے ہرگز ہرگز کسی صورت میں نفی خرق عادت لازم نہیں آتی اور اگر عقل کی یعنی نوع انسان کی عقل جو بطور جنس مانو ذہبے اور جس کے ذیل لاکھوں بلکہ لاکھوں عقول جزئیہ داخل ہیں مراد ہے۔ تو ہم دعویٰ کے ساتھ یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ہمارا پلہ بھاری ہے۔ پھر آپ کا انکار کرنا کہاں تک آپ کے لئے مفید ہو سکتا ہے؟ اسے سید صاحب خدا آپ کو مغفرت نصیب

کرے آپ تو بڑے بھاری قلاسفر مشہور تھے مگر خرق عادت کے انھاریں آپ کی عادتیں بالکل بچوں کی سی باتیں ہیں۔ حق یہ ہے کہ سید صاحب کی نظر ہمیشہ عالم مادی کی کائنات اور ان کے فلسفی جوڑ توڑ تک محدود ہی ہے اور انھیں عالم روحانیت کے غراب کی طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ان امور میں جو روحانیت کا نتیجہ ہیں آپ کی تحقیق انھار محض سے آگے نہیں بڑھی۔

سید صاحب نے ایسا کیوں کیا | سید صاحب نے جہاں اپنی دہ بیتی سے مسلمانوں کی معاشرت اور تمدن پر نظر ڈال کر انہیں ایک مغربی حکومت کی معاشرت اور

تمدن کے رنگ میں رنگنا چاہا۔ ان کے مذہبی مسائل میں بھی ایک نئی تحقیق کی بنیاد قائم کرنی چاہی مگر افسوس کہ سید صاحب اس معاملہ میں کامیاب نہ ہو سکے اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ خود علوم جدیدہ کی تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھے اور جو کچھ تھا وہ محض اسی سنی سنائی باتوں کا ذخیرہ تھا۔ آپ نے کچھ علمی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا اور کچھ مغربی مصنفین کے ان خیالات کو ہم پہنچایا جنہوں نے نگاہ بیکہ مذہب اسلام پر نکتہ چینی کی ہیں۔ اور کچھ مشرقی متکلمین بالخصوص معتزلہ فرقہ کے استدلال کو جو عقائد میں زیادہ زور دیتے ہیں حاصل کیا۔ اس طرح ان کے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہو گیا جس پر انہوں نے موجودہ نئی پیدا ہونے والی امت کے خیالات کو جانچنا شروع کیا۔ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ مغربی علوم کی رو سے ایک دن ایسی تہذیب و عقلیگی کہ مذہب کی بنیاد کو بالکل ہالے جائیگی۔ کوئی ایسی برکت ہو جس سے تو تعلیم یافتگان ملک کو مذہب اور علوم جدیدہ میں کسی قسم کا مخالفت نہ معلوم ہو کیونکہ علمائے اسلام نے بھی فلسفہ یونان کے عام شائع ہو جانے پر ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ ان کا خود یہ قول مشہور ہے کہ میں نے جو کچھ کیا نئی امت کے لوگوں کی خاطر کیا ہے اس میں شک نہیں کہ اس خیال سے سید صاحب کی نیک نیتی کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر افسوس کہ جو کچھ آپ نے کیا وہ بقول

ع۔ جو چال ہم چلے سونہایت بُری چلے

عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق تھا۔ علمائے اسلام نے تو اصول فلسفہ یونان کو کہیں غلط

ثابت کیا اور کہیں ان کو صحیح تسلیم کر کے مسائل کو پایہ ثبوت تک پہنچایا۔ الغرض معتقدات قرآن و سنت کے

قرن اولیٰ کے بزرگان میں صحیح تسلیم کئے گئے تھے ان کو ان کی اصلی صورت سے بال بھر بھی ہٹنے نہ دیا
مگر سید صاحب نے یکوشش کی کہ سب پر پانی پھر دکھایا اور خم ٹھونک کر علمائے اسلام کے مقابلہ میں
نئے علم کلام کے موجب ہونے کا دعویٰ کیا۔ مگر کوئی حقیقت بین اگر بشرط انصاف دیکھے تو اسے معلوم
ہو جائیگا کہ محض انکار ہی انکار تو کوئی نئی ایجاد نہیں ہو سکتی۔ بات تو تب سچی کہ انہیں معتقدات کو علوم
جدیدہ کے اصول پر پائے ثبوت تک پہنچا کر یورپ کے دہریوں کا منہ توڑ دیتے یہی وجہ ہے کہ ایک
لورین مختصر میں نے یہ کہا تھا کہ سید صاحب کی تحریریں اسلام کے ان معتقدات کو ثابت نہیں کرتیں
جو عرصہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے رُوسے زمین کے مسلمانوں میں تسلیم کئے گئے ہیں مگر سید صاحب ایسا
کرنے پر مجبور بھی تھے۔ کیونکہ علوم جدیدہ کے نئے نئے دلربا کرشموں کے مقابلہ میں ایسے لوگوں کو
جو تعلیم مذہب سے نا آشنا ہوں اور سائنس و فلسفہ کی عجیب و غریب تحقیقات میں شب و روز منہمک
ہوں۔ تاکہ جن معجزات جنت و نار و غیرہ پر ایمان کے لئے مجبور کرنا آسان کام نہیں تھا گویا میلہ بٹنے
نہایت نیک نیتی سے مسلمانوں کی مذہبی مخالفت کا التزام اپنے سر لیا ۔

علوم جدیدہ کیوں | یہ سوال صرف علوم جدیدہ ہی سے متعلق نہیں بلکہ علوم فلسفہ قدیمہ
کے متعلق بھی اسی طرح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اکثر فلاسفہ قدیم بھی
خرق عادات کا رد کرتے ہیں؟

میں مادی دنیا کے اصول پر زیادہ توجہ مبذول کی گئی۔ اور علوم قدیمہ میں محققین کی توجہ عموماً فلسفہ
ذہنی تک محدود تھی۔ اور مادیات میں انہیں توجہ کم تھی لیکن یہ امر کہ خرق عادت محال ہے علوم
جدیدہ اور قدیمہ ہر دو میں قریباً ایک ہی صورت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اور ہر دو کی بنائے انکار صرف
ایک اصل پر مبنی ہے کہ علت و معلول یا سلسلہ اسباب میں سبب مسبب کا تعلق واجب اور غیر متناہک
ہے یہ خیال درحقیقت دو خیال کا مجموعہ ہے (۱) کوئی معلول یا سبب بغیر کسی علت یا سبب کے
موجود نہیں ہو سکتا (۲) معلول اپنی علت سے اور سبب اپنے سبب سے علیحدہ نہیں ہو سکتا اہل
فلسفہ کے ہاں یہ ہر دو امر ایسے مزہدی ہیں کہ انہیں ان کی پابندی کرنے سے مادی دنیا میں ٹہری

کامیابیاں ہوئیں۔ سائنس کے غرائب اور علم ہیئت کے عجائبات کا دلِ صرمت انہیں مذکورہ بالا ہر دو امور پر ہے علیٰ ہذا علمِ طب اور علمِ کیمیا کے مسائل کی تحقیق بھی انہیں ہر دو پر مبنی ہے چونکہ نئی نئی تحقیقات سے انسانی معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور محقق خزانہ کے دریافت ہونے پر لوگوں کا تجربہ بھی ساتھ ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس لئے قانونِ فطرت کا مفہوم اہل فلسفہ کے نزدیک صرف اپنی ہر دو امور تک محدود ہے اور وہ انہیں ہر ایک امر کی صداقت کا موازنہ کرنے میں کافی حجت تسلیم کرتے ہیں +

کیا ان ہر دو امور کا رد ممکن ہے؟

اس میں شک نہیں کہ یہ ہر دو امور صحیح ہیں۔ مگر اہل مذہب سبب اور مسبب کے درمیانی تعلق کے وجوب کے قائل نہیں ہو سکتے یعنی وہ اس امر کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے کہ سبب اور مسبب کے درمیان

ایسا تعلق ہے کہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا محال ہو۔ بلکہ وہ اس تعلق کو ممکن کہتے ہیں۔ یعنی مسبب اپنے سبب سے منفک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آج تک اہل فلسفہ کی طرف سے کوئی دلیل بجز فرس کے پیش نہیں کی گئی۔ کہ ہم چونکہ ایسا ہوتے دیکھتے ہیں اس لئے ہمیں اس کا یقین ہے۔ مگر یہ دلیل سچائے خود سخت کمزور ہے جس پر لکھا جا چکا ہے۔ کہ تجربہ اور مشاہدہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ درجِ قطعیت کو نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو انسانی تحقیقات میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہوا کرتا۔

مگر منکر صرف اس قدر کہہ دینے سے کہ علت و معلول کے لزوم پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی تسلی نہیں پاسکتا۔ کیونکہ وہ کہہ دیا۔ کہ اسے حضرت میں نے مان لیا کہ علت و معلول کے لزوم پر میرے پاس کوئی دلیل نہیں اور میں یہ بھی تسلیم کر لیتا ہوں۔ کہ معلول اپنی علت سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ مگر

اس امکان کو میں صرف امکانِ عقلی مان سکتا ہوں۔ امکانِ وقوعی تسلیم نہیں کرتا۔ یعنی یہ تو مان لیتا ہوں کہ خدا کی قدرت میں بلا باپ بیٹا پیدا کرنا داخل ہے مگر ایسا کبھی ہوا نہیں۔ گو معجزہ کہ امکانِ عقلی کے تسلیم کر لینے پر امکانِ وقوعی کا انکار کرنا محض ایک قسم کی دھت بندی ہے۔ کیونکہ روایاتِ معجزہ سے وقوعِ معجزہ ذکر امت ثابت ہے پس منکر جب تک روایات کو ناقابلِ صنعت نہ قرار دے

اس کے برخلاف حجت قائم رہیگی *

منکرین ایسی روایات کو تسلیم نہیں کرتے جن میں خرق عادات کا ذکر ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ ان میں خلاف عقل باتیں لکھی ہیں۔ مگر اس لغو وجہ پر یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ آیا کتابیں انکار کی وجہ روایات کا غیر معتبر ہونا ہے یا ان کا خلاف عقل ہونا۔ اگر خلاف عقل ہیں تو پھر امکان عقلی نہ رہا۔ اور اگر اصول روایت کے رُوسے غیر معتبر ہوں تو اس کا ثبوت منکر کے ذمہ ہوگا۔

یہ نزاع بجز اس امر کے طے نہیں ہو سکتا کہ منکرین سلسلہ علت و معلول کے درمیان لزوم کے قائل نہ رہیں مگر اس لزوم کو باطل ثابت کرنے کے لئے علم نبوت کی ضرورت ہے تاکہ منکرین صفات ذاتِ بابی کو مقرف مادہ تسلیم کر لیں۔ اور اس بات کا یقین کر لیں کہ صفات اللہ کی کیفیت عمل کو انسان ہرگز احاطہ نہیں کر سکتا بلکہ وہ لا انتہائی طور پر تصرف کرتی ہیں۔ اور تمام موجودات انہیں صفات کا علیحدہ علیحدہ مظہر ہیں۔ مگر یہ سب کچھ مسئلہ توحید کی تکمیل پر منحصر ہے۔

مسئلہ خرق عادت کے | ان بطور کے لکھتے وقت مصر کا مشہور پریچہ القطار مجریہ ۱۵ شعبان ۱۳۳۵
متعلق ایک فاضل کی رائے | خاکسار کو ملا اور حسن اتفاق سے اس نے بھی بعنوان من الممكن وقوع کلمات الاولیاء (خرق عادت ادبیا اللہ سے واقع

ہو سکتا ہے) ایک مضمون مندرج تھا جس کو مطالعہ کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بالکل سے

ع۔ جاناں سخن از زبان من میگوئی

کا مصداق تھا۔ چنانچہ جن امور پر خاکسار نے بحث کی ہے انہی امور کو مضمون انکار فاضل نے حسب ذیل پیش کیا ہے۔ جس کو پہلے یوں شروع کرتا ہے کہ

”اگر ہم اپنے اس موجودہ زمانہ کو جس کو عام طور پر روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے علمت کا زمانہ کہیں تو کچھ تعجب نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کچھ اس قسم کا طوفان بے تیزی اندھا چلا آ رہا ہے کہ اہل دین و تقویٰ نہایت حیران ہو رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیونکہ او مصر اور مصر کے بازاری لوگوں نے مذہب کی سرپرستی کا ذمہ لے لیا ہے اور پڑے پڑے دعاوی پھیلا کر مذہب کی صورت بدلتا چاہتے ہیں۔ الخ“

اس کے بعد فاضل مضمون نویس نے مذاہب ائمہ اربعہ کی غرضت پر بھی بحث کی ہے بدلائل خرق عادات کے متعلق منکرین کی نسبت یوں لکھا ہے۔ وان دعوی القصر لیت فی الکون الکشف الہر باطل لا یؤید عقل یعنی یہ مصلحان قوم یہ بھی دعوی کرتے ہیں۔ کہ ان اولیاء اللہ کاموں میں محکم الہی تعرف کرنا اور مکاشفہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن کو عقل نہیں مانتی الخ۔

پھر یہ لوگ یہ بھی دعوی کرتے ہیں۔ وانہ لا یجوز العمل بالاحادیث ولو كانت صحیحۃ فی جمیع مسائل الاعتقاد من غیر قید الخ۔

یعنی احادیث پر اگرچہ صحیح ہوں۔ معتقدات کے بارہ میں بلا کسی قسم کی رکاوٹ کے عمل کرنا ناجائز ہے بلکہ قرآن مجید کو قانون فطرت پر مطابق کرنا چاہئے یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور جن سے اسلام کو اس قدر زبردست پہنچ رہا ہے کہ اقوام غیر سے نہیں پہنچ سکتا۔ ہم اس موقع پر نہایت مختصر طور سے امر حق کو ظاہر کرتے ہیں۔ تاکہ وہ لوگ عبرت پکریں جو مادی دنیا کی لذتوں میں اس قدر مستغرق ہو گئے ہیں۔ کہ انہیں ضروریات دین سے پوری پوری غفلت ہو گئی ہے اور اپنے خیال قائم اور زعم باطل میں اپنی اس حالت کو اپنے حق میں بہتر سمجھے بیٹھے ہیں۔ اعلمہ وفقنا اللہ جمیعاً لطاعتہ ان قدرة اللہ تعالیٰ تتعلق بالممکنات تعلق تاثیر و ان من الممکنات وقوع الکرامات للاولیاء ومن قال بعد وقوع الکرامات لا اولیاء فقد اذاع قدرة اللہ تعالیٰ فی تعلقہا۔ وهو الممکن او ما سوى اللہ تعالیٰ ممکن الخ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو دنیا کی ممکنہ اشیاء سے یہ تعلق ہے کہ وہ ملن میں مؤثر ہے۔ (یعنی ممکنہ اشیاء کو حسب مشیت الہی وجود دیتی ہے) اور خوارق عادات کا وقوع (امر ممکن ہے۔ محال نہیں ہو سکتا) سو جو شخص قدرت ذات باری کی نسبت ایک امر ممکن کے وقوع کو محال سمجھتا ہے گویا اس کے ساتھ یہ منازعت کرتا ہے۔ کہ قدرت ممکنات سے متعلق نہیں ہو سکتی حالانکہ وہ چیز ممکن ہے۔ کیونکہ سوا ذات باری کے تمام چیزیں ممکن ہیں۔ کوئی محال نہیں اور سب کی سب بالارادہ

آہی وجود پذیر ہوتی ہیں۔ وخرق العادة جائز عند المسلمين مستحل عند الفلاسفة لان
ارتباط الاسباب بمسبباتها ممکن عند المسلمين ولوجب عند الفلاسفة فتن كان من
المسلمين فلا يخرج من عقيدتهم ومن كان من الفلاسفة فليعلم ان الاسلام
دين لا فلسفة۔

یعنی خرق عادات مسلمانوں کے نزدیک جائز یا ممکن ہے اور اہل فلسفہ اسے محال کہتے
ہیں کیونکہ مسلمان لوگ سبب اور مسبب کے تعلق کو ممکن تسلیم کرتے ہیں یعنی ایک امر کے بعد
جس کو سبب کہتے ہیں دوسرے امر یعنی مسبب کا وجود میں آنا عادت الہیہ میں جاری ہے
اگر اللہ چاہے تو دوسرا امر پیدا نہ ہو۔ یا بدون پہلے امر کے وقوع میں آ جائے اور اہل فلسفہ کے
نزدیک یہ تعلق واجب ہے یعنی پہلے امر کے ہونے پر دوسرے امر کا وجود ضروری ہے عقل
اس امر کو تسلیم نہیں کرتی کہ پہلے امر کے ہونے پر دوسرا وجود پذیر نہ ہو۔ سو جو مسلمان ہیں انہیں اپنا
عقیدہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور جو فلسفی ہے اسے یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اسلام ایک دین ہے
فلسفہ یعنی لمحدین کی بگو اس نہیں فالحنی الذی لا یحیی عندہ ہوا لا اعتقاد بالصحيح الذی
علیہ اهل السنة والجماعة بثبوت الکرامات للاولیاء۔ الخ۔ سو حق جسکے
تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ جس کے اہل سنت والجماعت معتقد ہیں یعنی کہ خرق
عادات ثابت ہے۔ کیونکہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم میں اس امر کو توجہ اتر
تسلیم کیا گیا تھا جس کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ البتہ معتزلہ کرامت کی نفی کرتے ہیں۔ اور
مجرزہ کو ثابت کرتے ہیں۔ سو یہ بھی اس لئے کہ پھر مجرزہ اور کرامت میں ماہ الامتیاز کوئی امر
باقی نہیں رہتا۔ (یہ محض باطل ہے جس پر انشاء اللہ بحث ہوگی) ثبوت خرق عادات کو قرون
متمادی نے تسلیم کیا۔ چنانچہ آج تک تمام اہل اصول فقہا محدثین مجتہدین کا اسی پر اعتقاد ہے اور
تعجب ہے کہ بعض جاہل لوگ کیونکر لمحدین کے دام میں آ جاتے ہیں۔

یہاں تک میں نے فاضل مضمون لکھنے کے جتنہ فقرات کو بطور خلاصہ کے لکھ دیا ہے

ناظرین معلوم کر چکے ہونگے کہ اہل حق خواہ کہیں ہوں ہمیشہ ایک ہی مذہب رکھتے ہیں۔ کیونکہ خاکسار نے انہیں باتوں کو تفصیل وار قلمبند کر دیا ہے۔

اہل باطن کے طریق پر اہل باطن جو حقیقت اشیا کو کما حقہ دیکھتے ہیں اس امر متفق ہیں کہ موالید ثلاثہ یعنی حیوانات۔ نباتات۔ جمادات وغیرہ مخلوقہ علیحدہ روحیں رکھتے ہیں جو ایک نوع کی نہیں ہیں۔ اور اس امر

کا ثبوت آیات قرآن و احادیث صحیحہ سے بخوبی ہوتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وان من شیئ الا یسبح بحمدہ ولو لکن لا نفقہون تسبیحہم۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ اشیا مانند تعالیٰ کی تسبیح پکارتی ہیں صرف اتنی بات ہے کہ ہر ایک نوع کی تسبیح کا طریق وہی تسلیم کیا جائیگا جو خدا نے اس نوع سے مخصوص کر دیا۔ کیونکہ طریق کا اختلاف موالید ثلاثہ کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ ورنہ بلحاظ تصرف ارادہ باری سب ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ نوع انسان فیکہ مادی موجودات کی نسبت کامل روح رکھتا ہے جو حقائق و معارف تک ترقی کر سکتی ہے۔ اور دوسرے حیوانات کو صرف ایک ضروری حد تک فہم اور شعور دیا گیا ہے جن سے وہ اپنی ضروریات زندگی اور جلب منفعت اور دفع مضرت میں قادر ہو سکیں اور پھر ان حیوانات میں بھی فہم اور شعور کے مدارج ہیں۔ چنانچہ فہم تجربہ سے دیکھتے ہیں کہ گھوڑے اور گدھے کا شعور ایک نہیں ہوتا۔ پھر اس طبقہ سے جب نیچے اترتے ہیں اور نباتات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی لوازم کی رو سے مدارج ہیں مگر حس و حرکت ارادی جو حیوانات کے لوازم تھے اس قدر خفیف درجہ تک باقی رہ جاتے ہیں۔ کہ ہم یہ خیال رکھتے ہیں کہ ان میں حس و حرکت مطلقاً موجود نہیں۔ اور پھر جمادات کی نسبت ہم یقین ہو جاتا ہے کہ ان میں حس و حرکت نیز نشو و نما کا خاصہ خدا نے رکھا ہی نہیں اور اس لئے وہ کوئی روح بھی نہیں رکھتے۔ مگر درحقیقت ایسا

لے ہر ایک چیز اللہ کی تسبیح پکارتی ہے۔ مگر تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔ ۲۰ منہ

نہیں کیونکہ کسی وصف کا بغایت خفیت الاثر ہونے کے اس کی کلی نفی نہیں ہو سکتی۔ یوں سمجھو کہ خداوند کریم نے کمالات کے رُوسے موجودات میں مختلف طبقات پیدا کئے ہیں اور کچھ نہ کچھ کمال ہر ایک کو حاصل ہوا ہے۔ یہ طبعی تربیت بعینہ اسی طرح ہے جس طرح زمین کھوٹے وقت پہلے خشک ہوتی آتی ہے۔ پھر تر پھر کسی قدر زیادہ تر پھر کھڑ پھر ب سے آخر پانی۔ لیکن کچھ نہ کچھ رطوبت ہر ایک درجہ میں موجود ہے گو سب سے پہلے درجہ میں ہیں یقین ہوتا ہے کہ رطوبت نام کو بھی نہیں شیخ اکبر لڑی کتاب فتوحات کے آٹھویں باب میں لکھتے ہیں :-

ان المسئى بالجہاد والنبات عندنا لا سمار وراح لطنت غیر اوداك
اهل الكشف اياها فی العادة فلا یحس بها مثل ما یحس بها من الحيوان
فاكل عند اهل الكشف حیوان ناطق بالحق ناطق غیر ان هذا المراج
المخاص لیسى انساناً

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ جمادات اور نباتات بھی درجہ میں رکھتے ہیں جو اہل کشف کے سوا دیگر لوگوں کے ادراک سے مخفی ہیں۔ اور تمام اشیا انہیں پہنچنے والے حیوان بلکہ زندہ نظر آتے ہیں۔ منجملہ ان کے اس خاص وضع اور مزاج کا نام انسان رکھا گیا ہے ورنہ سب کو یہی لوازم حاصل ہیں۔ گو خفیت درجہ میں پھر ایک دوسرے مقام پر یہ لکھتے ہیں فالجہاد والنبات ذو حیوة وادراك فی الیامن کافی الظاہر ای فی جسد یعنی جمادات نباتات بھی زندہ ہیں اور ادراک کرتے ہیں مگر یہ صفات ان میں نہایت خفی ہیں ظاہر کل حیوانی میں ان کا کوئی اثر معلوم نہیں ہوتا۔ ملا صدرا شیرازی رسالہ قضا و قدر میں لکھتے ہیں :-

اعلم ان اثبات الشعور والادراك لجميع الموجودات حتی الجہادات والنباتات
علی ما یلزم من القہان والاحادیث مباہلت علیہ المباحث البرہانیة
وتبہیات العلوم لذوقیہ وایداع المقامات الکشفیة وهو مذہب
کثیر من المحققین لصاحب الاشراف والمحقق الطوسی والعلامة الطہرانی

وصاحب المحاکمات وابن کمونہ وطلالہ کلمات البغدادی و ذوق جمہ غفر منہ المکاشفین
منہم الشیخ العارف والمحقق المکاشف محی الدین ابن العربی ومتابعوہ *

اس عبارت کا ترجمہ واضح ہے الحاصل تمام نامی موجودات کو اپنی اپنی نوع کے مطابق صاحب
روح تسلیم کر نیک خیال پُرانا اسلامی مسئلہ ہے جس کا منبع قرآن و سنت ہے۔ اگر خوف طوالت نہ
ہوتا تو میں اس مسئلہ کے اثبات میں اور بھی کئی ایک قول مع دلائل نقل کرتا مگر بقدر ضرورت
یہی کافی ہے۔ بہر حال میں نے اس طریق استدلال کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ آج کل کے
محققین یورپ بھی اپنی تحقیقات سے اس نکتہ تک پہنچ گئے ہیں چنانچہ یہ عام خیال اہل فلسفہ کے
اذہان میں جم گیا ہے۔ کہ نباتات اور حیوانات بھی بیرون اشیا کے اثر سے اسی طرح متاثر ہوتے
ہیں جس طرح حیوانات۔ المنار قاہرہ کے مشہور پریس انگلستان کے ایک بڑے فلاسفر کا
مضمون اسی موضوع پر عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے اور اس کو پڑھ کر مجھے بڑی غشی
اس لئے ہوئی تھی۔ کہ مغربی محققین ڈیڑھ ہزار سال بعد اس نکتہ کو معلوم کر سکے ہیں جبکہ امی عرب
علیہ السلام نے ہدیہ وحی آسمانی دنیا کے سامنے اس وقت پیش کر دیا تھا۔ کہ ابھی آنیوالی
قوموں کی علمی ترقیات کا بنیادی پتھر بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ آج کل حکمائے یورپ بھی اس نکتہ
تک پہنچ گئے ہیں کہ ہمارے اطفال و اصوات کی مثالی صورتیں ان اشیا میں قائم ہو جاتی ہیں
جہاں اطفال و اصوات کے ظاہر ہونے پر وہاں موجود ہوتی ہیں اور حضور رحمۃ العالمین نے اس
خیال کو جہاں عرب کے سامنے یوں پیش کر دیا تھا کہ تم جس جگہ پر کسی گناہ کرو گے قیامت کے
دن وہی جگہ تمہارے برخلاف شہادت دیگی اس لئے بہتر ہے کہ اس کا کفارہ ادا کر دو یعنی اس جگہ
پر نیک کام بجالاؤ تاکہ نیکی کی شہادت بھی تمہارے حق میں بدی کے مقابلہ قیامت کے دن گذر سکے
بعض مفسرین نے آیہ یومئذ یحدث اخبارہا کی ذیل میں بھی یہی معنی لکھے ہیں *

رسالہ حمیدیہ میں جو ایک مصری فاضل نے لکھا ہے اور جس میں مولف نے مسائل اسلام کو
نئی طرز پر موازنہ کر کے شائع کیا ہے کہ اہل امریکہ نے بعض ایسے نباتات و حیوانات کا وجود

دریافت کیا ہے جن میں بہت سے حیوانی خواص تجربہ کئے گئے ہیں جن کو قبل ازیں محض طبقہ حیوانات تک محدود رکھا گیا تھا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ سانی تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں اہل فلسفہ کی کاسہ لیبی کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ اہل فلسفہ ایک نجاست خوار قوم ہے۔ جو دنیا پر خدا کی زندہ نعمت کا نمونہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ معرفت الہی کی چاشنی سے بالکل محروم ہوتے ہیں اور کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتے اور نہ انہیں اطمینان قلب کا درجہ کبھی نصیب ہو سکتا ہے اور نہ آخرت کی نجات۔ پس اگر انہیں ایسی باتیں اب ثابت ہو گئی ہیں تو ہماری بلا سے۔ ہم تو انہیں سڈا س اور پاجانہ میں پھینک دینے کو تیار ہیں۔ کیونکہ ہماری دینی اور دنیوی حاجتوں کے لئے قرآن پاک پورے طور پر مشغول ہے اور تمام عقدے اس کی بدولت حل ہو جاتے ہیں پھر ہم کیوں کسی غیر کے دست نگر رہیں؟

مذکورہ بالا اصل کی تصدیق جس کو حضرات اہل تصوف نے تسلیم کیا ہے حضور علیہ السلام کے بعض ان اقوال سے بھی ہوتی ہے جو بصورت آداب و احکام شرعیہ آپ نے ارشاد فرمائے کیونکہ جب ان کی علت کا پتہ لگ جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے کسی نہایت دقیق راز تک اس کا سراغ ملتا ہے۔ مثلاً شریعت کا حکم ہے کہ جس مکان میں کوئی مردیشی یا چوپائہ بندھا ہو اس میں عورت سے وطی کرنا مکروہ ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس سے حضرات صوفیہ کرام کے مذکورہ بالا اصل کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ حیوانات میں بھی غیرت و حیا جو انسانی اخلاق میں داخل ہیں موجود ہے اور اسی طرح یہ حکم کہ جن بہیمہ یا چوپائہ سے کوئی شخص وطی کرے اسے فی الفور ہلاک کر دو۔ آئینہ سواری وغیرہ کے کام میں نہیں لانا چاہئے۔ کیونکہ عامۃً ناس میں یا کم از کم اپنے نوع میں اس کے لئے موجب رسوائی ہے اور نیز مالک کے لئے بھی سالغرض مسئلہ مسلم ہو چکا ہے کہ تمام مادی اشیاء علیحدہ علیحدہ روحیں رکھتی ہیں اور تمام اپنی اپنی فطرت کے مطابق جی ناطق ہیں مگر اس امر کا تجربہ صرف علم کاشفہ پر مبنی ہے جو بارگاہ رب العزت سے بحر انبیا و اولیاء کے کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ دیکھو قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی زبان کی کیا ارشاد ہوتا ہے؟

وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِمْنَا مِنْتُمْ أَنْتُمْ كَلِمَاتٍ هَذِهِ الْوُجُوهُ الْفَضْلُ الْمُبِينُ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ بِرَحْمَةِ اللَّهِ وَبِحَقِّهِ

اس مسئلہ میں بحث کرنے کے لئے کئی اوراق سیاہ کرنا ایک معمولی بات ہے کیونکہ اس کی تصدیق کے لئے بہت سے ایسے امور پر نظر کرنا پڑتی ہے جو مختلف علوم سے متعلق ہیں مثلاً مسئلہ کشش اتصال سے جس کو عربی اصطلاح میں نظام جاذبہ کہتے ہیں اس مسئلہ پر ہم پوری پوری روشنی ڈال سکتے ہیں مگر میں اس کو زیادہ طول دینا پسند نہیں کرتا اور میرے مدعا کے لئے جو کچھ بیان کیا گیا ہے کافی ہے اس اہل عقلم کے تسلیم کر لینے پر غالباً مسئلہ متفرق عادت کا اہل تصوف کے طریق پر حل کر لینا کچھ مشکل نہیں معلوم ہوتا کیونکہ روحانی تاثیر کا سلسلہ تو ملاحظہ اہل فلسفہ بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے نبی اللہ جب بارادۃ الہی کسی خاص مادی شے میں تصرف کرتا ہے تو وہ شے اس کی روحانیت سے متاثر ہو کر اسی صورت یا وضع میں منتقل ہو جاتی ہے جس کا نبی اللہ نے ارادہ کیا ہو۔ کیونکہ جب یہ تسلیم کیا گیا کہ وہ جتنی ناطق ہے تو اس کا ایک دوسرے جتنی ناطق کے زیر فرمان ہونا جو اس سے کمالات میں کہیں بڑھا ہوا ہو مطلقاً محل تعجب نہیں۔ گویا ایک کی روحانیت دوسرے کی روحانیت پر غالب آکر اس کو ایسے آثار کا مصدر قرار دیتی ہے جو کسی دوسرے نوع کی مادی شے سے متعلق ہو سکتے ہیں کیونکہ مادہ میں ہر ایک صورت و وضع اختیار کر لینے کی قوت خدا نے دلویت رکھی ہے +

بارہ تو سوائے ہے مگر چونکہ عام طبائع مادیات کے ظاہری خواص تک محدود ہیں اس لئے

لے اور آپ نے فرمایا کہ اسے لوگوں میں پرندوں کی بونی سمجھنے کا علم دیا گیا ہے اور میں خدا نے سب چیزیں عیناً دیکھیں سب شک یہ خدا کی نمایاں مہربانی کا نتیجہ ہے۔ ۱۲ منہ +

مگر مجھے ان لوگوں پر سخت تعجب آتا ہے جو آفتاب کی تاثیر سے برف گھی موم وغیرہ اشیاء کا سیالی صورت میں منتقل ہو جانا تسلیم کرتے ہیں اور نبی اللہ کی روحانیت کو رتبہ نہیں دیتے۔ ۱۲ منہ +

انہیں کچھ نئی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر وہ حقیقت کوئی نئی بات نہیں انسان جب پہلے پہل کسی علم کے نئے مسئلہ کو دریافت کر کے اس کے عملی نتائج کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس سے واقعی تعجب پیدا ہوتا ہے مگر کچھ مدت پر وہ بات معمولی ہو جاتی ہے۔ سو اہل باطن کے ہاں تو باطن ایک معمولی بات ہے کہ نبی اللہ یا ولی اللہ کی روحانیت کیونکر دوسری مادی اشیاء کی روحانیت سے مؤثر ہو کر اس کو کسی دوسرے نوع کی مادی اشیاء کا مصدر آثار بنا دیتی ہے۔ ہاں ان لوگوں کے لئے یہ واقعی عجیب بات ہے جو حقائق اشیاء کا کچھ علم نہیں رکھتے۔ اسی اصل پر ستونِ حناء کا لازمی سمجھ ہیں کہ اس کا اور سوئے کا اور نیز سنگریزہ کا منکر کی مٹھی میں شہادت دینا وغیرہ ثالث میں المعینا الباصرۃ المذکورۃ فی کتب الاحادیث بالاسانید المعتبرۃ۔

اہل باطن کے استدلال کی بنا | اہل باطن اپنے اس طریق استدلال کی بنا ایک ایسے حقیقی اثر پر مبنی کرتے ہیں جس کے وجود کا تسلیم کرنا تعلیم و حق کی حقیقت کا ظاہر کرتا ہے۔ یہ بھی اثر اس روحانی طاقت کا

نتیجہ ہے جو انبیاء اور اولیاء مقربین کے نفوسِ قدسیہ کو روح القدس کے ساتھ اتصال پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ خرق عادات کا منکر اگر اس مسئلہ میں غور و تامل سے کام لے تو اس کو کامل یقین ہو جائیگا کہ خرق عادات کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ انہیں لوگوں کو نئی معلوم ہوتی ہے جو صرف تاثرات مادیہ تک محدود ہیں اور حقائق مجرودہ (لا لک و نفوس قدسیہ) اور ان کے عالم مادی میں مؤثر ہونے کا کچھ علم نہیں رکھتے۔ وہ صرف فلسفہ و سائنس کے پسند مادی اصول کا علم حاصل کر کے اشیاء مادیہ کے تاثرات میں حلیہ جاتے ہیں اور غلط یہ ہے کہ مادی سلسلہ سبب و مسبب کے متعلق بھی وہ صرف اسی قدر علم رکھتے ہیں کہ فلاں سبب یا علت کا نتیجہ فلاں مسبب یا معلول ہے

سید صدر علیہ السلام مسجد میں ایک ستون سے پیچھا لگا کر تشریف لے گئے تھے۔ بعد ازاں آپ نے اس پر لکھیہ لگانا چھوڑ دیا۔ چنانچہ وہ ستون روئے نکلا۔ آپ نے اسے گلے لگا یا تب خاموش ہوا۔ ۱۲ منہ۔

ہیں اس سے زیادہ انہیں کچھ معلوم نہیں یعنی وہ اس نکتہ کو ہرگز حل نہیں کر سکتے لہٰذا سبب یا علت کا توجہ طلب یا معلول ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ سبب اور مسبب میں کسی قسم کا تعلق ہے کہ اگر ایک امر (سبب) پیدا ہو تو دوسرا امر (مسبب) ضرور وقوع میں آئے۔ لیکن ایک علت کی نظر صرف ہیں تاکہ محدود نہیں رہ سکتی بلکہ وہ ان دونوں کے درمیان رابطہ حقیقی کی اصل علت کا مشاہدہ اپنی روحانی آنکھ سے کر لیتا ہے۔

کما قال عارف الروم

آبِ رَا آئے است کو می راندش

یعنی یہ پانی جو جاری ہے اس کے جریان کے لئے ایک اور پانی کی ضرورت ہے جو اسے چلائے اور وہ پانی جہی ارادہ الہی ہے جس کے اثر کا محسوس کرنا بدوین قلب پر آثار تو حید پیدا کرنے کے ممکن نہیں۔ اس نکتہ کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے بطون قرآن کی سیر کی ہو۔ اور لفظی مباحث سے ہٹ کر حقیقت کی طرف متوجہ ہو گیا ہو۔ ورنہ ظاہر بینوں کو بجز انکار کچھ حاصل نہیں ہے

گر ز سر معرفت آگاہ شوی - لفظ بگذازی سو معنی روی

مذکورہ بالا نفعی اثر کی تصدیق کے لئے عارف کامل شیخ محی الدین ابن عربی کی عبارت ذیل میں غور کرنا چاہیے۔ فاذا اتصل نفس قدسية به او ببعض ارواح اجرام السماوية والنفوس كان تأثيرها في العالم عند التوجه الاتصال تأثيرا يتصل به فتتفعل اجرام العناصر والنفوس الناقصة الانسانية منه بما اراد..... الخ یعنی جب نفس قدسی (ذہنی یا دلی کامل کی روح) رُوح القدس یا اجرام سماویہ کے ارواح و نفوس سے اتصال پیدا کرتی ہے تو اس اتصالی توجہ میں اس کی تاثیر عالم اجسام میں اجنیم اسی طرح ہوتی ہے جس طرح ان اشیاء کی تاثیر جو مرکبات مادیہ سے متصل ہو کر ان میں تاثیر کرتی ہیں۔ تب اجسام عنصری اور نفوس ناقصہ نفس قدسی کے عین منشاء کے مطابق اثر قبول کرتے ہیں یعنی ایک حقیقت سے دوسری حقیقت

کی طرف اجسام متقلب ہو جاتے ہیں *

اب ظاہر ہے کہ کسی نبی یا ولی کی طرف سے کوئی مادی چیز کسی جسم عنصری پر ایسا عمل نہیں کرتی مگر ایک اندرونی غنی اثر وہاں ایسا عمل کر رہا ہوتا ہے جس کے وجود کا ہم کبھی انکار نہیں کر سکتے اس امر کی حقیقت کے سمجھنے میں ان طبائع کو جو متعلق میں نظر کرنے کے عادی نہیں اور جن کا مبلغ علم محض مادی اشیاء کے جوڑ توڑ تک محدود ہے ممکن ہے کہ انکار ہو مگر میں نہایت وثوق اور اپنے یقین سے کہتا ہوں کہ حق اس سے آگے منجا وز نہیں ہو سکتا اور مجھے امید ہے کہ وہ طبائع جو قبول حق کے لئے تیار ہیں ان کے مان لینے میں متردد نہیں بیٹھیں گے۔ اور جو فطرتاً کج اندیش ہیں ان کو میں تو کیا سمجھا سکتا ہوں انبیاء علیہم السلام بھی انہیں راہ راست پر نہ لاسکے کیونکہ متقلب القلوب خود خداوند جانہ و تعالیٰ ہے جس طرف چاہے دلوں کو موڑ دے۔

والنعم ما قبل

ہر کرار روئے یہ بہبودے نداشت - دین روئے نبی سو نداشت

آج تو ہم پر دے دلائل خرق عادات کو ثابت کرتے ہیں اور منکرین انکار کرتے ہیں۔ آخر وہ لوگ بھی تو آدمی ہی تھے جو خرق عادات کو دیکھتے اور انکار کر دیتے۔ سر محض انکار سے تو کبھی کسی حقیقت کی نفی نہیں ہو سکتی *

خرق عادات کے طالب کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں؟

نبی اللہ صرف اتنا محبت کیا کرتا ہے۔ سو جن طبائع میں حقیقت شناسی کا مادہ و ولایت رکھا ہوتا ہے وہ کٹ جھتی سے باز رہتے ہیں البتہ ایک دوسرا گروہ

۱۔ چٹخی اثر عادات میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ ایک مثالیں کی دلی لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے مگر ہمیں بظاہر کوئی عمل سوائے یہ معلومہ کے نظر نہیں آتا۔ بچہ کے رونے پر یہاں اوقات ماں کے پستان سے دودھ ٹپک پڑتا ہے۔ ایک قسم کا سانپ ہے کہ اگر کسی حیوان کی طرف نظر کرے تو وہ حیوان وہیں مرجاتا ہے علیٰ ہذا القیاس ایک نبی اللہ یا ولی کامل کی طاعت کو جس قسم کا تصرف حاصل ہوتا ہے کہ کسی مادی شے کی حقیقت کو متقلب کر دے اس کے مان لینے میں کوئی وقت نہیں۔ ۱۲۔ منہ

ایسا بھی ہوتا ہے جو خرق عادات سے حق کی راہ میں جان کر رہتا ہے۔ ایسے لوگ بکثرت ہوتے ہیں اور ایک تیسرا گروہ ہے جو فطرانہ اولیٰ حق سے محروم رکھے جاتے ہیں انہیں خرق عادات سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ صدیق اکبر اور بعض دیگر عابد کبار گروہ اولیٰ کے لوگ ہیں۔ اور ابو جہل اور ابولہب وغیرہ نیر جی قسم کے مخالفین ہیں جنکی نسبت قرآن مجید میں "وان یروا کل ایۃ کاذبۃ منوا بها..... انہم داروہو یحکما ہے۔ بہر صورت مناسبت طبع جو تعلیم دینی کے قبول کے لیے طالع میں مرکوز ہوتی ہے۔ تصدیق ثبوت کے لیے شرط ہے۔ اگر یہ مناسبت طبع نہیں تو یقیناً سمجھو کہ ایسا شخص تعلیم دینی کو قبول نہیں کریگا۔

معجزہ ازہر قبر دشمن است - ہوئے جنسیت اپنے دل بردن است
موجب ایمان نباشد حشرات - ہوئے جنسیت کند جذب صفات
شیخ سرہندی مجدد الملت ثانی علیہ الرحمۃ اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں "خوارق و کرامات ازہر لے
جذب ہر دانی نیست مرہاں بہ مناسبت محتویہ منہذب ہر داند و اندکہ باں بزرگواران مناسبت ندر و
از دولت کمالت ایشان محروم است اگرچہ ہر از معجزہ خوارق و کرامات بہ منہذب
منکرین خرق عادات کا آیات قرآنیہ
آیات سے یہ استدلال کیا ہے کہ آیات قرآنیہ سے
منکرین خرق عادات کی نفی ہوتی ہے گو حسب موقعہ بخوبی
سے ضعف استدلال۔

اس کا بطلان بوجہا ہے مگر میں قرا زیادہ تفصیل سے اس موقع پر ان آیات کے متعلق بحث کرتا ہوں
ناظرین خوب غور سے کام لیں کیونکہ عموماً علوم عربیہ سے ناواقف اصحاب منکرین کی فلسفی تقریریں
پر تعجب کر کے ان کے ساتھ متفق ہو جاتے ہیں حالانکہ حقیقت حال کچھ اور ہوتی ہے حق کی پیروی
کرنا لازمی توفیق پر منحصر ہے مگر علمائے امت کا کام تاہم حجت ہے اور جو شخص خود علم نہیں رکھتا یا

۱۔ یعنی یہ لوگ تمام نشانات از قیل مجربات دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائینگے - ۱۶ منہ ۴۰

(۱) مینوع لفظ واحد ہے جس کے معنی چشمہ کے ہیں۔ سید صاحب نے چشمے بصیغہ جمع ترجمہ کیا ہے۔ کوئی کہ کتاب ہے کہ اصل مضمون میں اس غلطی سے کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ جواب بالکل غلط ہے لفظ لفظ کے ترجمہ کی غلطی سے مضمون میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) رقی مصدبہ یعنی ترجمہ کا ترجمہ سید صاحب ہنتر کرتے ہیں۔ غالباً آپ نے رقیہ یعنی افسوں سمجھا ہے۔ صراح میں ہے دتی برآمدن پر زربان۔ یعنی (رقیت فی التلمذ و فیاد و رقیار لقا مثله۔ علم لغت کی نادانگی کا نتیجہ ہے کہ ایسے صریح لفظ کا آپ کو تپہ نہیں لگا۔

(۳) کما زعمت کا بالکل ترجمہ چھوڑی دیا۔ یعنی تو آسمان کے ٹکڑے ڈالے جیسا کہ تو کہتا ہے چونکہ یہ الفاظ اس مر پر دلالت کرتے ہیں کہ جناب خیر علیہ السلام کے نزدیک بھی مثل تام ابنیا علیہم السلام کی آسمان ایک ایسی مہم چیز ہے جس کے ٹکڑے کر سکتے ہیں اور آپ بفضل خدا وجود آسمان کے محض تقلید محملان یورپ تکبریں لہذا آپ نے ہی بہتر سمجھا کہ ان الفاظ کا ترجمہ چھوڑی دیا ہے۔ بھلا اس دیندہ سی کا کوئی ٹھکانا ہے؟

(۴) تنزل علینا جو مستعدی ہے اور جس کے معنی "تو ہم پر اتار لائے" ہیں اس کو فعل لازم سمجھا اور ترجمہ "تو ہم پر اترے" سمجھا۔ علم صرف کی معمولی بات کو آپ نہیں جانتے اور بوجہ ناواقفیت علم خیر بھی خیال نہ آیا کہ لفظ کتاباً مفعول پڑا ہے جو فعل متعدی کو چاہتا ہے۔

(۵) لفظ قبیلہ کا ترجمہ بالکل چھوڑ دیا۔

ناظرین میں سے قیاس کر سکتے ہیں کہ جو شخص عربی زبان سے اس قدر ناواقف ہے وہ استدلال کیا خاک ٹگرے گا؟

اب میں سید صاحب کی وجہ استدلال کو بیان کرتا ہوں۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم سے کوئی معجزہ صادر نہیں ہوا مگر عا شد کلام بلکہ بیننا ہریت وثوق کے ساتھ بخدائے علم نازل یہ بات کہتا ہوں کہ ان آیات سے ہرگز نفی صدور معجزات کا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ ایک موٹی سی بات ہے کہ خاص کی نفی سے عام کی نفی لازم نہیں آتا۔

اگر کوئی کہے کہ فلاں عیسٰی میں زید موجود نہیں تھا تو اس سے ہرگز یہ بات نہیں کہہ سکتی کہ وہاں کوئی آدمی بھی موجود نہیں تھا۔ آیت اربعہ بحث میں اگر کفار کی استدعا پر وہ خرق عادت جنکی وہ تہذیبیست مذکورہ بالا میں کرتے ہیں وقوع میں نہیں آئے تو اس سے کہاں یہ بات نکلتی ہے کہ اور کوئی خرق عادت بھی وقوع میں نہیں آیا؟ دراصل یہ آیت پادریوں نے نگاہ و بیگاہ اعتراض کی صورت میں پیش کی ہے اور اب بھی کیا کرتے ہیں۔ سو یہ صاحب نے انہیں کی کاسٹرمی کی ہے مگر

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی ۔ کہاں راہ کہ تو میری تبرکستان است

ہاں یہ امر قابلِ بحث باقی رہا کہ کفار کی اس استدعا پر ان معجزات کا کیوں وقوع نہ ہوا؟ ہم چھپے لکھ آئے ہیں کہ معجزات وقوع کے ہیں۔ مگر اصرار جو کسی مخالفت کی استدعا پر واقع ہوا کرتے ہیں اور غیر اصرار جو بلا کسی استدعا کے بطور عاودۃ اللہ نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتے ہیں۔ مگر اصرار معجزات بوجہ مصلحت عدم ہلاکت قوم عموماً خداوند کریم ظاہر نہیں فرماتا کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہوتی ہے کہ معجزہ کے دیکھنے پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائینگے چنانچہ ایک موقع پر فرماتا ہے۔ و ما یستھرکم انھا اذا حیات لایؤمنون۔ یعنی تمہیں کیا معلوم ہے کہ یہ لوگ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائینگے؟ اور اگر ان کی استدعا پر معجزہ واقع ہو جاتا تو چونکہ وہ لوگ بالفاظ و اقسامہ اب اللہ حمد ایما یفملن جاستھم ایۃ لیؤمن بھا۔ خدا سے چھپان کر چکے تھے اس لئے اس عہد شکنی سے ان پر عذاب کا نازل ہونا قطعی ہو جاتا جس طرح صالح علیہ السلام کی قوم نے عہد شکنی پر اپنے نیش عذاب آہی کا مورد بنایا اور ایسی عہد شکنی پر عذاب کا نازل ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے چنانچہ مسیح علیہ السلام سے جب آسمانی دسترخوان کی استدعا کی گئی تو خدا نے کہا کہ اے مسیح! ان لوگوں سے کہ دو کہ اگر دسترخوان نازل ہونے پر بھی تم ایمان نہ لائے تو تم پر ایسا عذاب بھیج دوں گا جس کی نظیر دنیا میں موجود نہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا:۔ و ما نزلنا لایات الا متخوفاً۔ یعنی اس قسم کے معجزات

لے اور وہ اللہ کے نام پر مضبوط قہیں کھاتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی نشان (معجزہ) ملا تو ضرور ہی اس پر ایمان لے لیتے۔ ۱۴۰

اقتراح میں خوفِ ہلاکت مضمر ہوتا ہے کیونکہ ایمان نہ لانے پر نزلِ عذاب لازم ہو جاتا ہے سو چونکہ خداوندِ کریم اپنی رحمت واسعہ سے اس قسم کی ہلاکت کو پسند نہیں فرماتا اس لئے ایسے اقتراحِ معجزات عموماً کفار کی استدعا پر ظہور پذیر نہیں ہو اُکرتے۔ کوئی بوقوت جاہل اگر مذکورہ بالا آیت سے یہ ثابت کرنا چاہے کہ معجزہ کا صدور مطلقاً انبیاء علیہم السلام سے نہیں ہوا تو یہ سراسر اس کی جہالت ہے اور آیاتِ قرآنیہ میں تحریف +

اور لطف یہ ہے کہ خود سید صاحب نے جو دوسری آیت (وما منعنا..... الخ) لکھی ہے اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وقوعِ معجزہ ایک معمول ہے جو بشیئتِ الہی انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر جاری ہوا کرتا ہے مگر خدا فرماتا ہے کہ ہم تو ان کفار کی استدعا پر صرف اس لئے معجزہ ظاہر نہیں کرتے کہ یہ لوگ ہٹ و صرمی سے دیکھ کر بھی انکار کر دینے کے عادی ہیں اس لئے کوئی نتیجہ مفید ظہورِ معجزات اقتراح پر ان منکرین کے لئے مترتب نہیں ہو گا۔ امام فخر الدین ملازی نے اس تقریر کو نہایت عمدگی کے ساتھ قلمبند کیا ہے جس کا ترجمہ حسبِ لیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آیۃ سبحانِ دہیٰ هل کُنت الا یثکر اگر دسوکا۔ وہ جواب ہے جو کفار منکرین کو جنابِ پیغمبرِ خدا صلعم کی طوف سے دیا گیا ہے اور اس کی تقریر یوں ہے کہ اے منکر و اہتہار می مراد ایسے معجزات کی استدعا سے یہ ہے کہ تم ان امور کا لانا میری ذات سے طلب کرتے ہو یا یہ چاہتے ہو کہ میں خدا سے ان امور کی طلب کروں تاکہ میرے سچا ہونے پر یہ امور خرقِ عادت دلیل ہو سکیں پہلی صورت تو باطل ہے کیونکہ میں ایک بشر ہوں اور بشر کو ایسے امور اقتراح میں کچھ دخل نہیں۔ اور دوسری صورت بھی باطل ہے اس لئے کہ تم نے سب سے بڑے معجزہ (قرآن مجید) کی تکذیب کر دی ہے پس ان معجزات کی طلب گویا ایک مرغِ غیر ضروری کی طلب ہے جس کی کچھ بھی ضرورت نہیں سو تمہارا سوال ہی سر سے باطل ہے..... الخ

واضح ہو کہ خود اسی آیت سے یہ بات ظاہر ہے کہ جو کچھ کفار طلب کرتے تھے محض ازراہِ طعن و عناد تھا۔ ان کا ارادہ ہرگز یہ نہ تھا کہ ان معجزات کے صدور پر وہ ایمان لے آئیں گے۔ کیونکہ اول

تو انہوں نے یہ کہا کہ ”او ترقی فی السماء“ یعنی آسمان پر چڑھ دکھائے تو ہم ایمان لے آئیں گے
 اور پھر مساوت کا اظہار یوں کیا کہ ”لن نومن لم تہیک حتی تنزل علینا کتابا نفیوہ“ یعنی اس تیرے
 چڑھ جانے پر بھی ہم ایمان نہ لادیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ آتا رہ لادیں گے۔ ظاہر ہے کہ
 خود چڑھ جانا آسمان پر کیا کچھ کم معجزہ ہے پس جب ایسے معجزہ پر بھی ان کا ایمان لانے کا ارادہ نہ
 تھا تو صرف ظاہر ہے کہ ان کا ارادہ کسی طرح پر بھی ایمان لانے کا نہ تھا۔ اور یہ اقتراعات وہ محض
 بطور طعن و عناد کرتے تھے *۔

سچ پوچھو تو سید صاحب کو ایک خط سا ہو گیا تھا جس میں آپ کی عمر صرف ہو گئی اور ہمیشہ
 فہم معانی قرآن مجید میں اپنی کم لیاقتی سے یا جان بوجھ کر اخلائے حق کرتے رہے۔ دیکھو ایک دوسری
 جگہ پر حضور علیہ السلام سے وقوع معجزات کی کسی مضبوط دلیل بطور نص صریح موجود ہے۔ سید صاحب
 قبر سے اٹھیں اور اس کا جواب دیں یا لسی ہم مشرب بخیری کو رو دیا ہی میں نہائش کریں کہ وہ ان اعتراضات
 کا جواب دے کر انہیں سرخرو کر دے :-

قال اللہ تعالیٰ ”وَقُلْتُ اَتَدْعُوهُمْ اِلٰہًا مَّارَہُمْ کَمَا لَیْسَ لَیْمًا بِہٖ اَوَّلَ مَرَّةٍ..... الخ
 اس آیت میں لفظ اول مرۃ (پہلی دفعہ) سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضور علیہ السلام سے کفار کی
 اس استدعا سے پہلے انہوں نے معجزات دیکھے اور ایمان نہ لائے۔ اب بتلائیے سید صاحب اس
 پھندے سے کیونکر چھوٹ سکیں گے ؟

سید صاحب کا مذکورہ بالا آیت سے نفی معجزات پر استدلال کرنا اس وقت صحیح ہوتا جبکہ علمائے
 اسلام نے مفہوم رسالت میں یہ شرط قائم کی ہوئی کہ منکر کی استدعا پر معجزہ کا دکھانا بھی ضروری ہوتا

۱۔ مگر انہوں نے سید صاحب روئے صادق کا بھی انکار کرتے ہیں۔ ۱۲۔ منہ *

۲۔ ہم ان کے دلوں اور نگاہوں کو پلٹ دینگے (اور وہ ایمان نہیں لائیں گے) جس طرح کہ وہ قبل انہیں پہلی دفعہ
 دیکھ کر ایمان نہیں لائے ۱۲۔ منہ *

ہے مگر ایسا کسی نے نہیں کہا بلکہ معجزہ کو مفہوم رسالت سے خارج رکھا ہے اور اسی لئے وہ دلیل ہے
کیونکہ ہر آئینہ دلیل کو اپنے مدلول کا غیر متاثر دیتی ہے۔ اگر معجزہ رسالت کا جز ہوتا تو اثبات اشیء
نفسہ لازم آتا اور یہ باطل ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس امر کا کہ سید صاحب علم اصول سے ناواقف تھے
ان کے ہاں محض یورپ کی چند باتیں محیا رہی تھیں انہیں پر آیات قرآنیہ کو پرکھنا شروع کر دیا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ جابجا ٹھوکریں کھاتے چلے گئے ۔

بخمال سید صاحب قاضی ابن رشد اندلسی معجزہ کو دلیل نبوت قرار نہیں دیتے۔ اور صرف قرآن
ہی کو مثبت نبوت قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر معجزہ مثبت نبوت ہو تو چونکہ نبوت کا
نبوت معجزہ پر منحصر ہے اور معجزہ تب صحیح مانا جائیگا جبکہ پہلے نبوت کو تسلیم کر لیں تو گویا توقف اشیء علی نفسہ
لازم آئے گا اور تعجب ہے کہ اگر ان کے خیال کے مطابق ان سے یوں کہا جائے کہ قرآن تو بذریعہ نقل
تو آخر ہم تک پہنچا ہے اور اس کا دلیل ہونا موقوف ہے۔ نبوت نبوت پر اگر نبوت نبوت قرآن پر موقوف
ہو گا تو توقف اشیء علی نفسہ (ایک چیز کا اپنی ہی ذات پر موقوف ہونا جو باطل ہے) لازم آئے گا تو
گویا سید صاحب کو بخمال قاضی صاحب جس بات سے بھاگے تھے اس سے زیادہ ایک کڑی
بات کا سامنا کرنا پڑا۔ "فرضن المطہق تحت الخیڑاب"۔ مگر ہم تو کہتے ہیں کہ یہ تقریر کہ معجزہ
دلیل نبوت ہے اور نبوت دلیل معجزہ اس لئے توقف اشیء علی نفسہ یا دور لازم آئے گا بالکل باطل ہے
کیونکہ یہ قیاحت اس وقت لازم آتی جبکہ ہم نبوت کو دلیل معجزہ تسلیم کرتے بلکہ ہم تو صرف معجزہ کو دلیل
نبوت گردانتے ہیں یعنی یہ مانتے ہیں کہ چونکہ خرق عادت کا ظہور دعویٰ نبوت کے ساتھ ظہور میں
آیا ہے اس لئے دعویٰ اس دعویٰ کا پنی ہے گویا معجزہ دعویٰ نبوت کی تصدیق کرتا ہے مگر یہ نہیں
مانتے کہ چونکہ شخص نبی ہے اس لئے اس سے معجزہ صادر ہوا ہے۔ کیونکہ معجزہ امر خرق عادت کا نام

۱۷ یعنی ایک چیز خود اپنی ذات کو آپ ثابت کرتی ہے ۱۷ منہ ۔

۱۷ بارش سے بھاگا اور پرتالہ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ ۱۷ منہ ۔

ہے اور خرق عادت بالاتفاق جمہور علمائے اسلام اولیاء اللہ سے بھی صادر ہوتا ہے پس ایک چیز کا ثبوت اپنی ذات پر موقوف ہونا یعنی توقف الیشی علی النفس لازم نہیں آتا۔ سید صاحب کے استدلال میں غلطی ہے کہ وہ اپنے زعم میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ خیال علمائے اسلام اور خرق عادت صرف نبوی سے وقوع میں آتا ہے اس لئے ثبوت دلیل مستوفیہ حالانکہ معجزہ نبوت اور ولایت کے لئے لازم نہیں۔ اور یہ اعتراض کہ اگر خرق عادت انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ ہر دو سے وقوع پذیر ہو سکتا ہے تو پھر نبی اور ولی میں فرق کیا ہوگا کیونکہ پھر تو ولی کو بھی نبی کہہ سکتے ہیں؛ اس سوال کا جواب کافی دشمنی انشاء اللہ ایسی دیا جائیگا۔ بہر صورت مذکورہ بالا آیات سے سید صاحب کی غلطی استدلال کا بقتضیٰ تعالیٰ پورے طور پر تار و پود کھول کر دکھایا گیا ہے۔ مگر انصاف شرط ہے۔

خرق عادت انبیاء اولیاء میں کیا فرق ہے؟

اور اس کے امکان کو دلائل عقلیہ اور نقلیہ دونوں سے پایئے ثبوت تک پہنچا دیا ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ جس شخص کو خدا

نے حق پرستی کی ٹوہ نگاہ دی ہے وہ کبھی وقوع خرق عادت سے انکار نہیں کرے گا۔ حقیقت یہی مضمون کو بلاستیعاب پڑھنے سے صحیح رائے حاصل کی جاتی ہے۔ نامکمل مضمون کو چرچا کسی صحیح رائے کا معیار نہیں ہو سکتا۔

واضح ہو کہ جو خرق عادت انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر جاری ہوا کرتے ہیں ان کو معجزہ اور جو خرق عادت اولیاء کرام کے ہاتھوں پر جاری ہوں انہیں کرامت کے لفظ سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں۔ یہ ہر دو اصطلاحیں زمانہ نبوت کے بعد کی ہیں کیونکہ زمانہ نبوت میں یہ اصطلاح صرف لفظاً ہی نہیں محدود تھی جس پر میں نے بحث کر دی ہے۔ بعض نااہلوں نے انکار خرق عادت میں یہ بھی ایک خودویل پیش کی ہے کہ لفظ معجزہ و کرامت کا استعمال زمانہ نبوت میں نہیں تھا اس لئے خرق عادت کوئی شے نہیں مگر ایک سمجھ دار بخوبی جانتا ہے کہ دنیا میں کوئی علم جب باضابطہ کتب میں مدون ہوا کرتا ہے تو اہل باخیاں اور ہولت نیان کے لئے اصطلاحات وضع کئے جاتے ہیں مگر اس میں

لازم نہیں آتا کہ قبل از وضع اصطلاح ان امور کی حقیقت ہی معدوم تھی۔ علوم شریع کو چھوڑ کر تمام علوم کا یہی حال ہے کہ باضابطہ تدوین کے وقت اصطلاحات وضع کئے جاتے ہیں اسی طرح لفظ معجزہ و کرامت بھی علم کلام کی تدوین پر بغرض امتیاز وضع کئے گئے۔ عربی علم اصول کے جاننے والے اس مشہور جملہ کو جانتے ہیں۔ ”لا مناقشتہ فی الاصطلاح“

انبیاء اور اولیائے کرام کے خرق عادات میں بعض مستکملین نے کئی طرح فرق ظاہر کیا ہے مگر ان سب میں محمد علیہ بابہ الامتیاز صرف یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے خرق عادات کے ساتھ تحدیٰ قی ہے برخلاف اولیائے کرام کے کہ اس میں تحدیٰ نہیں ہوتی۔ اس کو واضح الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اگر خرق عادات کسی شخص کے ہاتھ پر مع دعویٰ نبوت جاری ہوں اور دعویٰ نبوت اس خرق عادات کو اپنے خصم کے سامنے یوں بطور حجت پیش کرے کہ وہ یعنی خصم کسی زمانہ میں ہرگز اس خرق عادات کا مقابلہ نہیں کر سکیگا بلکہ وہ یقیناً عاجز رہیگا تو ایسا امر خرق عادات معجزہ کہلائیگا اور اس طرح پیش کرنے کا نام تحدیٰ ہے۔ کرامت اولیائے کرام میں تحدیٰ نہیں ہوتی۔ بلکہ کرامت محض اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے صاحب کرامت کے متقرب الی اللہ ہونے کی دلیل ہے اور بطور انہماک اس عزت کے جو باریگاہ رب العزت میں ایسے شخص کو حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی نظروں میں عادۃ اللہ کے مطابق جاری ہوتا ہے اور اس وقوع خرق عادات کی علت وہی ہے جو پہلے ہم نے معجزہ کے لئے ثابت کر دی ہے بعض لوگوں نے کرامت اولیاء کا انکار کیا ہے اور معجزہ کا اقرار اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ بابہ الامتیاز ہر دو میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اور اگر خرق عادات کو غیر انبیاء یعنی اولیاء کے لئے بھی تسلیم کیا جائے تو معجزہ دلیل نبوت نہیں رہیگا مگر افسوس کہ انہوں نے تحدیٰ یعنی بابہ الامتیاز کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ جو دلی کامل ہو اور اخلاص و توحید و صدق و صفاء و دیگر تمام مراتب کمالات انسانی کو طے کر چکا ہو بصورتِ نبی نہ ہونے کے دعویٰ نبوت کر کے خرق عادات کا مالک بھی تسلیم کیا جائے۔ آج تک کسی دلی کامل صاحب کرامت نے دعویٰ نبوت نہیں کیا۔ اور اگر کوئی جھوٹا دعویٰ اٹھائے تو اسے خرق عادات نصیب نہیں ہوا۔ منکر کو چاہئے کہ کوئی ایسی نظیر

پیش کرے کہ کوئی ولی کامل صاحب خرق عادت بھی ہوا ہو اور وہ مدعی نبوت بھی ہوا ہو۔ میں دعویٰ سے ایسکتا ہوں کہ ایسا ہونا محالات عقلیہ میں سے ہے۔ خدا کے مقررہ قوانین میں ہرگز تغیر نہیں ہو سکتا اور اس باب میں قانون الہی یہی ہے کہ کاذب کے ہاتھ پر کبھی کوئی خرق عادت ظاہر نہیں ہوتا۔ عارف کامل شیخ علی ہجویری قدس سرہ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں اس مسئلہ نہایت لطیف بحث کی ہے۔ جس کی تشریح حربی پل ہے۔ فرماتے ہیں کہ معجزہ کے لئے شرط ہے کہ وہ دعویٰ نبوت کے ساتھ صادر ہوا اور کرامت کے لئے یہ شرط نہیں۔ ولی ولی ہوتا ہے اور بنی نبی۔ اور صرف خرق عادت ہی ہر دو میں وجہ امتیاز نہیں بلکہ دیگر بہت سے امور کے رُوسے ہر دو میں نمایاں فرق ہوتا ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ خرق عادت بنی کے لئے اس امر کی علت نہیں ہو سکتا کہ وہ بنی کسی دوسرے بنی سے زیادہ صاحب فضیلت سمجھا جائے بلکہ حق فضیلت جامعیت شریعت اور طے بلج قرب پر موقوف ہے۔ معجزات کی کمیت و کیفیت کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا کیونکہ کئی ایک انبیاء ایسے بھی ہوئے ہیں کہ ان کے خرق عادت بعض دیگر انبیاء سے بہت کم تھے مگر مراتب قرب میں انہیں بہتوں پر فضیلت تھی۔ اسی طرح ولی کے خرق عادت سے وہ ولی نبی کے ساتھ کبھی برابر نہیں ہو سکتا اور ولی کا مدعی نبوت ہونا محال امر ہے کیونکہ ولایت کے لئے صدق مقال شرط ہے اور کاذب لی نہیں ہو سکتا اور اگر ولی مدعی نبوت ہوگا تو اس کا مدعی ہونا نبوت کی تکذیب سمجھا جائیگا۔ اور یہ صریح کفر ہے اور تکذیب نبوت کی وجہ یہ ہے کہ ولی کی کرامت بنی کی حجت کے لئے موید ہوا کرتی ہے کیونکہ بنی جس طرح معجزہ سے اثبات نبوت کرتا ہے اسی طرح ولی کرامت سے جہاں ولایت کی تصدیق کرتا ہے۔ نبوت بنی کا بھی اثبات کرتا ہے۔ گویا ولی صادق اپنی کرامت سے اس بات کی تائید کرتا ہے چکی تائید بنی نے اپنے معجزہ سے کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محققین نے کرامت ولی کو عین معجزہ بنی قرار دیا ہے۔ کیونکہ کرامت ولی کے ظہور پر ایک ایماندار کو بنی کی صداقت کی دلیل ہاتھ آجاتی ہے اور اس کے لئے موجب تقویت ایمان ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جس طرح علوم شرائع کے حاملین ظاہر احکام شریعت

کے جاننے سے انبیا نہیں ہو سکتے اسی طرح کوئی دلی کامل صاحب کرامت ہونے سے بنی نہیں بن سکتا
گویا انبیا علیہم السلام کی وراثت ظاہری و باطنی کے الحاکم انبیا کی تصدیق نبوت کہتے ہیں اور ان
بزرگوں کی پیش کردہ حجت میں نبی کی حجت بھی جاتی ہے۔

اس تقریر کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ معجزہ کے لئے شرط ہے کہ نبی اس کو منکرین کے سامنے
بطور حجت پیش کرے۔ اور کرامت کے لئے شرط یہ ہے کہ ولی حتی الوسع اس کو حجتی سمجھے کیونکہ
معجزہ کا نتیجہ معجزہ دیکھنے والوں کے حق میں مفید پڑتا ہے۔ اور کرامت چونکہ حجت علی الغیر نہیں ہوتی
اس لئے اس کا فائدہ عموماً اس کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اولیاء اللہ ہمیشہ
اخفا کرتے رہے۔ کیونکہ عوام الناس کا فائدہ ہے کہ اس قسم کے خرق عادات کی طرف اصل غرض کو
چھوڑ کر زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور حقیقت و ولایت کو نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں نبی کو قبل از وقوع
معجزہ وقوع کی نسبت پتہ دیا جاتا ہے اور ولی کے لئے مرسوم نہیں۔ ولی تابع احکام نبی ہوتا
ہے اور اپنی طرف سے کوئی کسی قسم کا تصرف شرعی نہیں کر سکتا۔ برخلاف نبی کے کہ حسب تعلیم وحی
شرائع و دیانات کے احکام میں تبدیلی و تنسیخ اور ہر ایک قسم کا تصرف کرتا ہے۔ ولایت کا درجہ ہر
حالت میں نبوت سے کم تر ہے۔ اور اس لئے مدارج فضیلت میں بھی ہر دو متفاوت ہوتے ہیں ولی
صرف تعلیم نبی کی تجدید و تبلیغ کا فرض ادا کرتا ہے۔ نبی اور ولی کی مثال عینہ ایسی ہے۔ جیسے کہ ایک
بادشاہ کے دو ملازم ایک تو منصب علی پر کام کرتا ہو اور دوسرا پہلے کی زیر نگرانی ولی کامل بر درجہ
کمال متبع شریعت نبی ہوتا ہے۔ اگر اس کے معتقدات مخالف کتاب و سنت ہوں تو مردود ہے
اور جھوٹا۔ کرامت محض اللہ کی مہبت کا نام ہے۔ جس میں کتاب کو کسی قسم کا دخل نہیں اس لئے
بعض ظاہرین لوگوں کا یہ اعتراض یا کل نحو ہے۔ کہ خدا کسی کے لئے اپنے قانون کو نہیں بدلتا۔
کیونکہ ہم بھی یہی مانتے ہیں کہ خدا کسی کے لئے اپنے قانون کو نہیں بدلتا۔ مگر گفتگو یہ ہے کہ ہمارا تو دعویٰ
یہی ہی ہے کہ خرق عادت بھی قانون الہی ہے جو صرف انبیا و اولیاء سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ
کبھی نہیں بدلتا۔ رہا یہ امر کہ اس کے اسباب کیا ہیں۔ سو جب تک مدعی اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچائے

کہ اس بات کے اسباب صرف ہمارے تجربہ اور مشاہدہ تک ہی محدود ہیں تب تک حتمی حقائق کا اسباب مخفیہ کی نفی نہیں کر سکتا۔ جب یہ حال ہے تو زیادہ سے زیادہ مدعی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں ان اسباب ضروریہ کا علم نہیں سمجھتا ہو یا اس سے کوئی ترابی لازم نہیں آتی یا سی کلمہ کو فخر المتأخرین محدث مدہوی قدس سرہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یوں بیان کیا ہے۔ **وَلَكِنْ صَاقَ لَطَاقَ الْمُعْقُولِ عَنَّا بَرَعَهُ قَوْمًا فَكَلِمُوهَا أَوْ لَوْهَا وَقَالَ قَوْمٌ أَمَّا بِذَلِكَ وَإِنْ لَمْ نَدْرِ حَقِيقَتَهُ وَبَلِشْتَهُ بِهِ الْمُعْقُولُ عِنْدَنَا وَنَحْنُ نَقُولُ أَمَّا بِذَلِكَ كَلِمَةً عَلَى بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّنَا وَنُشَدُّ لَهُ الْمُعْقُولُ عِنْدَنَا** سید صاحب کی ایک فاش غلطی اسید صاحب نے اپنی تفسیر جلال میں ان عبارت کے ضمن میں ایک حضرت شاہ صاحب کی نسبت ایک اہم کریم کہ وہ بھی کرامات اولیا کا انکار کرتے ہیں اور لطف یہ کہ عبارت نقل نہیں کی صرف خطوط ہمالی میں یہ لفظ لکھ

دئے کہ اسی خیال پر شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حجۃ البالغہ میں کرامات اولیاء سے انکار کیا ہے۔ بغیر اس بطور سے اہم ناظرین کی توجہ ذیل کی عبارت کی طرف مبطل کرتا ہوں جس کا آغاز یوں ہوا ہے۔ **مِنْ هَذَا الْقِسْمِ سَوَالُ الْقَبْرِ وَزِنِ الْأَعْمَالِ وَالْمَرْوَعِ وَالصَّالِحِ وَالْمَرْوِيَّةِ وَكِرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ** یعنی وہ باتیں جو قرآن و احادیث کی رو سے صحابہ اور تابعین میں بلا کسی قسم کے احتمالات کے تسلیم کی گئی ہیں سوال قبر اور اعمال کا تولد اور پھر طر پر گذرنا اور اللہ تعالیٰ کا دیکھنا اور اولیاء اللہ کے کرامات ہیں۔ اب بتلائے حضرت شاہ صاحب کرامات اولیاء کا انکار کرتے ہیں یا اقرار؟ پھر دوسری جگہ حرق عادات نبیہ علیہم السلام کے ذیل میں فرماتے ہیں **وَكذلك لا وليا ملامتہ یعنی اولیاء اللہ کو بھی ایسے حالات دیئے جاتے ہیں۔ میں تو نہیں کہتا کہ سید صاحب نے ازراہ ناواقعی ایسا کیا ہے یا عداً مگر ایک مخالفت جو مسوئین**

لے لیکن مجرہ اور کرامات اور دیگر امور عالم برزخ بگمان اہل فلسفہ خلاف عقل ہیں اس لئے یا تو وہ بالکل منکر ہیں یا تاویل کرتے ہیں۔ اور ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ ہمارا ان چیزوں پر ایمان ہے۔ اور عقلی طرف سے اس پر دلیل رکھتے ہیں اور جن عقل کے علم بالکسب میں اس کی میزان میں یہ امور بالکل صحیح اور درست ہیں۔ ۱۲۰۰

کرنے کا حق رکھتا ہے یہ صاحب کو الزام تھا کہ ہرگز بری نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اتہام بھی اسی قسم کا ہے جو شیخ صاحب نے اپنی زندگی میں ہولوی علی بخش خان مرحوم کے سامنے صحیح مسلم پر یاد دہایا تھا۔

شیخ اکبر بن الدین بن عربی کے متعلق
سید صاحب کا ایک غلط خیال
سید صاحب نے شیخ اکبر کے متعلق بھی ایک ایسی ہی غلطی کی ہے آپ کہتے ہیں کہ شیخ اکبر کی تفسیر و روایت رکبہ اور سید از قیاس بالوں سے پڑے گرمیں کہتا ہوں۔

کہ غلط ہے۔ شیخ اکبر نے کہیں ظاہر امور سے انکار نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ اہل تصوف ظاہر کو قائم رکھ کر ایک اور اعتبار پیدا کیا کرتے ہیں جو کسی ظاہر شریعت کے منافی نہیں ہوتا۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہ جب فرمان خداوندی عصا کا زمین پر پھینک دینا ایک امر واقع ہے جس کو سب اہل اسلام تسلیم کرتے ہیں اور اہل تصوف بھی اس کا انکار نہیں کرتے۔ مگر وہ ایک اعتبار یہاں سے یہ بھی اخذ کر لیتے ہیں کہ عصا انسان کے لئے ایک قسم کا سہارا ہوتا ہے۔ گویا عصا کے پھینک دینے سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ غیر اللہ پر بھروسہ چھوڑ دو۔ مگر چونکہ یہ معنی ظاہر شریعت کے ہرگز منافی نہیں اور تیز اصل واقع کی اصلیت سے بھی انکار نہیں کیا گیا۔ اس لئے یہ اتہام بالکل بجا ہے کہ شیخ اکبر کی تفسیر میں تاویل کیلئے بھروسہ رکھی ہیں۔ اور یا ایہمہ وہ لوگ ان اعتبارات کو نہ تو قطعی سمجھتے ہیں نہ حجت و قیامات آپ کے کہ تمام ظوہر آیات کا انکار ہی کر دیا۔ اور الفاظ کو کہاں سے کہاں تک لے گئے۔ لیکن بنظر مزید اطمینان شیخ اکبر کے نہ سب کی تائید انہیں کی تفسیر سے کیجاتی ہے۔ آیہ و ہذا با نافع اللہ لکھ آیہ کی قول میں اعتبار ہی متنی کو بیان کر کے لکھتے ہیں کہ ہذا هو التاویل مع ان کلامہ اربطاً ہما

لے یہ صاحب نے ایک سارہادی کے معنی پر کہا ہے اس میں ایک حدیث مسلم کی نقل کی ہے جس کے کلمات میں بخلات فاطمة وھی جزیۃ فاطمہ عنہا میں فاطمہ حالات کہ وہ ان کی تفسیر میں آتا چھینکا انہوں نے اس کو اپنے کلمات حدیث کو یوں بلا جرات فاطمہ وجوبہ فاطمہ عنہا کہ آپ کا دعویٰ اس صورت میں ثابت ہوتا تھا جب ہولوی صاحب الزام تحریر نام کیا تو آپ نے فرمایا کہ میری سچائی میں کوئی کھاپا جب صحیح مسلم آپ کی گئی تو آپ نے پیش کرنے سے انکار کیا افضل واضحہ کار جو اپنے فعل تشبیہ سے کیا ہے۔ ۱۲

واجب فان ظہور المعجزات و خوارق العادات حق کا منکر شیا متھا یعنی یہ تو ساری باتیں ہیں۔ مگر
 باہمیہ ہم ظاہر پر ایمان لانا واجب جانتے ہیں کیونکہ معجزات اور خوارق عادت امور کا جو حق ہے جس
 میں کسی قسم کا شک نہیں اور ہم ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے۔

تاکثرین سمجھ گئے ہونگے کہ شیخ اکبر کا یہ گزشتہ بیان کہ ظاہر بات سے انکار کیا جائے یہ صرف آپ کی
 بات ہے اور اپنی تائید میں بعض نادانوں کو اپنا ہم خیال بنانا۔

علم سمرنیم اور شجرہ بازی وغیرہ امور کا اظہار خرق عادت سے مشابہ ہوتا
 دیکھیں کئی ایسے امور ہیں جن کی حقیقت ظاہر کیا
 ہی معلوم ہوتی ہے مگر عند الحقیق وہ بالکل مستند الحقیقت
 ثابت ہوتے ہیں بعض کو تاہ نظر دل سے انبیاء اور

اولیاء کے خرق عادت کو بھی ایک قسم کی دھوکا بازی یا دھت بند ہی سمجھا ہے ساتھ جنہوں نے وہ
 مہذبانہ انکار کرنا چاہا ہے انہوں نے یوں بکدیل ہے کہ نفس انسانی میں ایک قسم کی طاقت ہوتی ہے کہ
 وہ انبیاء پر ایسا اثر پیدا کرے۔ یہی خیال خلافت قدیم کا دیرازہ جزو تھا۔ اور یہی علم سمرنیم کے ماننے
 والے تسلیم کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اس میں۔ انبیاء اولیاء کے خرق عادت ان میں سے کسی ایک صحت
 میں بھی داخل نہیں۔ بلکہ یہ محض مویات الہی ہے۔ جو بظاہر اسباب ملکہ انبیاء اور اولیاء پر ظاہر کی جاتی
 ہے یہی اعتقاد حق ہے۔ اور اس کے برخلاف زندقہ والحاد۔

اس قسم کے امور جو محض دھوکا بازی اور علم تاثیر نفس پر مبنی ہوتے ہیں اور وہ امور جو اللہ تعالیٰ کے
 کی طرف سے بطور حجت دیئے جاتے ہیں گو باہم مشابہ ہوں مگر ان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ایسے
 اعمال والے لوگ بقابلہ نبی و ولی کبھی اپنا عمل جاری نہیں کر سکتے۔ کیا سازان فرعون کا وہ قرآن مجید
 میں مذکور نہیں؟ کہ بالآخر انہوں نے کیونکر اپنے غرور کا قرار کیا۔ ایسے لوگ اعمال و عقائد میں باطل و ناپاک
 ہوتے ہیں حالانکہ نبی یا ولی لکھوں اور کروڑوں کو سرچشمہ ہدایت سے سیراب کر سکتا ہے اور اس کے
 قوا و فعل میں ایک غیر معمولی صداقت کی چمک نظر آتی ہے۔ مگر عامل یا ساحر یا سمرنیم والا ان باتوں
 میں سے کسی ایک بات کی بھی قدرت نہیں رکھتا۔ ایسے لوگوں کو تعلیم حق سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہو سکتا

اور وہ پہلے پہل ایک قسم کی مشق کے عادی ہوتے ہیں بعد ازاں کچھ عمل بالید بھی کرتے ہیں اور دوسرے اشخاص پر اپنی توجہ کا اثر ڈال کر ان سے کچھ استفسار کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں منافعی نبوت و ولایت ہوتی ہیں جنہیں حقیقت سے کچھ سروکار نہیں۔ تاہم یہ دھماکہ و تائید شیطان میں کچھ فرق کرنا چاہیے۔

الغرض اور بھی بہت سے وجوہ امتیاز ہیں جو ہر دو کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں کیونکہ نبوت و ولایت کا منبع ذات باری ہے اور اعلیٰ سمرنیم اور سحر وغیرہ کا منشأ شیطان جہیت کے زیر اثر ہے۔ نئے کا نتیجہ ہے پہلا مبنی بر رحمت اور دوسرا مبنی بر لعنت پانی بظاہر ایک ہی شکل رکھتا ہے۔ مگر بعض کو دس کا پانی تلخ ہوتا ہے۔ اور بعض کا شیریں۔ لیکن قوۃ ذائقہ تمیز کر سکتی ہے۔ اور جس شخص کی قوۃ ذائقہ میں فرق آگیا ہو وہ شیریں کو بھی تلخ کہنے لگیگا۔

و کد من عاب قولا صحیحا
وافته من الفم السقیم

معراج نبوی

منجملہ عقائد اہل اسلام کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ معراج ہے جس کی تصدیق میں کتاب اللہ ناطق ہے۔ اسی بناء پر جمیع اہل اسلام بالاتفاق واقعہ معراج کے قائل ہیں۔ البتہ کیفیت معراج میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ شرف معراج حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صرف نصح پر فتوح کو حاصل ہوا جسیم اطہر کو اس واقعہ سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اور وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ آیہ "و ما جعلنا الرؤیا التي ارینا الا فتنة للناس" میں لفظ رؤیا سے معراج نبوی کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہم نے جو خواب (رؤیا) تجھے دکھایا اس سے صرف لوگوں کی آزمائش مقصود تھی۔ کیونکہ آپ کے واقعہ معراج کے بیان پر قریش نے انکار کر دیا اور اکثر مقلد و ضعیف الایمان لوگ بھی ان کے ہم خیال ہو گئے مگر حضرت ابو بکر صدیقؓ اور دیگر قوی الایمان لوگوں نے آپ کے بیان

کی تصدیق کی یکیں اس مسئلہ کو بوجہ ذیل توڑ دیا گیا ہے۔ اول تو اس لئے کہ لفظ وقتہ للناس اسی وقت صحت کے ساتھ مربوط ہو سکتا ہے جبکہ آپ کے بیان میں قریش نے کوئی امر بظاہر محال خیال کیا نہ اور وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ آپ کے الفاظ سے قریش نے اس جبہ غصہ کی ساتھ آسمان پر جانا سمجھا ہو۔ کیونکہ خواب کی حالت میں آسمان پر جانا اور عجائبات کا معائنہ کرنا بظاہر کوئی خلاف عقل بات نہیں اس لئے لفظ رویت سے مراد رویت ہے جو بیداری کی حالت میں ہو نہ کہ خواب کی حالت میں۔ وہم کیونکہ روایات صحیحہ میں یہ چکا ہے کہ پہلی دفعہ آپ کی معراج بہ حالت رویت تھی اور دوسری دفعہ بحالت بیداری رویت کی صورت میں اور اس رویت رویت میں حکمت خداوندی مضمر ہے کیونکہ پہلی ہی دفعہ رویت کا متخل ہونا حضور علیہ السلام کے لئے موجب صعوبت تھا۔ اس لئے پہلے رویت کے ذریعہ آپ کو عجائبات کے معائنہ سے مانوس کرنا مقصود تھا تاکہ رویت کی حالت آپ پر شاق نہ لگے۔ گویا رویت رویت بیداری کے لئے ایک قسم کی تہنید تھی اور یہ حالت بالکل نزول وحی کی حالت سے مشابہ ہے کیونکہ ابتدائے بعثت میں وحی کا نزول بصورت رویت ہوا کرتا تھا اور تدریج ملک روحانی کے کھلم کھلا ہر کلام ہوتے تاکہ ذہن پہنچ گئی آیت "اذا سئل علیک قولاً فقل عذرا" میں اسی صعوبت نزول وحی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی نسبت حضرت ام المومنین سے مروی ہے کہ تحت سردی کے دنوں میں نزول وحی کے وقت حضور علیہ السلام کے بدن مبارک پر سپینہ نہینے لگتا تھا اور آپ کو سخت تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ابتدائے وحی میں آیات قرآنیہ نہایت مختصر اور چھوٹی چھوٹی سورتوں کی شکل میں نازل ہو کر تھیں جو قرآن مجید کے آخری حصہ میں رکھی گئی ہیں۔ اس لئے آیت مذکورہ بالا کی صحیح تفسیر یوں ہوگی کہ لفظ رویت کو بخلاف مضاف لیا جائے یعنی "التصدیق الرویت" یا "التحقیق الرویت" پھر معنی یہ ہونے لگے کہ ہم نے پہلی دفعہ جو رویت تھی دکھایا تھا اس کو آئندہ رویت بیداری کی صورت میں لاکر لوگوں کا امتحان کیا گیا تاکہ جو لوگ تصدیق کریں وہ ثابت قدم رہیں اور جو انکار کریں ایمان کھو بیٹھیں سو ہم یہ کہ آیت مذکورہ بالا میں لفظ رویت سے مراد وہ رویت ہے جو صلح حدیبیہ سے پہلے آپ کو دکھایا

گیا تھا جس کا ذکر سورہ فتح میں مفصل آچکا ہے اور جس کا اصل یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رویا میں دکھایا گیا تھا کہ آپ جامع مسلمانان کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہوئے ہیں کیونکہ نبی اللہ کا رویا وحی قطعی ہوتا ہے اس لئے آپ نے جامع صحابہ کے ساتھ بیت اللہ کا سفر کیا اور مکہ سے باہر مقام حدیبیہ پر نزول فرمایا۔ قریش بیت اللہ میں داخل ہونے سے مانع ہوئے نامہ و پیغام ہونے کے بعد معاہدہ صلح نکلا گیا جس کو بعض صحابہ نے مسلمانوں کے حق میں بہتر اور مفید سمجھا۔ ایسی پر سورہ فتح نازل ہوئی جس سے ان لوگوں کو اطمینان حاصل ہوا جس کے دلوں میں کچھ وسوسہ پایا ہو چکے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رویا کی تصدیق کیوں نہیں ہوئی کیونکہ اس سورت میں صریح طور پر اشارہ فرمایا گیا "لقد صدق اللہ رسولہ السہوہ ویا..... الخ" یعنی خدا نے قالی نے اپنے رسول کو سچا و نواب دکھایا کہ تم لوگ حرام میں باہر امن و امان داخل ہو گے۔ چنانچہ فتح مکہ پر اس رویا کی پوری تصدیق ہو گئی۔ بات صرف یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رویا ہونے پر اپنے اجتہاد سے فی الفور سرسبت اللہ کی تیاری کا حکم دیدیا۔ مگر ارادہ الہی میں اس کا پورا ہونا کسی اگلے وقت پر موقوف تھا۔

چونکہ اس رویا پر سبھی لوگوں کے دلوں میں مختلف قسم کے وسوسہ پیدا ہو گئے تھے اس لئے لوگوں کے حق میں یہ ایک قسم کا فتنہ یا امتحان تھا چنانچہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ آیہ مذکورہ بالا معراج نبوی کے متعلق نہیں بلکہ واقع حدیبیہ کے متعلق ہے۔ اس لئے روحانی معراج کے قائلین کا استدلال اس آیت سے صحیح نہیں ہے۔

روحانی معراج کے قائلین ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے یہ حدیث بھی پیش کیا کرتے ہیں ما فتدات جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لینی شب معراج کو جسم اطہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے معقود نہیں پایا۔ سو یہ استدلال باطل ہے کیونکہ معراج نبوی مکہ معظمہ میں بعثت سے پانچ سال بعد واقع ہوئی۔ اور اس وقت تک ابھی حضرت ام المومنین کی ولادت بھی نہیں ہوئی تھی۔

نیز ان قائلین کا استدلال حدیث معراج کے لفظ نائم سے بھی قابل غور ہے کیونکہ واقع معراج کے
 بیان میں ان نائم فی الحج مروی ہے یعنی میں مقام رکع حطیم میں سو رہا تھا۔ جبرئیل علیہ السلام آئے اس کا
 جواب ہے کہ اول تو بعض روایات میں انہا جاتس فی الحج کا لفظ مروی ہے اس صورت میں یہ الفاظ
 محل استدلال بھی نہیں اور بصورت نہایت نائم یہ تو یہیم ہو سکتی ہے کہ آپ خواب میں تھے اور جبرئیل کے
 آنے پر آپ بیدار ہو چکے تھے چنانچہ الفاظ جہا منی جبرئیل موصوفی جہا منی فقمت قلہ اور شیا
 فحدث لمصنعی کا مفہیم بالکل بھات سب جس سے جبرئیل علیہ السلام کے دہانے پر آپ کا
 بیدار ہونا ثابت ہوتا ہے ورنہ آپ کا یہ فرمانا کہ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور جب کسی کو نہ پایا تو پھر ہو گیا
 بالکل بے محل ہو گا۔ اسی طرح حدیث کے آخری الفاظ قامتی نظامت وانا بالمسجد اعظم سے
 بھی یہ لوگ استدلال کیا کرتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ میں واقع معراج کے ہو چکے تھے اور جب بیدار
 ہوا۔ تو میں نے اپنے تئیں مسجد حرام میں پایا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ کو مشاہدہ عجائبات میں
 استغرق کامل ہو گیا۔ تو یہ حالت ایک سوئے ولسے کی حالت سے مشابہ تھی جو عالم مادی سے
 بالکل مشغول ہو جاتی ہے اس لئے پھر اپنی حالت راہ جوع کو اپنے استیقلت کے نقطہ سے تعبیر کیا۔
 مگر سلف صالحین کا ایک بڑا گروہ اور دیگر عامل اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ آپ کی
 معراج جسمانی تھی جو بحالت بیداری واقع ہوئی۔ اور اسی کو مذہب صحیح قرار دیا گیا ہے کیونکہ حضرات
 صحابہ اور تابعین کے بڑے بڑے اکابر اور جہدیں اکثر فقہاء اور محدثین اور متکلمین سب کا یہی مذہب ہے
 مذکورہ بالا ہر وہ مذہب کے علاوہ ایک جماعت اہل اسلام کی یہ رائے ہے کہ معراج نبی المقتدس
 تک جسمانی اور بیداری کی حالت میں واقع ہوئی اور بیت المقدس سے آسمان تک روحانی تھی چنانچہ
 قرآن مجید کے الفاظ من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر
 اس سے آگے آپ کی سیر جسمانی ہوتی تو اس کا موصوفی الفاظ قرآن میں نہ کر ہوتا۔ واضح ہو کہ احادیث
 میں واقع معراج کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے جن سے معراج کے رفیع مع الجسد واقع ہونے
 پر صحیح استدلال پیش کیا جاتا ہے مثلاً حضرت ابو بکر سے مروی ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے گزشتہ رات (شب معراج) آپ کو آپ کے مکان میں
 ڈھونڈا مگر میں آپ کو نہیں پاسکا۔ آپ نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام آئے تھے اور مجھے سوار کر کے
 مسجد اقصیٰ کی طرف لے گئے۔

واقعہ معراج کے متعلق مادہ پرست لوگ جو اطوار نبوت کی حقیقت سے بے خبر ہیں اگر اصول
 سائنس کے رُو سے اسے بیدار عقل خیال کریں تو یقین نہیں۔ مگر ہم اہل اسلام بالخصوص اور دیگر
 اہل مذاہب بالعموم خرق عادات کے قائل ہیں اور ایسے واقعات کو منجملہ دلائل نبوت خیال کرتے ہیں
 تمہارے خیال میں مسیح علیہ السلام کا بہ جبر عسکری آسمان پر جانا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعہ
 معراج کے لئے ایک قسم کی بہتید خیال کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ انکار سو یہ کوئی نئی بات نہیں بیشک
 ہم مانتے ہیں کہ جو امور بطور خرق عادات واقع ہوتے ہیں ممکن ہے کہ ان کے لئے کوئی اسباب
 مخفیہ ہوں۔ مگر عوام الناس پر ایسے اسباب کے مخفی رہنے سے ہی وہ واقعات محبت ہو سکتے
 ہیں اور اگر ان کے اسباب ایسے عام ہوں کہ انسانی اصول تجربہ و مشاہدہ پر ان کی مناسب تشریح
 ہو سکتی ہو تو پھر انہیں خرق عادات کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔



بائشتم

ایمان بالملائکہ و کتاب اللہ

مسائل میں اختلاف کا استدلال

اگر ہم شخص اپنی اپنی رائے کے پابند ہوں تو یوں سمجھو کہ تدبیر کوئی شے نہیں چونکہ فطری اختلاف طبع کی وجہ

سے تمام افراد انسانی کا اعتقالات الہی ہونا محال ہے اس لیے سب کے لئے عملی تعلیم حجت قرآنی گئی ہے تاکہ وہ تمام خواہشیں رک جائیں جو اپنی اپنی رائے کی پابندی سے لازم آتی ہیں اور چونکہ حجت حقہ کسی انسانی عقل کا نتیجہ نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ خالق السموات والارض کی طرف سے بطور اتمام حجت نازل کی گئی ہے اس لیے کسی مسلمان کو یہ مجال نہیں کہ اس کے تسلیم کرنے سے انحراف کر سکے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ اعتراض لازم آتا کہ کسی خاص انسان کی رائے کو کیوں حجت قرار دیا جاتا ہے اور بصورت نبی اللہ کی صداقت تسلیم کر لینے کے یہ اعتراض عائد نہیں ہوتا کیونکہ نبی اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ وما یطق عن الہوی ان ھو کلا وحی یوحی پر عامل ہوتا ہے اور یہ پایہ کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ الغرض کتاب اللہ اور سنت رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام جو کتاب اللہ کی تفسیر ہے ہر ایک مسلمان کا ایمان ہے اور جو بات کتاب اللہ اور سنت سے مخالف ہے وہ کسی کے لئے حجت نہیں۔ حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو بات کتاب اللہ اور سنت سے مخالف ہے اس کو دیوار پر دے مارو۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی محدث کتاب اللہ کی کسی آیت کی ایسی

تفسیر کرے جو مخالف کتاب و سنت ہو اور با ایں ہمہ چل کر کہ جس کی وجہ سے یہی کہتا
 چلے گی یہی تفسیر صحیح ہے چنانچہ ہمارے زمانہ میں اس کی کئی ایک مثالیں موجود ہیں مگر جب یہ معاملہ
 جمہور علمائے اسلام کے سامنے پیش کیا جائیگا جو اصول و فروع کو کما حقہ جانتے ہیں تو نہایت
 آسانی کے ساتھ فیصلہ ہو جائے گا کیونکہ بموجب فرمان نبوی جمیع علمائے امت مرحومہ کبھی ضلالت
 میں نہیں پڑیں گے یہی وجہ ہے کہ اہل حق کافر و ہمیشہ اہل ہوا کے مخالف رہتا ہے جس پر ملاحظہ
 طرح طرح کے بہتان اور سونٹن قائم کرتے رہتے ہیں +

امور عقلیہ میں نسبتاً | جن امور کو ہم بذریعہ حواس محسوس کر سکتے ہیں ان میں اختلاف بہت
 کم ہوتا ہے بلکہ حقیقتاً اختلاف نہیں ہوتا مگر وہ امور جو حواس کے اور اک
 سے بالاتر ہیں ان میں اختلاف بکثرت موجود ہے اور اس کی وجہ یہ ہے

کہ فطر تاقوۃ عاقلہ کا تمام افراد انسانی میں ایک معیار نہیں اس لئے ایسے امور کے متعلق ہمیں یہ
 دیکھنا ہو گا کہ آیا امر متعارض فیہ منجذہ اصول اسلام یا معتقدات دین کے ہے یا ان سے خارج صورت
 اہل میں بجز کتاب و سنت کسی شخص یا اشخاص کا قول مسموع نہیں گو کہ تمام دنیا کے محققین مل کر
 اس کی صحت کو تسلیم کریں اور میرے خیال میں ایسا کوئی امر نہیں جس کو روئے زمین کے محققین تسلیم
 کرتے ہوں۔ اور کتاب اللہ اور سنت اس کے مخالف ہوں۔ اور بصورت ثانی یعنی جبکہ وہ امر
 اصول اسلام و معتقدات سے کسی طرح تعلق نہیں رکھتا تو اس کے مان لینے یا انکار کر دینے سے کوئی
 صرح نہیں جیسے علم سمیٹ اور طبعیات کے بعض مسائل۔ مگر موجودہ زمانہ میں اکثر مسلمانوں نے
 اس اصل عظیم کی پیروی چھوڑ دی۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر ان کی تعداد ہے قریباً قریب اسی قدر
 مختلف فرقے قائم ہوتے چلے گئے ہیں مگر اہل حق وہی ہیں جن کی خلافت خود جناب مہر برکات
 نے بالفاظ مآنا علیہ واصحابی بتلاد می یعنی وہ لوگ جو طریق نبوت و صحابہ پر چلنے والے
 ہیں۔ اب ہر ایک مسلمان کو اپنے دل میں سوچ لینا چاہیے کہ آیا وہ اس طریق شریعت پر اعتقاد
 اور عملاً قائم ہیں جو بذریعہ وحی و ناطق حجت قرار پایا ہے یا کسی بلخ فلسفی کے طریق بنیٹ پر جس

میں ہولے ٹھکوک اور اواہام اور وساوس کے کچھ بھی نہیں رکھا اور قیامت کے دن موجب دہال جان ہو کر سامنے آئے گا۔ نحوۃ باشند من ذلک *

انکار حق کے دو طریق ہیں۔

جن لوگوں پر ہوائے نفس غالب آجاتی ہے وہ یا تو بالکل انکار کر دیا کرتے ہیں یا الفاظ کو خلاف قواعد طور پر رد کر اپنے مطلب کے مطابق معانی پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں کیونکہ بصورت صریح انکار صریح

کفر لازم آتا ہے مگر اس صورت میں ایسا ہر یقین دلایا جاتا ہے کہ نصوص کا انکار تو نہیں صحت معنی کی تعین میں اختلاف ہے گریب وہی پہلی قائم ہو جاتی ہے یعنی ایک دوسری صورت میں انکار کیا جاتا ہے۔ اس کو اصطلاح شریعت میں الحاد کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے شخص کو ملحد۔ محدین کی نسبت قرآن مجید میں بـالفاظ الذین یلحدون فی ایلنتا لا یخفون علینا وعید آچکی ہے اس لئے ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ طریق ما انا علیہ واصحابی کے سمجھنے میں دل جان سے سعی کرے کیونکہ ایمان نہایت بڑی قیمتی چیز ہے اس کو یونہی سرسری طور پر اہل فلسفہ کی دلچسپ مگر مہلک تقریروں پر کھودینا کسی ذی عقل کا کام نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھو کہ تمام دنیوی چیزوں کا بدل ممکن ہے مگر ایمان کا بدل کوئی چیز نہیں یہ کسی شخص کے لئے نشان شقاوت ہے کہ وہ کسی بدعتی یا ملحد کی غلط اور یہودہ تاویلات پر فریفتہ ہو کر یقین کرے کہ جو کچھ وہ سمجھ چکا ہے حق ہے کیونکہ یہ امر ہر حالت میں مد نظر رہنا چاہئے کہ کتاب سنت سے علیحدہ ہو کر کسی شخص کی رائے قابل حجت نہیں اور بھیج علمائے امت کا اتفاق اس کے رد کے لئے کافی دلیل ہے *

۱۔ قواعد سے یہاں قواعد صرف نحو۔ ۲۔ اصول۔ معانی۔ بیان مراد ہیں جو قرآن مجید کے فہم معانی کے

لئے علمائے اسلام نے زبان عربی کی ترکیب اسالیب کا کامل نتیجہ کر کے مدون کئے ہیں۔ ۱۲۔ منہ *

۳۔ ہماری آیات میں الحاد کرنے والے ہم پر تحقیق نہیں ہیں ۱۲۔ منہ *

احول معتقدات میں عام تعلید

جميع علماء اُمت کا اس امر اتفاق ہے کہ اصول معتقدات

مذہب میں ہرگز تقلید جائز نہیں کیونکہ معتقدات کے بارہ

میں نفوس قرآن و حدیث ثابت ہیں البتہ مسائل فروع میں جن کی بابت نص موجود نہ ہو کسی مجتہد کے اجتہاد و عقل کرنا درست ہے۔

معتقدات کی بابت احتیاط

معتقدات کے بارہ میں اہل امر کی پوری پوری چھان

بین کرنا چاہئے کہ صحیح معتقدات کیا ہیں اور جناب پیغمبر

علیہ السلام نے انہیں کس طرح تلقین کیا اور جماعت صحابہؓ نے اس کو کس صورت میں تسلیم رکھا؟

اگر کسی امر کی نسبت بذریعہ دلائل قطعیہ فیصلہ ہو جائے تو اس کو خوب مضبوط طور پر پکڑ لینا چاہئے

اور اس اور اس کے دواوس و شکوک کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ شیاطین الانس

و دنیا میں بہت ہیں اور اہل حق بہت کم۔

دور بہت سہرا ہے یاد دہشتدار۔ تا غول بیاباں نفر سید بسرا بیت

اور اگر بالفرض کسی اعتقاد ہی امر میں کسی قسم کا خلیجان پیدا ہو تو محض اس بنا پر کہ اس کو بذریعہ اصول

فلسفہ اس کی تحقیق نہیں ہونی ترک نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ حکم "قل دب زدنی علما" اس تحقیق

کا منتظر رہنا چاہئے کیونکہ اگر اس حالت میں اس کو موت آجائے تو یہ بات لازم نہ آجائے گی کہ وہ

بے اعتقاد مر رہے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسان کے حسن خاتمہ کا مدار حسن اعتقاد

پر بہ نسبت حسن عمل کے زیادہ ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے کہ تمام اہل تحقیق میں مسلم ہے۔ الغرض معتقدات کا

معاملہ بڑا نازک ہے۔ اس میں کتاب و سنت کو سب سے مقدم رکھنا چاہئے مگر افسوس کہ عالم دنیا

اسی ایک ضروری امر کی عدم پابندی سے کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ہیں؟ عام دستور ہو گیا

ہے کہ لوگ کتاب و سنت پر بہت کم متوجہ ہوتے ہیں اور جو بات انہیں کسی اہل ہوا سے مل

جائے تو چونکہ وہ بظاہر و کُش اور دلفریب ہوتی ہے جھٹ اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

بالخصوص ایسی حالت میں جیکہ پیش کر دیا اس کو کتاب اللہ کے الفاظ سے استنباط کرنے کا

مدعی ہو کیونکہ بوجہ ایمان و اہمیت وہ لوگ اس کی صحت و غلطی کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس پر معتقد ہو کر اہل حق کی تکذیب کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس بارہ میں اصل غلطی یہ ہے کہ معتقدات صحابہؓ کی پیروی کو لازم پکڑنا چاہیے کیونکہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگ جو بلا واسطہ جناب پیغمبر علیہ السلام کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہوئے اور جنہوں نے زمانہ وحی کی اپنی آنکھوں سے دیکھا اور موردِ احکام کو حسب تبلیغِ نبی اللہ سمجھا اور جن کی پیروی کی تاکید خود جناب ختمیت مآب نے واضح الفاظ میں فرمادی۔ اعتقاداً یا عملاً غلطی میں پڑے رہے ہوں حاشا و کما کہ یہ خیال کسی طرح بھی قابلِ وقت ہو۔ دیکھو قرآن مجید کیسے طرح اس خیال کا رد کرتا ہے آیہ کف خیر امة اخرجت للناس بد اور ملند ان کی اقتداء پر آمادہ کر رہی ہے اور آیہ لا کذب علیک امة وسطا لکنوا مشہدا علی الناس فیکون الرسول علیکم شہیداً نے ان لوگوں کی افضلیت اور اولویت پر زہر لگادی اور قرین عقل بھی یہی ہے کہ اس بزرگ جماعت کے لوگ علم و عمل میں آئندہ افراد امت کے لئے کامل نمونہ ہوتے جن سے دینِ حق کی عظمت و جہت کا پورا پورا اسکہ دلوں پر جم جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء۔ مگر افسوس اور سخت افسوس کہ غام جہاں اور ناکمل تعلیم یافتگان نے ایسے ایسے ضروری احکام کتاب اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور چند ایک بے دین اور اہل بدعت مدعیوں کی فلسفیانہ لمبی لمبی تقریریں پر مرتے۔ اور یہ نہ سمجھے کہ یہ سب تقریریں بظاہر الگ قسم کی شیرینی ہے جس میں زہر لپیٹ رکھی ہے اور روحانیت کو بالکل ہلاک کر دیتے والی ہے۔ بھلا بتاؤ کہ ترج تک کوئی فلاسفر بھی زمرہ موحدان یا بگاہ مسلکِ اہلِ حنر

۱۔ تم بہترین امت ہو جو ان لوگوں کے لئے بطور نمونہ ہدایت پیدا کئے گئے ہو۔ ۲۔ امنہ *

۳۔ ہم نے تمہیں ایک ایسی امت پیدا کیا ہے جو ہر ایک قسم کی علمی اور عملی روش میں نہایت متعل و اق ہوئی ہو تاکہ

تم ہدایت کا نمونہ بن کر لوگوں کے لئے بخیر و خیر شاہد بنو اور پیغمبر علیہ السلام تم پر شاہد ہوں۔ ۴۔ امنہ *

میں داخل ہو کر لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے موجبِ ہدایت ہوا ہے ؟ اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ یہ لوگ صحیح معنی میں تابعِ شریعت نہیں ہوتے بلکہ ان کے دل برزخاتِ عقائدِ حقہ مختلف قسم کے شکوک و ادوہام کا مخزن ہوتے ہیں جو قطعاً متنافی توحید ہیں۔ میں نے آج تک کبھی کسی فلسفی کو صاحبِ طمینان نہیں پایا اور نہ پایا جاسکتا ہے ۔

اب مذکورہ بالا دوسری مراتب کے بعد میں حقیقتِ ملائکہ کا ذکر کرتا ہوں کیونکہ شریعتِ حقہ اسلامیہ نے ایمان بالملائکہ کو بموجبِ نصِ قرآنی ”قل کل امن باللہ وملائکتہ وکتابہ ورسولہ“ ہر ایک مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے اور دوسری جگہ علمِ ایمان پر سخت وعید ہے ۔

لفظِ ملائکہ عربی میں فرشتہ کو کہتے ہیں جو اصل میں ’ملائک‘ تھا۔ تحقیق لفظِ ملائکہ

قلبِ مکانی سے ملائکہ ہو گیا اور ملائک سے بمعنی ہمزہ ملک ہوا اس کی جمع ملائک ہو گی اور کبھی حرت تارِ بغض تا نیت جمع پڑھا کر ملائکہ کہا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا بناوٹ کے رُوسے اصل مادہ لفظ کا ہمزہ۔ لام۔ کات (الک) ہو گا اور اس کا مصدر ’الموکتہ‘ بمعنی پیغام ہو گا بعض اس کو مادہ لام۔ ہمزہ۔ کات (لاک) میں لکھتے ہیں گویا ان کے نزدیک قلبِ مکانی اس میں نہیں ہوا۔ پہلی صورت میں اس کا وزن محفل اور دوسری صورت میں مفعول ہو گا۔ عرب اپنے محاورہ میں بولا کرتے ہیں ’الکئی الی فلان‘ یعنی فلاں شخص کو میرا پیغام پہنچا دے چونکہ فرشتہ بھی خدا کے حضور سے نبی اللہ کے پاس پیغام بتائی پہنچاتا ہے اس لئے اس کو ملائکہ کہتے ہیں۔ یہ تو اس لفظ کی لغوی تحقیق ہے جس میں کئی ایک مذاہب ہیں مگر میں یہاں صرف مذاہبِ ذیل کو جو مشہور ہیں بیان کرتا ہوں اور اس کے بعد آیاتِ قرآنِ مجید سے ثابت کروں گا کہ محقق مذاہب کیا ہے ؟

حقیقتِ ملائکہ میں اختلاف (۱) ملائکہ ایسے اجسامِ لطیفہ ہوائیہ کا نام ہے جن کی

فطرت میں اشکال مختلفہ میں مشکل ہو جانا خدا نے ودیعت رکھا ہے اور جن کا مسکن آسمان ہے۔ یہ اہل اسلام کا مذہب ہے *

(۲) ملائکہ کو لوکب کی روحوں کا نام ہے جو سعادت و نحوست کا اثر موجودات دنیا پر ڈالتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے خیال میں کوکب صاحب اور اک اور صاحب حیات ہیں جس طرح کہ انسان یہ مذہب بعض بت پرستوں کا ہے *

(۳) عالم کی اہل دو چیزیں ہیں نور و ظلمت۔ جو ہر لمحہ ہمیشہ اولیا و احیار کو پیدا کرتا رہتا ہے جن کو ملائکہ کہتے ہیں اور جو ہر ظلمت اعدا و اشرار کو جن کو شیاطین کہتے ہیں۔ یہ مجوسیوں کا مذہب ہے *

(۴) ہر مذہب سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ متخیر ہیں یعنی ایسے حقائق ہیں جو دیگر اجسام مادی کی طرح کسی نہ کسی مکان کے محتاج ہیں *

(۵) ملائکہ ان نفوسِ ناطقہ کا نام ہے جو انسانی جسموں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ نیک ہوں تو ملائکہ وہ شیاطین ہوں گے۔ یہ نصاریٰ کا مذہب ہے *

(۶) ملائکہ جو ہر مجرہ کا نام ہے یعنی ایسے حقائق ہیں جو نبات خود قائم ہیں اور لازم مادہ سے باطل بری ہیں اور وہ نفوسِ ناطقہ انسانی سے ایک علیحدہ نوع ہے۔ یہ اہل فلسفہ کا مذہب ہے *

(۷) ملائکہ کائناتِ عالم کے قولے فطریہ کا نام ہے مثلاً انسان میں ایسی قوتیں جو اس کو نیکی کی طرف میلان دیتی ہیں ملائکہ کہلاتی ہیں اور جو بُرائی کی طرف کھینچتی ہیں شیاطین۔ اسی طرح آگ۔ پانی۔ ہوا۔ سب اُول وغیرہ مظاہرِ قدرت کی فطری قوتیں ملائکہ ہیں۔ یہ زمانہ حال کے بیخیرہ کا مذہب ہے۔ ملائکہ کے متعلق صرف مذکورہ بالا مذہب دریافت ہو سکے ہیں مگر مجھے اس وقت مذہبِ اول کا اثبات اور باقی مذہب کا رد نہ نظر ہے لیکن واضح ہے کہ اثبات سے صرف یہاں یہ مراد ہے کہ تعلیم حقہ قرآن و سنت سے کیا ثابت ہوتا ہے کیونکہ ان حقائق

کی نسبت جو غیر مرنی ہیں کوئی ایسی دلیل قائم نہیں ہو سکتی جو مادی مشیائے کے اصول تجربہ پر مبنی ہو۔
یہ ثابت کرنا ضروری ہوگا کہ عقل اس قسم کی موجودات کو ہرگز بحال تجویز نہیں کر سکتی اور منکر کا انکار
اس کے حق میں کبھی مفید نہیں ہو سکتا جب تک وہ ایسی موجودات کے محال ہونے پر کوئی دلیل نہ
قائم کرے کیونکہ اس صورت میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے دلائل اثبات پر یقین
نہیں۔ سو یہ کسی کے اختیار کی بات نہیں۔ ہاں جب کتاب اللہ کو حجت قطعی تسلیم کر لیا جائے تو
ایماندار کے واسطے کافی ہے مگر ضعیف الایمان کے لئے امکان عقل اخص قرآن موجب یقین
ہو سکتے ہیں کیونکہ لصوص کتاب اللہ اور تجویز عقل قطع حجت کے لئے کافی ہیں اور جو اس صورت
کو بھی کافی نہیں سمجھتا تو اس مرد خدا کو سادہ دینا چاہیے کہ وقت مرگ تک انتظار کر دیکہ تمام حقائق متنازعہ کا خود
فیصلہ ہو جائیگا لا فکشتنا غلط غلط فصلت الیوم الحمد لید۔ اے یوم بیرون الملائکہ لا بشری
یومئذ للبحرین یقولون حججنا حججہم آئیں منکرین کو خوب غور کرنا چاہیے۔ یہ وہ وقت ہے کہ تمام حقائق سرستہ جن
کا انکار کیا جاتا تھا برائے عین مشاہدین جلتے ہیں اور حق اللہ باطل علیحدہ علیحدہ مرتبہ کے سامنے جلوہ گر ہونے لگتے ہیں
یو وقت صبح شود ہجور روز معلومت۔ کہ باکہ باختہ عشق و شب و یجور

”الایمان ثبت اقل مناعلی الایمان“

انکار و انکسار کا اثر

اس مسئلہ میں مذاہب مختلفہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اصل وجہ ملائکہ
میں کسی کو شیعہ نہیں کیونکہ کتب سادیہ کا بالاتفاق ایک امر کو پیش کرنا اس کی
حقانیت کی کافی دلیل ہے۔ اختلاف صرف ان کی حقیقت میں ہے۔ یہیں سے علمائے اسلام
نے اختلاف کیا ہے کہ جو شخص کسی ایسی حقیقت کو جس پر شرعاً ایمان لانا فرض ہے اس صورت میں
تسلیم نہ کرے جو یقینی طور پر اس مذہب میں جزو ایمان قرار دی گئی ہے۔ بلکہ کسی تاویلی صورت
میں تسلیم کرے تو آیا اس کا ایمان صحیح ہے یا نہیں؟ اس میں محققین کا مسلک یہ ہے کہ ایسا شخص
کافر تو نہیں ہاں لمحہ ہے کیونکہ وہ اپنے زعم فاسد میں مقرب منکر نہیں گویا بواسطہ اس کا مذہب
متزلزم انکار ہی سے مگر بعض نے ایسے شخص کو کافر کہہ دیا ہے لیکن معاندہ تکفیر برائے انکار ہے اس

کے فتویٰ میں جرأت نہیں ہو سکتی جب تک کوئی شخص صاف طور پر التزام اپنے تئیں کافر نہ بنائے
ایک نیچری نے انکار ملائکہ پر امام غزالی علیہ الرحمۃ کا ایک قول نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی
شے کے وجود کے پانچ درجے ہیں (۱) حسی (۲) دہمی (۳) خیالی (۴) مثالی (۵) عقلی۔ اگر ان
مراحج میں سے کسی ایک درجہ میں کسی شے کی حقیقت پر ایمان لایا جائے تو وہ شخص منکر نہیں کہ ایمان
اس نقل سے گویا عوام الناس کو اس نے یہ دھوکا دینا چاہا ہے کہ ملائکہ یا جنت و نار وغیرہ امور
کو اگر محض عقلی یا خیالی یقین کر لیا جائے تو ایمان کے لئے کافی ہے۔ اس کے جواب میں صرف یہ
کافی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت میں تقسیم مدارج مذکور نہیں اور اگر اہل معقول کی لئے پر اس
کو تسلیم ہی کر لیا جائے تو یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ کسی ایک درجہ وجود کو تسلیم کر لینا حقیقت
ایمان کے لئے کافی ہے؟ بلکہ کسی چیز پر ایمان لانا صرف اسی صورت میں صحیح ہوگا جبکہ اس
کو اسی وجود میں تسلیم کیا جائے جو شریعت نے بتایا ہے۔ صرف نقل قول کو پڑھ لینا اور
مصنف کے اصل نثر کو نہ سمجھنے کا مرض ایسا عام ہے جس سے بڑے بڑے لوگ بھی محفوظ
نہیں رہ سکے۔ امام صاحب کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کسی حقیقت کو خواہ کسی حالت میں تسلیم
کر لیا جائے تو بس ایمان ثابت ہو گیا بلکہ امام صاحب نے مختلف قسم کی موجودات کے مدارج وجود بتائے ہیں
اور انکا مشابہ ہے اگر کوئی چیز مثلاً قرن مجید جو جو محسوس ہے تو اس کے دیگر مدارج وجود بھی ہیں یہ مطلب نہیں کہ تو جو مجید
جو جو محسوس ہے اس پر تو ایمان نہ لاؤ بلکہ اس کے وجود عقلی کو تسلیم کرنے سے ایمان صحیح رہے گا۔

منکرین حقیقت

منکرین سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ تم کیوں انکار کرتے ہو
جبکہ شریعت حق میں تو صاف صاف وجود ملائکہ کو اسی صورت میں پیش
کیا گیا ہے جس کو عام مسلمان لوگ تسلیم کرتے ہیں اور احادیث صحیحہ اور

لے مرنے والے کو سنا دیا جائیگا کہ ہم نے تیری آنکھوں سے پردہ اٹھا سواج تیری نگاہ تیرے نبی جو
حقائق اور تجھے مخفی تھے تیرے مشاہد میں آئیے جس میں شک شبہ کو کسی قسم کا دخل نہیں ہو سکتا۔ ۱۲۰ منہ

جمیع علمائے قرون ثلاثہ (اصحاب و تابعین و تبع تابعین) نے بھی اسی صورت میں ان کا وجود تسلیم کیا ہے
 سچہ نہیں کیا مشکل پیش آئی کہ تم انکار کرتے ہو؟ اور ان کے وجود خارجی کے تسلیم کر لینے سے کس عقل
 اصل شرعی یا مسلمات عقلی کا انقضائے لازم آتا ہے جس سے تم تاویل کرنے پر مجبور ہو گئے ہو اور
 وہ کوئی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ مستنبط ہو سکے کہ ملائکہ قویٰ فطریہ کا نام ہے اور وہ
 کوئی خارجی ہرگز نہیں؟ غالباً ان سوالات کا جواب خاطر خواہ کوئی خارجی نہیں دے سکیگا
 اگر کسی کے پاس کوئی جواب ہے تو وہ صاحب براہ مہربانی ہیں بھی افادہ کریں تاکہ ہم بھی اپنے
 اوپر سے لکیر کے فقیر ہونے کا الزام دور کر سکیں اور اگر قرآن و سنت سے اس کا ثبوت نہیں
 مل سکتا اور یقیناً نہیں ملے گا تو برائے خدا کیوں دہریوں کی پیروی میں نعمت ایمان کو ضائع
 کرتے ہو جس کا بدل کوئی چیز بھی نہیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فلاسفہ طبعیین نے ایسے حقائق میں
 دو راہ قیاس و حکموں سے لگائے ہیں مگر نص کتاب و سنت کو چھوڑ کر ان ملعونوں کی پیروی کرنا
 صنعت ایمان کی علامت ہے یقیناً یہ کھو کہ اگر بفرض محال وہ اعتقاد غلط بھی ہے جس پر قرون
 ثلاثہ کے مسلمان چلے آئے ہیں تو تم پر اس کے تسلیم کر لینے کی صورت میں کوئی محبت قائم نہ کی
 جائیگی کیونکہ اس صورت میں تم اسی اعتقاد پر خدا کے سامنے حاضر ہو گے جس کی قطعاً خود جناب
 پیغمبر علیہ السلام نے معاہدہ کو فرمائی اور اگر وہ اعتقاد صحیح ہے جیسے کہ تمام متقین متباحث متکلمین
 محدثین اور فقہاء کا مذہب ہے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ مذہب حق اور تائید باطل کی جو ایہی
 تم لوگوں پر واجب ہو جائیگی۔ ایک بکے اعتقاد کے مسلمان کی ایمانی طاقت کا ہرگز یہ متقین نہیں بنا
 چاہئے کہ نصوص کتاب اللہ اور سنت رسول کو جو جمیع اکابر ائمہ کا شعار رہا ہے محض منکرین فلا
 کی خرافات پر ترک کر دے جن کی صحت اور قطعیت کا روئے زمین پر کوئی شخص مشکمل نہیں ہو سکتا
 کیونکہ کتاب اللہ اور سنت بہر حال یقینی ہیں اور خرافات اہل فلسفہ ظنی و اٹھان لایختی من

الحق شینا۔ مجھے تعجب ہے کہ سکر کے پاس کوئی ایسی قطعی دلیل ہے جس پر وہ اپنے دعویٰ کا ثبوت
 مبنی کرتا ہے حقیقت نفس انسانی کا پتہ تو اُسے خاک بھی نہیں لگا حالانکہ اقرب الاشیا نفس ناطقہ
 انسانی ہے مگر حقیقت ملائکہ کی تعین اور رد و تکذیب مذہب حق میں بڑے زور و شدت کے دعویٰ پیش
 کرتا ہے ۔

تو براؤج فلک چہ دانی چیست - چوں ندانی کہ در سرے تو کیست
 ذرا غور کرو کہ جس مخلوق کے صنعت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ہی حقیقت سے بے خبر ہے
 وہ اپنی عقل ناسا سے حقیقت ملائکہ کو کیا خاک سمجھ سکا ؛ لیکن کمزور انسان اپنے محدود علم پر اس
 قدر مغرور ہو جاتا ہے کہ وہ تحقیق حق میں پی بساط سے بہت دور آگے نکل جاتا ہے اور جو کچھ اپنے
 توہمات فاسدہ سے اس کو نظر آتا ہے اس کو حق تعین کرنے لگتا ہے اور اس پر یہاں تک زور
 دینے لگتا ہے کہ آیات قرآن مجید کو توڑ مروڑ کر اپنے باطل خیال کے ساتھ مطابقت دیتا ہے ۔

ملائکہ کا جسام ہوائیہ | جس قدر اجسام مرکب دنیا میں موجود ہیں مادی کہلاتے ہیں جب ہم
 بذریعہ عقل کمیائی ان کے اجزاء کی تحلیل کرتے ہیں تو جو جزو ان میں
 اور صاحب الہک ہونا | غالب آتا ہے اس کی طرف ان کو منسوب کرتے ہیں مگر اس خبر و غالب

کی طرف منسوب کرتے سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ باقی اجزاء عناصر ان میں موجود نہیں کیونکہ مرکب ہونا
 خود اس مرکب کی دلیل ہے کہ اس کی ترکیب مختلف اجزاء سے ہوئی ہے مثلاً انسان کو خاکی بولتے
 ہیں یا آئندہ دیگر عناصر بھی اس کی ترکیب میں شامل ہیں اسی طرح ملائکہ کو غلبہ اجزاء ہوائیہ کی وجہ سے
 اجسام ہوائیہ کہہ دیتے ہیں چونکہ ہوا غیر مرنی چیز ہے اس لئے ان کا غیر مرنی ہونا کچھ محل تعجب نہیں اور
 ان کا اجسام لطیف ہونا بھی غماز ہے کیونکہ مادی اشیاء میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض اشیاء
 باوجود مادی ہونے کے اس قدر لطیف ہیں کہ کوئی حس انہیں محسوس نہیں کر سکتی۔ دیکھو ہوا جب
 ایک حرکت ذکر کے قوت لامہ سے اس کا احساس نہیں ہوتا مگر اس کے وجود سے کبھی کوئی انکار
 نہیں کرتا اور اس سے بھی زیادہ لطیف اسیتھ ہے جس کو تمام بیدار غیر متناہی میں پھیلا ہوا مبتلا تے

ہیں اور اس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ آدمی کے آنکھ کے اندر بھی نفوذ کرتا ہے۔ چنانچہ زمانہ
 حال کے محققین نے علم روشنی کی تحقیق میں انتشار روشنی کی وجہ ہی بتلائی ہے کہ اشیر روشنی کے
 اجزاء کو اپنے ساتھ لیکر آنکھ کے اندر نفوذ کرتا ہے اور وہ ہر ایک شکل میں متشکل ہو جاتا ہے اور
 اس کا ایسا ہونا ظاہر ہے کیونکہ جب تک وہ تمام مناسب اشکال کو قبول نہیں کرتا مختلف اجسام
 میں اس کا نفوذ کرنا ممکن نہیں۔ اشیر یا ہوا کے علاوہ یہ خاصہ پانی میں بھی موجود ہے۔ پھر اگر کوئی
 مولوی صاحب یہ کہیں کہ ملائکہ اجسام لطیفہ ہوائیہ ہیں جو مختلف اشکال میں متشکل ہو سکتے ہیں
 تو اس میں کوئی ناممکن بات انہوں نے کہ دی۔ اور اس کے محال ہونے پر متعین کے پاس
 کیا دلیل ہے؟ کیونکہ صرف اسی قدر سے تو کوئی غلات مقول بات معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس
 خیال کی تائید اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ جب خداوند کریم نے اپنی قدرت کاملہ سے عالم کائنات
 میں انسان کو خاکی پیدا کر کے اس کو صاحبِ اوراک پیدا کیا ہے تو کوئی اچنبہا بات ہے کہ ایک
 ایسا مخلوق بھی اس نے پیدا کیا ہو کہ جس کا مادہ ہوائی ہو اور وہ صاحبِ اوراک ہو؛ انصاف
 سے کہو کہ صرف ایسی مخلوق کے غیر مرنے ہونے سے یہ لازم آتا ہے کہ کسی ایسی مخلوق کا موجود ہونا
 محالِ فعلی ہے؛ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ظالم کثیف کے ساتھ اوراک و علم کو لازم قرار دیا
 ہے تو ہوائی لطیف کے ساتھ اوراک و علم کا لازم قرار دینا بدیعہ اولیٰ صیح معلوم ہوتا ہے اور
 یہ جو کہا کرتے ہیں کہ ملائکہ کاظم و اوراک انسان کی نسبت وسیع ہے بالکل قرین قیاس ہے کیونکہ
 ان کی ترکیب انسان کی ترکیب کی نسبت زیادہ لطیف ہے اس لئے ان کا وسیع الامداد ہونا
 بھی امر لازم ہے۔ لیجئے ایک دوسرے طریق پر ایسے مخلوق کا وجود ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ
 تقسیم عقل کے رُوسے بلحاظ کثافت و لطافت موجودات مادیہ کے تین مدارج قائم ہو سکتے ہیں
 (۱) کثیف محض۔ (۲) کثیف و لطیف۔ (۳) لطیف محض۔ کثیف محض وہ اجسام مادیہ ہیں جن
 میں جس واداک نہیں غلات جہات مادیات اگرچہ نباتات بہ نسبت جمادات کے کسی قدر لطیف
 ہیں اور کثیف و لطیف حضرت انسان ہے جو باوجود کثیف الت ترکیب ہونے کے ایک جوہر محرو

یعنی نفس ناطقہ انسانی بھی رکھتا ہے جو صاحبِ اوراک ہے۔ اور محض لطیف نوعِ ملائکہ ہے جو محض اوراک ہی اوراک ہے اور ممکن ہے کہ خداوند کریم نے اس نوع کے علم و اوراک کے لئے بھی کوئی حدود مقرر کئے ہوں جس طرح انسانوں کے لئے حدود و نظرات ہیں چنانچہ آئیہ و ما متا اللہ مقام معلومہ اور آئیہ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اس تقسیم کی حقیقت میں غور کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جس قدر کوئی مخلوق لازمِ مادہ سے زیادہ مجرد ہوگا اسی قدر اس کا علم اور اوراک وسیع ہوگا چنانچہ اسی خیال پر حضراتِ صوفیہ کبار تعلقاتِ باویہ سے تجرود اختیار کر کے علوم حقیقیہ یعنی کشف والہام کے مالک بنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو کہ ملائکہ کا مختلف اشکال میں مشکل ہونا خلافِ عقل ہے کیونکہ فطرۃ اللہ کے برخلاف نہیں ہو سکتا۔ جو وجود جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اس سے ہرگز متبدل نہیں ہو سکتا ہم کہتے ہیں کہ تمہاری دلیل یعنی فطرۃ اللہ کا نہ بدلنا تو ہم بھی مسلم کہتے ہیں مگر بارہا تو دعویٰ ہی یہی ہے کہ ملائکہ کا کسی دوسری شکل میں آنا بھی فطرۃ اللہ ہے کیونکہ یہ خاصہ ان میں طبعاً خدا نے ولایت رکھا ہے۔ فطرۃ اللہ کا بدلنا تو تب لازم آئے جب معترض یہ ثابت کرے کہ مختلف اشکال میں متشکل ہونا ملائکہ کی جبلت میں مرکوز نہیں۔ یہ اسی قسم کا جواب ہے جو امکانِ خرقِ عادات میں بھی دیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فطرۃ اللہ کا بدلنا صرف محالِ عادی ہے مگر نبی اللہ کے ہاتھ پر بتامیدِ الہی کسی مادی جسم کا کسی دوسری صورت میں آنا بھی فطرۃ اللہ ہے کیونکہ فطرۃ اللہ کا اندازہ ہم اسی طرح لگا سکتے ہیں کہ کسی امر کو بذریعہ تجرید و مشاہدہ پایہ تصدیق تک پہنچایا جائے اور جب ایسا ہو گیا تو بس ایسا ہونا بھی فطرۃ اللہ ہوگا نہ خلافِ فطرۃ اللہ۔ پس جن لوگوں نے ملائکہ یا خرقِ عادات کا صرف اس بنا پر انکار کیا ہے کہ فطرۃ اللہ کا خلاف لازم آتا ہے انہوں نے خود فطرۃ اللہ کی مخالفت کی ہے کیونکہ فطرۃ اللہ یہی ہے کہ ہمارے اصولِ تجرید و مشاہدہ سے جس قدر قوانین پایہ ثبوت تک پہنچ چکے ہیں وہ جمیع فطرۃ اللہ پر حاوی ہیں۔ اور جب مخالفت یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نبی اللہ کے ہاتھ پر خرقِ عادات ہوتا خلافِ فطرۃ ہے تو گویا غیرِ

فطرۃ اللہ کو محدود کرتا ہے اور اسی کا نام مخالفت فطرۃ اللہ ہے کیونکہ وہ لامتناہی کو متناہی قرار دیتا ہے۔ ہاں زیادہ سے زیادہ مخالفت یہ کہہ سکتا ہے کہ قوانین تبدیل پر اس کا اپنا علم حاوی نہیں مگر اس سے کسی چیز کی حقیقت اصلیت کے انکار کرنے کا اسکو کیا حق محال ہے کیونکہ عدم دلیل سے عدم مدلول لازم نہیں آتا۔ یہ ایک قابل غور بات ہے جس کی تہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے جہال نے سیکڑوں صدقوں کا انکار کر دیا ہے۔

حقیقت روح انسانی پر غور کرنے سے ملائکہ کا ثبوت

روح انسانی کی حقیقت میں اس قدر اختلاف کیا گیا ہے کہ اس میں تقریباً سو سے بھی زیادہ اقوال موجود ہیں اور ہر ایک شخص نے اپنی اپنی عقل کے مطابق کچھ نہ کچھ کہا ہے مگر

سب سے زیادہ مضبوط اور محقق مذہب وہ ہے جو سوائے قانداں نبوت جناب امام ہمام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے۔ جناب کا ارشاد عالی ہے کہ جس طرح انسان عالم مادی میں ایک خاص شکل اور وضع رکھتا ہے اسی طرح عالم روحانی میں بھی اس کو وہی شکل و وضع حاصل ہے اور وہ شکل و وضع ایسی لطیف ہے کہ اس کو بذریعہ اس ہم ہرگز محسوس نہیں کیے جاسکتے مثلاً زید ایک شخص ہے جو خارجی وجود میں موجود ہے اور جس کو تمام لوگ محسوس کرتے ہیں مگر زید کی روح سے مراد وہ زید ہے جو اسی شکل و وضع میں نہایت ہی لطیف بلکہ الطف اللطائف مادی صورت میں موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مادہ جسمانی اور مادہ روحانی کی نوعیت ایک ہیں اس لئے ہر دو کے آثار اور خصوصیات بھی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اسی روح کو غیر فانی کہا جاتا ہے جو ظاہر ہی شکل جسمانی سے علیحدہ ہونے پر کامل مجرد ہو کر ادراک تام حاصل کرتی ہے۔ چونکہ روح بحالت مجرد ایک قائم بالذات ہستی کا نام ہے جو صاحب ادراک ہے اس لئے ملائکہ کو انسانی ہستی سے ایک علیحدہ مادی مدرک ہستی تسلیم کرنے میں کیا قباحت لازم آتی ہے؟ چنانچہ

۱۔ میں نے حقارت کے قول کا قطعی ترجمہ نہیں کیا بلکہ اس کی تفسیر اپنے لفظوں میں کی ہے۔ ۱۲۔ منہ۔

نصاری کے مذہب سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ان کے نزدیک ملائکہ انہیں نفس
 ناطقہ انسانی کا نام ہے جبکہ جسم سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ الغرض امام ہمام کے قول سے ایک ایسی
 لطیف الفطرہ مدد گہتی کا پتہ ملتا ہے جس کا مادہ انسانی بالکل جسمانی کے مادہ سے بالکل مختلف قسم
 کا ہے اور وہی روح یا نفس ناطقہ انسانی ہے۔ اس خیال کی تائید بعض متصوف کرام کے مکاشفہ
 اور مشاہدہ سے بھی ہوتی ہے کیونکہ وہ ارطاح مجرودہ انسانی اور ملائکہ کا مشاہدہ اپنے مکاشفہ
 میں کیا کرتے ہیں اگر ایسے مکاشفات صرف مستعد مکاشفہ کے حق میں حجت ہو سکتے ہیں نہ منکر کے
 حق میں۔ ہاں منکر کو ہم بطور الزام یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب علوم فلسفہ مثلاً طبیعیات، کیمیا، ہیئت
 وغیرہ کے محققین علمائے تجربہ مشاہدہ کو تم ایسی قوی حجت باور کرتے ہو کہ ان کے مقابل میں
 کسی نص آسمانی کو بھی سنا گوارا نہیں کرتے گو کہ تم نے خود تجربہ و مشاہدہ کیا ہو تو پھر کیا وجہ ہے
 کہ جو لوگ روحانی آلات وحدہ سے آسمانی کائنات (ملائکہ) کی خبر اپنے یقینی مشاہدہ کے دوسے
 دیتے ہیں تو تم لوگ انکار کر جاتے ہو۔ سچا بتلاؤ ان سب کا بالاتفاق مختلف زمانوں میں ایک
 ہی امر کی سہادت دینا کیونکر خلاف واقع ہو سکتا ہے؟ اور کیا وجہ ہے کہ اگر تمہیں کسی مسئلہ ریاضی
 کی تحقیق نہ ہو تو اپنے سے اعلیٰ قسم کے شخص سے استفادہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں دیکھتے مگر
 روحانی معارف و حقائق میں تم علمائے ربانی کی تعلیم کا انکار کر دیتے ہو؟ حالانکہ ان لوگوں کا طریق
 تحقیق یقینی اور قطعی ہے اور اہل فلسفہ کا فنی اور فرضی۔

”ان هذا الاشیء عجاب“

ممكن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ قوی فطریہ کو ملائکہ کہنا
 کوئی نیا مذہب ہے لیکن حقیقت یہ خیال فلاسفہ طبعیین کا پرانا ہے
 انہیں کی تصنیفات سے زماۃ موجودہ کے بعض محدثین نے اخذ کیا ہے
 شیخ بوعلی سینا جو اسلامی فلسفہ یونانی کا مشہور مصنف ہے رسالہ نبوت میں لکھتا ہے ”فن
 العادة فی الشریعة تسبیہ العقول اللطیفۃ الخیر المحسوسۃ ملائکہ“ یعنی شریعت

ملائکہ قوی فطریہ
 کا نام نہیں

میں لطیف غیر محسوس قویٰ کو ملائکہ کہ دیا کرتے ہیں۔ اور اس خیال کی تائید وہ اس طرح پر کیا کرتے ہیں کہ شریعت آسمانی میں ایسے رموز و کنایات ہوتے ہیں جو عام لوگوں کے فہم سے بالاتر ہیں اس لئے ان کی ایسے طور پر تعلیم کی جاتی ہے جس سے وہ بہ آسانی سمجھ سکیں چنانچہ ملائکہ کی اصطلاح بھی منجملہ انہیں رموز و کنایات کے ہے۔ اس خیال کو زمانہ حال کے مادی فلسفیوں نے بھی انہذا کیا مگر حکماً اشتراق یعنی پیر وان اظلاطین ملائکہ کو بذریعہ دلائل ایک علیحدہ آسمانی موجودات تسلیم کرتے ہیں جن کا مادہ دیگر اجسام مادی سے بالکل متغایر ہے اور وہ خدائی طرف سے عالم مادی کے مختلف امور کی تدبیر برتتین ہیں ایسی موجودات کو وہ اپنی اصطلاح میں ارباب الانوار کہتے ہیں کیونکہ دنیا کی مختلف انواع کی کائنات کی تربیت ان کے سپرد ہے۔ انہیں ہر دو مذہب کا اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا کسی چیز کو اس کے کمال مخصوص تک پہنچانے کا سبب کوئی ایسا امر ہے جو اس چیز کی ذات میں داخل ہے یا اس سے خارج؟ جو لوگ خارج امر کو سبب قرار دیتے ہیں وہ ملائکہ کے وجود کے قائل ہیں اور جو یہ کہتے ہیں کہ اس چیز کی ذات ہی میں وہ سبب موجود ہے مثلاً اس چیز کی طبیعت وہ ملائکہ کے وجود سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی قویٰ فطریہ جو کسی چیز میں خدائے دویت رکھے ہیں ملائکہ ہیں۔ اس موضوع میں طرفین کے بہت بڑے بے فلسفی مباحث کتب فلسفہ میں موجود ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ ملائکہ قویٰ فطریہ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک علیحدہ قائم بالذات مددگار کی نوع ہے جن کو خداوند کریم نے اشیاء عالم مادی کی حفاظت اور انتظام کے لئے پیدا کیا ہے گویا ایسی موجودات ایک قسم کے اسباب ہیں جو بموجب حکم خداوند سبحان و تعالیٰ اشیاء عالم میں تصرف کرتے ہیں ان اسباب کو وسائل بولتے ہیں کیونکہ حکم الہی کے مادی عالم میں نافذ ہونے کے واسطے واسطہ قرار پاتے ہیں۔ تمام روزمرہ حوادث مثلاً پیدا ہونا۔ مرنا۔ بیماری صحت۔ ہدایت ضلال۔ بارش۔ مد و جزر۔ زلزلہ وغیرہ امور خواہ کوئی خفیف سے خفیف حرکت و سکون ہو انہیں ملائکہ کی دسالت سے وقوع میں آتے ہیں۔ چونکہ وہ غیر مرنی موجودات ہیں اس لئے عوام الناس جو صرف مادی سلسلہ اسباب کا علم رکھتے ہیں ان کے وجود سے منکر ہوتے ہیں مگر اصحاب مجاہدات و

ریاضت کو ان کا برائے شاہدہ ہوتا ہے اور انہیں بھی صرف صلح بدن (روح کے بدن سے علیحدہ ہو کر عالم غیر مادی سے متصل ہونے کی حالت میں) اس کا مشاہدہ منظور ہے یہ نہیں کہ ہر وقت وہ ایسی موجودات کو دیکھتے رہتے ہیں ۔

لیئے سائل کا وجود کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسے وسائل کا ثبوت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر تو مسلم ہے کہ تمام سلسلہ کائنات سبب و مسبب کے اصول

پر عمل رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ عالم مادی بجائے خود ظلمت و کدورت ہے اور ذات باری ان تمام عیوب سے میرا و منزہ ہے جو مادی موجودات کو لازم ہیں اس لئے ہر دو کے باہمی تعلق کے لئے ایسے وسائل ہیں جو نہ تو بالکل مادی ہی ہوں اور نہ بالکل غیر مادی۔ سو ایسے وسائل صرف ملائکہ ہی ہیں کیونکہ مادی موجودات میں کوئی بھی چیز ان کی طرح لطیف و شریف نہیں گویا وہ ہر دو طرف سے یکساں منسوب ہیں یعنی آثار تجرد عن المادہ اور تعلق مادہ ہر دو ان میں پائے جاتے ہیں تاکہ ذات باری سے اثر قبول کر سکیں اور عالم مادی میں اثر پیدا کر سکیں اس کی مثال مادی سلسلہ اسباب میں یہ ہے کہ استخوان اور گوشت دو علیحدہ علیحدہ مختلف حقیقتیں ہیں اور اس لئے غذا کا اثر استخوان تک پہنچانے کیلئے مغروف (ایک قسم کی نرم ہڈی) واسطہ بن جاتی ہے کیونکہ وہ ایک لحاظ سے استخوان اور دوسرے لحاظ سے گوشت کے آثار اپنے اندر رکھتی ہے اس تقریر کو اجمالاً قاضی بیضاوی نے لکھا ہے۔ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ اگر ایسے وسائل نہ تسلیم کئے جائیں تو کیا حرج لازم آتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عالم کائنات میں خداوند کریم نے اپنی حکمت کاملہ سے قوانین مقرر کئے ہیں پس سب امور انہیں قوانین کے ذیل میں سرانجام پاتے ہیں۔ مثلاً بارش کا ہونا۔ سمندر وں میں مد و جزر کا پیدا ہونا۔ ہوا

لہ عبارت یہ ہے۔ "وَقَدْ يَزِدُّكَ فِي الطَّبِيعَةِ أَنْ تَعْظِمَ لَهَا عَجْرًا عَنْ قَبُولِ الْغِذَاءِ مِنَ الْحَبِّ لَهَا بَيْنَهُمَا مِنَ التَّبَعِ جَمَلُ الْبَارِئِ تَعَالَى بِحِكْمَةٍ بَيْنَهُمَا الْعُضُوفُ الْمُنَاسِبُ لَهَا لِأَيَّ اخْتِذَ مِنْ هَذَا وَحِطْفِي لَكَ ۱۲ مَرَّةً

کا چلنا اور دیگر تمام حوادث کے لئے اسباب ہیں اور پھر ان اسباب کے اسباب مخفیہ ہیں جن کو ملائکہ کہتے ہیں اور ایسے اسباب کا وجود صرف مذکورہ بالا وجہ پر مبنی ہے یعنی کہ عالم مادی اور ذات باری میں نقصان و کمال کے لحاظ سے سلسلہ مراتب ہے اور یہ سلسلہ ذات باری پر ختم ہو جاتا ہے جو علت العلل اور سبب الاسباب ہے۔ ویکھو نبوی سلاطین کے حضور سے بھی جو احکام نافذ ہوتے ہیں وہ بتدریج بوجہ اطاعت و زرا اور پھر بوساطت عمال و زرا اور اسی طرح سب سے آخر ماتحت علم کی معرفت تعمیل میں لائے جاتے ہیں بلکہ اس حکم انجائین کے ورنہ باغی شان سے بوساطت سلسلہ اسباب حوادث کا ظہور پذیر ہونا اس کی قدرت کاملہ پر دال ہے۔

آیات قرآن مجید سے ملائکہ کے قویٰ فطریہ ہونے کا رد

قیل اس کے کہ آیات مختلفہ سے اس غلط بلکہ بہتان محض کی ترمید کی جائے یہ ظاہر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کہیں اشارتاً یا کنایتاً آیات قرآنیہ یا احادیث

صحیحہ سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ ملائکہ کا لفظ عرف شریعت میں قویٰ فطریہ پر کیا گیا ہے بلکہ اس کے برخلاف ملائکہ کے لئے وہ صفات مذکور ہیں جو ذوی العقول محکف کے لئے ثابت کئے گئے ہیں چنانچہ آئندہ آیات سے واضح ہو گا اور نہ صرف قرآن مجید میں بلکہ کتب انبیاء علیہم السلام میں بھی اسی طرح مذکور ہے اگر بالفرض یہ خیال صحیح ہو تو یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ آیا لفظ ملائکہ کا اطلاق قویٰ فطریہ پر بطور حقیقت کے اس مذہب پر اصولاً اعتراض

یا بطور مجاز کے؟ اگر بطور حقیقت کے ہے تو ضروری

تھا کہ اشعار عرب میں جہن جہن اس کی کوئی سند موجود ہوتی اور ائمہ لعنت اس کو بیان کرتے مگر کہیں ایسا نہیں آیا۔ اور اگر اس لفظ کا اطلاق قویٰ فطریہ پر بطور مجاز ہوا ہے تو چونکہ اصول فقہ میں یہ بات قرار پا چکی ہے کہ استعارہ کی بنا مجاز پر ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ اطلاق بطور استعارہ ہو۔ اور جب استعارہ ثابت ہوا تو لفظ ملائکہ مستعار ہو گا اور قویٰ فطریہ مستعار نہ۔ مگر اس صورت میں مستعار منہ کا کوئی پتہ نہیں کیونکہ ملائکہ بمعنی معروف تو ضم

نزدیک مسلم نہیں پھر مستحار منہ کیا چیز ہوگی؟ اس نے مشکل داعی ہوئی کہ ملائکہ کا قویٰ فطریہ پر اطلاق نہ تو حقیقی طور پر صحیح ہوا اور نہ مجازی طور پر۔ اور اگر کوئی شخص یوں کہے کہ علم بیان کے اصول پر ملائکہ کا لفظ قویٰ فطریہ پر بطور مجاز مرسل کے اطلاق کیا گیا ہے تو ضروری ہوا کہ خصم قویٰ فطریہ اور ان اشیاء میں جن میں یہ قویٰ فطریہ موجود ہیں کسی قسم کا علاقہ منجملہ مجاز مرسل کیچے نہیں علاقوں کے تجویز کرے یعنی اس کو تسلیم کرنا ضروری ہوگا کہ آیا قویٰ فطریہ اور اشیاء میں تعلق حال و محل کا ہے یا لازم و ملزوم کا یا جزو و کل کا یا سبب و مسبب کا وغیرہ ایک پس جو اس علاقہ قرار دیا گیا اسی میں گفتگو کی جائیگی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خصم کے نزدیک قویٰ فطریہ اور اشیاء متعلقہ میں حال و محل کا یا لازم و ملزوم کا علاقہ ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو قویٰ فطریہ کو عرض ماننا پڑیگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خصم جس حقیقت کو ملائکہ تسلیم کرتا ہے وہ عرض ہے یعنی اس چیز سے جس میں وہ قوت فطریہ موجود ہے علیحدہ ہو کر اس کوئی وجود نہیں مثلاً سیاہی جو جسم سیاہ میں موجود ہے جسم سے علیحدہ ہو کر کوئی وجود نہیں کھتی مگر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے صاف صاف اس خیال کا رد ہوتا ہے کیونکہ اقتباسات ذیل میں یہ نظر غور دیکھنے سے واضح ہوگا کہ لفظ ملائکہ جن حقائق پر بولا جاتا ہے وہ بذات خود قائم اور متحرک و مرکب موجودات کا نام ہے :-

(۱) "وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ الْمَجِيدِ" یعنی ملائکہ عرش عظیم کو گھیرے ہوئے ہیں بجا لیکہ اپنے رب کی تسبیح کر رہے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قویٰ فطریہ گھیرے ہوئے ہیں اور وہ مثلاً کشش ثقل خدا کی تسبیح پکا رہی ہے اور یہ کہنا کہ زبان حال سے تسبیح پکا نامراد ہے قرآن مجید میں تحریر کرتا ہے جس پر کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں *

(۲) "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَلَاثِينَ"۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ

قویٰ فطریہ جو بذات خود قائم نہیں بلکہ دوسری چیزوں سے ان کی ہستی قائم ہے خدا کے عرش کو

اٹھائیں ہونگے؟ بجلا جو چیز خود عرض ہے وہ جوہر کیسے ہو سکتی ہے؟

(۳) "فان الله هومولاه وجبريل وصالح المؤمنين"۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ اور قوت فطریہ اور صالح المؤمنین بغیر علیہ السلام کے دوست ہیں؟ کیا ایسی اخوت کا قرآن مجید جیسی پاک کتاب میں ہونے کا کوئی شخص قائل ہو سکتا ہے؟

(۴) "انه لقول رسول كريم ذى قوة عند ذى العرش مكين مطاع ثم اين" کیا یہ قوت فطریہ کی تعریف ہے کہ قرآن مجید ہمارے بزرگ صاحب قوت ایلچی (جبریل) کا قول ہے جو ہمارا مقرب اور صاحب قدر و منزلت ہے جس کی تمام ملائکہ اطاعت کرتے ہیں اور وہ امانت سپار ہے؟ قوت فطریہ کو صاحب قوت کہنا کیسا تازیبا اور غلط خیال ہے؟ اس آیت کے ایک ایک لفظ کو غور سے دیکھو کہ قوت فطریہ کیوں کر اس کا مصداق ہو سکتی ہے؟ سفسطہ اور تعصب سے کام نہ لو بلکہ تحقیق حق کی نیت سے دیکھو۔

(۵) "والمالئكة يدخلون عليهم من كل باب سلام عليكم بما صبرتم فنعم عقبى الدار"۔ کیا اہل جنت کے پاس قوی فطریہ یوں کہیں گے کہ تم پر خدا کا سلام ہو کیونکہ تم نے احکام کی بجا آوری میں پورا استقلال دکھلایا سو آج تمہیں اس کا اچھا نتیجہ ملیگا؟ کوئی سمجھدار تو اس کا قائل نہیں ہو سکتا۔

(۶) "ونادوا يا مالئک ليقض علينا ريبک"۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اہل دوزخ قوت فطریہ کو کہیں گے کہ اے قوت فطریہ! تم ہمارے لئے حضرت باری سے فیصلہ قطعی کی (تم اس کرتی کہ اس عذاب سے ہم نجات پائیں؟ کیا انہو اور بے معنی خیال ہے؟

(۷) "ما یلفظ من قول الا لدیه رقیب عتید"۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان جب کوئی بات منہ سے نکالتا ہے تو قوت فطریہ اس کو قابو کر لیتی ہے کیسی سخت جہالت ہے؟

(۸) "یرسل حلیمک حفظة"۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا تم پر قوائے فطریہ کو بھیجتا ہے؟

(۹) "وان علیکم لحافظین کراما کاتبین یعلمون ما تفعلون" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قوائے فطریہ تمہارے اعمال کو لکھتے جاتے ہیں؟

(۱۰) "جاہل الملائکۃ اولیٰ جحۃ" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے بعض قوائے فطریہ کو پرگیا رکھے ہیں کیسی حاکمت ہے؟

(۱۱) "اللہ یصطفیٰ من الملائکۃ رسلا" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے بعض قوائے فطریہ کو الٰہی بنا رکھا ہے؟

(۱۲) "بل عباد مکرمون" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قوائے فطریہ بڑے مغز بینانِ خدا ہیں۔ بھلا اس لغویت کا کوئی ٹھکانا ہے؟

(۱۳) "یوم یقوم الروح والملائکۃ" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن قوائے فطریہ خدا کے سامنے صفت بستہ کھڑی ہوں گی؟ اور یہ صحیح ہے تو کیا انسان ان قوائے فطریہ سے علیحدہ پیش کیا جائیگا کہ قوائے فطریہ عین انسان نہیں؟

(۱۴) "ان اللہ و ملائکۃ یصلون علی النبی" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قوائے فطریہ مثلاً کشتِ ثقل اور قوتِ اتصال اور انسان کی قوتِ غازیہ اور ماسکہ اور واقعہ وغیرہ پیغمبرِ خدا پر وسیع ہوتی ہیں۔ اللہ صلی علی محمد و علی آل محمد و اصحابہ وسلم

(۱۵) "وہم من خشیۃ ربہم مشفقون" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قوائے فطریہ مثلاً کشتِ اتصال وغیرہ بوجہ خشیتِ الٰہی ڈر رہے ہیں؟

(۱۶) "انا لغن الصافون وانا لغن المسبحون" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قوائے فطریہ صفت بستہ بارگاہِ الٰہی میں کھڑے تسبیح پکارتے ہیں؟

(۱۷) "عباد الرحمن" کیا قوائے فطریہ خدا کے بندے ہیں؟

(۱۸) "تنزل علیہم الملائکۃ" کیا ایمانداروں پر قوائے فطریہ نازل ہوتے ہیں؟

حالانکہ قوائے فطریہ ہر ایک انسان میں پہلے ہی سے موجود ہیں؟

(۱۹) ماتزل الملائکۃ الا بالحق وما کانوا اذا منظرین کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر قولے فطریہ نازل ہوں تو پھر ان تکرین کو ہرگز مہلت نہ دی جائیگی حالانکہ قولے فطریہ ہر ایک مورد میں پہلے ہی سے نازل ہیں؛

(۲۰) "لیضربون وجوهہم وادبارہم" کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ قولے فطریہ

کفار کو مرتے وقت منہ اور پیٹھ پر ضربیں لگاتے ہیں؟

علیٰ ہذا القیاس ہم کہاں تک آیات کو لکھتے چلے جائیں۔ قرآن مجید کے بیشتر آیات ایسے ہیں جہاں قطعاً قولے فطریہ کے معنی چسپان نہیں ہوتے۔ صرف قصہ پیدائش آدم میں ملائکہ کے جواب و سوال سے اٹھل چھوڑے گئے قائم کرنا کہ عوام الناس کو سمجھانے کے لئے قولے فطریہ کو ذوی العقول فرض کیا گیا ہے سرسری غلطی ہے جس پر سولے اتباع طعن کا ذب کے کوئی دلیل نہیں کیونکہ بیسیوں آیات ہیں جن سے حقیقتاً ایسی ذوی العقول موجودات کا وجود ثابت ہوتا ہے جو بے شمار صفات کے مالک ہیں اور جو کسی طرح بھی قولے فطریہ پر صادق نہیں آسکتے۔ ایسے مدعی کو چاہئے متنازعہ اپنی اس لغو تاویل کو ایسا جامع مانع ثابت کرنا کہ کہیں اس تاویل کے رُوسے کسی قسم کا اعتراض نہ ہوتا۔ یا اس ہمہ محض یقین ہے کہ کسی ایک کوڑمختر لوگ محفل پنی بات کی پچ سے آیات مذکورہ بالا میں تطبیق کرنے بیٹھ جائیں مگر انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اصول تفسیر سے باہر گفتگو کرنا کلام الہی سے منحول کرنا ہے۔ اور سخت تعجب ہے کہ اس مدعی کو کیونکر معلوم ہو گیا کہ عرب کے لوگ ایسے یوقون تھے کہ قولے فطریہ کا مسئلہ نہ سمجھ سکے اس لئے ان کو ملائکہ کے لفظ سے سمجھانے کی ضرورت پڑی حالانکہ اکثر قولے فطریہ ایسی ہی ہیں جنہیں جاہل سے جاہل بھی جانتا ہے۔ اس امتحانے حقیقت میں شریعت کو کوئی مصلحت نہ نظر تھی؟ اور لطف یہ ہے کہ اسلام پاک سے پہلے تمام اہل کتاب یہود و نصاریٰ نیز ایرانی آتش پرست اور دیگر مذاہب کے لوگ برابر وجود ملائکہ کو اسی صورت میں تسلیم کرتے چلے آئے ہیں جس میں اسلام نے تعلیم کی۔ مگر حق یہ ہے کہ جب ہولے نفس غالب آجائے تو انکار کی بیسیوں راہیں نکل آتی ہیں اور یہ کیسی لغویات ہوگی

کہ اگر یہی کہا جائے کہ اسلام پاک میں قولے فطریہ پر ایمان لانا بھی اصول ایمان میں داخل ہے اور قرآن مجید نے اس تعلیم کو عقائد میں داخل کیا ہے جس کا فطراناً ایک جاہل سے جاہل بھی انکار نہیں کر سکتا۔ کیا کوئی ایسا شخص بھی دنیا میں موجود ہے جو آگ کی قوت احراق کا منکر ہو؟ کوئی سجدہ آدمی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ زید شش ثقل کے انکار سے کافر ہو گیا یا انسانی قوت حافظہ کی نہی کرنے سے مرتد بن گیا حالانکہ جبریل یا میکائیل وغیرہ ملائکہ کرام کے انکار سے بموجب نص قرآنی خاص کافر ہوتا ہے کیونکہ آیہ "من کان عدواً للہ و ملائکاتہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کا دشمن خدا کا دشمن ہے اور خدا کا دشمن مضافاً اللہ جہنمی ہے۔ ذرا غور کرو کہ اس آیت میں اگر ملائکہ سے قولے فطریہ مراد ہوں تو معنی یہ ہونگے کہ قولے فطریہ کا دشمن خدا کا دشمن ہے مگر مجھے تو اس کے کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے کہ قولے فطریہ کے دشمن ہونے کے کیا معنی ہیں؟ جبریل کو تو ملکہ نبوت مان کر یہ بڑا ناک و دی کہ جو شخص اس ملکہ نبوت کا دشمن ہوگا وہ خدا کا دشمن ہوگا۔ خوب بات تو یہ بھی لغوی ہے مگر باقی قولے فطریہ (مثلاً انسان کے قوی اور عالم کائنات کے بشمار قوی جن کا مظاہر قدرت میں ہر روز ہم اثر دیکھتے ہیں) کے دشمن ہونے کا مطلب میری سمجھ میں تو کیا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کونسا بوقوت ہے جو انسان کی قوت یا صرہ سامعہ یا قوت حافظہ متفکرہ یا قوت غاذیہ۔ واقعہ یا عالم کائنات کے مختلف قوی مثلاً کشش ثقل اور کشش اتصال یا دیگر اجسام ارضی و سماوی کے قوی کو اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ کیا کوئی صاحب اس معاملہ حل کر سکتے ہیں۔ ہاں ایک جواب تو میں خود ہی پیش کئے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آج کل تعلیم سائنس پر بہت زور دیا جاتا ہے مکن ہے کہ کسی کو یہ تاویل سوچو جائے کہ ان قولے فطریہ سے دشمنی کر نیکاً مطلب ہے کہ جو شخص طبیعیات اور علم النفس اور علم ہیئت نہ جانتا ہو گا وہ خدا کا دشمن ہے کیونکہ ان علوم سے بھی خدا کے کارخانہ قدرت کا انسان کو علم حاصل ہوتا ہے مگر اس کا جواب صرف یہی ہے کہ برائے خدا اس قسم کے استہزاء اور استخفاف سے کتاب اللہ کو بالاتر سمجھئے اور ایمانداروں کو اس قسم کی لغویات سے معاف فرمائیے۔ ان علوم کے بڑے بڑے علماء آج کل وہی لوگ ہیں جو خدا۔

نبوت بشریت۔ یوم آخرت وغیرہ سب باتوں کو افسانہ بلکہ تو محض سمجھتے ہیں۔ آپ کی تاویل کی مطابق چاہے تھا کہ یہ لوگ اولیاء اللہ کی جماعت میں داخل ہوتے۔ ناظرین پر اس امر کا ظاہر کر دینا واجب ہے کہ اس آیت شریفہ کا شان نزول یہ ہے کہ مقام فک کے احبار یہودیوں سے ایک شخص عبداللہ بن صوریہ نام جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت سراپا کرتے ہیں حاضر ہوا اور اس نے تحقیق مسائل میں اپنے تئیں مغلوب دیکھا اور ویل سے رہ چکا تو جناب پیغمبر سے یہ سوال کیا کہ تجھ پر آسمان پر سے کونسا فرشتہ وحی لایا کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جبریل جو تمام انبیاء کے پاس خدا کے حکم سے آتا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ تمام ملائکہ میں سے یہی ہمارا دشمن ہے اور اگر میکائیل تیرے پاس آتا تو ہم تجھ پر ایمان لے آتے کیونکہ جبریل عذاب کا فرشتہ ہے جو قبل ازیں کئی دفعہ ہماری قوم پر عذاب لے کر آتا رہا ہے (پھر اس نے اپنی سابقہ قوم بنی اسرائیل کے مختلف واقعات عذاب کا ذکر کیا) تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اس واقعہ سے ناظرین معلوم کر گئے ہونگے کہ نہ تو سائل کا متشابہ جبریل سے کسی قوت فطریہ کا تھنا نہ محیب علیہ السلام کا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو سائل کو حضور علیہ السلام یوں فرماتے کہ جبریل تو ملکہ نبوت کا نام ہے تم بے وقوف اس کو کیا سمجھے بیٹھے ہو؟ اور کثرت محبتی سے یوں کہنا کہ چونکہ سائل جبریل کو غلطی سے ایک موجود فی الخارج مدرک مخلوق سمجھتا تھا جو غیر مرئی ہے اس لئے خدا نے اس کے اس اعتقاد کو مسلم رکھ کے پیغمبر خدا کو ایسے جواب کی تعلیم جو اس کے اعتقاد کے مطابق تھا سہرا حاکقت و جہالت ہے کیونکہ انبیاء کو ہر ایک قسم کی غلطیوں اور بد اعتقادیوں کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوا کرتے ہیں نہ ان کی تائید و استحکام کے لئے۔ لغو بالہ من ذلک مع ہذا قوائے فطریہ کا سمجھنا کوئی ایسا مغلق امر نہیں تھا جس کے لئے ایک لفظ خلاف لغت اور خلاف کتب سابقہ اور اصطلاح مسلمہ نہ اسباب اس طرح پر استعمال کیا جاتا جس کا مفہوم بجز منکرین کے کوئی نہ

سمجھ سکے۔ مگر یہ تو یہ ہے کہ یہ کہنے کی جرات تو نہیں سکتی کہ جن آیات میں لفظ ملائکہ مستعمل ہو وہ آیات قرآن ہی نہیں۔ پیچھے سے کسی نے الحاق کر دی ہیں۔ اگر کوچہ بن پڑتی ہے تو یہی کہ لفظ ملائکہ کو تو مسلم لکھا جائے اور اس کے معانی بدل دیے جائیں مسلمان بھی ہے اور انکار بھی ہو گیا۔

کتاب پیدائش باب ۶ میں حضرت ہاجرہ کے ساتھ فرشتہ کا کلام اور حضرت اسمعیل کے پیدار ہونے کی بشارت دینا فتح و بسط سے مذکور ہے چنانچہ اس باب کی آیت (۷) یوں ہے (۸) اور

کتاب سماویہ سابقہ
سے ملائکہ کا ثبوت

خداوند کے فرشتے نے اسے میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس پایا (۸) اور اس نے کہا کہ اے سارہ کی ٹونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور تو کدھر جاتی ہے۔ وہ بولی کہ میں اپنی بیوی سارہ کے پاس سے بھاگی ہوں (۱۰) پھر خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤنگا۔ الخ۔ علی ہذا باب ۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تین فرشتوں کا مہمان بن کر آنا اور بیٹا پیدا ہونے کی بشارت دینا اور سڈوم کے لوگوں کی خبر ہلاکت دینا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان سے التجا کرنا مذکور ہے۔ اسی طرح باب ۲۱ و باب ۲۲ و غیرہ میں وجود ملائکہ پر صریح لفظوں میں جوہ ہیں جن کو مخالفت بھی تسلیم کرتا ہے۔

احادیث میں بشمار مواقع پر ملائکہ کا ذکر آیا ہے مگر یہ نظر

احادیث صحیحہ سے
ملائکہ کا ثبوت

اختصار حدیث ذیل شاہد ہے "عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال بینما نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات

یوم اذا طلع علينا رجل شہید بياض الثياب شہید سواد الشعر لا یروی علیہ اثر السفر ولا یعرفہ منا احد حتی جلس الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاسند ركبتيه الی ركبتيه ووضع کفیه علی فخذه ثم قال لی یا عمر انک رآی من السائل قلت اللہ ورسوله اعلم قال فانه جبریل انکم لعلکم دینکم" روا مسلم۔

ترجمہ: حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ ہم حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ ناگاہ ایک شخص جو نہایت سفید لباس اور سخت سیاہ بالوں والا تھا آنکلا اس پر کوئی کسی قسم کے اثر سفر معلوم نہ ہوتا تھا اور نہ ہم سے کوئی اسے پہچانتا تھا۔ آخر وہ جناب پیغمبر علیہ السلام سے ہم زانو ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ اس نے حضورؐ کے ہر دوران مبارک پر رکھ دیے (اور اسلام اور ایمان اور یوم قیامت اور اس کی علامات کی بابت سوال کیا جناب پیغمبرؐ نے ہر ایک سوال کا جواب دیا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو جناب پیغمبرؐ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عمرؓ تو جانتا ہے کہ یہ سائل کون شخص تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اللہ کا رسول بہتر جانتے ہیں (یعنی میں نہیں جانتا) آپ نے فرمایا کہ یہ جبائیلؑ تھے جو اس لئے آئے تھے کہ تم لوگوں کو تمہارا دین سکھائیں۔

اس صاف اور صریح حدیث میں خصم کے لئے کچھ بھی گنجائش باقی نہیں بجز اس کے کہ حدیث کا انکار کرے مگر انکار کرنے سے پہلے یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس حدیث کی تخریج ائمہ حدیث نے مختلف طریق پر کی ہے اور اس کو ترمذی نے حدیث صحیح حسن لکھا ہے اس لئے محض انکار کوئی نہ کھاتا نہیں۔ ایک ایسا انداز کے لئے تو یہ حدیث شہی کافی حجت ہے۔ کیا کوئی قوۃ فطرہ سنید لیا میں کہ حدیث میں حافض ہوتی تھی؟

اہل تصوف کے طریق پر
ملازمہ کا ثبوت -

صوفیہ کرام کا مسلک تفسیر یہ ہے کہ اصل معانی الفاظ کو صحیح تسلیم کر کے اعتباری معانی پیدا کیا کرتے ہیں۔ اکثر جہلاء ان کی تفاسیر کو دیکھ کر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ ظاہر

معانی کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی نسبت بعض سفہائے ہی الزام قائم کیا ہے حالانکہ یہ سلسلہ بہتان ہے۔ خود شیخ اکبرؒ کی تصانیف میں جایا اس کی تصریح موجود ہے کہ ظاہر قرآن پر ایمان لانا فرض ہے اور جو شخص ظواہر کو چھوڑ کر اپنے اعتباری اور فسفی تاویلات کی طرف جھکتا ہے کافر ہے۔ مثلاً وہ قصہ پیدائش آدم اور سوال و جواب ملائمہ کو اسی طور پر تسلیم کرتے ہیں

جس طرح پر قرآن مجید میں آچکا ہے۔ کوئی کسی قسم کی تاویل جائز نہیں لکھتے۔ ہاں اعتبارات دقیقہ جو ایسے قصص کے ضمن میں انشائیہ مذکور ہوتے ہیں وہ ایسے صحیح مذاق کے مطابق ضرور آجوتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اصل واقعہ ہی کا انکار کرتے ہیں کیونکہ ایسا مفسر تو بلا شک و شبہ یب متکر قرآن ہے۔ چنانچہ یہ نکتہ اس شخص پر مخفی نہیں جو صوفیائے کرام کی تصانیف پر نظر کرتا ہے۔ شیخ اکبر نے جایگا اپنی کتاب فتوحات کے مختلف مقامات میں حقیقت مذکورہ پر بحث کی ہے۔ چنانچہ استنباطات ذیل سے ان کا مذہب ناظرین پر بخوبی روشن ہو سکتا ہے:-

جلد سوم باب ۹ ص ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴ میں لکھتے ہیں "ان الله لما خلق الارواح النارية والنورية اعنى الحبان والملائكة شترك بينهما في امر وهو الاستعداد عن اعين الناس مع حضورهم معهم في مجالسهم حيث كانوا وقت جعل الله بينهما وبنائعين الناس حجابا مستورا قلنا نرى هم لا اذا شاءوا ان يظلموا والنا... الخ

ترجمہ۔ "خدا نے جب ناری اور نورنی رُوحوں یعنی جن اور ملائکہ کو پیدا کیا تو انہیں اس وصف میں کہ وہ لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں شریک بنا دیا یا انکہ وہ برابر ہر ایک جگہ لوگوں کی مجالس میں حاضر رہتے ہیں اور خدا نے ان کے اور آدمیوں کے درمیان ایک حجاب قائم کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں اگر وہ خود چاہیں تو اپنا آپ ہم پر ظاہر کر سکتے ہیں۔" الخ

"والملائكة رسل من الله الى الانسان موكلون به كاتبتون افعالنا واشياطين مسيطرون على الانسان بامر الله"..... الخ

ترجمہ۔ "اور ملائکہ اللہ کی طرف سے انسان کی طرف الٰہی ہیں جن کی اس پر ہر وقت وکالت قائم ہے اور وہ ہمارے اعمال کو برابر لکھتے جاتے ہیں اور شیاطین انسان پر حکم خدا مسلط ہیں۔" الخ۔ (مگر مطیع بندوں پر نہیں کیونکہ قرآن مجید میں آیا ہے "ان عبادي ليس لك عليهم سلطان")

ولا یطلق علی الاسرار اسم الجن الا لاستارهم فالجدة من الملائكة
 هم الذین یلزمون الانسان ویعاقبون فینا باللیل والنهار ولا نری هم عادة
 فاذا اراد الله عز وجل ان یراهم من الاش من غیر ارادة منهم لذلک رفع الله
 الحجاب عن اعین انبیا یرید الله ان یدرکهم فیدرکهم وقد یامر الله الملک
 والجن بالظهور لنا فیجب ان نلتزمی هم او یرفع الله العطاء منا فتراهم راسی
 المین وقد نری هم اجساد اعلیٰ صور وقد نری هم لا علی صور بشریة بل نری
 صم علی صورهم فی انفسهم کما یدرک کل احد منهم نفسه وهو صورته
 التی هو علیها فان الملائكة اصل اجسامها نور والحجاب نار صارج ولا نس ما
 وتراب

ترجمہ۔ "ارواح پر لفظ جن کا اطلاق صرف ان کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے کیا جاتا ہے اس
 لئے وہ ملائکہ جن پر لفظ جن کا اطلاق کیا گیا ہے وہی ہیں جو انسان سے ہر وقت لازم رہتے ہیں
 اور مدت دن برابر آمد و رفت کرتے رہتے ہیں اور عادت اللہ یونہی جاری ہے کہ ہم انہیں دیکھ
 نہیں سکتے۔ جب خداوند کریم کو یہ منظور ہوتا ہے کہ آدمیوں میں سے کوئی شخص جو دیکھنے کی
 قابلیت رکھتا ہو انہیں دیکھے تو وہ پردہ حجاب دونوں میں حائل ہوتا ہے اٹھا دیا جاتا ہے تب
 وہ شخص انہیں برابر دیکھتا رہے اور کبھی خداوند کریم ملائکہ اور جن کو حکم دیتا ہے کہ وہ مکمل ہو کر
 میں نظر آئیں تب ہم انہیں کھلم کھلا مشاہدہ کرتے ہیں پس کبھی تہنم انسانی صوتوں میں دیکھتے ہیں
 کبھی ان کی اصلی صورت میں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کبھی کبھی کا مین کو اپنی روح بھی نظر
 آجاتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ملائکہ کی اصل پیدائش نور سے ہے اور جن کی پیدائش آگ
 سے اور انسان کی پانی اور مٹی سے۔"

اور پھر صفحہ ۵۰۶ میں لکھتے ہیں "اعلم ان الله ما جعل للاسرار اخفئة الا
 الملائكة منهم لا تنصم الشرائع من حقيقة الاموالی خلقه فلا بد لیسر من اسباب

يكون لهم بها النزول والعرج فان موضع الحكمة يعطى هذا الجعل لئلا يجتهدوا
على قدر ما يتقدم في الانساني يسبقون به من حكمة الا انهم لا يخرجون اليه من حكمة
الخلق فهم بين الخلق والامم يتوزعون ولذا لا يثبت قالوا ما ننزل الا بالامر ربنا
ترجمہ "بعض ملائکہ کے لئے خداوند کریم نے بازوئے نبیؐ میں کیونکہ حضرت امیرؑ سے حضرت خلق
کی طرف سفیر ہیں اس لئے ان کے لئے اسباب ضروریہ تھے چاہیں کہ جن سے چڑھ اور اتر سکیں
کیونکہ حکمت کا یہی مقصد ہے۔ پس ان کے لئے ان کے مراتب کے مطابق بازوئے نبیؐ
کے جن کی وجہ سے چڑھتے اور اترتے اور آمد و رفت کرتے ہیں اور اسی لئے قرآن مجید میں جب
حضورؐ نے حضرت جبریلؑ سے کچھ مدت نہ نازل ہونے کی وجہ دریافت کی تو جبریلؑ کے
جواب کو حکمت خداوند کریم نے یوں فرمایا کہ ہم نیز حکم خدا نازل نہیں کرتے۔"

شیخ اکبر نے مختلف مقامات پر ملائکہ و شیاطین کی تحقیق میں بڑی بڑی لمبی بحثیں
کی ہیں یہاں ان سب کے ایراد کا موقع نہیں۔ حق یہ ہے کہ تحقیق ایسے مسائل کے متعلق
شیخ اکبر نے کی ہے کسی نے نہیں کی۔ مثلاً ایسی موجودات کی حقیقت اور ان کا مادہ اور ان
کے صفات اور خصوصیات اور مابہ الامتياز اور ان کی ضرورت اور ان کے فرائض متعلقہ
وغیرہ امور کو بہت اچھی طرح سے کھولا ہے۔ اگر کسی محقق کو تحقیق مطلوب ہو تو اسے شیخ اکبر
کی فتوحاتِ مکہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں منکرین کو بالخصوص ایک ایسے بڑے محقق فاضل۔
صاحب الالہام والکشف۔ جامع علوم عقلیہ و قلبیہ کی تحقیق غالباً نہایت مفید ثابت ہوگی
کیونکہ یہ وہ شخص ہے جس کی تصانیف میں بعض ایسی باتیں بھی باقی جاتی ہیں جو بڑے بڑے
اکابر علماء کو بھی نصیب نہیں ہوئیں۔ یہ شخص کوئی عام آدمی نہ تھا بلکہ اخص الخواص میں اس
کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہ صاحب ایک موقع پر شیخ اکبر کی عبارت نقل کر کے ثابت کرتے

ہیں کہ شیخ اکبر بھی ملائکہ سے قولے فطریہ مراد لیتے ہیں حالانکہ شیخ کی عبارات مذکورہ بالا سے صاف واضح ہوتا ہے کہ شیخ اکبر ملائکہ کو ایک حقیقتِ مدرکہ مخلوق من النور مانتے ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے ”قال الشيخ في نصوص الحكم وكانت الملائكة من اجس قوی ثلاث الصورۃ التي

ہی صورۃ العالم المعبر عنہ فی اصطلاح القوم بالانسان الكبير۔“ سخت عجیب ہے کہ کیونکر سید صاحب نے اس عبارت سے اپنا مطلب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ اس سے تو عاصی ہی مذہب کا ثبوت ملتا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صورتِ عالم کو جس کو صوفیائے کرام اصطلاح میں انسان کبیر کہتے ہیں اس کے لئے ملائکہ مجموعہ قویٰ میں داخل ہیں یعنی عالم کے تمام کار و بار بغیر ملائکہ کے نہیں ہو سکتے جس طرح کہ انسان کے کار و بار اس کے قویٰ کے بغیر انجام نہیں پاتے پس ملائکہ عالم کے لئے بمنزلہ قویٰ کے ہیں چنانچہ وہ اس کی تصریح یوں فرماتے ہیں ”فكانت الملائكة له كالقوى الروحانية والحسية التي في نساء

الانسان۔“ یعنی کہ ملائکہ عالم کبیر کے لئے ایسے ہیں کہ جس طرح قویٰ روحانیہ وحسیہ انسان کیلئے جس طرح انسان کے لئے قولے روحانیہ وحسیہ مدبر و متصرف ہیں اسی طرح عالم کیلئے ملائکہ * سید صاحب نے یہاں ایک عجیب جملہ دیا کہ جملہ فکانت الملائكة له كالقوى کا ترجمہ یوں کیا ”قویٰ جن کو ملائکہ کہتے ہیں۔“ حالانکہ سوائے زمین کا کوئی عربی و ان اس کا یہ ترجمہ نہیں کرے گا۔ مگر سید صاحب کا مطلب ایسے ہی ترجمہ سے پورا ہو سکتا تھا۔ ناظرین خواہ انصاف سے دیکھ لیں کیونکہ شیخ کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کبیر یعنی عالم بعینہ اسی طرح ہے جس طرح انسان جو عالم صغیر کہلاتا ہے جس طرح انسان میں قویٰ ہیں اسی طرح عالم میں ملائکہ قویٰ کا کام دیتے ہیں۔ اگر ملائکہ سے قویٰ ہی مراد ہوں تو مشبہ اور مشبہ بہ کا متحد ہونا لازم آئے گا جو اصول تشبیہ کے برخلاف ہے۔ اور ایک خرابی یہ ہے کہ سید صاحب نے نہ رشور سے ملائکہ کو صفاتِ باری کہتے ہیں پس لازم آیا کہ قولے فطریہ صفاتِ باری ہوں۔ ”ولا يقول به عاقل۔“ الغرض سید صاحب کا کلام اس موقع پر سخت متناقض واقع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکبر

کے متناکواںہوں نے نہیں سمجھا کیونکہ شیخ کا منشایہ ہے کہ اصل واقعہ پیدائش آدم اور منظر ملائکہ کا حق ہے مگر میں اس سے ایک یہ اعتبار پیدا کرنا چاہئے کہ جو کچھ عالم کبیر میں واقع ہوتا ہے اس کی مثال عالم صغیر میں موجود ہے۔ چنانچہ آیہ ”انی جاعل فی الارض خلیفۃ“ کی ذیل میں وہ لکھتے ہیں ”واعتبروا بحالک فی نفسک“ یعنی اس واقعہ کو بطور اعتبار تو اپنی ذات میں بھی دیکھ لے کیونکہ جو کچھ عالم کبیر میں ہے اس کا نقشہ تیرے اندر موجود ہے۔ سید صاحب نے یہ سمجھا کر شیخ کی مراد اس قصہ سے صرف انسانی قوی کا جھگڑا ہے جس کو خدا نے سمجھانے کے لئے مثال کے طور پر بیان کیا حالانکہ شیخ نے مذاق تصوف پر اعتبار حاصل کیا ہے چنانچہ تمام تفسیریں اس کا یہی ثبوت ہے۔ الغرض شیخ کی عبارت سے اصل واقعہ کا صاف اقرار پایا جاتا ہے شیخ اکبر کو چھوڑیے ہم ایک اور محقق یعنی شیخ عبدالکریم جیلانی مصنف انسان کامل کا حوالہ دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں: ”فنسبۃ الملائکۃ الیہ نسبة القطرات الی البحر نسبة الثماریۃ الذین یحملون العرش منہ نسبة الثماریۃ الی قام الوجود الانسانی بہا من روح الانس“ وہی العقل والوجد والفکر والخیال والمصورة والمخاططة والمددۃ والنفس“ ترجمہ ”ملائکہ کو روح عالم کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قطرات بحر کو بحر سے نسبت ہے اور ان آٹھ ملائکہ کو جو بموجب نصرت آنی عرش کو اٹھائے ہونگے عالم روح کے ساتھ وہی نسبت ہے جو انسان کی آٹھ قوی کو انسانی روح سے نسبت ہے۔ وہ آٹھ قوی یہ ہیں (۱) عقل (۲) وہم (۳) فکر (۴) خیال (۵) مصورة (۶) حافظہ (۷) مددکہ (۸) نفس“ یہ بار بار لکھا گیا ہے کہ صوفیہ کرام نے انسانی ہستی کی ایک ایک چیز کو عالم کائنات کی ایک ایک چیز سے تشبیہ دے کر عالم کو بہتر لے شخص واحد کے فرض کیا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت میں روح سے مراد عالم کی روح ہے جس کو انسانی روح سے تشبیہ دی گئی اور ملائکہ

لے اس کا ثبوت آیت ذیل سے ثابت ہوتا ہے: ”یوم یقوم الروح والملائکۃ“۔ ۲۱۵

اس بشر؟ عالم کے لئے وہی کام دیتے ہیں جو مذکور بالا انسانی آئینہ قوتیں انسانی رُوح کو۔ اب کون
 شخص ہے جو یہ کہے کہ ملائکہ قوائے فطریہ کا نام ہے کیونکہ قوائے فطریہ تو غیر مددگاہی کا نام ہے
 جن کا وجود کسی دوسری چیز میں پایا جاتا ہے اور ملائکہ حقایق مددگار کا نام ہے جو بذات خود
 قائم ہیں۔ امام حجت الاسلام اپنی کتاب احیاء العلوم جلد چہارم میں لکھتے ہیں: "فان هذه
 العين لا تصلح المشاهدة لاسرار الملائکوتية وكل ما يتعلق بالآخرة فهو من عالم
 المملکوت اما ترى الصحابة کيف كانوا يؤمنون بنزول جبرئیل وما كانوا يشاهدونه
 ولهم منون بان الله عليه السلام رثا هذه فان كنت لا تؤمن بهذا فتصحیح اصل لا یمن
 بالملائکة والوحی اهد علیک..... ترجمہ:۔ کیونکہ ہماری یہ ظاہری آنکھ عالم
 ملائکہ کے امور کے مشاہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتی اور عالم آخرت کے تمام امور اذ قسم عالم
 ملکوت میں جو بذریعہ حواس ظاہری محسوس نہیں ہو سکتے کیا تو نہیں جانتا کہ صحابہ جبرئیل
 کے حضور پر نازل ہونے لکھے ایمان رکھتے تھے؟ یا انکہ وہ جبرئیل کو نہ دیکھتے تھے اور اس
 بات پر ایمان رکھتے تھے کہ جناب پیغمبر انہیں دیکھتے ہیں۔ سوائے ناوان اگر تو نزول جبرئیل پر ایمان
 نہیں رکھتا تو سب سے ضروری امر تیرے لئے یہ ہے کہ تو پہلے وحی اور ملائکہ پر ایمان
 لانے کی تصحیح کرے۔"

مذہب متکلمین | اہل اسلام کے لئے قرآن و سنت حجت ناطق ہیں مگر چونکہ غیر مذہب
 والوں کی روک تھام علمائے امت کا فرض ہے اور نیز خود اسلام پاک
 میں بھی کئی فرقہ اہل بدعت دہوا پیدا ہو گئے ہیں اس لئے گروہ متکلمین نے حسب ضرورت وقت
 ہر ایک قسم کے خیالات فاسدہ کا قلع و قمع بذریعہ دلائل وبراہین عقلیہ تجویز کیا مگر حق یہ ہے کہ
 دلائل عقلیہ صرف مادی دنیا کے متعلقہ مباحث میں تو کارآمد ہو سکتے ہیں اور جو امور ہائے حواس
 سے بالاتر ہیں ان میں تعلیم وحی کے سوا کوئی چارہ نہیں البتہ براہین عقلیہ سے ہم ایسے امور کا امکان
 ضرور ثابت کر سکتے ہیں اور جب امکان ثابت ہو جائے اور تعلیم وحی اس کی تصدیق کرے تو یقین

کے لئے کافی ہے جو لوگ ملائکہ کا ثبوت اصول طبیعیات و فلسفہ پر لیا چاہتے ہیں انہیں بحر نامی کے کبھی کبھہ حال نہیں ہوتا۔ یہ لوگ سرے سے اپنی ابتدائی غلطی سے ناواقف ہوتے ہیں کیونکہ جب وہ ملائکہ کا ثبوت اصول طبیعیات پر مانگتے ہیں تو گویا وہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ملائکہ بعینہ اجسام مرکبہ کی طرح مخلوقات ہیں یا یوں کہو کہ وہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ مادی موجودات کے خواہ کبھی قسم کی موجودات کا وجود ناممکن ہے حالانکہ بڑے زبردست دلائل سے یہ بات پائے ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ عالم مادی عالم روح کے لئے بمنزلہ آثار و اظلال کے ہے اس خیال کی تصدیق میں کتب سماویہ ناطق ہیں۔ اور بحر فلسفہ طبعیین یا دہر میں کے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ علامہ عبد الکریم شہرستانی نے اپنی کتاب مل و نخل میں فرقہ تصابہ اور فرقہ حقا کا ایک مناظرہ نقل کیا ہے جس سے عالم روحانی کے موجودات اور ان کی شرافت و نزاہت اور بعض دیگر مسائل دقیقہ مشلاً کیفیت مبداء و معاد عالم کا بہت عمدہ ثبوت دیا ہے۔ افسوس یہ مناظرہ بہت طویل ہے جس کو میں اس مقام پر نقل نہیں کر سکتا۔ اس مناظرہ کے ضمن میں جو بطور مثال وجواب کے لکھا گیا ہے بعض ایسے اعتراضات کا جواب بھی حاصل ہوتا ہے جو عموماً فلسفی مزاج لوگوں کے دلوں میں بطور شکوک و سادس کے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جن کی وجہ سے ان کے اعتقادات کبھی صحیح نہیں ہوتے۔ اس قسم کے لوگوں کو مناظرہ مذکورہ بالا نہایت غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔

ابن خرم ظاہری اپنی کتاب الفصل فی الملل، الکلام، اعدا النخل کی جلد اول میں عنوان "الکلام علی ما ینکر النبیۃ والعدلائکۃ" میں ایک لمبی تقریر کے بعد لکھتے ہیں جس کا حاصل ہے کہ میں معلوم ہے کہ کمرہ زمین اور تمام اجسام مرکبہ مادیہ مردہ ہیں جن میں حیات موجود نہیں البتہ بعض اجسام مرکبہ صاحب حیات ہیں اور وہ وہی جن کو ہم حیوان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں

۱۷ امام ابو الفتح محمد بن عبد الکریم شہرستانی المتوفی ۴۵۰ھ ۱۲ منہ ۷۵۰ ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن خرم ۸۵۰
میں شہر قرطبہ میں پیدا ہوئے جس کو بجل کارو ودا بولتے ہیں۔ ۱۲ منہ ۷۵۰

اس سے معلوم ہوا کہ دو صفت ہدایت ان اجسام میں صرف نفوس کے اتصال سے پیدا ہوئی ہے جن میں
ادراک اور کمال علمی بوساطت قوتی مافی البدن برتے ہوتے ہیں کیونکہ نفس کے بدن سے بخارہ ہو
جاتے پر یہ کیفیات پیدا نہیں ہوتیں اور یہ معلوم ہوا کہ یہ شرف صرف خالق مجروحہ سے مخصوص ہے
اجسام مرکبہ کا یہ خاصہ نہیں جیسا نفوس بشریہ کی جو جسم سے تعلق رکھتے ہیں یہ حالت ہے تو ایسا نہیں
کے تسلیم کرنے سے کیا ملے گا جو بالکل مجروحہ کہ بدیدہ کمال ادراک اور کمال علمی سے موصوف
ہوں کیونکہ نفوس بشریہ عالم اجسام میں بنزلہ ان احوال مجروحہ کے ہیں جو عالم روحانی میں موجود ہیں
(مستقوقہ یعنی یہی کہتے ہیں) بعد ازاں لکھتے ہیں "وہذا صفة الملائكة علیہم السلام علی
یہذا ان علی قدر سعة ذلك المكان یكون كثرة من فیہ من اہلہ و عمارہ و انہ
لا تنسبہ لہا فی هذا المحل الحقیق والفقطة الکدرا و مما ہذا لکما لانبیاء
لہذا المكان من ذلك و یہذا أصح الہدایة و ہکذا احتیروا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم عن كثرة الملائكة فی الاحیاء المسندة الثابتة عنہ صلی اللہ علیہ وسلم
و یہذا واجب ان یقولوا الحمد للہ علیہ وسلم"

یہ صاحب کے بعض فقرات پر سرسری نظر | سید صاحب نے انکار کیا کہ یہ رہنمائی زور و یاس ہے مگر

لے یعنی حیات و ادراک وغیرہ انہیں بشریہ کام میں ہی ملائکہ کی صفت ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہاں ملائکہ نہیں ہیں بل گن
کی رسم سے بقدر ان کی تعداد کے ہے اور جو موجودات اس عالم ادنیٰ میں موجود ہے اس کو وہاں کی موجودات سے کچھ نسبت نہیں
اور ایسا کہ جنود و رات الاہوا جس طرح یہاں کی شتا کو وہاں کی قضا سے کوئی نسبت نہیں اس امر کی تصدیق میں حضور خیر
صادق نے اسی طرح خبر دی ہے جو اخبار صحیحہ میں موجود ہے اور یہیں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خدائی طوطا عالم ہادی میں تیرا سر
لئے الہی اور واسطہ بنتے ہیں ۲ اس مسئلے ہم کبھی سید صاحب کے فقرات کو نہ بحث نہ لائے مگر جیسا کہ لانا پڑتا ہے یہ کہ بعض اصحاب
کے فہم میں سید صاحب کے خیالات بنایا ہے عقلم ہو گئے ہیں۔ حالانکہ فرض ہے کہ ان کی تعلیم فکر و دین مگر فہم نہیں لیتے کہ وہ صاحب
دین کی کچھ باتیں نقل کیا ہے مگر یہ کچھ نصیحت بات کی امید کہ ان کا طبع ہے خدائے علیم جانتا ہے کہ ہم بعض تفسیری سے اس کے تفسیر میں ۲ اس

افسوس کہ کوئی ذات آپس سے بن نہیں پڑی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں سید صاحب نے تفسیر لکھی اس وقت ان کے خیالات ایسے ہی تھے۔ بعد میں اس مسئلہ کے متعلق جب جاننے ان کی تعلیم کی تو کسی قدر اپنے خیالات کو بدلنے پر مجبور ہوئے کہ وہ مولوی علی بخش صاحب مرحوم نے جب آپ کو بڑے زور سے ملزم قرار دیا تو آپ نے اپنی ترمیم کے لئے پہنچ تہذیب الافعال و اشعیان لکھ کر میں یہ فقرہ لکھا۔ اس عقیدہ میں بھی میری نسبت کسی قدر اتہام ارقام فرمائے ہیں جن کو میں بیان کرتا ہوں (مگر نگاہ سے مراد قولے انسانی ہیں) میرا یہ قول ہے کہ ملک کے لفظ کا قولے انسانی پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ سید صاحب کی اس عبارت میں لفظ "اتہام" سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اپنے تئیں اس عقیدہ سے بری کرتے ہیں اور لفظ بھی نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ سید صاحب قائلے نظریہ کے علاوہ بھی حقیقتاً ملک کے قائل ہیں اور قولے انسانی پر بطور مجاز ملک کا لفظ بولنے کے قائل ہیں مگر ان کی تفسیر میں صاف انکار یہ فقرات موجود ہیں اور غالباً یہ اسی قسم کا جو عہد ہے جو انہوں نے مسئلہ اجابت و دعائیں کیا ہے کیونکہ تفسیر میں اجابت و دعا کا صاف انکار ہے مگر بعد میں جو سال لکھا اس میں اس مضمون کی کسی قدر تعلیل کی اور یہ ظاہر کیا کہ یہ کسی اجمال کی تفصیل ہے جو تفسیر میں ہم نے لکھا ہے۔ مگر یہ وہ عبارات کا مفہوم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

(۱) سید صاحب آیہ "فالمدبرات امرأ" کو بطور حجت پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب غور کرنا چاہئے کہ مدبرات امور کون ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مدبرات امور ملائکہ ہیں نہ قولے فطریہ۔ آپ بھی تو مانتے ہیں "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" پھر چاہئے تھا کہ قرآن ہی سے فیصلہ کرتے کہ مدبرات امور کیا ہیں۔ آپ نے لفظ مدبرات سے پہلے شروع سورت میں جو صفات مذکور ہیں ان کو تو چھڑ دیا اور مدبرات کو لیلیا مدبرات سے اگر قولے فطریہ مراد ہیں تو پہلے صفات کو بھی ان پر مطابق کیا ہوتا مگر کہاں لیجئے قرآن مجید میں دوسری جگہ اس کی تفسیر موجود ہے "لہ محقیبات من بین ید یدہ ومن خلفہ لہ وسان کے لئے رات بعد دن کے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اسکے لئے اول کے پیچھے جس کو حکم خدا

يُحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ۔ اس آیت شریفہ کی تفسیر میں خود جناب پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا۔ يَتَّبِعُ الْقَبُولَ فِيكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ وَيُحِيطُونَ فِي صَلَوةِ الْفَجْرِ وَصَلَوةِ الْغَمْرِ... الخ۔
مدبرات سے وہی ملائکہ مراد ہیں جو مختلف امور عالم کے انصرام پر متعین ہیں۔ ان ملائکہ کا کام یہ ہے کہ دنیا کے روزمرہ حوادث کے اسباب پر حکم خداوندی ہم پہنچاتے ہیں۔ تو اسے خطریہ کا نہ تو توجہ نہ مذکورہ بالا میں کوئی بیان ہے اس حدیث مسطورہ میں ۛ

(۲) پھر لکھتے ہیں:-

بلکہ انہی آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ جس شے کو یہود و جبریلؑ تعبیر کرتے تھے وہ کوئی جداگانہ مخلوق حقیقت شخصہ نہ تھی۔ سبحان اللہ اس عبارت سے پہلے یہ کہہ سکتے تھے کہ یہود کے نزدیک تو جبریلؑ ایک موجود شخص ہیں اب انکار بھی کر دیا۔ اب ان دو باتوں سے ایک ضرور غلطی ہے (۳) آپ لکھتے ہیں:-

”ہاں اس قائلہ تسلیم ہو سکتا ہے کہ اسی مائدہ نبوت پر جبریلؑ کا اطلاق ہوا ہے۔ اس تسلیم کی کوئی وجہ بھی ہے یا صرف آپ کی ہی زبان پر تمام قرآن کے معانی کا مدعا ہے۔ (۴) آپ لکھتے ہیں:-

”کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ خدا کے پاس باوجودیکہ ان دو فرشتوں کے سوا اور بھی بہت سے فرشتے ہیں مگر خبرِ نبوت فرشتوں کے اور سب لے نام ہیں کیونکہ کسی اور کا نام قرآن میں نہیں آیا؟“

اس پر تعجب کرنا سراسر آپ کی غلطی ہے اگر اس پر تعجب کرتے ہیں تو اس پر کیوں تعجب نہیں کرتے کہ ہزاروں صحابی پیغمبرؐ کے تھے ان میں سے بجز زید کے اور کسی کا نام قرآن میں نہیں آیا کیا

(القیہ حاشیہ) محفوظ لکھتے ہیں۔ ۱۲۰ منہ۔ ۱۵۰ یعنی یکے بعد دیگرے آسمان میں فرشتے رات کو اور دن کو اور نماز فجر

اور نماز عصر کے وقت جمع ہوتے ہیں۔ ۱۲۰ منہ ۛ

بجز زید کے آپ کے نزدیک اور تمام صحابہ بے نام تھے اور کیا مالک اور زبانیہ ملائکہ کا نام قرآن مجید میں نہیں آیا؟
(۵) آپ لکھتے ہیں:-

”حضرت عزرائیل بھی بڑے مشہور فرشتے ہیں جو سب کے پاس آئینگے اور کسی کو نہیں چھوڑینگے۔ اگر چہ ان کا ذکر یہ لفظ ”ملاک الموت“ قرآن میں آیا ہے مگر ان کا کچھ نام نہیں بیان ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بڑے جلیل القدر صحابی تھے اور سب کو معلوم ہے کہ جناب رسول اللہ کے بعد منصب خلافت آپ ہی کو ملا تھا۔ اگر چہ ان کا ذکر قرآن مجید میں بہ الفاظ ”انی اثنین“ آیا ہے مگر ان کا نام بیان نہیں ہوا کیا آپ یہ نتیجہ نکالیں گے کہ حضرت صدیق اکبرؓ درحقیقت کوئی صحابی نہ تھے؟“

خدا جانتا ہے کہ محض بچوں کی سی باتیں ہیں جن کو ایک ایسا شخص جو قرآن جیسی کتاب کو حل کرنے کا مدعی ہو ہرگز زبان پر نہیں لاتا۔
(۶) آپ لکھتے ہیں:-

”ان سب باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ فرشتوں کے نام یہودوں کے مقرر کئے ہوئے ہیں جو مختلف قوی کے تعبیر کرنے کو اپنوں نے رکھ لئے تھے۔“

دلیل و مدلول میں رابطہ دینا کوئی آپ ہی سے سیکھے۔ وہ کون سے مقدمات برہانہ میں جن سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ کیا یہی مقدمات کہ جبریل و میکائیل کے سوا کسی فرشتہ کا نام قرآن میں مذکور نہیں اور عزرائیل کو یہ لفظ ”ملاک الموت“ بیان کیا گیا ہے۔ اگر واقعی یہی مقدمات ہیں تو یہ بریں عقل و دانش بیاہیدہ گریست۔ ہمارا قلم منہ زور بتاتا چاہتا ہے مگر کیا کریں آپ اس وقت ہمارے ہم نرم نہیں اور آپ کے نادان دوست حق سنا گوارا نہیں کرتے۔

گفتگو آئین درویشی بنود - ورنہ باتو ما جواہر ادا شتم

آپ کے اس قول پر کہ یہ نام یہودوں کے وضع کئے ہوئے ہیں یقیناً آپ کے پاس کوئی کمزور

سے مکڑہ دلیل بھی نہیں محض آپ ملن کی پروی کر رہے ہیں۔ اگر ملائکہ کے نام نہ مذکور ہونے سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے تو میں قویٰ نظریہ کو آپ پیش کرتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا یہی نام قرآن مجید نے مذکور نہیں کیا اس سے آپ یہ نتیجہ نکالیں گے کہ قویٰ نظریہ کا یہ تحقیق کوئی وجود نہیں۔ اور اگر آپ ان کے قرآن مجید میں ہونے کا دعویٰ کر سکیں تو مصداق ایجا دیندہ ہونگے۔
(۷) پھر آپ لکھتے ہیں کہ:-

”ہاں اس قدر تسلیم ہو سکتا ہے کہ قدیم عرب اور نیز رسول خدا صلعم کے زمانہ کے عرب بھی ملائکہ کا الملاق ان قویٰ پرچہ سے اور وہ قانون قدرت کے دیکھ کے اموات انجام پاتے ہیں کرتے تھے صریح غلط اور محض انحراف ہے۔ واقعی یا اللہ شہید! اہل عرب کے ہاں خاص نام قویٰ کے لئے علیحدہ علیحدہ الفاظ مقرر ہیں کسی قوت کا نام ملائکہ نہیں۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ اس زمانہ کے عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ قال اللہ تعالیٰ ”جعل الملائکۃ عباداً للہ جن اناثا“۔ یعنی ملائکہ کو جو خدا کے مطیع و فرمانبردار بندہ ہیں خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں حالانکہ وہ کسی قوت کو نہ خدا کی بیٹی کہتے تھے نہ ان کی عبادت کرتے تھے۔ پس آپ کے اقرار پر خود قرآن مجید کافی دلیل ہے عرب کے کسی کلام سے قویٰ فطریہ کا مدبر عالم ہونا ثابت نہیں۔ یہ آپ کا اہتمام ہے۔
(۸) اس کے بعد آپ نے اور ایک کمال دکھلایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں جیہ کہ البعبعیدہ

جاہلی کے اس شعر میں:-

فَلَسْتُ لَا نَسِيحٍ وَلَكِنْ لَمْلَأْتُكَ - تَتَوَلَّى جَوَّ السَّمَاءِ يَصُوبُ
صوب کہتے ہیں مینہ کو اس لئے اس شعر سے پایا جاتا ہے کہ مینہ برسانے کی جو قوت ہے اس کو فرشتہ سمجھتے تھے۔ سبحان اللہ کیا کوئی شخص بھی نہیں رہا جو انصاف دوست ہوا اور حق کو قبول کر کے اپنی ایمانی طاقت کا ثبوت دے؟ ہم اس کا کیا جواب دیں؟
فَانْ كُنْتَ لَا تَدْرِي خَذَا الْعَصِيَةِ - وَاَنْ كُنْتَ تَدْرِي الْمَصِيْبَةَ اعْظُمْ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب یوں سمجھتے کہ تمام دنیا بھال سے بھری ہے جس طرح چٹائیں چلنے لگیں گئے مگر یہ دیکھ چکا کہ آخر حق ہی ہو گا کہ اسے اور باطل باطل۔ اس شخص سے استفہاد کرنے میں ماشاء اللہ آپ نے چار ٹھوکریں کھائی ہیں۔ حسب ذیل :-

(۱) ابو عبیدہ کو آپ زمانہ جاہلیت کا شاعر کہتے ہیں۔ یہ آپ کی تاریخ دہائی پر دل ہے حضرت من ابی عبیدہ معروف و مشہور راہب میں ظلم و نحو کے۔ ان کا اصلی نام محرم تھا باب کا نام نشتی۔ اشعار تالیف کی وجہ سے آؤنی ہیں۔ ابن عساکر کہتے ہیں کائنات و کائنات فی وجہ اسناد حشر و ما فی الایلة النبی توفی فیما الحسن البصری یعنی ما وجہ اسناد میں اس رات کو سید پر گئے جب ہوا چھوٹی بصری اور تمام کر گئے انسان کی وفات سے یا اسے یا اس میں ہوئی ۔

(۲) آپ اس کو ابو عبیدہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ امر آپ کی ادب دہائی کا منقصر ہے کہ شہ ہے۔ یہ ابو عبیدہ کا شعر نہیں اور میں معلوم ہے کہ آپ نے یہ شعر صحاح و تہذیب سے لیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :- "النشد ابو عبیدہ لہجہ من عبد القیس جاہلی بیدح بعض الملوک" یعنی ابو عبیدہ مخومی نے بنی عبد القیس کے ایک شاعر جاہلی کا جس میں وہ ایک اور شاعر کی تعریف کرتے سنداً یہ شعر پیش کیا ہے۔ آپ نے ایک آسان عبارت کا مطلب کہ نہیں سمجھا مگر قرآن مجید کی ترکیب پر بحث کرتے وقت فراء اور سیویہ کے بھی کان کرتے ہیں ۔

(۳) فلسفہ کی جگہ آپ نے لست کہ عدا مالانکہ بغیر حرف فاء و من شعر مرست نہیں ہوتا۔ یہ آپ کی عود من دانی کا نتیجہ ہے۔ گویا اعتراض نفس استدلال میں نظر نہیں مگر جب آپ کی تعلی پر غور کیا جائے تو آپ کے متبعین پر جواب کو اپنا پیغمبر سمجھتے ہیں ظاہر کہ دنیا واجب ہے (۴) لفظ مذک جو کہنی ملک ہے سے، آپ وہ توفہ مروا لیتے ہیں جس سے بارش ہوتی ہے

۱۔ (بقیہ ماضی) اگر توفہ نہیں مانتا تو یہ عیب ہے اور اگر توفہ مانتا ہے (اور ایسا کتاب ہے) تو یہ بڑھ کر عیب ہے ورنہ

حالانکہ شعر میں ملوہی فرشتہ ہے جس کا آپ انکار کر رہے ہیں خود لفظ انسی کے مقابلہ پر اس کا لانا
دلائل کرتا ہے کہ شاعر ممدوح کا نوع انسان سے بالاتر ہونا ثابت کرتا ہے۔ کیا انس بھی آپ
کے نزدیک یعنی انسان نہیں؟ بلکہ کوئی قوت ہے تاکہ مقابلہ درست ہو کیونکہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی
کہ شاعر ممدوح کو نوع انسان سے خارج کر کے اس کو قوت فطری قرار دے کیونکہ شعر کا ترجمہ
یہ ہے:- کہ

اے ممدوح کسی انسان کی طرف تو منسوب نہیں بلکہ تجھے فرشتہ کہنا چاہیے جو آسمان
پر سے ایش لے کر اترتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو نوع انسان سے بالاتر ہے کیونکہ تیرا فیضان
اس قدر عام ہو گیا ہے کہ تجھے فرشتہ باران کہنا زیادہ جواہل و نیا کیلئے موجب حمت ہو کرتا ہے۔
یہ بعینہ ہی خیال ہے جو زمان مصر جمال یوسف کا نظارہ کر کے بلا اختیار پکارا ٹھی تھیں "ان
هذالامم لکسرہم"۔ یعنی یہ تو فرشتہ ہی ہے۔ کیا یہاں بھی آپ کی یہ مراد ہو گی کہ زمان مصر
کے نزدیک یوسف ایک قوت فطری ہیں؟ کوئی سمجھ دار آدمی تو اس نحویت کا قائل نہیں
ہو سکتا۔ سیاق و معنی خود پُرانا ظاہر کر رہا ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف شاعر نے انتقال کیا ہے
یعنی ممدوح کو انسان سے فرشتہ قرار دیا ہے۔ نہ یہ کہ تو انسان نہیں ہے بلکہ تو ایک قوت فطری ہے
اچھا دوسری طرح سہی۔ ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ قوت کیا چیز ہے؟ آیا کوئی شے
قائم بالذات ہے یا قائم بالغیر؟ اگر قائم بالذات ہے تو مرئی ہے یا غیر مرئی؟ اور اگر قائم بالذات
اور غیر مرئی ہے تو اگر وہ از نوع ملائکہ نہیں تو اور کیا چیز ہے؟ اور اگر قائم بالغیر ہے تو کس کے
ساتھ قائم ہے؟ اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ شاعر نے وہ قوت قائم بالغیر مرادی ہے؟ غالباً
اس کا جواب آپ سے تاقیامت نہ بن پڑتا۔ یہ ہے آپ کی قوت استدلال کا نتیجہ جس سے
چند ایک ناواقفان کو آپ نے شکوک و ابہام کے دلدل میں پھنسا دیا ہے

خواجہ پندار کو کہ وارد حاصلے - خواجہ را حاصل بخیر پندار نیست

(۹) آپ لکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے جو عرب کے بت پرستوں کا عقیدہ

(۹) آپ لکھتے ہیں ”کہ تمام مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے جو عرب کے بُت پرستوں کا تھا۔“
 بالکل غلط اور سفید جھوٹ کیونکہ کوئی مسلمان فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں نہیں مانتا اور لطف یہ ہے کہ خود
 ہی حضور دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں کہ اب ہم کو اس بات کی تلاش کرنی ہے کہ قدیم مشرکین عرب کا
 فرشتوں کی نسبت کیا خیال تھا؟ جہاں تک کہ ہم نے تحقیق کی ہے قدیم عربوں کا لفظ ملک اور
 ملک کی نسبت ایسا خیال جیسا کہ یہودیوں کا ہے ثابت نہیں ہوا۔ پھر صفحہ ۴۰ پر آپ اہل اسلام
 اور یہود کا عقیدہ فرشتوں کے متعلق ایک ہی قرار دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اہل اسلام اور مشرکین کا اعتقاد
 ایک نہیں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ آپ کی کوئی بات سچی مانی جائے؟ عجیب قسم کا جنط ہے کہ اس
 صریح تناقض پر بھی آپ کو محقق ہونے کا دعویٰ ہے۔ کیا کوئی انصاف پسند ہے جو یہ پکاراٹھے کہ
 میں سید صاحب کے عقائد سے باز آیا اور قیامت کے دن کے لئے دوسروں کو اپنا شاہد بنانا
 یوں؟ آخر ایک نہ ایک دن مرکزِ احکم الحاکمین کے حضور میں چلیں گے جہاں دودھ کا دودھ
 اور پانی کا پانی دکھایا جائیگا۔

(۱۰) ”قرآن مجید سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے ثابت نہیں“
 آپ تذکرہ الصمد آیاتِ قرآنیہ کا جواب دے لیں پھر یہ بات منہ سے نکالیں۔
 (۱۱) پھر آپ نے آیہ ”وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا“ سے استدلال کر کے اپنا
 دعویٰ ثابت کرنا چاہا ہے حالانکہ یہی آیت ان کے خیال کا قلع قمع کرتی ہے۔ کیونکہ مشرکین یہ کہا
 کرتے تھے کہ ہمارے پاس ہدایت کے لئے بچائے اس نبی کے کوئی فرشتہ کیوں نہیں آتا۔ خدا نے
 فرمایا ”وَلَوْ اَنزَلْنَا مَلَائِكَةً لَّكُنَّا مِنْكُمْ لَمَنَظِرًا“ یعنی اگر ہم فرشتہ ان کے پاس بھیجتے
 تو بات کا فیصلہ ہی ہو گیا ہوتا اور پھر آئندہ اس وقت تک انہیں یہ ہدایت ہی کیوں دی جاتی؟
 کیونکہ فرشتہ کو حقیقی صورت میں دیکھنا طاقتِ بشری سے خارج ہے چنانچہ انبیاء کو بھی مشکل
 ہو کر نظر آتے ہیں پھر فرمایا ”وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكَ لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبِئْسَ مَا لِبِئْسُونَ“
 یعنی اگر نبی ہم کو کوئی فرشتہ ہی مقرر کرتے تو پھر بھی انسان ہی کی شکل میں ہوتا اور پھر وہی بات تمھاری

یعنی کہ یہ لوگ شک میں پڑے رہتے اور کبھی باور نہ کرتے کہ یہ ملک بصورت انسان ہے بلکہ یہ کہتے
کہ کوئی معمولی آدمی ہے جیسے کہ اب پیغمبر کو سمجھتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ملائکہ محترم
مشیا کا نام ہے جن کا دکھائی دینا ممکن ہے مگر نہ اس طور پر کہ ہر ایک شخص جب چاہے مشاہدہ
کر لے۔ اسی صورت میں ان کی استدعا اور جو جواب انہیں دیا گیا مطابق ہونگے اور اگر ایسا نہ ہوتا
تو یہ کہنا کافی تھا کہ اے نادانو! کیا فرشتہ بھی کوئی ایسی چیز ہے جو دکھائی دے؟ اس کو نہیں
سیارہ کے شروع میں بھی بتلایا ہے اور وہاں الفاظ یوں مریدوں کے لئے فیصلہ کر دیا
ہے کہ جو فرشتہ معنی متعارف جو تسلیم کئے گئے ہیں ثابت ہے *

(۱۲) پھر لکھتے ہیں۔ "بعض اکابر اہل اسلام کا بھی یہی مذہب ہے جو میں کہتا ہوں اور امام
محی الدین ابن عربی نے "فصوص الحکمہ" میں بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔"
حاشا وکلا۔ قطعاً و یقیناً بخدا! ہم نزل کہ اکابر اسلام میں سے کسی نے اس لنوا اعتقاد کا
اظہار کیا ہو۔ رہا شیخ اکبر کا معاملہ سو ہم نے گذشتہ سطور میں ان کی عبارات کو نقل کر کے دکھایا
ہے کہ شیخ بڑے زور کے ساتھ جو دلائل کو اسی صورت میں تسلیم کرتے ہیں جو اہل حق کے نزدیک
مسلم ہے۔ افسوس! آپ خواہ مخواہ اکابر کا نام لے کر بیچا لے انگریزی خوانوں کو دھوکا دے گئے
لغوہ باللہ من ذلک *

(۱۳) پھر آپ شیطان کی نفی میں لکھتے ہیں "خدا نے فرمایا کہ جو دوسوے دل میں آتے ہیں
ہم اُن کو جانتے ہیں۔" کوئی پوچھے کہ اس سے شیطان کی نفی کیونکر ہو گئی؟
(۱۴) پھر لکھا ہے "خدا نے فرمایا کہ نفس ہی بُرائی کرنے کو کہتا ہے۔"

قرآن مجید کی کسی آیت کا نہ تو یہ عبارت ترجمہ ہو سکتی ہے نہ حاصل۔ اگر کہیں کسی نے
قرآن کی آیت ہو تو ہو غالباً آپ نے آیت "ان النفس الامارۃ بالسوء" کا ترجمہ کیا ہے مگر ہم دعویٰ
سے کہتے ہیں کہ سرزمینِ مراکش سے دیوار چین تک ایک عربی دین بھی ایسا نہیں ملے گا جو اس ترجمہ
کو صحیح کہنے کی جرأت کرے۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ بیشک نفس برائی کی طرف بڑھتا ہے۔

مگر آپ نے جو ترجمہ میں لفظ ہی کی تخریج کا وہی تو کس قاعدہ سے؟ اس لفظ نے کلام کا مفہوم ہی
 کچھ اور کا اور بدل دیا۔ یہ آپ کی ظلم استعدادی کا نتیجہ ہے یا خیانت کا؟ ہم نیک نیتی سے
 یہی یقین کر چکے کہ آپ عربیت سے بالکل نا آشنا ہیں ایسی ہی غلطیاں آپ نے مختلف مواقع
 پر کیں ہیں مگر ان میں سے بجز ایک واقف کے دوسرے بیچا سے موازنہ نہیں کر سکتے۔

علم معانی پڑھے جانتے ہیں کہ قصر الصفۃ علی الموصوف یا قصر الموصوف علی الصفۃ سے
 تخصیص پیدا ہو جاتی ہے اس کی اردو زبان میں یہ صورت ہوگی "شاعر زید ہی ہے"۔ زید
 شاعر ہی ہے "اس قاعدہ کے مطابق اگر آپ کے ترجمہ کو عربی میں لکھا کہ کیا جائے تو آیت
 کے الفاظ کی صورت ترکیبہ یوں ہونی چاہیے۔ "ان الامامہ وہی النفس"۔ ربے شک
 نفس ہی بڑائی کا حکم دیتا ہے! اس صورت میں آپ کا دعویٰ یعنی نفی شیطان بخوبی ثابت
 ہو سکتا ہے آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ نفس بہت بُری چیز ہے جو انسان کو بڑے زور
 سے بڑائی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے کہیں کسی نقطہ سے یہ ترشح نہیں ہوتا کہ سوائے نفس کے
 اور کوئی چیز بڑائی کی طرف حکم دینے والی نہیں۔ آپ نے لفظ ہی اُپر صا کر خواہ مخواہ تحریف کا
 الزام اپنے سر لیا۔

(۱۵) پھر آپ ایک مقام پر جبریل کے واسطہ دہی ہونے کے انکار میں یوں درافشانی
 کرتے ہیں کہ آیہ اِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعْ لَهُ فَخُذْ مِنْهُ حِسَابًا مَّا رَتَبَ لَكُمُ الْكُتُبُ وَالْأَقْلَامُ خُذْ
 قرآنِ تَلْسِ بِمُغْبِرٍ بِرِئَاسِ كِیَا لِنِیْ خُودِ دِل سے پھوٹا کیونکہ 'قَسَمَ نَاہُ' صیغہ جمع متکلم ہے چونکہ تلبیت
 فعل کی خدشہ اپنی ذات کی طرف کی ہے اسلئے ثابت ہوا کہ کوئی واسطہ نہیں۔ میں کہتا ہوں
 کہ آپ کا استدلال بالکل پادور ہوا ہے۔ کیا اگر کوئی شخص یوں کہے کہ علیگڑھ کانچ کے بانی

۱۷ لے پیغمبرِ حب ہم پڑھ چکیں تو تو اس پڑھنے کی پیروی کیا کر لینی پوری آیت پڑھ جائے
 کے بعد تو اپنی زبان پر لایا کہ۔ ۱۲ منہ جو

سید صاحب ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ سید صاحب اینٹ چوڑا اور تعمیر کا کام خود بنفس نفیس کرتے رہے ہیں؟ کیا اسناد مجازی اور اسناد حقیقی کا مسئلہ علم معانی میں بیان نہیں ہوا؟ قرآن مجید میں بسا اوقات خداوند کریم نے ضلال کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اور بسا اوقات شیطان کی طرف بھی نسبت کیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کبھی فعل کی نسبت علت بعیدہ کی طرف ہوا کرتی ہے اور کبھی علت قریبہ کی طرف۔ اس کی مثالیں ہر ایک زبان میں بہ کثرت موجود ہیں لیجئے قرآن شریف ہی سے مثال پیش کی جاتی ہے۔ "یا ہامان ابن لی صہحاً" (فرعون نے اپنے وزیر سے کہا کہ لے ہامان تو میرے لئے ایک محل بنا کر) کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ لے ہامان تو جا کر خود ٹوکری سر پر اٹھالے۔ افسوس آپ ایسی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں اور پھر دعویٰ ہے کہ سلف و خلف کی تحقیق پر جمع کئے بغیر ایک قدم آگے نہیں چلتے۔ کیا اسی تحقیق پر آپ نے جبریل کا انکار کر کے یہ لکھا تھا "من از روح الایں قرآن پہنچاے مئی خوانم۔ اگر اس انکار کا نتیجہ یہی تحقیق ہے تو بس معلوم ہوا کہ عمر بھر حق سے کوسوں دُور رہے ہیں اور اگر آپ کو الہام و کشف ہوا ہو تو آپ کے لئے حجت ہو گا نہ کسی غیر کے لئے *

(۱۶) پھر لکھتے ہیں "غرضیکہ تمام محققین اس بات کے قائل ہیں کہ انہیں قویٰ کو جو انسان میں ہیں اور جن کو نفسِ آمارہ یا قوائے بھیمیہ سے تعبیر کرتے ہیں یہی شیطان ہے۔" محققین سے مراد آپ کی کلہا پان فروش اور سلروانا بنائی ہوئے وند جس کے دماغ پر خدائے کچھ بھی نور عقل کا پرتو ڈالا ہے وہ تو ایسی لغو بات منہ سے نہیں نکالے گا بلا حجت محض وہ یہ یورپ کی پیروی میں ایک بات کہ دنیا کسی ایماندار کا کام نہیں۔ قرآن و سنت آپ کی تشریح کے محتاج نہیں کیا انہیں باتوں پر آپ کہا کرتے تھے کہ جو انسان کے لئے ہیں نے یہ تفسیر لکھی ہوئی کیا انہیں صحیح اعتقاد کی ضرورت نہیں؟ آپ نے تو تعلیم یافتگان کے حق میں مذہبی دشمنی کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا اور آج کل جو اتحاد بعض لغو پرستوں کی طرف سے پھیل رہا ہے یاد رکھیں کہ اس کی جوابدہی کا بڑا بوجھ آپ ہی کی گردن پر ہے *

آپ نے تحقیق کا لفظ تو منہ سے نکال بھینکا ذرا دو چار کا نام تو لکھ دیا تو تاہم توبہ تحریر الحرام میں کھڑے ہو کر یہ جملہ کہنے کو تیار ہیں کہ بدلے لایزال کیہ محض بہتان ہے۔

حضرات صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور بعد کے علمائے محدثین و متکلمین و صوفیہ کرام میں ایک بھی ایسا شخص نہیں گذر جس نے ملائکہ اور شیطان کا انکار کیا ہو۔ یہ کیسی جرأت ہے کیوں ہی محققین کا لفظ آپ نے بڑ دیا؟ ہاں ممکن ہے کہ آپ کی مراد بعض ان حکماء سے ہو جو آپ کی طرح کلمہ لا الہ الا اللہ سے زیادہ کچھ مفہوم نہیں سمجھتے اور غالباً اگر آپ یا آپ کا کوئی دام افتادہ حوالہ دے گا تو حکمائے منکرین کے اقوال کا حوالہ دے سکے گا۔ ورنہ علمائے قرآن و سنت میں سے تو ایک شخص بھی آپ کا ہم خیال نہیں مل سکے گا۔ اور حکماء کے قول کو جو وقعت قرآن اور سنت کے سامنے حاصل ہے وہ معلوم ہی ہے۔

اب میں آپ کے اسی قدر فقرات پر جرح کو ختم کرتا ہوں ورنہ آپ کی تفسیر کا ایک ایک لفظ کاٹ دینے کے قابل ہے۔ ناظرین بطور مشق از خروائے خود اندازہ لگا لیں گے۔

ناظرین! آپ اس امر کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ سید صاحب کے خیالات مذہبی فلسفہ طبعیین اور بعض دیگر مذاہب ضالہ کے اصول سے ماخوذ ہیں۔ آپ اگر ترتیب علم کلام یا قدمائے فلاسفہ یونان کی تصانیف کو دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ سید صاحب بالکل مطابق التعلیل بالنتیجہ انہیں کے مقلد ہیں۔ زیادہ نہیں تو مل و نخل اور دبستان المذاہب فارسی ہی دیکھیں جن سے آپ سید صاحب کے خیالات کا ماتخذ معلوم کر سکیں گے۔ مثلاً حکمائے مشائین مانتے ہیں کہ جن لوگوں کو قوت قدسیہ نصیب ہوتی ہے (انبیاء مراد ہیں) ان کی قوت خیالیہ اس درجہ تک قوی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اور اکات کو بصورت جمیلہ دیکھتے اور ان کا عمدہ کلام سنتے ہیں یعنی دراصل نہ کوئی فرشتہ ہوتا ہے نہ کوئی آواز یا کلام ان کو سنائی دیتا ہے بلکہ محض ان کے وہ معلومات (جو ان کو مبادی قیاض سے عطا ہوئے ہیں) کسی عمدہ شکل میں نظر آتے اور نہایت عمدہ و چسپ کلام کرتے ہیں پس وہ فرشتہ جو بنی کو دکھائی دیتا تھا وہی تھا اور وہ وحی اور الہام ہی آواز

عقی (دیکھو کتاب مل و نخل شہرستانی مطبوعہ جلد دوم صفحہ ۸۶) *

بتلائے سید صاحب کی تحقیق وحی اور اس تقریر میں کیا فرق ہے؟ بلکہ سید صاحب نے ہنایت بیباکی سے انبیاء کو دیوانہ دمی سے تشبیہ دی ہے لیکن ان خیالات کی وقعت پر وہاں جناب محمد عری صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں پرکاش کے برابر بھی نہیں۔ اور سنئے بعض حکماء کا جنت کی نسبت یوں عقیدہ لکھا ہے کہ نبی لوگوں کو آخرت کی ترغیب دیا کرتے ہیں اور وہاں کے ثواب و عقاب مثالوں میں لوگوں کے اطمینان قلب کے لئے بتلاتے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک امر محل ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا (دیکھو مل و نخل صفحہ ۶۷) *

یہ پچھلا جملہ حدیث کا ترجمہ ہے اور پہلا خیال انکار جنت و دوزخ پر مشتمل ہے۔ کیا اس خیال اور سید صاحب کے خیال میں کچھ فرق ہے؟ ہرگز نہیں *

اور سنئے بعض اہل ہوا کا یہ عقیدہ ہے کہ سوائے عالم محسوس کے اور کوئی عالم نہیں۔ ان کاہر بات میں اپنے ذہن صافی اور فطرۃ سلیمہ پر ارجح کو سید صاحب نیچر کہتے ہیں (اعتماد ملی ہے نہ وہ جن کے قائل ہیں نہ فرشتہ کے اور نہ کسی خرق عادت کے اور اس گروہ کا نام طبعیہ دہریہ ہے (دیکھو مل و نخل صفحہ ۱۰) *

پھر ہی مصنف دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ احکام شریعت از قسم اوامر و نواہی محض مصلحت وقت کے گرد سے مصلحان وقت اپنی طبیعت صافی سے تجویز کر لیتے ہیں اور جن غیب کی باتوں کی وہ خبر دیتے ہیں وہ درحقیقت ان کے اپنے خیالات ہوتے ہیں ان کا کوئی تحقیقی وجود نہیں۔ بلکہ یہ باتیں محض عام جاہلوں کیلئے بطور تہریب و ترغیب کے بیان کی جاتی ہیں..... الخ *

اب ناظرین غور سے دیکھ لیں کہ سید صاحب کے خیالات کا ماحذیبی تقریریں ہیں یا کتاب و سنت؟ میں اس پر زیادہ حاشیہ نہیں چڑھاتا۔ راستی پسند طلبہ کو حق خود نظر آجائیکا مگر میں ہمارے کی چوٹی پر کھڑا ہو کہ کہنے کو تیار رہوں کہ ان خیالات فاسدہ سے اسلام پاک کو ہرگز

ہرگز کسی قسم کا حلق نہیں۔ یہ کنا و منکرین کے خیالات ہیں جو شروع آفرینش سے انبیاء کے مخالفت ہے
ہیں *

اب میں آخر بحث پر ملائکہ کے متعلق جناب ولایت مآب

جناب امیر المؤمنین علی
کے کلام سے دو مشہاد

حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب ؑ کے خطبات سے دو
اقتباسات پیش کرتا ہوں اور میں یقین کرتا ہوں کہ حقیقت ملائکہ

کے متعلق اللہ اور اللہ کے رسول کے بعد ایسا جامع کلام ہونے زمین کے کسی فاضل کی
قلم سے نہیں نکلا اور نہ نکلنا ممکن ہے۔ چنانچہ آپ اپنی نسبت ایک خطبہ میں فرماتے ہیں۔
نَحْنُ شَجَرَةُ النَّبُوَّةِ وَمَحَطُّ السَّالَةِ وَتَحْتَهَا الْمَلَائِكَةُ وَمَعَاوِنُ الْعِلْمِ وَبَنَائِجُ
الْحُكْمِ۔ (ترجمہ) ہم اہل بیت نبوت کا درخت اور رسالت کے ڈالے جانے کا مقام
اور ملائکہ کے آمد و رفت گزرنے کی جگہ اور علوم حقہ کی کان اور حکمت و دانش کے سرچشمے
ہیں۔ یاد رکھو کہ یہ اضافہ نہیں۔ یہ حقیقت الامر ہے جس کی تصدیق خود جناب سرور کائنات
نے بالفاظ اُنّاد اسر الحکمة و علی بابہا "کرومی ہے (ترندی)۔ ایک دوسرے مقام
پر یوں فرماتے ہیں "سلونی عن طرق السماء فانی اعلم بها من طرق الارض"۔
(مجھے آسمان کے راستوں کی بابت پوچھو کیونکہ میں زمین کے راستوں کی نسبت آسمان کے
راستوں کا زیادہ واقف ہوں)۔ شیخ اکبر انبی تفسیر میں لفظ طرق کے متعلق لکھتے ہیں کہ
اس سے احوال و مقامات روحانیہ مراد ہیں۔ بہر صورت ایسے حقائق کے متعلق ایسے ہی لگوں
کا قول جہتر ہو سکتا ہے نہ کسی یا وہ تو فلسفی کا۔ آپ فرماتے ہیں :-

(۱) ثُمَّ فُتِحَ مَا بَيْنَ السَّمَاوَاتِ الْعُلَى فَمَلَأْنَهُنَّ أَطْوَارَ امْنٍ مَلَائِكَةً فَمِنْهُمْ
سَجُودٌ وَكَائِرٌ كُفُوفٌ وَرُكُوعٌ لَا يَتَقَبَّضُونَ وَصَافُونَ لَا يَتَوَلَّوْنَ الْعُيُونُ وَمُسَبِّحُونَ لَا
يَسْأَمُونَ لَا يَعْشَاهُمْ فَوْمُ الْعُيُونِ وَلَا يَمُوهُ الْحَقُولُ وَلَا فِتْرَةُ الْإِبْدَانِ

لے اہل میں یہ جملہ امام غفر اللہ عنہ رازی کا ہے جس کے لفظ یہ ہیں "واعلم ان ملائکہ بعد کلام اللہ و کلام رسول اللہ کلام اللہ

ولا عقله السيان ومنهم امانا على وحيد والستة الى رسده ومتلفون
بقضائه وامرهم ومنهم الحفظه لعباده والستة لا يواب حياته
ومنهم الثابتة في اكرضين السفلى اقد امهم والمارقة من السماء
العليا اعناقهم والخارجية من الاقطار اركانهم والمناسبة لقوائدهم
الحرش اكتافهم فاكسوا ووتة ابصارهم متلفون باجنتهم مضرة
بينهم وبين من دونهم حجب الحزنة واستار القدر لا يتوهمون
ريهم بالتصوير ولا يجرون عليه صفات المضعفين ولا يجادونه
على الامكن ولا يشيرون اليه بالتطائرة

(دیکھو تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۲۶، ۲۷ مطبوعہ مصر)

ترجمہ۔ پھر خداوند کریم نے انہاں کے بلند کہ ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور انہیں مختلف قسم کے ملائکہ سے بنایا جن میں سے بعض تو سجدہ ہی میں پڑے ہیں جو رکوع نہیں کرتے اور بعض سجالت رکوع ہیں جو قیام نہیں کرتے۔ وہ صفت البتہ کھڑے ہیں اور اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے اور خدا کی تسبیح کر رہے ہیں اور نہیں اکتاتے۔ ان کی آنکھوں میں نیند اور عقل میں سہو اور بدلتن میں ٹکان اور کسی قسم کی بھول چوک عارض نہیں ہوتی۔ انہیں میں سے بعض کو خداوند کریم نے اپنی وحی کا اس میں مقرر کیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کو پیغام ربانی پہنچاتے ہیں اور دنیا کے مختلف امور کی تدبیر کے لئے بحکم الہی وہ پراہر آمد و رفت کرتے رہتے ہیں انہیں میں سے بعض کا یہ کام ہے کہ وہ ہر ایک انسان کی حفاظت پر متعین ہیں اور بعض بہشت کے دروازوں کی خدمت اور پاسداری کرتے ہیں اور بعض ان میں سے ایسے ہیں کہ ان کے پاؤں زمین کے سچے طبقہ میں قائم اور ان کی گردنیں فلک الافلاک سے اوپر اور ان کے ہاتھ اطر اعظم کی حد سے خارج ہیں اور ان کے کندھے پایہ باعش رب العزۃ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس کی بارگاہ جلال سے ان کی نگاہیں سرنگوں ہیں اور وہ اپنے پروں میں لپٹے ہوئے ہیں اور

ان کے اور ذات باری جل جلالہ کے درمیان ہیبت اور عظمت کے پڑے لگ رہے ہیں۔ وہ ذات باری کو کسی شکل و تصویر کے طور پر اپنے دہم میں نہیں لاتے اور مخلوقات کے صفات اس کی ذات پر جاری نہیں کرتے اور نہ وہ اسے کسی مکان میں پاتے ہیں اور نہ بذریعہ امتثال اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں *

نوٹ: پچھلے فقرات کا مائل یہ ہے کہ جس طرح انسان ضعیف النیان خدکی ذات و صفات کو اپنے ذہن میں ایک فرضی شکل سے مخصوص کر کے تصور کرتا ہے حالانکہ خدا اس وہی شکل اور تصویر سے بالکل بری ہے بلکہ کے لئے ایسا نہیں کیونکہ انسان کا علم خارج سے حاصل کیا جاتا ہے اور بلکہ محض اور اک ہیں جنہیں ترتیب مقدمات اور اکتساب نتائج کی ضرورت نہیں پڑتی *

پھر ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں "من ملائکۃ اسکنتم سبلو تک و فتم عن ارضک و ما علم خلقک یک و اخو فہم لک و اقربہم منک لیسکنوا الا صلاب و لم یخلقوا من ماء مہین و لم یثعبہم رب المنون و انہم علی مکانہم منک و منزلتہم عندک و استجماع اہواءہم فیک و کثرۃ طاعتہم لک و قلة غفلتہم عن امرک و لو عاینوا کنہ ما خفی علیہم منک فحق اعمالہم و لمنز و علی انفسہم و لحر فوا انہم لم یعبد و لک حق عبادک و لم یطیعوا حق طاعتک" * (سبح البلاغۃ) *

ترجمہ۔ اے خدا! بعض ایسے ملائکہ بھی ہیں جن کو تو نے اپنے آسمانوں پر بسایا ہے اور اپنی زمین سے انہیں بلند جگہ میں ٹھہرایا ہے وہ تیری دوسری مخلوقات کی نسبت تجھے زیادہ جانتے ہیں اور ان کی نسبت تیرا زیادہ خوف کرتے ہیں اور تجھ سے زیادہ قریب ہیں۔ وہ نہ تو بابوں کی پیٹھ میں رہے اور نہ ماؤں کے رحموں میں اور نہ وہ ذلیل پانی (نطقہ) سے پیدا کئے گئے ہیں گروہ رذکار سے ان میں کسی قسم کی پرگندگی اور پریشانی عائد نہیں ہوتی۔ وہ باوجود اس امر کے

کہ تیرے نزدیک ان کی قدر و منزلت بڑی ہے اور سب کے سب تیری بابت ایک ہی خواہش
 کہتے ہیں اور تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے حکم کی بجا آدھی سے کبھی فافل نہیں ہوتے اگر
 تیری حقیقت ذات سے جو ان پر پوشیدہ ہے واقعہ ہوں تو اپنے اعمال کو بمقابلہ تیری عظمت
 ذات کے حقیر اور اپنے تنہیں عیب آلودہ سمجھنے لگیں اور اس بات کو جان لیں کہ وہ تیری عبادت کو
 کما حقہ بجا نہیں لاتے اور نہ پورے طور پر تیری اطاعت کا فرض ادا کر سکتے ہیں ۔

ان ہر دو استشہاد سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ لاکھ کوئے فطریہ نہیں بلکہ وہ ایک عالم نور
 کی ایسی مخلوقات کا نام ہے جو محض ادراک اور حیرت پیدا کی گئی ہے اور جن کا مادہ اجسام مرکب کے
 مادہ سے بالکل علیحدہ ہے اور خداوند کریم کی طرف سے خلقت امور پر موقوف ہیں۔ چونکہ ان کی نوع
 عالم مادی ظلماتی کی تمام انواع سے علیحدہ ہے اس لئے لازمی بات ہے کہ ان کے خواص اور لوازم
 بھی علیحدہ ہوں ۔

الایمان بین الجبر والقدر

قرآن مجید کے آیات مقدمہ میں چار مواقع ایسے ہیں جن میں اعداء اللہ مشرکین نے تضاد
 قدر کو بر خلاف تعلیم وحی کے حجت گردانا ہے اور اپنے مذہب باطل کفر و شرک کی تائید میں تقدیر
 ازلی کو پیش کر کے اپنی معذوری ثابت کرنا چاہی ہے وہ مواقع حسب ذیل ہیں :-

(۱) سیدقول الذین اشرکوا لو شاء الله ما اشرکنا ولا ابائونا..... قل فقل

الحجة الباطنة فلو شاء الله لهدا الکمل اجمعین " یعنی مشرکین کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا
 تو ہم لوگ اسے آباؤ اجداد و شرک نہ کرتے اسے بخیر انہیں کہ دو کہ حجت کاملہ صرف اللہ تعالیٰ
 کے لئے ہے اور وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا ۔

رب انا ان الذین اشرکوا لو شاء الله ما عبدنا من دونه من شیء " یعنی مشرک لوگ

کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی غیر کی عبادت نہ کرتے۔

رج قال الذین کفروا والذین امنوا انطعموا من اوفیاء اللہ اطعمہ یعنی کافر

لوگ ایمانداروں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھانا دیں جنہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کھانا دیتا

(۵) وقالوا لئن لم یفزعنا ما عبدنا من دین الا للہ بظن انہم

الایسہ صوں یعنی کافر لوگ کہتے ہیں کہ اگر چہ چاہتا تو ہم ان باطل معبودوں کی عبادت

نہ کرتے۔ ان لوگوں کو مشیت الہی کی حقیقت کا کچھ پتہ نہیں صرف اگلے سچے باتیں کہتے ہیں۔

آیات مذکورہ میں خود کہنے سے معلوم ہو گا کہ ان کا مفہوم ٹھیک وہی مفہوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ

نے ابلیس علیہ اللعنة کی طرف سے میلن فرمایا ہے حیت قل حکایۃ عن ربہا غویب

لانین لہم فی الارض ولا غوبینہم اجمعین یعنی خدایا جو اس کے کہ تو نے مجھے

گمراہ کیا ہے میں نبی آدم کی نظروں میں اعلیٰ بد کو دنیا میں مزین کر کے دکھاؤں گا اور ان سب کو

گمراہ کیا کروں گا۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اعداء اللہ نے حق کے مقابلہ پر تقدیر الہی کو بھٹ گردانا اور

نہرب جبر کے قائل ہوئے۔ لیکن قابل بحث یہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس استدلال کو

کیوں مسلم نہیں رکھا؟ جبکہ قرآن شریف میں ایسے آیات موجود ہیں جن سے بظاہر ان کے

استدلال کی حقانیت کا پتہ چلتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ولو شاء ربک ما فعلوا"۔

یعنی اگر تیرا پروردگار چاہتا تو وہ لوگ شرک نہ کرتے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا ہے ولو شاء

لا تبنی اکل نفس ہذا اھا یعنی اگر تم چاہتے تو ہر ایک نفس کو اس کی ہدایت عطا کرتے۔ علی ہذا

جنس دیگر آیات میں بھی بظاہر کفار کے مذکورہ بالا استدلال کی صحت کا پتہ لگتا ہے۔ اس صورت

میں یہ سوال عائد ہوتا ہے کہ ایک ہی امر کفار کی طرف سے تو باطل قرار دیا گیا اور صلئے تعالیٰ

کی طرف سے صحیح۔ حالانکہ ہر دو کا مفہوم ایک ہی ہے۔ واضح ہو کہ اس مقام پر بہت سے اکابر

تحقیقین کو دھوکا لگتا ہے اور حقیقت الامر سے ناواقف رہ کر مقام تحقیق سے دور نکل گئے ہیں۔

ہم ذیل میں ہر دو قسم کے آیات میں تطبیق کرتے ہیں۔ ناظرین کو ایسے مقامات پر غور سے کام لینا چاہئے کیونکہ قرآن مجید میں ایسے بہت سے مواقع ہیں جن میں بظاہر تناقض معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت تناقض نہیں ہوتا۔

بعض محققین نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے مذکورہ بالا قول کی تصدیق اور تکذیب نہیں کی۔ بلکہ ان کے طریق استدلال کے غلط اور بے محل ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ کیونکہ مشرکین کا یہ قول کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم بہت پرستی نہ کرتے اپنی اصلیت کے رُوسے بالکل صحیح ہے مگر انہوں نے اس استدلال کو ایسے طور پر استعمال کیا ہے جس سے ادا مرد و نواہی شریعت کا معارضہ پایا جاتا ہے اور قضا و قدر کو اپنے لئے حجت جان کر تکالیف شرعیہ کو ساقط کرنا مفہوم ہوتا ہے جس سے ضرورت نبوت کا مفہوم بالکل بے معنی ثابت ہوتا ہے مگر جہاں اللہ تعالیٰ نے "ولو شاء ربنا ما فعلوه" ارشاد فرمایا ہے وہاں اس نے اپنی قدرت کاملہ اور اپنی ربوبیت اور وحدانیت اور تمام اشیائے موجودات کے اپنی طرف محتاج ہونے کا ثبوت دیا ہے یعنی یہ ثابت کیا ہے کہ جس امر کے متعلق ہماری مشیت ہوتی ہے وہ واقع ہو کر رہتا ہے اور جس سے ہماری مشیت متعلق نہیں ہوتی وہ کبھی وقوع پذیر نہیں ہوتا گو یا عقیدہ متفق علیہا "ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن" کی تعلیم دی ہے مگر مشرکین نے اس کے برخلاف ایسے مواقع پر اس کا استعمال کیا جو عقیدہ مذکورہ بالا کے متافی ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کی صحت کا رد نہیں کیا بلکہ اس کے بے محل اور جاہلانہ استعمال کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کا یہ خیال محض ان کی نافرمانی پر مبنی ہے اور یوں ہی اُنکل پچو منہ سے نکال پھینکتے ہیں اور انہیں اس عقیدہ کی حقیقت کی کچھ خبر نہیں کہ کس معنی میں وہ صحیح ہے اور کس معنی میں غلط۔

اس کی بجائے وہ نظیر ہے جو فرقہ خوانج نے بمقابلہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ پیش کر کے کہا تھا "اِنَّ الْحُكْمَ لَا لِلّٰهِ" حضرت امیرؑ نے فرمایا "کلمۃ حق اريد

بہا الباطل، یعنی خوارج کا قتل بجا ہے خود باطل صحیح ہے کیونکہ فیصلہ صرف کتاب اللہ ہی کا کام ہے مگر خوارج ناہنجار نے اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی کی ہے، یعنی استدلال کو بے محل استعمال کیا ہے۔ یہی حال مذکورہ بالا مشرکین کا ہے جو لہذا شاء اللہ ما عیدنا۔ ... کو اپنے شرک کے جواز میں حجت گردانتے ہیں کیونکہ ذاتی یہ خیال بہت صحیح ہے بلکہ عقائد اسلام میں افضل ہے کہ ”ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن“۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان پر سے احکام شرعیہ کی تکلیف اٹھا دی گئی ہے اور وہ کفر و شرک کے کرنے میں مجبور ہے کیونکہ اس خیال کے تسلیم کر لینے سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے کفر و عصیت پر راضی ہوتا ہے حالانکہ وہ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے ”لا یرضی لعبادہ الکفر“۔ یعنی وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔ مشرکین کا استدلال ایک گونہ اس امر کا مستلزم ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے برخلاف حجت قائم کرنے کا حق حاصل ہے حالانکہ یہ خیال سراسر باطل ہے کیونکہ کسی کو برخلاف ذات باری کسی معاملہ میں کوئی حجت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو ہر ایک طرح سے بندوں پر حجت حاصل ہے کیونکہ وہ کامل القدزہ اور کامل الحکمۃ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین کے برخلاف فرمایا: **فَللّٰہِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ**، یعنی یہ لوگ قصداً قدر کی آڑ میں برخلاف ذات باری کے حجت پیش کر کے سرخرو ہونا چاہتے ہیں حالانکہ حجت کا ملکہ تو صرف ذات باری کو حاصل ہے اور یہ لوگ اس حجت کو توڑ نہیں سکتے کیونکہ ہم نے انہیں بذریعہ اسباب و تعلیم وحی ان کی صلاح و فلاح اور ہلاکت و عذاب کی طرف جاننے میں انہیں آسانی دے رکھی ہے۔ پھر ان کی حجت کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ اس لئے یہ لوگ قصداً قدر کے پردہ میں خدا کے تعالیٰ کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں جو محض حماقت و نادانی ہے۔

۱۳۸ بقیہ حاشیہ حضرت امیر المؤمنین اور امیر معاویہ کے درمیان تصفیہ کیلئے حکم مقرر تھے۔ خوارج بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ حق و باطل کا فیصلہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے آدمیوں کو کیوں میان لایا جاتا ہے؟ ۲۰۲ منہ

یہ مقام واقعی قابل غور ہے کیونکہ ایک ہی امر کو جب اثبات ذات باری میں پیش کیا جاتا ہے تو وہ بالکل صحیح بلکہ عین توحید سمجھا جاتا ہے اور جب اسی امر کو تعلیم وحی کے معارضہ اور اوامر و نواہی کے ابطال میں پیش کیا جاتا ہے تو وہ بالکل باطل بلکہ عین کفر ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ہر ایک فعل کی جو نشان سے صادر ہوتا ہے۔ دو جہت ہو کر پڑتی ہیں۔ جہت اول کو تو ذات باری کی مشیت و قدرت سے تعلق دے سکتے ہیں جس سے کمال صفات باری کا یقین حاصل ہوتا ہے یعنی آیہ ”وَمَا تَشَاؤُنَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ“ کی حقیقت قلب مومن پر منکشف ہوتی ہے اور چشم بصیرت سے اللہ تعالیٰ کی مشیت ازلی کو ہر فرد کائنات میں موثر ہوتے دیکھنے لگتا ہے اور اسی مقام پر یہ راز کھلتا ہے کہ کیونکر تمام اشیاء اور ان کے عوارض ایک ہی حیثیت سے ذاتِ مطلقہ کا ملکہ کے مقتضائے قدرت و حکمت کی سمجھیں جو انہیں حسب ارادہ القلوب و تبہل کے دوران میں لاتی رہتی ہے۔ یہی معنی ہیں آیہ ”کل یوم ہونی شان“ کے۔ اس مسئلہ میں غور کرنا چاہیے مبادا نیچریت و دہریت کے دلدل میں نہیں جانے کا موقع پیش آجائے۔

اور جہت ثانی کے لحاظ سے اس فعل کو ارادۃ انسانی کے ساتھ تعلق دیا جاتا ہے جس سے انسان کی اس حالت اختیار کی کا یہ منکشف ہوتا ہے جس کے رُوسے وہ جوابدہ قرار پاتا ہے اور یہ حالت اختیاری مشیت ذات باری کی معلول ہے۔ اس مقام پر آیہ ”لَنْ يَسْتَفِيدَ“ کی حقیقت کا پتہ لگتا ہے اور عارف چشم بصیرت سے دیکھ لیتا ہے کہ کس حیثیت سے وہ باوجود ارادۃ ازلی کے تابع ہونے کے کتابِ فعل کا اختیار رکھتا ہے۔ الغرض انسانِ کامل وہ ہے جس پر انسانی فعل کی ہر دو مذکور بالا حیثیت کا انکشاف حقیقی ہو جاتا ہے اور وہ ہر دو کے ربط کی واقعیت کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ یعنی جب ایک طرف شان ربوبیت اور دوسری طرف شانِ عبودیت ہر دو اپنے اپنے مقام میں اس کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں تو اس پر یہ معاکل جاتا ہے کہ مشیت ازلی کیونکر اس کے لئے اسباب قدرتی کا باعث ہوتی

ہے جن کی پابندی میں وہ اپنی حدود اختیار سی حیثیت سے بطور کتاب کے مشاہدہ فعل قرار پاتا ہے یہی مطلب ہے جناب پیغمبر علیہ السلام کے قول "اعملوا فکل میسرہ لما خلق لہ" یعنی عمل کئے جاؤ کیونکہ تم میں سے ہر ایک کو اس امر کے بجا لانے کی سہولت دی گئی ہے جو ازل سے اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ اس تقریر سے صاف معلوم ہو گیا کہ انسان کو غلی حیثیت کے متعلق گفتگو کرتے وقت اس کے اختیار و عدم اختیار کا معیار ہے کہ ہم پر یہ بیت اور عبودیت کے اس ضروری ربط اور تعلق پر غور کریں جس کے بغیر تو ہم خالق بے ہمتا کی توحید کا مسئلہ سمجھ سکتے ہیں اور انسانی ہستی کی عظمت اور اس کی غایت کا مفہوم ہمارے ذہن میں آ سکتا ہے عوام الناس ایک سخت غلطی کیا کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیات جبر کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکل لیتے ہیں کہ انسان محض ایک لکڑی یا پتھر ہے جو کسی نوع کا بھی ارادہ و اختیار نہیں رکھتا۔ یا آیات اختیار کو پڑھ کر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ ذات باری کو انسانی افعال کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں بلکہ وہ انسان خود اپنے افعال کا خالق اور مختار کل ہے حالانکہ یہ ہر دو مذہب باطل ہیں حق یہ ہے کہ انسان مشیت ازل کے تابع ہو کر اپنی آزاد و مرضی کا استعمال کرتا ہے اور اسی لئے وہ جوابدہ بھی ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں "القضاء والقدر والمشيئة النافذة من اعظم ادلة التوحيد فجعلها الظالمون الجاحدون حجة لهم على الشرائع فكانت حجة الله هي البالغة وحجتهم هي الملاحقة" یعنی قضاء و قدر اور مشیت ازل کی توحید ذات باری کے اعلیٰ دلائل میں سے ہیں مگر مشرکوں نے قضاء و قدر کو حکمت شرعیہ اور بعثت انبیاء علیہم السلام کے باطل ثابت کرنے میں استعمال کر لیا سو اللہ تعالیٰ کی حجت غالب رہی اور ان کی حجت باطل قرار پائی *

ایک حدیث شریف میں جو صحیح مسلم میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے یوں وارد ہوا ہے۔ "المؤمن القوى خير واحب الى الله من المؤمن الضعيف وفي كل خير لآخر من علي ما يفتعل واستحق باب الله ولا تجزئ وان اصابك شئ فله تفل لو اني فعلت كذا او كذا ولكن قل قد ر الله ما شاء فقل فان لو تفتتح على الشيطان" *

ترجمہ۔ یعنی مومن قوی مومن ضعیف سے اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ ہر ایک نیکی میں جو تجھے نفع دے حرص کر اور اللہ تعالیٰ سے اس کے بجالانے میں مدد مانگ۔ اور عاجز نہ ہو اور کوئی امر (ناگوار) تجھے پیش آئے تو مستکبر کہہ کر کہ اگر میں نے یوں کیا ہوتا تو یوں ہوتا یا رکاش میں یوں کرتا تو ایسا ہوتا) بلکہ یوں کہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا مقدر ہے جو اس نے چاہا کر دیا۔ کیونکہ حق (اگر) کا بولنا عمل شیطان کا وہ فائدہ کھول دیتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے حق میں ظن پیدا کر دیتا ہے جس سے بندہ کا ایمان باطل ہو جاتا ہے +

اس صحیح حدیث سے براہ راست امور ذیل کا پتہ لگتا ہے :-

(۱) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ نے بحسب اقتضاء اسماء وصفات بندہ سے محبت کرتا ہے۔ وہ خود

قوی ہے اس لئے مومن قوی سے محبت کرتا ہے۔ وہ دتر ہے اس لئے دتر کو دوست رکھتا ہے۔ وہ جمیل ہے اس لئے جمال کو دوست رکھتا ہے۔ وہ عظیم ہے۔ اس لئے علما کو دوست رکھتا ہے۔ وہ عمن ہے اس لئے عمنین کو دوست رکھتا ہے۔ علی ہذا القیاس

(ج) انسان کی سعادت اس میں ہے کہ وہ دنیا و آخرت کی فلاح بخش کشا پر حریص ہو

یعنی اپنی پوری کوشش صرف کرے +

(د) انسان تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے کیونکہ ہر توفیق الہی کوئی کامیابی

نہیں ہوتی امید ہی ہے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے +

(۴) ضعف اور عجز کو دیر کرے کیونکہ ضعف اور عجز سے ناکامی کی صورت میں اگر اور

کاش کے الفاظ کہنے لگتا ہے اور یہ تاسف و اہم ہے جو کسی صورت میں مفید نہیں +

(۵) کامیابی کو مشیت الہی کا نتیجہ سمجھے جو اصل توحید ہے +

ان نکتہ بالا نتائج پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ کس جامعیت کے ساتھ جناب امی علیہ

السلام نے اثبات قضائہ و قدر اختیار عباد اور عیوبیت کا اظہار فرمایا ہے۔ والحمد للہ تعالیٰ۔ ۱۱۔

مسئلہ جبر و اختیار

اس عنوان کا مطلب یہ ہے کہ ارتقاب گناہ کی توجیہ بیان کرنے میں لوگوں نے مختلف طریق اختیار کر رکھے ہیں اس مسئلہ کو مسئلہ جبر و قدر کا ضمیمہ سمجھنا چاہیے۔ اکثر لوگ اس دقیق مسئلہ میں اپنے عقیدہ کی صحت کو ملحوظ نہیں رکھتے اور نہیں جانتے کہ تمام عقائد حق کی بنیاد پر جبر و قدر کی حقیقت سمجھنے پر منحصر ہے۔

اہل جبر کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنے حرکات و سکنات میں بالکل مجبور ہے اور وہ کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے میں کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اس کی مثال جینیم ایک لاشی کی سی ہے جو حرکت دینے سے حرکت کرتی ہے اور اگر حرکت نہ دیں تو ساکن رہتی ہے اس خیال کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کا ضروری نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت کے تمام اوامر و نواہی کو باطل قرار دیا جائے اور ضرورت نبوت کو عبث تسلیم کیا جائے اور افعال ذات باری کو حکمت و مصلحت سے عاری سمجھا جائے۔

اہل قدر کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان سے جس قدر افعال سرزد ہوتے ہیں ان کیساتھ ذات باری کو کسی قسم کا تعلق نہیں بلکہ انسان خود اپنے افعال کا خالق ہے اس لئے کچھ ضرورت نہیں کہ ان افعال کے لئے کسی حکمت و مصلحت کی ضرورت تسلیم کی جائے اس مذہب کے رُوسے انسان بھی خالق خیر و شر قرار پاتا ہے۔

اہل جبر نے حکمت ذات باری کا انکار کر دیا اور اہل قدر نے قدرت ذات باری کا۔ گویا ایک دوسرے کے حریف ہیں کیونکہ اول میں تو انسان کو بالکل بے تعلق کہا گیا ہے اور دوسرے میں اس کو خالق خیر و شر قرار دیا گیا ہے۔ مگر ہر دو مذہب باطل ہیں۔ اور صحیح مذہب جو کتاب اللہ اور سنت صحیحہ نبویہ سے ماخوذ ہے وہ ہے جہان ہر دو کے عین وسط میں واقع

ہوتا ہے یعنی نہ توجیر محض ہے اور نہ قدر محض جس کی توجیر کے دو جزو ہیں۔ (۱) ذات باری کا ارادہ تمام اشیاء میں نافذ ہے اور کوئی امر اس کے دائرہ علم و ارادت۔ حکمت و قدرت سے خارج نہیں ہو سکتا۔ اس اتفاق سے انسان کو اپنے صنعت اور غیر کا علم ہوتا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے توفیق اور محنت کی استدعا کرتا ہے۔ (۲) انسان کس فعل میں خیر کو شریع دینے میں مختار ہے اس عقیدہ سے وہ اپنے مالک کی بارگاہ میں اپنے تئیں مجرم قرار دیتا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف شرکی نسبت کرنے سے باز رہتا ہے۔ ان ہر دو اجزاء کے ملنے سے جو صحیح عقیدہ مسئلہ جبر و قدر کے متعلق حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خالق افعال ذات باری ہے اور الکتاب فعل انسان سے صادر ہوتا ہے۔ یہی وہ صحیح عقیدہ ہے جس سے توحید۔ شریعت۔ عدل۔ حکمت کا ابطال لازم نہیں آتا۔ اور اس کے سوا جس قدر مذاہب ہیں استقامت سے بہت دور ہیں۔ آیات قرآنیہ میں غور کر کے دیکھو کہ کس طرح پر آیات جبر کے ساتھ آیات قدر کو ربط دیا گیا ہے اور ہر دو کے باہم ملانے سے مذکورہ بالا صحیح عقیدہ کیونکر حاصل ہوتا ہے ورنہ اہل جبر نے آیات جبر کو اپنے دعویٰ میں پیش کر کے آیات قدر میں تاویل کر لی اور اہل قدر نے آیات قدر کو اثبات دعویٰ میں پیش کر کے آیات جبر میں تاویل کر لی اور بجائے خود ہر دو دعویٰ حق بن بیٹھے۔

انسان کے مرکب جرم ہونے کے متعلق جس قدر توجہات دیکھی گئی ہیں ان میں سے ذیل کی توجہات قابل غور ہیں۔ ان کے علاوہ اور جب قدر توجہات ہونگی وہ انہیں میں کم و بیش نظر کرنے کا نتیجہ سمجھی جائیں گی۔

(۱) یہ وہ مقام ہے جس میں انسان اور حیوان مطلق میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں قائم کیا گیا نہ جبر کی حقیقت کی خبر ہو نہ قدر کی بلکہ لذات حیوانی اور خواہشات نفسانی سے متمتع ہونا اصل مقصود سمجھا جائے۔ اس خیال کے لوگ دائرہ انسانیت سے بالکل خارج ہیں۔

(۲) مذہب جبر یہ مذہب ابطال شرعیات و جزا و سزا پر مبنی ہے اور جو انسان کو کھلے بندوں

ہر ایک قسم کے ارتحاج فواحش کی اجازت دیتا ہے۔ احتمال کے لوگ اکثر مشرکین اور اعداء اللہ ہیں *

(ج) مذہب قدرت۔ یہ مذہب ذات باری کو معطل قرار دیتا ہے اور اس کی قدرت و ارادت کا منکر ہے۔ انہیں قدرت یہ مجوسیہ کہا گیا ہے کیونکہ جس طرح مجوس نیکی اور بدی کے لئے علیحدہ علیحدہ خدا قرار دیتے ہیں اسی طرح یہ لوگ ذات باری کے ساتھ انسان کو بھی خالق افعال ٹھہراتے ہیں اس لئے یہ بھی مشرکین کہلاتے ہیں۔ آجکل اکثر نیچر یہ کا یہی مذہب ہے *

(د) مذہب اہل علم و ایمان جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ارادۂ قدرت ذات باری تمام امور میں نافذ ہیں اور انسان خیر و شر میں سے کسی ایک جانب کو اختیار کرنے کی وجہ سے جوابدہ ہے *

(ه) مذہب عجز و ضعف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعانت و توفیق نہیں ہوگی اور وہ اپنے بندہ کو ثوابت قدم نہیں رکھیں گے تو وہ ہلاک ہو جائیں گے *

(و) مذہب توحید۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو وصفت خلق و ایجاد میں یگانہ تسلیم کیا جائے اور اس کی ارادت کو بلا قید نافذ یقین کیا جائے اور بندہ کی نسبت یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ بلا مشیت و ارادت ذات باری خود مختار ہو کر گناہ کرنے سے عاجز ہے۔ ضمن (ه) میں بندہ کے ضعف و فقر پر خیال ہوتا ہے اور اس ضمن میں ذات باری کے وصف خلق و ایجاد میں متغیر ہونے پر *

(ز) مذہب حکمت۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو حکمت ذات باری پر نظر ہوتی ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ عین حکمت پر مشتمل ہے چنانچہ بندہ کے گناہ کے ساتھ آلودہ ہونے میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے اور انسانی عقل اس کے سمجھنے سے قاصر ہے *

(ح) مذہب اسماء صفات۔ اور وہ یہ ہے کہ اسماء و صفات ذات باری کو اشیائے

۱۔ معنوں حکمت ہیوط آدم علیہ السلام میں اس کے متعلق کچھ بحث کی جائیگی *

عالم سے اس طرح جلوہ بچھا جائے کہ تمام اشیاء موجودات کسی نہ کسی اہم ذات باری کا مظہر ہے۔ مثلاً اللہ تبارک و تعالیٰ غفار۔ تواب۔ غفور۔ رحیم ہے اور یہ اسمائے اپنے مقتضی کے مطابق جلوہ آثار کو چاہتے ہیں یعنی اگر بندہ ارتکاب گناہ نہ کرتا تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت۔ قبول۔ توبہ۔ عفو۔ علم وغیرہ کا مظہر کیا ہوتا؟ چونکہ اس کے اسمائے حسنی کے آثار کا جلوہ لاہ ہے اس لئے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اگر اہل دنیا گناہ نہ کرنے تو اللہ تعالیٰ کسی اور مخلوق یا امت کو پیدا کرتا تاکہ وہ گناہ کرتے جس سے انہیں مغفرت کا استحقاق پیدا ہوتا۔

چنانچہ بعض عارفین کی نسبت مقبول ہے کہ ایک رات جبکہ تخت اندھیرا تھا اور بارش ہو رہی تھی میں بیت اللہ میں بچا باری ایوں دست بدعا تھا کہ خدا یا مجھے عصمت عطا فرما تاکہ میں ارتکاب گناہ سے محفوظ رہوں۔ ہاتھ نے آواز دی کہ میرے بندے مجھ سے عصمت مانگتے ہیں اگر میں انہیں عصمت دینوں تو میری مغفرت و رحمت کا مستحق کون ہوگا۔ وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ اس جواب کو سن کر میں اس قدر نادم ہوا کہ صبح تک استغفار کرتا رہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے باہر ہو کر ارتکاب گناہ نہیں کر سکتا۔ گواہ اہل قدر کا رہے واضح ہو کہ ضمن (ز) اور (ح) مقربین بارگاہِ کار تہ ہے اور ہر ایک کو یہ مقام نصیب نہیں ہو سکتا۔

الحاصل ایمان صحیح جس پر سلف صالحین سے ترجیح تک اجماع رہا ہے یہ ہے کہ جس قدر حوادث عالم کائنات میں صدور پڑتے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کو خاص خاص مصلحتیں اور حکمتیں مد نظر ہوتی ہیں جن کو ہم ناقص عقل سے ہرگز سمجھ نہیں سکتے۔ اولوالعزم انبیاء اور مقربین بارگاہ کو یہ مقام نصیب ہوتا ہے کہ وہ ذات باری کے ارادہ کو عالم کائنات میں اس قدر موثر دیکھتے ہیں کہ ایک ایک ذرہ کائنات کا اس کے علم و قدرت اور اس کے ارادہ و حکمت کے ذیل میں عمل کر رہا ہے۔ یہی وہ عرفان حقیقی ہے جہاں تک عارف کامل کو ترقی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے حضرات حسن اور فہم کا اشتیاق میں حکم نگاہ سے خاموش رہتے ہیں اور زبان پر کسی بات کو لاتا

موتے ادب جانتے ہیں مگر وہ لوگ جو اس درجہ بصیرت سے محروم ہیں قضائے الہی پر راضی نہیں ہوتے۔ بلکہ موافق یا مخالف حالات پر رونا و غضب کا اظہار کرتے ہیں +

بندہ کے ارتکاب گناہ میں جو مصلحتیں ذاتِ باری کو مد نظر ہوتی ہیں ان کا حصر ناممکن ہے۔ بخلاف ان کے بڑی مصلحت یہ ہے کہ بارگاہِ ذوالجلال میں عجز و انکسار و شرم و انابت اور خالص توبہ اور اظہار احتیاج مطلوب ہے اور حقیقتاً بندہ کی طرف سے یہ امور زیادہ قوی ہوتے ہیں اس قدر اس کی رحمت کا نزول بھی وسیع ہوتا ہے چنانچہ احادیث صحیحہ میں وارد ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کے توبہ کرنے پر بہت خوش ہوتا ہے اور اس کو اس مثال میں یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جنگل میں اپنا ہتھیار پر اس کا زور راہ لدا ہو کھو بیٹھے اور ناامید ہو کر سو رہے اور جب بیدار ہو تو آدھنی ٹوکھ پتے سر ہانے کھڑا دیکھے اس حالت میں اس کی مسرت اور خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ اس بندے کی نسبت بھی جو گناہ سے خالص توبہ کر لیتا ہے ایسا ہی خوش ہوتا ہے +

گناہ بندہ کے لئے موجب نزول رحمت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوالبشر علیہ السلام کو اس میں مبتلا کیا گیا۔ اور پھر ان پر اپنی مغفرت و رحمت نازل فرمائی تاکہ اولادِ آدم بھی گناہ کر کے مغفرت الہی سے ناامید نہ ہو کر کریں۔ کیونکہ بیج کا اثر پھل میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ بعض مہین کا قول ہے کہ اگر توبہ اللہ تعالیٰ کو محبوب نہ ہوتی تو اشرف المخلوقات کو اس میں مبتلا نہ کرتا۔ سو توبہ انسان کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ کمال تک ترقی کرنے کی سیڑھی ہے اور سعادتِ آخری اور رحمتِ ابدی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

انسان کی فطرت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اس کے لئے لازم ہے اور ممکن نہیں کہ وہ گناہ نہ کرے وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر انسان گناہ نہ کرتا اور باطل پاک و صاف رہتا تو گروہ ملائکہ کی طرح کمالات میں ترقی کرنے سے محروم رہتا۔ کیونکہ ملائکہ کے کمالات طبعی ہیں تدبیری نہیں۔ برخلاف اس کے انسان کے کمالات بتدیرج ترقی کرتے ہیں اور یہ

بات صرف اسی صورت میں تصور ہو سکتی ہے جب کہ طلبِ کمال کے ساتھ ساتھ موانع بھی موجود ہوں۔ مگر کمالِ عرفان کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی اور ابتلا و امتحان کی حکمت چھل جاتی اور خیال کی محنت اس امر کے تسلیم کرنے پر منحصر ہے کہ انسان ایک ترقی کرنے والا مخلوق ہے۔ اور اگر تسلیم نہ کیا جائے تو امیٹ اور پتھر اور انسان میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔

یقین میدان کہ ماچدیں غائب - نہ بہر یک دل بیتا نہ ہلیم
فرستادیم آدم را بصحرا - جمال خویش در صحرا نہ ہلیم
جب توبہ کر چکنے کے بعد بندہ کو بارگاہِ رب العزت کی طرف پوری توجہ ہو جاتی ہے۔ تو اس کے دل میں محبتِ الہی اور بھی ترقی کرتی ہے کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ میرا پروردگار کس درجہ کا رحیم و کریم ہے۔ کہ باوجودیکہ میں تمام عمر عصیان میں گزار کر اس کے پاس آیا ہوں تب بھی اس نے مجھے بھروسہ و اقرار گناہ اور طلبِ عفو کے مغفرت کی عزت سے امتیاز بخشا اور نہ صرف یہی بلکہ آئندہ اعلیٰ سے اعلیٰ مدارجِ قرب کا وعدہ فرمایا۔ اور انوارِ واقسام کی روحانی لذتوں سے پہرہ یاب فرمایا۔ اور آخرت میں ایسی بے مثل سعادتوں کی خبر دی جن کا اندازہ کرنا عقلِ انسانی کا کام نہیں۔ اس خیال کے صحیح ہو جانے پر قلبِ مومن میں محبتِ الہی اس درجہ تک قوی ہو جاتی ہے کہ وہ دنیا کی تمام ناپائدار لذتوں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ اور صرف اسی کا ہورہتا ہے۔ انسان کو جب تک حقیقتِ فطرت سے غیری رہتی ہے وہ اموالِ الہیہ پر اعتراض کرنے سے باز نہیں رہتا۔ ہر ایک امر واقع پر وہ یا تو اظہارِ رضا کرتا ہے۔ یا اس سے ناراض ہوتا ہے۔ مگر جب ارادہِ انلی کے نفوس کا پورا علم ہو جاتا ہے اور اس امر کا یقین ہو جاتا ہے کہ حکیمِ مطلق نے امور کو سلسلہ اسباب کے تابع رکھا ہے اور ان سے خاص خاص نتائج کو وابستہ کیا ہے جو گویا ظاہرِ مخالفت نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ تو حسن و قبح کا خیال اٹھا کر افعالِ ذاتِ باری میں خیرِ محض کا مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ عسی ان تکرھواشیاء وھو خیر لکد و عسی ان تحبواشیاء وھو شر لکم۔

یہی عرفان حقیقی ہے اور اسی کو تکمیل توحید بولتے ہیں۔

اگر انسان ارتکاب معاصی سے باطل پاک و صاف رہتا تو مقام عبودیت تک اسکو کبھی رسائی حاصل نہ ہوتی اور انعامات سے کبھی مستفید نہ ہو سکتا۔ معاصی کا ارتکاب بالآخر سعادت مند کو مقام عبودیت تک پہنچا دیتا ہے۔ کیونکہ نفس کی جباریت اور قلب کی قساوت بجز اس کے دور نہیں ہو سکتی۔ کہ انسان اپنے انواع و اقسام کی کوتاہیوں میں گرفتار دیکھے اور یہ امر اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے مقام کمال سے بہت نیچے پڑا ہے جن کی وجہ سے خواہشات نفسانی کی پروری ہے اس خیال کی صحت پر اس کو گندہ شتہ کوتاہیوں پر حسرت ہوتی ہے اور رجوع الی اللہ کا خیال اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور یہ خیال اس کو حقیقی توبہ کے مقام پر پہنچا دیتا ہے اور مغفرت و رحمت کا مستحق بنا دیتا ہے۔ اور اگر اس کو اپنی کوتاہیوں کا علم نہ ہوتا تو وہ کبھی رجوع الی اللہ نہ کرتا۔ بلکہ حیوان مطلق کے مقام میں محبوس رہتا۔ اس تقریر سے صاف معلوم ہو گیا کہ صرف گناہ ہی انسان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اظہار ذلت اور احتیاج پر مجبور کرتا ہے۔ اگر انسان گناہ نہ کرتا تو کس خیال پر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استدعا و رحمت کرتا۔ اور کس چیز کی مغفرت چاہتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عقور الرحیم ہے اس لئے اس نے اپنے مغفرت و رحمت کے حصول کے لئے اسباب و شرائط مقرر کر دیئے ہیں۔ اور گناہ ایک بھاری سبب ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع دلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم نہایت وسیع ہے۔ اگر اس کا علم نہ ہوتا تو زمین و آسمان کا سلسلہ الکیب ان بھر کے بے قائم نہ رہ سکتا۔ امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس درجہ تک علم اختیار کیا ہے کہ بعض لوگ یوم حساب کا انکار کرنے لگے اور اسکے وسعت علم کی وجہ یہ ہے کہ وہ انسان کے ضعف و فطرت سے آگاہ ہے اور وہ جانتا ہے کہ ایسے کمزور مخلوق کو اس کی کسرشی پر فی العود مانع نہ کرنا اس کو ان مدارج کمالات سے روک دینا ہے جو عمر بھر کے گناہوں کے بعد توبہ کر لینے پر اس کو حاصل ہو سکتے ہیں البتہ

صدور گناہ انسان کے لئے صین مصلحت ہے اگر صدور گناہ کی نسبت انسان کی طرف نہ کی جائے اور انسان کو ارتکاب گناہ میں باطل علیحدہ رکھا جائے تو پھر اس کو کیونکر احتیاج معفرت کی نوبت آئیگی۔ کیونکہ وہ تو مجرم ہی نہیں اور برخلاف اس کے اگر انسان ہی کو خالق قتل قرار دیا جائے تو پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معفرت کی امید کیسے ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ امر بالکل ناجائز اور بے معنی ہے کہ خالق قتل تو انسان ہے اور خالق معفرت ذاتِ باری *

قدرت و حکمت ذاتِ باری عز اسمہ کے صفات کا لہ میں سے ہیں۔ اور ان ہر دو کے مفہوم میں اس ذات کا ذمی حیات۔ ذی علم ذمی ارادہ ہونا شامل ہے کیونکہ ہر حیات و علم و ارادہ صاحب قدرت اور صاحب حکمت ہونا منظور نہیں۔ ہم ذیل میں ان ہر دو صفات ذاتِ باری پر بحث کرتے ہیں اور یہ بحث بسا اوقات بڑے بڑے عقل و فہم کے مدعیان کو بھی مضطرب کر دیا کرتی ہے۔ ہم یہ ثابت کرینگے کہ ہر تعلیم قرآن کے کوئی ایسا قطعی ماخذ نوع انسانی میں دنیا میں آج تک موجود نہیں ہوا جو اس قسم کی مشکلات کو حل کر کے طالب حق کو اطمینان کے درجہ تک پہنچا سکے۔ ہم نے بارہا دیکھا اور سنا ہے کہ اکثر اصحاب ایسے دقیق مسائل میں بلا اتباع کتاب و سنت بحث کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور غلط مقامات قائم کر کے غلط نتائج پر قائل ہو جاتے ہیں۔ جن کا اثر عام طبائع انسانی پر یہ ہوتا ہے کہ مستندات صحیحہ سے کوسوں دور جا پڑتے ہیں اور خود گمراہ ہو کر دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا کرتے ہیں اور سچ پوچھو تو مجھے برا کہنا چاہئے کہ جو لوگ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے اعراض کر کے محض اپنے توہمات باطلہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور انہیں کو اپنی تحقیق کا منہ پٹی سمجھ کر سماعت حق سے برطرف رہتے ہیں وہ اسی سزل کے قابل ہیں کہ انہیں اطمینان قلب کی خوش فضا منزل تک رسائی نصیب نہ ہو۔ قرآن مجید میں خود اس امر کی طرف مختلف مقامات میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ سا صرف عن الیٰتی الذین یتکبرون فی الارض بخیر الحق..... الخ اس آیت مبارکہ میں لفظ آیات سے وہ دلائل حقہ اور براہین قطعیہ مراد ہیں جو ایک بالغ النظر حکیم کو

صراط مستقیم فطرت پر چلنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اس آیت شریفہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص غیر حق (توہمات باطلہ) کی پیروی کرتا ہے اسے کبھی بھی منزل تحقیق تک رسائی نہیں ہو سکتی اور بالآخر وہ ناکام اور نامراد دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہی معنی ہیں آیہ اولہ ما توتی کے یعنی جو شخص جس پیش یا طریق کو اختیار کرتا ہے ہم اس کو اس کا دالی بنا دیتے ہیں۔ اہل حق اتباع رسول کے سوا کسی امر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور اہل باطل ہمیشہ حسرت و ضلالت کے جنگل میں سرگردان رہتے ہیں۔ الغرض کتاب اللہ سے اعراض کرنا اور اتباع جناح خبیثیت مآب کو چھو کر کرب فلسفہ میں حق کے متلاشی ہونے کا نتیجہ دنیا میں موجب ذلت و رسوائی اور آخرت میں حسرت و وبال کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

مفہوم قدرۃ

ہم نے کتب کلام میں تعریف قدرۃ کو دیکھا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس سے بجز دوساوس و شکوک کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا۔ آخر ایک کتاب میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے مفہوم قدرۃ اور قدرۃ کا مفہود ہونا ثابت ہوتا ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں القدر قدرۃ اللہ یعنی قدر سے قدرت ذات باری مراد ہے۔ یہ وہ مختصر اور جامع تعریف ہے جو ایک محقق کے لئے بیسیوں مسائل مشککہ کے حل کے لئے بمنزلہ کلید کے ہے یہی وجہ ہے کہ ابن عقیل جیسے اکابر اہل علم نے اس تعریف کو سن کر فرمایا اندہ شفی بہذہ الکلمۃ وافصح بها عن حقیقۃ القدر یعنی امام ممدوح نے اس مختصر کلمہ سے کسی ایک امراض سے شفا بخش دی ہے اور حقیقت قدر کا کامل بیان فرما دیا ہے۔ فی الحقیقت خور کرنے سے معلوم ہو گا کہ امام ممدوح کی نظر کتاب اللہ اور سنت صحیحہ میں نہایت عمیق تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب قدر حوادث عالم کا ثبات میں وجود پذیر ہوتے ہیں وہ سب کے سب ذات باری عز و جہ کے علم الہی کے مطابق وقوع میں آتے ہیں اور جس چیز پر اس کا علم حاوی ہے۔ وہ اس کے دائرہ قدرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں صفت قدرۃ و حکمت کو جمیع معلومات اور معلومات پر محیط ظاہر کیا گیا ہے چونکہ معلومات ذات باری لامتناہی ہیں اس لئے بطور لزوم یہ ماننا پڑ گیا کہ

مقدورات ذات باری بھی لائقہا ہی ہیں۔ بعض تنگ خیال لوگ یہ اعتراض اٹھایا کرتے ہیں کہ جو کچھ علاج میں موجود ہے قدرت ذات باری ہی تک محدود ہے۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ جو امور تاحال وجود پذیر نہیں ہوئے ذات باری کی نسبت وہ ایسے ہی موجود ہیں جس طرح موجودہ کائنات ہماری نسبت موجود ہے کیونکہ ذات باری زمانہ اور اس کے آثار سے بالاتر ہے۔ یہ ایک دقیق راز ہے جس کو اکثر کم فہم نہیں سمجھا کرتے۔ پس قدرت ذات باری کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ وہ ان امور پر حاوی ہے جو ازل سے ابد تک وقوع پذیر ہوتے والے ہیں۔ ایسے تمام امور کو ممکنات بولا کرتے ہیں اور وہ کسی صورت میں محدود نہیں ہو سکتے ۴

مفہوم حکمت

عالم کائنات اور اس کے تمام تغیرات و انقلابات ایک نہایت حکیم مطلق کے شاہد ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہم ان تغیرات و انقلابات کے متعلق خاص خاص نتائج و غایات کو وابستہ دیکھتے ہیں جو سب کے سب اپنی نوعیت میں انسانی ہستی کے ساتھ بطور لزوم متعلق ہیں۔ یعنی انسانی ہستی کی تکمیل ان پر منحصر ہے۔ مائت وین کا ہیر پھیر اور آفتاب و قمر کا ایک قانون کلی کے مطابق مسخر ہونا اور باد و باران کا موجود ہونا سب کا ظہور۔ الخرض تمام حوادث یا الواسطہ یا بلا واسطہ انسانی ہستی کی تکمیل کے لیے بمنزلہ اسباب کے ہیں۔ اور حکیم مطلق نے ان امور کو ایک ایسی حکمت کاملہ کے رُوسے قائم کیا ہے کہ وہ حسب ارادہ انہی خاص خاص نتائج کے مستلزم ہیں۔ ہر ایک چیز کی کیفیت اور کمیت کا اندازہ اس نے اپنے علم کامل سے لگادیا ہے۔ پس کوئی امر یا کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کے وجود میں لانے یا محو کرنے میں کوئی نہ کوئی حکمت مد نظر نہ ہو اس میں انسانی ہستی کی بے شمار مصلحتیں متبج نہ ہوں۔ یہ علیحدہ معنی ہیں کہ کوئی شخص اپنی غلط فہمی یا کج اندیشی سے اس حکمت پر آگاہ نہ ہو سکے۔ بہر صورت یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ عالم کائنات کا وجود و عین انسانی ہستی کے ساتھ مناسب مہر و پیر ہوا ہے یعنی کوئی شے یا امر یا حادثہ انسانی ہستی اور اس کی ضرورتوں سے مخالفت واقع نہیں ہوا۔ اسی مناسبت کا باعث حقیقت و صفت حکمت سے

متصف ہونا ہے کیونکہ بدوں اس مناسبت کے سمجھنے کے کوئی شخص پورے طور پر اس شریعت پر آگاہ نہیں ہو سکتا کیونکہ شریعت ہی عین حکمت ہے جو بواسطہ انبیاء علیہم السلام نوع انسان تک پہنچائی گئی۔ ورنہ فلسفہ یعنی ادھام باطلہ کا نام حکمت نہیں کیونکہ اس میں حق بہت کم ہے اُدھ باطل زیادہ۔ قرآن مجید اسی حکمت کی طرف اشارہ فرماتا ہے ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتیٰ خیرا کثیرا یعنی جس شخص کو حکمت دی جاتی ہے وہ خیر کثیر کا مالک ہو جاتا ہے۔ یہیں سے غور کرنے پر ضرورتِ نبوت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے وچرا اس کی یہ ہے کہ جمیع افراد انسانی میں یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ خود بخود مفید و مضر اشیاء کا علم حاصل کر سکے۔ اور صفات ذاتِ باری اور امور متعلقہ عالم آخرت بالخصوص بحیر تعلیم وحی کے عقدہ لائیل رہتے ہیں۔ لہذا حکمت کاملہ ذاتِ باری اس امر کی مقتضی ہوگی کہ جہاں عالم کائنات کو انسانی ہستی کیساتھ ایک خاص مناسبت پر پیدا کیا گیا ہے۔ بذریعہ تعلیم وحی اس کو کمال حقیقی تک رسائی حاصل کرنے کے اصول پر بھی آگاہ کر دیا جائے۔ اسی خیال پر قرآن مجید جانجا ناطق ہے کہ کوئی شخص بجز اتباعِ رسل و انبیاء علیہم السلام منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

قدرت و حکمت کے مفہوم کو علیحدہ علیحدہ سمجھ چکنے

ملازمِ قدرت و حکمت

کے بعد یہ بات از خود واضح ہو سکتی ہے کہ یہ ہر دو صفات

باہم لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ مفہوم حکمت سے ایک ایسے سلسلہ سبب و سبب کا پتہ لگتا ہے جو انسانی ہستی کے عام مصلح پر مبنی ہے چنانچہ آیہ ربنا ما خلقت هذا باطلا (خدا یا!) تو نے سب کچھ بے سود پیدا نہیں کیا میں انہیں مصلح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور مفہوم قدرت میں یہ امر مندرج ہے کہ سلسلہ کائنات اس کے علم کامل کے مطابق وقوع میں آیا ہے اور چونکہ کوئی غیر قبل از کائنات وجود پذیر نہیں تھا اس لیے یہ بھی ماننا ضروری ہوگا کہ نفاذ قدرت میں کوئی امر اس کے لیے مانع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ غیر یہ صورتِ مخلوق ہی ہوگا اور مخلوق جو ہر ایک جہت سے خالق کا محملِ جہ ہے بعد از نفاذ قدرت وجود موجود ہوگا۔

اس لئے قدرت اپنے نفاذ میں ہر ایک متضاد سے یا مخالف سے بری ہے اور اسی لئے اس کو مطلق بولا کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا تقریر سے واضح ہو گیا کہ ہم علم و قدرت و حکمت کو یہ ترتیب مقدم و آخر خیال کر سکتے ہیں مگر یہ باری اپنی سمجھ ہے۔ ذات باری کو یہ صفات بلا تقدیم و تاخیر حاصل ہیں۔ کیونکہ وہ ذات مقدسہ زمانہ اور آثار و لوازم زمانہ سے بالکل بالاتر ہے۔

بعض کوتاہ فہم لوگوں کو یہ اعتراض کرتے عموماً سنا گیا ہے کہ

ایک اعتراض کا جواب | قرآن مجید میں الفاظ انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن

فیکون واقع ہوئے ہیں جن سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ قیل از خطاب کن کوئی شے موجود تھی جس کو خطاب کیا گیا۔ کیونکہ محدوم محض محل خطاب نہیں ہو سکتا۔

واضح ہو کہ یہ اعتراض محض اس غلط فہمی سے پیدا ہوتا ہے کہ عام لوگ صفات ذات باری کو انسانی صفات پر قیاس کرنے لگ جاتے ہیں حالانکہ یہ نایت شدہ امر ہے کہ سلسلہ کائنات بدیں بہتیت موجودہ جاری نیست حادث ہے و گرنہ وہ علم ذات باری میں قدیم ہے۔ اس سیرت میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بجز تعہیم اپنی قدرت کاملہ کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ باری قدرت کا علم کا مقصد نایہ نہیں کہ اس کے نفاذ میں امتناع یا توقف پیدا ہو یا کسی غیر کی امداد یا کسی آلہ کی احتیاج محسوس ہو۔ معلوم ہوا کہ لفظ کن سے حقائق علیہ کو معرض وجود میں لانا مقصود ہے۔ اور صرف بجز تعہیم اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔

مسئلہ صفات میں غلط فہمی کی وجہ سے
چاہے مختلف العقائد فرقتے پیدا ہو گئے

علم کلام میں جو معتقدات اسلامیہ کی تنقیح کے لئے علمائے اسلام نے وضع کیا تھا مسئلہ صفات ذات باری ایک خاثر مسئلہ ہے چنانچہ

اس مسئلہ کے متعلق جیقدر بے اعتدالیاں لیگوں نے کیں اسی قدر فرقہ بندیوں زیادہ ہوتی رہیں مگر چار مشہور گروہ اس مسئلہ کے اختلاف سے حسب ذیل مشہور ہیں :-

(۱) اول وہ گروہ ہے جو ذات باری سبحانہ کے لئے قدرت و حکمت کی نفی کرتے

ہیں۔ ان کے نزدیک ذاتِ باری نہ صاحبِ قدرت ہے اور اسی طرح نہ صاحبِ حکمت بلکہ عالم کا وجود اس ذات سے اضطراری طور پر واقع ہوا ہے یعنی ظہورِ عالم میں اس کا کچھ اختیار نہیں تھا اور کارخانہٴ عالم میں ان مصلح اور مصلح کو جو نظر کرتے ہیں (رحم سے صفتِ حکمت کا ثبوت ملتا ہے) غایتِ الہیہ کہ دیا کرتے ہیں۔ الخیر ارادہ حکمت کوئی چیز نہیں یہ گروہ جہاں تمام انبیاء علیہم السلام اور کتبِ سماویہ کی مخالفت کرتا ہے عقلِ سلیم کی شہادت کا بھی انکار کرتا ہے۔ اور ذاتِ باری سبحانہ کی سخت لہانت اور تنقیص کرتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ صفاتِ ذاتِ باری کا انکار کرتے ہیں اس لیے بُرے بت پرستوں سے بھی زیادہ بدتر ہیں *

(ب) دوم وہ گروہ ہے جو قدرتِ ذاتِ باری کے قائل ہیں مگر اس کی صفتِ حکمت کا انکار کرتے ہیں یعنی عالم و مافیہا کے متعلق کسی غایت یا نتیجہ محدودہ کے قائل نہیں چنانچہ یہ لوگ سلسلہٴ اسباب اور قوائے فطریہ کو نہیں مانتے جن پر خاص خاص مصلح اور مصلح مرتب ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید میں کہیں لامِ علت کو تسلیم نہیں کرتے یہ لوگ بھی صراطِ مستقیم سے دُور ہیں اور ضلالت کے دریا میں غرق و

(ج) سوم وہ گروہ ہے جو صفتِ حکمت کے قائل ہیں لیکن سلسلہٴ اسباب اور عالم و مافیہا کے کسی غایت کے لئے موجود ہونے کو تسلیم کرتے ہیں مگر کمالِ قدرت کی نفی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی ایماندار کا ایماندار ہونا اور متقی کا متقی ہونا اس کے احاطہٴ قدرت سے خارج ہے۔ بلکہ افعالِ عبادِ بلا اختیار و مشیت ذاتِ باری بندوں سے صادر ہوتے ہیں۔ یہ گروہ بھی دائرہٴ ایمان سے باہر ہے *

(د) چہارم وہ گروہ ہے جو کتاب اللہ اور سنتِ صحیحہ پر ایمان رکھتا ہے اس گروہ کے لوگ حق اور باطل کو علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں اور مذکورہ بالا طوائفِ سہ گانہ سے مخالف ہیں۔ وہ آیۃ الاکالہ الخلق والکلام کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کیونکہ اس آیتِ شریفہ

میں لفظ خلق اور امر سے ذات باری عز اسمہ کا صاحب قدرت و حکمت ہونا صاف ثابت ہوا ہے۔ اس لئے یہ لوگ اس کی صفت خلق اور امر پر دو پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ کوئی ایک ذرہ موجودات کا بھی اللہ تعالیٰ کے علم انہی سے خارج نہیں۔ کیونکہ وہ ذرہ مخلوق ہے اور صفت خلق کے لئے خالق کا صاحب علم ہونا ضروری ہے۔ سو جس چیز سے اس کا علم متعلق ہے وہ چیز اس کے احاطہ قدرت میں بھی داخل ہے اور یہ صفت قدرت اضطراری نہیں بلکہ ارادی ہے۔ یعنی اس کے ارادہ سے نفاذ پاتی ہے اور یوں ہی اتفاقیہ نہیں بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور غایت مد نظر ہے پس وہ کامل العلم اور کامل القدرۃ اور کامل الحکمۃ ہے مع ہذا وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اس ذات وحدہ لا شریک نے بذریعہ اسباب طبعیہ اور بعثت انبیاء علیہم السلام کے اہل عالم پر تمام حجت کر دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں نصایہ امر مذکور ہے پس اگر وہ تمام اہل السموات والارض کو معرض عذاب میں لے آئے تو یہ عین عدل ہو گا اس میں ہرگز ظلم نہیں سمجھا جائیگا۔ بلکہ عین حکمت ہو گا۔ اس گروہ کے لوگ نہ تو جبر یہ ہیں جو مشیت ذات باری کے تو قائل ہیں مگر سبب و حکمت کی نفی کرتے ہیں اور قضا و قدر کو اپنی بدعلیوں کے لئے آڑ بنا لیتے ہیں اور نہ قدر یہ جو اس کی صفت قدرت کی نفی کرتے ہیں اور انسان کو صرف نیک و بد کا خالق قرار دیتے ہیں اور ذات باری کے ارادہ و قدرت کو افعال عباد پر محیط نہیں مانتے۔ بلکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے علم کامل کے مطابق طاعت و عبادت کی توفیق عطا فرماتا ہے اور محصیت اور گناہ کا منع نفس انسانی ہے اور وہی محصیت و گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور ذات باری کی طرف گناہ کی نسبت نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ مانتے ہیں کہ مشیت ذات باری بندوں کے اعمال فقیہ پر اسی طرح حاوی ہے جس طرح اس کا علم۔ اور اگر اس کی مشیت اس کے برخلات ہوتی تو نفوس گناہ کا ارتکاب نہ کرتے۔ وہ نیک اعمال سے راضی ہوتا ہے اور بد اعمال سے ناخوش۔ یہ فرقہ اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد میں ہے اور یہی وہ عقائد حقہ ہیں جن کا

ایک ایماندار کو متفق ہونا چاہئے پس مسئلہ جبر و اختیار میں اہل سنت والجماعہ ہر دو (جبر و اختیار) کے درمیان ہے۔ یعنی وہ نہ تو انسان کو محض مجبور خیال کرتے ہیں کیونکہ یہ خیال انزال کتب اور بدشت انبیاء علیہم السلام کو عبث قرار دینے پر مبنی ہے۔ یا یوں کہو کہ انسانی ہستی اور جادوی ہستی کو یکساں یا نہ پر تقسیم کرتا ہے۔ جو صراحتاً منافی عقل ہے اور وہ نہ ہی اس کو ایسا مطلق العنان قرار دیتے ہیں کہ وہ کسی بالاتر ارادہ کا محکوم نہیں اور وہ اپنے افعال و اعمال کا خود ہی خالق و مالک ہے کیونکہ یہ خیال کہ صفات خداوندی ہیں انسان کو شریک کھڑا یا ذات باری کو محفل قرار دینے پر مبنی ہے۔ مگر عقل سلیم جس طرح محض جبر کو باطل باور کرتی ہے اس طرح انسان کے مختار مطلق ہونے کو بھی غلط سمجھتی ہے۔ اور ہر وہ مذہب کا بطلان آیات قرآنیہ اور آثار صحیحہ میں جا بجا مذکور ہے اس نازک اور دقیق مسئلہ میں حق وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھ دیا یہی وہ مذہب ہے جو انسان کو اس امر کے مرکز اطمینان پر کھڑا کر دیتا ہے اور اس کو صراطِ مستقیم شریعت سے منحرف ہونے کا موقع نہیں دیتا۔ اھبی وہ مذہب ہے جس پر تمام اکابر دین اور سلف صالحین کا اتفاق رہا ہے اور بجز اس کے قرآن و سنت سے کسی اور مذہب کا اتخاذ کرنا مصداق ہے۔ آیہ ما ذا ابدا الحق الا الضلال کا۔

وهذا الحق ليس به خفاء - فدعني عن بنيات الطرقت

اس میں کچھ شک نہیں کہ خصم کے سامنے اثبات و دعویٰ کے فرض سے بذریعہ لال کاٹھ سبکدوش ہونا نہایت ہی دشوار امر ہے۔ مگر طالب حق کے سامنے مشکل بھی نہیں استدلال کا میدان استقامت وسیع ہے کہ ہر ایک شخص کو اثبات میں کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں مار لینے کا موقع مل ہی جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ فضول بکواس میں عمر ضائع کرتے اور وسوس اور اداہام کی دلدل میں پھنسے رہتے ہیں مسئلہ جبر و اختیار میں لوگوں نے اس قدر خامہ فرسائی کی ہے کہ محال ہے کہ کسی طالب حق کے لئے اس طومار بے معنی میں کوئی مفید بات نظر آئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جبر نے آیات حیر کو

حجت گردانا اور آیات قدر کی تاویل کر لی۔ اور قدر یہ نئے آیات قدر کو حجت سمجھ لیا اور آیات جبر میں تاویل کر کے اپنے دعویٰ کے مطابق بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر دو آج تک باہم دست و گریبان ہیں البتہ فرقہ حق اہل سنت والجماعت نے باتباع حضرت نبی حق کو سمجھ لیا۔ اور خوب سمجھا۔ اس مسئلہ کی نظیر مسئلہ صفات ذات باری ہے جس میں اہل تشبیہ نے بخیال خود آیات تشبیہ کو حجت گردانا اور آیات تنزیہ میں تاویل کر لی۔ دلیل تنزیہ نے آیات تنزیہ کو حجت قرار دیا اور آیات تشبیہ میں اپنے مطلب کے مطابق تاویل کر لی مگر اہل سنت والجماعت نے یہاں بھی مسلک اعتدال کو اختیار کیا۔ کیسے مذہب تشبیہ مع التنزیہ اور تنزیہ مع التشبیہ کو منتخب کیا۔ جو مقتضائے آیات و آثار صحیحہ ہے۔ اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کے مذہب کی حقیقت

اثبات ہر اہل حق

شروع آیات قرآن مجید سے ثابت ہے آیہ ایالۃ نعبد و

ایالۃ نستعین۔ نہایت وضاحت کے ساتھ ہر دو مذہب باطلہ لبر یہ قدر یہ (کارو کر ہی ہے) کیونکہ جملہ ایالۃ نعبد میں جبر یہ کا اور جملہ ایالۃ نستعین میں قدر یہ کا رد ہے۔ یہ نادور نقیض استدلال صرف قرآن مجید ہی سے مخصوص ہے۔ ورنہ انسانی فطرت کے نہایت یقینی اور مخفی مقتضیات کو مد نظر رکھ کر کوئی انسانی عقل ایسا جامع اور کمال استدلال تجویز نہیں کر سکتی جس کو ہر ایک سلیم الطبع آدمی تسلیم کر لیتے پرمجبور ہو جائے تفصیل اس

بقیہ حاشیہ ۱۲۰ یہ وہ حق ہے جس کی قسم کا خفا نہیں سو مجھے اوصاف دھر گلدنڈیوں پر چلنے سے معاف رکھ دیکھو نہ صرف استقیم کو نہیں چھوڑا جاتا ۱۲۱ منہ ۱۲۰ اہل تشبیہ وہ لوگ ہیں جو الفاظ وجہ یہ میں غیر کوا اللہ تعالیٰ کے لئے انسانی وجہ یہ میں پر قیاس کہتے ہیں اور اہل تنزیہ وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ الفاظ بطور استعارہ کے بولے گئے ہیں ورنہ ذات باری کیلئے نہ تو وجہ ہے نہ بدینہ میں اہل حق کا مسلک یہ ہے کہ یہ امور ذات باری کیلئے ثابت ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لئے ان کا اطلاق کیا ہے تو ہم ان کی نفی نہیں کر سکتے ہیں ہاں ان کی کینیت کو الٰہی وجہ یہ اور میں کی کیفیت سے مختلف جانتے ہیں ۱۲۱ منہ +

اجال کی یہ ہے کہ کمال انسانی کا آخری مقام وہ ہے کہ جس کو کمال عبودیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کمال عبودیت موقوف ہے۔ کمال عبادت پر اور کمال عبادت موقوف ہے اور امر و نہی شریعت کی پابندی پر اور امر و نہی شریعت کا عائد کرنا اس امر کی ضرورت پر مبنی ہے کہ انسان مکلف ہونے کی قابلیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہم بالبداهت دیکھتے ہیں کہ وہ چند ایک قوی فطریہ کے ذریعہ سے حسب ضرورت طبعی متصرف ہو سکتا ہے اور یہی ایک امر اس کو دیگر جمادی ہشیار کی ہستی سے امتیاز بخشا ہے چونکہ حیلہ ایالۃ نسبت فیض انسان اپنی ذات کی طرف کرتا ہے اس لئے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی ہستی کو چند فرائض کی سجاوڑی کے معرض میں لاتا ہے گویا اس نسبت فیض سے وہ اپنے تئیں جوابدہ قرار دیتا ہے اور اس کا اپنے تئیں جوابدہ قرار دینا ثابت کر رہا ہے۔ کہ وہ اپنے تئیں خالص جبر کا محکوم علیہ نہیں سمجھتا۔ پس حیلہ ایالۃ نسقین میں خالص جبر کا رد نہایت زور کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اب غور کرو کہ حیلہ ایالۃ نسقین کی حقیقت میں جو بآواز بلند فرقہ فطریہ کا بطلان ثابت کر رہا ہے۔ کیونکہ استغانت کی حقیقت بحر اس کے اور کچھ نہیں کہ انسان بازگاہ حضرت رب العزت سے اپنے مقاصد کے حین النظم کے لئے طالب عون ہو اور طلب عون اسی وقت متوجہ ہے جبکہ وہ اپنے قولے فطریہ کو کسی امر مقصود کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ مگر قوی کا صرف متوجہ ہونا اس کے مقصد کی سرانجام دہی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک خارجی اسباب کی تائید مثل قوی کو جاسی نہ رکھ سکے اور انہیں اسباب ضروریہ خارجیہ کا متنبہ ہونا اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے حصول عون کو ظاہر کرتا ہے اور اسی کا نام توفیق الہی ہے چونکہ اس حیلہ میں انسان اپنے فرائض کے انضمام کو توفیق ذات باری پر موقوف رکھتا ہے لہذا انسان کی خود مختاری کا مسئلہ باطل ہو گیا۔ پس ہر دو حیلہ کے ملانے سے جو صریح مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان نہ تو محض جبر کا مانع ہے اور نہ علی الاطلاق مختار +

سعادۃ و شقاوت کا ازل میں مقدم ہونا
ترک عمل اور ترک اجتہاد کا مستلزم نہیں

بہت سے لوگوں کو یہ دھوکا لگ رہا
ہے کہ جب مشیت الہی ازل میں انسان کی شقاوت
و سعادت پر جاری ہو چکی ہے تو پھر انسان کا

عمل کے لئے اجتہاد سعی کرنا یا اس کا ترک کرنا برابر ہیں اس بارہ میں بعض اچھے اچھے
سمجھدار اہل علم کو بھی نہایت متزلزل و مکھیا گیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مذکورہ بالا خیال کی تائید
کتاب اللہ اور آثار صحیحہ سے نہیں ہو سکتی۔ اور یہ امر توحید ذات باری کی تکمیل کے لئے
کافی ہو سکتا ہے۔ اس سوال کا فیصلہ خود جناب سرور کائنات صلعم نے فرما دیا تھا۔ جب کہ
بعض صحابہ نے عرض کیا کہ جب ہر ایک شخص کا جنتی یا جہنمی ہونا ازل میں مقدم ہو چکا ہے
اور اس کے سعید اور شقی ہونے کا فیصلہ بھی ہو گیا ہے تو کیا ہم اس مقدر پر مطمئن ہو کر
عمل اور کوشش کو نہ چھوڑ دیں کیونکہ جو سعید ہو گا وہ خود بخود اہل سعادت کا عمل بجا لائیگا
اور جو شقی ہو گا وہ بھی مجبوراً اہل شقاوت کے عمل پر کاربند ہو گا۔ اس سوال کا جواب حضور علیہ
السلام نے یوں ارشاد فرمایا تھا کہ تم عمل کئے جاؤ۔ کیونکہ ہر ایک شخص کو اس کی تقدیر
ازل کے مطابق عمل میں آسانی دی گئی ہے۔ اہل سعادت کو اہل سعادت کے عمل کی اور
اہل شقاوت کو اہل شقاوت کے عمل کی اسی معنی کی ایک حدیث مستند امام احمد میں مروی
ہے جب کہ بنی ہیینہ کے ایک شخص نے عرض کیا تھا کہ جب ازل میں ہر ایک شخص کے عمل
اور سعی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ تو لوگ پھر کیوں عمل کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو
اللہ تعالیٰ نے (سعادت یا شقاوت میں سے) کسی ایک کے لئے پیدا کیا ہے اس کے
اسباب عمل بھی اس نے ساتھ ہی تجویز کر دیئے ہیں (یعنی عمل و سعی ضروری ہیں مگر وہ مقدم
ہیں) اس کی تصدیق کتاب اللہ میں خود خدائے عزوجل نے کروئی ہے حدیث قال نفس
وما سوما قال لہما فجورہا و تقویٰہا اس آیت میں الفاظ فجورہا و تقویٰہا میں (جو تبرک
اضافی مذکور ہیں) اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ہر ایک نفس کو فجور اور تقویٰ کا الہام اللہ

کی طرف سے ہوتا ہے جو ازل میں اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے حدیث ذیل میں جو بردایت
عبداللہ بن عمر مروی ہے اسی معنی کی وضاحت کرتی ہے حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول
اللہ مدارِ عمل کس چیز پر ہے آیا اس چیز پر جس کا فیصلہ ہو چکا ہے یا اس چیز پر جس کا فیصلہ
ابھی ہونا ہے جناب پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ عمل کا مدار فیصلہ ازلی پر ہے۔ مگر
ہر ایک شخص اپنے مقدر کے مطابق عمل کی توفیق دیا جاتا ہے۔

الغرض کتاب و سنت میں اس قسم کے ہمہ جہت نظائر موجود ہیں جن سے مذکورہ بالا
خیال کی پوری پوری تائید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے
مذکورہ بالا حدیث سن کر فرمایا کہ میں عمل میں کوشش کرنے کی رو سے پہلے سے بھی زیادہ
مضبوط ہو گیا ہوں اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کی قضاہت اور وقت فہم اور صحت
علم کس پایہ کی تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے نہایت لطیف پیرایہ میں یہ
ارشاد فرمایا ہے کہ تقدیر انہی عالم دنیا میں بذریعہ اسباب کے ظہور پذیر ہوتی ہے جس کا مطلب
یہ ہے کہ انسان بذریعہ کوشش کے اس مرکوپا لیتا ہے جو ازل میں اس کے لئے مقدم ہو چکا
ہے اور اس کے کرنے کی اس کو قدرت دی گئی ہے جو جس قدر ترتیب اسباب میں انسان
کوشش کرتا ہے اسی قدر حصول مقدر زیادہ کامل طور پر مستصور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر اس کے
مقدر میں صاحب اولاد ہونا ازل میں قرار پا چکا ہو تو اسباب حصول اولاد میں اس کا سعی کرنا
ضروری ہے علیٰ ہذا دیگر تمام امور میں بھی انسان کا سعی کرنا اسی طرح لایہ ہے پس جو شخص اس
ضروری شرط کے نظر انداز کرے کہ تو کل کے نام سے تعبیر کرتا ہے وہ سخت غلطی پر ہے اس
کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے کوئی شخص بغیر غذا اور پانی کے سیری اور سیرانی کی امید رکھتا
ہو۔ خلاصہ یہ کہ انسان کو دینی اور دنیوی امور میں اسباب کا پابند کیا گیا ہے اور اس پابندی
اسباب سے وہ مقدر انہی سے سرمو تفاوت نہیں کر سکتا۔ یہی معنی ہیں ہمارے اس قول کے
کہ انسان جبر اور اختیار کے درمیان پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہی صحیح مذہب ہے اور بحر اس کے

اس نازک مسئلہ میں تمام رائیں باطل ہیں جس شخص نے اس امر کو سمجھ لیا اس نے دینی اور دنیوی مصلح کو پال لیا۔ اور جس نے افراط و تفریط کی وہ گمراہ ہو گیا۔

بعض نزدیکان سلف سے یوں مروی ہے کہ نجد میں اس امر کو دوست نہیں رکھتا کہ میرا معاملہ میرے ہاتھ میں ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہونا میرے ہاتھ میں ہونے کی نسبت بھلا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ سلسلہ اسباب کا متکفل ہے اس لئے تقدیر انبی انسان کے لئے اعمال کے سبب لائے میں معاون ہے۔ نہ ملخ۔ اس تقریر سے یہ معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح طور پر انسان کی حد اختیار کو نبھایا ہے جس سے نہ تو نظام توحید میں فرق آسکتا ہے۔ نہ انسان کو مطلق العنان ماننا لازم آتا ہے ۱۰

الکسب والجبر

مسئلہ زیر بحث میں یہ ہر دو لفظ استعمال میں آیا کرتے ہیں ان میں فرق ظاہر کرنا ضروری ہے کیونکہ ایسا اوقات بعض اصحاب ان الفاظ کا مفہوم غلط سمجھا کرتے ہیں۔ کسب اصل تحت میں جمع کو بولتے ہیں جو ہر صی صاحب صحاح کہتے ہیں "هو طلب الرزق يقال كسبت شيئاً أو اكتسبت بمعنى" اور قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال تین طرح پر آیا ہے (۱) عقد القلب وعزمہ کہ قولہ تعالیٰ لا يؤاخذكم الله باللغو في أيمانكم ولكن يؤاخذكم بما كسبت قلوبكم اس آیت میں کسبت بمعنی غمّت ہے (۲) کسب المال من التجارة کہ قولہ تعالیٰ یا ایہا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتہم (۳) السعی والعمل کہ قولہ تعالیٰ لہما ما کسبتا وعلیہما ما اکتسبتا ۱۱

اسی طرح لفظ جبر کا استعمال عربی زبان میں تین طرح پر آیا ہے (۱) ان یغنی الجہل من فقرہ و یجبر غظمہ من کسر یعنی غلشی کے بعد آدمی کا غنی ہو جانا یا ٹوٹی ہوئی ہڈی کا درست کرنا اس معنی کی رو سے یہ لفظ لازم اور مستعدی دونوں طرح پر استعمال میں آتا ہے ایک شاعر نے ہر دو کو جمع کیا ہے ۱۲

قد حیر الدین الالہ فحیر

یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کو درست کر دیا سو وہ ہو گیا (رب) الا کرہ والقہر اس صورت میں یہ لفظ باب افعال سے مشتق ہو گا یعنی اجبرہ علیہ بولینگے نہ جبرہ علیہ (ج) الحزہ والا متناع یعنی کسی کی دسترس اور رسائی سے بالاتر ہونا اسی لئے ورت خرم کو جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہو تو نخلہ نجیاء بولتے ہیں بروایت اخفش آیہ ان فیہا قوما جبارین سے ایسے لوگ مراد ہیں جو صاحب قوت و عظمت تھے گویا النخل الجبار سے اس نے یہ معنی اخذ کئے ہیں والجبار من الناس العالی الذی یجبر الناس علی ما یرید یعنی آدمیوں میں سے جبار وہ شخص کہلاتا ہے۔ جو لوگوں کو اپنے ارادہ پر مجبور کرتا ہے۔ اور جب ذات باری کے متعلق اس اسم کا اطلاق کیا جاتا ہے تو اس کے معنی میں عظمت کا مفہوم داخل ہوتا ہے۔ قال ابن عباس فی قوله تعالیٰ الحیاء المتکبر هو العظیم قال محمد بن کعب النہاسی الجبار لاندہ اجبر الخلق علی ما اراد الخلق ادق شأناً من ان یجبروا ربهم الا بمشيئهم مگر محققین نے فیصلہ کیا ہے کہ جب لفظ جبار ذات پر اطلاق کیا جاتا ہے تو ملک قہر و علویں سے ایک کا مفہوم اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب اس لفظ کا استعمال کسی آدمی پر کیا جاتا ہے جو اسی طرح مذموم سمجھا جاتا ہے جس طرح لفظ متکبر کا اطلاق۔ قال اللہ تعالیٰ یطیع اللہ علی کل قلب متکبر جبار۔ مذکورہ بالا تحقیق صرف لغوی تحقیق ہے مگر ذیل میں اس کی تشریح (مطلاً حاضر و ہی معلوم ہوتی ہے۔

اس مضمون کو ابن باقلی نے حسب ذیل لکھا ہے کہ ہر ایک ذی عقل اس امر کو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کے ان اعلیٰ و خواہشات پر ثواب و عقاب مترتب کر لکھا جو ان کی زندگی میں ان سے ظاہر ہوئے۔ اور یہ بھی لفظ قطعہ سے ثابت ہے کہ اس نے اپنی حکمت کا ملہ سے انہیں ادا کروا دی کی بجا آوری کی قدرت دی ہے اور وہ نیکے

بد اعمال کو اپنی مرضی اور ارادہ سے اختیار کرتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ انہیں امور کا وہ مطالبہ بھی کر لیا جن کی بجا آوری کی اس نے انہیں قدرت دی ہے۔ اور اس کے برخلاف کسی امر کا قائل ہونا صراط مستقیم سے انحراف کرنا ہے۔ کیونکہ تمام سلف صالحین کا یہی عقیدہ تھا۔ اس مقام پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا فعل کا وقوع صرف عبد کی قدرت حادثہ سے وقوع میں آتا ہے یا صرف ذات باری کی قدرت سے یا ہر دو سے ؟

پچھلی دونوں صورتیں باطل ہیں کیونکہ انسان کا جوابدہ ہونا۔ باطل قرار پاتا ہے البتہ پہلی صورت کو قائم رکھا جاسکتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ عبد کی قدرت حادثہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ اسی وجہ سے جایا آیات میں فعل کی نسبت ذات باری کی طرف کی گئی ہے اگرچہ اس نے عبد میں قدرت فعل پیدا کر کے اس کو محتار بنایا ہے۔ مگر خالق قدرت و فعل وہی ہے۔ انسان بذریعہ اسباب ضروریہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں اپنے حسن اختیار اور سوئے اختیار کی وجہ سے مرتکب ہو کر جوابدہ قرار پاتا ہے اس لئے عبد کی شان یہ ہے کہ وہ مختار اور مامور ہے اور خلق اسباب جس پر وجود و فعل مترتب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس کو بذریعہ مثال یوں سمجھنا چاہیے کہ آقا اپنے ملازم کو کسی سرمایہ کے تجارت میں لگانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ اس کی اجازت پر اس کو تجارت میں لگاتا ہے ظاہر ہے کہ درحقیقت تجارت آقا کرتا ہے اور ملازم اس کی اجازت پر عمل کرتا ہے۔ اور اگر وہ اجازت نہ دیتا تو ملازم کا فعل ناقذ نہ ہوتا۔ اب اگر وہ برخلاف مرضی آقا کے عمل کرے تو اس کا فعل قابل گرفت ہوگا۔ گویہ مثال بہم وجہ صحیح نہیں بلکہ اصل مدعا کے سمجھنے میں کسی حد تک مفید ہے ۔

واللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم

المقادیر

واضح ہو کہ مسئلہ قضا و قدر نہایت دقیق اور وسیع مسئلہ ہے۔ چونکہ موجودہ زمانہ میں اکثر لوگ مادی فلسفہ کے مطالعہ سے نچریت یا وہریت کے دم میں آکر ایمان حقیقی کی شاہراہ سے کوسوں دور جا پڑتے ہیں اور چونکہ یہ مسئلہ تمام اصول و فروع شریعت کے لئے بمنزلہ اساس کے ہے اس لئے اگر کسی شخص کو قضا و قدر پر ایمان نہیں تو یقیناً وہ محض برائے نام اسلامی جماعت میں شمار ہوتا ہے ورنہ درحقیقت اسے اسلام و اہل اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔ (بنا لا تنوع قلوبنا۔ امین۔) ذیل میں مقادیر خمسہ کی تشریح کی جاتی ہے جن کا اسلامی شریعت میں مفصلاً ذکر آچکا ہے۔ چونکہ ایسے ضروری مسائل سے ہر ایک مسلمان کا تکمیل ایمان کے لئے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اس لئے ہمیں اس امر کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ناظرین کو ان مسائل کی حقیقت سے بے خبر نہ رہنے دیا جائے مگر چونکہ ہر ایک شخص خود بخود ان کا استنباط نہیں کر سکتا اس لئے ہمارا فرض ہے کہ اہل اسلام میں ان کی اشاعت کریں :-

التقدیر الاول | تقدیر اول سے اللہ تعالیٰ کا اشیائے کائنات کو

مراو ہے۔ ایک حدیث میں جو صحیح مسلم میں بروایت عبد اللہ بن عمر بن عاص مروی ہے یوں وارد ہوا ہے ”کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق السموات والارض الخمسین الف سنة وعشر شہ علی الماء“۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے پیدا کرنے سے پہلے پچاس ہزار سال مخلوقات کی ہر ایک چیز کا اندازہ باندھ دیا اور اس کی عرش پانی پر تھی۔ اور یہ کتابت اس ساعت میں واقع ہوئی جبکہ اللہ تعالیٰ نے قلم کو

پیدا کیا اور اس پر ایمان لانا واجب ہے چنانچہ ایک حدیث میں جو مستدام احمد رحمہ اللہ
 میں روایت عبادۃ بن صامت مروی ہے یوں وارد ہوا ہے "قال دخلت علی عبادۃ
 وهو مرضی الخلیل فیہ الموت فقلت یا ابتاہ اوصنی واجتہد لی فقال اجلسنی
 فلما اجلسوہ قال یا بنی انک لن یجد طعمہ الا یؤمن ولن تبلغ حق حقیقۃ
 العلم یا اللہ تبارک وتعالیٰ حتی تؤمن بالقدیر خیرہ وشرہ قلت یا ابتاہ
 وکیف لی ان اعلم ماخیر القدر وشرہ قال تعلم ان ما اخطا لک لم ینک
 لیصیبک وما اصابک لم ینک لیخطئک یا بنی انی سمعت رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان اول ما خلق اللہ تعالیٰ القلم ثم قال کتب
 نجرہ فی تلک الساعۃ بما ہو کائن الی یوم القیامۃ یا بنی ان مت
 ولست علی ذلک دخلت النار" یعنی میں عبادہ (اپنے باپ) کے پاس گیا
 اور وہ مرض الموت میں پڑے تھے میں نے کہا کہ اے مہربان باپ مجھے کچھ وصیت
 فرمائیے کہنے لگے کہ ذرا مجھے اٹھا کر بٹھا دو جب اٹھا کر بٹھا دیے گئے تو فرمایا کہ بیٹا تجھے
 ایمان کی عداوت اور کما حقہ علم معرفت ذات باری حاصل نہیں ہونگے جب تک تو تقدیر
 الہی کے خیر و شر پر ایمان نہیں لائے گا۔ میں نے کہا کہ اے باپ مجھے تقدیر کے خیر و شر
 کا کیونکر علم ہو؟ فرمایا کہ جو چیز تجھ سے مل جائے اس کی نسبت تجھے یقین ہو کہ تقدیر ہی
 میں اس کا مل جانا لکھا تھا اور جو چیز تجھ پر وارد ہو اس کی نسبت تجھے یقین ہو کہ اس کا
 نہ ملنا تقدیر الہی میں مفرد تھا۔ بیٹا! میں نے پیغمبر علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا تھا کہ پہلے پہل
 اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا کیا اور اسے حکم دیا کہ لکھ۔ بولا خدا یا! کیا لکھوں؟ حکم ہوا کہ ہر ایک
 امر جو قیامت تک ہونے والا ہے لکھ۔ بیٹا! تجھے اس تقدیر الہی پر اگر ایمان نہیں
 ہوگا تو جہنم میں جائے گا۔

اس حدیث میں صاف طور پر تقدیر خداوند جل و علا کی نسبت ارشاد فرمایا کہ قبل از وجود

کائنات اللہ تعالیٰ نے تمام امور کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک واقع ہونگے اپنی
 حکمت کاملہ اور قدرت ہائے کمال سے لکھ دیا تھا اور محدث ترمذی نے اسی مضمون کی حدیث ذیل کو
 روایت کیا ہے اور اس کو حدیث حسن صحیح لکھا ہے۔ عن عبد اللہ بن عباس قال
 كنت خلف النبي صلى الله عليه وسلم يوما فقال لي يا غلام اني اعلمك كلمات
 احفظ الله يحفظك احفظ الله تجده تجاهك اذا سالت سئل الله واذا استعنت
 فاستعن بالله واعلم ان الامة لو اجمعت على ان ينفعوك بشئ لم ينفعوك الا بشئ
 قد كتبه الله لك وان اجمعتوا على ان يضروك لم يضروك الا بشئ قد كتبه الله عليك
 رفعت الاقلام ورجفت الصحف یعنی عبد اللہ
 بن عباس سے مروی ہے کہ میں ایک دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے تھا
 آپ نے فرمایا اولیٰ کے! میں تجھے کچھ باتیں سکھانا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ (کے احکام)
 کی حفاظت کر وہ تیری حفاظت کرے گا تو اس کی شریعت کی عزت کر تو اسے اپنی
 سامنے پائیکا جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ ہی سے کر اور جب اللہ سے مطلب کرے
 تو اسی سے مدد طلب کر اور اس بات کا یقین کرے کہ اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے کوئی نفع
 پہنچانا چاہیں تو وہ کچھ نفع نہیں پہنچا سکیں گے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ
 دیا ہے اور اگر سب جمع ہو کر تجھے کچھ ضرر پہنچانا چاہیں تو وہ نہیں پہنچا سکیں گے مگر وہی
 جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے (تمہارے وجود سے پہلے) قلم خداوندی لکھنے سے
 فارغ ہو چکا ہے اور وقار (لکھے جا کر) خشک ہو چکے ہیں یعنی جو کچھ ہوتا تھا پہلے ہی
 ہو چکا ہے۔ اور بخاری میں ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ یا ابا ہریرہ حف القلم بامت
 لاق یعنی اے ابو ہریرہ جو تیرے پیش آنے والا ہے اس پر انیل میں قلم خداوندی لکھ
 کر خشک ہو چکا ہے

در حقیقت مذکورہ بالا مضمون کی تصدیق میں آیت "ما اصابت من مصیبة فی

الارض ولا فی افسکھ الا فی کتاب من قبل ان نراھا" موجود ہے اور یہی آیت احادیث مسطورہ بالا کا ماخذ ہے۔ اس آیت شریفہ میں جو مسئلہ تقدیر کے حل کرنے میں اصل اصول ہے علمائے اختلاف کیا ہے کہ لفظ نبراھا میں ضمیر ہا کا مرجع کیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مصیبت - ارض - نفس علیحدہ علیحدہ تینوں مرجع ہو سکتے ہیں مگر محققین نے فیصلہ کیا ہے کہ تینوں کا مجموعہ اس ضمیر کا مرجع ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ زمین میں اور کہتا ہے نفسوں میں کوئی مصیبت نہیں پہنچتی جو ان چیزوں کے پیدا کرنے سے پہلے لوح محفوظ میں ثبت نہ ہو چکی ہو جس رضی اللہ عنہ اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں "واللہ ان اللہ لیتقضی القسیۃ فی السماء ثم یضرب لھا اجلًا انہ کانت فی یوم کذا وکذا فی ساعۃ کذا وکذا فی النجۃ اذ العامۃ حتی ان الرجل لیاخذ الحصا ما یاخذھا الا بقضاءہ و قدرہ قال یا ابا سعید واللہ لقد اخذتھا وانی عنھا العقی ثم لا صبر لی عنھا قال الحسن او لا تری"

یعنی بخدا کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر کسی امر کا فیصلہ کر کے اس کے لئے ایک مہلت اور روز وقوع اور ساعت وقوع معین کر دیتا ہے وہ امر عام لوگوں سے متعلق ہو یا کسی خاص شخص سے حتیٰ کہ آدمی اپنی چھڑی کو بھی محض حکم آسمانی الہی کے مطابق ہاتھ میں لیتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا کہ اے ابوسعید خدری کہ میں چھڑی ہاتھ میں لیتا ہوں حالانکہ مجھے اس کی کچھ ضرورت بھی نہیں ہوتی مگر پھر بھی مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا انہوں نے فرمایا کہ اس سے کیا تجھے حکم تقدیر الہی کا یقین نہیں ہو سکتا؟

اور حدیث ذیل مذکورہ بالا تشریح کی اور بھی تقویت کرتی ہے "ان اللہ عزوجل خلق خلقہ فی ظلمۃ ثم القى علیہم من نورہ فمن اصابہ من نورہ یومئذ اھتدی ومن اخطأ ضل فلذلک اقول جفت القلم علی علم اللہ" یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی خلقت کو ظلمت میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور ڈالا جس شخص پر

اس دن وہ تو پہنچ گیا وہ تو ہدایت یافتہ ہو گیا اور جو اس نور سے علیحدہ رہا وہ گمراہ۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی پر قلم الہی خدشہ نہ ہو گیا (جو ہونا تھا ہو چکا)۔

تقدیر ثانی | تقدیر اول قبل از خلق السموات والارض تھی اور تقدیر ثانی بعد از خلق مگر افراد عباد کے پیدا ہونے سے پہلے چنانچہ ترمذی میں بروایت

ابو عبد الرحمن سلیمان بن علی ابن ابی طالب مروی ہے: "بینما نحن مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو یبکی فی الارض اذ وقع راسہ الی السماء ثم قال ما منک من احد الا قد علمہ قال وکیع الا قد کتب مقدرہ من النأ و مقدرہ من الجنة قالوا انزلہ فینزلک یا رسول اللہ قال لا انا ولا کل منکم لیس فیہم جناب یا خیر علیہ السلام کے ساتھ تھے اور ایک کریدنی سے آپ زمین کو سریدتے تھے کہ کیا ایک پل نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا اور پھر فرمایا کہ کوئی تم میں سے ایسا نہیں کہ جس کا ٹھکانا جہنم یا جنت میں (پہلے سے) معین نہ ہو چکا ہو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا (اس صورت میں) ہم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کر لیں آپ نے فرمایا نہیں تم عمل کئے جاؤ گے نہ کہ ہر ایک شخص کو اس امر کے بجالانے میں آسانی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث بروایت عمران بن حصین مروی ہے

قیل یا رسول اللہ اعلم اهل الجنة من اهل النار قیل نعم فیه یعمل العالمون قال کل منکم لیس فیہم جناب یا خیر یعنی حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ کیا اہل جنت اہل نار سے علیحدہ ہو چکے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ عرض کیا گیا کہ عمل کرنے والے کس امر کی بابت عمل کر رہے ہیں یعنی یہ معاملہ طے ہو چکا ہے تو اب عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ نے فرمایا کہ ہر ایک شخص اس امر کے لئے جو اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے آسانی دیا گیا ہے۔ اور صحیح حاکم میں بروایت ابی بن کعب ایہ "واذ اخذ ربکم من بنی آدم من ظہورہم ذریعتہم" مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو اس دن

جمع کے جنت جنت بنا دیا اور ان کو گویا کیا چنانچہ ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا اور الست
بریکہ سے ان سے عہد لیا جس پر انہوں نے کہا "بلی" یعنی ہاں تو ہمارا پروردگار
ہے اور ہم تیرے مطیع و فرمانبردار بندے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بنی آدم میں
تمہارے اس اقرار پر زمین اور آسمان کو اور تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو گواہ مقرر کرتا ہوں
تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یہ نہ کہتے تلو کہ میں تیری ربوبیت کا علم نہیں تھا یا ہم اس امر سے
غافل رہے ہیں۔ سو تمہیں میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا ہوگی اور کسی غیر کو میرے
ساتھ شریک نہ کرنا ہوگا۔ میں تمہاری ہدایت کے لئے تمہاری طرف پیغمبر بھیجوں گا جو تمہیں میرا
اس وقت کا عہد یاد دل کر رہیں۔ میری عبادت کی طرف متوجہ کیا کریں گے اور میں اپنی شریعت اور
کتابیں تمہارے لئے نازل کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس عہد کے لئے چکنے پر حضرت
ابو البشر کو ان کی اولاد کو کھلانی گئی آپ نے اپنی اولاد کو مختلف حالات اور وضع میں
دیکھ کر عرض کیا کہ خدایا اگر تو ان سب کو یکساں بنا دیتا تو کیا اچھا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ
نے فرمایا کہ میں یہ جانتا ہوں کہ بندے میرے شکر گزار ہوں (اگر سب کے حالات یکساں
ہوتے تو عبودیت کا اظہار نہ ہوتا اس لئے میری حکمت کا ملہ اس اختلاف کی مقتضی ہے)
انہیں لوگوں میں آدم علیہ السلام نے انبیاء علیہم السلام کو دیکھا کہ چراغ کی طرح روشن تھے۔
اور یہ روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیۃ لا تأخذ بالیأس الخ کے ذیل
میں فرماتے ہیں "ان الله اخذ على ادم انہ ربهم وكتب رزقہ واجلہ ومصیباتہ
شما اخرج من ظہرہ وولدہ کھیمۃ الذن فاخذ علیہم الميثاق انہ ربهم
وكتب رزقہم واجلہم ومصیباتہم یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے اپنی
ربوبیت کا اقرار لے کر اس کی روزی اور مدت عمر اور مصائب وغیرہ کا اندازہ معین کر دیا پھر
اس کی پیٹھ سے پیوٹیوں کی طرح اولاد کو نکالا اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیکر ان
کی روزی اور مدت عمر اور مصیبتوں کا اندازہ بابتھ دیا۔

مسطورہ بالا آیت شریفہ کے ذیل میں بروایت عبد اللہ بن مسعود روای ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر نکالا تو آپ کی پشت کے دانے پہلو پر ہاتھ پھیرا اور اولادِ آدم کو جو سفید لونو کی طرح چھوٹیوں کی شکل میں تھا نکالا اور انہیں کہا کہ تم میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جاؤ علیٰ ہذا بایں پہلو پر ہاتھ پھیر کر سیاہ رنگ کی چوٹیوں کی شکل میں اولادِ آدم کو باہر نکالا اور انہیں کہا کہ تم جہنم میں داخل ہو جاؤ اس جالیہ میں بے نیام ہوں اور مجھے کچھ پرواہ نہیں)۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن شریف میں اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کہا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا بعض نے خوشی خاطر اور بعض نے بکراہت خاطر اس کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ تب اللہ تعالیٰ اور اس کے مالک نے کہا کہ ہم اس امر کے (تمہارے اس عہد و اقرار کے) شاہد ہیں۔ کہیں تم قیامت کو یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو شرک نہ کرتے ہم نے اپنے آباء و اجداد کی تقلید کر کے ایسا کیا یہی وجہ ہے کہ اولادِ آدم میں بعض تو خالص توحید کے مالک ہیں اور اکثر لوگ اپنے آباء و اجداد کی تقلید میں گرفتار ہیں اور مشرک ہیں *۔

اسی تفسیر کی تائید آیہ "ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعا و کرہا" سے بھی ہوتی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اسی ذات مقدس کے لگے تمام مخلوقات زمین و آسمان مطیع ہے خواہ خوشی خاطر خواہ بکراہت خاطر۔ سو خوشی خاطر تو اہل ایمان ہیں اور بکراہت خاطر اہل شرک۔ اور آیہ "فللہ الحجۃ البالغۃ فلو شاء لہدکم اجمعین" کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ روزِ ميثاق (عہد) میں تمہیں ہدایت یافتہ بنا نا چاہتا تو تم سب ہدایت یافتہ ہوتے اسی طرح عبد اللہ بن ربیع کتاب ائمہ میں بروایت ابو کلابہ روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو انکی پیٹھ سے نکالا پھر جو اس کے دانے ہاتھ میں تھے ان کو دائیں جانب پھینک کر کہا انکو میں نے جنت کیلئے پہنچایا کیا ہے اور میں نے نیام نہ ہوں اور جو بائیں ہاتھ میں تھے انکو بائیں جانب پھینک کر کہا ان کو میں نے جہنم کے لئے پہنچایا کیا ہے اور میں نے نیام نہ ہوں۔ تب ان میں سے ہر ایک کے اعمال کو مقدمہ کر دیا اور کتاب بند کر دی اور علم الہی طے کر دیا۔

(جو ہونا تھا ہو چکا) آیہ مسطورہ بالذاتی تفسیر میں اور بھی بہت سی روایات ہیں مگر بعض دیگر بعض سے کسی قدر مخالف ہیں۔ چنانچہ بعض سے تو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اولاد آدم کی بیٹیوں سے یعنی بعض کو بعض سے نکالا اور بعض روایات میں آدم علیہ السلام کی بیٹی سے نکالنا مذکور ہوا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ جس طرح روزِ ميثاق میں ان سے ریلویت کا عہد لیا گیا تھا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ایک ایسی فطرت پر پیدا کر دیا ہے کہ انہیں مخلوق ہونے کے بعد اس کی ریلویت سے کچھ انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی کا نام تقدیرِ ميثاق اور ميثاقِ اول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برخلاف کسی کو نہ تو ابدان قیامت کو ہی حجت کرنے کا موقع ملے گا بلکہ اللہ تعالیٰ نے "قللہ الحجۃ البالغۃ" کے رُوسے سب پر خواہ کوئی مومن ہو یا کافر تمام حجت کر دیا ہے +

احتجاج آدم و موسیٰ علیہما السلام | اس مقام پر اس حدیث کی تشریح نہایت ہی ضروری معلوم ہوتی ہے جو یہ آیت حضرت ابوہریرہؓ مروی ہے اور سلمہ قضا و قدر کے باب میں اہم سمجھی گئی ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
 احجج ادم و موسیٰ فقال موسیٰ یا ادم انت ابونا خبنا واخرجتنا من الجنة فقال لہ
 ادم انت موسیٰ اصطفاک اللہ بکلامہ و خطبک التوراة مبداء التومنی علی امر قد
 اللہ علی قبل ان یخلقنی بالربعین سنة فقال البنی صلی اللہ علیہ وسلم فحج ادم و موسیٰ
 فحج ادم و موسیٰ فحج ادم و موسیٰ۔“

یعنی آدم اور موسیٰ علیہما السلام نے ایک حجت پکڑ لی موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ آدم تو ہی ہمارا باپ ہے تو نے ہمیں جنت سے ناکام رکھا اور ہمیں وہاں سے نکلوا یا آدم علیہ السلام نے فرمایا تو ہی موسیٰ ہے جس کو خدا نے ہمکلامی کا درجہ بخشا اور اپنے ہاتھ سے توریت لکھ کر تجھے عطا فرمائی۔ کیا تو مجھے ایک ایسے امر کی بابت ملامت کرتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے میرے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے مقدر کر رکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ اس جواب پر آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے (یہ جملہ آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمایا) +

واضح ہو کہ یہ حدیث ایک محرکہ الارامسکہ ہے اور اس کی تفسیر میں علمائے امت نے بہت سے اقوال بیان کئے ہیں۔ اور بعض ملاحدہ نے جو تقدیر اور مشیت الہی کے افعال انسانی پر حاوی ہونے کے منکر ہیں اس حدیث کی اصیلت سے انکار کیا ہے حالانکہ یہ حدیث اصول محدثین کے مطابق ثابت ہے اور ہر ایک قرن میں علمائے امت نے اس کو قبول کیا ہے اور اس امر کی شہادت دہی ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی زبان حقائق ترجمان سے اس کا ارشاد فرمایا ہے اور بعض دیگر نے اس کی بے معنی تاویلیں کی ہیں مگر دشمنان خدا اور رسول کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ جب کوئی نص ان کے عقائد کے مخالف پڑا کرتی ہے تو اسی طرح یا تو اس سے انکار کر دیا کرتے ہیں یا اس کو خلاف مقصود کسی دوسرے مفہوم پر محمول کر لیا کرتے ہیں۔ اسی قسم کے لوگوں نے دین میں رخنہ اندازیاں پیدا کر کے فرقے قائم کئے (خذ بعذر اللہ تعالیٰ) لیکن اگر یہ منکرین حدیث کے مفہوم اصلی سے نگاہ ہوتے تو کبھی انکار کرتے اور ان پر تکذیب حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا الزام عائد ہوتا +

اس حدیث کی توجیہ میں علمائے مختلف اقوال بیان کئے ہیں مگر یہاں ان سب توجیہات کا ذکر کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس کی وہ توجیہ جو صحیح ہے ناظرین کے پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث باوی النظر میں فرقہ جبریہ کی دلیل ہو سکتی ہے جو انسان کے تیکن بد اعمال کو تقدیر الہی پر حوالہ کر کے انسان کو مطلقاً بے تصور قرار دیتے ہیں اور وجہ انسانی یوں بیان کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے اپنے جرم کو تقدیر الہی پر حوالہ کر کے موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کا جواب دیا۔ برخلاف اس کے معتزلہ قدریہ نے تو حدیث ہی کا انکار کر دیا کیونکہ انہیں کوئی صحیح جواب اپنے مسلک کے مطابق معلوم نہیں ہوا +

یہ امر مسلم ہے کہ موسیٰ علیہ السلام توحید ذات باری اور اس کے اسما و صفات کی حقیقت

کا کمال علم رکھتے تھے پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ آدم علیہ السلام کو ایک جرم کی بابت ملامت کی جائے جس سے وہ توبہ کر چکے تھے اور وہ تو یہ قبول بھی ہو گئی یا یہ کیسے ممکن تھا کہ آدم علیہ السلام اپنے جرم پر یہ عذر پیش کرتے کہ چونکہ تقدیر سابق میں ایسا لکھا تھا اس لئے مجھ سے سر نہ ہوا۔ کیونکہ ایسا صحیح مانا جائے تو شرعیت کے تمام ادا و رد و ایسا کا بطلان لازم آتا ہے۔

بلکہ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کو ان کے جرم پر ملامت نہیں کی تھی بلکہ یہ ملامت اس مصیبت پر تھی جو آدم علیہ السلام کے جرم کی وجہ سے خود آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر عائد ہوئی۔ اور وہ مصیبت ان کا بہشت سے نکالا جانا جانا تھا جس کا سبب وہی جرم آدم تھا نہ کچھ اور اور جس کی وجہ سے ان کی اولاد بھی محروم رہی چنانچہ لفظ آخر جتنا "اَوَلَمْ يَجْعَلْنَا" (تو لے ہمیں جنت سے نکالا) اور لفظ خیتنا "اَوَلَمْ يَجْعَلْنَا" (تو لے ہمیں محروم رکھا) سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔

گویا آدم علیہ السلام کا جواب یوں تھا کہ اے موسیٰ تیرا اس مصیبت پر ملامت کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ مصیبت تو میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی مقدر ہو چکی تھی۔ حال جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ملامت کرنا اس مصیبت کی وجہ سے تھا جو بسبب جرم آدم علیہ السلام سب پر عائد ہوئی نہ اس جرم پر جس کا ارتکاب آدم علیہ السلام نے کیا تھا جس سے جبر یہ فرقہ کی بول قائم ہو سکے۔

اور یہ مسلم ہے کہ گناہ اور مصیبت کے عذر پر تو تقدیر سابق کو پیش نہیں کیا جاسکتا اور مصیبت پر پیش کیا جاسکتا ہے یعنی یہ کہنا صحیح نہیں ہو گا کہ میں نے جرم اس لئے کیا ہے کہ تقدیر میں ایسا لکھا تھا اور یوں کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ فلاں مصیبت کا دار و دیوار تو تقدیر سابق میں مقدر تھا۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ بہت صحیح جواب ہے جو اس حدیث میں فرقہ جبر یہ کے رو میں دیا جاسکتا ہے۔

بعض علمائے کتاب و سنت نے ایک اور بھی جواب دیا ہے جو یکاے خود مفید اور بامنی

ہے اور یہ ہے کہ جرم و مصیبت میں تقدیر سابق کو عذر میں پیش کرنا بعض مواقع پر تو نافع ہو سکتا ہے
 ہے اور بعض مواقع پر مضر مثلاً اگر انسان سے گناہ سرزد ہو اور توفیق الہی سے توبہ کر کے بھجے اللہ
 کر گیا تو یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تقدیر سابق میں ایسا ہی لکھا تھا کیونکہ اس سے بھی ایک قسم کا
 اقرار ربوبیت اور انہماک عبودیت کا مفہوم پایا جاتا ہے لیکن ایسی حالت میں کہ دوسرے گناہ کر رہا ہے اور
 ادھر بے باکانہ طعیر ہیں کہ رہا ہے کہ عدلے تعالیٰ نے ایسا ہی لکھا تھا تقدیر سابق کو اپنی بریت
 میں پیش کرنا "عذر گناہ بدتر از گناہ" کا مصداق ہے کیونکہ پہلی صورت میں اوامر و نواہی شریعت کا
 عدم ضرورت ثابت نہیں ہوتا اور اس دوسری صورت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نیک و بد اعمال
 سب کچھ خدا کر وانا ہے بندہ کا درمیان کچھ تعلق نہیں حالانکہ یہ جواب شریعت حق کے بطون
 کا مستلزم ہے پس ایسی صورت میں تقدیر سابق کو عذر میں پیش کرنا مضر ہے کیونکہ یہ وہی غلط
 طریق ہے جو مشرکین نے اختیار کیا تھا اور کہا "لو شاء اللہ ما اتکنا ولا اباؤنا" یعنی اگر
 اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم اور ہمارے آباؤ اجداد شرک نہ کرتے۔ الغرض توبہ صبح کے بعد عذر گناہ
 میں تقدیر سابق کو پیش کرنا تو صحیح ہے اور قبل از توبہ درست نہیں۔ اور آدم علیہ السلام نے بعد از
 توبہ ہی ایسا عذر کیا تھا جو ایک گونہ انہماک عبودیت پر مبنی ہے اس لئے حدیث مطوّرہ بالا کسی
 طرح محل اعتراض نہیں ہو سکتی۔

تقدیر ثالث

یہ وہ مقام ہے جب بچہ رحم مادر میں ہوتا ہے اور اس کی
 سعادت و شقاوت اور عمر و رزق وغیرہ حالت مقدّر کئے جاتے ہیں
 اسکے ثبوت میں مختلف احادیث وارد ہو چکی ہیں۔

برہانیت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ مخبر صادق جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ

و سلم نے فرمایا :-

ان احدکم لیجمع خلقه فی بطن امه اربعین یوما ثم یكون فی ذلک
 علقۃ مثل ذلک ثم یكون فی ذلک مضغۃ مثل ذلک ثم یرسل الله

الیہ الملائک فینفخ فیہ الروح ویومر باریع کلمات یکتب رزقہ
واجلہ وعملہ وشقی اوسعید قوالذی لا الہ غیرہ ان احداکم لیعمل
علی عمل اهل الجنة حتی ما یكون بینہ وبنیہا الا ذراع فیسبق علیہ
الکتاب فیعمل یعمل اهل النار فیدخلها وان احداکم لیعمل یعمل اهل
النار حتی ما یكون بینہ وبنیہا الا ذراع فیدبق علیہ الکتاب فیعمل
یعمل اهل الجنة فیدخلها متفق علیہ۔

حاصل یہ ہے کہ رحم ماوریں چالیس دن تک نطفہ میں انقلاب ہو کر علقہ (خون بستہ)
بن جاتا ہے۔ پھر چالیس دن میں مضغہ (گوشت کالو تھڑا) بن جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک
فرشتہ کو بھیجتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کو حکم ہوتا ہے کہ اس بچہ کی روضی
عمر عمل۔ سعادت و شقاوت لکھ دے اسی وعدہ لائشریک کی قسم ہے کہ کوئی شخص اہل جنت
کے اعمال صالحہ کر رہا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے جنت میں داخل ہونے میں صرف ایک ہاتھ کا
فرق رہ جاتا ہے (یعنی بہت قریب ہو جاتا ہے) کہ تقدیر الہی (جو رحم ماوریں مقدر ہوئی تھی)
اس پر غالب آکر اس کو جہنم میں گرا دیتی ہے اور اسی طرح کوئی شخص اہل جہنم کے اعمال قبیحہ
کر رہا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے جہنم میں داخل ہونے میں صرف ایک ہاتھ کا فرق رہ جاتا ہے کہ
تقدیر الہی اس پر غالب آکر اس کو جنت میں داخل کر دیتی ہے۔

اور صحیح مسلم میں بروایت خلیفہ بن اسید مروی ہے۔ "قال صلی اللہ علیہ وسلم
یدخل الملائک علی النطفة بعد ما تستقر فی الرحمہ باربعین او خمس واربعین
لیلۃ فیقول یارب اشقی امسعید فیکتابان فیقول ای رب اذكرہ امر انشی
فیکتابان ویکتب عملہ واثرہ واجلہ ورزقہ فلا یراد فیہا ولا ینقص۔"

یعنی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نطفہ پر فرشتہ چالیس یا پچاس دن کے بعد آتا
ہے اور کہتا ہے کہ خدایا! اس کو نیک بخت لکھوں یا بدبخت؟ سو جیسا ہو لکھا جاتا ہے

پھر پوچھتا ہے خدایا! مذکر لکھیں یا مؤنث؟ سو جیسا ہو لکھا جاتا ہے بعد ازاں اس کے اعمال اور عمر اور روزی کو لکھا جاتا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی *

اور عبد اللہ بن عمر بن عاص کی روایت میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں **يُسْأَلُ الْمَلَكُ** عند ذلک **فَيَقُولُ يَا رَبِّ اسْقِطْ أَمْرِي ثُمَّ فَيَسْأَلُ لَهْ ثُمَّ يَقُولُ يَا رَبِّ أَوْ لِحَدِّ أَمْرٍ** اسْقِطْ أَمْرُ لَهْ ثُمَّ يَقُولُ **اقْطَعْ رِزْقَهُ** مع خلقه **فَيَقْضِيهِمَا جَمِيعًا** فَوَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يَنْبَالُ إِلَّا مَا قَسَمَ لَهُ يَوْمَئِذٍ أَذَا كَلَّ رِزْقَهُ قَبْضٌ "یعنی چالیس دن نطفہ کے رحم مادر میں قرار پانے کے بعد فرشتہ بارگاہ رب العالمین میں سوال کرتا ہے کہ خدایا! یہ بچہ اوصو را پیدا ہوگا یا پورا؟۔ اللہ تعالیٰ اس کو بیان فرمادیتا ہے۔ پھر فرشتہ کہتا ہے کہ خدایا! ایک ہی ہوگا یا جفت؟ اللہ تعالیٰ اس بات کو بھی بیان فرمادیتا ہے پھر کہتا ہے کہ خدایا! اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی روزی کا فیصلہ کر دے چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر دو ام کا فیصلہ کر دیتا ہے خدائے وحدہ لا شریک کی قسم ہے کہ انسان وہی کچھ پاتا ہے جو اس کے لئے اس دن مقرر ہو چکا ہے سو جب وہ شخص اپنی روزی کو پورا کر لیتا ہے تو روح اس کی قبض کر لی جاتی ہے یعنی مر جاتا ہے *

اور سند امام احمد بن حنبل سے روای ہے **قَالَ فَرَجُ اللَّهِ عَنْ جَلِّ الْكَلِّ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ جَسَّاسٍ** من اجله **وَرِزْقُهُ وَمُضْجَعُهُ وَآثَرُهُ وَشَقَّتِي أَمْرٍ سَعِيدٍ** "یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کے متعلق پانچ چیزوں سے فائز ہو چکا ہے۔ مدت عمر۔ روزی۔ جائے دفن۔ اعمال سعادت و شقاوت۔ اور بروایت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا **السَّعِيدُ مَنْ سَعَدَ فِي بَطْنِ أُمِّهِ** "یعنی سعادتمند وہ شخص ہے جو ماں کے پیٹ ہی میں سعادتمند ہوتا ہے یعنی نطفہ سے علقہ ہونے تک اللہ تعالیٰ فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ وہ بچہ کو سعید یا شقی لکھ دے اس امر کی تصدیق کہ رحم مادر میں بچہ کی مذکورہ بالا پانچ چیزوں کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے بہت سی اور احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے ہم نے خوف طوالت بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا

ہاں جس روایات کے الفاظ بعض دیگر روایات سے کچھ مختلف ہیں مگر یہ امر قابل مبادہ ہے کہ فرشتہ چونکہ وہ بالالہیہ چیزوں کو لکھتا ہے اور جو فرشتہ لوح پھونکتا ہے وہ اسی ہے جو ایک سو بیس دن کے بعد پچھ میں نفع روح کرتا ہے یہ امر بہت سے لوگوں پر مخفی رہا ہے اسلئے انہوں نے چالیس اور ایک سو بیس دن کے روایات میں تعارض خیال کیا حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے *

تقدیر رابع

یہ تقدیر لیلۃ القدر میں واقع ہوئی ہے اور اس کی ضرورت پر قرآن مجید ناطق ہے "انا انزلناه فی لیلۃ مبارکۃ انا کنا منذرین فیما یفرق کل امر حکیم" یعنی ہم نے قرآن مجید کو برکت والی رات میں نازل کیا بیشک ہم عذاب سے ڈرتے ہیں اس مبارک رات میں ہر ایک امر کی جو عین حکمت پر مبنی ہوتا ہے علوہ علیہ تفصیل کی جاتی ہے یہ امر کہ وہ رات لیلۃ القدر ہی ہے۔ آیہ "انا انزلناه فی لیلۃ القدر" سے ثابت ہے اور جن لوگوں نے نصف شعبان کی رات کو خیال کیا ہے انہیں نے سخت غلطی کھائی ہے۔ بروایت ابن عباس مروی ہے "یکتب من امر الکتاب فی لیلۃ القدر ما یکون فی السنۃ من موت و حیوۃ و رزق و مطہ حتی الحجاج" یعنی لوح محفوظ سے لیلۃ القدر میں تمام ان حواشی کو مقدر کیا جاتا ہے جو سال بھر میں ہونے والے ہوں حتیٰ کہ یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ فلاں فلاں شخص حج کرے گا اور بروایت مقاتل مروی ہے "یقدر اللہ فی لیلۃ القدر امور السنۃ فی بلادہ و عبادہ الی السنۃ القابلۃ" یعنی اللہ تعالیٰ لیلۃ القدر میں سال بھر کے امور اپنے شہروں اور بندوں میں اندازہ لگا دیتا ہے *

تقدیر خامس

تقدیر خامس کی ضرورت پر بھی قرآن مجید ناطق ہے حیث قال

بحانہ و تعالیٰ "کل یوم ہونی شأن" حاکم نے اپنی صحیح میں بروایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کیا ہے۔ ان مہا خلق اللہ لوحا محفوظا من درۃ بیضا و وقتاہ من یاقوتہ تجہراء قلمہ نور و کتابہ نور ینظم فیہ کل یوم ثلاثاۃ و ستین۔ نظرۃ نفی کل نظرۃ منها یخلق و یرزق و یحیی و یمیت و یعز و ینزل و یفعل ما یشاء فذلک قولہ کل یوم ہونی شأن یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں لوح محفوظ بھی ہے جو سفید موتی سے بنائی گئی ہے جس کے ہر دو کنا کے سرخ یاقوت سے ہیں اور اس کا قلم نور سے اور اس کی کتاب بھی نور سے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر ہر روز تین سو ساٹھ دفعہ اپنی نظر ڈالتا ہے اور اس کی ہر ایک نظر میں پیدائش۔ روزی۔ زندہ کرنا۔ مارنا۔ عزت دینا۔ ذلیل کرنا و قمع میں آنا رہتا ہے اور وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قول کل یوم ہونی شأن کی یہی صحیح تفسیر ہے۔

اور عثمان بن دارمی نے کتاب الروعی المرسی میں بروایت عبداللہ بن مسعود نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رات دن نہیں اس نے زمین و آسمان کو اپنے نور سے روشن کیا ہے اور ہمارے ہاں کا ایک دن اس کے ۱۲ بارہ ساعت کا ہے سو تمام آدمیوں کے اعمال اس میں پیش کئے جاتے ہیں۔ گناہوں کو دیکھ کر وہ غضب میں آتا ہے اور پہلے پہل ملائکہ حاملان عرش اس کے غضب سے آگاہ ہوتے ہیں جس پر انہیں اللہ تعالیٰ کا غضب شاق گذرتا ہے پھر وہ تسبیح پکارتے ہیں پھر جبریل علیہ السلام ایک گزنا کو پھونکتے ہیں جس پر تمام اشیاء اس کی آواز کو سن لیتی ہیں اور تین ساعت تک برابر اللہ تعالیٰ کی تسبیح پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے اور چھ ساعت تک یہ حالت رہتی ہے پھر تین ساعت تک اللہ تعالیٰ "ارحام" میں نظر کرتا ہے جس کا اشارہ آیہ "هو الذی یصورکم فی الامحام" میں آچکا ہے اس کے بعد ہر ایک روزی میں نظر کی جاتی ہے اور یہ حالت تین ساعت تک رہتی ہے۔ آیہ "اللہ ینسبط الرزق لمن یشاء و یقدر" میں اسی کی طرف اشارہ ہے اس طرح بارہ ساعت پوری

ہو جاتی ہیں *

نتیجہ

ہماری گزشتہ تحقیق کا نتیجہ حسب ذیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ

سے انتظامِ عالم کو ایک ایسے مضبوط اور اٹل قانون پر چلا رکھا ہے کہ کوئی امر جب

تک پہنچ دفعہ اس کی نگرانی میں نہیں آچکتا عالمِ خارجی میں وجود پذیر نہیں ہوتا *

(۱) پچاس ہزار سال قبل از خلق السموات والارض اس نے انسان کی ہر ایک چیز کا

اندازہ مقرر کر دیا *

(ب) بعد از خلق السموات والارض پہلے اندازہ کی تفصیلی صورت قائم ہوئی۔ یہ تقدیر

روزِ ميثاق کو واقع ہوئی *

(ج) پھر رحم مادر میں نطفہ کے علقہ بنتے وقت دوسری صورت کو عملاً قائم کیا *

(د) پھر لیلۃ القدر میں سال بھر کے متعلقہ حوادث کو منصبط کیا *

(هـ) پھر ہر ایک دن میں واقع ہونے والے حوادث کو معین کیا *

واضح ہو کہ پانچوں تقدیریں یکے بعد دیگرے اس ترتیب سے رکھی گئی ہیں کہ ہر ایک

تقدیر اپنے سے پہلی کی تفصیل ہوتی ہے۔ گویا جو امر سب سے پہلی تقدیر میں قائم ہوا ہے ہی

آخر کار عالم میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس سلسلہ تقدیر میں غور کرنے سے اللہ تعالیٰ کے کمال

علم اور کمالِ حکمت و قدرت کا پتہ لگتا ہے *

مراتب القضاء والقد

یہ مسئلہ تمام دیگر معتقدات اور اعمالِ صالحہ کی پابندی کے لئے اصل اصول ہے کیونکہ

جس شخص کو قضاء و قدر پر ایمان نہیں وہ درحقیقت مسلمان نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا

انکار صفات ذاتِ باری۔ ضرورتِ نبوت۔ حشر و نشر وغیرہ اصولِ دین کے انکار کا متلزم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلفِ صالحین خصوصاً صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کے لوگ منکرِ قضا و قدر کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے اور اس بارہ میں کمال شدت سے کام لیا کرتے تھے۔ واضح ہو کہ حسبِ تحقیق علمائے کتاب و سنت قضا و قدر کے چار مرتب حسبِ میل ہیں۔ (۱) اللہ تبارک و تعالیٰ کا اشیائے مخلوقات کی نسبت قبل ان کے پیدا ہونے کے عالم ہونا +

(ب) قبل پیدا ہونے اشیاء کے ان کو اپنے قلم سے لکھنا +

(ج) اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارادہ کا اشیاء سے متعلق ہونا +

(د) اللہ تبارک و تعالیٰ کا ان اشیاء کو پیدا کرنا +

مختصراً ان چار کو الفاظِ علم و کتابت، مشیت اور خلق سے تعبیر کیا جاتا ہے قبل میں علیحدہ علیحدہ ہر ایک کی تشریح کی جاتی ہے :-

علم تمام انبیاء علیہم السلام اور اکابرِ علمائینی صحابہ تابعین و تبع تابعین رضی اللہ عنہم بلا اختلاف اس امر پر متفق ہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وجودِ اشیاء سے پہلے ان کا علم رکھتا تھا۔ اور اشیاء کا مکتوب فی اللوح ہونا اس امر پر صریح طور پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کے پیدا ہونے سے پہلے ان کا علم رکھتا تھا۔ قال اللہ تعالیٰ اَلَمْ تَعْلَمَنَّ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ اَلْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِی كِتٰبٍ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ لَیْسِرٌ۔ یعنی اے مخاطب کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کا علم رکھتا ہے بے شک یہ امر لوح محفوظ میں لکھا ہے۔ اس آیت کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قبل از وجودِ اشیاء ان کی ذات اور ان کی صفات از ہم مقدار شکل۔ لون۔ مدت مکان اور دیگر تغیرات و انقلابات الخرض ہر ایک امر کا علم رکھتا تھا اور اگر ایسا نہ تسلیم کیا جائے تو ان اشیاء کا معرض وجود میں آنا ہی محال ہوتا ہے۔ بہر صورت

یہ امر بالکل یعنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایک شے کی ذات اور صفات وغیرہ کا اسی طرح قبل از وجود علم رکھتا تھا جس طرح بعد از وجود۔ ہمارا علم کسی شے کے متعلق اس شے کے وجود پتہ پر ہونے پر پیدا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا علم ایسا نہیں بعض نادان لوگ اللہ تعالیٰ کے علم کو انسانی علم پر قیاس کرنے لگ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ان کی زبان سے یہ اعتراض سنا جاتا ہے کہ جب اشیا موجود تھیں تو اللہ تعالیٰ ان کی کس چیز کا عالم تھا کیونکہ بغیر وجود کے کسی چیز کا علم نہیں ہوا کرتا۔ مگر یہ کم عقل لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ اعتراض انسانی علم کے بارہ میں تو صحیح ہے مگر ذاتِ باری عزوجل کی نسبت صحیح نہیں کیونکہ اس کا علم ہر ذی اشیا سے مکتسب نہیں بلکہ خود اس کی ذات ہی علمِ اشیا کی مقتضی ہے جو اشیا عالم کائنات میں وجود پذیر ہوتی ہیں ان کا علمی وجود ذاتِ باری کے ساتھ قائم تھا اسی علمی وجود کے مطابق اشیا کو خارجی طور پر اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے وجود بخشا یہ سوال کہ کس طرح اشیا کو خارجی وجود حاصل ہوا بجز ان عارفانِ ربانی کے کسی کو نہیں ہو سکتا جو تجو کمال حاصل کر کے ظلمتِ مادہ سے رہائی پا جاتے ہیں اور وہ صرف گروہِ مسلمین ہی ہے انسان میں بھی ملازم ہیں عقل اس میدان میں لنگ ہے اور صغہ کا غد تنگ۔ انسان کی ایک فطری کمزوری ہے کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر عقل کو کام میں لانا شروع کر دیتا ہے اور محدود معلومات پر جمیع کائنات کے حقائق کو اپنے زورِ عقل سے معلوم کرنا چاہتا ہے اور رفتہ رفتہ ذاتِ باری کے متعلق وسوس و شکوک اٹھا کر صہلیت سے دور جا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے توہماتِ باطلہ کو حقائق سمجھ کر دہرے پر اترتا ہے اور انسان کی یہ غلط فہمی اس وقت اور بھی ترقی کرتی جاتی ہے جبکہ وہ مادیات میں تصرف کر کے نئے نئے اکتشافات اور ایجادات پر آگاہ ہوتا ہے جن سے اس کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ذاتِ باری کے متعلق بھی غور و خوض کرنے سے وہ حقیقتِ امر پر مطلع ہو جائیگا مگر یہ نہیں سمجھتا کہ جب مادیات کے عجائبات ہی کا حصر انسان کیلئے ناممکن ہے تو

ذات باری کے متعلق کیا خاک سمجھیں گا اور شیا کے قدرت کاملہ ذات باری سے وجود پذیر ہونے کی کیفیت تو بدول اس کے منکشف ہی نہیں ہو سکتی کہ انسان کو تجربہ و کامل ہو کر عالم مادیات سے باہر سیر کرنے کا موقع ملے اور یہ امر بدول گردہ مرسلین ہر ایک کے لئے متصور نہیں انسان کو اپنی حد سے زیادہ نہیں بڑھنا چاہئے۔ مادیات میں غور و تصرف کر کے جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے وہ کیا کم ہے ابھی تو اس کا عشر عشر بھی حضرت انسان کو حاصل نہیں ہوا ذات باری کے متعلق عقل سے کام لینا بالآخر منہ کی کھانا ہے۔

تو کارِ زمین را نگو ساختی ۔ کہ با آسمان نیز پرداختی

کتابت

علم ذات باری کے بعد دوسرا درجہ کتابت کا ہے جس پر قصص آیات و احادیث ناطق ہیں۔ آیت ذیل میں غور کرو "وَلَقَدْ كُتِبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرْثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ" ان فی هذا البلد اقاموا عابدین۔ یعنی ہم نے زبور میں بعد از ذکر یہ لکھ دیا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہونگے بے شک اس امر میں پیغام حق ہے ان لوگوں کے لئے جو خدا کے تعالیٰ کی سچی پرستش کرنے والے ہیں معلوم نہیں عام لوگ اس آیت شریف کے کیا معنی سمجھا کرتے ہیں کیونکہ علمائے مفسرین نے اس آیت کی تشریح الفاظ میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے۔ مگر ہم محقق اور اقویٰ مذہب کے مطابق اس کی تفسیر لکھتے ہیں۔ اس آیت میں لفظ زبور۔ ذکر۔ ارض۔ صالحون قابل غور ہیں۔

واضح ہو کہ لفظ زبور سے یہاں صرف وہی کتاب مشہور مراد نہیں جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی بلکہ اس کے مفہوم میں جمیع کتب منزلہ و اقل میں چنانچہ قرآن مجید کے الفاظ "الْبَيِّنَاتِ وَالزَّبُورِ" میں لفظ زبور سے تمام کتب منزلہ مراد ہیں اور لفظ ذکر سے ام الکتاب مراد ہے جس کی تصدیق ایک حدیث متفق علیہ سے ہوتی ہے: "قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اللَّهُ وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ غَيْرُهُ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ وَكُتِبَ فِي الذِّكْرِ

کل شیئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ موجود تھا اور کوئی چیز اس کے سوا موجود نہ تھی اور اس کی عرش پانی پر تھی اور اس نے تمام اشیا کو ذکر (ام الکتاب) میں لکھا۔ اسی ام الکتاب کو لوح محفوظ بھی کہا کرتے ہیں چونکہ کتب ہادیہ میں درج کچھ مرقوم ہے جو ام الکتاب میں مکتوب ہے اس لئے ان کتب پر اصطلاح قرآنی میں لفظ ذکر کا اطلاق کیا گیا ہے مثلاً: **وَسَلُّوا** اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ اس آیت میں ذکر سے تورات و انجیل مراد ہیں اور اسی طرح قرآن مجید کو لفظ ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً: **وَاَنْزَلْنَا الْاِلٰهَ الذِّكْرِ الْبَتِّينَ لِلنَّاسِ** ما نزل الیہم۔ یعنی ہم نے تیری طرف ذکر نازل کیا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں لوح محفوظ کو مختلف معانی کے لحاظ سے مختلف الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے مثلاً **اٰیہ وکل شیء احصینہ فی امام مبین**۔ میں امام مبین کے لفظ سے وہی ام الکتاب یا لوح محفوظ مراد ہے۔ پھر دوسری جگہ مطلق لفظ کتاب سے تعبیر کیا مثلاً **ما فرطنا فی الکتاب من شیء** مگر اس آیت میں لفظ کتاب سے بقول بعض مفسرین قرآن مجید بھی مراد ہو سکتا ہے۔ مگر ام الکتاب ہی اقویٰ اور اصح تفسیر ہے۔

اس کی تائید بعض آثار صحیحہ سے بھی ہوتی ہے چنانچہ بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **لما قضی اللہ الخلق کتب فی کتابہ فھو عندہ فوق العرش ان رحمۃ غلبت غضبی**۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو مقرر کیا تو اپنی کتاب میں جس کے پاس عرش پر موجود ہے یہ لکھا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔

اور لفظ ارض سے دنیا مراد ہے اور یہی صحیح مذہب بھی ہے اگرچہ بعض مفسرین نے ارض سے بیت المقدس اور بعض نے جنت آخرت مراد لی ہے۔ اس کی تائید بھی حدیث **زویت لی الارض** سے ہوتی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے بطور پیش گوئی

ارشاد فرمایا کہ میری امت ارض دنیا کے مشرق و مغرب کی مالک ہو جائے گی ۔
 اسی طرح لفظ ”صالحین“ امت محمدیہ مرحومہ مراد ہے نہ کچھ اور اگرچہ بعض نیاحیرہ
 نے محض خوشامد کے لئے انگریزی قوم مراد لی ہے جو عقلاً و شرعاً ممنوع ہے کیونکہ صلاح
 و تقویٰ ایمان بالنداء ایمان بالرسول کی فرع ہیں نہ کفر و شرک کی ۔ اور صالحین کا لفظ تو پُر
 بھاری لفظ ہے جس کو قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام پر اطلاق کیا ہے اگرچہ خالص الایمان
 مسلمان بھی اس میں داخل ہیں مگر صلاح و تقویٰ کے مدارج مختلف ہیں اور یہ لیجنہ ایسی
 غلطی ہے جیسے آج کل جنوبی ہند کے ایک مغرور انگریز عہدہ دار کی بیوی کے مرجانے پر
 ایک مسلمان اٹیڈ ٹرنے بلا سوچے سمجھے لکھ دیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے حالانکہ
 کافر یا مشرک بلکہ ضعیف الایمان مسلمان بھی مطلق صبر کا رتبہ نہیں پاسکتا چنانچہ صبر جمیل جو
 شیوہ انبیاء علیہم السلام ہے حاصل ہو کیونکہ صبر فرع ہے ایمان بالنداء اور ایمان بالرسول علیہ
 اور جب سرے سے ایمان ہی نہیں تو صبر کس چیز کا نام ہے ؟

مذکورہ بالا الفاظ کی تشریح کے مطابق آیت مسطورہ بالا کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے
 لوح محفوظ پر لکھ چکنے کے بعد ان آسمانی کتابوں میں جو گاہ و بگاہ انبیاء علیہم السلام پر
 نازل کی گئیں یہ لکھ دیا ہے کہ ہمارے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مرحومہ زمین دنیا
 کی مالک ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ بہر صورت آیت تشریف سے اس امر کا قطعی ثبوت حاصل
 ہوتا ہے کہ تمام اشیائے کائنات کو اللہ تعالیٰ نے حسب اپنے علم کامل کے لوح محفوظ
 میں ضبط کیا اور وہاں سے وہ اشیاء بمقتضائے ”خلقنا کل شیء بقدر“ ہم نے ہر
 چیز کو ایک خاص انداز کے ساتھ پیدا کیا ہے ، عالم کائنات میں حسب ارادہ الہی وجود
 پدیدہ ہوتی ہیں ۔

تمام انبیاء علیہم السلام اور کتب منزلہ اور فطرت انسانی اور عقل

سلیمہ اور انسان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ اس امر پر شاہد ہیں کہ عالم کائنات

مشیت

میں کسی امر کے وجود اور عدم وجود کی حقیقی غلت مشیت یا ارادہ ذات باری ہے جس چیز سے اس کا ارادہ متعلق ہو وہ موجود ہوتی ہے اور جس کے متعلق نہ ہو وہ موجود نہیں ہوتی۔ تمام اہل اسلام اس اصل عظیم کو تسلیم کرتے ہیں اور کسی کو اس میں انکار نہیں۔ ہاں بعض اہل فلسفہ نے جو اعداء اللہ اور اعداء الرسول کا گروہ ہے یہ ہندیاں بکا ہے کہ عالم کائنات میں ایسی اشیا بھی ہو سکتی ہیں جن سے ذات باری کے ارادہ کو کچھ تعلق نہیں اور نیز بعض اشیاء سے ارادہ ذات باری متعلق ہوتا ہے گروہ نہیں ہوتیں۔ یہ خیال و حقیقت کفر صریح اور شرک قبیح ہے جس سے بڑھ کر اور کوئی بے ادبی اور گستاخی حضرت باری عزائمہ کی نہیں ہو سکتی (وما قدر و اللہ حق قدر) قرآن مجید نہایت واضح سے واضح الفاظ میں اس باطل خیال کا رد کرتا ہے۔ آیات ذیل میں غور کرو۔

(ا) "ولو شاء الله ما اقتتلوا ولكن الله يفعل ما يريد" یعنی اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے پر اللہ تعالیٰ وہی کچھ کرتا ہے جس کا ارادہ کرتا ہے *
 (ب) "ولو شاء ربك ما فعلوه" یعنی اگر تیرا رب چاہتا تو وہ لوگ (افتر) وغیرہ نہ کہتے *
 (ج) "ولو شاء ربك لاس من في الارض كلمه جديما" یعنی اگر تیرا رب چاہتا تو سب کے سب ایمان لے آئے ہوتے *

(د) "ستجدني ان شاء الله من الصابرين" یعنی تو مجھے (اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا) صبر کرنے والوں میں سے پائے گا *

اور جناب مخیر علیہ السلام کو تو خاص طور پر ہر ایک امر کو مشیت ذات باری سے مشروط کرنے کی تعلیم ہوئی۔ قال سبحانه وتعالى "ولا تقولن لشيء اني فاعل ذلك عدا بل ان يشاء الله" یعنی کسی امر کی بابت یوں مت کہا کہ وہ میں اس کو کل کر لوں گا ہاں لفظ "ان شاء الله" اپنے ارادہ کے ساتھ منظم کر لیا کرو کیونکہ کوئی امر بجز مشیت الہی تم محض اپنی مشیت سے بجا نہیں لاسکتے بلکہ تمہاری مشیت اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت

کے تابع ہے حیث قال سبحانه عز وجل "وما تشاؤون الا ان يشاء الله" یعنی تم بجائے خود کسی امر کا ارادہ نہیں کر سکتے جب تک اللہ تعالیٰ اس کا ارادہ نہ کرے پھر فرمایا "قل لا املك لنفسي ضرا ولا نفعا الا ما شاء الله" یعنی (اے پیغمبر) انہیں کہ دو کہ میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی قسم کے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں ہاں صرف اس خیر کا مالک ہوں جس کا اللہ تبارک و تعالیٰ ارادہ کرے۔ الغرض قرآن مجید میں سینکڑوں آیات اس معنی پر بطور قاطعہ دلائل کے موجود ہیں اور حقیقت جب تک ارادہ ذاتِ باری کو ہر ایک امر کی علت نہ مانا جائے اور یہ ایمان نہ ہو کہ خلق - رزق - عطاء - منع - قبض - بسط - موت - حیوۃ - ضلالت - ہدایت - سعادت - شقاوت - عزت - رذلت وغیرہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے وجود پذیر ہوتی ہیں اور اگر اس کا ارادہ نہ ہو تو کوئی امر وجود پذیر نہیں ہو سکتا کسی شخص کو حقیقی توحید کی طرف راستہ نہیں مل سکتا اس نکتہ کی طرف ایک حدیث میں جو بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ مروی ہے یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک شخص جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر کسی امر کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا کہ اس نے اٹھائے کلام میں کہا "ما شاء الله وشئت" یعنی جو اللہ تعالیٰ اور حضور چاہیں جناب پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اس جملہ کے کہنے سے تو نے مجھے خدا تعالیٰ کے ساتھ برابر کا شریک ٹھہرا دیا ہے ایسا مت کہو بلکہ یوں کہو "ما شاء الله وحده" یعنی جو صرف اللہ تعالیٰ چاہے اور بروایت حلیفہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا لا تقولوا ما شاء الله وشاء فلان ولكن قولوا ما شاء الله ثم شاء فلان" یعنی یوں مت کہہ کہ وہ جو اللہ تعالیٰ اہم چاہو (وہ ہوگا) بلکہ یوں کہہ کہ وہ جو اللہ تعالیٰ چاہے اور پھر تم چاہو (وہ ہوگا) کیونکہ پہلے جملہ سے اللہ تعالیٰ اور مخاطب کے کسی امر میں برابر کے شریک ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور دوسرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی امر کے ہونے نہ ہونے کا معاملہ محض اللہ تعالیٰ کے ارادہ پر مبنی ہے اور آدمی کا ارادہ اسی کے ارادہ کا تابع ہے بجائے خود کچھ

بھی نہیں۔ اور اس خیال کی توضیح اور تائید اس حدیث سے بخوبی ہو جاتی ہے جو صحیح مسلم میں
 بروایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے "حیث قال صلی اللہ علیہ وسلم
 قلوب العبادین اصبعین من اصابع الرحمن کقلب واحد یصر فہا کیف لیشاء"
 یعنی بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان قلب واحد کی طرح ہیں جیسے وہ
 چاہتا ہے پھیر دیتا ہے اس حدیث سے صاف معلوم ہو گیا کہ بندوں کے دلوں میں ہر ایک
 قسم کا ارادہ کا پیدا ہونا محض اللہ تبارک و تعالیٰ کی ارادت پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے
 طریق سے اس حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں "ان شاء اقامہ وان شاء ازاغہ"
 یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو بندوں کے دلوں کو صراطِ مستقیم پر لگا دے اور اگر چاہے تو
 صراطِ مستقیم سے پھیر دے۔

اسی شرک کی جڑھ کلٹنے کے لئے جناب پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا لا یقل
 ابن آدم یا خبیۃ الدہی فانی انا الدہی ارسل الیل والنفار فاذا اشتت بقضتہا
 یعنی آدمی کو نہیں چاہئے کہ کسی حادثہ یا ناکامی پر یوں کہنے لگے کہ زمانہ کا بُرا ہو کیونکہ
 میں زمانہ ہوں۔ رات اور دن کو عالم دنیا پر پیدا کرتا ہوں اور جب چاہتا ہوں تو انہیں
 سمیٹ لیتا ہوں۔ اس حدیث کا مطلب بموجب تشریح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہے
 کہ اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ حوادث وغیرہ کی نسبت زمانہ کی طرف کر کے زمانہ کو اپنے
 اشتعاریں برا بھلا کہتے جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ ایسا کہنا شرک ہے کیونکہ تمام
 امور اللہ تعالیٰ کی ارادت پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ زمانہ تو خود اللہ تعالیٰ کا ایک
 مخلوق ہے اور جس کو تم حوادث کا سبب یا علت سمجھتے ہو وہ درحقیقت علت نہیں
 بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے ارادہ پر مبنی ہیں جن میں اس کی بے شمار حکمتیں منہر ہوتی ہیں اس لئے
 تمہارا زمانہ کو بُرا کہنا فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کو بُرا کہنا ہے کیونکہ جس چیز کو تم زمانہ کی طرف
 منسوب کرتے ہو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اور اسی خیال کی تائید

یہ حدیث کتنی ہے ”ان اصابت شیء فلا تقبل لوانی فعلت کذا او کذا او لکن قل
 قد اراد الله وما شاء فعل فان لو تفتح عمل الشیطان“ یعنی اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو
 یوں مت کہا کرو کہ اے کاش میں نے یوں کیا ہوتا (تاکہ ایسا نہ ہوتا) بلکہ یوں کہا کرو
 کہ اللہ تعالیٰ نے یوں ہی مقدر کیا تھا اور جو اس نے چاہا کرو دیا کیونکہ ”اے کاش“ کا
 لفظ عمل شیطان کے دروازہ کو کھول دیتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان حسرت زدہ
 جبر و فزع کرنے لگ جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے حق میں کمی ایک قسم کی بدظنیاں پیدا
 ہونے لگتی ہیں جو انسان کے ایمان کو باطل کر دیتی ہیں۔ اسی مضمون کو ایک دوسری
 حدیث میں ارشاد فرمایا ہے۔ حیث قال صلی اللہ علیہ وسلم ”ما النعم علی عبد من
 اهل وولد فيقول ما شاء الله لا قوة الا بالله فيرى فيه آية دون الموت“
 یعنی بندہ کو جو نعمت زن و فرزند کی قسم سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہوتی ہے اگر
 سے دیکھ کر ”ما شاء الله لا قوة الا بالله“ پڑھے تو اس میں خیر و برکت ہوتی ہے ہاں موت
 اہل امر ہے مطلب یہ اس کے اہل و عیال ہر ایک قسم کی بلا اور صدمہ سے محفوظ رہتے
 ہیں۔ امام مالک رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوتے وقت یہی جملہ پڑھا کرتے تھے۔ کسی
 شخص نے پوچھا تو آپ نے فرمایا کیا تم نے قرآن مجید میں یہ نہیں پڑھا ”ولو لا اذ دخلت
 جنتک قلت ما شاء الله لا قوة الا بالله“ یعنی تم نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت
 کیوں جملہ ”ما شاء الله... الخ“ نہیں پڑھا اور گھر انسان کے لئے بمنزلہ باغ کے ہے
 اس لئے گھر میں داخل ہوتے وقت یہ جملہ پڑھنا ہر ایک قسم کی آفت و گزند سے
 محفوظ رہنے کے لئے حرز و امان کا موجب ہے اور ایک دوسری حدیث میں حضرت
 سلیمان علیہ السلام کی نسبت حضور علیہ السلام نے خبر دی کہ سلیمان علیہ السلام نے لیکر
 حلقاً اپنے دل میں عہد کر لیا کہ میں اپنی شتر بویوں سے ہم صحبت ہو گا جن سے شتر ہی
 بچے پیدا ہوں گے جو میدان جنگ میں جہاد لڑا کر ٹیگے، نشان ایزدی آپ نے ایسا

ہی کیا بلکہ کبھی ایک بیوی کے اور کوئی حاملہ ہوئی اور وہ بھی ایک بچہ جنی جو ادھورا تھا۔ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر سلیمان علیہ السلام ان شاء اللہ کہ گراں کیا کرتے تو خدا کی قسم سب کے سب ایسے شاہ سوار بہادر پیدا ہوتے کہ جہاں فی سبیل اللہ کرتے ۔

اس پر بھی تمام انبیاء علیہم السلام اور کتب سماویہ اور فطرت انسانی بالاتفاق شاہد ہیں۔ البتہ قد یہ فرقہ کے لوگوں نے اس میں اختلاف کیا ہے

اور بندوں کو اپنے اپنے افعال کا خالق قرار دیا ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ کسی گمراہ کو ہلاکت یا قہر یا ہلاکت یا قہر کو گمراہ یا کسی مسلم کو کافر یا کسی کافر کو مسلم بنائے بلکہ لوگ خود ہی بلا ارادہ و مشیت الہی اپنے افعال کے خالق ہیں۔ حج کل اکثر پیغمبر کا یہی مذہب ہے انہیں لوگوں کو حدیث میں مجس الامتہ کہا گیا ہے۔

قرآن مجید و احادیث صحیحہ میں ان لوگوں کے ابطال دعویٰ پر سینکڑوں دلائل موجود ہیں۔ اور اکابر علمائے اسلام نے شروع سے حج تک ان کی سرکونی میں شریک رہا۔ کتابیں لکھی ہیں۔ سچ ہے کتاب و سنت صحیحہ کے مقابل میں کوئی باطل مذہب قرار نہیں کر سکتا۔ اس فرقہ کا باطلہ کا حریف مقابل فرقہ جبریت ہے جو گو دلائل میں قہر سے کسی قدر اقرب الی الصواب ہیں مگر جبر محض کے قائل ہونے کی وجہ سے حق سے دور جا پڑے ہیں کیونکہ جبر محض کے خیال پر شرائع و دیانات وغیرہ کی ضرورت بالکل باطل ثابت ہوتی ہے اور انسان نیک و بد اعمال کے ارتکاب میں ایک لاشی یا کسی دوسرے آلہ سے زیادہ وقت نہیں رکھتا ۔

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں بڑے بڑے مشاہیر علمائے اسلام کے پاؤں ڈگمگائے ہیں اور کئی ایک مذہب پیدا ہو گئے ہیں ۔

ایک فرقہ کا خیال ہے کہ ارتکاب فعل میں حرکت کا موجد تو اللہ تعالیٰ ہے اور اس فعل کا طاعت یا معصیت ہونا بندہ کی قدرت سے واقع ہوتا ہے۔ ایک دوسرا فرقہ

اس امر کا قائل ہوا ہے کہ وقوع فعل خواہ طاعت ہو یا معصیت اللہ تعالیٰ اور بندہ ہر دو کے اختیار اور قدرت پر مبنی ہے اور ہر ایک ان میں علیحدہ علیحدہ بھی اس فعل کی قدرت رکھتا ہے۔ ہر ایک تیسرے فرقہ کا خیال ہے کہ فعل کی نسبت ذات باری کی طرف تو بطور مستقل کی جاتی ہے اور بندہ کی طرف بطور غیر مستقل مگر حقیقت مؤثر صرف قدرت ذات باری ہے۔ قدرت باری جب قدرت بندہ کے ساتھ مل جاتی ہے تو قدرت بندہ فعل میں مؤثر ہوتی ہے گویا قدرت باری قدرت بندہ کے ساتھ بطور اعانت شامل ہو جاتی ہے۔ اور ایک چوتھے فرقہ کا مذہب ہے کہ بندہ کا فعل عین فعل ذات باری ہے مگر شرط یہ ہے کہ بندہ کا ارتکاب وقوع فعل کے لئے شرط ہے اور ذات باری فاعل۔ اور ایک پانچویں فرقہ کا خیال ہے کہ قادر فی الحقیقت ذات باری ہے نہ بندہ۔ اور بندہ حرکت و سکون وغیرہ امور میں مجبور ہے اور انسان کا کھانا پینا۔ اٹھنا۔ بیٹھنا بعینہ الیسا ہی ہے جیسے اس کا مرتا۔ بڑھنا۔ آفتاب کا طلوع وغروب وغیرہ۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ مذہب بالکل جبریتہ قدریہ کا مذہب ہے۔ علیٰ ہذا المقتضی اس مسئلہ میں اور بھی کئی ایک مذاہب ہیں مگر ان میں سے ہر ایک فرقہ کے مذہب میں حق اور باطل مخلوط ہے اور عاقل حق وہی ہے جو کتاب اللہ اور سنت سے باجماع صحابہ و تابعین ماخوذ ہے اور وہ یہ ہے کہ قدرت ذات باری ہر ایک چیز اور ہر ایک فعل یا حادثہ پر حاوی ہے اور اس کی مخلوقات میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کے ارادہ سے یا نہر جاسکے بلکہ اس کا ارادہ۔ علم۔ قدرت ایک ایک ذرہ کائنات کو شامل ہے اور وجود مخلوقات سے پہلے اس نے ہر ایک چیز کا اندازہ باندھ دیا تھا۔ اسی کے مطابق تمام حوادث۔ افعال۔ حرکات و سکنات وقوع میں آتے رہتے ہیں۔ انسان کسی امر کا ارادہ نہیں کر سکتا جب تک اس کا ارادہ اس امر کے متعلق نہ ہو (ما تشاؤون الا ان یشاء اللہ) جو وہ چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ اس نے انسان میں کسی فعل کے ارتکاب اور ترک کی استعداد رکھ دی ہے اور یہ ارتکاب و ترک صرف بتوفیق

ذات باری مقصور ہے نہ بدوں اس کے۔ وہ حرکت دیتا ہے اور بندہ حرکت کرتا ہے وہ کھڑا کرتا ہے اور بندہ کھڑا ہوتا ہے وہ ہدایت کرتا ہے بندہ ہدایت پاتا ہے علیٰ انہماک کچھ اس کے ارادہ پر منحصر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت و ارادت فعل اور ترک فعل سے ایک اور حیثیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور بندہ کی ارادت و قدرت دوسری حیثیت سے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فعل اور چیز ہے اور مفعول اور چیز۔ فعل بندہ کی طرف حقیقی نسبت سے منسوب ہے اور مفعول ذات باہمی کی طرف حقیقی نسبت سے۔ اس لئے بندوں کے حرکات و اعتقادات تو ان کے افعال کہلائیں گے مگر یہی چیزیں ذات باری کے لئے مفعول بھی ہوں گی۔ مختصر طور پر وہ عقیدہ ہے جس کو اہل سنت والجماعت کے جمہور نے تسلیم کیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ دیگر مذاہب میں اس عقیدہ کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور موجود ہے اور اس عقیدہ کو بطور اعتدال کے علمائے کتاب و سنت نے استنباط کیا ہے جس میں نہ توجہ برعین ہے اور نہ قدر محض۔ اور اگر کوئی شخص سورہ فاتحہ کی آیت "ایک نعبد و ایک نستعین" پر غور کرے تو اسے بخوبی یقین ہو جائیگا کہ یہ مذہب نہایت ہی اعتدال پر مبنی ہے کیونکہ لفظ "نعبد" سے نسبت فعل حقیقی طور پر بندہ کی طرف مفہوم ہوتی ہے اور لفظ "نستعین" سے اعانت و توفیق الہی کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے جس کا صاف یہ مطلب ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی اعانت نہ ہو تو انسان کچھ قدرت نہیں رکھتا۔ پھر اسی سورہ مبارکہ میں آیت "اهدنا الصراط المستقیم" میں غور کرو کہ ہدایت انسان کو بدوں اعانت ذات باری کے کوئی عطا نہیں کر سکتا۔ لہذا قال عز وجل "انک لا تقدر علیٰ ان یهدی من یشاء" یعنی اے پیغمبر تو ہدایت نہیں کر سکتا بلکہ اللہ جس کو چاہے ہدایت کر دے حالانکہ دوسری جگہ حضور علیہ السلام کی نسبت فرمایا "وانک لہدی الی صراط مستقیم" یعنی بے شک تو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ بظاہر ہر دو آیت میں تضاد و تناقض معلوم ہوتا ہے حالانکہ حقیقت ایسا نہیں کہ پہلی آیت میں لفظ ہدایت سے اعانت و توفیق مراد ہے جو بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کے ہاتھ

میں نہیں اور دوسری آیت میں لفظ ہدایت سے تبلیغ وحی اور تعلیم احکام شریعت مراد ہے جو لازمہ منصب نبوت ہے۔ بہر صورت خلاصہ بحث یہ ہے کہ احکام قضا و قدر کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال و افعال کا خالق ہے کیونکہ وصف خالقیت سے کوئی چیز موصوف نہیں ہو سکتی۔ یہ وصف صرف ذات باری ہی سے مخصوص ہے +

ایمان یا البعث الحدیث

مرنے کے بعد پھر حیات اٹھنا ایک ایسا مسئلہ ہے جو صرف مذہب اسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ نیک و بد اعمال کی جزا و سزا کا عقیدہ تو تقریباً تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے مگر اس کے وقوع کی کیفیت ہر ایک مذہب میں علیحدہ علیحدہ صورت میں تسلیم کی گئی ہے مذہب اسلام میں اس کی صورت اس طرح تسلیم کی گئی ہے کہ انسان از سر نو دوبارہ جسمانی طور پر زندہ ہو کر ناک سے اٹھیں گے۔ اور اپنے اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا پائیں گے چنانچہ ہر ایک صحیح العقیدہ مسلمان اس کی تصدیق کرتا ہے مگر مادہ پرست لوگ جو سرے سے حقیقت روح کے قائل نہیں تسلیم نہیں کرتے اور خیر و شر کے فرقہ کے لوگ یہ مانتے ہیں کہ جزا و سزا کی صورت روحانی طور پر واقع ہوگی جسم مبعوث نہیں ہوگا۔ پہلا فرقہ تو قطعاً دائرہ اسلام سے خارج ہے اور دوسرا فرقہ محدین کا ہے جن کے عقائد کی بناء عموماً فلسفہ اور طبیعیات کے اصول پر مبنی ہے۔ اسلام پاک میں ایسے خرافات عقائد کی کوئی جگہ نہیں +

واضح ہو کہ صحیح العقیدہ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انسان دوبارہ جسمانی زندگی پاکر اٹھلے گا۔ کتاب اللہ میں بار بار اس عقیدہ کو صاف اور صریح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن میں نہ تو تاویل کی گنجائش ہے نہ انکار کی۔ انکار تو اس لئے نہیں ہو سکتا کہ کتاب اللہ جو کلام الہی سے

ابراہیم وحی ناطق نبی اللہ کی معرفت ہم تک پہنچتی ہے۔ "وما یطق عن الہوی ان ہو
 بلا وحی یوحی" انکار کا مطلب یہ ہوگا کہ منکر کتاب اللہ اور نبی اللہ ہر دو کی تکذیب کرتا
 ہے۔ لہٰذا بلائیں من ذلک۔ اور تاویل کی ضرورت اس لئے پیش نہیں آتی کہ دوبارہ جسمانی
 زندگی کا حاصل ہونا کوئی امر متعین نہیں بلکہ ایسی زندگی کی ضرورت اور ثبوت میں دلائل
 قطعیہ موجود ہیں *

واضح ہو کہ آیات قرآنیہ سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ اکثر اہل عرب اہل جہان
 کا انکار کرتے تھے جن کو بار بار حقیقت کون وفساد اور صفات ذات باری کی طرف توجہ دلائی
 گئی۔ چنانچہ ایک عرب کہتا ہے ۵

حیوۃ ثم موت ثم نشور - حدیث شریفہ یا ام عمر

شاعر اپنی بیوی ام عمرو کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ زندگی کے بعد موت اور موت کے
 بعد پھر جی اٹھنا بے سرو پا باتیں ہیں۔ اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے ۵

وینذرنا الرسول بان سخی - وکیف حیوۃ اصداہم وہام

یعنی پیغمبر میں خبر دیتا ہے کہ ہم مغرب پھر جی اٹھیں گے بھلا صدی اور ہمارے کا پھر
 زندہ ہونا کیسے ممکن ہے ؟

اس انکار کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ یہ خیال رکھتے تھے کہ گلی سڑی ہڈیوں سے پھر دوبارہ
 انسان کے جسم کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔ یہی حل فلسفہ اور طبیعیات کے اکثر علمائے زمانہ
 حال کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ انسان صرف مادہ کا نام نہیں بلکہ مادہ مع صورت انسان
 کہلاتا ہے۔ جب موت کے آنے سے صورت باطل ہو جاتی ہے تو اجڑے مادہ یعنی عناصر

۱۔ عرب جاہلیت اس امر کے قائل تھے کہ جب انسان مرتا ہے تو سر کی کھوپڑی سے ایک جانور
 پیدا ہو کر اڑ جاتا ہے جس کو صدی ادا ہوا ہو لیتے ہیں۔ ۱۲ منہ *

علحدہ علیحدہ اپنے اصل مرکز کی طرحت رجوع کرتے ہیں جس سے ایک معین انسان کی حقیقت باطل ہو جاتی ہے اگر ہم یہ مان لیں کہ اس معین مادہ میں دوبارہ قوت حیات پیدا ہو جاتی ہے تو جو صورت اس مادہ پر عائد ہوگی وہ پہلی صورت نہیں ہوگی بلکہ وہ ایک نئی صورت ہوگی ایسے اکثر جزا و سزا کا عقیدہ صحیح مان لیا جائے تو یہ جزا و سزا ایک نئے شخص پر عائد ہوگی اس مرنے والے معین شخص پر حالانکہ نیک یا بد اعمال کا فاعل وہ شخص تھا جس کے ساتھ اس کی پہلی صورت مختص تھی۔ یا یوں کہو کہ وہ شخص جو دوبارہ زندہ ہوئے وہ پہلا شخص نہیں ہوگا چونکہ یا بد اعمال کا مرتکب ہوا تھا اس لئے بجائے معصوم کے ایک غیر معصوم کو جزا و سزا کا متحمل ہونا پڑیگا اور یہ صحیح نہیں +

اس کے علاوہ متکرمین یہ اعتراض بھی کیا کرتے ہیں کہ جب ایک انسان دوسرے انسان کو کھاتا ہے تو وہ غذا ہو کر کھانے والے کا جزو بدن ہو جاتا ہے تو بعثت کے وقت وہ رُوحیں ایک انسان کے جسم سے کس طرح متعلق ہو سکتی ہیں؟ اسی طرح زمین کی پیداوار از قسم حبوب و غلات و فواکہ انسانوں کی غذائی رہتی ہے۔ اور یقیناً یہ پیداوار زمین خاک شدہ انسانوں کے جسموں سے تیار ہوتی ہے جو بصورت غذا پھر زندہ انسانوں ہی کا جزو بدن بن جاتی ہے۔ گویا بعثت کے وقت ایک ہی مادہ بہت سے انسانوں کی صورتوں کا متحمل ہوگا +

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس قسم کے اعتراضات صفات ذات باری میں غور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ "وما قدر اللہ حق قدرہ"۔ یہ لوگ صفات ذات باری کو ضعیف انسان کی صفات پر قیاس کر کے کئی قسم کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خالق حقیقی کی لاتناہی علم و قدرت کو وہ انسانی علم و قدرت کی طرح محدود خیال کرتے ہیں +

واضح ہو کہ انسان کے جسم میں دو قسم کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اقل اجزاء اصلہ جو انسان کی پیدائش سے اخیر عمر تک اس کے جسم میں موجود رہتے ہیں۔ و دوم اجزاء فضلیہ

یعنی وہ اجزاء جو بذریعہ غذا جزو بدن بنتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ علم و قدرت خداوندی کے مقابل میں اجزائے اصلیہ کا انسان کے بدن میں باقی رہنا کوئی ناممکن امر نہیں اسلئے اگر کوئی انسان بواسطہ غذا کسی دوسرے انسان کا جزو بدن ہو جائے تو ان اجزائے فضلیہ کے اتصال اور تفرق سے اس کے اجزائے اصلیہ میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور انہیں اجزائے اصلیہ کے ساتھ رُوح کو تعلق دیا جائیگا جس سے وہ دوبارہ زندگی حاصل کرے گا۔ اور اجزائے فضلیہ خواہ وہ پہلے اجزاء ہوں یا ان کے علاوہ کوئی دوسرے اجزاء اجزائے اصلیہ کے ساتھ منضم کئے جائیں گے اور رنج و خوشی کا احساس صرف رُوح اور اجزائے اصلیہ کے ساتھ ہوگا۔ اور یہ امر اعادہ حیاتِ ثانیہ سے منافی نہیں اور یہ اعادہ اجزائے فضلیہ (عین ہوں یا غیر) پر موقوف نہیں۔ اس تقریر سے مذکورہ بالا ہر دو اعتراض مسئلہ عقیدہ بحث پر مائل نہیں ہو سکتے کیج و خوشی کا احساس صرف رُوح کو ہوگا اور جسم کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ بقصص قرآن اور حدیث سے بالکل مخالف ہے تمام صحیح العقیدہ مسلمان اسی عقیدہ پر متفق ہیں۔ گو حیاتِ ثانیہ کی تفصیلی کیفیت سے وہ آگاہ نہ ہوں مگر اس سے عقیدہ کی اصلیت میں کسی قسم کا حرج لازم نہیں آتا۔

مذکورہ بالا تقریر کی تائید میں بعض مفسرین نے آیہ وَاذْخُلُوا فِيهَا مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُہُورِهِمْ ذَرِيَّتَهُمْ وَاسْهَدُوا عَلَى الْقَسَمِ السَّيِّئِ بِرَبِّكَ قَالُوا بَلَىٰ سَهِدْنَا قَالَتْ ذَلِيلٌ فِي لَحْيَيْهِ أَنَّ اللَّهَ تَعَالَىٰ لَمْ يَخْلُقْ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كِي مِثْلِهِ سَے ان کی اولاد کو نکالا پھر اولاد کی پیشوں سے ان کی اولاد کو نکالا علیٰ ہذا القیاس تمام اولادوں کو جو آدم علیہ السلام کی پشت سے پیدا ہوئی تھیں نکال کر ان میں فعل و نہم اور حرکت اور کلام پیدا کئے اور سب سے اپنی بلوبیت کا اقرار لیا اور پھر سب کو آدم علیہ السلام کی پیش میں لوٹا دیا۔ اس تفسیر کے ضمن میں بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس امر کی کیفیت کو خدائے تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ آیا وہ ذات جن کو صورت انسانی میں لکھ کر ان سے اترالیا گیا وہ مٹی کی صورت میں متغلب ہو گئے یا وہ ذات بدستور قائم رہ کر

مئی کا جزدین گے محسوس سے انسان پیدا ہوتے ہیں مگر اقرب الی الصلوٰۃ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے
 بنی آدم کے ذوات کو آدم علیہ السلام کے مساوات سے نکالا اور انہوں نے بحالت عقل و فہم جو
 حیات کے لئے لازم ہیں اس کی ربوبیت کا اقرار کیا (ایسے صغیر حیوانات کا صورت ذلت میں
 موجود ہونا بعید از عقل نہیں) انہوں نے خود میں کے ذریعہ سے مشاہدہ کیا ہے کہ ایک
 قطرہ پانی میں کئی لاکھ حیوانات موجود ہوتے ہیں۔ بھلا قدرت الہیہ کا کون احاطہ کر سکتا ہے ؟
 اے شریفیہ لفظ ذذیبہ "اشارہ کر رہا ہے کہ وہ ذریت بصورت انسان تھے ورنہ ذرات
 کا لفظ بولا جاتا اس لئے احتمال قوی ہے کہ وہ تمام اولادیں جو آدم علیہ السلام کی بیٹی کی خلقت
 سے نکالی گئی ہیں ان میں ان کی رُو میں بھی داخل کی گئیں پھر انہیں ان کی ماؤں کے پیٹ کی
 خلعت میں پیدا کیا اور پھر تیسری دفعہ زمین کی خلعت میں زندہ کیا گیا یہی ظلمات ثلاثہ ہیں جن کا
 ذکر قرآن مجید میں آچکا ہے اور اے نفعت فیہ من روحی "سے صاف طور پر واضح ہوتا
 ہے کہ لفظ رُوح کو جو یائے متکلم کی طرف مضاف کیا گیا ہے آدم علیہ السلام کے پہلے عنصری
 کے ساتھ جو تعلق دیا گیا تھا وہ بدستور اولاد آدم میں بھی پایا جاتا ہے یعنی اجزائے اصلیہ میں پھر
 بحکم خداوندی جب رُوح کو تعلق دیا جائیگا تو اس میں از سر نو حیات عود کرے گی۔ خلاصہ یہ
 ہے کہ انسان رُوح اور اجزائے اصلیہ کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ اجزائے اصلیہ آدم علیہ السلام
 سے آج تک پشت پشت منتقل ہوتے چلے آئے ہیں اور قیامت کے دن انہیں کا اعادہ ہوگا
 یعنی رُوح کو ان کے ساتھ تعلق دیا جائیگا اور ان سے انسان از سر نو حیات حاصل کرے گا۔
 انسان جب مر جاتا ہے تو ان ذرات سے رُوح کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے اور ان میں حیات
 باقی نہیں رہتی۔ اور اجزائے فضلیہ کی ترکیب زائل ہو جاتی ہے اور اجزائے اصلیہ بدستور محفوظ
 رہتے ہیں اور وہ کسی صورت میں بھی زائل نہیں ہوتے۔ اور ہر ایک قسم کا تغیر و تبدل اور سلسلہ
 انقلابات جو جسم انسانی پر ابتدائے پیدائش سے نہ صرف مرنے تک بلکہ مرنے کے بعد بھی جاری
 رہتا ہے اس کا تعلق صرف پہلے انسانی کیساتھ ہے جو اجزائے فضلیہ کا مجموعہ ہے *

ہم ان مادہ پستوں سے پوچھتے ہیں کہ تم ایک قطرہ مانی میں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اجرامِ صغیرہ کا پتہ دیتے ہو جن میں تمام حیوانی لوازم موجود ہیں۔ اور یہ بھی کہتے ہو کہ ہیکلِ انسانی میں بیچارہ مسامات پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک بالشتِ مریح میں چارہاں مسامات کا موجود ہونا قرار دیتے ہو تو پشتِ آدم سے نفوسِ خلاق کے برابر ذرات کا خارج ہونا کیوں بیدار عقل سمجھا جاتا ہے؟ اور پھر ان ذرات کے پشتِ آدم میں واپس جانے کی نظیر بھی تمہاری تحقیقاتِ جدیدہ میں موجود ہے کیونکہ تم اجرامِ صغیرہ کا متعدی امراض میں ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف منتقل ہونا تسلیم کرتے ہو۔ پھر تم ہی لوگ مادہ منی میں ایسے اجرامِ صغیرہ حیوانیہ کا پتہ دیتے ہو جو صورتِ خردین کے ذریعہ سے عروس بنتے ہیں اور باوجود اس قدر صغیرہ الجسم ہونے کے تمہارے محققین ان کے اندر حیوانی اعضاء کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک کے سر کا طول ایک فیراٹ کے چھ ہزارویں حصہ کے برابر ہے اور عورت کے رحم میں داخل ہو کر سات یا آٹھ دن تک متحرک رہتے ہیں۔ بعض نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ تیرہ منٹ کے عرصہ میں ایک فیراٹ بھٹا مسلے کرتے ہیں۔ ایسے اجرامِ صغیرہ کے قائل ہونے کی صورت میں یہ کیا تعجب ہے کہ مرد کے اجرامِ صغیرہ عورت کے مادہ اجرامِ صغیرہ کے ساتھ مل کر انسان کے اجزائے اصلیہ قرار پائیں جن کیساتھ بذریعہ غذا اجزائے فضلیہ منضم ہوتے ہوں جس سے ہیکلِ انسانی تیار ہوتا ہے اور اسی مادہ منی کے ساتھ وہ ذرات بھی شامل ہوتے ہیں جن کا شمار انسانی ہو سکتا ہے جتنا اس شخص کی نسل میں آئندہ اولادیں پیدا ہو سکتی ہیں کیونکہ حقیقتِ حیات کا مرکز انسان کا قلب ہے اس لئے ان ذرات کا مرکز انسان کا قلب ہی ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حرکتِ قلب کے بند ہو جانے پر انسان کی الفور مر جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتاً انسان اسی ذرہ کا نام ہے جب روح کا تعلق اس ذرہ سے منقطع ہو جاتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ اور وہی ذرہ اس خالقِ حقیقی کے علم و قدرت کے زیر اثر رہ کر قائم رہتا ہے اور وہی خالقِ ازلہ انلی کے مطابق روح کو پیراس کے ساتھ تعلق دے گا جو ایک مکمل انسان کی شکل میں

کھڑا کیا جائے گا اور اس میں کوئی بات منافی عقل نہیں۔ عبداللہ بن زبیرؓ جناب خیر علیہ السلام کے سامنے ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور کہنے لگا کیا تم یہ کہتے ہو کہ تمام انسان دوبارہ زندگی حاصل کریں گے بھلا ایسی بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ جواب ملا یحییٰ الذی انشاھا اول مرۃ یعنی وہی ذات اقدس اس کو دوبارہ زندہ کرے گی جس نے اُسے پہلی دفعہ زندہ کیا تھا یعنی جس طرح انسان پہلے بے نام و نشان تھا اور اس نے رُوح کو تخلیق و یکسر حیات عطا فرمائی وہی ذات اسے پھر دوبارہ زندہ کرے گی۔ اور آیہ کما بدیٰ اکم تعودون میں اس تشبیہ سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ جس طرح شروع پیدائش میں انسان کو ٹھوس مادہ سے بذریعہ رُوح زندہ کیا دوسری دفعہ بھی وہی ذات زندہ کرے گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ بحث بعد الموت کی مذکورہ بالا توجیہ پر تمام علمائے اُمت نے اتفاق کیا ہے یا اس پر ایمان لانا واجب ہے بلکہ ہمارا مطلب یہ ہے کہ یہ توجیہ بحث بعد الموت کے ثبوت کرنے میں عقل اور شریعت ہر دو کے منافی نہیں ہے۔ ہاں امام رازی۔ ابو الطاہر۔ شحرانی وغیرہم کی تصریحات سے اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ اجزلے اصلییہ سے ہم وہ ذرات مراد لے سکتے ہیں جو آیہ ”اذا اخذ ربکم من بنی آدم“ الخ میں بموجب تفسیر نبوی مذکور ہوئے ہیں اور جن کو حدیثیات آدم کہا گیا ہے اور اجزلے فضیلیہ سے مراد ہیکل انسانی ہے۔ اور انہیں مذکورہ تصریحات میں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انسان حقیقی کا لگانا قلب انسانی ہے اور یہ ہیکل صرف بمنزلہ آلہ کے انسان کو کام و قیام ہے۔ بہر صورت بحث بعد الموت کا عقیدہ خالق حقیقی کے علم و قدرت کی لامتناہی وسعت کے مقابلہ پر ہرگز منافی عقل نہیں اور نہ علوم جدیدہ اس کو باطل ثابت کر سکتے ہیں۔

علامہ ابن عقل سلیم اس امر پر شہد ہے کہ اگر بحث بعد الموت کے عقیدہ کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے تو انسان جس کو ہم اشرف کائنات ثابت کر چکے ہیں دیگر حیوانات کی نسبت کسی فضیلت و شرافت کا مستحق نہیں رہتا بلکہ اس عقیدہ کو ترک کر کے وہ بُرے اعمال سے بھی

ہیں رہ سکتا۔ اور یہ امر اس بات کا پتہ ثبوت ہے کہ انسان فطری طور پر ہمیشہ ہوم و افکار میں زندگی بسر کرتا ہے اور یہ حالت انسان کو کئی ایک کمالات کی طرف متوجہ ہونے سے روک دیتی ہے بلکہ اس کو پایہ انسانیت سے گرا دیتی ہے۔ اگر ایسی بد مزہ زندگی اور ناگوار حالت کے دور کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی ایسی تدبیر نہ ہو جس سے وہ ان مصائب سے رہائی پاسکے تو اس کی زندگی دوسرے حیوانات کی زندگی سے کچھ امتیاز نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ ان سے بھی بدترین زندگی کا مالک ہوگا۔ کیونکہ کامل انسان وہی ہو سکتا ہے جو حزن اور خوف ہر دو سے نجات حاصل کرے۔ جس کو کتاب اللہ نے "حیوۃ طیبہ" (پاک زندگی) سے تعبیر کیا ہے اور جس کی تفسیر میں دوسری جگہ فرمایا "لا خوف علیہم ولا هم یحزنون" ایسی پاک زندگی کا حاصل ہونا کمالات انسانہ کا آخری درجہ ہے مگر کوئی شخص اس درجہ تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کو ایسی زندگی کے بہترین نتائج کی توقع نہ ہو۔ مگر تجربہ و مشاہدہ اس بات پر شاہد کہ ایسی زندگی حاصل کرنے کے لئے کوئی ملکی قانون یا رواج کفایت نہیں کر سکتے بلکہ اس کا اصول ان نفوس قدسیہ کی تعلیم پاک پر منحصر ہے جنہیں خدا نے تعالیٰ نے اہل عالم کی ہدایت کے منصب پر ممتاز فرمایا ہے اور خود فطر تاخیر و سعادت کی طرف مائل اور لذت جویانی اور خلوت انسانی سے مستقر رہتے ہیں۔ یہ اس طبقہ عالیہ کے لوگ ہیں جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے طبقہ کے نام سے موسوم ہے کیونکہ عوام الناس جسمانی لذائذ و شہوات میں مبتلا رہ کر دارالجزا سے غافل رہتے ہیں اور دارالجزا کی حقیقت ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے اس لئے یہ بزرگواران بارگاہ رب العزت سے ایک سچی تعلیم کے متقبل ہو کر اہل عالم کو حقائق مابعدیہ سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ وہ حقائق ہیں جن کی نسبت دینی علوم یا حکمیت خاموش ہیں۔

سنا حتیٰ کسی امر مرعوب خاطر کے متعلق ہوتا ہے جو زمانہ ماضی میں حاصل تھا اور جانا نہ با اور خوف کسی ایسے آگاہ امر کے متعلق ہوتا ہے جس کے زمانہ مستقبل میں وقوع کا خطرہ ہو۔ ۱۲ منہ

گرم کرنے کے بعد انسان کے لئے کوئی نئی زندگی نہ ہو تو اس کی دینیوی زندگی دیگر حیوانات کی زندگی سے کوئی بہتر زندگی نہیں۔ صرف انسان ہی ایک ایسا مخلوق ہے جس کے لئے علم و معرفت کی ترقی کی کوئی حد نہیں۔ دیگر حیوانات کو ان کی مضرت اور منفعت کا علم طبعاً حاصل ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بکری کا بچہ بیڈون اس امر کے کہ اسے آگاہ کیا جائے طبعاً بھیڑنے کی صورت کو دیکھ کر ہلکا جاتا ہے اور نباتات کو اپنی غذا بنانا ہے۔ اسی طرح شیر کا بچہ گوشت کے سوانہات کو اپنی غذا نہیں بناتا۔ اوروہ بھیڑ۔ بکری۔ ہرن وغیرہ کو اپنی غذا کے لئے تلاش کرتا ہے اور اپنی غذا حاصل کرنے میں کسی قسم کی تعلیم کا محتاج نہیں ہوتا۔ مگر آدمی کا بچہ پیدا ہونے کے بعد ہر ایک مضرت و منفعت کے سمجھنے میں اپنے دوسرے ہم جنسوں کی تعلیم کا محتاج ہوتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دیگر حیوانات کو دفع مضرت اور طلب منفعت کے سوا جن کا علم اسے طبعاً حاصل ہوتا ہے کسی زیادہ علم و معرفت کی قابلیت نہیں دی گئی۔ مگر انسان پیدا ہونے کے بعد خواہ وہ کتنی طویل عمر حاصل کرے پھر بھی اس کے حقائق و معارف کے حاصل کرنے کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ اگر انسان اور دیگر حیوانات ہر دو کی نسبت یہ خیال کیا جائے کہ مرنے کے بعد ہر دو بے نام و نشان ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی دوسری زندگی کا حاصل ہونا ایک عبث خیال ہے تو کیوں انسان کو لامتناہی کمالات علم و عمل کی استعداد دی گئی ہے اور دیگر حیوانات کو ایک عین حد سے زیادہ ترقی کی استعداد نہیں دی گئی؟ عقل سلیم اس مقام پر فہمی دیتی ہے کہ جس طرح انسان اور دیگر حیوانات کی دینیوی زندگی میں نمایاں امتیاز ہے اسی طرح مابعد الموت بھی دونوں کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی۔ یہ اہم اور دقیق مسئلہ ہے جس کے سمجھنے میں غور و تحقیق اور فکر و تحقیق کی ضرورت ہے۔

محذہم دنیا میں جب افراد انسانی کی حالت عملی میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض افراد فاسق و فجور اور ظلم و تعدی اور خواہشات نفسانی میں اس درجہ تک مستغرق ہیں کہ ان کی تمام عمر اسی تباہ حالت میں بسر ہو جاتی ہے اور انہیں اپنے برے اعمال کا احساس تک نہ

بھی نہیں ہوتا۔ بر خلاف اس کے بعض افراد ایسے بھی ہیں جو فطری طور پر اعمال صالحہ۔ عبادت اور خلق خدا کی نفع رسانی اور نیکار جان و مال میں اپنی عمر بسر کرتے ہیں اور اخلاق حسہ و فضائل و کمالات کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں اور خلق خدا کی نیکی اور پرہیزگاری اور عباد پرستی کی عام طور پر شہادت دیتے ہیں۔ کیا کوئی توضیح الفطرۃ الانسان ایک آن کے لئے بھی تسلیم کر سکتا ہے کہ ہر کر و دونوں کا انجام ایک ہی ہو گا۔ حاشا وکلا۔ افسوس کان مؤمن کان کان فاسقا۔ لایستون ان ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک قلمند مستحق مزاح کے لئے کافی ہے۔

”مدعی گرنکست د فہم سخن گو سر و ششت“

ایک شخص جن کا کلام اہل بصیرت کے لئے نہایت دقیق و دقیق ہے ضرورت بحث و تشریح لکھتے ہیں کہ موت اور موت کے بعد بعثت کو مبدأ حقیقی یعنی ذات باری کی طرف رجوع کرنے کے لئے ایک گویہ حرکت کا ابتدا سمجھنا چاہئے۔ یہ نہیں کہ پھر ہم ادنیٰ کثیف کی طرف عود کرنے کا نام ہے چنانچہ یوم بعثت کو یوم قیامت اس لئے کہا گیا ہے کہ اس دن روح اس بدن طبعی سے مستثنیٰ ہو کر اپنی ذات میں قائم ہوگی بلکہ اس کو ایک عالم آخرت کا بدن دیا جائیگا جس کا قیام روح کے ساتھ ہوگا۔ یہ حالت حیات دنیوی کی حالت سے بالکل مخالف ہوگی کیونکہ حیات دنیوی اس بدن کے ساتھ قائم ہے اور اس دنیوی زندگی میں شریعت کے ادا و نواہی کے بجالانے کی تکلیف سے صرف یہ عرض ہے کہ روح کو اس عالم دنیا اور شہوات کی قید اور زبانی اور مکان کی لوازم سے نجات دہی جائے اور انسان کے ظاہر و باطن میں روحانی آثار غالب آجائیں مگر یہ نجات بجز اس فانی زندگی کو عالم آخرت کی باقی زندگی کے ساتھ بدل دینے کے سوا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حیات باقی کی معرفت حاصل کرنا اور اس پر ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ انسان کے وجود سے مقصود بالذات صرف یہی امر ہے کہ آیات قرآنیہ جن میں اللہ نے بعثت بعد الموت کے متعلق دلائل دیئے ہیں ان سے اسی بعد الموت کی حیات کی حقیقت پر چوبھارے جو اس سے غائب ہے آگاہ کرنا مقصود ہے چونکہ ما بعد کی حیات اس دنیا کی

حیات سے ایک علیحدہ نوعیت رکھتی ہے جس کی ماہیت کا سمجھنا ایک مردشوار ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس کا انکار کر دیا ہے اور اکثر ایسے بھی ہیں جو عالم آخرت کو اور فیم حنت کو دنیا اور دنیا کی نعمتوں پر قیاس کیا کرتے ہیں اور وہ انہیں اخروی نعمتوں کی خاطر عبادات وغیرہ بجا لاتے ہیں مگر ضرورت حال اس کے برخلاف ہے *

سو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن مجید میں اثبات معاد کے متعلق جس قدر آیات وارد ہوئی ہیں ان سے دو امر کا اثبات مقصود ہے ایک تو بعثت و حشر کا ثبوت اس حیثیت سے کہ مبداء کے لئے کسی غایت کی ضرورت ہے اس لئے وہ آیات جن میں لفظ اور ان کے حالت نقصان سے کمال کی طرف منقلب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے ان سے اس امر کا ثابت کرنا مقصود ہے کہ نطفہ کے ان تخیلات و انقلابات کے لئے کوئی نہ کوئی غایت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرتاً کمال اور اپنے مبداء سے قرب حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انسان کا شرف ذاتی اس بات کا مقتضی ہے کہ تذکرہ بالا کمال و قرب عالم مادی سے بالاتر توجہ الہوت یعنی عالم آخرت میں ہونا چاہیے اس لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام مدارج حیات نبوی کو پورا کر لے اور جادوی اور نباتی اور حیوانی کمالات انسان کو حاصل ہو چکیں اور حیات مادی کے آخری کمال کو پہنچ جائے تو وہ کسی دوسرے عالم یعنی آخرت کی طرف متوجہ ہو کر اپنی غایت کو پہنچ جائے۔ اگرچہ دیگر حیوانات کے لئے بھی مادی زندگی کے یہ تخیلات و انقلابات پائے جاتے ہیں مگر وہ اپنی فطری استعداد کی رُو سے انسانی درجہ کمالات تک ترقی نہیں کر سکتے *

وہ آیات جن میں زمین و آسمان اور دیگر اجرام عظیمہ کے پیدا کرنے سے عالم آخرت پر استدلال کیا گیا ہے ان سے دراصل فاعل حقیقی کے مرجع ہونے کا اثبات مقصود ہے چونکہ اکثر لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ کوئی شے مادہ جسمیہ کے بدون موجود نہیں ہو سکتی کیونکہ لاشے سے شے کا حصول ناممکن امر ہے اس لئے عالم آخرت کا وجود میں آنا بھی ناممکن ہے یا یوں کہو کہ وہ اس امر کو قدرت ذات باری سے یسید خیال کرتے ہیں مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ عالم آخرت کی اشیاء

کا وجود بطریق انشاء ہوگا نہ بطریق تخلیق یعنی عالم آخرت برائے عدم سے وجود میں لایا جائیگا۔ یہ نہیں کہ کسی مادی اصل سے جو پہلے سے موجود ہو تیار کیا جائیگا سو ایسی آیات سے ذات پاری نے آنگاہ کیا ہے کہ اس کی شان قابلیت ابلع و انشاء کی مفتضحی ہے نہ مادہ سے کسی چیز کو تیار کرنے کی۔ یعنی عدم سے وجود میں لانا اس کی کمال صفت پر مبنی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ مادہ موجودہ کو مختلف ترقیوں میں منتقل کر دے چنانچہ زمین و آسمان اور دیگر اشیائے کائنات سب کے سب عدم سے وجود میں آئے ہیں نہ یہ کہ وہ کسی دوسرے مادہ سے تیار کئے گئے ہیں۔ چنانچہ جنت و نار اور عالم آخرت کے اجسام وغیرہ کا وجود بھی انشاء و اختراع پر مبنی ہے یعنی عدم سے وجود میں لائے جائینگے۔ اس تقریر سے یہ اعتراض بھی رفع ہو جاتا ہے کہ عالم آخرت کا وجود کس مادہ سے اور کس جہت اور مکان اور کس زمانہ اور وقت میں ظہور پذیر ہوگا یہ حال جو کہ حقائق کے سمجھنے سے عاری ہیں وہ عالم آخرت کو عالم اجسام پر قیاس کر کے کہا کرتے تھے ”متی هذا الوجود“۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ عالم آخرت کے مکان و زمانہ عالم دنیا کے مکان و زمانہ سے علیحدہ نوعیت رکھتے ہیں اور نہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حقائق آخرت کا وجود اور ایجاب و نیای کی اشیاء کے وجود اور ایجاب سے علیحدہ حقیقت رکھتے ہیں حالانکہ عالم آخرت کی حقیقت عالم دنیا کی حقیقت سے کہیں زیادہ قوی اور مستحکم ہے اور وہ محض بطور ابلع و انشاء کے وجود پذیر ہوگا جس طرح یہ عالم دنیا ابلع و انشاء کے طور پر وجود پذیر ہوا۔ ایہ ”کلیع البصر“ اور اقرب اور ایہ ”انما امرہ اذا اراد شیاً ان یقول لہ کن فیکون“ میں ہی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تقریر سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا دوبارہ بعد الموت مسجود ہونا بطور ابلع و انشاء کے ہوگا۔ یہ بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کی ترکیب بدنی کے اجزائے اصلیہ عالم دنیا میں بقائے دوام کے قائل نہیں تھے۔ اور عالم آخرت میں انہیں اجزا کو ایک ایسی استعداد دی جائیگی جو بقائے دوام کے قابل ہوں تو اس صورت میں مذکورہ بالا وہم پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس میں دونوں باتیں ملحوظ رہتی ہیں یعنی اجزا کا عادیہ لفظوں

قرآن سے ظاہر ہوتا ہے اور استدلال و ثبوت سے دوام جو ایک گونہ ابدی و انشائی سمجھا جاتا ہے۔
 ان غرض جب حیات آخرت کی نوعیت حیات دنیا کی نوعیت سے بالکل ایک مختلف حقیقت ہے
 تو عام جہال کے بعض اعتراضات بالکل ساقط ہو جاتے ہیں ۔

مسئلہ آخر و سر

یہ ہر دو نقطہ عام طور پر لوگوں کی زبان پر جاری رہتے ہیں مگر بہت کم لوگ ہیں جو ان کی
 حقیقت سے صحیح طور پر واقفیت رکھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ بدون عارف کامل کے دوسرے
 لوگ ان کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ عوام الناس کا دستور یہ ہے کہ جب کسی امر کو اپنی
 خواہش اور غرض کے مطابق واقع ہوتے دیکھتے ہیں تو اسے امر خیر خیال کرتے ہیں بخلاف
 اس کے اگر کسی امر کو اپنی خواہش اور غرض کے منافی پاتے ہیں تو اسے امر شر کہا کرتے ہیں مگر
 یہ خیال سرسرقطہ ہے جس کی وضاحت حسبِ ذیل ہے :-

سلسلہ کائنات میں کوئی امر خالق حقیقی کے علم و ارادہ سے خارج ہو کر واقع نہیں ہوتا
 اور خالق حقیقی کے تمام افعال عین مصلحت اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک امر کو مخلوق
 ہونے کی حیثیت سے اپنے خالق سے ایک نسبت فی ہے اور اسی نسبت کو ملحوظ رکھ کر اگر ہم
 کسی امر کو اپنی خواہش اور غرض سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صرف اس امر کا مخلوق
 ہونا اسے خیر یا شر کہلانے کا مستحق نہیں بنا دیتا۔ بلکہ محققین اس کو خیر محض خیال کرتے ہیں۔

کیونکہ ایک ہی امر جس کو زید اپنے حق میں خیر سمجھتا ہے وہی امر دیگر کے حق میں شر ہو سکتا ہے
 مگر محققین کا یہ فیصلہ ہے کہ جو امر عالم کائنات میں وجود رکھتا ہے وہ خیر محض ہے اس میں شر کو
 کچھ دخل نہیں جملہ الوجود خیر مکملہ کے یہی معنی ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام اشیائے

کائنات حقیقی طور پر خیر محض ہیں ہم جب کسی شے کو شر کہتے ہیں تو صرف اس جہت سے کہ وہ ہماری خواہش اور غرض کے منافی ہے لیکن اس کا ہماری خواہش اور غرض کے منافی ہونا اسے فی الواقعہ شر نہیں بنادیتا۔ ممکن بلکہ ضروری ہے کہ وہی امر کسی دوسرے شخص کے حق میں خیر و مصلحت ہو اس لئے وہ اسے خیر محض کہیگا اس سے معلوم ہوا کہ مخلوقیت کی حیثیت سے دنیا سے شر معدوم ہے۔ اس کو مثال کی صورت میں لیں سمجھو کہ باران رحمت آسمان سے نازل ہو کر تمام جاندار مخلوق کے لئے باعث حیات سمجھا گیا ہے لیکن اگر کسی شخص کا مکان گر جلے یا پھسل کر اس کی ٹانگ لٹ جائے تو کیا یہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ بارش کا ہونا ایک امر شر ہے۔ اسی طرح سانپ جو خالق حقیقی کی ایک مخلوق ہے دوسنا چھوڑ دے تو کیا اس صورت میں بھی اس کا وجود شر کہلائیگا۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں پائی جاتی جو بعض اشخاص کے اغراض کے موافق اور بعض دیگر اشخاص کے اغراض کے منافی نہ ہو۔ دودھ ایک نفیس اور لطیف غذا ہے مگر کئی ایک طبائع ایسی بھی ہیں جن کے حق میں (اگر وہ پی لیں) تو نہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے ہم نہایت آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ خیر و شر کے الفاظ کا اطلاق محض اضافی طور پر کیا جاتا ہے حقیقی طور پر وہ خالق حقیقی کا ایک مخلوق ہے اور چونکہ وہ موجود ہے اس لئے وہ خیر محض ہے ہم جب اسے اپنی خواہش اور غرض کے موافق یا مخالف پاتے ہیں تو اسے خیر یا شر کہہ سکتے ہیں۔ اس خیال کو ہم ایک دوسری صورت میں لیں ظاہر کر سکتے ہیں کہ خیر ایک امر وجودی ہے اور شر ایک امر عدمی۔ اس لئے سب کائنات یہ حیثیت مخلوق خیر محض ہیں اور اگر ہم کسی شے کو شر کہہ سکتے ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے کمال فطری سے خالی ہے یا کمال فطری سے ناقص درجہ پر رکھی گئی ہے مثلاً بصارت ایک امر وجودی ہے اور اس لئے وہ خیر محض ہے مگر اندھا پن جس کو ہم شر خیال کرتے ہیں وہ حقیقت عدم بصارت کا نام ہے جسکو ہم آنکھ کے فطری کمال سے عاری ہونے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ الغرض شر کسی چیز میں

ضروریات اور منافع کے نہ ہونے کا نام ہے ورنہ کوئی مخلوق اپنی مخلوقیت کی جہت سے شر نہیں کہلا سکتا کیونکہ خالق حقیقی خیر محض ہے اور اس سے شر صادر نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ بالکل صحیح ہے کہ عالم اسباب میں جب ایک شے دوسری شے کے ساتھ تعلق چاہل کرتی ہے تو دونوں کے اتصال سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے وہ اگرچہ بجائے خیر ہے مگر ہم اپنی مصلحت اور عدم مصلحت کے رُو سے اسے خیر و شر کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ اس مقام پر ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ اے ”ومن لعل مشقال ذرۃ خیر اریہ ومن لعل مشقال ذرۃ شر اریہ“ میں لفظ خیر و شر چونکہ الگ الگ مستقل مفہوم رکھتے ہیں اس لئے ہر دو کی حقیقت وجودی ہے نہ عدی۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی لفظ شر کا مفہوم عدی ہے۔ مثلاً جو دو لوگوں میں دو متغافل مفہوم ہیں مگر جو دو تو ایک امر وجودی ہے جس کو کوئی صاحب جو اپنے اختیار سے عمل میں لاتا ہے مگر بغل عدم جو کا نام ہے جس میں کسی امر کی ضرورت داعی نہیں ہوتی۔ اس لئے پہلا فعل خیر ہے دوسرا شر۔

ناظرین کو چاہئے کہ مسئلہ خیر و شر میں مزید غور سے کام لیں۔

الفاظ قرآنیہ بید الخیر میں غور کرو جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو امر ذاتِ باری سے صادر ہوتا ہے وہ خیر محض ہے یوں نہیں فرمایا بید الخیر والشر کیونکہ شر عدم محض کا نام ہے۔

سَعَادَتِ شَقَوَاتِ

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ انسان روح اور جسم کے مجموعہ کا نام ہے اس لئے فطرانہ اسکی ذات نقصان و کمال کے رُو سے دو جہت کی استعداد پر مشتمل ہے۔ اگر وہ اپنی جہت روحانی کی

طرف متوجہ ہو کر فضائل و کمالات کا ذخیرہ جمع کرے تو وہ اہل سعادت میں شمار ہوتا ہے اور جہت جسمانی کی طرف متوجہ ہو کر ذلّ و نقصانات میں متغرق ہو جائے تو زمرہ اہل شقاوت میں داخل ہو جاتا ہے۔ جہت اولیٰ کی طرف متوجہ ہونے کی صورت میں سب سے پہلے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس امر پر غور کرے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اس عالم جسمانی میں وجود پذیر ہونے سے کیا غرض ہے؟ جب وہ اس مرحلہ کو طے کر لے گا تو اس کو لامحالہ یہ خیال دامنگیر ہو گا کہ وہ اپنے مبدأ اول کی طرف رجوع کرے اور اس مرحلہ کو طے کرنے کے لئے اسے اس امر کی ضرورت محسوس ہوگی کہ وہ کوئی ایسا طریق اختیار کرے جس پر چل کر وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ اگر توفیق ازودی اس کے شامل حل ہو جائے تو وہ تعلیم نبوت کی طرف متوجہ ہو گا کیونکہ بجز تعلیم نبوت کوئی شخص ان آداب سے آگاہ نہیں ہو سکتا جن کی پابندی سے وہ معرفت ذات باری کا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ انہیں آداب کا نام شریعت حقہ ہے جو بذریعہ وحی ناطق نوع انسان تک بواسطہ نبی اللہ پہنچ چکی ہے۔ "الشریعة کلہا ادب"۔ جو شخص شریعت کا پابند نہیں وہ آداب طریقت سے محروم رہتا ہے اور مقام سعادت تک اسے رسائی نصیب نہیں ہو سکتی۔

خلافت پیہمبر کسے راہ گزید - کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

اگر جہت ثانیہ یعنی جہت جسمانی کی طرف متوجہ ہو جائے تو لذات حیوانی میں مبتلا ہو کر وہ ایک ایسے قعرِ ذلیلیت میں جا گرتا ہے جہاں سے اس کو بچر یا ہر آنا و شولہ ہو جاتا ہے اور تمام حیوانی خصائل جسد غرور - غضب - شہوت - تکبر وغیرہ کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے۔ اس حالت میں وہ اگرچہ بہ شکل انسان زندہ رہتا ہے مگر فی الحقیقت وہ بہائم کے رتبہ سے بھی کہیں دور جاڑتا ہے ایسے ہی لوگوں کی شان میں کتاب اللہ ناطق ہے۔ "اولئک کا لانعام بل ہم اضلّ مسبیلا"۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہائم اپنی فطرت میں جس رتبہ پر پیدا کئے گئے ہیں اسی پر قائم ہیں مگر وہ انسان جو مذکورہ بالا ذلّ میں مبتلا ہو جاتا ہے اپنے فطری مقام سے بھی کہیں

نیچے جا کر رہا ہے اور یہی مقام شقاوت ہے۔ اَعَاذُنا اللہ من ذلک۔ اصطلاح شریعت میں اہل سعادت کو اصحاب الیمین اور اہل شقاوت کو اصحاب الشمال سے تعبیر کیا گیا ہے کسی عارف نے انسان کی انہیں ہر دو حالت کو مد نظر رکھ کر فرمایا ہے۔

آؤمی زادہ طرفہ معجونیت - کنز فرشتہ سرشتہ وزیمہ ال
گر کند قصداں شود بدائیں - در کند میل آن شود بد اذال

حکمت ہبوط حضرت ابوالبشر آدم علیہ السلام

حضرت ابوالبشر علیہ السلام کا جنت سے نکل کر زمین پر آباد ہونا قرآن مجید میں کسی دفعہ مذکور ہوا ہے حتیٰ کہ عوام الناس بھی اس مشہور واقعہ کی کیفیت سے عام طور پر آگاہ ہیں مگر اس واقعہ کو محض ایک تاریخی قصہ کے دربان پر پڑھ سن لینا اہل تحقیق کے لئے کافی نہیں۔ وہ اکابر علمائے دین جن کی نظر واقعات کے مخفی اسرار تک کام کرتی ہے حضرت ابوالبشر کے واقعہ کو انسانی فطرت کی بے شمار مصلحتوں کا جامع بتلاتے ہیں۔ اوصاف الحقیقت غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان واقعہ حضرت ذات باری کی کسی بڑی حکمت پر مشتمل ہونا چاہئے قرآن مجید کے تاریخی واقعات کو محض تاریخی حیثیت سے دیکھنا کوئی بڑی خوبی نہیں بلکہ ایسے واقعات سے جو اہم نتائج ابدان کے علل دریافت ہوتے ہیں مقصود بالذات ہیں۔ واقعہ مذکور بالا پر ہم اسی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں اور اپنے ناظرین کو مزید تحقیق سے مستفید کراتے ہیں یہ امر بجائے خود ایک وسیع بحث ہے کہ جس جنت سے حضرت ابوالبشر نکالے گئے تھے وہ کہاں تھی؟ اس میں علمائے اسلام نے بہت اختلاف کیا ہے مگر ہمیں اس وقت اس تحقیق سے کچھ سروکار نہیں۔ ہم صرف بعض ان حکم و مصلح پر غور کرتے ہیں جو آپ کے

جنت غلد سے نکل کر اس دارقانی میں آباد ہونے سے بد نظر تھے :-

(۱) انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ اشیا کی حقیقت کو بدون ان کے اصدا کی حقیقت پر گاہ ہونے کے نہیں سمجھ سکتی۔ ہم نور کی حقیقت کو کلی طور پر اور اک نہیں کر سکتے جب تک ظلمت کی کیفیت سے متاثر نہوں۔ ایک چیز کا علم اس کی ضد کے علم پر متکل ہے۔ اسی اصل مسلم کی مطابق ضروری تھا کہ حضرت ابوالبشر دارالنعیم سے وارد دنیا میں آباد ہوتے تاکہ انہیں اور ان کی اولاد کو اس دارقانی کی ہوم و عوم اور آلام و آفات کی کیفیت سے متاثر ہونے کا موقع ملتا۔ اور بعد ازاں دارالنعیم کی حقیقی قدر و منزلت کا انہیں علم ہوتا اور اگر وہ پہلے ہی سے دارالنعیم میں موجود رہتے تو چونکہ وہ جگہ پر خالم اور ہر ایک قسم کی تکالیف سے پاک و صاف ہے اس لیے بنی آدم تکلیف کے بعد راحت کی قدر سے بالکل بے خبر رہتے ۔

(ب) جنت کو اللہ تعالیٰ نے امر و نہی کا محل نہیں بنایا یعنی تکالیف شرعیہ وہاں ساقط ہو گئی چونکہ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کو ابتلا و امتحان کے قابل پیدا کیا ہے اس لیے بنی آدم کا اس دارالحسن میں آنا ضروری تھا تاکہ اتمام حجت کے بعد ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کے مطابق مدارج حاصل ہوں اور اگر جنت جلد ہی میں رہتے تو فطرت انسانی کی وہ قابلیت جو بحکم لیبیلو کہ ایکم احسن عملا میں ودیعت رکھی گئی ہے باطل جاتی ۔

(ج) اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کو اس قابل پیدا کیا ہے کہ وہ علمی اور عملی مدارج میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کمال تک ترقی کر سکے۔ ان مدارج میں سے - نبوت - رسالت - ولایت - شہادت وغیرہا نہایت عالی قرار دیے گئے ہیں مگر انسانی فطرت ان مدارج کو دارالنعیم میں اُٹے بغیر مدینہ و سعادت و ریاضت کے حاصل نہیں کر سکتی۔ اگر بنی آدم کا مسکن داریونیا قرار نہ پاتا تو ان مدارج کا اکتساب اور ان کے لوازم کا ظہور ہرگز ممکن نہیں تھا ۔

(د) اللہ تبارک و تعالیٰ نے کتاب پاک میں اپنے اسمائے حسنہ کا ذکر فرمایا ہے مثلاً غفور - رحیم - عفو - کریم - علیم - حافظ - رفیع - مجی - مہیت وغیرہ اور ان اسمائے مقدسہ کے

آثار میں عالم میں مظاہر مختلف برظاہر ہوتے ہیں چنانچہ اس کا معفور ہونا معفور نہ کو چاہتا ہے اور اس کا رحیم ہونا مرحوم کا مقتضی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تمام اسمائے طیبہ کے آثار مختلف مظاہر پر نمایاں ہوتے ہیں اور ہر ایک ذرہ کائنات کا اس کے کسی کسی اسم مقتضی کا مظہر ہے اس لئے عالم وافیہا کمال ذات باری کا شاہد ہے اور اگر آدم علیہ السلام اس عالم خراب آباد کو آباد نہ کرتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ کمالات ذات باری کا اظہار نہ ہو حالانکہ وہ کمالات فی حد ذاتہ اپنے اپنے مظاہر کے مقتضی ہیں *

(۷) عالم دنیا کی زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے جو نوعیت میں اس عالم کی زندگی سے بالکل مختلف ہے حکمت ذات باری عز اسمہ اس امر کی مقتضی ہے کہ اس عالم کی زندگی کے بعد اس کا سلسلہ شروع ہو اس لئے ذات باری کے کمال صفات کا اظہار جس طرح اس عالم کے مظاہر میں ضروری تھا اسی طرح عالم آخرت میں بھی بدرجہ اتم کمال صفات کا ظہور لازم ہے اور وہ اسی صورت میں ممکن ہے جیسے اس دار فانی سے دار باقی کی طرف انتقال ہو *

(۸) اس دار الامتحان میں اللہ تعالیٰ نے جس ایمان کی طرف اپنے بندوں کو توجہ دلائی ہے وہ ایمان بالغیب ہے اور یہی ایمان انسان کے لئے دنیا و آخرت میں مفید ہے کیونکہ ایمان بالشہادت (دیکھ کر ایمان لانا) تو ہر ایک شکر کے لئے بھی ضروری ہے چنانچہ قیامت کو ہر ایک منکر بھی صاحب ایمان ہو گا مگر بے سود *

اگر حضرت ابوالبشر اس عالم میں تشریف نہ لاتے تو ایمان بالغیب کے بعد اللہ تعالیٰ کے نعیم اخرویہ کو حاصل کرنے کی لذت کا کبھی علم حاصل نہ کر سکتے اور نہ ہی انہیں اس کی کچھ قدر ہوتی۔ کیونکہ شروع ہی سے ایک حالت میں رہنے سے کسی دوسری حالت کا علم نہیں ہو سکتا۔

لذت وصل نذاذد مگر آن سوختہ - کہ پس از دوسے بسیار بجا ناں برسد

(ذ) اٹلا حضرت ابوالبشر میں مختلف مدارج کے لوگ تھے۔ بعض تو صالح اور مومن تھے جو دارالنعیم میں رہنے کے قابل تھے اور بعض شقی اور منکر جو دارالنعیم کے مستحق نہ تھے بلکہ جہنم کے مستوجب تھے۔ اگر حضرت ابوالبشر دنیا میں تشریف نہ لاتے تو طیب اور خبیث بدستور دارالنعیم میں رہتے۔ مگر یہ امر حکمت ذات باری کے منافی تھا اس لئے اس نے اپنے علم ازیلی سے ہر ایک کو اس حیات دنیوی کے راستہ سے اس کے مناسب مسکن (جنت یا جہنم) میں لیجانا چاہا اور وہ اسی صورت میں مقدر تھا نہ کسی اور صورت میں +

(ح) احب ملائکہ نے حضرت ابوالبشر کے زمین میں خلیفہ بنائے جانے میں محبت پیش کی کہ ایسا مخلوق دنیا میں فتنہ و فساد کا مرکز ہو گا تو اللہ تعالیٰ کی غیرت بمقتضائے "لله الحجة البالغة" اس امر کی متقاضی ہوئی کہ گروہ ملائکہ کو ان کی محبت میں ملزم قرار دیا جائے۔ کیونکہ اسی نوع انسان ہی میں ایسے بنی آدم بھی تھے جو رسالت۔ نبوت۔ ولایت وغیرہ مدارج عالیہ کی قابلیت رکھتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوالبشر کو اس دنیا میں بھیج کر گروہ ملائکہ کو دکھلادیا کہ ان کا علم حکمت ذات باری پر محیط نہ تھا اور ان کا معترض ہوتا ان کی غلطی پر مبنی تھا۔ چنانچہ بالآخر ملائکہ کو معلوم ہو گیا اور ان کا یہ علم احتتام دنیا پر بالکل کامل ہو جائیگا کہ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے منصب خلافت کیلئے برگزیدہ کرنا چاہا تھا وہ باوجود ایسے قوائے شہوانیہ اور غضبیہ پر مشتمل ہونے کے بھی اپنے مالک حقیقی کا فرمانبردار اور اس کا سچا طلبکار ہے جو اس کو وصال ذات باری اور قرب خداوندی سے مانع ہیں اور گروہ ملائکہ کا نتیجہ و تلعس کرنا چنداں محل تعجب نہیں کیونکہ وہ قوائے مذکورہ کی کشش سے بالکل پاک و صاف ہیں مگر حضرت انسان کا وجود اس قدر موانع کے باوجود اس کے آستانہ جلال پر سجود ہو کر اپنے تئیں محل عبودیت میں لانا واقعی بڑی قدر قیمت رکھتا ہے۔ مگر حضرت ابوالبشر اس عالم میں نازل نہ فرماتے تو ملائکہ پر یہ غیبی شہادت مخفی رہتی +

مع ہذا ابلیس کا حضرت ابوالبشر اس اور ان کی اولاد سے دشمنی رکھنے کا معاملہ اس

قدر واضح نہ ہوتا جس کا اب مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کا اس کے
فریب اور غلبہ سے محفوظ رہنا ثابت نہ ہوتا ۛ

(ط) مقامات عالیہ میں سیر کرنے کی کیفیت مخفی رہتی یعنی صبر۔ احسان۔ جہاد۔ شکر۔
توبہ وغیرہ کرامات کا ظہور بدون نزول حضرت ابوالیٰسہ نہیں ہو سکتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا
کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں کا خزانہ ایسی گرامی قدر مخلوق پر تقسیم نہ ہوتا مگر اس حکیم مطلق نے
اپنی حکمت بالغہ سے ان صفات عالیہ کی کلام پاک میں جا بجا عزت کی جس کو عاشقانِ الٰہی
دل و جان سے اپنے لئے گوارا فرماتے ہیں: ”واللہ یختص برحمۃ من یشاء“

(ی) سب سے بڑھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ اور اشرف سے اشرف حکمت جو نزلِ آدم
میں حکیم مطلق کے علمِ انہی میں تھی وہ یہ تھی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو دارِ نعیم سے نکال کر
اولادِ آدم کو ایک ایسی بیش بہا نعمت کا عطا فرمانا مقصود تھا جو بصورتِ دارِ نعیم میں پہنچنے
کے انہیں کبھی حاصل نہ ہوتی اور وہ نعمت وہ عہد انہی تھا جس کو اس نے حضرت انسان کے

لئے حصولِ قرب اور جواریہ نعمت کے واسطے سببِ اول قرار دیا۔ اور اس کی فطرت میں
قابلیتِ حصولِ ولایت کے بذریعہ تعلیم آگاہ کر دیا کہ جو شخص اس سبب کی حقیقت کو سمجھ
کر اس کی معرفت میں کمال پیدا کر لے گا وہ ابدی نعمت اور حقیقی مسرت کا مالک و وارث
بنادیا جائیگا اور جو اجراض کر لے گا وہ غائب اور غاسر رہے گا۔ یہ مضبوط عہد انسان کے لئے شرط
مستقیم اور بناءِ عظیم ہے جس کو وہ بدون علمِ دارِ اوہ کے ہرگز حاصل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ
ارادہ ایک بابِ عظیم ہے جس سے ذاتِ باری کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے اور علم اس باب
کی جانی ہے جس کے بدون ارادت کا باب کبھی کھل نہیں سکتا۔ ان فرض کوئی انسان سببِ ارادت
علم کے معرفت ذاتِ باری کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا کیونکہ جس قدر محرومی اور کوتاہی
انسان کو پیش آتی ہے صرف علم و ارادت ہر دو کے یا ہر دو میں سے کسی ایک کے نہ
ہونے سے ماند ہوا کرتی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ علم ہو مگر ارادت کی توفیق اور بہت طلب

رکھتا ہو۔ یا علم سے بے بہرہ ہو اور اس بے ارادت بھی اس کے دل میں نہ ہو تو ایسا شخص
 ہمیشہ ذلت کی لپیٹ میں پڑا رہتا ہے اور غفلت اور آرام طلبی کے دام سے کبھی رہائی نہیں
 پاسکتا۔ لہٰذا صرف اس شخص کے جو ذیور علم سے آراستہ ہو اور طریق طلب میں نہایت سرعت
 کے ساتھ چل رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص بہت جلد منزل مقصود تک پہنچ جائیگا کیونکہ
 جب شوق طلب غالب آجاتا ہے تو کسی دوسری چیز کی طرف رغبت نہیں رہتی اور کسی
 ایسے شخص سے ہم صحبت ہوتا ہے جو اس کے خیال کا نہ ہو بلکہ تمام غیر اللہ کو دل میں بُرا
 سمجھنے لگتا ہے اور کوئی چیز اس کو اس کے مقصد کی تکمیل سے مانع نہیں ہو سکتی۔ یہ
 حالت کمال ارادت سے پیدا ہو سکتی ہے اور کمال ارادت کا پیدا ہونا اس امر پر موقوف
 ہے کہ انسان اپنی مراد کی عظمت اور ضرورت کا علم حاصل کر لے اور یہ علم کتاب اللہ اور
 سنت رسول صلعم کے صحیح اتباع کا نام ہے نہ کچھ اور۔ کیونکہ بعثت رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے اور اس کا قرب حاصل کرنے کے تمام
 راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ صرف کتاب اللہ اور سنت رسول علیہ السلام کا ایک راستہ باقی
 ہے جو ہر ایک طرح سے یقینی اور اطمینان بخش اور تمام آفات سے محفوظ و امین ہے سو جس
 شخص کو اپنے مالک حقیقی سے سچا تعلق پیدا کرنا ہو اور اس کے جوار رحمت میں رہ کر
 انعامات لاتنا ہی سے مستفید ہونا ہو اسے چاہیے کہ دامن رسول عربی صلعم سے ملے
 ہو تاکہ دین و دنیا میں ہر ایک قسم کے خطرات و آفات سے محفوظ ہو جائے کیونکہ انسان کی
 زندگی کا مقصود اصلی یہی ہے اور اگر اس سے بے بہرہ رہا تو دین و دنیا میں ناکام رہا۔ الغرض
 تمام ادیان و ملل کے بعد ملت اسلام کا اہل عالم کے سامنے پیش کیا جانا اس امر کی دلیل
 ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بخیر اس دین مقدس کے کسی اور دین کا اتباع ہرگز منظور نہیں۔ اے تو من
 یتبع غیر الاسلام دینا قلن لقبل منہ کے یہی صحیح معنی ہو سکتے ہیں نہ کچھ اور اس تقریر
 سے معلوم ہو گیا کہ حضرت ابوالبشر کا دنیا میں تشریف لانا پیش خمیہ تھا اور جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا یہ حضور کے واسطے سے نعمت خداوندی کی تکمیل کا اجر کا اشارہ
 اے "الیوم اکملت لکم دینکم و ما رغبہ فیہ" و اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے نعمت و رضیت لکم اسلام دینا
 میں واضح سے واضح الفاظ میں آچکا ہے حضور علیہ الصلوٰۃ سے پہلے جس قدر مذاہب عالم
 میں مروج تھے سب کے سب اسلامی تعلیم شریعت کا کوئی نہ کوئی جزو اپنے اندر رکھتے تھے
 مگر مقدس اسلام نے دنیا پر حقیقت مذہب کا وہ صاف آمینہ تیار کیا جس میں علیؑ سے علیٰ اخلاقی
 معاشرتی۔ تمدنی۔ سیاسی۔ جسمانی۔ روحانی تربیت اور اصلاح کے مکمل اصول کا منہ ڈال
 واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اب کسی غیر مذہب کو مذہب کی حیثیت سے مذہب اسلام کے
 سامنے پیش کرنا گو یا آفتاب کو چرخ و کھلا نا ہے۔

چندال یوز کرشمہ و ناز ہی قلل - کا یہ سچو سرور و مشورہ ہر مہرام ما
 رک، اللہ تبارک و تعالیٰ کے کمالات لا انتہا یہ ہیں جن کا حصر انسانی عقل کے اندر
 سے بالاتر ہے مگر بالمقابل کمالات الوہیت کے عبودیت ایک مقام ہے کامل سے
 کامل بشیر کا۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں آثارِ بشریت بالکل محو ہو کر آثارِ صفات کاملہ ذات
 یاری کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی مقام پر اسرار و معارف مبدا و معاد کا انکشاف کئی ہو جاتا ہے
 اور یہی وجہ ہے کہ ایک صحیح حدیث میں اس مقام کی عظمت کی طرف اشارہ آیا ہے کہ
 اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو جناب سرور عالم رحمۃ اللعالمین صلی اللہ
 علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بھیجا اور حکم دیا کہ ہماری طرف سے سناؤ کہ ملک نبی بنا چاہتے
 ہو یا عبد نبی۔ یہی منصب نبوت کے ساتھ سلطنت و نبوی بھی چاہتے ہو یا خلعت نبوت کے
 ساتھ کمال عبودیت کو پسند رکھتے ہو۔ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرائیل
 علیہ السلام کی طرف ایسے طور پر دیکھا جیسے کوئی شخص کسی سے کسی امر میں استصواب کرتا
 ہے۔ جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ بارگاہ رب العزت میں تواضع مطلوب ہے تب حضور
 علیہ السلام نے فرمایا "بل ان اکون عبد اللہ" یعنی مجھے سلطنت و نبوی ہرگز مطلوب

نہیں ہیں تو شانِ عبودیت کے ساتھ اس بارگاہِ مقدس میں حاضر ہونا چاہتا ہوں اور یہی میری حقیقی عزت ہے۔ چونکہ حضور علیہ السلام نے شانِ عبودیت کو اپنے لئے پسند فرمایا اس لئے وہ تمام کمالات جو اس مقامِ عالی سے بہتر نہ لازم کے قرار دئے گئے تھے مجموعی طور پر حضور علیہ السلام کو خزانہ رحمت یاری سے عطا ہو گئے۔ ”فالحمد لله على ذلك“ اور دلیل اس مطلوب پر یہ ہے کہ جنابِ باری عز اسمہ نے حضور علیہ السلام کے اظہار کمالات کے موقع پر آپ کو لفظ ”عبد“ سے یاد فرمایا ہے (۱) شبِ معراج حضور علیہ السلام کے اعلیٰ سے اعلیٰ کمالات کے عطا ہونے کی خبر دیتی ہے فرمایا ”سبحن الذی اسمرنی بعبدہ“ (۲) الایۃ۔ (ب) مقامِ دعوت و تبلیغ میں فرمایا ”وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ“ (۳) الایۃ۔ (ج) مقامِ تحدی میں فرمایا ”وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بآیۃ من مثله“ (۴) الایۃ۔ یہ ہر سہ مقامِ انسانی کمالات کے اعلیٰ سے اعلیٰ صفات پر مشتمل ہیں اس لئے بجائے رسولِ یانہی کے لفظِ عبد کو اختیار کیا گیا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ مطلوب ہے کہ یہ کمالات صرف مقامِ عبودیت کے ساتھ لازم ہیں۔ بھلا سلطنتِ دنیوی کو ان کمالات سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ ”ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء“

اس دعویٰ کی تصدیق ہم حدیثِ شفاعت سے بخوبی کر سکتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ لوگ علیحدہ علیحدہ انبیاء علیہم السلام کے پاس جائینگے اور سب کے سب اپنی جگہ دوسرے کو پیش کرنے کی بابت اشارہ کریں گے۔ آخر حجبِ نوبتِ مسیح علیہ السلام پر آئیں گی تو وہ فرما دیں گے ”اذہبوا الی محمد عبد عفر اللہ لہ ما تقدم من ذنبہ وما تاخر“ یعنی تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان عبد ہے جس کو دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا قلم سودیا ہے۔ سو آج کے دن ایسے جلیل القدر منصب (شفاعت) پر وہی تامل ہونے کے قابل ہے۔ اس حدیث سے صاف معلوم ہو گیا کہ کمالِ عبودیت میں حضور علیہ السلام کو وہ پایہ نصیب ہوا تھا جو کسی دوسرے کو نہیں

مل سکا۔ اور نیز یہ کہ یہ پایہ صرف کمال عبودیت کا نتیجہ ہے نہ کسی اور وصف کا۔ مگر اس انجام اور اظہار کمالات عبودیت کا صرف حضرت ابوالبشر کے دنیا میں تشریف لانے پر مرتب نہ ہو سکتا تھا کیونکہ حکمت کاملہ ذات باری اس امر کی متقاضی تھی ۔

(۱) مشیت انہی میں یہ حکمت مضمون تھی کہ اپنے مطیع بندوں پر کمال نعمت کا اظہار کرے تاکہ وہ اس کی زیادہ محبت حاصل کر کے اس کے اعلیٰ الشکر گزار ثابت ہوں۔ اور استعمال نعمت سے زیادہ لذت اُٹھائیں اور یہ امر بدون اس کے مفقود نہیں تھا کہ بالمقابل اپنے اعدائے لئے انواع و اقسام کے عذاب اور سزا کا بھی مشاہدہ کر دیتا کیونکہ کسی نعمت کی لذت اس وقت کامل ہوا کرتی ہے جبکہ اس کی مخالف حالت کا انہیں علم ہو۔ سو یہ امر حضرت ابوالبشر کے زمین میں نزول کرنے کی صورت میں متجوز کیا گیا۔ مع ہذا حکمت آیہ وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون کی تکمیل بھی مد نظر تھی جو دار النعمیم میں ناممکن تھی۔ کیونکہ اس کی فطرت اللہ تعالیٰ نے دارالابتلا سے بالکل مختلف پیدا کی ہے لہذا بنی آدم کا نشو و نما زمین میں ضروری قرار پایا۔ کیونکہ تکالیف شرعیہ کا محل صرف دار دنیا ہے نہ دار النعمیم۔ نیز چونکہ فطرت انسانی میں یہ قابلیت بھی رکھی گئی تھی کہ بنی آدم اپنے تئیں شیطان یعنی ابلیس کے مکر و فریب اور حیلہ سے محنت و کوشش کر کے محفوظ رکھ سکیں اور جب کہیں اس کا غلبہ دیکھیں تو اس کو دفع کریں اس لئے ان کا نزول دار دنیا میں لابد تھا۔ تاکہ قوی اور ضعیف پر اتمام محبت ہو جائے۔ اور اگر یہ امتحان نہ ہوتا تو تمام افراد انسانی ایک ہی حالت میں رکھے جاتے۔ اختلاف استعداد کی ضرورت نہ پڑتی ۔

اس موقع پر ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا تھا کہ انسانی فطرت میں ایسی قابلیت ہی نہ رکھتا تاکہ دفع ابلیس اور اس کے مقابلہ کی ضرورت ہی نہ عائد ہوتی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بیشک ممکن تھا مگر انسانی فطرت کی حقیقت علم انہی میں لیں ہی مقدم ہو چکی تھی اس لئے اس کے برخلاف کیونکر وقوع میں آتا۔ اور اگر اس کے

سب خلافت انسانی فطرت پیدا کی جاتی تو پھر انسان انسان نہ ہوتا بلکہ ملک (فرشتہ) ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کو عقل و شہوت ہر دو کے آثار کا منبع قرار دیا اور عقل و شہوت کے نہ ہونے کی صورت میں حضرت انسان بدیں ہیئت موجودہ مخلوق نہ ہوتا۔

گویا اس اعتراض کی صورت میں بے کہ انسان انسان کیوں ہے۔ اس لئے حکمت ذات باری پر یہ اعتراض ہرگز عائد نہیں ہو سکتا کہ اس لئے انسان کو انسان کیوں بنایا ہے؟

(م) چونکہ اللہ تعالیٰ حمد مطلق کا مالک ہے اس لئے اس کمال کا اظہار ہر دو صورت انعام و انتقام میں قرار پایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح وہ بصورت فضل و احسان مستحق حمد ہے اسی طرح بصورت عدل و انتقام بھی وہ محمود ہے۔ دیکھو اہل سعادت و اہل شقاوت کے جنت و جہنم میں بھیجنے کا ذکر کرنے کے بعد لیوں ارشاد ہوا ”وَرِضِیْ بَیْنَهُمَا بِالْحَقِّ وَقِيلِ الْحَمْدِ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ“ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دو صورت فضل و عدل میں کامل حمد کا سزاوار ہے۔

(ن) سلسلہ اسباب کا تقرر عالم اسباب میں حکمت ذات باری کے کمال کی دلیل ہے جو کہ سعادت و شقاوت کے لئے بھی اس دار دنیا میں علیحدہ علیحدہ اسباب موجود ہیں مگر ان اسباب کا دار نعیم میں حاصل ہونا دو متضاد امور کے جمع ہونے کا متلزم تھا مگر دار النعیم کی فطرت ہر ایک قسم کے تخالف و تضاد سے بری ہے لہذا ضروری تھا کہ یہ سلسلہ اسباب جو حکمت ذات باری عز اسمہ پر قطعی دلیل ہے اس دار دنیا میں قائم کیا جائے اور سعادت و شقاوت اس کا لازم قرار دیا جائے کیونکہ سعادت و شقاوت کا بدن پائیدی اسباب کے حاصل ہونا کسی اعلیٰ سے اعلیٰ حکمت باری کے وجود پر دلالت نہیں کرتا۔ بلکہ محض وصف فضل و عدل و وجہ حکمت پر مبنی ہے اس لئے زیادہ مدد و رح ہے اور وہ صرف نزول دار دنیا کی صورت میں مقصور تھا اور اگر دار نعیم میں بھی یہ پائیدی اسباب مقصور ہوتی تو دار دنیا اور دار نعیم میں کچھ تفاوت نہ تھا۔

دس اقرآن مجید ناطق ہے کہ خلق آدم سے اس عالم میں مقصود یہ تھا کہ اولاد آدم کو منصب
 خلافت الہی پر متنازعہ نہ کیا جائے چنانچہ فرمایا ”انی جاعل فی الارض خلیفۃ“ اور پھر فرمایا۔
 ھو الذی جعلکم خلافت فی الارض ” مگر منصب خلافت بذاتہ کوئی غایت حقیقتی نہ تھی
 بلکہ اس سے اولاد آدم کو جنتِ خالد میں لے جا کر انہیں جواریہ جنت میں ہمیشہ کے لئے مجہ دنیا
 مقصود تھا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے علم ازل کے رُوسے انسانی فطرت کے ضعف اور اس کی
 جلد بازی کو جانتا تھا۔ اس لئے اس نے حضرت ابوالبشر کو جنتِ خالد کی کیفیت اور وہاں کی
 پاک زندگی کے لطف سے آگاہ کر دیا تاکہ ان کی اولاد کو بھی بخوبی معلوم ہو جائے کہ دنیا
 اور مافیہا بمقابلہ جنتِ نعیم کے کچھ حقیقت نہیں رکھتی اور اگر میں جنتِ خالد اور واقعہ حضرت
 ابوالبشر کا پتہ نہ دیا جاتا تو ہم بوجہ ضعفِ فطرت اور عجلت کے دنیوی لذتوں کو چھوڑنا کبھی
 گوارا نہ کرتے اور نہ کسی دائرِ نعیم کی طرف ہمیں توجہ ہوتی مگر موجودہ حالت میں منصبِ خلافت کو
 دائرِ نعیم کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ جو شخص کسی پائدار اعلیٰ لذت کی حقیقت
 کا علم رکھتا ہو وہ اس کو چھوڑ کر کسی ادنیٰ اور ناپائدار پر محدود نہیں رہ سکتا۔ بلکہ ہمیشہ کامل
 لذتوں کے حصول میں سعی رہتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ
 اللہ تعالیٰ ملائکہ سے دریافت فرماتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ وہ
 جواب دیتے ہیں کہ خدایا تجھ سے جنت طلب کرتے ہیں۔ پھر انہیں فرماتا ہے کہ میرے
 بندوں نے جنت دیکھی ہے؟ ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ خدایا انہوں نے جنت کو نہیں
 دیکھا۔ پھر فرماتا ہے کہ اگر وہ دیکھ پائیں تو کیا کریں۔ ملائکہ عرض کرتے ہیں کہ اس سے
 زیادہ طلب اور شوق ان کے دلوں میں پیدا ہو۔ اس مضمون حدیث سے واضح ہو گیا کہ
 وہ دنیوی لذتیں انسان کے لئے مقصود بالذات نہیں بلکہ دنیا و مافیہا حصولِ جنت
 نعیم کے لئے بمنزلہ اسباب کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جن کو جنتِ نعیم کی حقیقت
 کا حقِ یقین ہو جاتا ہے وہ دنیا کی ناپائدار لذتوں سے منہ موڑ لیتے ہیں کیونکہ دنیوی لذتیں

سب کی سب بالآخر موجب حسرت و وبال ثابت ہوتی ہیں اور ایمان صحیح اوجب قلب مومن میں اپنا گھر کر لیتا ہے پھر کوئی چیز اس کو مرکز ایمان سے نہیں ہٹا سکتی بلکہ ایسا قلب ہمیشہ عالم آخرت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور اپنے اصلی ٹھکانے کو کبھی نہیں بھولتا اور اس دار فانی سے اس کا تعلق صرف عارضی ہوتا ہے کما قیل ۷

نقل فؤادک حیث شئت من الھوی - ما الحب الالجبیب الاول
کہ منزل فی الارض یا لعلہ الفتی - وحینئذ اید الاول منزل
یعنی تم اپنے دل کو جہاں چاہو لگاؤ محبت صرف اسی پہلے پیارے سے ہو سکتی ہے
آدمی دنیا میں کئی ایک جگہوں میں سکونت اختیار کرتا ہے مگر اس کا شوق ہمیشہ اپنے پہلے
(اصلی) وطن کی محبت میں جوش مارا کرتا ہے ۸

حاصل یہ ہے کہ حضرت ابو البشر کے دنیا میں آباد ہونے سے مقصود یہ ہے کہ وہ بذریعہ
سلسلہ اسباب کے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذات اور عالم آفاق میں نہایت مضبوط
طور پر قائم کر دیا ہے سفر آخرت کے لئے زاد راہ اپنے ساتھ لے تاکہ وہ اس کی رحمت
کاملہ کا استحقاق حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے اس کے بساط قرب میں جگہ پاوے۔ مگر
بجز محنت و مجاہدت کے یہ مرحلہ طے نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ”و تحمل
الثقالکم الی بلد لہ تکولوا بلعیدہ الا بشق الانفس“ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارا غمی طر
ایسی سواریاں پیدا کی ہیں جو تہکے بوجھ اور سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی
ہیں جہاں تم بجز سخت محنت اور تکلیف کے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ غور کرو کہ جب دنیوی
سفر کی یہ حالت ہے کہ ہم بدون تیاری سامان سفر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے تو
سفر آخرت کی کھن منزل بدون سامان سفر کے کیونکر قطع ہوگی؟ اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم
ہے اور وہ اپنے بندوں کو نہایت مہربانی کے ساتھ اس سفر کو آسان کرنے کے لئے
ہدایت فرماتا ہے ”و تزودوا فان خیر الزاد التقوی“ یعنی زاد راہ کو اپنے ساتھ لو اور

بہترین زادوراء تو تقویٰ ہی ہے گویہ آیت احکام حج کے موقعہ پر مذکور ہے مگر صاحبین ذکر کی
 آگہی کے لئے سفر آخرت کو آسان بنانے کے لئے بھی ہدایت فرمائی اور فرمادیا کہ سب سے
 اچھا زاد جو تم اپنے ساتھ لے سکتے ہو وہ تقویٰ ہی ہے۔ سو کیسے ہی زیان کاریں وہ
 لوگ جو شب و روز غفلت کے حجاب میں ڈھے ہیں اور باوجودیکہ قرآن مجید پکار پکار کر
 آنے والی اہل اور نالائم حالت سے آگاہ کر رہا ہے مگر وہ ایک ناکارہ لذت کے عوض
 دوامی مسرت کو ہاتھ سے کھو رہے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ ان اللہ اشتری من المؤمنین
 انفسهم واموالهم بان لھم الجنة یعنی اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے ان کی
 جانوں اور ان کے مالوں کو بعوض جنت کے خرید لیا ہے۔ ہاں کسی کسی خوش قسمتی ہے کہ
 اللہ تعالیٰ تو مشتری ہوا اور ہم بائع اور زرخش ناپا کنار زندگی اور مال اور مسیح جنت نعیم! سے
 امروزہ دران کوشش کہ دنیا باشتی - حیران حال آں دل آرا باشتی
 شمرت باواچو کو دکاں و شرب عید۔ - تا چند و انتظارِ سرور باشتی
 مسکند زیر بحث یعنی اخراج آدم (علیہ السلام) کے متعلق بعض آثار میں حسب ذیل وارد ہوا
 ہے جو زبان حضرت باری ارشاد کیا گیا ہے :-

"یا آدم لا تجزع من قولی لک اخرج منها فلک خلقتھا فانا العقی عنھا
 وعن کل شیء وانا الجواد الکرمیہ وانا لا اتمتع فیھا فانی اطعمہ ولا اطعمہ وانا العقی
 الحمید ولكن انزل الی دار البذر فاذا بذرت فاستوی السراع علی سوقہ
 وصار حصید انھیند فتعال ناستوفہ احوج ما انت الیہ الجنة بعشر مثالھا
 الی سبعة شتعت الی اصغاف کثیرة فانی اعلم بمصلحتک فیک وانا العلی الحکیم
 یعنی اے آدم! تم میرے اس قول سے کہ تم جنت سے نکل جاؤ کچھ غم مت کرو کیونکہ جنت
 کو میں نے تیری خاطر ہی پیدا کیا ہے اور میں اس سے اور ہر ایک چیز سے بے نیاز ہوں اور
 صاحب جود و کرم ہوں۔ اور میں خود اس سے متمتع نہیں ہوں گا کیونکہ میں دوسروں کو کھانا دیتا

ہوں اور کوئی دوسرا مجھے کھاتا نہیں دے سکتا۔ اور میں بے نیاز ہوں اور بہت وہ صفات ہوں
 لیکن تم زمین کی طرف جاؤ جو کھیتی بونے کا مقام ہے جو جب تم بیج زمین میں ڈالو گے اور
 کھیتی کے پٹھل وغیرہ غلے آئیں گے اور کاٹنے کے قابل ہو جائیں گی تو تب تم کو چاہئے کہ تم
 اسے اپنی حاجت کے لئے کاٹو۔ اور ایک دانہ کے عوض دس دانہ بلکہ سات سو گنا تک
 یا اس سے بھی زیادہ حاصل کرو۔ کیونکہ میں تیری مصلحت کو تجھ سے زیادہ جانتا ہوں اور
 میں خدا نے برتر اور صاحب حکمت ہوں ۛ

اس عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کا جنت سے نکالا جانا کئی ایک
 مصلحتوں پر مشتمل تھا اور یہ بات اللہ اسماء الہیہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو عبارت منظور کیا
 میں مذکور ہے مثلاً پہلی حالت سے زیادہ کامل حالت میں دوبارہ جنت میں لیجا نا اور پھر یہ
 اسباب کمال فطری تک ترقی کرنا اور کمالات ذات باری کا اظہار کرنا اور نیکیے بد
 پر اتمام حجت کر کے ہر ایک کو اس کے مقام پر پہنچانا وغیرہ ذلک
 مجھے یقین ہے کہ جس قدر مسئلہ عنوان بالا کے متعلق لکھا گیا ہے وہ بہت سے
 شکوک و ادوہام کے رفع کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ دہ
 بھی کئی ایک وجوہ تجویز کر سکیں ۛ

واللہ اعلم بالصواب الیہ المرجع والمآب

موت انسان کیلئے موجب کمال ہے

انسان طبعاً موت سے نفرت کرتا ہے اور یہ ایک ایسی غلط فہمی ہے جس میں قریباً
 ہر ایک شخص مبتلا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال یا العہوم انسانی طبیعت میں جاگزیں

کہ اگر انسان کو موت کی خبر ملے تو اس کی دنیا کی لذتوں سے محروم کر دیتی ہے اگر انہیں اس
 بات کا یقین نہ ہو تو اس کے دل میں ہرج و مرج کے بدن سے قطع تعلق کا نام ہے جس پر انسان معرفت
 ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ یا عالم دنیا سے عالم آخرت کی طرف
 رجوع کرتا ہے تو وہ اس قدر طالب اور لڑناں نہ پالتے جاتے۔ بچہ ماں کے شکم میں ایسی حالت
 میں ایام حمل کو پورا کرتا ہے کہ وہ اس کے پیٹ سے باہر آتا نہیں جاتا۔ وہ وہاں نہایت
 خوش زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے جب باہر آنے کا وقت ہے۔ تو چلتا ہے کیونکہ اس کے آرام
 میں خلل آتا ہے لیکن ولادت پا کر جب عالم دنیا کے سناٹے سے متنع ہونے لگتا ہے
 تو پھر واپس ماں کے پیٹ میں جانا نہیں چاہتا۔ یہی حال انسان کا عالم دنیا سے موت
 کے وقت متحدہ ہونے پر ہوتا ہے اگر اسے یقین ہو کہ یوم موت عالم آخرت میں اس کا یوم
 ولادت ہے تو قطعاً موت کا خوف اس کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی بیان کر آئے ہیں
 کہ عالم دنیا سے عالم آخرت کی طرف منتقل ہونا درحقیقت جوع الی اللہ کرنا ہے۔ اور وہ
 کمالی چیز اس کے کہ انسان مادی زندگی سے قطع تعلق کرے۔ کمال نہیں ہو سکتا۔ اس لئے
 موت ایک ضروری اور اڑل امر ہے اس لئے سال میں چوبیسے بیس یا کھلی جب تک
 تین یا چار بار ہوتا ہے۔ اس لئے انسان میں تفرق و انفصال پیدا نہ ہو تب تک اس کا
 ایک بار آو و رخصت ہونا چاہیے۔ اناج کا دانہ جب تک پیسے گوندھنے پکالنے اور
 کھانے کے لئے مرحلے سے نہیں کر لیتا تب تک ہمارا جزو بدن نہیں بنتا۔ موت اگرچہ بظاہر
 ہیکل حیوانی کے فاسد ہونے کا موجب ہے مگر درحقیقت انسان کا اپنے اشرف الخایات
 سے اتصال پانا ہے۔ اسی خیال بفضل اہل تحقیق نے جو حقیقت انسان اور انجام موت
 سے آگاہ ہیں۔ فرمایا ہے۔ المودۃ جسٹریوصل الحسب الی الحسب یعنی موت ایک
 پل ہے جو پیاسے کو پیاسے تک پہنچا دیتی ہے۔
 موت کا خوف صرف دو قسم کے شخصوں کو ہو سکتا ہے۔ اول ایسے اشخاص جن کی حالت

سے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ انسان صرف مادی زندگی تک ہی انسان ہے اس کے بعد اس کے لئے اور کوئی زندگی نہیں اس لئے وہ لذات جسمانی سے علیحدہ ہونا ناگوار خیال سمجھتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ہمیشہ زندہ رہیں اور خطوط نفسانی سے تمتع ہوتے رہیں جیسے گبریاں جو گو بریں خوش رہتا ہے اور باغ و بوستان کی لطیف زندگی سے بے خبر ہے ایسے ہی لوگوں کی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

وَلْيَعْلَمِ الْفِتْنَةُ مَا هُوَ وَلْيَعْلَمْ مَنْ فِي الْعَذَابِ
لَوْ يَعْلَمُ الْفِتْنَةُ مَا هُوَ وَلْيَعْلَمْ مَنْ فِي الْعَذَابِ ان يَعْلَمُ۔

ایسے لوگ نہایت حسرت اور اہم کے ساتھ دنیا سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ دوم وہ شخص جو باجائز موت کی زندگی پر ایمان تو رکھتا ہے مگر اپنے گناہوں کی وجہ سے آنے والے عذاب سے ڈرتا ہے۔ سولیس شخص کو چاہیے کہ وہ سچے دل سے رجوع الی اللہ کرے انشاء اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی عذاب نہیں۔

چونکہ موت انسان کو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف اور ایک رفیع مقام سے شریف مقام کی طرف پہنچاتی ہے کا فیہ ہے اس لئے قرآن مجید میں ایمانداروں کو مختلف الفاظ میں بشارتیں دی گئی ہیں۔ اور ایک حدیث میں وارد ہوا ہے۔ من احب لقاء الله احب الله لقاء یعنی جو شخص خدا تعالیٰ سے ملنا چاہتا ہے خدا تعالیٰ بھی اس سے ملنا چاہتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ موت جنت کا ایک دروازہ ہے اگر موت نہ ہوتی تو جنت میں داخل ہونا کیونکر مقصور ہوتا۔ خدا تعالیٰ نے موت کو اظہار احسان کے موقع پر ذکر کیا ہے چنانچہ فرمایا:۔ الذی

لے یعنی تم انہیں سب لوگوں سے بڑھ کر دینی زندگی سے حریص پاؤ گے اور بعض مشرکین یہ چاہتے ہیں کہ وہ ہزار سال جیتے رہیں حالانکہ اگر انہیں اتنی زندگی بھی مل جائے تو یہ امر آئیو لے عذاب کو ٹھال نہیں سکتا۔ ۱۲ منہ۔

خالق الموت والحیوة لیبیلو کہ ایکم احسن علایہ یعنی وہ خدا جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہارا امتحان کرے کہ کون اچھے عمل بجا لاتا ہے اس آیت شریفہ میں موت کو حیات سے پہلے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ بظاہر حیات کو موت سے پہلے ذکر کرنا چاہئے تھا مگر اس میں نکتہ یہ ہے کہ موت وہ چیز ہے جو انسان کو حیات حقیقی تک پہنچاتی ہے اور حیات دنیا حیات آخرت کے مقابلہ پر ناقابل اعتبار حیات ہے۔ چونکہ حیات آخرت ایک بھاری نعمت ہے اس لئے جو چیز اسی نعمت کے حصول کا ذریعہ ہو وہ بجائے خود ایک نعمت ہے یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور دیگر اولیا معظم موت کو دوست رکھتے تھے اور حدیث الدنیا بسجن المومن وجنة الکافر میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب کرم اللہ وجہہ کے اس قول میں غور کرو کہ آپ نے موت کو کیا سمجھ رکھا تھا۔ فرماتے ہیں واللہ ما ابالی اقع علی الموت اذ یقع الموت علی من حجاب چہرہ جاں میشود غبار تتم خوشامدے کہ ازین چہرہ پردہ بر فلتم



اے خدا میں اس بات کی کچھ پرواہ نہیں کرتا کہ میں خود موت پر جا پڑوں یا موت مجھ پر آ پڑے یعنی میرے لئے ہر دو حال یکساں ہیں۔ ۱۲ منہ *

ماہنامہ

معاد

ایکسب الانسان ان لمن یجمع عظامہ بلی قادرین علی ان یسوی بنا نہ
معاویہ دوبارہ جی اٹھنا مقتدر اسلام کا ایک اصل عظیم ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ تمام وعدہ و
وعید اور ثواب و عقاب کی تعلیم ایمان بالمعاد پر موقوف ہے۔ اس مسئلہ میں مختلف مذاہب کے
لوگوں میں بہت اختلاف واقع ہوا ہے۔ بلکہ خود اہل اسلام کے مختلف فرقوں میں اس مسئلہ کی
توفیت کو مختلف طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ تمام مذاہب عالم میں حقیقت معاد کا اقرار کیا جاتا ہے۔ صرف
فلاسفہ طبیعیین اور دوسرے فرقہ کے لوگ اس کا انکار کرتے ہیں مگر بقابلہ تعلیم و وحی جو حق ناطق
ہے۔ ان جھگڑوں کی کچھ دال نہیں لگتی۔ دراصل ان لوگوں کے انکار کی بنا اس امر پر موقوف ہے
کہ انسان صرف اس سبیل جسمانی کا نام ہے۔ اور اس سے زائد کوئی اور مفہیم لفظ انسان کا
نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ حقیقت روح کا انکار کرتے ہیں۔ اور اگر روح کی اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ

۱۔ اس موضوع پر اگرچہ گذشتہ صفحات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر صرف اس خیال سے کہ یہ مسئلہ موجودہ
مادہ پرستی کے زمانہ میں بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے اس کے متعلق مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۲۔ اس
سے کیا انسان یں کچھ بیٹھا ہے کہ اسکی ہڈیاں پھر جمع نہیں کر دکھائیے کیوں نہیں اس قدر کہ اسکی انگلیوں کی پون تک پھوڑت کیوں

ایک غیر مادی چیز ہے۔ جو معارفہ نتائج حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی ہے جس پر یہ بات الہی اور سرمدی سعادت کی مالک ہو کر جوار رحمت الہی میں اپنا شھکارنا بنا لیتی ہے۔ تو پھر ہمیں سداۃ اتر کر معلوم ہونا چاہیے۔ مگر وہ ایسا نہیں مانتے غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ایسے مسئلے کی حقیقت کے انکار کر دینے سے تمام سلسلہ کائنات کے بے اثر اور بے سود ہونے کی تسلیم دیتے ہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ امر قطعی اور یقیناً جاتا ہے جس کی قوانین فطرت اور تعلیم وحی سے تصدیق ہو سکے اب ہم دیکھتے ہیں کہ مسئلہ معاویہ پر جو معیار کے روئے کہاں تک قابل تسلیم ہے اس مسئلہ بحث کرنے کے لئے مراتب ذیل کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ حقیقت معاویہ و ضرورت معاویہ۔ سلسلہ کائنات کی ہر ایک چیز کو دیکھو اور نہایت یقین نگاہ سے اشیاء کی فطرت میں غور کرو۔ آپ کو بخوبی معلوم ہوگا کہ ایک عام انقلاب اور تیسرے تمام افراد موجودات میں اپنا اعلیٰ کردار ہے۔ اشیاء اپنے اپنے طبعی خواص کے مطابق کمال کو حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ جس کی قابلیت صلاح ازلی نے ان کی طبعاً میں دوامیت رکھی ہے۔ قانون الہی اپنے عام اور وسیع اثر سے سب کو ان کے ذاتی مقتضائے مطابق اپنا مقہور و مغلوب کئے ہوئے ہے ہم ایک آن کے لئے بھی اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ اشیاء اپنے نوعی کمال کے حاصل کرنے میں مذکورہ بالا قانون الہی کی مخالفت جہت پر عمل کرتی ہیں۔ حقیقت افراد موجودات کا اپنے اپنے کمال طبعی کی طرف رجوع کرنا خداوند جل و علی کی تجلیات صفات کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ صفات کاملہ ذات باری کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے مظاہر کو ان کے طبعی کمال تک پہنچیں اس لئے قانون الہی تمام انواع موجودات پر اسی طرح محیط ہے کہ ہر ایک نوع کے افراد مقررہ قواعد کے ذیل میں اپنے کمالات کو جمیعہ کے حاصل کرنے کے لئے مستعد ہیں۔ جس کمال کا قدرت نے کسی نوع کو مستحق پیدا کیا ہے۔ اسی کمال کی طرف ان کا رجوع ضروری ہے

چونکہ انسانی فطرت بلحاظ استعداد کمال تمام افراد موجودات سے ممتاز ہے چنانچہ اس امر کا کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ لامتناہی ترقی کی قابلیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور یہ بات نہ صرف بطور امور متعارفہ مان لی گئی ہے بلکہ ایک امر واقع ہے جس کی تصدیق ہر ایک شخص بذریعہ دلائل بخوبی کر سکتا ہے۔ اس لئے اس کی غایت بھی تمام افراد موجودات کی غایت سے اشرف اور اعلیٰ ہونی چاہئے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی میں کسی ایسے کمال کے نقطہ انتہائی یعنی غایت تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس آثنا میں وہ صرف اس غایت کے حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ اور وہ غایت جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے مدت العمر دنیا میں اس سے مخفی رہتی ہے اور قانون فطرت اسی امر کا مقتضی ہے کہ وہ مخفی رکھی جائے۔ کیونکہ کسی امر کی غایت کا وجود اس غایت کے ابتدائی ضروری عمل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نتیجہ عمل نتیجہ سے مقدم ہو یا اس غایت کا علم اجالی ہیں فطری طور پر ہوتا ہے۔ جس کی تصدیق میں وحی آسمانی نازل ہو کر ہم پر حجت قائم کرتی ہے۔ اگر ہم اس غایت کے قطعی اور یقینی ہونے کا یقین رکھتے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم ایک ذات واحد مطلق کو جس کا علم اور ارادہ اور جس کی حکمت اور قدرت ہمارے وجود کا باعث ہوئے ہیں اور جس نے ربنا ما خلقت هذا باطلا کے قانون قطعی سے افراد موجودات کے متعلقہ خواص کی طرف ہمیں راہ نمائی کی ہے کمال الصفا تسلیم کرتے ہیں۔ ایسا کرنا تو اس کے عاجز مخلوق یعنی انسان کا کام بھی نہیں۔ بھلا وہ خود کیوں ایسے عجب اور عیسو و کام کو کرنے لگا تھا۔ افسوسکہ انما خلقتنا کہ عشا و انکہ المینا لا ترجعون۔ سبحان اللہ وہ کیا نامراد عقول ہیں۔ اویسی ناپاک فطرتیں ہیں جو

۱۔ اشارہ ہے۔ آیہ یا ایہا الانسان انک کادح الی ربک کد حاقنا قبیہ کی طرف ۱۰ منہ +

۲۔ خدایا تو نے یہ سلسلہ کائنات بے نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ ۱۲ منہ +

۳۔ کیا لوگوں نے بیچارہ کو یہ کہہ نہیں بے نتیجہ پیدا کیا ہے۔ اور بالآخر تم لوگ گمراہی طرف نہیں لوگے ۱۶ منہ +

حکیم علی الاطلاق کے کارخانہ فطرت کو عبرت قرار دیتے ہیں کیا کوئی دانشمند اس امر کو تسلیم کرے گا کہ انسان جیسے گرہینقد مخلوق کی غایت صرف یہی ہے کہ وہ مختلف لذائذ نفسانی اور حفظ حیوانی سے مستمتع ہو کر بالآخر مرداس کی طرح زیر زمین چلا جائے۔ اور بعد ازاں اس کے ہر ایک قسم کے افعال حسہ اور اعمال قبیحہ کا اسے کوئی نتیجہ نہ ملے جبکہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے اعمال نیک و بد کا یہاں ہمیں کامل نتیجہ نظر نہیں آتا۔ گو بعض اوقات سلسلہ حکومت ملکی میں انتظامی حالات کی اصلاح کے لئے بظاہر بعض افعال کے نتائج ظاہر ہوتے نظر آتے ہیں مگر یہ نتائج وہ نہیں ہیں اور یقیناً وہ نہیں جو فطرت انسانی کے رُوسے بطور غایت ہم پر عائد ہونگے یہ ایک بھاری غلط فہمی ہے کہ ہماری اس زندگی کے مختلف افعال کے نتائج جو سلسلہ نظام عالم میں دوسری سمجھے جاتے ہیں ہماری آخری غایت ہو سکتے ہیں۔ بلکہ خود کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان انقلابات بے تحاشہ و خوشی کا نتیجہ انسانی فطرت کی اصلاح اور انسانی سوسائٹی کی بہبود پر مبنی ہے جبکہ انسانی فطرت کی حقیقی غایت نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ سب حقیقی غایت کے لئے دیگر اسباب کی طرح اسباب ہیں *

قرآن مجید کی تعلیم ہیں دو مختلف قسم کی ہستیوں کا پتہ دیتی ہے جن کو ثنائیت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نشا اولیٰ کا اشارہ اس آیت میں کیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النِّشْأَةَ الْاُولٰی فَلَوْلَا تَذٰکُرٌ وَّ اِنْ تَنْشَآءُ ثَانِیَہٗ کَا اِسْتَارَہٗ اٰیٰتِ ذٰلِیْہِیْنَ مَوْجُوْبَہٗ ثُمَّ یُنَسِّیْ النِّشْأَةَ الْاٰخِرَۃَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ نشا اولیٰ سے ہمارا اس قضائے عالم میں جلوہ گر ہونا مراد ہے اور نشا راخری سے مرنے کے بعد دوسری دفعہ جی اُٹھنا۔ چونکہ یہ عدائے خالق السموات والارض کا فرمان ہے جس میں شک و شبہ کو

لے تم اپنی پہلی بار عدم سے وجود میں آئے کو تو جانتے ہو پھر کہیں تم اس کو یاد نہیں کرتے۔ ۱۲ منہ *
 ۱۳ پھر خدا دوسری پیدائش میں پیدا کر دے گا اور وہ سب اشیاء پر قادر ہے *

کسی قسم کی گنجائش نہیں۔ اسلئے اصول فطرت کے معیار پر یقیناً درست آنا چاہئے سو فطرت انسانی اس کتنا ہوں کہ نہایت زور کے ساتھ اس کی تصدیق کرتی ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری فطرت ہمیشہ ہر ایک امر میں انجام دہنی کی طرف میلان رکھتی ہے اور ہماری کوئی حرکت و سکون ایسی نہیں کہ جس میں ہم پہلے نتیجہ کو اپنی عقل سے معین نہ کر لیں اور اگر معین نہ کر سکیں تو کم از کم بطور اجمال کسی نتیجہ غیر معلوم کا یقین ہمارے دل میں ضرور ہو جوتا ہے۔ انسانی فطرت کی یہ ایک اندرونی شہادت ہے جس پر تمام نظام عالم کا سلسلہ رہا ہے۔ یہ یقین صرف ہماری ارادی حرکات و سکنات تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام کائنات کے تمام قدرتی قوی کے عمل میں ایسا ہی یقین رکھتے ہیں۔ یہی یقین تمام اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی اور جہانی ترقیات کا مدار ہے۔ التزم انسان کا معاملات کے انجام میں غور کرنا اس کا فطری خاصہ ہے۔ اسی اصل پر ہم اپنی موجودہ ہستی کی غایت و اجمالی یقین رکھتے ہیں جس کی نوعیت بذریعہ وحی معلوم ہے اگر اس خاصہ کی ضرورت کو ہم تسلیم نہ کریں تو انسانی فطرت میں اس کا وجود باطل تسلیم کرنا پڑیگا۔ کیسی فاش غلطی ہے کہ انسان جیسے اشرف المخلوقات موجود کو بے غایت تسلیم کیا جاتا ہے موت جس کو بظاہر عام لوگ نیست ہونے سے تعبیر کیا کرتے ہیں وہ بوجہ جہیمہ کی ترکیب کے زائل ہو جانے کا نام ہے۔ ورنہ نیست محض کوئی چیز بھی نہیں ہوسکتی۔ روح انسانی کا اس سبب جہانی سے علیحدہ ہو جانا اس کی حقیقت میں ہرگز غفل غائد نہیں کر سکتا بلکہ موت موجب کمال انسانی ہے کیونکہ معارف و حقائق کا انحطاط کلی مادی تعلقات کی صورت میں ناممکن ہے۔ جوہنی کہ وہ اس سبب عنصری سے علیحدہ ہوتی ہے وہ ایک نیا وجود اختیار کرتی ہے۔ جس کی نوعیت اس کے اس وجود سے بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔ اور چونکہ نہایت اور لطافت کے رُوسے اسے حقائق مجرورہ (عالم ملکوت) سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو مراتب علم میں تمام کائنات سے برتر ہیں اسلئے وہ حقیقی مسرت کو حاصل کر کے اپنے مقصدات

فطرت یعنی کمال کی غایت کو پہنچ جاتی ہے۔ موت ہمارے لئے گویا ہر موجب فساد ہے مگر درحقیقت یہی فساد بدن اور مجرور روح ابدی نجات تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتے ہیں اس کی سینکڑوں مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن کو ہم سرسری نگاہ سے ٹال جاتے ہیں مثلاً زمین میں بیج پھینکا جاتا ہے جب تک قولے طبعیہ اس میں عمل کر کے اس کے اجزا میں ایک قسم کا تفرق نہ پیدا کریں اس میں نشوونما پیدا نہیں ہوتا۔ اجزا متفرق ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر سے ایک پودا پھولتا پھلتا ہے جس کا نتیجہ یا عامل پھر وہی ہوتا ہے جو پہلے تھا گو یہ مثال پورے طور پر مطبق نہیں ہو سکتی اور نہ میرا نسا تطبیق کلی کا ہے۔ مگر اس سے کسی چیز کے بظاہر فساد ہو جانے میں ایک عظیم الشان مصلحت کا مضمر ہونا تو ضرور ثابت ہوتا ہے پس موت جس کو بظاہر علم سے تعبیر کیا جاتا ہے درحقیقت ہمارے کمال کا موجب ہے مگر ہم انسان کی اس غایت حقیقی اور اس کے تدریجی انقلابات سے وہاں تک پہنچنے کا یقین نہ رکھیں تو انسان نہ صرف ایک بے سود اور بے معنی مخلوق کا نام ہوگا بلکہ اس سے بڑھ کر تمام موجودات میں بدتر اور نمکا کوئی اور مخلوق نہیں ہو سکا۔ اور نہ صرف اسی قدر بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تمام سلسلہ کائنات ہی عبث اور بے نتیجہ تسلیم کرنا پڑے گا مگر نہ تو فطرت سلیم اس کی تائید کرتی ہے اور نہ کتب آسمانی سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

الغرض معاد کی حقیقت نفس ناطقہ انسانی کی فطرت کے سمجھنے پر موقوف ہے اور کوئی شخص جب تک نفس انسانی کی سعادت و شقاوت کو جو بطور غایت بعد قطع تعلق بدن پیش آئے والی ہیں نہ سمجھے معاد کی ضرورت کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے معاد کے ثبوت میں سب سے پہلے مراتب ذیل کا ختم سے فیصلہ کر لینا چاہئے۔

(۱) روح انسانی ایک حقیقت مجرد کا نام ہے اور وہ قطع تعلق بدن کے بعد باقی رہتی ہے

(۲) اعمال نیک و بد کی غایت ضروری ہے۔

(۳) اس غایت کا وجود قبل از قطع تعلق بدن ممکن نہیں۔

(ب) معاد روحانی ہے یا جسمانی۔

یہ حصہ نہایت مختلف فیہ ہے اور اس میں مختلف مذاہب حسب قیاس ہیں :-

(۱) معاد صرف روحانی ہے (۲) معاد صرف جسمانی ہے (۳) معاد روحانی اور جسمانی ہر دو سے اکثر اہل فلسفہ اور حکماء اسلام میں حکیم ابو نصر فارابی صرف معاد کے روحانی ہونے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام عوام الناس کو ان کے فہم و عقل کے مطابق مرنے کے بعد کے حالات ثواب و عقاب وغیرہ استعارہ و تشبیہ کے طور پر بیان کر کے ترغیب و ترغیب کیا کرتے ہیں اور ان امور کو ایسے طور پر پیش کرتے ہیں جس سے وہ یہ آسانی سمجھ سکیں کیونکہ عام انہام امور روحانیہ اور لذات عقلیہ کی حقیقت کے اور آگ سے عاجز ہوتے ہیں اسلئے معاد کے متعلق جس قدر الفاظ آسمانی کتابوں میں آچکے ہیں سب کے سب بطور استعارہ استعمال کئے گئے ہیں۔

مگر اس تقریر کا جواب یہ ہے کہ الفاظ کو اصول کے رُوس ہم صرف ان کے حقیقی معنی میں استعمال کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر حقیقی معنی کے تسلیم کر لینے سے کوئی محال عقلی لازم آئے تو الفاظ کو مجازی معنی مثلاً استعارہ کنایہ وغیرہ پر محمول کر سکتے ہیں مسئلہ معاد میں ہم بدن کے دوبارہ قیام کو ہرگز محال عقلی تسلیم نہیں کرتے۔ اگر کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کرے بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ ہم اس امر کے قائل ہیں کہ جس بدن سے دوبارہ روح تعلق پیدا کرے گی وہ عین پہلا بدن نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا مثل ہوگا۔ قال اللہ تعالیٰ اولیس الذی خلق السموات والارض بقادر علی ان یخلق مثلهما اور دوسری جگہ فرمایا عن خلقناہم وشدنا استرہم واذ انا یدلنا انما لہم تبدیلان۔

صہ یہ اہل تخیل کا مذہب ہے جس کو ہم گذشتہ صفحات میں باطل ثابت کر چکے ہیں۔ ۱۲ منہ +

سے کیا وہ ذات جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے پیدا کر سکے گا ۱۲ منہ +

۱۲ منہ ہی نے انہیں پیدا کیا اور ان کے بندھن مضبوط کیے ہیں اور جیسے پہلے تو ان جیسوں کو بدل دینگے ۱۲ منہ

پس جس صورت میں کہ توام بدن بمقابلہ قدرت ذات باری ممکن ہے۔ اور کتاب آسمانی روحی طاق
اس کی تصدیق کرتی ہے تو ہم کسی طرح معاد جسمانی کو محال عقلی تسلیم نہیں کر سکتے۔
اعتراض: اس موقع پر ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ توام بدن اجزائے مختلفہ
سے بواسطہ اسباب ممکن ہے مثلاً انسان کی پیدائش کے لئے لطفہ کا رحم میں قرار پانا
اور بعد ازاں مختلف صورتوں میں بذریعہ عمل قوائے طبیعیہ منتقل ہونا اور غذا اور لباس سے
نشو و نما پانا ضروری ہے۔ اس لئے دفعہ ایسے وجود کا متحقق ہو جانا قرین عقل نہیں اور معاد
جسمانی کے قائل دفعۃً انسان کے پیدا ہونے کے قائل ہیں۔

جواب۔ توالد و تولد و علیحدہ علیحدہ اور ہیں۔ مذکورہ بالا تقریر سلسلہ توالد کی صورت
میں درست ہے۔ مگر تولد کی صورت میں درست نہیں۔ کیا ہم دفعۃً اکثر حیوانات کا بلا سلسلہ
توالد پیدا ہونا مشاہدہ نہیں کرتے۔ حالانکہ علم حیوانات کے علمائے اس بات کو زبردست
دلائل سے پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ انسان کی ابتدائی پیدائش جیکہ ابھی سلسلہ توالد
و تناسل جاری نہیں ہوا تھا تولد ہی تھی جس کو آسمانی کتابیں بھی تسلیم کرتی ہیں اسی امر
کی طرف خداوند تعالیٰ جل و علی ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔ **النساء امرہ اذا راد
شیئان یقتول لہ کن فیکون** اور چونکہ مسیات کے اسباب مضمون میں لینی کسی معلول
کی علت یا اس کے طریق عمل کو ہم ہرگز محدود نہیں کر سکتے اس لئے بمقابلہ قدرت حکیم
علی الاطلاق اس بات کا امکان بالکل واضح ہے کہ انسان کے دفعۃً ہی اُسٹنے سے پہلے
قواء فطریہ اس کے مادہ بدن میں ایسے طور پر عمل کر رہے ہوں کہ وقت معین پر پیرمان ایزدی
بالکل تعلق روح کی قابلیت اس میں پیدا ہو جائے اس لئے اس امر کے تسلیم کر لینے میں اگر
کچھ تاثر ہو سکتا ہے تو صرف اسی قدر کہ ایسا ہونا بعید از عقل ہے۔ محال اور مستحسن پس جب

امکان ثابت ہے۔ اور کتب سماویہ مصدق ہیں۔ تو اس کے مان لینے میں شک و شبہ کو کسی قسم کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

دوسرا مذہب معاویہ کے جہانی ہو سکا ہے۔ مگر چونکہ محض جہانی ہونے کے کچھ معنی نہیں ہو سکتے اس مذہب کا مرجع بھی تیسرے مذہب کی طرف ہو سکتا ہے۔ یعنی کہ معاویہ جہانی اور روحانی ہر دو ہے۔ یہی مذہب صحیح ہے جسکو تمام اہل سنت والجماعت اور بعض دیگر فرقہ ہائے اسلامی مانتے ہیں۔ کیونکہ ظوہر آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے اسی مذہب کی تصدیق ہوتی ہے اور یہی اعتقاد اکثر سلف و خلف متکلمین کا ہے۔

وحی آسمانی ثابت کرتی ہے اور اہل فلسفہ نے اس بات کو مسلم رکھا ہے کہ پہلے پہل عالم کائنات کا مادہ ذرات کی صحبت میں پھیلا ہوا تھا۔ خداوند جل شانہ کے ارادہ سے حسب ضرورت ان میں ترکیب پیدا ہوتی گئی۔ وہی ترکیب کے ذائل ہو جانے اور پھر ذرات کی صورت میں عود کرنے کو فساد عالم کہتے ہیں۔ جس کا اشارہ مختلف الفاظ میں آیات کے اندر پایا جاتا ہے۔ فکانت ہباء بنبشا۔ وسیرت المجال فکانت سربا اذا دکت الارض دکا دکا وغیرہ میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ وقت مقررہ پر پھر وہی پہلی صورت ہو قبل ترکیب بھی موجود ہو جائیگی اور خداوند کریم کی حکمت کاملہ سے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو جائیگے۔ قال اللہ تعالیٰ یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات نص ہے مذکورہ بالا دعویٰ کی اثبات پر۔

ہماری موجودہ زمانہ میں یورپ کے علم ہیت اور طبیعیات کے علمائے بھی اس کارخانہ فطرت کے فاسد ہو جانے کو اپنے اصول کے مطابق ثابت کیا ہے۔ ہم اس امر کو باسانی یوں

۱۔ پہاڑ ذرات پر آگندہ ہونگے۔ ۲۔ منہ ۳۔ پہاڑ چلائے جائیگے اور ہر سرب نی گرد ہو کر نظر آئیگے۔ ۴۔ جبکہ زمین خوب کوٹ دی جائیگی۔ ۵۔ قیامت کو یہ زمین و آسمان دوسری نئی زمین و آسمان سے بدل دیئے جائیگے۔

بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اشیاء مادیہ میں یہ قدرتی بات ہے کہ ان کی ترکیب بتدریج زمانہ کے
 طبعی قوی کے اثر سے زائل ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ ہم روزمرہ اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ
 یہ اثر ایسا عام ہے کہ کوئی مادی جسم انحلال ترکیب خواہ ایسا ہی مضبوط ہو محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پس
 جس صورت میں کہ مختلف اشیاء کے افراد کی یہ حالت ہے۔ تو کل سلسلہ کائنات کے فساد
 سے کوئی امر مانع ہے۔ کیونکہ جو خاصہ فرداً فرداً اشیاء مادیہ کی فطرت میں موجود ہے وہی
 مجموعہ اشیاء میں پایا جاتا ہے اور چونکہ گذشتہ اوراق میں ثابت ہو چکا ہے کہ انسان
 جس کو عالم صغیر کہتے ہیں سلسلہ کائنات یعنی عالم کبیر سے مشابہ ہے اور دونوں ہر ایک
 بات میں کلی مماثلت رکھتے ہیں۔ اس لئے جب ہم انسان کی ترکیب جسمانی کو زائل ہوتے دیکھتے
 ہیں تو اسی پر عالم کبیر یعنی سلسلہ کائنات کے اجزاء کا درہم برہم ہونا بھی قیاس کر سکتے ہیں۔
 ہاں مدت قیام ہر دو کی علیحدہ علیحدہ ہے بلکہ تہایت غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ
 خداوند کریم نے فساد کائنات کی حقیقت کے سمجھنے کے لئے ہماری آنکھوں کے سامنے یہ
 سب نظائر پیدا کر دیئے ہیں جن سے ہمیں کلی یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ جس کامل قدرت
 خدا نے پہلی دفعہ سلسلہ کائنات کو صرف اپنے ابادہ سے کھڑا کر رکھا یا وہی خدا پھر اس کو
 اپنی قدرت کاملہ سے دوسری صورت میں موجود کر رکھا بیگا۔ قال اللہ تعالیٰ فی القہر ان
 الحمید وهو الذی بید الخلق شد یعید و دھول ہون علیہ ۔

تثلیث واضح ہو کہ معاد روحانی اور جسمانی روحانی و جسمانی یعنی مذکورہ بالا ہر سہ مذاہب کی
 وجہ اختلاف صرف یہ ہے کہ معاد روحانی کے قائلین فقط انسان سے صرف نفس ناطقہ
 الثانی یا روح مجرد مراد لیتے ہیں۔ جو نیک و بد اعمال کا کتاب کرتی ہے اس لئے

اسے ہی وجہ ہے کہ ان کے مرنے کو قیامت صغریٰ اور عالم کے فنا ہونے کو قیامت کبریٰ کہتے ہیں ۔
 دوسری وجہ ہے جو مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر اس کو لوٹائیگا اسی بات اس پر اس لئے ہے ۔

نواب و مہتاب بھی اسی کے مخصوص ہے۔ اور معاویہ جہانی کے قائلین کے نزدیک انسان صرف اس شکل جہانی سے مراد ہے اور روح ان کے نزدیک صرف صورت نوعیہ سے مراد ہے۔ جو مرنے پر زائل ہو جاتی ہے۔ حشر احیاء پر پھر وہی صورت جو موجب حیات ہے جسم سے تعلق پیدا کر لگی۔ ان لوگوں کے نزدیک روح کوئی مجرور اور بے دنیا باقی نہ ہے والی چیز نہیں اور جو لوگ معاویہ جہانی اور روحانی ہر دو کے قائل ہیں ان کے نزدیک انسان مجموعہ روح اور شکل جہانی کا نام ہے۔ قرآن و سنت سے بھی اسی مذہب کی تائید ہوتی ہے۔ اور یہی اس خاکسار کے نزدیک بھی صحیح ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمۃ اسی مذہب کی تائید نہایت عمدہ طریق پر کرتے ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

اکثر تحقیقین معاویہ جہانی و روحانی کے قائل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اصول فلسفہ اور شریعت ہر دو کو اکٹھا کرنا چاہا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ روح میں معرفت ذات باری سے اور اجسام اشیاء بادیہ بناسبہ سے سعادت حاصل کئے ہیں مگر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ روحانی اور جہانی ہر دو سعادت کا کامل طور پر حاصل ہونا انسان کو اس زندگی میں ممکن نہیں کیونکہ اس موجودہ زندگی کا خاصہ تو یہ ہے کہ اگر انسان کو معرفت ذات باری میں زیادہ استغراق حاصل ہو تو وہ جہانی سعادت اور لذت سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور اگر جہانی لذت کی طرف متوجہ ہو جائے تو وہ روحانی لذت سے باطل بچ رہتا ہے اس شکل کی وجہ یہ ہے کہ روح انسانی تعلق بدن کی حالت میں نہایت کمزور ہوتی ہے۔ اور جب مرنے کے بعد عالم ارواح سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ قوی ہو جاتی ہے پھر جب اس کو بدن سے تعلق حاصل ہوگا تو وہ ہر دو قسم کی سعادت یعنی جہانی و روحانی لذات کو کمال طور پر حاصل کرنے کے قابل ہو جائیگا۔ اور ظاہر ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ سعادت انسان کے لئے اسی صورت میں مقصور ہو سکتی ہے جبکہ وہ ہر دو اقسام لذت کو حاصل کیے پس اعلیٰ کمال نہ تو صرف روحانی لذات میں پایا جاتا ہے نہ صرف

جسمانی لذات میں بلکہ ہر دور کے اکٹھا ہونے میں موجود ہے۔ اسی قسم کی تقریر شائع مقاصد نے بھی کی ہے۔

یہاں ایک اعتراض کا جواب ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسان کا حشر جسمانی ضروری ہے تو کیا دیگر حیوانات کا بھی حشر ضروری ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام عالم کائنات کے وجود میں لانے سے مقصود بالذات صرف حضرت انسان کا وجود تھا جو حکم آیہ حمله الانسان بالارمانت کا متحمل ہوا۔ دیگر تمام موجودات انسان کے منزل مقصود تک پہنچنے میں بمنزلہ اسباب کے ہیں ان کا وجود مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالعرض ہے اور قاعدہ ہے کہ جب مقصود بالذات حاصل ہو جائے یعنی مابعد موت انسان اپنے کمال حقیقی کو پہنچ جائے تو اسباب کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لئے ان کا حشر ضروری نہیں۔ بعض آثار میں ان کا حشر اس طرح پر ثابت ہوتا ہے کہ وہ حشر کے بعد پھر نیست و نابود ہو جائیں گے۔ کیونکہ جو ضرورت عالم دنیا میں ان کے وجود کے متعلق وابستہ تھی عالم آخرت میں باقی نہیں رہیگی۔ اس لئے ان کے بقائے دوام کی بھی کچھ ضرورت نہیں ہوگی۔

حقیقت

دوسرے اور ماہ پرست لوگوں کا خیال ہے۔ کہ انسان صرف اس جسم عنصری کا نام ہے جو ایک خاص ترکیب اعضا اور نظام معین کے ساتھ قائم ہے۔ اور طبعی طور پر اس کے قویٰ اور اعضا خاص خاص اعمال کو سرانجام دیتے رہتے ہیں جس سے اس کا تسلسلہ زندگی قائم رہتا ہے۔ اور اس سے زیادہ انسان کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ وہ خیال

ہے جس سے نہ صرف انسان کا اشرف کائنات ہونا باطل جاتا ہے بلکہ حکمت خداوندی کا بطلان لازم آتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر یہ لوگ خالق حقیقی اور مائع ازلی کے وجود کو مع اس کی صفات کاملہ کے تسلیم کر لیتے۔ تو حقیقتِ رُوح کے تسلیم کرنے میں ان کو کسی قسم کا مخالفت نہ ہوتا۔ صانع ازلی اور اس کے صفات کاملہ کے اثبات کے متعلق ہم قبل ازیں بحث کر آئے ہیں۔ اس وقت ہمیں یہ بتلانا مطلوب ہے کہ انسان صرف اس تکلیفِ عنصری کا نام نہیں بلکہ وہ اس جسمِ عنصری اور ایک لطیفہ ربانیہ یعنی رُوح ہر وہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ رُوح کی حقیقت کے متعلق مختلف لوگوں نے مختلف اقوال پیش کئے ہیں جن کا نقل کرنا پڑھنے والے کے لئے تشویشِ ذہن کا موجب ہے۔

شائع علیہ السلام سے حقیقتِ رُوح کے متعلق کوئی نص وارد نہیں ہوئی۔ اسلئے محققین نے اس میں غور و خوض کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ صرف اسی اعتقاد پر قائم ہیں کہ قرآن و حدیث سے وجودِ رُوح کا پالینا کافی ہے اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اور اس کے مان لینے میں کوئی امر منافی عقل للذم نہیں آتا۔ اور نہ اس کے غیر محسوس ہونے سے اس کا عدم لازم آتا ہے۔ کیونکہ کئی ایک امور ایسے ہیں کہ وہ بذریعہ حواس محسوس نہیں ہوتے۔ مگر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا مثلاً ابھیر کے وجود پر کیا دلیل ہے۔ مگر اس کی ضرورت موجودہ زمانہ کے محققین نے محسوس کی ہے یا وہ جاندار ماقبے جو خور و مین کے ذریعہ سے دیکھے جاتے ہیں برخلاف اسکے بعض محققین نے حقیقتِ رُوح کے متعلق غور و خوض کیا ہے۔ چنانچہ امام الحرمین عبد الملک جوینی جو اکابرِ علمائے اسلام میں شمار ہوتے ہیں حقیقتِ رُوح کے متعلق لکھتے ہیں :- اِنَّهَا جِسْمٌ لَطِيفٌ شَقَاتُ حَيِّ لَدَاتِهِ مُشْتَبِكٌ بِالْأَجْسَامِ الْكَثِيفَةِ اشْتِبَالُ الْعَاوِلِ بِالْعَوْدِ الْخَاضِعِ لِنَفْسِ الْإِنْسَانِي (روح) ایک جسم ہے جو لطیف اور ثقیل اشتبالت اور لذاتہ زندہ ہے اور مادی جسموں کے ساتھ اس طرح ملا ہوا ہے جس طرح سبز نیشاں میں

یانی ملا ہوا ہو۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے ایک قول سے اس قول کی تائید ہوتی ہے اور اسی مذہب کو اکثر محققین نے صحیح قرار دیا ہے۔ یہ امر کہ روح کا جسم کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے ایک دقیق مسئلہ ہے مگر یہ صحیح ہے کہ قلب انسانی کے ساتھ اس کا تعلق قریبی ہے اور اسی تعلق کی وجہ سے انسان کا سلسلہ حیات قائم ہے۔ دورانِ حیات اور تجارات اس کے زیر تصرف عمل کرتے ہیں۔ یہ چیزیں بجائے خود تصرفِ روح کے لئے بمنزلہ آلات کے ہیں اور اگر ہتھیلیاں اور صرف حقائق ان کا کام نہیں۔ کیونکہ یہ سب امور مادی ہیں اور مادہ علم و معرفت سے عاری ہے۔

روح کے جسم سے ایک علیحدہ حقیقت ہونے پر ایک یہ دلیل ہے کہ ہم جسم یا اس کے کسی حصہ کو اس کی طرف مضاف کر کے بولا کرتے ہیں۔ چنانچہ بولتے ہیں میرا جسم دوکرتا ہے میری آنکھ دکھتی ہے میرے پاؤں پھٹ گئے وغیرہ۔ غور کرو کہ ان جملوں میں جسم آنکھ پاؤں کس چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ کیا چیز ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہوا کرتی ہیں ورنہ اضافت کے کوئی معنی نہ ہونگے۔

نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مادہ امور کلیہ کا اور اک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ امور کلیہ کا کوئی وجود خارج میں نہیں ہوتا مثلاً اس امر کا اور اک کرنا کہ زید ناطق ہے قوتِ سامع کا کام ہے مگر اس امر کا اور اک کہ تمام انسان ناطق ہیں۔ قوتِ سامع کا کام نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اور اک کسی دوسری چیز کا نام ہے اور وہ چیز وہی ہے جس کو نفس یا روح بولتے ہیں نفس یا روح کے ثبوت میں ہماری ایک باطنی شہادت بھی موجود ہے جس سے ہم اس کے وجودِ کامل کا یقین رکھتے ہیں۔ اور وہ شہادت یہ ہے کہ انسان ہر ایک چیز کے غافل ہو سکتا ہے مگر وہ اپنی ہستی سے کہیں پہلے کبھی غافل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگر اس کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ لیا جائے تو پھر بھی اس کو اپنی ہستی کا ویسا ہی یقین ہوتا ہے جیسا کہ اس نے پہلے تھا۔ یہ اندرونی شہادت اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ روح کوئی مادی چیز

نہیں۔ اور وہ آپ اپنی ہستی کی دلیل ہے۔

جو لوگ کشف والہام کی حقیقت سے آگاہ ہیں وہ بالیقین جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو نفوس قدسیہ کے مالک ہیں بسا اوقات امور فیسیہ پر مطلع ہو کر کہتے ہیں۔ اور اس کا انکار کرنا سراسر حماقت ہے کیونکہ یہ ایک امر واقع ہے۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ ٹھوس مادہ جو علم و ادراک سے بے بہرہ ہے زمانہ ماضی یا مستقبل کے متعلق کسی قسم کی اطلاع نہیں پاسکتا۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ انسانی جسم کی ترکیب میں جو قویٰ اور اعضاء کام کرتے ہیں وہ بذاتہ کسی فعل کا سبب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ بمنزلہ آلات کے ہیں۔ اور ان کے استعمال میں لانے والی کوئی اور حقیقت ہے جو ٹھوس مادہ سے علیحدہ ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے طریق عمل میں سلسلہ اسباب کی پابندی ایک خاص نظام کے ماتحت عمل میں آتی ہے ہم ہر ایک فعل کے متعلق پہلے ارادہ کرتے ہیں۔ پھر اسباب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسباب کے عمل میں لانے اور عمل کے غلط یا صحیح نتیجہ کی پہلے سے توقع رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ طریق عمل اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے قویٰ اور اعضاء کو مناسب طریق پر عمل میں لانے کے لئے ان سے علیحدہ کوئی اور حقیقت موجود ہے جو متصرف ہوتی ہے اور یہ تصرف جو ایک خاص سلسلہ نظام عمل میں دیکھا جاتا ہے۔ ٹھوس مادہ کا کام نہیں۔ اگر کوئی شخص انسان کا ایک سہل عضری و حیات یا مٹی یا لکڑی سے تیار کرے اور اس کے اندرون و بیرون میں تمام اعضاء کو قائم کرے جو علم تشریح الابدان سے آج تک پایہ تحقیق تک پہنچ چکے ہیں اور جسم کے مختلف حصوں میں تمام رگیں اور پٹھے اور دریائیں جو دو دہان خون اور حرکت کا کام دیتی ہیں اپنی اپنی جگہ پر مکمل کرے اور کسی آلہ کے ذریعہ جسم کے اندر دو دہان خون اور تنفس بھی پیدا کرے۔ المرض جسم انسانی کی کوئی بناوٹ جو کسی عضو کے لئے مخصوص ہے مہل نہ رہ جائے۔ اور وہ انسان کی ہی طرح بولنے لگے اور نقل و حرکت بھی انسان ہی کی طرح کرنے لگے تو کیا کوئی عقل مند آدمی یہ یقین کر لے گا کہ وہ ایک حقیقی انسان ہے اور اس میں علم

اور ایک اور معرفت اشیا اور نیک و بد اور مفید و مضر میں امتیاز کی قوت بھی پائی جاتی ہے
حاشا و کلا وہ بیکل ایک شخص مادہ سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اور نہ اس سے انسان
کی طرح علوم و فنون کے حاصل کرنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ ہاں بازیچہ اطفال ضرور ہے۔

اہل یورپ نے مسئلہ تحقیق رُوح میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور لگا ہے ہیں مگر تا حال
انہیں کسی صحیح مرکز تک رسائی نصیب نہیں ہوئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی تحقیق کا مدار
اصول سائنس پر مبنی ہے جو مادیات سے گذر کر کسی قسم کی کائنات پر عادی نہیں ہو سکتی۔ لہذا
وہ ناکام ہی رہینگے۔ یہ بچا ہے ایک ایسی بھول بھلیاں میں چکر رہے ہیں جہاں سے ان کو نکلنا
نصیب نہیں ہو گا تا وقتیکہ وہ قرآنی تعلیم کا اتباع نہ کریں۔ سُنئے ہیں کہ ان لوگوں میں بھی بعض
ایسے محقق پیدا ہو گئے ہیں جو مادہ کے علاوہ غیر مادی موجودات کے قائل ہوئے ہیں اور تحقیق
مادیات نے ہی انہیں اس اقرار پر مجبور کیا ہے۔ کیونکہ تحقیق مادمات نے ان کو کسی ایک مشکلات
کے حل کرنے میں عاجز ثابت کر دیا ہے جو حقیقت رُوح کے تسلیم کر لینے پر بکسانی حل ہو سکتی
ہیں۔ اگر یہ لوگ آج قرآنی تعلیم کا اتباع کر لیں تو وہ بسہولت تمام اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے
ہیں۔ تعلیم قرآن نے ان کی روحانی ترقی کا ایک ایسا وسیع میدان دکھایا ہے جس کے
منازل طے ہونے پر انسان کامل حقیقت رُوح کا نہ صرف قائل ہو جاتا ہے بلکہ وہ اس کا مشاہدہ
بھی کر لیتا ہے دیکھو کہیں میرے ان الفاظ کو سرسری طور پر نہ مائل دینا۔ کیونکہ یہ ایک پتے
کی بات ہے۔ میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر مخاطب کو دیکھتا ہوں کہ اس
کی نظر مادیات سے آگے تجاوز نہیں کر سکتی اس لئے اسی قدر پر کفایت کرنا مناسب خیال
کر رہا ہوں۔

دریں مشہد ز گویائی مژن دم
سخن را خستم کن و اللہ اعلم

روح انسانی ہر ایک قسم کی موجودات کا اور کسے کہہ سکتی ہو

روح اور نفس دو علیحدہ علیحدہ لفظ ہیں مگر بعض لوگ تاواقنیت کی وجہ سے ان ہر دو کی حقیقت بھی علیحدہ علیحدہ قرار دیتے ہیں مگر صحیح یہی ہے کہ ہر دو لفظ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور اس کی حقیقت کے دریافت کرنے سے بڑے بڑے حکماء اور اکابر محققین بھی دنگ رہ گئے ہیں۔ جو لوگ انسانی زندگی کو صرف ایک مادی طور پر اور تاثرات تک محدود رکھتے ہیں وہ روح کی حقیقت کو غیر مادی تسلیم نہیں کرتے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور وہ ہریت کا سنگ اساسی ہے۔

روح انسانی ایک توفانی جوہر ہے جو مادہ اور اس کے لوازم سے بالکل پاک ہے۔ جسم اور اس کے تمام اعضا اور قویٰ بمنزلہ اس کے خدام کے ہیں جن سے وہ اپنی مصلحت یعنی چمکوت اور دفع مضرت کا کام لیتا ہے۔ اور رنج و خوشی اور دیگر کیفیات سے متاثر ہوتا ہے۔ مگر بواسطہ جسم نہ بذات خود۔ کیونکہ بذات خود اس مادی زندگی میں دیکھی قسم کا اور کس نہیں کر سکتا۔ البتہ جسم سے تجرد کی حالت میں وہ بلا واسطہ ہر ایک قسم کی اشیا کا اور کس کر سکتا ہے۔ عوام الناس کو یہ بات صرف نیند کی حالت میں حاصل ہو سکتی ہے اور اس حالت میں بھی روح کی کثافت و لطافت کے اختلاف کے رُوح سے اس کے اور کات مختلف ہو سکتے ہیں۔ خواص الناس جن پر بذریعہ ذکر و عبادت اور مجاہدت و ریاضت لطافت روح غالب آجاتی ہے اپنے اور کات میں قولے جسمانیہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ کیونکہ رُوح بذات خود ایک نورانی حقیقت ہے جس کی مثل بعینہ ایک صاف اور شفاف آئینہ کی سی ہے جو ہر قسم کے غبار و زنگ اور دیگر کدورت سے بالکل پاک و صاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام گذشتہ اور آئندہ زمانہ کے متعلق بعض امور

کی خبر بلا کم و کاست دیدیا کرتے ہیں۔ اور یہ امر یہ دئے واقعات یقیناً صحیح اور قابل تسلیم ہے اور اس کا انکار محض جہالت اور بے علمی پر مبنی ہے۔ اگر رُوح بجائے خود ایک حقیقت مجرورہ نورانیہ نہ ہوتی۔ تو ہمیں مادی اصول کے رُوسے کوئی صحیح توجیہ اس امر کی نسبت معلوم نہیں ہوتی جس پر گذشتہ یا آئندہ واقعات کی خبر دنیا صحیح تسلیم کیا جاسکے۔ ہم منکرین حقیقت رُوح سے توجیہ مذکورہ بالا کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کون سے اصول ہیں جن پر مقدس بزرگان ملت نے امور غیبیہ پر اطلاع حاصل کی ہے اور جس کی تصدیق پورے طور پر تمام لوگوں نے کی ہے؟ شب محراب کے واقعات کے متعلق کفار مکہ کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بیت المقدس اور دیگر امور کی بابت سوال کرنا اور آپ کا صحیح صحیح جواب دینا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تصدیق خود ان منکرین کفار نے کر دی۔ حالانکہ حضور علیہ السلام کا بیت المقدس تشریف لے جانا کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔ اسی طرح نجاشی شاہ حبشہ ملک حبش میں وفات پاتا ہے اور حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔ اٹھو اپنے بھائی نجاشی کا جنازہ پڑھو۔ علی ہذا خبر و پرویز ایران میں اپنے بیٹے کے ہاتھ سے مقتول ہوتا ہے اور حضور علیہ السلام مدینہ میں اس کے ان قاصدوں کو جو حضور کی خدمت میں حاضر تھے ان کے بادشاہ کے ہلاک ہونے کی خبر دیتے ہیں کہ آج رات خدائے تعالیٰ نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات کتب سیر و تاریخ میں بروایات صحیحہ مذکور ہیں۔ بجز انبیاء علیہم السلام کی شان تو کہیں بہت ہی بلند ہے۔ امت مہوم میں ایسے ہزاروں بزرگان دین گذر چکے ہیں جنہوں نے امور غیبیہ کی صحیح صحیح اطلاع دی جس کی صحیح طور پر پوری پوری تصدیق ہو گئی۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صحیح تاریخی واقعہ ہے کہ آپ نے ساریہ نام اپنے سپہ سالار کو جو بہاؤند علاقہ ایران میں جہاد کر رہا تھا اثنائے خطبہ میں منبر پر اُٹھا و فرمایا یا ساریہ الخیل یعنی لے ساریہ اپہاڑ کی جانب ہو جاؤ۔ چنانچہ ساریہ یہ آواز سننے ہی پہاڑ کی جانب ہوئے

اور دشمن پر فتح پائی۔ مدینہ اور تہاوند میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہے۔
 دہلی کے مشہور حکمران رائے پتھورائے جو پرہتشی راج کے نام سے مشہور ہے حضرت
 خواجہ اجیمیری علیہ الرحمۃ کی گرفتاری کا حکم دیا۔ آپ نے ایلیچیوں کو مخاطب ہو کر فرمایا۔
 ”رائے پتھور امر چھی گوید۔ باؤ اور زندہ گرفتہ بدست پادشاہ اسلام سپرویم۔ چند روز
 نہ گذرنے پائے تھے کہ شہاب الدین غوری کو ہستان مغربی سے اپنا لالو لشکر لے کر
 دہلی پر چڑھ آیا اور پرہتشی راج کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔
 کچھ عرصہ گذرا کہ میں نے مصر کے ایک مشہور رسالہ میں یہ واقعہ پڑھا تھا کہ ایک شخص
 امریکہ میں فوت ہوتا ہے اور مصر میں اپنے بھائی کو خواب کی حالت میں یہ کہتا ہے کہ میں
 مرتا ہوں۔ میرے حساب کتاب کے کاغذات فلاں فلاں جگہ رکھے ہیں اور ان کی تفصیل
 کے لیے بھی فہمائش کر دی۔ چنانچہ وہ کاغذات جن کی تفصیل اس نے اپنے بھائی سے
 سستی تھی اسی طرح پائے گئے۔ بعد میں تحقیق کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ اسی رات اس کی
 موت واقع ہوئی۔

اس قسم کے نظائر کہیں ہزاروں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں جن کا انکار محض تعصب
 اور جہالت پر مبنی ہے کیا منکرین حقیقت روح کے پاس مادی اصول کے رُوسے کوئی
 صحیح توجیہ ہے مگر یہی فتن ہے کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں

اس بیان سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ روح ایک حقیقت نورانیہ کا نام ہے جو
 اپنے کمالات کے رُوسے عل اور اک میں قوائے جسمانیہ کی محتاج نہیں اور اس کا بلاچون
 تسلیم کر لینا موجب سعادت ہے اور انکار موجب شقاوت۔
 والتوفیق من اللہ تعالیٰ
 جو ہشوی سخن اہل دل گو کہ خطا ست
 سخن شناس نہ دل برا خطا اینجا ست

روح فانی نہیں

جب یہ معلوم ہو چکا کہ رُوح انسانی بدن سے ایک علیحدہ حقیقت کا نام ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا بدن کی موت کے ساتھ رُوح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ یا یہ کہ فنا صرف بدن کیلئے ہے اور رُوح باقی رہتی ہے۔ جہور اہل اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بدن سے قطع تعلق ہو جانے پر رُوح حسبِ اعمال خوشی یا رنج کی حالت میں باقی رہتی ہے کیونکہ بدن صرف اس کے لئے محلِ تصرف تھا۔ اس لئے بدن کے مرجائے پر صرف اس کا محلِ تصرف فانی ہو جاتا ہے نہ یہ کہ وہ خود فانی ہو جاتی ہے۔ جو لوگ بدن کے مرنے کے بعد پھر قبر میں یا قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کا اس بنا پر انکار کرتے ہیں۔ کہ رُوح کا بغیر بدن کے قائم رہنا ناممکن ہے۔ ان کا انکار ایک بے منہی سی بات ہے کیونکہ رُوح کا بغیر بدن کے باقی رہنا کوئی ناممکن امر نہیں۔ بلکہ اس کا بدن کے ساتھ تعلق حاصل کرنا بظاہر خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ رُوح کو جسم کے ساتھ اس قسم کا تعلق حاصل نہیں جیسے عرض کو اپنے جوہر کے ساتھ تعلق ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ عرض بغیر جوہر کے کوئی وجود نہیں رکھتا مثلاً سیاہی جو جسم سے علیحدہ ہو کر نہیں پائی جاسکتی۔ اس لئے رُوح بذاتہ قائم ہے اور اپنی ذات اور اپنے خالق کا علم رکھتی ہے اور اس علم کے حصول میں وہ خارجی محسوسات کی محتاج نہیں ہوتی۔ بلکہ تعلقِ بدن کی حالت میں بھی وہ تمام محسوسات خارجیہ سے فافل ہو سکتی ہے۔ مگر وہ اپنی ذات اور اپنے خالق کی احتیاج سے کبھی فافل نہیں ہو سکتی اور اگر ذکر اللہ اس پر غالب آ جائے اور دوامِ ذکر کی توفیق حاصل کر لے تو تمام اشیائے ماسوی اللہ اس کے ذہن سے اُتر جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اپنی ذات سے بھی فافل چلا جاتی ہے۔ اس مقام پر اس کو کسی محسوس و معقول امر کا شعور تک نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اُسے یہ بھی

شعور میں ہوتا کہ وہ اپنی بہتی کے شعور سے غافل ہے چونکہ اس نظام پر اس کو شعور حق کے
 سوا کسی امر کا شعور نہیں رہتا۔ اور شعور حق قوی اور آلات بدنہ کا محتاج نہیں اس لئے
 روح اپنی ذات کی رو سے قطعاً بدن کی محتاج نہیں ہے کیونکہ بدن اور اس کے آلات
 کی ضرورت صرف محسوسات خارجیہ کے اور لک کے لئے ہوا کرتی ہے۔ لہذا بدن
 سے قطعاً تعلق کر لینے پر عالم مادی سے اس کا قطع تعلق تو ہو جاتا ہے مگر محتاجی غیر مادی
 سے قطع تعلق نہیں ہو سکتا۔ اگر روح کی اس حقیقت کو کوئی شخص کما حقہ سمجھ لے تو
 اسے یقین ہو جائیگا کہ بدن سے علیحدہ ہونے پر وہ بذاتہ باقی رہ سکتی ہے رہا یہ امر کہ
 قبر میں یا قیامت کے دن اسے پھر بدن کے ساتھ کس طرح اتصال ہوگا۔ سو اس کا جواب
 یہ ہے کہ روح کے بدن کے ساتھ اتصال کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ روح بدن
 میں متصرف ہے اور وہ بدن کو اپنا منکر کر سکتی ہے سو مرنے کے بعد بارادہ الہی وہ
 بدن کو اپنے تصرف اور تغیر میں لاسکتی ہے اور روح کے اس تصرف و تغیر کا تسلیم
 کرنا کوئی ناممکن بات نہیں کیونکہ ہم بعض مادی اشیاء کا اس امر کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ
 باوجود ایک شے کے دوسری شے کے ساتھ متصل نہ ہونے کے ایک دوسری شے کو
 اپنی تغیر و تصرف میں لاسکتی ہے سو روح جو ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ غیر مادی
 حقیقت ہے بدرجہ اولیٰ ایسے تصرف و تغیر کی مالک ہوتی ہے۔ چنانچہ زمانہ حال میں
 ملک امریکہ کے ایک خاص علاقہ میں ایک ایسے بڑے درخت کا پتہ لگایا گیا ہے کہ
 حیوانات جس کی غذا ہیں۔ اگر کوئی جاندار چیز اس کے نیچے یا اس کے قریب پہنچ جائے
 تو وہ اپنی برقی کہر مانی طاقت سے اسے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اس حیوان کے جسم
 سے اجزاء غذا ایسے کو جذب کر لیتا ہے اور وہ حیوان مروہ ہو جاتا ہے۔ ایک سیارح نے
 جو اسی مصیبت میں تہلہ مکر مشکل سے بچ نکلا تھا۔ ایک طویل داستان میں اس موقع کو
 قلمبند کیا ہے جو خاکسار مؤلف نے خود پڑھا ہے۔ آفتاب ہی کو لو کہ کئی ملین میل کے فاصلہ

مختلف جھص کے ساتھ متعلق ہو کر ایک قسم کی کثرت کا محل قرار پاتی ہے۔ پھر عالم برزخ میں جو عالم مادی اور غیر مادی کے درمیان کی حالت کا نام ہے ایک دوسری حالت کو محال کر لیتی ہے یعنی وہ ایک ایسی صورت اختیار کر لیتی ہے جو اس کی مادی صورت کا شنی کھلاتی ہیں اور جسمانی زندگی میں ہی صورت مجودہ بدن میں اسی طرح سرایت کئے ہوئے ہے جیسے سبب شراخ میں پانی اور وہ جسم مردہ میں پس لائی جاتی ہے اور اس سے سوال کیا جاتا ہے (جو سوال قبر کے نام سے مشہور ہے) امام حجت الاسلام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ روح جب بدن سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو اپنی وصف ناطقیت کی وجہ سے خصوصاً خارجہ کے معانی کا اور لک بدستور کرتی رہتی ہے کیونکہ سببیت جسمانی سے اس کا باطنیت مجرور ہونا ناممکن ہے اور وہ موت کے وقت اپنی موت کا شعور رکھتی ہے اور موت کے بعد اپنے تئیں عالم خیال کی صورت میں مشاہدہ کرتی ہے اور وہ اپنی مادی زندگی میں جو عقائد رکھتی تھی ان کا تصور کرتی رہتی ہے اور قبر میں اسے سوال کا شعور بھی ہوتا رہتا ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات میں لکھتے ہیں کہ موت دو قسم کی زندگی کے درمیان ایک حالت برزخی کا نام ہے جس میں روح جسم برزخی خیالی اسی طرح حاصل کرتی ہے جس طرح نیند کی حالت میں وہ ایک جسم خیالی کو حاصل کرتی ہے اور یہ خیالی جسم اس موجودہ مادی جسم ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ برزخی حالت بمقابلہ آخرت کی زندگی کے ویسی ہی سمجھی گئی ہے جیسے عورت کے پیٹ میں جنین کی حالت مختلف اطوار میں متغیر ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ ماں کے پیٹ سے باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح برزخی جسم قیامت کے دن ایک نئی دلاوت حاصل کر گیا۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ مرنے والے کی موت پر اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ عالم آخرت کے لئے ولادت کے آثار کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ عالم برزخ کو قیامت کے دن سے ہی نسبت ہے جو ماں کے پیٹ میں رہنے کی حالت کو دنیاوی زندگی سے

پھر ذوات کے دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی روح کو اس مادی صورت کا مدبر بنایا ہے خواہ وہ دنیا میں موجود ہے یا برزخ یا دار آخرت میں۔ سب سے پہلی صورت جو اُسے دی گئی۔ وہ یوم شیاق کی صورت تھی جبکہ اس سے رابطہ کا اقرار لیا گیا تھا۔ پھر اس صورت سے علیحدہ ہو کر وہ اس مادی صورت میں منتقل ہوئی۔ جو دنیوی زندگی میں اس کو دینی جاتی ہے۔ اور ماں کے پیٹ میں چوتھے مہینہ سے شروع ہو کر موت تک اس کو حامل رہتی ہے۔ پھر جب مر جاتا ہے تو موت کے وقت سے سوال قبر کے وقت اس کو ایک دوسری صورت دی جاتی ہے اور سوال کے وقت سے اس کو پھر وہی صورت دی جاتی ہے جس پر موت طاری ہوئی تھی اور اسی صورت کے ساتھ وہ زندہ کیا جاتا ہے۔ روح کی اس زندگی کو حکمت خداوندی کی بنا پر لوگوں کے آنکھ اور کان میں نہیں کرتے۔ البتہ خواص انسان آگاہ ہو سکتے ہیں۔ سوال قبر کے بعد عالم برزخ میں ایک اور صورت دی جاتی ہے جو قیامت کے دن تک اس کو حاصل رہتی ہے۔

[تنبیہ] روح کے مختلف صورتوں میں منتقل ہونے سے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس صورت میں روح کے لئے تجربہ کیسے ہوا کیونکہ تجربہ سے مراد اس عالم مادی سے تجربہ کا حاصل ہونا ہے نہ کہ جمیع عوالم سے۔ جبکہ اس عالم دنیا کے علاوہ اور بھی بہت سے عوالم ہیں جن میں بعض بعض کی نسبت زیادہ لطیف ہیں اور وہ سب کے سب اس عالم مادی سے بالکل علیحدہ نوعیت کے ہیں]

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ انسانی روحیں ایک دوسرے سے متمیز ہیں اور اپنی ٹھکان رکھتی ہیں اور بدین سے علیحدہ ہوتے پر باہم متعارف ہوتی ہیں کیونکہ اہل سنت اس بات کے قائل ہیں کہ روح ایک ایسی ذات ہے جو بے نفسہ قائم ہے اور اوپر اور نیچے کی طرف آمد و رفت کرتی ہے اور وہ اپنے بدن سے ایک ایسی صورت حاصل کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسری روحوں سے متمیز ہوتی ہے۔ کیونکہ روح بدن سے اسی طرح متاثر ہوتی ہے

جس طرح بدن روح سے اور ایک کے نیک و بد کا اثر دوسرے پر ہوتا ہے بلکہ جسم سے علیحدہ ہونے پر روح کا متمیز ہونا اور بھی زیادہ واضح ہوتا ہے کیونکہ بدن اکثر آپس میں مشتبہ ہو جاتے ہیں اور روحوں میں اشتباہ نہیں ہو سکتا۔ ظاہر صورت کو روح انسانی کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہوتی ہے جس پر روح و بدن کی ترکیب کا مدار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اہل فرست ظاہر شکل سے کسی شخص کے باطن کا پتہ لگاتے ہیں اور جب مالک جو مادی کیفیات سے ماری ہوتے ہیں باہم متمیز ہیں تو انسانی روحیں کیوں متمیز ہو گئی۔

ابن تیم اور امام غزالی کا علیحدہ علیحدہ خیال شیخ ابن عربی کے خیال سے جو تباہ صورت کی بابت اوپر بیان ہوا ہے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن اگر شیخ کے قول کی یونہی جیہ کریں کہ مختلف صورتوں کے بدلنے کے ساتھ جسم مادی کی ہیئت اور اس کا اثر ان صورتوں کے ساتھ لازم رہتا ہے جیسا کہ بدن سے علیحدہ ہونے پر روح کو مادی جسم کے ساتھ ایک قسم کا تعلق باقی رہتا ہے۔ خواہ وہ برزخ کی کسی حالت میں ہو تو پھر نظائر کچھ مخالفت نہیں ہوتی۔

واضح ہو کہ مابعد الموت کے حالات چونکہ عالم مادی سے عالم برزخ سوال قبر کی طرف منتقل ہو جانے کے متعلق ہیں اس لئے ان کے متعلق یہ بحر

شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خبر کے ہمارے پاس کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ عقل انسانی اس امر کے متعلق کچھ تجویز نہیں کر سکتی البتہ اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح ماں کے پیٹ میں بچہ مختلف قسم کے اطوار میں منتقل ہوتا ہے اسی طرح ماں کے پیٹ سے علیحدہ ہو کر میرے تنگ بھی اس کو مختلف اطوار میں منتقل ہونا پڑتا ہے کیونکہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ موت کے آنے پر عالم مادی سے علیحدہ ہو کر انسان عالم برزخ میں ایک نئی ولادت حاصل کرتا ہے اور پھر قیامت کے دن ایک اور نئی ولادت کا حاصل ہونا ضروری ہے تو لابد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عالم برزخ اور قیامت کے دن اس کی ہر دو ولادت پر بھی مختلف قسم کے اطوار میں انسان کا منتقل ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ

آیہ لترکبن طباقن طبق کی پی تشریح کی گئی ہے جس کا عریح مفہوم یہ ہے کہ تہیں مختلف
مدارج احوال میں متغلب ہونا ہوگا۔ اس بے ہم صحیحین کی ایک حدیث کی بنا پر سوال قبر کے
عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں اس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جب میت کو
قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے متیقن واپس آجاتے ہیں تو صاحبِ قرآن کے جو توں
کے آہٹ کو بھی سنتا ہے تب وہ فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور اس کو بٹھو دیتے ہیں
اور پوچھتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے۔ اور یہ آدمی (حضور علیہ السلام) جو تم میں مبعوث
ہوا تھا کون ہے۔ اس سوال پر مومن تو یہ جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور یہ شخص
محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو دلائل حقہ اور ہدایت لیکر ہم میں مبعوث ہوئے
اور ہم ان پر ایمان لائے اور ان کے پیرو کہلائے پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ دلہن کی
سی میخی منیدیں سو یا کرو۔ اور منافق یا فاجر آدمی (مذکورہ بالا سوال کے جواب میں)
یہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا سو میں نے بھی کہہ دیا تب وہ
اسے کہتے ہیں کہ تو نے نہ تو جانا اور نہ پڑھا پھر اسے اپنی گرز سے مالتے پٹیتے ہیں ۛ

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف
سوال قبر روح اور بدن ہر دو سے ہوگا

ہر دو سے ہوگا حتیٰ کہ اس شخص سے بھی سوال ہوگا جس کو درندے کھا گئے ہیں یا سے
دفن نہ کیا گیا ہو۔ ہم اس کی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اس لئے بعض خیال کا
یہ خیال کہ قبر کھولنے پر ہم اس کیفیت سوال اور ثواب و عذاب کی نسبت کچھ محسوس نہیں
کرتے بالکل بے حقیقت اور بے معنی خیال ہے مثال کے طور پر اسے یوں سمجھنا
چاہیے کہ وہ شخص سو رہے ہیں جن میں سے ایک تو بحالت نوم اپنے تئیں راحت و
خوشی میں پاتا ہوا دوسرا اسی حالت میں اپنے تئیں سرج و عذاب میں دیکھتا ہو
جو لوگ بیداری کی حالت میں ان کے پاس بیٹھے ہیں انہیں ان دونوں کی حالت کا

کچھ بھی احسان نہیں ہوتا۔ مگر جب دونوں بیدار ہوتے ہیں۔ تو اپنے اپنے ماحر کو ان کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح فقہ الکبریٰ لکھتے ہیں کہ روح انسانی کو بدن کے ساتھ پانچ قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ جن میں سے ہر ایک نوع کے احکام علیحدہ علیحدہ ہیں۔ پہلا تعلق بحالت ہنس ہوتا ہے۔ دوسرا ولادت پر حیاتِ زندہ رہتا ہے۔ تیسرا نیند کی حالت میں جس کی نسبت ہم کہتے ہیں کہ وہ زندہ بھی ہوتا ہے اور مردہ بھی۔ چوتھا مرنے کے بعد عالم برزخ میں کیونکہ اس حالت میں بھی گو بدن سے وہ مجرور ہو چکا ہے۔ مگر باکلیت اس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کو بدن کی طرف ایک گونہ التفات باقی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبِ قبر کو سلام بھیجا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ دفن کر کے واپس آنے والوں کے جوتوں کی آہٹ کو بھی سنتا ہے اور یہ ایک خاص قسم کی حیات ہے جو دنیوی حیات سے علیحدہ ہے۔ پانچواں قیامت کے دن جب اجسام زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے۔ اور یہ تعلق نہایت مستحکم اور مضبوط ہے۔ کیونکہ اس کے بعد پھر اُسے موت۔ نیند یا اور کسی قسم کا فساد لاحق نہیں ہوگا۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ عالم دنیا کے احکام بدن پر عاید ہوتے ہیں۔ اور بدن روح کے تابع سمجھا جاتا ہے اور مشرور و نشر کے احکام روح اور بدن دونوں پر عاید ہوتے ہیں۔

یہ مسئلہ عام طور پر متنازع فیہ ہے۔ کہ آیا صاحبِ قبر سنتا
سماع میت اور جواب دیتا ہے یا نہیں۔

مندرجہ بالا حدیث سے صاف طور پر واضح ہے کہ اہلِ قبور سنتے اور جواب دیتے ہیں اور ایک دوسری حدیث میں قبر پر گزرنے والوں کو حکم ہے کہ وہ قبر والوں کو بدیں الفاظ

۱۵ ملاں رحمۃ اللہ کا یہ بیان شیخ اکبر محی الدین بن عربی کے بیان سے ایک تخیل سے تفاد کے ساتھ متحد سمجھنا چاہیے۔ جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں (۱) واللہ اعلم بالصواب ۱۲۷ھ

سلام کہیں۔ السلام علیکم یا اهل القبور یعنی اللہ لنا ولکم سبق تمونا وانا انشاء اللہ
 بکم لاحقون۔ اگر اہل قبور سماع نہیں کہتے تو انہیں مخاطب بنانے کے کیا معنی ہیں
 مع ہذا غزوہ بدر کے موقع پر جن کفار کے سروں کو گویں میں ڈال دیا گیا تھا۔ حضور
 علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ان سے خطاب کرنا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس سوال
 پر کہ یا رسول اللہ کیا یہ سنتے ہیں آپ کا یہ فرمانا کہ ہاں سنتے ہیں مگر جواب نہیں دے سکتے
 سماع میت کے متعلق قطعی حجت ہے۔ نیز حضرت ابن عباس کی اس حدیث سے مامون
 بن یزید اخیه المؤمن الذی کان یعرفہ فی الدنیا۔ فسیلہ علیہ الاعرقہ ورد
 علیہ السلام یعنی کوئی شخص جب اپنے کسی مؤمن بھائی کی قبر پر گذرتا ہے جسے وہ دنیا
 میں پہچانتا تھا۔ اور اسے سلام کہتا ہے۔ تو صاحب قبر اس کو پہچانتا ہے اور اس کے
 سلام کا جواب دیتا ہے۔ سماع میت کے دعویٰ کی پوری تصدیق کرتی ہے۔ ان
 احادیث کے برخلاف جو توجہات رکیکہ کی جاتی ہیں وہ اس قابل نہیں کہ ان کی طرف کچھ
 التفات کیا جائے۔ البتہ متکرمین سماع موتی حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے
 انکار سماع کو حجت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ جب آپ سے سماع موتی کی بابت
 پوچھا گیا تو آپ نے قرآن مجید کی ان آیات سے استدلال کیا۔ اذ لا تسمع الموتی
 اور آیت وما انت بمسمع من فی القبور مگر ایک محقق جو اصول تفسیر سے آگاہ ہے
 جانتا ہے کہ ان ہر دو آیات کا حکم عام بقاعدہ مامون عام الا وقد خصی منه البعض
 اپنے عموم پر باقی نہیں رہا بلکہ مذکورہ بالا احادیث اس کی تخصیص کرتی ہیں۔ مع ہذا اس
 میں اسماع کی نفی ہے نہ کہ سماع کی چنانچہ آیت کا اگلا حصہ واللہ یسمع من یشاء وهو
 علی کل شیء قدير اس دعویٰ کی تائید کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ شیخ ابن تیمیہ نے اپنے
 ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ جو شخص سماع موتی کا انکار کرتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ
 علیہ وسلم کی صحیح حدیث کا انکار کرتا ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ حضرت ام المؤمنین کا اپنا

مجتہدانہ خیال تھا اور چونکہ اس وقت تک احادیث کی تدوین و ترتیب نہیں ہوئی تھی اس لئے انہیں احادیث صحیحہ موصول نہیں ہوئیں۔ اب جبکہ احادیث پر شرح و تفسیر ہو چکا ہے سماع موتی کا انکار محض ہٹ دھرمی ہے حافظ ابن قیم نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب جو کتاب الروح کے نام سے منسوب ہے لکھ کر پوری تحقیق کی ہے سوال قبر کے متعلق یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب میت سے سوال ہوتا ہے تو لامحالہ اسے زندہ ماننا پڑے گا۔ سو اس کے متعلق حافظ ابن قیم نے نہایت عمدہ جواب دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ قبر میں میت کو جو حیات حاصل ہوتی ہے۔ وہ دنیا کی محدود حیات نہیں ہے جس میں روح بدن کے ساتھ ایسا تعلق رکھتی ہے کہ وہ بدن کی تصرف و تدبیر ہوتی ہے (کیونکہ تصرف و تدبیر کے لئے قویٰ بدن کی ضرورت ہے جو مرکب موقوف ہو چکیں ہوں) البتہ بدن کو ایک دوسری قسم کی حیات حاصل ہوتی ہے جس سے انسان سوال کے جواب دینے پر لذت پاتا ہے اور اس حیات کی مثال جہنم ایسی ہے جیسے ایک سونے والا شخص جو نہ تو مردہ ہوتا ہے نہ زندہ یہی وجہ ہے کہ نیند کی نسبت النوم ارجح الموت واروہو ہے (سونے والا زندہ ہی ہے کیونکہ وہ مردہ نہیں اور مردہ ہی ہے کیونکہ اس کے حواس و اعضا معطل ہوتے ہیں۔ یہی حیات قبر کا حال ہے وہ موت اور حیات کے مابین ایک حالت کا نام ہے۔

عذاب قبر کے متعلق آیۃ الناریہ منون علیہا عذاب وادعشیانض صریح ہے یعنی فرعون اور اس کے ساتھیوں کو صبح و شام جہنم کے سامنے لایا جاتا ہے اور چونکہ آیت کے الگ حصے میں عذاب قیامت کا اشتراک العذاب کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے یقیناً صبح و شام کے عذاب سے عالم برزخ ہی کا عذاب مراد

لے خاکسار مولف کو بھی حافظ ابن قیم کے جواب کے مطالعہ کرنے سے پہلے اپنے دل میں یہی جواب چھا تھا اور

ہے اور اسی کا نام عذاب قبر ہے صحیح مسلم میں بروایت ابن جریج رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ
 ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے دعا کی کہ خدایا مجھے میرے زوج (رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم) اور میرے باپ (ابوسفیان) اور میرے بھائی (معاویہ) سے متمتع
 کیجئے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے اللہ تعالیٰ کے معینہ بہتوں
 اور حمد و وہ ایام اور مقومہ روزیوں کی بابت سوال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان میں ہر گز
 پس پیش نہ کرے گا۔ اگر تو نے عذاب جہنم اور عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگی ہوئی
 یہ سب سے بہتر بات تھی۔

عامہ مؤمنین اور شہداء کے لئے نعمت و راحت کے حصول پر شاہدین چنانچہ

سورہ واقعہ کی آیت ناما ان کان من المقبرین فمروءح ورحمان وجنت نعمر
 میں غور کرو کہ حرف فا جو لفظ روح پر واقع ہوا ہے صاف پتہ دے رہا ہے کہ جسد
 عنصری سے علیحدہ ہوتے ہی مرنے والی روح ان العامات کو چل کر قیامت ہے اور
 اسی طرح کفار کے لئے بھی موت کے ساتھ ہی کھولتے ہوئے گرم پانی اور آتش
 و فرخ کی خبر سنادی۔ اس آیت کی تفسیر کے لئے اس حدیث میں غور کرو القبر
 امار و منہ من ریاض الجنة او حضرة من حفر النار یعنی قریا تو جنت کا ایک
 باغ ہے یا جہنم کا ایک گڑھا ہے۔ مگر شہدا کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے حیث قال
 ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون
 اس آیت شریفہ میں شہدا کی جس حیات کا ذکر آیا ہے اس کی نسبت اہل تحقیق کا یہ مذہب
 ہے کہ شہدا قبر میں روح مع البدن کی حالت میں زندہ رہتے ہیں چنانچہ امیر معاویہ کی
 نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے قبور شہدا پر ایک چٹمہ جاری کرنا چاہا۔ حکم دیا کہ اس شخص
 کا کوئی رشتہ دار اس جگہ مدفون ہے وہ اسے قبر سے نکل لے۔ جابر فرماتے ہیں کہ ہم

نے جیب شہد کو نکالا تو ان کے بدن بدستور تازہ تھے چنانچہ ایک شہید کی پنڈلی پر
کھووتے وقت کدال لگ گئی تو اس سے خون بہنے لگا۔ فضائل شہداء میں بہت سی حادثات
وار ہو چکی ہیں جن کا ایراد یہاں ہم نہیں خیال کیا جاتا۔

عذابِ قبر

عذابِ القبر قرآن و سنت صحیحہ سے ثابت ہے جو امور عالم برزخ یا عالمِ آخرت یا
موجودات غیر مریئہ سے تعلق رکھتے ہیں ان میں علوم عقلیہ سے ہم کوئی استدلال پیش نہیں
کر سکتے۔ ان کی نسبت مخبر صادق نے بذریعہ وحی قطعی جو کچھ میں بتلادیا ہے وہی ہمارا
ایمان ہے۔ عذابِ القبر منجملہ ایسے امور کے ہے جو عالم برزخ سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے
کتاب اللہ اور سنت صحیحہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے گو ہم بذریعہ حواس اس کی کیفیت
کا احساس نہیں کر سکتے۔ معتزلہ میں عذابِ برزخ اور بعض خواص عذابِ القبر کا
انکار کرتے ہیں دلیل ان کی یہ ہے کہ قرآن مجید میں وارد ہے کہ رَبَّنَا آمَنَّا بِأَنَّ لَكَ
أَحْيَتِنَا أَمْثَلُ مِنْ أَوَّلِنَا (خدا یا تو نے ہمیں دُودِ دفعہ مارا اور دُودِ دفعہ زندہ کیا) یعنی پہلے
عدم میں تھے جو بمنزلہ موت کے ہے پھر پیدا ہوئے۔ بعد ازاں موت آئی اور مر گئے۔
پھر قیامت کو زندہ ہونگے۔ گویا دُودِ دفعہ موت اور دُودِ دفعہ زندگی کا مرحلہ طے کرنا
پڑا۔ اگر عذابِ القبر کو تسلیم کیا جائے تو تین دفعہ زندہ ہونا لازم آئے گا۔ اسی طرح یہ
لوگ اِیْہِ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَآتًا فَاحْیَا کُمُ اللّٰہُ..... الخ کو
بھی بطور دلیل پیش کرنے میں اور دُودِ دفعہ موت اور دُودِ دفعہ زندگی کا مفہوم پیدا
کر کے عذابِ القبر کا انکار کر دیتے ہیں۔

واضح ہو کہ مذکورہ بالا دلیل قائلین عذاب القبر کے مخالف صرف اسی صورت میں
 صحیح ہو سکتی ہے جبکہ قائلین قبر میں حیم مع روح کا زندہ ہونا تسلیم کرتے ہوں لیکن کتاب
 و سنت سے قبر میں حید غصری زندہ ہونا کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ حید غصری دوبارہ
 زندہ ہونا صرف قیامت کے دن ہوگا۔ عذاب قبر صرف روح انسانی سے مخصوص ہے
 اور وہ قیامت کے عذاب کے لئے پیش خمیہ ہے۔ قرآن مجید میں ل فرعون کی بابت
 یوں وارد ہے۔ النَّارُ كَيْفَ مَوْنٌ عَلَيْهِمْ غَدُ وَاَوْعَشْتِیَا وَلَیَوْمٌ تَقُومُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوا
 اِلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ یعنی وہ لوگ صبح و شام آگ کا عذاب دیئے جاتے
 ہیں اور جب قیامت کا دن ہوگا تو حکم ہوگا کہ فرعونوں کو سخت سے سخت عذاب میں ڈال
 دو۔ اس آیت سے صریح طور پر واضح ہے کہ قبل از قیامت عذاب کا ہونا مستحق ہے۔
 پھر دوسری جگہ یوں وارد ہے۔ "وَلَوْ تَرَىٰ اِذَا الظَّالِمُنَّ فِیْ عَذَابَاتِ الْمَوْتِ الْمَلَائِكَةُ
 بَاسِطُوْا اَيْدِیْهِمْ اَخْرِجُوْا اَنْفُسَكُمُ" یعنی اگر تم اس حالت کو مشاہدہ کرتے جبکہ
 ظالم لوگ موت کے شہائد میں مبتلا ہوتے ہیں اور ملائکہ جواروح قبض کرتے ہیں ان
 کے سروں پر ہاتھ پھیلانے یہ کہ رہے ہوتے ہیں کہ اپنی رُوحوں کو باہر نکالو۔ آج تم اپنی
 سرکشوں کے عوض ذلت کا عذاب دیئے جاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت قبل از قیامت
 واقع ہوگی نہ قیامت کے دن۔ کیونکہ الفاظ الْیَوْمَ تَجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ میں
 لفظ الْیَوْمَ سے مرنے کا دن مراد ہے نہ قیامت کا۔ پھر فرمایا۔ اِنَّا تَوْفُوْنَ لِحُورٍ
 یَوْمَ الْقِیَامَةِ یعنی تم قیامت کے دن پوری پادشاهوں کے لئے جاؤ گے۔ ان الفاظ سے
 صاف معلوم ہو رہا ہے کہ قبل از قیامت بھی حرب اعمال نیک و بد کچھ نہ کچھ ثواب و عذاب
 جاری رہتا ہے۔ مع ہذا وہ لوگ جو کشف والہام کا رتبہ رکھتے ہیں اپنے ذاتی مشاہدات سے
 عذاب القبر کی خبر دیتے ہیں اور احوال صحیحہ میں عذاب القبر کی نسبت پوری پوری تصریح
 کر دی گئی ہے۔ اور عقلی طور پر بھی ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ انسان مرنیکے بعد

دارالاحل میں داخل ہو کر بتدیج اس حالت کو پہنچا تھا جس میں شرعی طور پر اسے ٹیک وید کا جواب دہ ہونا ضروری ہو جاتا ہے اسی طرح دارالخزائن بھی بتدیج موقع حساب تک لایا جائیگا جہاں اسے اپنے اعمال کا ٹیک وید نتیجہ دیکھنا ہو گا یعنی جس طرح دنیا میں آتے ہی پتھر بتدیج ارادی حرکات و سکنات میں مشغول ہونے لگتا ہے اور ایک خاص مدت پر اس کے حرکات و سکنات قابل مواخذہ ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح مرنے پر معاً اعمال کی جزا ٹیک وید کے آثار پیش آنے لگتے ہیں اور بتدیج موقع حساب تک لایا جاتا ہے کیونکہ جس طرح دنیا میں آنا ایک نئی زندگی اختیار کرنا سمجھا جاتا ہے اسی طرح دنیا سے علیحدہ ہونے پر عالم آخرت کی ولادت کا وقت ہوتا ہے اور قیامت اعمال کی جوابدہی کا عذاب قبر سے مراد صرف وہ عذاب ہے جو مرنے کے بعد معاً مرنے والے پر عائد ہوتا ہے سو جہاں روح کا ٹھکانا ہوگا وہیں اسے عذاب و ثواب کا متحمل ہونا پڑیگا۔ لفظ عذاب کو قبر کی طرف محض ان عذاب و اکثر حالات کے خیال سے مضاف کیا گیا ہے خواہ مرنے والا ہر مندوں کے پیٹ میں چلا جائے یا میدان جنگ میں مارا جائے اللہ تعالیٰ کا ہر طرف سے مالک نہ رحمت یا مالک نہ عذاب جھٹ آ موجود ہوتے ہیں کیونکہ جو پیتر عذاب و ثواب کا مورد بنتی ہے اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ مرنے والے کا جسم کسی خاص صورت میں زیر زمین مدفون ہو۔

آثار صحیحہ میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کی نسبت یوں مذکور ہے کہ اس نے خوف عذاب سے اپنے پس ماندوں کو وصیت کی کہ اس کو ریزہ ریزہ کر کے چلا دیں اور اس کی خاک کو دریا میں بہا دیں جب وہ مرا تو مقام سوال و جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے سوال کیا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا کہ خدایا تیرے عذاب سے ڈر کر۔ حکم ہوا اس شخص کو چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ ہمارے عذاب سے ڈرا ہے جس سے اس کا ہمیں اپنا مالک اور اللہ تسلیم کرنا پایا جاتا ہے اسلئے معلوم ہوا کہ عذاب کے

لے زیر خاک مدفون ہونا شرط نہیں ہے

امام ابن حزم ظاہری لکھتے ہیں "کل میت فلا بد له من قنطرة وسؤال و بعد ذلك سمعوا أوتكيد إلى يوم القيامة فيرفون حينئذ أجورهم وينقلون إلى الجنة والنار..... وكل مكان يستقر فيه النفس إثر خسر وجهها من الجسد فهو قبر لها إلى يوم القيامة" یعنی ہر ایک مرنے والے کے لئے امتحان اور سوال و جواب کا ہونا ضروری ہے جس کے بعد وہ قیامت تک یا تو سرور کی حالت میں رہے گا یا سختی میں رہے گا اور قیامت کے دن ہر ایک شخص کو اس کے اعمال کی پوری پوری پاداش دیکھائی جائے گی۔ پھر جنت یا جہنم کی طرف متوجہ ہوئے گا..... اور روح کے جسم سے نکلنے کے بعد جہاں وہ ٹھہری وہی جگہ قیامت تک اس کی قبر ہے۔ یہ خیال کہ مرنے والا شخص قبر میں بیٹھ اسی طرح زندہ رہتا ہے جس طرح وہ دنیا میں زندہ تھا بالکل غلط ہے۔ اس کا قرآن و حدیث صحیح میں کہیں بھی ذکر نہیں ایسا زندہ ہونا صرف قیامت کو ہوگا۔ اے اللہ یتوفی الانفس حين موتها..... الی اجل مستحی" میں غور کرو جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وقت معین سے پہلے کوئی شخص زندہ نہیں ہوگا اور وہ وقت معین یوم القيامة ہے۔ ایک حدیث میں جو مہمال بن عمرو سے مروی ہے ارجح کا اجسام میں بوقت سوال و جواب قبر میں لوٹایا جاتا مذکور ہوا ہے مگر علمائے حدیث نے اس کو صحیح نہیں رکھا بلکہ جمیع صحابہ کا اتفاق اس امر پر ثابت ہوا ہے کہ اجسام زیر خاک لاشے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حدیث ابن عمر و میں وارو ہے "هذه الجحش ليست بشئ وان الارواح

لے بطور مجرہ مکر زندہ ہونا اس مفہوم میں داخل نہیں کیونکہ قرآن مجید اس قسم کے زندہ ہونے کی نہایت زور دہ کیا ہے تاکہ یہ ثابت ہو کہ جو لکھا ہے کہ مرنے کے بعد تیل اور قیامت کوئی زندہ نہیں گا یہ صرف ان لوگوں کے خلاف ہے جو کہ

عند اللہ یعنی یہ اجسام کچھ بھی نہیں اور روحيں مرنے والوں کی اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔
 نیز حدیث معراج میں حضور علیہ السلام کا آسمان اول پر آدم علیہ السلام کو اس حال
 میں دیکھنا کہ اہل سعادت کی روحيں ان کے دائیں جانب ہیں اور اہل شقاوت کی روحيں
 ان کے بائیں جانب ہیں یقینی دلیل ہے ہمارے مذکورہ بالا دعویٰ پر۔ نیز غزوہ بدر پر
 حضور علیہ السلام کا مشرکین کی لاشوں کو خطاب کرنا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا سوال کرنا کہ
 آیا وہ لوگ سنتے ہیں اور آپ کا یہ جواب دینا کہ تم لوگ میری بات کون سے زیادہ
 نہیں سنتے صاف دلیل ہے کہ مرنے والوں کی صرف روحيں سنتی ہیں ورنہ اجسام تو
 بالکل بے حس و حرکت ہوتے ہیں۔

ہماری مذکورہ بالا تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ مذاہب قبر قرآن و سنت سے ثابت
 ہے اور وہ صرف روح سے تعلق رکھتا ہے اور روح ایک جسم لطیف ہے جو بعینہ
 ہمارے اس کثیف جسم کی شکل اور وضع رکھتا ہے۔ ہندو لوگ اُسے سوکھشم شریر بولتے
 ہیں۔

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ قبر یا تو جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے اور
 یا بہشت کی چھواریوں میں سے ایک چھواری ہے۔ اس صحیح اور یقینی خبر پر بعض متکبرین
 نے جنہیں حیوانی حواس کے سوا زیادہ کوئی حس نصیب نہیں ہوئی یہ اعتراض کیا کہ یہ کیونکر
 ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ہم قبر کو کھود کر دیکھتے ہیں تو اس میں بجز خاک و استخوان کے کچھ بھی
 نظر نہیں آتا اور نہ کہیں کوئی پتھر اور سانپ ہوتے ہیں اور نہ منہائے نگاہ تک قبر وسیع
 نظر آتی ہے اور نہ دو انگلیوں کے درمیانی فاصلہ کے برابر تنگ جیسا کہ آثار میں وارد
 ہوا ہے۔ نیز ایک مصلوب شخص کو جو مدت تک یوں ہی پڑا خشک ہوتا ہے کبھی حرکت یا

سلہ چونکہ اصطلاح میں روح کو لطیف مانا گیا ہے اس لئے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی مادی ہوگی مگر یہ خیال صحیح نہیں ۱۲۸

فرمایا کرتے یا آگ میں جلتے یا سوال و جواب کرتے نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح جن لوگوں کو ہندو جگہ میں کھا جاتے ہیں یا جن کے اجزائے جسمیہ مختلف جانوروں کے پٹیوں میں جا و اہل ہوتے ہیں ان کی نسبت نکیرین کا سوال و جواب کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟ علیٰ ہذا القیاس تمام وہ امور جن کی نسبت احادیث میں ذکر آچکا ہے کیونکہ معیار عقل پر صحیح تسلیم کئے جاسکتے ہیں؟ واضح ہو کہ یہ سب شہادت و شکوکِ قلبیہ علم اور علمِ نبوت سے ناواقفیت پر مبنی ہیں اور محض ایک عامیہ خیالات کا نتیجہ ہیں ورنہ جس شخص نے علومِ نبوت کے مطالعہ میں کچھ حصہ غم کا صرف کیا ہوگا یقیناً ایسی بے سرو پا باتیں منہ سے نہیں نکلے گا کہ ہم اپنے دعویٰ کے اثبات اور منکر کے اظہار کے لئے ذیل میں چند ایک امور کا ذکر کرتے ہیں جن میں غور کرنے سے ہمیں امید ہے کہ مسئلہ عذاب القبر بالکل سمجھنے کے قابل ہو جائیگا۔ محقق کو چاہئے کہ ہر ایک امر میں تحقیق کا حق ادا کرے اور قبل از تحقیق کبھی نفی و اثبات پر جرات نہ کرے۔ مع ہذا انسان کو عام اور پیشگی مزلج ہونے سے ہمیشہ بچنا چاہئے کیونکہ بات بات میں سُوَطَن کا عادی ہونا انسان کو بسا اوقات یقینیات کے مان لینے سے روک دیتا ہے جو موجب ہلاکت ہے۔

(۱) یقین سمجھنا چاہئے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے کسی امر محال عقلی کی خبر نہیں دی یعنی کسی ایسے امر کی انہوں نے امت کو تعلیم نہیں دی جس کو نوعِ انسان کی عقل ناممکن باور کرے۔ بلکہ ان حضرات کے اخبار کی دُور تہیں ہیں اول جن کی شہادت عقلِ انسانی یا فطرتِ انسانی میں موجود ہو۔ دوم جنہیں عقلِ انسانی محض اپنی ذاتی استعداد سے اور اک نہیں کر سکتی۔ مثلاً تمام وہ امور غیبیہ جو ہمارے حواس کی دسترس سے بالاتر ہیں اور جن کی قطعیت میں شک نہیں ہو سکتا۔ سو جب کبھی ایسے امور کی نسبت یہ خیال پیدا ہو کہ عقلِ انسانی ان کی تصدیق نہیں کرتی تو شک نہیں کہ یا تو ان امور کی نسبت انبیاء علیہم السلام پر کسی نے افتراء کیا ہوگا یا اگر صحیح ہونگے تو شخصِ معترض کی اپنی لم فہمی اور کوتاہی عقل کا نتیجہ ہوگا۔

اور نفس الامر میں وہ امور ثابت ہو گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ تعلیم قرآن میں جا بجا بذریعہ وحی ایسے امور کی اطلاع دینے کو اہل ایمان کے لئے موجب فرح و سرور قرار دیا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ
 الَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ لَعَنُوا الْيَهُودَ بِمَا آتَوْا إِلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ ۖ يَعْنِي بَن لُوكُوں كو
 ہم نے كتابِ وحی وہ خوش ہوتے ہیں اس تعلیم وحی پر جو تجھ پر نازل کی گئی ہے اور اسی طرح
 دوسری جگہ فرمایا فَبِذَلِكْ فَليفرحوا پس اس نزول قرآن پر چاہئے کہ خوشی منائیں
 علیٰ ہذا قرآن مجید کی تعلیم جا بجا شفاء۔ رحمت۔ ہدایت۔ فضل وغیرہ الفاظ سے یاد کیا
 گیا ہے۔ اور یہ امر ناممکن ہے کہ کسی محال امر کے خبر ملنے پر لوگوں کو اظہار فرح و سرور
 کا موقع ملے۔ یا ناممکن امور لوگوں کے لئے موجب رحمت و شفاء ہو سکیں۔ اس سے
 معلوم ہوا کہ اخبار وحی سب کے سب بجائے خود اپنے معنی میں قطعاً ثابت و صحیح ہیں۔
 اس نکتہ پر خوب غور کرنا چاہیئے +

(ب) اس امر کے متعلق پوری کوشش کرنا چاہئے کہ آیات و احادیث کے وہ
 معانی جو مرادواتِ باری ہیں اور جو جناب پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمائے ہیں کلام
 سے اخذ کئے جائیں اور ان معانی کے سمجھنے میں غلو و تقصیر یا افراط و تفریط سے احتراز
 ہمیشہ واجب سمجھنا چاہیئے اس اصل عظیم کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے اسلام میں بدعت
 و ضلالت کا دروازہ کھل گیا۔ اور سوء فہم نے لوگوں کو کہیں سے کہیں تک پہنچا دیا۔ اور
 اس سوء فہم کے ساتھ اگر کسی شخص پر ہوا اے نفس بھی غالب آگئی ہو (معاذ اللہ) تو پھر
 اس کا کوئی لگنا نہیں۔ کیا تمام اہل بدعت و ہوا کے فرقے سوء فہم اور سوء ظن اور
 ہواے نفس کا نتیجہ نہیں ہیں؟ اگر ان تمام فرقوں کے پیروہ استنباطات اور غلط معتقدات
 کی تشریح کی جائے تو ہزاروں دفاتر بھی کافی نہیں ہو سکتے قرآن مجید کے اقل سے
 آخر تک ایک ایک آیت شریفہ کے تعین معنی میں غور کر کے دیکھو تمہیں معلوم ہو گا کہ
 کوئی آیت بھی ایسی نہیں ملے گی جس پر ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق بافراط و تفریط

الامان اللہ۔ حتیٰ کہ جس آیت کو ایک شخص کسی خاص مدعا کے اثبات میں پیش کرتا ہے اس کا مخالف اسی آیت کو اس کی نقیض کے اثبات میں پیش کرتا ہے۔ درحقیقت بوالعجبی اسی کا نام ہے ۛ

(ج) مذکورہ بالا ہر دو اصل کے بعد مسئلہ زیر بحث کی نسبت یوں سمجھنا چاہیے کہ تعلیم و وحی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کے بے تین دار مقرر کئے ہیں اول دار دنیا جس میں ہم اب موجود ہیں اس کو دار العمل بھی کہتے ہیں۔ دوم دار برزخ یہ اس مقام کا نام ہے جس میں انسان مرنے کے بعد سے میدانِ حشر میں معبوث ہوئے تک رہتا ہے سوم دار القرار یعنی وہ مقام جہاں حشر کے بعد ہمیشہ کے لئے رہنا ہوگا انسان کی فطرت میں ان ہر سہ مذکورہ بالا دار میں رہنے کی قابلیت موجود ہے مگر یہ بھی واضح ہے کہ جن احکام اور لوازم اور ضرورتوں کا وہ اس دار دنیا میں تابع ہے وہ دار برزخ میں اس کے ساتھ نہیں ہوتیں۔ دار برزخ کے احکام و لوازم و ضروریات دار دنیا سے بالکل علیحدہ نوعیت کے ہیں۔ عموماً لوگ اس ضروری امتیاز کے نہ سمجھنے کی وجہ سے انواع و اقسام کے شکوک کی دلدل میں پھنس جاتا کرتے ہیں حالانکہ ایک مونیٰ نبی بات ہے کہ جب ہر دو عالم کی نوعیت حیات ایک نہیں تو ان کے احکام و لوازم کیونکر ایک ہو سکتے ہیں؟ علیٰ ہذا دار القرار کی نوعیت حیات دنیا اور دار برزخ کی حیات سے بالکل علیحدہ ہے اور اس لئے وہاں کے نعیم و عذاب کی کیفیت بھی ان ہر دو دار سے بالکل مختلف ہے ۛ

جب ہر سہ دار کے احکام و لوازم حیات کا مختلف ہونا معلوم ہو چکا تو اس امر پر خوب غور کرنا چاہیے کہ دار دنیا میں احکام حیوانیت احکام روحانیت پر غالب ہوتے ہیں اور دار برزخ میں اس کے برعکس صورت ہوتی ہے یعنی احکام روحانیت احکام حیوانیت پر غالب آجاتے ہیں مگر جس طرح دار دنیا میں حکم و روح کے درمیان ایک نامفہوم سا

تعلق قائم ہوتا ہے اسی طرح وار برزخ میں بھی ہر دو میں ایک تعلق قائم رہتا ہے جس کی کیفیت بالکل مبہم ہے اور چونکہ ہر دو میں ایک بنائیت لطیف تعلق قائم رہتا ہے اس لئے ان ہر دو میں کسی ایک کو جب کسی قسم کا صدمہ یا تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرا بھی اس سے متاثر ہوتا ہے یعنی جسم کے عذاب سے رُوح تکلیف پاتی ہے اور رُوح پر عذاب گانے سے جسم پر بھی اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ ایک بیداری امر ہے جس کے اثبات کی کوئی ضرورت نہیں۔ الغرض دایر دنیا میں جسم ظاہر ہے اور رُوح مخفی اور وار برزخ میں رُوح ظاہر اور جسم مخفی ہوتا ہے۔ اس لئے جس چیز کے آثار زیادہ ظاہر ہونگے اس کی کیفیت خوشی و رنج ذاتی ہوگی اور جس کے آثار مخفی ہونگے اس کی کیفیت نسیم و عذاب پسے کے تاج ہوگی اور اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی دقت پیش آسکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کے سمجھنے کے لئے نام (سولنے والے شخص) کو بطور نظیر کے پیش کیا ہے کیونکہ سولنے والا خواب کی حالت میں خوشی یا رنج وغیرہ کیفیات سے برابر متاثر ہو رہا ہوتا ہے مگر یہ سب کچھ اس شخص کی رُوح پر گزرتا ہے اور جسم رُوح کے تاج ہو کر بعض اوقات ایسے ہی متاثر ہوتا ہے جیسے خود بلا واسطہ کسی ضرب یا صدمہ سے متاثر ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات بیدار ہونے پر جسم پر نشان ضرب موجود ہوتے ہیں اور خواب میں کسی عمدہ میوہ یا لذیذ کھانے کا اثر بیداری کی حالت میں بھی محسوس ہوتا ہے۔ اس کے متعلق بہت سے نظائر صحیحہ موجود ہیں اور ہر ایک شخص اپنے ذاتی تجربہ سے بھی اس کی تصدیق کر سکتا ہے۔ سو جب اس دایر دنیا میں یہ کیفیت ہمارے مشاہدہ میں آکر ہیں مطمئن کر سکتی ہے تو اس کیفیت کا وار برزخ میں (جبکہ رُوح پر تجر و غالب آجاتا ہے اور اس کو اپنے جسم

لے کیا یہ امر کہ تعجب نیز ہے کہ دو شخص ایک ہی بستر پر سوتے ہیں ایک تو بحالت خواب غلاب میں مبتلا ہوتا ہے اور جب بیدار ہوتا ہے تو اس کا ارپاٹے ہم پر پاتا ہے اور دوسرا نہایت خوشی اور نزاہت کی حالت میں ہوتا ہے اور بیدار ہو کر اسی خوشی کا اثر محسوس کرتا ہے اور لطف یہ کہ ایک کو دوسرے کے حال سے مطلقاً خبر تک نہیں ہوتی۔ ۱۲۰ منہ

سے ایک خفیف مہم تعلق باقی رہتا ہے کہیونکہ انکار ہو سکتا ہے؟ اور چونکہ حشر کے دن رُوح اور جسم میں پھر از سر نو تعلق قائم ہوگا اس لیے نعیم و عذاب کا احساس رُوح اور جسم ہر دو کے لیے بدرجہ اکل ہوگا۔ اس مقام میں پورے غور سے کام لینے سے معلوم ہوگا کہ مسئلہ عذابِ قبر کے متعلق جو کچھ شائع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے اور جس کو منکر سوء فہم کی وجہ سے ایک پیچیدہ اور شکل امر سمجھتا ہے بالکل صحیح اور ثابت فی نفس الامر ہے۔

وَكَم مِّنْ عَلَبٍ قَوْلًا صَحِيحًا - وَافَتْهُ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِيمِ

(د) حکیم مطلق کی حکمت کا مکملہ کا نتیجہ ہے کہ اس نے دار دنیا کے رہنے والوں سے

دار برزخ اور جنت و نار وغیرہ امور کو مخفی رکھا ہے کیونکہ ایمان بالغیب کی حکمت اسی مصدقہ کی متفقہ تھی۔ کہ ان امور کو انسان کے مکلفات بالا اعمال پہلے تک پر وہ غیب میں کھاجائے بعض محضر لوگ (جو نزع کی حالت میں ہوں) بسا اوقات ملائکہ کے وجود کی بعینہ اسی طریق پر خبر دیا کرتے ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے۔ کئی ایک مختصر صالح بزرگان نے علیکم السلام ملائکہ کے سلام کے جواب میں کہا ہے اور لوگوں نے سنا ہے بعض نے وضو اور دو رکعت نماز ادا کرنے کی مہلت مانگی ہے چنانچہ وضو اور نماز کے بعد ان کی رُوح کو ملائکہ نے قبض کیا ہے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ جب نزع کی حالت میں تھے تو آئینہ کھول کر ادھر ادھر دیکھتے تھے۔ حاضرین نے کہا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں فرمایا کہ وہ لوگ آ موجود ہوئے جو نہ تو انسان ہیں نہ جن۔ بعد ازاں ان کی رُوح قبض کی گئی جیکہ لا الہ الا اللہ ان کی زبان پر جاری تھا۔ ہم ایسی ہیبت سی نظیریں بزرگان دین اور صلحا کی لکھتے مگر مضمون بے سو و طویل ہو جاتا۔ اسی امر کی طرف آیت ذیل میں اشارہ ہے فلو لا اذا ابطلت المحلوق وما انتہر حیث ینذرتهم ون و نحن اقرب الیہ منکہ ولكن لا تبصرون۔ یعنی جب مرنے والے کی رُوح حلق تک پہنچ جاتی ہے ملائکہ تم لوگ پاس کھڑے دیکھ رہے تھے ہو اور ہم تمہاری نسبت اس مرنے والے سے زیادہ

قریب پہنچتے ہیں مگر تم اس حقیقتِ قرب یا اس حالت کو جو اس پر گزرتی ہے ادراک نہیں کر سکتے
 اس آیت میں سخن اقرب الیہ سے مزبور ہے کہ ہمارے ملائکہ حاضر ہو کر اس کو ہماری بارگاہ میں
 لانے کے لئے اس کے ساتھ وہ سبک کرتے ہیں جس کا وہ مستحق ہوتا ہے مگر یہ تمام کیفیت
 حاضرین کی آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے کیونکہ اس کا انخساف منافی حکمتِ ایمان بالغیب
 ہے۔ پہلی منزل ہوتی ہے جو مرنے والے کو ملے کر ناپڑتی ہے۔ ملک الموت اپنا ہاتھ
 بڑھا کر روح کو قبض کر لیتا ہے اور اسے وہی خطاب کرتا ہے جس کا وہ باقرن اللہ مامور
 ہوتا ہے۔ حاضرین سب پاس موجود ہوتے ہیں مگر وہ نہ تو اس حالت کو دیکھ سکتے ہیں نہ
 اس خطاب کو سُن سکتے ہیں۔ نہ اس کوئے خوش کو سو گھم سکتے ہیں جو اہل ایمان کے لئے ملائکہ
 اپنے کفن میں استعمال کرتے ہیں پھر ملائکہ دو صفوں کے درمیان ہو کر اس کو عزت کے ساتھ
 بجاتے ہیں۔ پھر روح تمام غسل اور تجہیز و تکفین کی حالت کو دیکھتی ہے اور جب جنازہ لے
 چلتے ہیں تو کہتی ہے کہ مجھے کہاں لئے جاتے ہو؟ یہ سب کیفیت فی الواقعہ وقوع پذیر ہوتی
 ہے مگر حاضرین میں سے کسی کو اس کا علم و ادراک نہیں ہوتا۔ پھر جب احد میں میت کو رکھا جاتا ہے
 اور اس پر مٹی ڈال کر قبر کو مسطح کیا جاتا ہے تو ملائکہ کو قبر میں جانے سے کوئی حیر مانع نہیں ہوتی
 کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ملائکہ کو ایسا لطیف جسم بخشا ہے کہ اگر پتھر کو کھود کر میت کو
 اس کے اندر رکھا جائے اور اوپر قلعی اور سیسے سے خوب بند کر دیا جائے تب بھی ملائکہ کا
 وہاں پہنچ جانا کوئی دشوار امر نہیں۔ وہ اجسامِ کثیفہ میں اسی طرح آ جاتے ہیں جس طرح اڑنے
 والے جانور ہو ایں اُڑتے پھرتے ہیں۔ بعد ازاں قبر کا منہ تائے بصر تک وسیع ہونا یا
 دو انچلیوں کے درمیانی فاصلہ سے زیادہ تنگ ہونا بالذات روح کے لئے ہوتا ہے اور
 بدن اس کے تابع رہتا ہے اور منقطعہ قبر یعنی قبر کا میت کو بھینچنا جس سے کہ اس کی ہڈیاں
 چوڑ چوڑ ہو جائیں حق ہے جس میں کوئی شک نہیں اور اگر کوئی شخص کہے کہ قبر کو کھودنے
 پر میت بدستور نظر آتی ہے تو اس سے اس کیفیت کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی

حکمت کاملہ سے مصلحت بندگان کے لئے میت کو ویسا ہی دکھاتا ہے جیسا انہوں نے اس کو قبر میں رکھا تھا کیونکہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ وارہ نرخ کے احکام دار دنیا سے بالکل مختلف ہیں۔ اس لئے تکذیب ان امور حقہ کی جنگی خبر صادق نے خبر دی ہے اور جن کو اہل مکاشفہ نے بسا اوقات مشاہدہ کیا ہے سر اسر جہالت و حماقت ہے۔

(۷) یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ وارہ نرخ کی آگ دار دنیا کی آگ سے بالکل علیحدہ نوعیت کی ہے اہل دنیا اس کا احساس نہیں کر سکتے کیونکہ اس آگ کی حرارت دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ سخت ہے اور یہ امر موجب حیرت ہے کہ دو شخص پہلو پہلو مدفون ہوئے ہیں اور ایک آگ کے گرہے میں پڑا ہوتا ہے اور دوسرا عین راحت میں۔ اور ایک پر دوسرے کی حالت کا کچھ اثر نہیں پڑتا جیسا کہ ہم نے اوپر ایک بستر پر دو سونے والوں کی تمثیل بیان کی ہے۔ علمائے اسخون فی العلم میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں ”وقد ارانا الله من آيات قدرته في هذه الدار ما عجب اعجب من ذلك بكثير ولكن النفوس مولعة بالتكذيب بما لم تخط به علماً إلا من وفقه الله وعصمه“ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں دار دنیا ہی میں بہت سے اپنے آیات قدرت دکھائے ہیں جو عذاب القبر کی کیفیات سے کہیں بڑھ کر تعجب انگیز ہیں۔ لیکن عام لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جن امور کا انہیں خود علم نہیں ہوتا ان کی تکذیب کرنے پر آمادہ ہو جایا کرتے ہیں الا ماشاء اللہ لہذا ان کا ذکر کرتا بے سود ہے۔

عذاب القبر کا عامہ ناس کے احساس و ادراک سے مخفی رکھا جاتا عین مصلحت انسانی ہے اور اگر لیا نہ ہوتا تو تخلیف اعمال کی حکمت باطل جاتی اور لوگ ایک دوسرے کو دفن نہ کرتے چنانچہ حدیث صحیحین میں وارد ہے ”لو لا ان تدافنوا لدعوت الله ان يمسحكم من عذاب القبر ما سمع“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کو عذاب قبر کی وہ کیفیت نظر آتی تھی جو دوسرے لوگوں کی نظروں سے مخفی رکھی گئی

ہے اور یوں ہی چاہئے تھا کیونکہ اگر عامہٴ ناس اس کیفیت سے آگاہ ہو جائیں تو عمر بھر
 کبھی کسی کام کی طرف متوجہ نہ ہوں اور نہ انہیں اپنی زندگی خوش معلوم ہو بلکہ تمام دنیا کے
 کاروبار چھوٹ جائیں اور سلسلہٴ انتظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی امر کی طرف حضور علیہ الصلوٰۃ
 والسلام نے ایک حدیث میں اشارہ فرمایا ہے کہ جو کچھ میں دیکھتا ہوں اگر تم لوگ دیکھ
 پاتے تو تم کبھی نہ مینتے اور ہمیشہ رویا کرتے۔ چونکہ جانوروں اور بہائم کے لئے تکلیف
 اعمال کی حکمت مد نظر نہ تھی اس لئے ایسا اوقات انہیں عذاب القبر کا احساس ہو جاتا
 ہے چنانچہ حضور علیہ السلام کا چچر ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے جس کے اندر قبر والا
 عذاب پارہا تھا ڈر کر بے اختیار بھاگ نکلا۔ اور قریب تھا کہ حضور علیہ السلام کو گر کرے
 حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ ابو عبد اللہ محمد بن رزیزہ حرانی نے میرے پاس بیان کیا کہ میں
 شہر آمد (علاقہ شام) سے باہر عصر کے وقت ایک بستان کی طرف جا نکلا۔ آفتاب
 بالکل غروب ہوئے کو تھا کہ میں ایک گورستان میں جا داخل ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک
 قبر میں سے ایک شعلہٴ آتش نکل رہا تھا جیسے کوئی آگینہ کا مدور کوزہ ہوتا ہے اور میت
 اس آگ کے اندر پڑی جل رہی تھی۔ میں یہ کیفیت دیکھ کر رنگ رہ گیا اور اس خیال پر
 اپنی آنکھیں ملنے لگا کہ کہیں یہ معاملہ خواب کا نہ ہو۔ پھر میں نے ادھر ادھر شہر اور دیگر
 نشانات کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ میں جاگتا ہوں سوتا نہیں۔ یہی کیفیت مشاہدہ کرتا ہوا
 میں اپنے گھر کو چلا۔ مگر میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہ تھے گھر والوں نے کھانا
 سامنے رکھا مگر میں نہ کھا سکا۔ اٹھا اور اس قبر والے کا شہر میں پتہ لگانا شروع کیا
 آخر معلوم ہوا کہ وہ ایک محصل کی قبر تھی جو لوگوں پر سخت ظلم اور تشدد کیا کرتا تھا اور
 وہ اسی دن مرا تھا۔ مگر ایک منکرہ پتھر کی اسے فاسفورس کہہ سکتا ہے۔

واضح ہو کہ اس قسم کا مشاہدہ عام نہیں ہو سکتا بلکہ اللہ تعالیٰ احب چاہتا ہے کبھی کبھی
 بعض الناس پر مصلحتاً منکشف کر دیتا ہے چنانچہ جن و ملائکہ کی بھی یہی کیفیت ہے

کہ گاہے گاہے لوگوں پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ابن ابی الدنیا کتاب القیود میں شعی سے روای ہیں کہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں غزوہ بدر کے میدان میں جا رہا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص زمین سے باہر نکلتا ہے اور دوسرا اس کو لوہے کی گرز سے مارتا ہے اور پھر وہ زمین میں دھس جاتا ہے۔

علی ہذا یوں ہی یہ سلسلہ جاری رہا اور میں چلا آیا۔ حضور پر نور نے فرمایا کہ وہ ابوالہشام بن ہشام ہے جو قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہیگا۔ ابن ابی الدنیا بروایت ہشام بن غزوہ عن ابیہ راوی ہیں کہ ایک شخص گھوڑے پر سوار کہ اور مدینہ کے پاس سفر کر رہا تھا کہ اتفاقاً ایک گورستان پر اس کا گذر ہوا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک قبر سے جس سے شعلہ نئے آتش زور سے نکل رہے تھے ایک شخص زنجیروں کے اندر جکڑا ہوا نکلا۔ اور باواز بلند بکا کہ او مرو خدا! مجھ پر پانی ڈال۔ ایک دوسرا شخص اس کے پیچھے لگا ہوا یہ کہتا تھا کہ دیکھنا ہرگز اس پر پانی نہ ڈالنا۔ وہ سوار یہ کیفیت دیکھ کر غش کھا گیا۔ اور اس کی سواری اس کو کسی دوسری طرف لے گئی جب صبح ہوئی تو اس کے تمام بال مائے خوف کے سفید ہو گئے تھے۔ جب حضرت عثمانؓ کے پاس اس واقعہ کی خبر پہنچی گئی تو آپؐ نے فرمایا کسی شخص کو اکیلے سفر نہیں کرنا چاہئے۔ اس قسم کے سنیکڑوں واقعات صحیحہ معتبر روایات سے مروی ہیں مگر ہم نے بطور تمثیل چند ایک کا ذکر کر دیا ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ عذاب القبر کے متعلق جو کچھ خبر صادق نے فرمایا ہے حق ہے جس

لے میرے ایک دوست نے بیان کیا کہ ایک دفعہ مجھے ایک قبر کے پاس سے گذرنے کا اتفاق ہوا میری ہر دو پٹلیوں کو ایسی سخت حرارت محسوس ہوئی جیسے آگ کے اندر سے گذر رہا ہوں دیکھا تو ہر دو پٹلیوں کے بال جل گئے آگ کا نشان تو نظر نہ آیا مگر حرارت ایسی تھی کہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے عذاب سے محفوظ رکھے۔

ہیں شک کی ہرگز گنجائش نہیں ❖

(د) منکرین عذاب القبر اگر اس مسئلہ میں خود سے کام لیتے تو انہیں ہرگز انکار کا موقعہ نہ ملتا۔ کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسی دار دنیا میں کسی ایک امور کو عام لوگوں کی نظروں سے مخفی رکھا ہے حالانکہ ان کی حقیقت سے انکار کرنا محض جھٹ اور چال ہے۔ دیکھو جو بریل علیہ السلام جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں آتے اور آپ سے ہم کلام ہوتے مگر پاس والے نہ تو انہیں دیکھ سکتے نہ ان کا کلام سن سکتے۔ بعض غزوات میں ملائکہ نے کفار کو تازیانوں سے مارا اور ان کی گردنیں قطع کیں مگر مسلمان جہادیوں کو ملائکہ نظر نہیں آتے تھے۔ ہاں ان کے کائے ہوئے سر زمین پر گرتے دیکھتے تھے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ تمام انسانی طبائع ملائکہ کے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتیں ❖

ایہ۔ وان من شیء الا یسیح بجدہ ولكن لا تفقهون تیسحہ۔
میں غور کرو کہ کس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر ایک شے کی نسبت تیسح بکارنا فرمایا ہے مگر کیا ہم اشیاء کی تیسح کا اور اک کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اس آیت میں نہیریانہ طبیعتوں کا یہ کہنا کہ تیسح سے مراد ہر ایک شے کا اپنے صلح کے وجود پر دلالت کرنا مقصود ہے بالکل غلط اور بے معنی بات ہے کیونکہ اس صورت میں لا تفقهون کا لفظ بالکل ضائع جاتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک شے کے اپنے صلح پر دلالت کرنے کو تمام قائل جانتے ہیں۔ پھر لا تفقهون کا کیا مطلب ہوا؟ پھر دوسری جگہ فرمایا ”انما سخرنا المجال معہ لیسجن بالعشی والاشراق“ یعنی داؤد علیہ السلام

۱۔ تمام اشیائے کائنات فات بابی غزاسمہ کی تیسح اس کی حمد کے ساتھ پکار رہی ہیں مگر
تحم لوگ ان کی تیسح کو نہیں سمجھ سکتے۔ ۱۲ منہ ❖

کے ساتھ ہم نے پہاڑوں کو مطیع کر دیا جو ان کے پہلے اور پچھلے حصے میں ان کے ساتھ تسبیح
 پکارتے۔ کیا اس آیت میں پہاڑوں کے تسبیح پکارتے سے یہ مراد ہے کہ ان کا وجود
 اپنے صالح حقیقی کی دلیل ہے؟ ہرگز نہیں۔ بجا دلالت علی الصالح کی تخصیص کے دو
 مخصوص وقتوں سے کیا معنی؟ پھر فرمایا۔ ”یا جبال اتبی معہ“ اس آیت میں بھی
 وہی اعتراض لازم آتا ہے یعنی دلالت علی الصالح کے لئے محبت کی کیا ضرورت ہے؟
 جس منکرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں تاویپ سے مراد آواز کی گونج کا
 پہاڑوں سے کاڑوں میں سنائی دینا ہے مطلب یہ کہ داؤد علیہ السلام جب تسبیح پکارتے
 تو پہاڑ کی گونج سے ویسی ہی آواز سننے والوں تک پہنچتی اور یہی پہاڑوں کا تسبیح کرنا
 تھا۔ مگر ان عقل کے اندھوں سے کوئی یہ تو پوچھے کہ کیفیت ہر ایک شخص کی آواز کے
 لئے ہے یا داؤد علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھی؟ اگر ہر ایک کے لئے ہے تو پھر
 داؤد علیہ السلام کے لئے اس امر کو کیوں بطور اظہار الخاتم کے مخصوص کر دیا؟

پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ
 فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالْجِبَالُ وَالْشَّجَرُ وَالدَّابُّ وَکَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ
 یعنی تمام اشیائے ارضی و سماوی اور چاند اور سورج اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور
 پتھر پائے اور اکثر انسان اللہ تعالیٰ کے حضور سرسجود ہیں۔ اگر اس آیت میں سجدہ سے
 دلالت علی وجود الصالح مراد ہو تو اکثر آدمیوں کی تخصیص کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ
 ہر ایک آدمی حیثیت مخلوق ہونے کے لئے خالق کی ہستی پر شاہد ہے اس لئے
 ضرور ہے کہ سجدے سے حقیقی وجود مراد ہو جس کی کیفیت کا ہر ایک سنے کی نسبت ہم اور کم
 نہیں کر سکتے پھر فرمایا ”اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ
 صٰفٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰتَهُ وَتَسْبِيحَهُ“ یعنی آسمانی اور زمینی کائنات اللہ تعالیٰ
 کی تسبیح پکارتی ہے اور پرندے ہر ایک قطار و قطار اڑتے ہوئے تسبیح پکارتے ہیں

اور ان کا زندہ ہو جاتا۔ یہ ایسے نظائر ہیں جن سے بجز ایک لمحہ کے جو ناویلات باطلہ کا عادی ہو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ کیا ان عجائبات کے مقابلہ میں قبر کے اندر میت کا زندہ ہو کر عذاب پانا زیادہ تعجب انگیز ہے گو ہمیں اس کی کیفیت کا احساس نہ ہو۔

(۱) ناظرین کو یہ امر بھی معلوم ہونا چاہئے کہ عذاب و نعیم سے دار برزخ کے عذاب و نعیم مراد ہیں۔ اور یہ دار برزخ وہی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور جس کی طرف قرآن مجید میں الفاظ اشارہ کر رہا ہے۔ وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ۔ اس دار برزخ میں جو فطرت انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ دار دنیا کی فطرت سے زیادہ لطیف و تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص سولی پر چڑھایا جائے یا ڈوب جائے یا جل کر خاک ہو جائے یا کوئی مردہ اسے پھاڑ کر کھا جائے تو ان سب صورتوں میں مرنے والے شخص کو دار برزخ کی زندگی ضرور ناگوار حاصل ہوتی ہے اور جہاں جہاں کسی مرنے والے کے اجزائے جسمیہ ہونگے ان سے جسم برزخی تیار ہو کر مورد عذاب و نعیم ہو جائیگا۔ سو اگر کسی شخص صلح کو توڑ میں پھینک دیا جائے اور وہ جل کر مر جائے تو نعیم جنت اور ہر ایک طرح کی آسائش اس کے لئے وہیں بہتیا ہونگے اور اگر کسی غاسق یا کافر کو کسی بلع و بوستان میں دفن کیا جائے تو نار عذاب اس کو وہیں جلائیگی۔ بہر صورت اللہ تعالیٰ کے عذاب و نعیم کے لئے کئی ایک طریق ہیں۔ کیونکہ خدا مہر عالم اور جملہ اشیا اس کی مخلوق اور مطیع ہیں۔ اور وہ ان میں حسب ارادہ تصرف کر سکتا ہے اور اس کی حکمت کے طریق عمل و مظاہر کا کسی انسان سے حصر نہیں ہو سکتا۔ ایک حدیث صحیح میں وارد ہے کہ انبیائے سلف کی امتوں میں ایک شخص نے مرتے وقت اپنے اقارب کو وصیت کر دی تھی کہ مجھے جلا کر میری لاکھ کچھ تو ہوا میں اڑا دینا اور کچھ دریا میں بہا دینا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ بھجوا کر ملائکہ بر کو اس کے اجزائے جسمیہ کے جمع کر لیا حکم دیا۔ چنانچہ اس شخص کے اجزائے جسمیہ سے جسم تیار ہو گیا تو اس میں

روحِ بھروی اور اس سے سوال کیا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا کہ عذابِ تہرے عذاب سے بچنے کے لئے میں نے ایسا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی غرت کی حالت پر اس کو مغفرت دے دی۔ اس بیان سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ اجزاءِ جسم کا منتقل ہونا عذابِ برزخ سے مانع نہیں ہو سکتا۔

(ح) یہ بھی واضح ہونا چاہئے کہ موتِ معاد اول ہے اور اسی کو بحشت اول بھی کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے دو معاد مقرر کئے ہیں جن میں جزا و سزا ہوتی ہے بحشت اول۔ تو وہ ہے جبکہ روح کو اس پہلے عنصری سے مفارقت ہوتی ہے اور بارِ برزخ کی طرف منتقل ہو کر حسبِ اعمال عذاب و نعم کا موروثی ہے مگر دایرہِ برزخ میں پورا عذاب و نعم نہیں ہوتا بلکہ پورا عذاب و نعم بحشت ثانی کے وقت ہوگا اور وہ اس وقت ہوگی جبکہ پھر روح کو جسم سے انفصال دیکر حساب و کتاب لیا جائیگا اور یہی وہ بحشت ثانی ہے جس پر ایمان لانا ہر ایک مسلمان کے لئے فرض ہے اور اس کا منتقل کافر۔ اس کی بحشت کہ پورا عذاب و نعم بحشت ثانی کے وقت بعد از حساب ہوگا اور یہی وہ نقل و انتقال الموت و الحیات و یوم القیامۃ ہے۔ اس کا ہر دو بحشت اول و بحشت ثانی کو قرآن مجید میں عابجا ذکر کیا گیا ہے اور اصطلاحِ منتقلین میں ان کو قیامتِ صغریٰ اور قیامتِ کبریٰ سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ قیامتِ صغریٰ کا ذکر سورہ مؤمنین سورہ واقعہ سورہ قیامت سورہ مطففین سورہ فجر وغیرہ میں آیا ہے اور قیامتِ کبریٰ کا ذکر تو شروع سے آخر تک موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا ملکہ یہی ہے کہ اعمالِ حسنہ اور اعمالِ سیئہ کی جزا و سزا اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جبکہ روح اس پہلے عنصری سے علیحدہ ہونے لگتی ہے۔ اس لحاظ سے دایرہِ برزخ

گویا پہلا دارالجزا ہے اویسی عذابِ نعمِ قبر کا موقع ہے جس کی نسبت جنابِ خیر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا "یُفْتَحُ لَهُ بَابٌ إِلَى الْجَنَّةِ فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحٍ وَنَعِيمٍ" یعنی مومن صالح کے لئے جبکہ وہ قبر میں رکھا جاتا ہے تو ایک دروازہ جنت کی طرف کھول دیا جاتا ہے جہاں سے اس کو جنت کی راحت و نعم پہنچتی رہتی ہے اور کافرو فاسق کی نسبت فرمایا "يُفْتَحُ لَهُ بَابٌ إِلَى النَّارِ فَيَأْتِيهِ مِنْ حَرٍّ هَاوٍ وَسُوءٍ مَسْهُمٍ" یعنی کافرو فاجر کو جہنم میں رکھا جاتا ہے تو جہنم کی طرف سے اس کے لئے ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے جہاں سے اس کو دوزخ کی حرارت اور سخت گرم ہوا پہنچتی رہتی ہے۔ اور اس نعم و عذاب میں رُوحِ اقدس ہم ہر دو شریک ہوتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ گناہ یا نیکی کرتے وقت ہم دونوں شریک تھے۔ پھر جب قیامت کبریٰ کا دن ہوگا تو انہیں دروازوں کے راستہ سے وہ اپنے اپنے ٹھکانے پر جا کھڑے ہوں گے۔ اہل باطن جن کے قلوب شواغل دنیا سے باہل پاک ہیں ان ہر دو کیفیات کو وار و نیا ہی میں محسوس کر لیتے ہیں۔ ہاں مرنے پر یہ احساس زیادہ قوی ہوتے لگتا ہے اور قیامت کبریٰ کے دن کھلم کھلا نمایاں ہو کر یکساں طور پر ظہور پذیر ہوگا۔

(ط) تبصّر بغاواقفوں کا خیال ہے کہ عذاب القبر کو قرآن مجید میں صراحتاً بیان نہیں کیا گیا یا آنکہ اس پر ایمان لانا انہیں ضروری ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنابِ خیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تمام ضروریاتِ دین اور معتقداتِ حق کی بذریعہ وحی مطلق تعلیم دی اور حضور نے بلا کم و کاست امت مرحومہ تک اس کی تبلیغ کر دی۔ اور یہ ایک وہ اصل عظیم ہے جس پر تمام شریعتِ اسلامی کا مدار ہے اور کسی مسلمان کو اس میں شک کی گنجائش باقی نہیں حضور علیہ السلام قرآن شریف کے مفسرِ حقیقی ہیں۔ پس جو کچھ عذاب القبر کی آیات مجملہ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں مفصلاً مذکور ہوئے حق ہے اور اسی پر ایمان لانا واجب ہے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے فرمایا: "إِنِّي أُدِيتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ"

یعنی مجھے قرآن شریف (جو وحی ناطق ہے) کے ساتھ سنت صحیحہ (جو وحی خفی ہے) اور جو عمل و اعتقاد میں احکام قرآنیہ کے ساتھ ہی محدود ہے وہی گئی ہے پس احادیث صحیحہ آیات قرآنیہ کی تفسیر ہیں۔ اور مختصر صوابی کے قول پر ایمان واجب۔ ذیل میں ہم ان آیات کو قلمبند کرتے ہیں جن میں عذاب القبر کا ذکر آچکا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: وَلَوْ تَرَىٰ اِذَ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوْا اَيْدِيَهُمْ اَخْرِجُوا الْفُسْكَمَ الْيَوْمَ تُحْجَزُونَ عَذَابَ الْيَتِيمِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْكِبُونَ

اس آیت شریف سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جب ظالم لوگ شدید موت میں گرفتار ہونگے اور ملائکہ عذاب قبض روح کے لئے ہاتھ پھیلائے گا ان کے سروں پر کھڑے ہونگے تو انہیں کہیں گے کہ بس اب نفوس (جسیتہ) کو نکلنے دو آج تم ذلت کا عذاب دیئے جاؤ گے بوجہ ان باطل امور کے جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کیا کرتے اور اس کی بات سے بڑی اکثر کے ساتھ منہ پھیر کر چل دیا کرتے تھے۔ اس آیت میں الفاظ ”الیوم تجزؤن“ سے وہی دن مراد ہے جس دن ظالمین کی روح قبض کی جائیگی۔ اور یہی عذاب القبر ہے کیونکہ قیامت کبریٰ کی نسبت جو بھی واقعہ نہیں ہوئی ”الیوم کہنا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ پس کہاں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ عذاب القبر کا ذکر قرآن مجید میں صراحتاً مذکور نہیں ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا ”فَوَقَاهُ اللّٰهُ سَيِّئَاتٍ سَامِكُوا وَاِحْزِقُوا بِالْغَمَرِ سَوَاءٌ الْعَذَابُ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے مکر و حیلہ کی برائیوں سے بچالیا اور فرعونوں کو بدترین عذاب لئے آگھیرا۔ اور پھر فرمایا: ”الْاَنَارُ لِهٰمْ عَذَابٌ اَوْ عَشِيَّةٌ اَوْ لَیْمٌ مِّنْ تَقْوِمِ السَّاعَةِ اَوْ خُلُوَالِ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ“۔ یعنی فرعونوں کو ہر روز صبح و شام آگ کے سامنے لایا جاتا ہے اور جب قیامت کبریٰ کا دن ہوگا تو حکم

ہو گا کہ فرعونوں کو جہنم کے سخت عذاب میں داخل کر دو اس آیت میں الفاظ "یوم تقوم الساعة" نے فیصلہ کر دیا کہ قیامت کے دن سے پہلے بھی فرعونوں کو صبح و شام عذاب کیا جاتا ہے۔ معہذا اور بھی آیات اس بحث کے لئے موجود ہیں۔ اختصاراً اسی پر کفایت کی گئی ہے۔

(دی) اس امر کا واضح کر دینا ضروری ہے کہ دو کون سے ایسے اسباب ہیں جن پر عذاب قبر ہوتا ہے اس سوال کا جواب مچل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عدم معرفت اور اس کے اوامر و نواہی کے ٹوٹنے پر عذاب ہونا ضروری ہے اور مفصل یوں ہے کہ احادیث صحیحہ سے مستند ہے کہ چھلی کھانے۔ نجاست بول سے طہارت نہ کرنے۔ بلا طہارت نماز پڑھنے۔ حکم شریعت سے آگاہ ہو کر اس پر عامل نہ ہونے۔ نمازیں تاخیر کرنے۔ زکوٰۃ ادا نہ کرنے۔ مجالس میں تصنع اور تکلف سے نفرت کر کے بیٹھنا۔ مال یتیمی کو ناجائز طور پر ہضم کرتے۔ زنا کرنے۔ غیبت کرنے۔ کسی کی عزت آبرو میں طعن کرنے۔ مال غنیمت میں خیانت کرنے۔ ظلم سے کسی کا مال اڑا لینے۔ رشوت کھانے۔ جھوٹ بولنے۔ جھوٹی شہادت دینے کسی شخص کو تہمت زنا لگانے۔ لواطت کرنے چوری کرنے۔ عذر و کد و خیانت کرنے۔ حلال کھاتے اور ٹھکانے۔ فرائض کے محو کرنے مسلمان کو اذیت پہنچانے مسلمان کی عیب جوئی کرنے۔ خلاف شریعت حکم نافذ کرنے نفس معصوم کو ہلاک کرنے۔ صفات ذوات باری کے متعلق عقائد باطلہ کی اشاعت کرنے میت پر نوحہ کرنے۔ ناچ رنگ کی مجلس میں شامل ہونے۔ قبور پر مساجد بنانے اور چراغ جلانے۔ کم تولنے یا اپنے سیلف صاحبین پر زبان طعن دراز کرنے۔ کاسن و مخم سے غیب دریافت کرنے اور اس کی تصدیق کرنے۔ آیات اللہ کی تذکیر پر مٹا ہی سے

باندہ آنے قرآن مجید پر اعتراض کرنے۔ جھوٹی قسم کھانے۔ شرارت کا خوف دل سے اٹھا دینے۔ بخش سکتے۔ قدرت جج پر حج ادا کرنے۔ حلال و حرام میں امتیاز نہ کرنے۔ قطع رحم کرنے۔ میسین و یتیم پر رحم نہ کرنے۔ ریا کرنے۔ عشوق والدین کرنے۔ امر حیر سے روکنے پر عذاب قبر ضروری ہے۔ چونکہ اکثر لوگ منجملہ مذکورہ بالا گناہوں کے کسی نہ کسی گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس لیے عام طور پر تمام لوگوں کے لئے کم و بیش عذاب قبر ہوتا ہے۔ اگرچہ لیٹا ہر قبر کو نہایت متبرک وضع کا بنایا دیں لیکن اگر صاحب قبر بلا توبہ مرا ہے تو وہ ضرور عذاب بھگتے گا۔

(ک) بالآخر ہم یہ بھی بیان کر دیتے ہیں کہ عذاب قبر سے بچنے کے لئے ہر شب سوئے سے پہلے عاصیہ نفس کرتا چاہئے اور دن بھر کے گناہوں کو یاد کر کے ان سے توبہ کرنی چاہئے۔ اور یہ نیت کرنا چاہئے کہ آئندہ اس گناہ کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ توبہ کے بعد ذکر تسبیح و تحمید و تہلیل کرے اور کثرت لاجل کو لازم پڑھے۔ ہر شب سوئے سے پہلے سورہ ملک کا پڑھنا عذاب قبر سے امان کا موجب ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔ بہر صورت توبہ ہمیشہ کئی عمدہ اور اطمینان بخش ذریعہ عذاب سے بچنے کے لئے مستصحب نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو توفیق دے۔ آمین !

سناخ الاسواح

زمانہ قدیم سے حکماء اس مسئلہ پر بحث کرتے چلے آئے ہیں کہ انسان کے مرنے پر اس کی روح ایک بدن سے کسی دوسرے بدن کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ حکمائے یونان میں بھی بعض لوگ سناخ کے قائل تھے اور یہود سب کے سب آؤ آگوں کے قائل ہیں۔ مگر

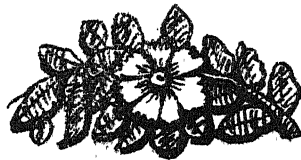
صحیح یہ ہے کہ اس دعویٰ کے ثبوت میں جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ محض ظنیات کی حد تک محدود ہیں۔ کوئی قطعی دلیل کج تک اس دعویٰ کے متعلق پیش نہیں کی گئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مسئلہ تناسخ اور ڈارون کے مسئلہ ارتقاءے انسانی ہر دو کا ماخذ مسئلہ قدم عالم ہے اسلام پاک میں اس مسئلہ کی کوئی اصل نہیں۔

قائلین تناسخ نے تناسخ کی مختلف صورتیں قائم کی ہیں بعض تو اس بات کے قائل ہیں کہ جب انسانی روح اپنے کمالات کے تمام مدارج کو طے کریتی ہے تو پھر آواگون سے ہمیشہ کیلئے نجات پالیتی ہے اور کمالات میں ناقص ہونے کی صورت میں وہ ایک انسانی بدن سے دوسرے انسانی بدن کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ قایت کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کو ان کی اصطلاح میں نسخ کہتے ہیں۔ اور بعض کا یہ خیال ہے کہ اگر روح اپنے کمالات میں ناقص اور اخلاق ذمیمہ میں مبتلا ہے۔ تو انسانی درجہ سے اتر کر کسی ایسے حیوان کے بدن سے تعلق حاصل کرتی ہے جس کو ان اخلاق ذمیمہ کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے مثلاً بزدل کی روح خرگوش کے جسم میں اور بھکاری کی روح لومڑی کے جسم میں اور شکر کی روح شیہ کے جسم میں وغیرہ ذلک اور اس انتقال کو ان کی اصطلاح میں نسخ بولتے ہیں اور اگر جاوی اجسام کی طرف روح منتقل ہو تو اسے اصطلاحاً فسخ کہتے ہیں۔ اور اگر نباتی اجسام کی طرف منتقل ہوں تو اسے نسخ بولتے ہیں۔ تناسخ کی ان چاروں صورتوں کا حکمائے اسلام نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ ان چار مذاہب شہرہ کے علاوہ بعض لوگ اس امر کے قائل ہیں کہ کمالات کے فیض کا پہلا مظہر نباتات ہے۔ اس لئے روح سب سے پہلے نباتاتی جسم میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر نباتات سے منتقل ہو کر حیوانی جسم میں اور پھر حیوانی جسم سے منتقل ہو کر انسانی جسم میں پھر انسانی کمالات کے ناقص مدارج کو بتدریج طے کر کے بالآخر اعلیٰ کمالات کے انسانی جسم میں منتقل ہو کر آئندہ ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ڈارون روح مجرد کا قائل ہوتا۔ تو یہ صورت بالکل اس کے نظریہ کا شنی ہے۔ غالباً ڈارون نے اسی خیال کو ایک

مختصر اختلاف کے ساتھ اپنا نیا مذہب قرار دیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈارون تہیور سی
 کا اپنا مذہب نہیں اس مسئلہ میں ایک یہ مذہب بھی ہے کہ بعض روحیں انسانی جسم سے علیحدہ ہو کر
 اجرام سماویہ یعنی کواکب کے ساتھ تعلق حاصل کر لیتی ہیں۔ مگر مذکورہ بالا مذہب سب کے
 سب اسلامی شریعت کے برخلاف ہیں اور فی نفسہ کسی صحیح استدلال پر مبنی تھیں۔ یہ لوگ
 سب سے بڑی محبت یہ پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم افراد انسانی کے حالات میں جب نظر کرتے
 ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ امیر اور مرقہ الحال ہیں۔ جو ہر طرح عیش و عشرت میں زندگی
 بسر کرتے ہیں اور اکثر ایسے ہیں جو تنگ دستی اور مصیبت اور مختلف قسم کی بیماریوں میں مبتلا
 ہیں اور یہ اختلاف احوال صرف اس امر کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اس زندگی سے پہلے نیک اعمال
 کر کے موجودہ زندگی میں آرام پا رہے ہیں۔ یا پہلی زندگی میں بد اعمال کے مرتکب ہو کر اس
 زندگی میں رنج اور دکھ اٹھا رہے ہیں۔ ورنہ اس اختلاف احوال کی اور کوئی وجہ نظر نہیں
 آتی۔ مگر ایک عاقل جو اصول استدلال سے آگاہ ہے اس امر کو بخوبی جانتا ہے کہ دلیل
 کی یہ نشان ہوئی چاہئے کہ وہ اثبات مدلول کی مستلزم ہو۔ یا یوں کہو کہ دلیل و مدلول میں ربط
 لزوم کا مقرر ہونا ضروری ہے۔ ذیل مذکور میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اس سے نتیجہ
 مطلوبہ یعنی اثبات ناسخ ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختلاف احوال نیک و بد
 اعمال کا نتیجہ نہیں بلکہ حکمت خداوندی اس بات کی مقتضی ہے کہ موجودات عالم کے احوال
 میں یکسانیت اور مساوات نہ پائی جائے۔ کیونکہ اس کے برعکس سلسلہ نظام عالم ایک
 دین بھی قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ صفات ذات باری میں ثور کرد۔ کہ کس طرح متضاد واقع
 ہوئے ہیں۔ اور یہی اس ذات کمالات لا متناہی کی دلیل ہے کیونکہ یہ امر مسلم ہو چکا ہے
 کہ جس قدر کوئی موجود صفات متضادہ کا جامہ ہو گا۔ اسی قدر وہ زیادہ متصف بکمال ہو گا۔
 ذات باری کی صفات میں مدلل و میترق قابض و باسط۔ ظاہر و باطن اول و آخر۔ ہادی۔
 مصل و غیر ذلک کس طرح تضاد کا پتہ دے رہے ہیں۔ ان اسمائے حسنہ کا ہر موجودات عالم

میں جایز نظر آ رہا ہے۔ تعجب ہے کہ کیونکر خیال ہے اس اختلاف احوال کو تنازع پر محمول کر لیا
جب علت اختلاف وہ ٹھہری جو ہم نے بیان کی تو اب مدعی کا فرض ہے کہ وہ یہ ثابت
کرے کہ علت اختلاف صفات ذاتِ باری نہیں بلکہ پہلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے مگر
ایسا ثابت کرنا لوہے کے چنے چبانا ہے *

اور یہ خیال کہ بعض حیوانات کے حرکات و سکنات اور عادات اور تہذیب مخالفت و
موافق وغیرہ ایسے قرائن موجود ہیں جو مستفیدین تنازع کے مذہب کی تائید کرتے ہیں۔ محض
ایک ظنِ فاسد ہے جس کی میزانِ حجت میں کوئی وقعت نہیں۔ حیوانات خدا تعالیٰ کی
جائدادِ مخلوق ہے اگر ان میں ایسے صفات موجود نہ ہوں۔ تو وہ زندہ کیسے رہ سکیں۔ ان
کے ایسے صفات کو تنازعِ ارجح کا نتیجہ قرار دینا حکمتِ خداوندی سے انکار کرنا ہے۔ ہم
نے آج تک قائلینِ تنازع کے جس قدر دلائل کا مطالعہ کیا ہے کوئی بات ان میں قابل
اعتماد نظر نہیں آئی بلکہ ظنِ فاسد سے یہ لوگ اس کے قائل ہوئے ہیں جس کی بنا محض
قانونِ تشابہ پر قائم کی گئی ہے غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ انسانی زندگی کے مختلف مراحل
میں ایک مرحلہ دنیوی زندگی کا بھی ہے جو اس کو اس عالمِ جسمانی کی صدمت میں طے کرتا پڑتا
ہے۔ سچے طرح ایک مرحلہ کے طے ہونے پر وہ اس سے پہلے مرحلہ کی طرف واپس نہیں
جاسکتا مثلاً شباب سے طفلی کی طرف اس کا عود کرنا محال ہے اسی طرح دنیوی زندگی
کے مرحلہ کے طے ہو جانے پر پھر وہ دنیوی زندگی کا مرحلہ دوبارہ طے نہیں کر سکتا بلکہ اس
سے اگلے مرحلہ کی طرف اسے متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے ہمارے پاس کوئی یقینی دلیل
جس سے جسمانی زندگی کی طرف عود کرنا ثابت ہو پائی نہیں جاتی *



حیوانات کا قتل و ذبح

ہمیں اس مسئلہ پر بحث کرنے کی کچھ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ اس کا عقائد اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ ہندو مذہب کے بعض فرقوں کا یہ عقیدہ ہے چونکہ بعض ناواقف لوگ مسلمانوں میں بھی ایسے پائے گئے ہیں جو اس عقیدہ کے موید ہیں لہذا مختصراً اس کے متعلق چند سطروں کا قلمبند کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ خیال کہ حیوانات کا قتل و ذبح ایک قسم کی بے رحمی اور سنگدلی پر مبنی ہے جس سے انسان کا اپنے حظ نفس کی خاطر ظلم کرنا پایا جاتا ہے۔ ایک نہایت جاہلانہ خیال ہے جو علت خداوندی کے سرسرمنا فی ہے اسی خیال کے رُو سے بعض اقوام عالم کا یہ عقیدہ ہے کہ صالح ایک نہیں بلکہ دو ہیں ایک تو خیر کا خالق ہے اور دوسرا شر کا اور حیوانات کا ذبح و قتل خالق شر کے متعلق ہے اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حیوانات کا ذبح و قتل کسی پہلی جنم کی عقوبت پر مبنی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو تناسخ ارواح کے قائل ہیں اور بعض لوگ اس کی علت کے دریافت کرنے سے اپنے تئیں عاجز تسلیم کرتے ہیں مگر یہ سب باتیں قالون الہی کی حکمت اور مصلحت سے ناواقف ہونے کا نتیجہ ہیں۔ عقائد اسلام میں ان کو کوئی جگہ نہیں اگر یہ لوگ اس امر میں غور کرتے کہ حکم الہی ربنا ما خلقت هذا باطلاً عالم کائنات میں کوئی ایک شے بھی ایسی نہیں نظر آتی جو مخلوق خدا کی منفعت عامہ کے لئے پیدا نہ کی گئی ہو۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ بعض اوقات اسی عامہ مصلحتوں میں جہتی ضرر بھی پایا جاتا ہے۔ اور ایسا ہونا عالم نادیات کی فطرت کے لئے ایک امر لازم ہے۔ مثلاً باران رحمت کے مفید عام ہونے میں کسی کو کلام نہیں مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے ساتھ جہتی شر شامل نہیں ہوتا۔ ایک رانڈ بڑھصیا کا جھونپڑا تباہ ہو جاتا ہے۔ اور ایک پھل کر بازو یا ٹانگ

توڑ بیٹھا ہے۔ آمد و رفت مسافران میں تخلیص کا پیش آنا اور بسا اوقات مال و متاع کی
 تباہی ایسے واقعات ہیں جن کا مشاہدہ ہر ایک شخص کر سکتا ہے۔ مگر کبھی کسی عقل مند
 سمجھدار کی زبان سے یہ نہیں سنا گیا کہ نزول بابل نزل عذاب ہے تو کبھی ان کے
 ایسے لغو عقیدہ اور بے مغضے خیال کی تائید کا موقع نہ ملتا۔ کیونکہ ذبح و قتل حیوانات
 میں بے شک بظاہر ایک سید روانہ سلوک پایا جاتا ہے مگر اس کے ضمن میں جو بیشمار
 مصالح مضمر ہیں وہ عین حکمت خداوندی کا نتیجہ ہیں۔ قانون تنازع البقا کی اصلیت پر
 غور کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ذبح و قتل حیوانات سے مقصود بالذات ظلم و سیر صمی نہیں
 بلکہ صالح حقیقی نے عالم کائنات میں ایک ناقص مخلوق کو کسی دوسرے کامل مخلوق کی
 بقا کا سبب بنایا ہے اور ادنیٰ درجہ کے موجودات کو اعلیٰ درجہ کے موجودات کے
 لئے مطیع و مسخر کر دیا ہے کیا نباتات میں روح نباتی نہیں ہے پھر کیوں اسے حیوان
 کی غذا بنایا گیا کہ یہ ظلم نہیں ہے؟ اسی طرح ناقص درجہ کے حیوانات کو کامل درجہ کے
 حیوانات کا مادہ غذا بنایا گیا ہے۔ اور قانون تنازع البقا کا جس کی ضرورت اور تائید
 میں کل محققین نے بڑے مباحث جلیلہ قلمبند کئے ہیں یہی منشاء ہے کہ ادنیٰ موجودات
 اعلیٰ اور اشرف موجودات کی بقا کے لئے مادہ غذائیہ پہنچائے۔ قانون فطرت کے ایسے اہم
 نتائج کے مقابلہ میں دو صالح خیر و شر کا ماتا یا کسی پہلے جنم کی عقوبت کا قائل ہونا محض
 ایک ناکالانہ اور سفیہانہ خیال ہے۔ اگر نباتات حیوانات کی غذا نہ ہوتی اور ادنیٰ
 حیوانات اعلیٰ حیوانات کے لئے مادہ غذائیہ نہ پہنچائیں تو اس کا حتمی نتیجہ یہ ہوتا
 کہ نباتات اور حیوانات مردہ ہو کر سڑ جاتے اور عفونت کے عام ہو جانے پر اس قدر
 دبائے عام اور مختلف قسم کی بیماریاں دنیا میں پھیلی جاتیں کہ انسان کی ہلاکت تک نہایت
 جاتی۔ قانون تنازع البقا صرف نباتات اور خشکی کے حیوانات تک ہی محدود نہیں بلکہ
 وسیع سمندروں میں بھی یہی کیفیت مشاہدہ کی جاتی ہے چھوٹے حیوانات بڑے حیوانات

کے لئے مادہ غذائیہ ہم پہنچاتے ہیں۔ خالق حقیقی نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے اس کے لئے خلق لکھ ما فی الذوق جیسا کا وسیع و سترخوان بچھا یا ہے پھر یہ کیسے کوئی قلمند آدمی جو افعال ذات باری کی حکمت سے آگاہ ہو حیوانات کے ذبح و قتل کے جزئی ضرر کو مد نظر رکھ کر کہہ سکتا ہے کہ ایسا کرنا ظلم اور سیرجی پر مبنی ہے۔ اگر یہ لوگ غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے اس فعل میں صرف اس کی اپنی ذاتی منفعت ہی نہیں بلکہ خود ان حیوانات کے حق میں بھی مفید ہے۔ کیونکہ یہ تو یقیناً معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ اس لئے بچائے اس کے کہ دنیا میں ان کی کثرت اس وجہ تک پہنچ جائے کہ میدانوں اور جنگلوں میں ان کی گنجائش نہ ہو سکے تو خود انہیں کے لئے ایک حشر بننا ہو جائے۔ اور بری موت مرے اور انسانوں کو بھی ساتھ لے مرے۔ اسلام پاک نے ذبح و قتل حیوانات کی اجازت عام عطا فرما کر قانون متنازع البقا کی تصدیق کر دی۔ اسی قسم کے حکم اور مصالح کو مد نظر رکھ کر جو احکام شریعت میں مضمر ہیں ہم نہایت تمدنی کے ساتھ یہ کہا کرتے ہیں کہ دنیا کا آئندہ مذہب صرف اسلام پاک ہی ہوگا۔

کون کہتا ہے کہ انسان کا قصاص کے طور پر قتل کئے جانا اس کے لئے ضرر نہیں۔ مگر اصول مدن معاشرت و سیاسیات اس امر کے مقتضی ہیں کہ ایسا کیا جائے۔ ورنہ مخالفین کے خیال کے مطابق ضروری ہے کہ اگر کوئی مریض کسی ایسی ہلک بیماری میں مبتلا ہو جس پر ڈاکٹر کو عمل جراحی کرنا ضروری ہے تو محض اس غرض سے کہ مریض کو تکلیف ہوگی عمل جراحی سے روک دیا جائے۔

بریں عقل و دانش بیابید گریست

اس قسم کے عقائد عموماً تمام مذاہب باطلہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور جن کے قلع و قمع کے لئے صرف قرآنی تعلیم ہی متکفل ہے۔

عالم برزخ

چونکہ عالم برزخ کا ذکر قرآن مجید میں آچکا ہے چنانچہ فرمایا ومن درائهم برزخ الی یوم
یبعثون۔ یعنی ان کے آگے برزخ ہے جہاں انہیں قیامت تک رہنا ہو گا اس لئے
ضروری نظر آتا ہے کہ اس کے متعلق مناسب تشریح کی جائے سو معلوم ہونا چاہئے
کہ انسان کو پیدا ہونے کے بعد تین عوالم سے گذر کر اپنی انتہائی منزل تک پہنچتا ہے۔
اول عالم حس جس کو عالم شہادت بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ عوالم کے ذریعہ مشاہدہ میں آتا
ہے اور وہ یہی حیات طبعی کا عالم ہے جو انسان دنیا میں رہ کر پوری کرتا ہے۔ اس عالم کا
منظر ہر حواس خمسہ ظاہری ہیں۔ دوم عالم خیال جس کو عالم مثال اور عالم غیب بھی کہتے
ہیں اس عالم میں انسان حیات روحانی حاصل کرتا ہے اور اس کا منظر ہر حواس باطنی ہیں
اور حواس باطنی اس عالم میں وہی کام دیتے ہیں جو حواس ظاہری عالم شہادت میں۔
وجہ اس کی یہ ہے کہ روح کا جب تک بدن سے تعلق رہتا ہے وہ اشیائے خارجیہ کا
احساس کرتی ہے اور بذریعہ حواس ظاہری وہ عمل احساس کو سرانجام دیتی ہے مگر جب
روح بدن سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔ تو عالم شہادت یعنی اشیائے خارجیہ سے منقطع
ہو کر عالم خیال میں پہنچ جاتی ہے اس وقت اس کی قوت خیال کا عمل قوی ہو جاتا
ہے۔ کیونکہ عالم شہادت میں لوازم مادیات کے حامل ہونے کی وجہ سے اس کا عمل بہت
ضعیف اور خفی رہتا ہے۔ مگر بعد الموت عالم خیال میں یہ عمل قوی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ
جب اسے اپنے مبداء کے کسی قدر قرب حاصل ہو جاتا ہے تو روح بذاتہا آلات و
حواس جسمانی کی مدد کے بغیر اپنا عمل سرانجام دینے لگتی ہے۔ چنانچہ جن اشیاء کو
ظاہری مادی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی انہیں باطنی حواس کے ذریعہ مشاہدہ کرنے

گنتی ہے۔ اور بعد الموت کے حقائق کو بالعیان دیکھتی ہے اور اس کے اعمال نیک و بد کے مناسب اس پر مختلف قسم کی صورتوں کا انکشاف ہوتا ہے چنانچہ وہ جو اس باطنی کے ذریعہ لذیذ چیزوں کو چکھتی اور خوشیوار چیزوں کو سونگھتی اور دلکش آوازوں کو سنتی اور لذتِ دالم کا اور اک کرتی ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بعد الموت کی صورتوں کا وجود ان اشیاء کے وجود کی طرح ہے جو خواب کی حالت میں محسوس ہوتی ہیں لیکن ذات اور حقیقت میں ہر دو کی صورتیں ایک نہیں ہوتیں۔ بلکہ بعد الموت کی صورتیں ان صورتوں کی نسبت اپنی حقیقت اور اصلیت میں کہیں زیادہ قوی اور شدید ہوتی ہیں جن کو انسان عالم شہادت میں محسوس کرتا ہے کیونکہ ما بعد الموت کی صورتوں کے لئے جہت مکانِ مان اور دیگر لوازم مادہ کی ضرورت داعی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مشاہدہ سے لذت اور دالم یا رنج و خوشی کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ بعد الموت کی حیات کو حیاتِ دنیا سے وہی نسبت ہے جو ان کی بیداری کی حالت کو خواب کی حالت سے ہوتی ہے حدیث الناس نیام اذا ماتوا انتہوا (لوگ سوئے ہوئے ہیں مگر جاگ اٹھیں گے) میں مذکورہ بالا حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ حدیث درحقیقت آیہ نکشفنا عنک عظامک فیصرک الیوم الحدید سے ماخوذ ہے۔

سوم عالم عقل خالص یہ وہ حیات ہے جو ان کو قیامت کے دن حاصل ہوگی جس کا منظر ہر فرد روح انسانی ہے۔ اس عالم میں روح کو اپنے مبداء ذاتِ باری سے اور بھی زیادہ قرب حاصل ہوگا۔ کیونکہ وہ طبعاً اپنے مبداء کی طرف کھینچی جا رہی ہے۔ آیہ وان الی ربک النقی اس پر شاہد ہے۔

انسان کو مذکورہ بالا ہر سہ عوالم میں ہو کر گزرنا ہے یعنی پہلے عالم محسوسات مادہ پھر عالم محسوسات مجرودہ اور پھر عالم عقل بالفعل میں بحکم آیہ لترکبن طبقاً عن طبق سے اپنے مختلف مراحح حیات کو پورا کرنا ضروری ہے۔ اور جب تک وجہ بدرجہ اپنی انتہائی سیر کو

پہلے درجے میں دوسرے درجے کی اور دوسرے درجے میں تیسرے درجے کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اس کی مثال بچہ انسان کی طفولیت۔ شباب اور پیری کے ہر سہ مدارج زندگی کی سی ہے۔ طفولیت میں شباب کی کیفیت اور شباب میں پیری کی کیفیت کا بھلا کوئی نمونہ اور اک ہو سکتا ہے۔ الغرض ہر ایک شخص کے مختلف مدارج زندگی کی سیر کا خاتمہ بالآخر ذات باری کی طرف ہوگا۔ جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ یا مثال کے طور پر لیں سمجھو کہ اس کی مختلف قسم دائرہ زندگی کا نقطہ ابتدا اس کے نقطہ انتہا پر منطبق ہو جائیگا۔ آیہ دن منکم لا واردها میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اہل تحقیق نے لکھا ہے۔ کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی حیات دنیوی کا خاتمہ ہو کر روح عالم برزخ میں چلی جاتی ہے اور اس کو قبر میں اپنے بدن سے ایک گونہ تعلق رہتا ہے۔ بعض انبیائے کاملین کی قبر سے آسمان کی طرف ایک لوزانی ستون کا دیکھا جانا غالباً اسی تعلق پر مبنی ہے۔ عالم برزخ میں روح کا وجود ایک جوہر مثالی کی صورت میں جو باویات سے علیحدہ ہو کر اور اک کرتا ہے قائم رہتا ہے اور وہ ایک حقیقت متعینہ مشفقہ کا نام ہے جس کو تمام لوازم اور اک حاصل ہوتے ہیں برزخ کے معنی ایک ایسی چیز کے ہیں۔ جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو۔ چونکہ قبر کی حالت دنیا اور آخرت کے مابین حائل ہے اس لئے اسے برزخ کہا گیا۔ عالم برزخ کی مدت موت سے قیامت تک اور اس کی جگہ قبر سے علیین تک صالحین کے لئے اور سحیین تک کفار اور فجار کے لئے تحقیق کی گئی ہے۔ عالم برزخ میں ایمانداروں کی روح کی تین صورتیں ہیں۔ اول ارواح انبیاء جن کی جگہ جنت ہے دوم ارواح شہداء جن کی جگہ ایک بنجر خیمہ میں ہے۔ جو جنت کے دروازہ پر لگایا ہے اور جہاں ان کو صبح و شام جنت کی روزی دی جاتی ہے۔ سیوم عامہ اہل ایمان کی روحیں جس کی نسبت بعض روایات میں آیا ہے کہ انہیں آسمان اقل پر آدم علیہ السلام کے دائیں بائیں جگہ دی جاتی ہے

اور بعض علمائے لکھاپے کہ ساتویں آسمان پر ایک گھر ہے جہاں ایمانداروں کی روہیں قرار پکڑتی ہیں جب کسی ایماندار کی روح مرنے کے بعد وہاں پہنچائی جاتی ہے تو وہاں کی روہیں اس کے آنے پر خوش ہوتی ہیں اور اس سے دنیا کے حالات پوچھتی ہیں۔

اور کفار اور فجار کی روہیں سحین میں پہنچائی جاتی ہیں۔ یہ عالم برزخ کا وہ مقام ہے جو برزخ کے تمام مقامات کی نسبت سب سے نیچے تجویز کیا گیا ہے اور سب سے اوپر کا مقام اعلیٰ علیین کہلاتا ہے اور یہ سب مقامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں دکھلائے گئے تھے۔ چنانچہ بعض روہیں سیر پرندوں کی شکل میں جنت میں آمد و رفت کرتی ہیں اور بعض کسی دنیا کے قرضہ کے ذمہ میں جنت سے روکی جاتی ہیں بعض عرش کے نیچے قنادیل میں رکھی جاتی ہیں اور بعض زمین پر ہی روکی جاتی ہیں اور بعض میکاٹل کے حوالہ کی جاتی ہیں اور بعض آدم علیہ السلام کی کفالت میں اور بعض زاینوں کے تنویر میں اور بعض خون کی نہر میں جگہ پاتی ہیں۔ اور ان سب کو اپنے جموں سے ایک قسم کا اتصال ہوتا ہے۔ اور اپنے اپنے اعمال کے مطابق نعیم اور عذاب کو حاصل کرتی ہیں۔ اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ روہیں ہر جمعہ کے دن اپنی قبروں کی زیارت کرتی ہیں۔

علم النسخ کے مذکورہ بالا کیفیات صرف تعلیم دہی سے اخذ کئے گئے ہیں۔ چونکہ عالم مادی کے اصول پر ان کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا اس لئے ہم انہیں بے چوں و چرا مان لینا ہی ضروری ہے۔

ایصال ثواب

ایصال ثواب ایک ایسا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ عامہ اہل اسلام اس کے قائل ہیں۔ اور

تمام عقائد کی کتابوں میں اس کی بحث کی گئی ہے اور عقائد میں اسے داخل کیا گیا ہے ایسی حالت میں اس سے انکار کرنا محض نادانی اور کج فہمی ہے سوائے معتزلہ کے مسلمانوں کے تمام فرقے (شیعہ و سنی) ایصالِ ثواب کے معتقد ہیں۔ معتزلہ کے انکار اور ان کے اس استدلال پر کہ خدا نے نہیں انسان الہاماسعی فرمایا ہے۔ علمائے اہل سنت محدثین و فقہاء۔ و صوفیہ وغیرہم نے بڑی جرح و قدر اور تردید کی ہے۔

۱۔ اگر آیہ شریفہ لیس انسان الہاماسعی کے واقعی یہ معنی لئے جائیں اور اس کا یہی مطلب ہو کہ انسان کو صرف وہی ملیگا جس کے لئے وہ بذاتِ خود کوکوشش کرتا ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے تو مسلمانوں کو بہت سے متفق علیہ معتقدات غلط اور ختم ہو جائیں گے۔ اور خود قرآن مجید کی بہت سی آیات اس ایک آیت کی محاضرات و مخالفت ثابت ہونگی۔

شفاعت جس کی مسلمانوں کو اس ہے اور قرآن پاک سے ثابت ہے امر فضول اور نحو ہو جائیگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے لئے دعائے مغفرت کرنا اور قبول ہونا غلط ہو جائیگا۔ اور ہر عمل کام سمجھا جائیگا۔ حالانکہ خود قرآن مجید میں ہے دلوانہم اذ ظلموا انفسہم جاؤلک فاستغفرواللہ واستغفرلہم الرسول لوجہ واللہ توابا رحیماً۔

اسی طرح نماز جنازہ اور وود و سلام اور والدین کے لئے دعائے مغفرت اور حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنی ذریت کے لئے دعا مانگنا۔ اور مومنین اور سابقین کے حق میں استغفار وغیرہ ذلک سب باتیں نحو اور بیکار ہو جائیں گی۔ حالانکہ ان سب امور

ہے اگر وہ لوگ اپنے نفسوں پر ظلم کر کے تیرے پاس آئے ہوتے اور خدا تعالیٰ ہی مغفرت مانگی ہوتی اور رسول خدا بھی ان کے لئے مغفرت مانگتے تو بیشک وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

کا ثبوت نص قطعی سے ہے عیاذاً باللہ۔ اور خدا نے اپنی پاک کلام میں وعدہ فرمایا ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں گے اور ان کی ذریت بھی ان کی متبع رہے گی۔ تو گو ان کی اولاد و ذریت ان کے درجہ و درتہ کی نہ ہو۔ لیکن ہم ان کے پاس خاطر سے ان کی ذریت کو بھی جنت میں داخل کر دیں گے۔ مذکورہ بالا آیت کی رو سے یہ الحاق جائز و درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ غیر کی سعی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ آیت کے ظاہری معنی کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں اس وجہ سے منکرین کو دھوکا ہوا ورنہ مسئلہ سے نفی ایصالِ ثواب ثابت ہی نہیں ہوتی۔

مفسرین میں اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے لیکن اکثر اس آیت لیس الانسان الامساخی کی یہ تفسیر کرتے ہیں کہ آیت سے میت کو دوسرے کی سعی سے نفع پہنچنے کی نفی نہیں ثابت ہوتی۔ کیونکہ ایصالِ ثواب سے منتفع ہونا اس سے میت کے اپنے ہی عمل و سعی (ایمان) کا نتیجہ ہے۔ اگر ایمان نہ ہو تو انسان کو کسی امر کا نفع نہ پہنچے۔ تو ہمارا ایمان ان تمام خیرات کا باعث ہوا۔ آیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو کسی امر کو کسی کی سعی کا نفع نہ پہنچا جب تک کہ وہ اپنے نفع کے لئے کوشش اور اپنے لئے خودی نہ کرے یعنی بندہ مومن نہ ہو۔

اور اکثر علمائے مفسرین الانسان میں لام تملیک کا لیتے ہیں۔ اور آیت کے یہ معنی لیتے ہیں کہ انسان اپنی سعی ہی کا مالک ہوتا ہے۔ نہ دوسرے کی سعی کا۔ ہاں غیر اگر اپنی سعی کو ہدیہ دہہ کرے تو اس سے وہ منتفع ہو سکتا ہے چنانچہ روح المعانی سید الموسیٰ مختار عراقی کی تفسیر (جو کئی جلدوں میں بہت معتبر تفسیر ہے) میں اس معنی کو بھی لکھا ہے اور لام تملیک کا بیان کیا ہے اور تفسیر جامع البیان میں اسی آیت کی تفسیر کو یوں بیان کیا گیا ہے اور بعضاً لا میلک شیئاً غیر ذلک وان کان قد یحصل له بفضل اللہ و بدعا لغير و صدقۃ له نفع لکن ہولاء ذلک (جامع البیان بر حاشیہ جلالین)

ان تفسیروں کے علاوہ اور کتابوں میں بھی اکثر علمائے اہل آیت میں لام تملیک کا

ایسا ہے اتحاد السادة المتقين شرح احیاء علوم میں علامہ زبیدی محدث رحمہ اللہ تحریر فرماتے
 اتفق اهل السنة على أن الاموات يتقعون من سعي الأحياء یعنی اہل سنت
 متفق ہیں کہ مروجے زندوں کی سعی سے منتفع ہوتے ہیں۔ پھر تحریر فرماتے ہیں۔ وذهب
 بعض اهل البدع من اهل الكلام الى عدم وصول شيء البتة لالdead
 ولا غيره وقوله مردود بالكتاب والسنة واستدلاله بقوله تعالى وان ليس للانسان
 الا ما سعى مدفوع بانه لم ينف انتفاع الجبل بسعي غيره والنافعي ملك غير
 سعيه واما سعي غيره فهو ملك لساعيه فان شاء ان يبذل له وان شاء ان يقيده
 لنفسه وهو سبحانه لم يقل لا يشفع الا بما سعى اور قریبا ایسا ہی علی قاری مبحث
 حنفی شرح فقہ اکبر میں ادنیٰ تئیر کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ
 علامہ ابن قیم محدث بھی کتاب الروح ص ۲۰۶ میں ایسا ہی لکھتے ہیں۔ القرآن لم
 ينف انتفاع الجبل بسعي غيره الخ یعنی قرآن مجید نے غیر شخص کی کوشش سے فائدہ
 اٹھانے کی نفی نہیں کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ بعض اہل بدعت نے جو ایصال ثواب سے انکار
 اور اس آیت سے استدلال کیا ہے مردود و دفع ہے۔ کیونکہ اس آیت سے انتفاع
 کی نفی نہیں نکلتی۔ بلکہ ملک کی نفی ہے۔ اگر کوئی اپنی سعی کسی میت کو ہدیہ دہہ کر دے تو اس
 سے اس کے منتفع ہونے کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں وکان
 شيخنا يختار هذه الطريق ويثبتها۔ کہ ہمارے شیخ علامہ (ابن قیم مرحوم) محدث

بعض اہل بدعت مثلاً معتزلہ اور پیچیدہ کا یہ خیال ہے کہ مرے ہوئے لوگ دوسرے لوگوں کی دعا صدقہ وغیرہ
 سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ حالانکہ قرآن و سنت سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے اور ان لوگوں کا آیت
 ليس للانسان الا ما سعى سے استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ لام تملیک کا ہے جس کا مطلب یہ ہے
 کہ انسان غیر کی سعی کا مالک نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ کہ اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھا سکتا۔ ۱۲ منہ +

اسی تفسیر کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے تھے ۔

ویکھو علامہ ملا علی قاری مہنچ الازہر شرح فقہ الکبریٰ استقناع پر اسی آیت لبس للانسان (الما سحی) سے استدلال کر کے فرماتے ہیں کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی شخص دعا و استغفار و صدقات و خیرات و قرأت قرآن یا اور کار خیر کسی میت کے لئے کرے اور اس کی سحی یہ ہو کہ میت کو اس کا ثواب پہنچے تو ضرور اس کی سحی پوری ہوگی اور میت منتفع ہوگی کیونکہ انسان جس امر کی سحی کر لگا۔ اس کو وہی ملیگا۔ اس لئے لبس للانسان (الما سحی)۔ برخلاف مشرکین ہمارے دعویٰ کی مثبت ہے نہ مبطل ۔

یہاں تک تو صرف قرآن مجید اور تفاسیر وغیرہ سے ایصال ثواب پر بحث کی گئی اب ذرا احادیث کی طرف توجہ کیجئے۔ احادیث صحیحہ احیا کی سحی سے اموات کو نفع پہنچنے کے بارے میں اس کثرت سے مروی ہیں کہ اگر سب طرق ملائے جائیں تو مشہور کیا معنی حد تو اتر کو پہنچ جائیں جیسا کہ علامہ ابن ہمام نے فتح التقدير باب الحج عن الغیر میں لکھا ہے احادیث سے تو صاف صاف ثابت ہے کہ مردے کو مالی خیرات۔ بدنی خیرات دعا۔ درود۔ نماز۔ روزہ۔ قرآن سب کا نفع پہنچتا ہے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے جناب سرور عالم صلعم سے پوچھا۔ انا نصدق عن موتانا ونحج عنهم وندعولهم فهل یصل ذلک الیہم یعنی ہم اپنے اموات کی طرف سے صدقات و خیرات اور حج اور ان کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں تو کیا یہ ان تک پہنچتا ہے۔ فرمایا۔ کہ ہاں پہنچتا ہے اور وہ اس سے اس طرح خوش اور مسرور ہوتے ہیں جیسے کوئی کسی کو عمدہ اور مرغوب ہدیہ و تحفہ بھیجے اور وہ اس سے خوش ہوئے۔ باب الحج عن النیر میں صحاح و سنن میں میت کی طرف سے حج کرنے اور مردے کو اس کا ثواب بھیجنے کے بارے میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں۔ آنحضرتؐ کا دو مینڈھے ذبح کرنا ایک اپنے اور اپنے عیال کی طرف سے دوسرا اپنی تمام اہل بیت کی طرف سے کتب احادیث میں مشہور و معروف ہے ۔

ایک شخص نے حضرت صلعم سے والدین کی وفات کے بعد ان کے ساتھ احسان و سلوک کرنے کی بابت پوچھا۔ فرمایا کہ مرنے کے بعد ان کے ساتھ احسان و سلوک یہ ہے کہ تم اپنی ناز کے ساتھ ان کی طرف سے ناز پڑھو اور اسی طرح ان کی طرف سے رونے رکھو۔ ایصالِ ثواب کی دو صورتیں ہیں۔ ایک نیا بہتہ یعنی مرنے کی طرف سے کوئی کار خیر کرنا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کار خیر کا ثواب اس کی طرف ہدیہ اور اسے بہہ کرنا اول الذکر تو بالکل متفق علیہ ہے لیکن ایسا ثواب اور بہہ میں بعض نے اختلاف کیا ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ بہہ میں تملیک و قبضہ شرط ہے اور اس صورت میں بہہ کرنا بالکل اس پر قابض ہی نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ چونکہ درست ہوگا لیکن انصاف یہ ہے کہ تملیک و قبضہ محسوسات میں ہوتا ہے اور ایصالِ ثواب کوئی محسوس امر نہیں در نہ کیا انسان اپنے لئے جو حسان و خیرات و سخی کرتا ہے۔ اس کی اسے تملیک حاصل ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس پر قابض ہوتا ہے؟ کتاب الروح میں علامہ ابن قیم نے مختلف جگہوں میں شیئ کی ہیں اور اسے ثابت کیا ہے۔ ایک جگہ میں لکھتے ہیں کہ جب کوئی مدیون مر جائے اور کوئی شخص اس کا دین اپنے پاس سے ادا کر دے اور میت کی طرف سے دائن کو اس کا دین دیدے تو شخص میت۔ اس سے منتفع ہوتا ہے۔ اور اس کے سر سے دین کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ نو ہدیہ اور بہہ سے وہ کیوں نہ منتفع ہوگا اور ان دونوں میں فرق یہی کیا ہے جس طرح سے کہ میت کا دین ادا اور پورا کر دینے اور اس کو بری الذمہ کر دینے سے وہ براہ و ادا میت تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ بری ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اگر ثواب عمل اس کو بخشے گا اور ہدیہ کرے گا۔ تو وہ ہدیہ اس تک پہنچے گا۔ اور بھلا کون ہی شخص کو نسا قاعدہ کو نسا قیاس ہے۔ جس کے بموجب ایک ذمہ داری ساقط کر دینے تو میت منتفع ہوتا ہے اور ہدیہ اور بہہ سے نہیں۔ شرح الصدور افسح القدير وغیرہ میں یہ حدیث منقول ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ سے مروی ہے کہ جو شخص مقبرے کی طرف سے

گذمے اور گیارہ بار سورہ اخلاص پڑھ کر اس کا اجر اموات کو بدیہ کرے (بخشدے) تو اسے ان اموات کے حد کے حساب سے ثواب ملیگا (خرجہ ابو محمد السمرقندی مرفوعاً) اور ابو القاسم سعدین علی زنجانی نے جناب ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ جو شخص مقبروں میں جائے اور سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص اور مقابر (الکلم الکاشف) پڑھ کر ثواب میت کو بخشدے اور کہے کہ خدایا میں نے جو کچھ پڑھا ہے اس کا ثواب ان اہل مقابر کو پہنچے تو وہ مروے خدا کے یہاں اس کے سفارشی ہو گئے (شرح الصدور)

ایصال ثواب بطریق بدیہیہ کے مجوزہ قائل بڑے بڑے بندگان علماء ہیں مثلاً امام احمد بن حنبل - حافظ شمس الدین بن عبد الواحد المقدسی - علامہ ابو محمد عبدالحق ابو محمد سمرقندی - امام غزالی - حافظ بن حجر مقلانی - ابو القاسم سعد زنجانی - علامہ ابن قیم محدث علامہ جلال الدین سیوطی - علامہ زبیدی محدث - امام عبد الوہاب شرنانی - ملا علی قاری - علامہ ابن ہمام - علامہ بدال الدین عینی - حضرت شاہ ولی اللہ محدث - حضرت شیخ عبدالحق مولانا شاہ عبدالعزیز محدث - اور علامہ قاضی شوکانی و دیگر اکابر علی امامت مقتدا بیان اہل حدیث (و خیرہم من العلماء والفقہاء والمصلحین والمحدثین رحمہم اللہ تعالیٰ)۔

علامہ ابن قیم کتاب الروح میں جہور سلف اور خاص کر امام احمد بن حنبل کا مسلک لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: "نیز امام احمد نے فرمایا کہ تین بار آیت الکرسی اور سورہ اخلاص پڑھ کر مردہ کو بخشدو" شرح الصدور میں ہے کہ امام غزالی کی احیاء اور علامہ عبدالحق کی العاقبۃ میں امام احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ جب تم مقبروں میں جاؤ - تو سورہ فاتحہ اور مغوذتین اور اخلاص پڑھ کر اموات کو بخشو ان کو ثواب پہنچا ہے ہدایہ

سے ان حضرات کے اسمائے گرامی لکھنے کا سبب یہ ہے کہ بعض متکبرین اس مسئلہ میں مزید توجہ سے کام میں نہ

باب الحج عن الخیر میں ہے الاصل فی هذا ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله
لغيره الى قوله عند اهل السنة والجماعة۔

قاضی شوکانی مرحوم میل الاوطار کی جلد دوم میں لکھتے ہیں وقد اختلفت فی غیر
لصدقة من اعمال البر هل یصل الی المیت فذهب المعتزلة الی انه لا یصل
شیء واستدلوا بالجموع الیة وقال فی شرح الكنزان للانسان ان یجعل ثواب
عمله لغيره الی قوله ویصل ذلك الی المیت ینفعه عند اهل السنة۔
امام عبد الوہاب شہرانی کشف الغمہ میں فرماتے ہیں قال ابن عباس کان رسول اللہ
صلی اللہ علیہم و آلہ وسلم یحیی علی الدعاء والصدقة والقرباء المهداة للموات
من اقاربہم و اخوانہم ویقول ذلك کلمة ینفہم۔ دیکھئے یہ حدیث حضرت ابن
عباس سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اپنی اموات کی طرف صدقات خیرات
کے ہدیہ کرنے کی ترغیب دیتے تھے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ نے النصاب
میں فرماتے ہیں کہ آئس زیارت قبور و تبرک بقبور صالحین و اداء و ایشاں بآداء و ثواب
و تلاوت قرآن و دعائے خیر و تقسیم طعام و شیرینی امر حسن و خوب است بہ اجماع علماء
اکثر محدثین و علماء بڑے زور سے اس کے قائل ہیں۔ نازنک کے ہدیہ ہونے
موجہ مثبت ہیں (زبدۃ النصاب) کا ص ۱۰۳ و ص ۱۰۴ و ص ۱۰۵ ملاحظہ ہو طوالت کی وجہ
سے برج نہیں کرتا۔

ثواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم مسک الختام میں فرماتے ہیں۔ شیخ در ترجمہ
گفتہ در آثار قرأت فاتحہ کتاب و موتین و قل ہو اللہ احد و گردانیدن ثواب بآئے
اہل مقابر آید است۔

المحقق الصیال ثواب و وطریقے اہل سنت والجماعت کے نزدیک درست
و جائز و مستحسن ہے۔ پیچروں اور محدود سے تو بحث نہیں ہاں اکثر غیر مقلدین کا

اس سے انکار کرنا باوجودیکہ وہ اپنے کو اہل حدیث کہتے ہیں سخت تعجب کی بات ہے حالانکہ اگلے محدثین و معتدیان اہل حدیث اس کے قائل اور مجوز تھے۔

یہاں تک ہمارے ایک فاضل دوست نے تحقیق کی ہے اس سے آگے ناکسا اپنی تحقیق بدیہ ناظرین کرتا ہے +

یہ بالکل صحیح ہے کہ انسان اپنے ان تمام مسئلہ مذکور بالا کی مزید تحقیق |

اعمال سے جو اس نے خود اپنی زندگی میں کئے ہوں فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کا کوئی عمل خواہ کچھ اور کیسا ہی مختصر ہو ہرگز ضائع نہیں ہو سکتا اس دعویٰ پر قرآن مجید ناطق ہے۔ اور احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ مگر ہمیں اس وقت اس مسئلہ پر بحث کرنا مقصود ہے کہ آیا مرنے کے بعد روح کسی زندہ شخص کے اس عمل سے جو بغرض ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھا سکتی ہے یا نہیں اسلام میں صرف اہل کلام کا مشہور فرقہ معتزلہ اس امر کا قائل ہے کہ مرنے والا زندوں کے عمل سے کسی طرح بھی مستفید نہیں ہو سکتا۔ اور وہ قرآن مجید کی آیت لیس للانسان الا ما سعى کو اپنے دعویٰ پر دلیل گردانتے ہیں جس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ انسان فقط اپنی سعی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ غیر کا عمل اس کے حق میں کچھ مفید نہیں ہوتا۔ واضح ہو کہ جمہور اہل اسلام فقہاء و محدثین و مفسرین بالاتفاق اس امر کے قائل ہیں کہ مردہ کو زندہ کے عمل کا فائدہ پہنچتا ہے اور آیہ مسطورہ بالا سے اس خیال کی قی نہیں ہو سکتی چنانچہ آگے چل کر ہم انشاء اللہ اس آیت کے صحیح معنی کی تحقیق کریں گے +

جس عمل کا ثواب مرنے والے کو مرنے ایصالِ ثواب کی دو صورتیں ہیں | کے بعد پہنچ سکتا ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں

(۱) اول اس عمل کا ثواب جس کا باعث مرنے والا اپنی زندگی میں خود بنا تھا (ثواب) دوم اس عمل کا ثواب زندہ مرنے والے کے بعد بغرض ایصالِ ثواب بجا لائے مثلاً

مرنے والے کے حق میں دعائے خیر کرنا اور اس کے لئے استغفار اور صدقات وغیرہ کا وینا۔ ان
 ہر دو صورت میں کسی مسلمان کا مرنے والے کو ثواب پہنچانا صحیح ہے۔ البتہ علمائے ائمہ اربعہ
 میں اختلاف صرف یہ ہے۔ کہ آیا مردہ کو عمل صدقہ کا ثواب پہنچتا ہے یا صدقہ صرف کرتے
 کا ثواب؟ کچھ ہوا ایسا کہ ثواب عند الجمع متحقق ہے۔ قسم اول کے ثواب پر وہ حدیث
 ولالت کرتی ہے جس کو مسلم نے اپنی صحیح میں بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کیا
 ہے اذامات الانسان الفظع عنہ عملہ الا من ثلث من صدقة جاریة
 او علم یتفق بہ او لم یصلح لیدعولہ یعنی انسان جب مر جاتا ہے۔ تو اس کا عمل
 اس سے رُک جاتا ہے مگر تین اعمال ایسے ہیں جس کا ثواب بعد از مرگ بھی اس کو پہنچتا
 رہتا ہے۔ اول صدقہ جاریہ مثلاً مسجد یا کنواں یا مہاں سرا وغیرہ۔ دوم علم شریعت کی
 مشاعت جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ سوم اولاد و صلح جو والدین کے حق میں دعائے
 مغفرت کرتے رہیں۔ افسن ابن ماجہ بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے
 انما یلحق المؤمن من عملہ وحناتہ بعد موتہ علما علمہ ونشرہ وولدا
 صالحا ترکہ او مصحفا ورثہ او مسجدا بناہ او بیتا لا من السبیل بناء نھرا اکواہ
 او صدقة اخرجھا من مالہ فی صحۃ و حیاتہ تلحقہ من بعد موتہ۔ یعنی
 ایسا اندر آدمی مرنے کے بعد اپنے اعمال اور حنات کو پاتا ہے۔ خواہ کوئی علم ہو جو دوسرے
 کو پڑھایا ہو۔ یا پھیلایا ہو یا فرزند صلح جو اس لئے پیچھے چھوڑا ہو یا قرآن مجید جو کسی
 دوسرے کا ملک کر دیا ہو یا مسجد جس کو اس نے تعمیر کیا ہو یا کوئی مہاں سرا یا نہر
 جو اس نے کھدوائی ہو۔ یا صدقہ جو اس نے اپنے مال سے اپنی محنت کی حالت میں
 فی سبیل اللہ لگا لیا ہو۔ اور صحیح مسلم میں بروایت جریر بن عبد اللہ مروی ہے قال رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم من سن فی الاسلام سنۃ حسنة فله اجرھا واجر من عمل
 بہا من بعدہ من غیر ان ینقص من اجرھ شیئ ومن سن فی الاسلام سنۃ سیئہ

کان علیہ وزرہا ووزر من عل بہا من اجبہ من غیر ان ینقص من اوزارہم شیاً
یعنی جو شخص اسلام میں کسی نیک طریق یا رسم کی بنا ڈالتا ہے۔ تو اس کو اس کا اجر اور اس پر
آئندہ زمانہ میں عمل کرنے والوں کا اجر ملتا ہے۔ بدول اس کے کہ عمل کرنے والوں کے
اجر سے کچھ کم کیا جائے۔ اسی طرح جو شخص اسلام میں کسی بُرے طریق یا بُری رسم کا بانی
ہوتا ہے۔ تو اس کا گناہ اور اس پر عمل کرنے والوں کا گناہ اس شخص کو پہنچا رہیگا۔
بدول اس کے کہ عمل کرنے والوں کے گناہ سے کچھ کم کر دیا جائے۔ اور منہ امام احمد
میں بروایت حذیفہ رضی اللہ عنہ مروی ہے۔ قال مسائل سہل علی عمد رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فامسک القوم ثم ان رجلاً اعطاه فاعطى القوم
فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من سن خیر فاستن بہ کان لہ اجر ومن
اجور من تبعہ غیر منتقص من اوزارہم شیاً یعنی ایک شخص نے جناب پیغمبر
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حاضر ہو کر کچھ سوال کیا کسی نے کچھ نہ دیا۔ پھر ایک شخص نے
سائل کو کچھ دیا۔ اسے دیکھ کر دوسروں نے بھی کچھ دیا۔ جناب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ جو شخص کسی ایک رسم کی بنا کرتا ہے۔ اور دوسرے اس پر چلتے ہیں۔ تو اس کو اپنا
ادمان لوگوں کا اجر ملتا ہے۔ جو اس پر چلتے ہیں بدول اس کے کہ ان لوگوں کے اجر
سے۔ کچھ کم کیا جائے۔

اسی مضمون

میں یہ حدیث بھی وارد ہوئی ہے لا تقتل نفساً ظلم الا کان علی ابن ادم الاول
کفل من دمہا لانہ اول من سن القتل یعنی کوئی شخص جب ظلم سے قتل کیا جاتا
ہے۔ تو آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے (قابیل) کو اس گناہ سے ایک حصہ ملتا ہے
کیونکہ وہی پہلے پہل رسم قتل کا بانی ہوا۔ جبکہ اس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا۔
ایصال ثواب کی قسم ثانی پر بھی دلائل قطعیہ موجود ہیں قال اللہ تعالیٰ والذین

جاءوا من بعدهم ليقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذين سبقونا بالايمان يعني وہ لوگ
 جوان کے بعد آئے ہیں۔ وہ بارگاہ رب العزت میں یوں عرض کرتے ہیں۔ کہ خدایا تو ہمیں اور
 ہماری ان بھائیوں کو جو ہم سے ایمان لانے میں سبقت کر گئے ہیں بخش دے *
 اس آیت شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے پہلے بھائیوں کے حق میں دُعائے استغفار کرنے
 پر اہل ایمان کی وجہ فرمائی ہے جس سے صاف طور پر عیاں ہے کہ مرنے والے اپنے بعد
 کے اہل ایمان کی دُعائے استغفار سے مستفید ہوتے ہیں اور اس استفادہ پر تمام علمائے
 امت متفق اللفظ میں نماز جنازہ کی حقیقت اس دعویٰ پر واضح دلیل ہے ایک حدیث میں
 بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے۔ یوں وارد ہوا ہے۔ اذا صلیتہ علی
 المیت فاخلصوا لہ الدعاء یعنی جب تم کسی میت پر نماز جنازہ ادا کرو۔ تو اس کیلئے
 دعا کو خالص کرو۔ اور صحیح مسلم میں بروایت عوف بن مالک مروی ہے۔ کہ جناب رسول اللہ
 علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جنازہ پر نماز ادا کی میں نے آپ سے یہ دعا ضبط کر لی
 اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ
 وادخلہ بالہما والتلج والبر ووقفہ من الخطاء کما نقیم الثوب الا بیض من
 الدنس وابدلہ دارا خیرا من دارہ واهلہ خیرا من اھلہ وزوجا خیرا من
 زوجہ وادخلہ الحبۃ واعذہ من عذاب القبر وعذاب النار یعنی خدایا اس
 کے گناہ کو بخش دے۔ اور اس پر رحم فرما اور اسے عاقبت بخش اور اس سے درگزر فرما
 اور اس کے حق مہمانی کی عزت فرما۔ اور اسے وسیع جگہ پر اتار اور سرد پانی اور برکت سے
 اسے پاک کر دے اور گناہ سے اسے ایسا پاک کر دے جیسے سفید کپڑا میل کپیل سے
 صاف ہوتا ہے۔ اور اس گھر سے بہتر گھر دیہاں کے اہل و عیال سے بہتر اہل و عیال
 اور یہاں کے زوج سے بہتر زوج عطا فرما۔ اور اسے جنت میں داخل کر اور عذاب
 قبر اور عذاب جہنم سے اسے پناہ دے اور سن میں بروایت واثلہ بن اسفغ مروی ہے کہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک شخص کا جنازہ پڑھا۔ تو آپ نے دعا فرمائی۔

اللہم ان فلان بن فلان فی ذمتک وحبل جوارک فقه من فتنة القبر وعذاب النار وانت اهل الوفاء والحق فاغفر له وارحمه انک انت عفور الرحیم۔

یعنی خدایا فلاں بن فلاں تیرے عہد اور ہمسائیگی میں آیا ہے تو اسے قبر اور جہنم کے عذاب سے بچالے تو وفائے عہد اور حق کا مالک ہے۔ تو اسے بخش دے اور اس پر رحم فرما۔

کیونکہ تو بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے اور بروایت ابن عثمان رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ حضور علیہ السلام دفنِ مدینہ کے بعد تیرے کھڑے ہوتے۔ اور فرماتے کہ اپنے بھائی کے

حق میں دعائے مغفرت اور خدا تعالیٰ سے اس کے سوال و جواب قبر کے وقت ثابت قدم رہنے کی استدعا کرو۔ کیونکہ اب اس کے امتحان کا وقت ہے۔ اسی طرح زیارت

قبور کے موقع پر یہ دعا پڑھنی حدیث میں مروی ہے السلام علیکم اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون تسلم اللہ لنا ولکم

العافیۃ۔ یعنی اے ایماندارو! اور مسلمانوں! جو ان گھروں میں ساکن ہو۔ تم پر سلام ہو۔ ہم بھی انشاء اللہ تم لوگوں سے آملے والے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے

لیئے عافیت کی استدعا کرتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس احادیث اور آثار میں مرنے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کا ذکر اس کثرت سے موجود ہے کہ اصلاً کسی کو مجالِ انکار نہیں۔ اور خود نماز جنازہ دعائے

مغفرت ہے۔ اگر اس دعا کا اثر نہ ہوتا۔ تو شارع علیہ السلام فعلاً اور تعلیماً اس زور کے ساتھ تاکید نہ فرماتے۔ اور بعد میں صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کی جماعت عصر بعد عصر

اس پر عامل نہ ہوتی۔ ایک حدیث میں وارو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بند کے مدارج کو جنت میں بلند کرے گا۔ وہ شخص پوچھے گا کہ یہ انعام مجھے کس عمل کے عوض ملا ہے۔

اس کو کہا جائیگا کہ تیرے بیٹے نے تیرے حق میں دعائے خیر کی تھی۔

ایصالِ اصدقتہ

اس کے بارے میں بھی احادیث صحیحہ موجود ہیں اور زمانہ

نبوی میں اور نیز بعد کے جماعت ہفت میں اس پر برابر عمل کرنا

ہونا چاہا آیا ہے۔ اور جمہور علمائے امت اس پر متفق ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں جو صحیحین میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مروی ہے کہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری ماں مر گئی۔ اور کچھ وصیت نہ کرنے پائی اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ پول سکتی تو صدقہ کھرتی کیا اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اس کا اجر اسے ملیگا؟

حضور نے ارشاد فرمایا کہ ہاں ملیگا۔ اور نیز صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی ماں وفات پا گئی۔ اور وہ موت کے وقت اس کے پاس موجود نہ تھے۔ انہوں نے جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری ماں میری غیر حاضری میں وفات پا گئی۔ کیا اگر میں اس کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو اسے مفید ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں مفید ہوگا۔ اس پر انہوں نے ایک بارغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا۔ اور صحیح مسلم میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ ایک شخص نے خدمت جناب پیغمبر علیہ السلام حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا باپ کچھ مال چھوڑا ہے۔ اور کچھ وصیت نہیں کی۔ کیا میرا اس کی طرف سے صدقہ کرنا اس کے لئے کچھ مفید ہوگا۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ ہاں مفید ہوگا۔

نیز سنن اور مسند امام احمد میں سعد بن عبادہ سے مروی ہے کہ ام سعد کے مرنے پر انہوں نے پیغمبر علیہ السلام سے پوچھا کہ میری ماں کے لئے کونسا صدقہ افضل ہے آپ نے فرمایا کہ پانی کا وقف کرنا۔ انہوں نے ایک کو داں کھدوا کر اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس اس باب میں اور بھی احادیث مروی ہیں۔ ثبوت و دعویٰ

ایصال ثواب صوم و حج

صحیحین میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا۔ من مات و علیہ صیام صام عنہ و لیثہ۔ یعنی جو شخص مرجائے اور روزے اس کے ذمہ باقی ہوں۔ تو بعد میں مرنے والے کا ولی اس کی طرف سے ادا کر سکتا ہے اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک عورت نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ میری ماں مر گئی اور اس کے ذمے کچھ روزے رہ گئے ہیں۔ جو اس نے نذر مان رکھے تھے۔ کیا میں اس کی طرف سے وہ روزے ادا کر دوں حضور نے فرمایا کہ اگر اس کے ذمہ کچھ قرض ہوتا اور تو ادا کرتی تو کیا ادا ہو جاتا۔ اس نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ فرمایا کہ تو اپنی ماں کی طرف سے روزے ادا کر دے۔ اور سنن البو داؤد میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ مروی ہے اذا مضی الرجل فی رمضان ولم یصم اطعم عنہ ولم یکن عنہ قضاء وان نذر قرضی عنہ ولیثہ یعنی جب کوئی شخص ماہ رمضان میں بیمار ہو جائے اور روزہ نہ رکھا ہو تو اس کی طرف سے ایک سکن کو ہر روزہ کے بدلے رکھا تا دیا جائے اور قضا نہ کی جائے۔ اور روزہ نذر اس کے ذمہ ہو تو اس کا ولی اس کی طرف سے قضا دے سکتا ہے اسی طرح ثواب حج کے بابے میں صحیح بخاری میں وارد ہوا ہے کہ بنی جہنیہ کی ایک عورت نے خدمت جناب پیغمبر علیہ السلام میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میری ماں نے حج نذر مان رکھا تھا اور بلا اوائے حج مر گئی کیا میں اس کی طرف سے ادا کر سکتی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں تو اس کی طرف سے حج ادا کر دے کیا اگر اس پر کوئی قرضہ ہوتا تو اسے ادا نہ کرتی۔ سو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ادا کے حقوق کا زیادہ مستحق ہے۔ اور نیز بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ ان امراة سالت النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ابنتها ماتت ولم یحج قال حجی من انبت یعنی ایک

عورت نے جناب پیغمبر علیہ السلام سے سوال کیا کہ میرا بیٹا بلا حج ادا کئے مر گیا ہے۔ اپنے فرمایا کہ اپنے بیٹے کی طرف سے حج ادا کرے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جمیع اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ کسی شخص کی طرف سے قرضہ کا ادا کرنا خواہ ادا کرنے والا کوئی اجنبی شخص ہو اور خواہ مرنے والے کے ترکہ سے نہ ادا کیا جائے مرنے والے مدیون پر سے قرضہ کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور ابو قتادہ والی حدیث اس دعویٰ پر صریح دلیل ہے۔ جبکہ وہ کسی عیب کی طرف سے دو دینار قرضہ کے ادا کرنے کے متکفل ہوئے تھے۔ اور عیب ادا کر دیئے تو حضور نے فرمایا کہ اب مرنے والے کی جلد (جناب نہ) سے بھنڈی ہو گئی۔ اور اس امر پر بھی اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ جب کسی زندہ شخص کا کسی میت پر قرضہ ہو اور وہ زندہ شخص میت کو صاف کر دے تو میت پر سے قرضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لئے مفید ہوتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس شخص کسی زندہ مدیون پر سے ساقط ہو جاتا ہے یا آنکہ زندگی کی نسبت امکان ادا کا احتمال ہوتا ہے اور وہ اگرچہ کسی غیر کے ادا کرنے پر راضی بھی ہو بلکہ اگر وہ بھی کر دے تو وہ زندہ قرضہ سے بری ہو جاتا ہے۔ تو میت جس کی نسبت امکان ادا کا احتمال نہیں ہوتا کیونکہ ادا نہیں ہوگا۔ اور جب غیر کے بری کرنے یا قرضہ ساقط کر دینے سے مدیون قائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تو بہ اور ہدیہ کر دینے سے کوئی کیوں مستفید و منتفع نہ ہوگا کیونکہ عمل کا ثواب تو ہدیہ کرنے والے یا بہ کرنے والے کا حق ہوتا ہے سو جب وہ خود کسی دوسرے زندہ مدیون سے قرضہ ساقط یا اسے بہہ کر سکتا ہے تو مرنے والے پر سے کیوں ساقط نہ ہوگا۔ کیونکہ کوئی نص یا قیاس یا قاعدہ شرعی ایسا نہیں جس سے معلوم ہو کہ زندہ بچے تو ساقط ہو جاتا ہے۔ اور مرنے والے پر سے ساقط نہیں ہوتا۔ زندہ اور مردہ میں اس مسئلہ میں کوئی امتیاز نہیں۔ اور نصوص ایصال ثواب الی المیت اس قدر قوی ہیں کہ ان سے یہ مسئلہ بلا شک و شبہ صاف ہو جاتا ہے اور احادیث کے رد سے جب

روزہ کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ حالانکہ روزہ محض نیت قلب پر منحصر ہے جس میں کوئی عمل خارجی نہیں کرنا پڑتا۔ تو بس فعل میں نیت اور عمل خارجی ہر دو شامل ہیں مثلاً قرأت قرآن کا ثواب بدرجہ اولیٰ میت کو اس کا ثواب پہنچا۔ گویا روزے کا ثواب میت کو پہنچانے میں یہ اشارہ ہے کہ باقی دیگر اعمال کا ثواب بلا شک میت کو پہنچتا ہے کیونکہ باقی سب میں نیت اور عمل خارجی موجود ہے۔ برخلاف روزہ کے کہ اس میں صرف نیت بلا عمل خارجی ہوتی ہے *

شارع علیہ السلام نے ثواب صدقہ کے میت کو پہنچنے کی بابت حکم دینے میں گویا اشارہ کر دیا ہے کہ تمام عبادات مالیہ کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ اور ثواب روزہ کے پہنچنے کی بابت حکم دینے میں یہ اشارہ فرمایا ہے۔ کہ دیگر تمام عبادات بدنیہ کا ثواب بھی میت کو پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح حج کی نسبت جو مالی اور بدنی ہر دو عبادات پر مشتمل ہے فرمایا کہ میت کو ثواب پہنچ جاتا ہے۔ اصران ہر سہ کی بابت نصوص احادیث اور اجماع اور قیاس صحیح موجود ہیں عبادت تو مقیمہ مانعین وصول ثواب کے دلائل مانعین وصول ثواب مفصلہ ذیل نصوص اپنے دعوے پر پیش کیا کرتے ہیں:-

(۱) وان لیس للامان الا ما سعى (ب) ولا تجزون الا ما کنتم تعملون -

(ج) لهما ما کسبت وعليهما ما اکسبت (د) قال رسول اللہ صلی علیہ وسلم (امات العبد انقطع عمله الا من ثلاث صدقة جارية علیہ وولد صالح یدعوله او علم یتفع بہ من بعدہ -

ان نصوص سے مانعین نے استدلال کیا ہے کہ مرنے والا صرف اس امر کا مالک ہوتا ہے جو اس نے کیا ہو۔ اور نص حدیث مذکورہ سے صرف صدقہ جاریہ اور علم صالح اور علم نافع کا بعد از مرگ ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ اسی طرح حدیث انس رضی اللہ عنہ

میں صرف سات اشیا کے ثواب کا مہیت کو پہنچا مذکور ہے۔ علم جس سے دوسرے لوگ مستفیع ہو سکیں۔ کتب و رسائل یا ہنر و صنعت کا کھدوانا۔ درخت کا لگانا۔ مسجد کا تعمیر کرنا کسی غیر کو قرآن مجید کا مالک بنادینا۔ ولد صالح جو دعا معفرت کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بدوں اس کے اور کسی عمل کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اور نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ کسی چیز کا ہدیہ بھیجا ایک قسم کا حوالہ ہے اور حوالہ کسی حق واجب کے واسطے ہوا کرتا ہے۔ اور اعمال سے ثواب واجب نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ثواب محض فضل خداوندی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ایک ایسے امر کو جو واجب نہیں کیونکہ کسی دوسرے کی طرف حوالہ کیا جاسکتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ اعمال پر ثواب دے یا نہ دے اور اگر کوئی شخص کسی غیر کی طرف سے کوئی عبادت مالی یا بدنی سنبھالے اور اس کو خدا تعالیٰ پر حوالہ کرے کہ وہ کسی مرنے والے کو اس کا ثواب عطا فرمائے تو اس کی نظیر بعینہ ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص کسی فقیر کو کسی ایسے شخص کی طرف حوالہ کرے جس کی نسبت اسے امید ہے کہ وہ خیرات کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی غیر متعین چیز کا ہدیہ یا ہدیہ کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ اور نیز رجب عبادات میں کسی غیر کو اپنے اوپر ترجیح دینا مکروہ ہے تو غایت عبادات یعنی ثواب میں کیونکر ترجیح دینا جائز ہوگا؟ یہی وجہ ہے کہ امام احمد حنبل رحمۃ اللہ نے اس امر کو مکروہ قرار دیا ہے۔ کہ کوئی شخص خود جماعت کی پہلی صف سے پیچھے ہٹ آئے اور کسی غیر کو ادب کی وجہ سے آگے کرے کیونکہ اس حرکت سے ایک ایسے امر سے اعراض لازم آتا ہے جو حصول ثواب کا سبب ہے چنانچہ آپ سے فتویٰ لیا گیا کہ باپ کو کوئی شخص اپنی جگہ ادب سے اگلی صف میں دے سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ باپ سے احسان بہتے کے اور بہت سے طریق ہیں۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر میت کی طرف کسی عمل کے ثواب کا منتقل کرنا صحیح ہوتا تو زندہ کی طرف بھی ہو سکتا تھا۔ نیز اگر یہ خیال صحیح ہوتا۔ تو ثواب کا نصف اور رجب بھی

منتقل ہو سکتا نیز اگر یہ صحیح ہوتا تو کوئی شخص عمل کو اپنی ذات کے لئے بجا لاکر بعد میں دوسرے کی طرف منتقل کر دیتا۔ حالانکہ مجوزین کہتے ہیں کہ میت کو ثواب پہنچانے کے عمل کی حالت میں نیت ایصال کرنی چاہیے۔ اور نیز اگر یہ صحیح ہوتا تو جس طرح نفل کا ہدیہ کرنا یا سبہ کرنا جائز تھا۔ اسی طرح واجبات کا بھی جائز ہوتا۔ نیز تمام عبادات یا تکالیف شرعیہ ایک گونہ ابتلا اور امتحان پر مبنی ہیں۔ اس لئے ان میں بدل و عوض کبھی جائز نہیں کیونکہ شخص مکمل بذاتہ ذمہ دار ہے۔ وہ کسی کو اپنا قائم مقام نہیں بنا سکتا۔ مثلاً مریض ازالہ مرض کے لئے بذاتہ محتاج ہے کہ دوائی استعمال کرے اور بھوکا اور پیاسا بذاتہ محتاج ہے کہ روٹی کھائے یا پانی پیے۔ نہ یہ کہ کوئی دوسرا شخص اس کا قائم مقام ہو۔ نیز اگر غیر کامل کسی دوسرے کے حق میں مفید ہوتا۔ تو غیر کا اس کی طرف سے توبہ کرنا بھی مفید ہو سکتا۔ مگر یہ مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرداً فرداً ہر ایک شخص سے اسلام کا سوال کر لگیا۔ کسی ایک کا مسلمان ہونا دوسرے کے حق میں مفید نہ ہوگا۔ علیٰ ہذا نماز کا حال ہے۔ سو جب اصول میں ایک کا دوسرے کی طرف سے نائب ہونا جائز نہیں تو فروعات میں کیسے جائز ہوگا؟

رہا یہ معاملہ کہ لصوص میں دعائے مغفرت کا ذکر آیا ہے سو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی رحمت کاملہ سے میت کے گناہوں سے درگزر کرے۔

بعض اصحاب اس امر کے قائل ہوئے ہیں کہ عبادات دو قسم کی ہیں ایک قسم میں تو قائم مقامی ہو سکتی ہے۔ مثلاً اولے امانت۔ اولے دین اخراج صدقہ حج وغیرہ کا ثواب تو میت کو پہنچتا ہے۔ اور دوسری قسم میں قائم مقامی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اسلام لانا۔ نماز ادا کرنا۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا روزہ یہ ایسے عبادات ہیں جو خود فاعل کی ذات سے مخصوص ہیں کسی دوسرے کے کرنے سے میت کو ان کا ثواب نہیں پہنچتا۔

رہا حدیث مذکورہ بالا کا حوالہ جس میں میت کی طرف سے روزہ رکھنے کا ذکر آیا ہے سو اسکا جواب کئی ایک وجوہ سے ہو سکتا ہے۔ (۱) مؤطا امام مالک میں لکھا ہے (ایصوم احد عن احد قال وهو امر مجمع علیہ عندنا لا خوف فیہ یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے روزہ نہیں رکھ سکتا۔ اور ہمارے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے) (ب) مع ہذا حدیث عن المیت کے اسناد میں اختلاف ہے (ج) یہ حدیث آیہ وان لیس للانسان الا ما سعی کے منافی ہے (د) نیز یہ حدیث اس حدیث کے منافی ہے جس کو نسائی نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے۔ (ایصلی احد عن احد ولا یصوم عن احد ولكن یطعم عنہ مکان کل یوم مدامن خنطۃ یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے نہ تو نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ روزہ رکھ سکتا ہے۔ بلکہ ہر ایک دن کے عوض میں ایک مد گندم کا صدقہ کرنا چاہیے) (مد بمطابق دو کعبہ دست جس کو پنجابی میں ٹبک بولتے ہیں) (۲) یہ حدیث قیاس علی کے منافی ہے۔ کیونکہ جب نماز۔ اسلام۔ تو بہ میں کوئی کسی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ تو روزہ میں کیسے ہو سکتا ہے ؟

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہو گیا کہ ایک گروہ تو مطلقاً کسی قسم کی عبادت میں قائم مقامی کو جائز نہیں رکھتا۔ اور دوسرا گروہ بعض عبادات مثلاً صدقہ و حج وادائے قرضہ و امانت وغیرہ میں جائز رکھتا ہے۔ مگر مذہب صحیح وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ مجوزین کی طرف سے مانعین کے مذکورہ بالا دلائل کا رد حسبِ قیاس ہے واضح ہو کہ مانعین کے دلائل میں کوئی دلیل ایسی نہیں

رد دلائل مانعین

جو صحیح طور پر ان کے دعویٰ میں پیش ہو سکے۔ سب سے پہلی آیت وان لیس للانسان الا ما سعی پیش کی گئی ہے۔ مگر اس آیت کے مفہوم میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ کہ ایک گروہ کا خیال ہے کہ لفظ انسان سے مراد

اس آیت میں کافر ہے نہ مومن کیونکہ مومن اپنی سعی اور غیر کی سعی سے جو اس کی طرف سے
کی جائے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ پہلے احادیث میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ مگر حق
یہ ہے کہ کافر کی تخصیص صحیح نہیں۔ بلکہ نقطہ ان کافر اور مسلم ہر دو کو شامل ہے۔ کیونکہ
سیاق آیات سے عموماً ہی مفہوم ہوتا ہے اور اس کے نظامہ بکثرت قرآن شریف میں
موجود ہیں۔ مثلاً۔ یا ایہا الانسان اناک کادح الی ربک آلائیہ۔ اور ان الانسان
لنقی خسہ اور ان الانسان لربہ لکنود اور ان الانسان خلق ہلواہ اور
ان الانسان لیطغی اور ان الانسان لظلوم کفار۔

بعض مفسرین نے ان آیات میں البہل اور ولید بن مخیرہ اور عقیقہ بن ابی معیط
وغیرہ کفار سے مراد لی ہے۔ مگر تحقیق کے نزدیک ان آیات میں عام طور پر انسانی
فطرت کی حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے تخصیص صحیح نہیں۔

ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ آیہ مذکورہ بالاسابقہ شریعتوں کے متعلق ہے
امت مرحومہ مجذبیہ کے متعلق نہیں۔ کیونکہ اس امت کے لوگ اپنی اور غیر کی سعی سے
فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر یہ خیال پہلے خیال سے بھی زیادہ ضعیف ہے کیونکہ کوئی
قرنیہ اس امر پر دلالت نہیں کہ امت مجذبیہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے بلکہ حکم کی تقریر مقصود ہے
نہ الباطل اور ایک گروہ کا خیال ہے کہ للانسان میں حروف لام بمعنی حروف علی کے متعل
ہوا ہے مگر یہ خیال گذشتہ ہر دو معنی سے زیادہ ضعیف بلکہ باطل ہے۔ کیونکہ اس میں تائید
نعت مضمون کلام کو معنی ضد میں استعمال کرنا لازم آتا ہے۔ ایک اور گروہ نے یہ کہا ہے
کہ اصل میں کلام کی تفسیر یوں ہے کہ ان لیس للانسان الاماسعی اوسعی لہ یعنی
انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ تو دوسری کرے یا اس کے لئے کوئی دوسرا سعی کرے
مگر یہ صرف بلاقرنیہ کے ہرگز صحیح نہیں۔ بلکہ بلا حجت کتاب اللہ پر زیادتی لازم آتی ہے
اور بعض کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ بالامسوخ ہے اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے۔ والذین

امنوا واتبعتم ذریتہم بایمان الحق ابہم ذریتہم۔ یہ قول بنی عباس رضی اللہ عنہ
 سے مروی ہے مگر یہ بھی ضعیف ہے کیونکہ صرف کسی قول کی بنا پر کسی آیت کا حکم منسوخ
 نہیں ہو سکتا۔ مع ہذا نسخ و منسوخ میں یہ ضروری ہے کہ ہر دو کا مفہوم اکٹھا نہ ہو سکے
 بلکہ وہ ہر دو ایک دوسری کی نقیض یا منہ ہوا کرتے ہیں۔ مگر ان ہر دو آیات کے مفہوم
 کو بلا تعلق جمع کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد آخرت
 میں اپنے آباء کے تابع ہونگی جس طرح کے دنیا میں وہ اپنے آباء کے تابع تھے۔ اور
 اولاد کا آخرت میں بلا سچی بلحاظ ورثہ کے اپنے آباء سے ملحق ہونا و حقیقت ان کے
 آباء کی خوشی اور سرت کے لئے ہے نہ اولاد کے لئے۔ اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی
 ہے کہ بلا سچی کسی آدمی کو اعلیٰ حد پر پہنچا دے۔ اس میں پہلی آیت کیساتھ کیا منافات ہے
 النرض مذکورہ بالا توجیہات بالکل ناقابل اعتبار ہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ آیہ ان کا تندر
 و اذہرۃ و ذرہنی اخری لکونی نفس کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھایگا یعنی ہر ایک اپنے
 اپنے اعمال کا جوابدہ ہوگا اور آیہ وان لیس للانسان الا ما سغی علیہ علیہ آیات
 ممکنہ ثابتہ الحکم ہیں اور ہر دو اللہ تعالیٰ کے کمال عدل اور اس کی حکمت کاملہ پر مبنی
 ہیں۔ کیونکہ پہلی آیت کا اقتضا یہ ہے کہ کوئی کسی دوسرے کے جرم میں ماخوذ نہیں ہوگا
 اور دوسری کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی کسی دوسرے کے اعمال سے رستگاری نہیں پاسکیگا
 عذر کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر دو آیات میں فطرت الہی کا منہ ہیں۔ جن سے دو علیحدہ
 علیحدہ باطل خیالات کا رد ہوتا ہے۔ کیونکہ سلاطین کا اکثر قاعدہ تھا کہ مجرم کے متعلقین
 کو اس کے جرم کے عوض ماخوذ کر لیا کرتے تھے۔ پہلی آیت سے اللہ تعالیٰ نے
 انسان کو تسلی دیدی ہے کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوگا۔ دوسری آیت نے واضح کر دیا
 کہ اپنے آباء و اجداد وغیرہ کے اعمال اترانا اور ان سے امید رکھنا نجات کی جیسا کہ
 بعض جاہل مشائخ زادہ خیال کرتے ہیں بالکل فضول ہے +

ابو الوفاء میں عقل کی یہ مذکورہ بالا کے متعلق لکھتے ہیں کہ بہترین باب اس آیت کی تفسیر میں
 یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی خوش اعمالی اور حسن معاشرت سے دوست ادا دلاویم پہنچاتا ہے
 اور لوگوں سے خیر و مروت کے ساتھ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس پر رحم کرتے ہیں
 اور اس کے لئے عبادات کا ثواب بھیجتے ہیں سو اس صورت میں وہ اعمال اس کی سعی
 کا نتیجہ ہونگے۔ کیونکہ وہ خود اپنے اعمال سے ایسے احباب و اقارب کے بہیم پہنچانے
 کا سبب بناتا تھا۔ اس لئے گو بظاہر عمل کسی غیر کا ہے مگر درحقیقت اس کا موجب وہ خود
 ہے جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوئی ہے ان اطیب ما اکل المہجیل من کسیہ وان
 ولد من کسیہ یعنی اپنی کمائی کا مال سبک اچھا ہے اور انسان کا فرزند بھی اس
 کی کمائی میں داخل ہے۔ چنانچہ ولد صالح والی حدیث اور مذکور ہو چکی ہے۔ اور یہ مسلم ہے
 کہ آدمی شرعی اعمال میں اپنے بھائیوں کی امداد سے منتفع ہوتا ہے دیکھو کہ اکیلے
 کی نماز اکیلے ہوتی ہے۔ اور جب وہ دوسرے نمازیوں سے مل کر پڑھتا ہے تو اس
 کی نماز کا ثواب سوائس گنا زیادہ پڑھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر کا عمل کسی
 دوسرے کے عمل کے لئے زیادتی کا ثواب کا سبب ہو جاتا ہے چنانچہ جہاد اور حج اور
 امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ امور میں کثرت عاملین کی وجہ سے ثواب زیادہ ہو جاتا
 ہے اور حدیث المؤمن للمؤمن کالنبیان شید بعضہ بعضا و شبک بہن اصابہ
 یعنی ایماندار ایماندار کے ساتھ مل کر مثل ایک عمارت کی ہے جس کا ایک جزو دوسرے
 جزو کی تقویت کرتا ہے۔ اس امر کو جناب پیغمبر علیہم السلام نے انھیں میں انگلیاں ملا کر دکھایا
 کہ یوں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک ایماندار دوسرے
 ایماندار سے مل کر وصول نفع کا سبب ہوتا ہے۔ خواہ دوسرے کی حیات میں وصول نفع
 کا سبب ہو یا بعد از مات مع ہذا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خبر دی ہے کہ ملائکہ حاملان
 عرش اور جو اس کے گردا گرد ہیں ایمانداروں کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتے رہتے

ہیں اسی طرح بعض انبیاء علیہم السلام کی دعا مغفرت کا ذکر قرآن مجید میں آچکا ہے گویا کسی ایماندار کا ایماندار ہونا سبب ہے وصولِ ثواب کا اور یہ ظاہر ہے کہ ایماندار کا ایمان لانا اس کی ذاتی سعی کا نتیجہ ہے اس لئے یہ بالکل صحیح ہے کہ جو ثواب غیر کی طرف سے پہنچا یا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اس کے اپنے عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دیکھو جناب پیغمبر علیہ السلام نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اگر تیرا باپ ایمان لایا ہوتا۔ تو اس کی موت کے بعد تیرا اس کی طرف سے غلام آزاد کرنا اس کے لئے مفید ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان جو انسان کی ذاتی سعی ہے موجب وصولِ ثواب ہے۔

بعض علمائے اسلام نے آیہ وَاَنْ لِّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے متعلق یوں تقریر کی ہے۔ کہ قرآن مجید نے اس امر کی نفی نہیں کی کہ ایک شخص کسی غیر کی سعی سے منتفع ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس امر کی نفی کی ہے کہ کوئی شخص کسی غیر کی سعی کا مالک ہو سکتا ہے اور کسی غیر کی سعی سے منتفع ہونے یا غیر کی سعی کا مالک ہونے میں بڑا فرق ہے سو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ انسان صرف اپنی ہی سعی کا مالک ہو سکتا ہے۔ غیر کی سعی غیر کا اپنا ملک ہے اگر وہ چاہے تو کسی دوسرے کے لئے صرف کر دے یا اپنی ذات کے لئے محفوظ رکھے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ انسان غیر کی سعی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ صرف یہ فرمایا ہے کہ غیر کی سعی کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس تفسیر کو بعض اکابر علمائے امت نے مقبول رکھا ہے اور درحقیقت پتہ کی بات ہے۔ اب یہی مانعین کی دوسری پیش کردہ آیات یعنی آیہ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ اور آیہ وَلَا تَحْزَنُوا اَلَا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ سوانہر دو آیات کے سیاق سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ ان ہر دو کا مفہوم یہ ہے۔ کہ کوئی شخص کسی غیر کے جرم میں عقوبت کا مستوجب نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو مافات فرمایا ہے فالیوم لا تظلم نفس شیئاً ولا تجزون الا ما كنتم تعملون یعنی آج قیامت کے دن کسی شخص پر کچھ ظلم

نہیں ہوگا۔ اور تم لوگ مروت اپنے اعمال کی جزا پاؤ گے اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا کہ کسی شخص پر اس کے گناہوں سے زیادہ سزا عائد نہ ہوگی اور نہ اس کی نیکیوں میں سے کچھ کم کیا جائے گا۔ اور کوئی غیر کے جرم میں مآخوذ نہ ہوگا۔ غور کرو کہ ان آیات میں کہاں اس امر کا اشارہ ہے۔ کہ کوئی شخص کسی غیر سے بطریق ہب یا ہدیہ کے بھی منتفع نہ ہوگا۔ بلکہ یہ پینوہی اور ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ایک شخص کو کسی دوسرے کے لئے یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ اس کے حق میں کسی عمل نیک کو بطور ہب یا ہدیہ کے پیش کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماتا ہے یہاں عوض و معاوضہ کا ذکر کہاں ؟

اور حدیث اذامات العبد، انقطع عملہ الخ کا استدلال میں پیش کرنا سو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ عمل کے منقطع ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ انتفاع بھی منقطع ہو جائے انقطاع عمل تو مرنے کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ مگر کسی شخص کا بطور ہدیہ یا ہب کے ثواب عمل کا غیر کہ چنانچہ منقطع نہیں ہو سکتا۔ اس حدیث سے استدلال کرتے وقت گویا مسئلہ نے نہیں سمجھا کہ منقطع اور چیز ہے (عمل) اور غیر منقطع اور چیز (ثواب عمل غیر) اور مخالفت کا یہ کہنا کہ اس قسم کا ہدیہ ایک قسم کا حوالہ ہے اور جو حق واجب کی بابت ہو کرتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ خیال اس حوالہ کی بابت ہے جو ایک مخلوق دوسرے مخلوق پر کرے لیکن مخلوق کا خالق پر حوالہ کرنا علیحدہ بات ہے جس کو مخلوق کے مخلوق پر حوالہ کرنے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ایسا خیال بالکل باطل ہے مع ہذا امت کا اجماع ہو چکا ہے۔ کہ کسی شخص کے کسی غیر کی طرف سے ادائے قرض سے دیون بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ اور تمام صدقات اور حج کا ثواب کسی غیر کے لئے ہدیہ کیا جاسکتا ہے علی ہذا اقرار ہے بھی۔ بھلا انصوص شریعہ کے مقابلہ میں ان قیاسات فاسدہ کی کیا حیثیت ہے اور مانعین کا یہ خیال ہے کہ عبادت میں کسی کو اپنے پر ترجیح دینا صحیح نہیں کیونکہ امر خیر سے اعراض لازم آتا ہے

سوا اس کا جواب یہ ہے کہ زندہ کو واقعی اپنے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اس خیال پر کہ اس زندہ کے خاتمہ بالا ایمان کا ہمیں علم نہیں اگر اس کو اپنے پر ترجیح دیں تو ایک نابل کو امر خیر میں ترجیح دینا لازم آئیگا لیکن جو شخص مرچکا جس طرح اس پر نماز جنازہ بخیاں خاتمہ بالا ایمان ادا کیجاتی ہے اسی طرح بخیاں اس کے صبح الایمان ہونے کے اس کو عبادت میں ترجیح دیکر ثواب عبادت کا ہدیہ یا سہ اس کے حق میں کیا جاسکتا ہے۔ مع ہذا عبادت میں جسے کو ترجیح دینے اور ثواب کے ہدیہ کرنے میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ عبادت میں ترجیح دینے سے ایک گونہ سستی اور کسالت کا مضمون ظاہر ہوتا ہے۔ اور عمل کا ثواب ہدیہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ دوسرے کو نفع پہنچاتا ہے یا خود نفع اٹھانا چاہتا ہے۔

نیز عبادت میں دوسرے کو اپنے پر ترجیح دینا مقصود عبودیت کے منافی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اظہار عبودیت کرے۔ جب یہ اس نے خود ترک کر کے غیر کو اپنے پر ترجیح دی تو گو حکم خداوندی کو ترک کیا لیکن ایک عمل خیر کا خود سچا لاکر اس کا ثواب دوسرے کو پہنچانا ایک علیحدہ بات ہے۔ بلکہ یہ ایک عمل خیر کی طرف سبقت کرنا ہے جو بحکم آیہ فاستبقوا الخیرات باطل جائز بلکہ ضروری ہے اور اس ہدیہ یا سہ ثواب کو ہرگز سبقت الی الخیر کا منافی نہیں کہا جاسکتا۔

اور مانعین کے اس قول کا جواب کہ اگر ہدیہ ثواب میت کے لئے جائز ہوتا تو زندہ کے لئے بھی جائز تھا۔ سوا اس کا جواب یہ ہے کہ بعض فقہاء کے اقوال میں زندہ اور مردہ میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا۔ ہر دو کو یکساں طور پر ہدیہ ثواب کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ مگر بعض فقہاء نے کہا ہے کہ زندہ اور مردہ کی حالت میں بہت فرق ہے کیونکہ زندہ اس قدر محتاج نہیں ہے جس قدر مردہ گر زندہ کے لئے بھی دوسرے کے عمل کا ثواب ہدیہ کیا جاسکتا تو عبادت و نوافل وغیرہ کو لوگ خود سچا لاتے بلکہ دوسروں سے بطور ہدیہ یا بطور اجرت کے حاصل کر لیا کرتے۔ اور ہر ایک قسم کی طاعت و عبادت ایک قسم کا عوض محض

ہو جاتی اس لئے یہ ہرگز صحیح نہیں کہ زندہ ہدیہ ثواب کا مستحق قرار پاسکے رہا ایک زندہ شخص کی طرف سے دوسرے شخص کا قرضہ ادا کرنا سو یہ شرط ثابت ہے اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ قرضہ حقوق العباد میں سے ہے۔ جس میں کوئی ایک شخص دوسرے کی طرف سے قائم مقامی کر سکتا ہے۔ خواہ بدیوں کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد۔ اور مانعین کے اس قول کا جواب کہ اگر ہدیہ ثواب جائز ہوتا۔ تو اس کا نصف اور ربع بھی جائز ہوتا۔ یہ ہے کہ بعض مجتہدین اس امر کے قائل ہیں کہ ثواب عمل عامل کا ملک ہے اور اس کو اختیار ہے کہ کل یا نصف یا ربع کسی دوسرے کی طرف منتقل کرے چنانچہ بعض فتاویٰ میں وارد ہوتا ہے کہ اگر ایک عمل خیر کا ثواب چار شخصوں کو پہنچانا چاہے تو ہر ایک کو اس ثواب کا ربع پہنچ جائیگا۔

اور مانعین کے اس قول کا جواب کہ اگر ایصال ثواب صحیح ہوتا۔ تو یہ بھی صحیح ہوتا۔ کہ شخص عامل پہلے عمل کو اپنی ذات کے لئے بجا لاتا اور پھر بعد میں اس کا ثواب دوسرے کی طرف منتقل کر دیتا۔ حالانکہ تم مجتہدین اس بات کے قائل ہو کہ ایصال ثواب تب ہی ہوتا ہے۔ کہ عمل کرتے وقت عامل ہدیہ یا ہبہ کی نیت پر کرے ورنہ ایصال ثواب نہیں ہوتا۔ یوں ہے کہ کلام سلف میں ایسی شرط نظر نہیں آتی۔ البتہ بعض متأخرین نے اس امر کا ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی عمل از قلم نماز۔ روزہ۔ قرأت قرآن بجا لاکر اس کا ثواب کسی مروتہ مسلمان کو پہنچائے تو وہ اس کو پہنچ جاتا ہے بشرطیکہ عمل سے پہلے یا اتنا سے عمل میں اس کی نیت کر لی ہو۔ اور ابو عبد اللہ بن حمدان رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کوئی حق شرعی واجب جس میں قائم مقامی ہو سکتی ہے کسی کی طرف سے ادا کرے تو اس کا اجر اس کو پہنچ جاتا ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ نیت عامل کے عمل سے پہلے یا عمل کے وقت ہدیہ یا ہبہ کی ہونی چاہئے۔ اور غالباً یہ خیال سنت نبوی سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے ایصال ثواب کی بابت جناب پیغمبر علیہ السلام سے سوال کیا تھا۔ ان کا یہ سوال نہیں تھا

کہ عمل کر چکنے کے بعد بھی ہم اس کو کبھی مردہ کی طرف منتقل کر سکتے ہیں یا نہیں بلکہ ان کا سوال یہ تھا کہ ہم میت کی طرف سے کر سکتے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں عمل اولائیت کی نیت پر کیا جائیگا۔ نہ کر چکنے کے بعد اس کا ثواب منتقل ہو گا۔ فی الحقیقت اس شرط کی تائید آثار صحیحہ سے ہوتی ہے۔ اس لئے اسلم طریق یہی ہے کہ ایصال ثواب کی نیت قبل از عمل کرے مگر بصورت ذکر نے کے بھی انتقال ثواب ہو سکتا ہے۔ علمائے اُمت اس کے قائل ہو چکے ہیں۔

اور مانعین کے اس قول کا جواب کہ اگر ایصال ثواب صحیح ہوتا۔ تو فرائض و واجبات کا ثواب بھی انتقال کیا جاسکتا۔ یہ ہے کہ یہ اعتراض اس شخص کے مذہب پر سرگزر وارو نہیں ہوتا۔ جو ایصال کی رو یا قبل از عمل نیت انتقال کو ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ عامل پر تو واجب نہیں ہوا۔ برے ہی کی طرف سے کیے او اگر سکتا ہے۔ ہاں جو شخص عمل کر چکنے کے بعد بھی ایصال و انتقال کا قائل ہے۔ اس پر یہ اعتراض ضرور عائد ہوتا ہے سو اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت علمائے اُمت سے منقول ہے کہ وہ اپنے فرائض و نوافل کا ثواب اہل اسلام کی طرف سے منتقل کر دینا جائز رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ عمل عامل کا ملک ہے جب شریعت میں اس کی ممانعت نہیں تو اس کا احتیاء ہے کہ غیر کی طرف منتقل کر دے۔

اور مانعین کے اس قول کا جواب کہ تکالیف یا عبادات شریعہ ایک قسم کا امتحان و ابتلا ہیں ان کا غیر کے لئے بدل و صرف صحیح نہیں۔ کیونکہ تکلیف شرعی سے عامل کی ذات کا عمل کو جو دیکھا لانا مقصود ہے یہ ہے کہ یہ خیال اس امر کا مانع نہیں کہ شارع علیہ السلام کسی مسلمان کو اجازت دیں کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے عمل سے نفع پہنچائے۔ بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور اس کا کمال احسان سمجھنا چاہئے چنانچہ اس نے ملائکہ اور حاملین عرش کو اہل ایمان کی مغفرت پر لگا رکھا ہے۔ اور جناب پیغمبر علیہ السلام کو اہل ایمان کے حق

میں دعائے استغفار کا حکم دیا اور قیامت کو نہ بعض شفاعت بمقام محمود میں مبعوث فرمانا تجویز کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے قبور پر کھڑے ہو کر ان کے حق میں دعا فرمایا کرتے علیٰ ہذا کسی خاص شخص پر عمل کا واجب ہونا اس امر کا مانع نہیں کہ غیر اسکے لئے ایصال ثواب کرے۔

اور مانعین کا یہ کہنا کہ عبادات مقیم کی ہیں۔ ایک قسم میں تو دوسرے کی طرف سے قائم مقامی ہو سکتی ہے اور دوسری میں نہیں۔ یا نفل باطل خیال ہے کیونکہ نہ تو کتاب اللہ اور نہ سنت صحیحہ اور نہ کوئی قیاس صحیح اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ فلاں عبادت میں تو کسی غیر کی طرف سے قائم مقامی ہو سکتی ہے اور فلاں میں نہیں۔ دیکھو ورنہ میں قائم مقامی نہیں ہو سکتی۔ مگر حدیث میں غیر کی طرف سے روضہ ادا کرنا واجب ہو چکا ہے۔ بلکہ شریعت نے فرض کفایہ میں بھی قائم مقامی کو جائز رکھا ہے۔ جس پر صحیح یہ ہے کہ اگر کوئی ایک بھی اس کو ادا کرے تو دوسروں پر سے ساقط ہو جاتا ہے (اور طفل نابالغ جو ابھی عقل کے درجہ کو نہ پہنچا ہو) کی طرف سے اس کا قیام یعنی سرپرست حج کا احرام باندھ سکتا ہے۔ اور تمام مناسک حج ادا کر سکتا ہے۔ امام ہمام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے اس امر کو جائز رکھا ہے کہ ایسے شخص کی طرف سے جو بے ہوش پڑا ہو۔ یا اس پر غشی طاری ہو گئی ہو۔ اس کے ساتھی احرام باندھ سکتے ہیں۔ اور شارع علیہ السلام نے والدین کے اسلام کو اطفالِ صغیرہ کا اسلام قرار دیا ہے۔ علیٰ ہذا شریعت حقہ اسلامیہ میں اس قسم کی قائم مقامی کے اور بھی بہت سے نظائر موجود ہیں بلکہ اگر کوئی شخص نہایت غور سے کام لے تو اس کو معلوم ہو جائیگا کہ شریعت اسلامی کا عین منشا یہی ہے کہ ایصال نفع کسی غیر تک کیا جائے۔ بھلا شریعت کیونکر کسی ایسے عمل نیک کو روک سکتی ہے جس سے ایک شخص اپنے والدین یا اپنے مسلمان بھائیوں سے احسان و مروت یا کسی قسم کی نیکی بجالا سکے۔ جبکہ مرنے کے بعد لوگ تھوڑی تھوڑی نیکی کے

بھی فتلج ہوتے ہیں۔ بہر صورت اسلام میں ہر ایک قسم کے عمل کا ثواب بلکہ کسی قسم کی شرط کے ہر ایک مسلمان مردہ کو پہنچ سکتا ہے۔ اور یہی صحیح مذہب ہے۔
 مع ہذا اس امر کی تصدیق میں اہل ایمان کے بشمار ایسے روایات صادقہ (خواب) موجود ہیں جس میں ثواب پہنچانے والوں کو مرنے والوں نے کہا کہ تمہارے فلاں عمل کے ثواب ہدیہ کرنے سے ہم پر سے عذاب کی تخفیف ہو گئی اور اس قسم کے روایات درجہ تواتر تک پہنچ چکے ہیں جس کی کوجہ سے حلال تک باقی نہیں رہی اور انکی پیچیدہ وہی نظیر ہے جو حدیث صحیح میں وارد ہو چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اری رؤیا کہ قد تواطأت علی النہانی الدشر الا و اخری میں دیکھتا ہوں کہ لیلتہ القدر کے بارے میں تم سب کی رؤیا (خواب) اس امر میں باہم مطابقت میں کہ لیلتہ القدر رمضان شریف کے عشرہ آخر میں ہے۔ سو جس طرح روایت حدیث میں ایک کثیر تعداد کے راویوں کا ایک ہی حدیث کو روایت کرنا اس کو درجہ تواتر تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح کثیر التعداد اہل ایمان کے روایات بھی درجہ تواتر تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔ اور مسئلہ تنازعہ میں ایک جم غفیر کے روایات اس بارے میں ثابت ہیں جو باہم مطابق ہیں۔

اور مانعین کا مذکورہ بالا حدیث موطا امام مالک رحمہ اللہ کا پیش کرنا کہ کوئی شخص کسی غیر کی طرف سے روزہ نہ رکھے اور امام مالک رحمہ اللہ کا یہ فرمانا کہ اس میں اختلاف نہیں۔ صحیح نہیں کیونکہ امام صاحب نے عندنا سے صرف اہل مدینہ کا مذہب پیش کیا ہے اور ان کو دیگر تمام بلاد کے علمائے اُمت کے اختلاف پر اطلاع نہیں ہوئی۔ کیونکہ بروایت سعید بن جبیر بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے قضائے رمضان کی بابت فتویٰ دیا کہ مرنے والے کی طرف سے ادا کیا جاسکتا ہے۔

اور یہ کہنا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ حدیث موطا کے راوی ہیں صحیح نہیں کیونکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ ایک اصحابی نے اپنی ایک دوسری روایت کے

بہ خلاف فتویٰ دیا۔ سو اس سے ان کی روایات میں کچھ عیب لاحق نہیں ہوتا۔ اور ممکن ہے کہ اس حدیث سے انہیں انسیان ہو گیا ہو۔ یا تاویل کر لی ہو یا رائج مذہب روایت معارض سے اخذ کر لیا ہو کیونکہ حدیث ام المومنین عائشہ دربارہ جواز ایصال ثواب روضہ زیادہ صحیح اور مضبوط ہے۔

مع ہذا اقوال علمائے سلف اس امر میں موجود ہیں کہ میت کی طرف سے روزہ ادا کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اختلاف یہ ہے کہ بعض تو اس امر کی طرف گئے ہیں کہ قرض اور نذر ہر دو قسم کے روزہ کو کوئی غیر میت کی طرف سے ادا کر سکتا ہے اور بعض کا یہ مذہب ہے کہ مردہ کی طرف سے رمضان کے روزہ کا تو کھانا کھلائے اور نذر کا روزہ میت کی طرف سے ادا کرے۔

عام طور پر لوگوں کا دستور ہے کہ کسی عمل کا ثواب کسی دوسرے کی

کیا ایصال ثواب کے لئے تلفظ ضروری ہے

طرف انتقال کرتے وقت منہ سے الفاظ بھی بولتے ہیں جن میں وہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ اس صدقہ یا قرأت یا کسی دوسری عبادت کا ثواب فلاں بن فلاں کے ملک کرتا ہوں۔ اور خدا سے اس ثواب کے شخص مردہ کے نام مقبول فرمالینے کی اتنا اس کرتے ہیں۔ گو اس میں کوئی جرح نہیں بلکہ ایک گونہ استحکام عمل پر دلالت کرتا ہے مگر سلف صالحین میں اس طریق کی پابندی پر کوئی دلیل نہیں بلکہ صرف نیت غیر بر عمل بجالانا ہی کافی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے لیکن اس صورت میں کہ عمل کو کوئی شخص اپنی ذات کے لئے بجالائے اور بعد ازاں اس کا ثواب کسی غیر کی طرف منتقل کرنا چاہے تو صرف نیت کافی نہیں بلکہ الفاظ میں غیر کی طرف ایصال ثواب کی استدعا کرنا ضروری ہے بعض لوگ یوں کہا کرتے ہیں۔ کہ خدا یا تو نے اگر میرا یہ عمل قبول فرمالیا ہے تو اس کا ثواب فلاں بن فلاں کے نام منتقل کر دے یا اس کے نامہ اعمال میں لکھ دے ایسے شرائط

کی کچھ ضرورت نہیں اور نہ ان میں کچھ فائدہ ہے کیونکہ مشروط کئے بغیر ہی اللہ تعالیٰ ایسا کر دیتا ہے۔ ہاں اگر شرط نہ لگا دینے سے اللہ تعالیٰ عامل کی نیت کے بغیر کچھ اور کر دیا کرتا تو مشروط کا فائدہ ہو سکتا تھا مگر ایسا نہیں ہے۔

بدیہ یا یہ کیلئے کونسا عمل افضل ہے؟
 غیر کے لئے ایصالِ ثواب کرنے
 میں ہی عمل افضل ہوگا جس کا ثبوت زیادہ ہو۔

مگر صدقہ میت کے لئے اس کی طرف سے روزہ رکھنے سے زیادہ نافع ہے اور بہترین صدقہ وہ ہے جو مستحق غلیہ جس کو صدقہ دیا جاتا ہے اکی حاجت کو دور کرے اور جس سے وہ ہمیشہ اپنی حاجت میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی خیال پر ایک حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے۔ افضل الصدقة سقی الماء یعنی بہترین صدقہ پانی کا پلانا ہے مگر واضح ہو کہ یہ وہیں ہوگا جہاں پانی کی قلت ہو یا بدشواری دستیاب ہوتا ہو۔ ورنہ لب دریا لیکر کنواں کھدوانا ایک بھوٹے کو کھانا کھلانے سے کیسے افضل ہو سکتا ہے۔ علی ہذا میت کیلئے دعائے مغفرت جبکہ نہایت اخلاص اور تضرع کے ساتھ کی جائے اس کی طرف سے مسدقہ کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ بہر صورت ایصالِ ثواب صدقہ دعائے مغفرت حج دیگر اعمال کی نسبت افضل ہے۔ علی ہذا القیاس۔ تلاوتِ قرآن مجید کا ثواب بھی میت کے لئے بہت مفید ہے کیونکہ یہ عمل بھی صدقہ صیام و حج وغیرہ اعمال کی طرح میت کو پہنچ جاتا ہے۔ اور علماء کا اس پر اتفاق ہے۔ ہاں بعض تے یہی لکھا ہے کہ تلاوتِ قرآن قبول پر سلف میں مروج نہ تھی۔ کچھ زمانہ بعد امت میں اس کا رواج ہوا۔ مگر یہ اس کے متعلق شکی کی یہ روایت مل گئی ہے جس کو حافظ ابن قیم نے نقل کیا ہے کانت الانصاف افاضات لہم میت اختلافوا لی قبرہ یقرؤن القرآن یعنی انصار کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا کوئی قری مر جاتا۔ تو اس کی قبر پر جاتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے۔ بدیہ ثواب حضور جنتِ نبوی علیہ السلام اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بدیہ ثواب

بھنڈی صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں یا نہیں بعض علمائے امت نے اس کو مستحب قرار دیا ہے اور بعض نے فرمایا ہے کہ زمانہ صحابہ میں ایسا نہیں تھا۔ مگر میں اس میں ایک روایت سے ثابت ہوا ہے۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر قربانی اپنی طرف سے اور نیز بعد رحلت پیغمبر علیہ السلام کے آپ کی طرف سے بھی ادا فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے کچھ حرج نہیں بلکہ موجب مزید محبت ہے مع ہذا اکابر حضرات علماء مشائخ ایسا کرتے چلے آئے ہیں یہ بھی واضح ہو کہ امت کا ہر ایک فرد بشر جو کسی عمل خیر کو سچا لاتا ہے اس کا ثواب اس عامل کے علاوہ جناب پیغمبر علیہ السلام کو بھی پہنچتا ہے۔ کیونکہ حضور ہی حقیقت اس کے راہنما اور بانی تھے اور قیامت تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اس لئے جناب پیغمبر علیہ السلام کا ثواب اعمال تمام امت کے ثواب اعمال سے امتنا ہی بڑھا ہوا ہے فالحمد للہ علی ذلک ۛ

استحباب دعا

یہ نہایت اہم اور دلچسپ مسئلہ ہے اور ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ دعا کی حقیقت۔ اور اس کی استحباب کے متعلق جو تعلیم اسلام پاک میں دی گئی ہے کسی دوسرے مذہب میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی اس مسئلہ کو بالتفصیل بیان کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ کی ضرورت ہے۔ مگر ہم بفضلہ تعالیٰ بقدر ضرورت اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہیں ماہ پرست طلباء کو لازم ہے کہ وہ نہایت غور سے اس کا مطالعہ کریں تطریہ سہولت ہم اس مضمون کو مختلف حصص میں تقسیم کرتے ہیں ۛ

چونکہ مذہب اسلام میں کوئی ایسی تعلیم نہیں پائی جاتی
اسباب کی اہمیت | جو فطرت انسانی سے مطابقت نہ رکھتی ہو اس لئے ہم اپنے

تقاضائے فطرت کی رو سے پابندے اسباب پر مجبور ہیں خود انسان کی جسمی بناوٹ اس کی تائید کرتی ہے۔ اور عالم خارج میں ہم سلسلہ کائنات میں اشیاء کا رابطہ سبب و مسبب کے ساتھ وابستہ ہونا دیکھتے ہیں اس عالم گیر قانون کے رو سے ہم اس کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ہر ایک حادثہ کے لئے سبب کا ہونا ضروری ہے۔ سلسلہ اسباب کی ضرورت سے انکار کرنا گویا فطرت اللہ کی مخالفت کرنا ہے۔ کتاب اللہ میں اول امر ولو ابی اور مختلف قوموں کے تاریخی واقعات کا جائزہ ذکر ہوا ہے۔ اور یہ سبب کچھ سبب و مسبب کی ضرورت پر مبنی ہے چونکہ اس امر کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی لہذا اس کی توضیح کی چندال ضرورت نہیں کتاب اللہ کا حکم لیں لا انسان الا ماسعی اس دعویٰ پر حجت قطعی ہے *

انسان کو جب کبھی کوئی حاجت پیش آتی ہے یا وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے رفع کرنے کے لئے وہ

دعا کی ضرورت

مناسب اسباب کی تلاش کرتا ہے اور ایسا کرنا اس کا تقاضائے فطرت ہے۔ اسباب کی پابندی سے اگرچہ اسے کامیابی کا یقین کال نہیں ہوتا۔ مگر اس کا سلسلہ امید کبھی منقطع نہیں ہوتا وہ زندگی کے ہر ایک مرحلے میں اپنی کامیابی کی امید پر کوشش کا سلسلہ لگاتا رہا رہتا ہے تو یکایک اس کے دل میں اسباب کے غیر موثر ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اسباب کے غیر موثر ہونے کی وجہ کوئی ایسا امر ہے جو انسان کے احاطہ قدرت سے باہر ہے۔ کیونکہ اگر اسباب بڑھتا موثر ہوتے تو نتیجہ مطلوبہ کے پیدا ہونے میں کچھ شک نہیں تھا۔ یہ امر ہر ایک شخص کے اپنے تجربہ پر موقوف ہے کہ کتر ایسا ہوتا ہے کہ اسباب مناسب کی رعایت پورے طور پر ملحوظ رکھی جاتی ہے اور بظاہر کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جاتا۔ مگر بائیںہہ نتیجہ مطلوبہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس موقع پر اس کو اپنے عجز اور بیچاریگی کا یقین ہو جاتا ہے۔

اور اسباب سے بہت کر اپنے خالق حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو سبب الاسباب ہے اور تمام سلسلہ کائنات کا نظام اس کے علم اور ارادہ اور قدرت کے ماتحت چل رہا ہے اور جب اس کے لائق صفت کالیقین ہو جاتا ہے تو وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھ لیتا ہے کہ موجودات عالم کا ایک ایک ذرہ اس خالق حقیقی کے جلال و جبروت کے زیر اثر مقبوض و مغلوب ہے وہ جس طرح چاہتا ہے اشیائے کائنات میں تصرف کرتا ہے اور ایسا تصرف صرف اسی کا حق ہے اس مرحلے پر پہنچ کر اس کی وسیع الہیاتی کے بھروسے پر اس کے سامنے عرض حاجت کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ رحمت الہی کا دریا جوش میں آتا ہے اور از خود ایسے اسباب پیش آتے ہیں کہ طالب اپنے گوہر مطلوب کو پالیتا ہے ۔

شرط استجاب دعا

کتاب اللہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ امن یحبیب المضطر اذا دعاہ بھلا کون سے جو ایک بے چارہ کی بے چارگی کی حالت کا استنا ہے اس آیت شریفہ میں لفظ مضطر

میں سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اجابت دعا کے لئے اضطراب شرط ہے ورنہ مضطر کی جگہ داعی کا لفظ کام دے سکتا تھا۔ جیسے آئیہ اجیب دعوة الداع اذا دعان میں یہ لفظ موجود ہے۔ اضطراب کے معنے بے بسی اور بیچارگی کے ہیں۔ یعنی بحالت دعا بندہ کی حالت بیچارگی اس درجہ تک پہنچ جائے۔ کہ غیر اللہ کی طرف سے خواہ کوئی ہو۔ یاں کلی کالیقین ہو جائے۔ اور تمام حیلوں اور چارہ جویوں سے دست بردار ہو کر صرف محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اور بالیقین جان لے کہ اس کے سوا میر کوئی متولی نہیں۔ اور میں ایک بے دست و پا غایر مخلوق ہوں۔ اور اس کے قلب کی تشنگی اس حد تک پہنچ جائے کہ سطوت و جلال الہی کی ہیبت اس کے ظاہر و باطن پر غالب آکر اس کی آنائیت کو معدوم کر دے۔ حتیٰ کہ اسے اپنی ذات بھی فراموش ہو جائے۔ چنانچہ بعض آئمہ میں وارد ہوا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک

دعا کے جواب میں یہ بشارت دی گئی۔ انا عند المنکسرۃ قلوبہم لا وجلی یعنی ارشاد ہوتا ہے کہ میں ان دلوں کے ساتھ رہتا ہوں۔ جو میری سطوت و جلال کی ہیبت کی وجہ سے شکستہ ہوتے ہیں۔ رسمی طور پر ہاتھوں کا اٹھانا اور زبان سے الفاظ بولنا جیسا کہ عام لوگوں میں دیکھا جاتا ہے کہ ان کے دلوں میں کسی قسم کی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ بعد ازاں ان کی توجہ میں استقامت ہوتی ہے کچھ مفید نہیں۔ اس امر کی طرف ایک حدیث شریف میں اشارہ ہے۔ ادعوا للہ وانتم موقنون بالاحیاء واعلموا ان اللہ لا یتجیب دعاء من قلب غافل لا یعنی اسی حالت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کو پکارو کہ تمہیں نصیب ہو کہ وہ سنتا ہے اور جان لو کہ وہ غافل اور غیر متوجہ دل کی دعا کو نہیں سنتا۔

حق تو یہ ہے کہ شستگی بدوں بچاؤ کی کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کو اپنی بچاؤ کی کا علم اس وقت ہوتا ہے جبکہ تمام خارجی اسباب کی طرف سے یاس کلی ہو جاتی ہے جب تک کہ غیر اللہ کی نسبت کچھ بھی خیال باقی رہتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ ابھی پورے طور پر رجوع اللہ کے مقام تک اس کو رسائی حاصل نہیں ہوئی۔ مگر ایسی حالت کا پیدا ہونا انسان کے بس کی بات نہیں۔ ہاں جب آلام و مصائب چاروں طرف سے انسان کو آدوباتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سچی امانت حاصل ہو جاتی ہے جس کی عکاسی یہ ہے کہ بے اختیارانہ حالت میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اور آنسوؤں کا جاری ہونا پروردگار کے نزول رحمت کا نشان ہے۔ الغرض بندہ کا تضرع ابہتال یعنی بجاالت بچاؤ کی گھر گڑا تا استجاب دعا کے بے ضروری شرط ہے صاحب شہوی فرماتے ہیں۔

اے کہ خواہی از بلا جاں آخری جان خود را در تضرع آوری
کہ این تضرع را بہ حق قدر است و اں بہا کا نجاست آری و نجاست

دُعا اور اسباب

بعض ناواقف لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ دعا اور

اسباب کی پابندی ایک دوسرے کے منافی ہیں مگر یہ خیال قطعاً

غلط ہے کیونکہ دعا بھی منجملہ اسباب کے ایک سبب ہے۔ ہاں معبودہ اسباب سے

اس کی نوعیت علیحدہ ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دعا کی استجابت کا ظہور

معبودہ اسباب کی پابندی کی صورت میں ہو ا کرتا ہے۔ اسباب مناسبہ کا پیدا ہونا

استجابت دعا کا نتیجہ ہے۔ اِذَا ارَادَ اللّٰهُ اَمْرًا هَيَّا اَسْبَابَهُ اور یہ امر عین حکمت

خداوندی پر مبنی ہے۔ اگر حادثہ اللہ اس بات پر جا ہی ہوتی۔ کہ بلا پابندی اسباب

انسان اپنے مطلوب کو پالیا کرے تو ہم اس کی قدرت کاملہ کے سامنے اس امر کو

ناممکن نہیں سمجھتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں اس کی صفت حکمت کا ماحصل

ہونا لازم آتا ہے۔ اور حکمت اسی سلسلہ سبب و مسبب کا نام ہے اس لئے اس کی

قدرت کاملہ کا ظہور حکمت کے ذیل میں اور اس کی حکمت بالذات کا ظہور قدرت کے

ذیل میں ہو ا کرتا ہے۔ اور یہی طریق ایک ایماندار کے لئے عین صواب ہے کیونکہ اس

میں ذات باری کی ہر دو صفت قدرت و حکمت کو یکساں طور پر ملحوظ رکھا گیا

ہے۔ حکمت بے قدرت اور قدرت بے حکمت کہیں پائی نہیں جاتی۔ کیونکہ دنیا

کی فطرت ہی اسی قانون پر جا ہی ہے اس تقریر سے معلوم ہوگا کہ بعض لوگوں کا

یہ خیال کہ حصول اسباب کے لئے کوشش کریں یا نہ کریں۔ وہی ہوگا جو مقدر ہے

سر اسر باطل ہے کیونکہ اس خیال کے لوگ صفت قدرت کو تو ملحوظ رکھتے ہیں مگر

صفت حکمت کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اسباب کی پابندی بہر صورت ضروری

ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ تمام امور کا سرانجام اور حوادث کا وقوع مشیت انلی

پر موقوف ہے۔ مگر مشیت اسباب ہی کے ذیل میں جا ہی ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں

کہ بعض اوقات ہماری طرف سے کوئی کوشش صادر نہیں ہوتی اور خود بخود اسباب

مناسب پیدا ہو جاتے ہیں جن سے ہمارا مطلوب حاصل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ہم اپنی کوشش سے اسباب مناسبہ کو ہم پہنچاتے ہیں اور اپنے مطلوب کو پا لیتے ہیں۔ مگر اسباب کی ضرورت ہر حال میں داعی ہے۔ چونکہ ہمیں اسذہ کے واقعات کا علم نہیں دیا اس لئے ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم اپنی کوشش میں کامیاب ہونگے یا نا کامیاب لہذا ہم کو امید کامیابی پر اپنی کوشش کا سلسلہ جاری رکھنا پڑتا ہے۔ مستحسن کا یہ کہنا کہ اگر مطلوب کا ہونا مقدر ہے تو ہو کر رہیگا اس لئے کوشش کرنا اور نہ کرنا یکساں ہے درست نہیں۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ کوئی شخص یہ کہوے کہ اگر بیمار نے تندرست ہونا ہے تو ہو رہیگا طبیب یا ڈاکٹر کا معالجہ کریں یا نہ کریں یکساں ہے۔ یہ جملہ بیجاے خود صحیح تو ہے مگر لوگ اس کے محل استعمال کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے دعا بہر صورت انسان کا فرض ہے ہمیں کیا معلوم کہ ارادہ انہی میں ہونا مقدر ہے یا نہ ہونا کیا یہ امر ارادہ انہی میں داخل نہیں ہو سکتا کہ ہمارا مطلوب اللہ تعالیٰ نے ہمارے رجوع الی اللہ پر ہی موقوف رکھا ہو۔ اس نکتہ میں خوب غور سے کام لینا چاہیے۔ اور قدرت اور حکمت (سلسلہ سبب و سبب) ہر دو کو ملحوظ رکھنا چاہیے *

استجابت کی مختلف صورتیں | اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ استجابت دعا کا مطلب یہ ہے کہ دعا کرنے والے کو اس کا مطلوب

حاصل ہو مگر یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ انسان بسا اوقات اپنے خیال کے مطابق کسی مطلوب کو اپنے حق میں مفید سمجھتا ہے مگر ذات باری عزائمہ کے علم میں اس کا حصول اس کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے اس لئے وہ مطلوب اسے نہیں دیا جاتا۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے ایک نادان بچہ لئے ڈاکٹر کسی خاص قسم کی غذا سے یہ پیر بخور کرنا ہے اور بچہ اپنے والدین سے اس کے حاصل کرنے میں ضد کرتا ہے مگر وہ اسے نہیں دیتے کیونکہ انہیں علم ہے کہ اس غذا میں بچہ کی ہلاکت ہے اسلئے

وہ اُسے کوئی مناسب غذا دے کر روک دیتے ہیں۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ والدین اس غذا کے دینے میں سچے سے بخل کرتے ہیں؟ یہی حال دُعا کا سمجھو۔ کہ دُعا کنندہ کو اس کا مطلوب نہیں دیا جاتا کیونکہ وہ اس کے حق میں مضر ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ بحکم لا اُضیع عمل عامل منکم کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا اس لئے اس دُعا کے نتیجہ کو مختلف صورتوں میں استجاب کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ "مَا عَلَى الْاَرَضِ مُسْلِمٌ يَدْعُو اللَّهَ بِدَعْوَةٍ اِلَّا اَتَاهُ اللَّهُ اَيَّاهَا اَوْ صَرَفَ عَنْهُ مِنْ الشَّرِّ مِثْلَهَا مَا لَمْ يَدْعُ بِاَسْمِ اَوْ قَطِيعَةٍ رَحِمَ" جس کا اصل یہ ہے کہ کسی مُسلم دُعا کنندہ کو یا تو اس کا مطلوب دیا جاتا ہے یا کوئی اُنے والی مصیبت اس کے عوض میں ٹال دی جاتی ہے بشرطیکہ کسی امر گناہ یا قطع رحم کے لئے وہ دُعا نہ کرتا ہو۔ اور بعض آثار سے ثابت ہے کہ اگر داعی کو اس کا مطلوب نہ دیا جائے تو وہ دُعا بطور ایک حسنہ کے اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے جس کا ثواب قیامت کے دن لے دیا جائیگا۔ ایک حدیث میں وارد ہوئے ہے یستجاب لاحد کہ مالم یجعل بقوله قد دعوت فلم یستجب لی" یعنی داعی کی دُعا کو مستجاب رکھا جاتا ہے جب تک وہ گھبرا کر یہ نہ کہنے لگے کہ میں بےست دُعائیں کر چکا ہوں مگر مستجاب نہیں ہوئیں۔ یہ جملہ اکثر لوگوں کی زبان سے سنا جاتا ہے مگر وہ اس امر سے ناواقف ہوتے ہیں کہ استجاب میں توقف کا واقع ہونا حکمتِ خداوندی پر مبنی ہوتا ہے وقتِ محنت سے پہلے کبھی کوئی امر واقع نہیں ہو سکتا *

تفسیر مدارک میں آیت "اجیب دعوة الداع اذا دعان" کے ذیل میں لکھا ہے: "اجابة الدعاء وعد صدق من الله لا خلف فيه غير ان اجابة الدعوة تختلف قضاء الحاجة فاجابة الدعوة ان يقول المبدأ يا رب فيقول الله لبيك عبادي وهذا امر مرعوبٌ موجدٌ لكل مؤمن وقضاءٌ

اعطاء المراد وذلك قد يكون ناجزاً وقد يكون بعد مدّة وقد يكون في الآخرة
وقد تكون الخيرة له في غيره یعنی اجابت دعا خداے تعالیٰ کی طرف سے ایک سچا
وعدہ ہے جس میں خلت کو چھوٹ نہیں۔ ہاں اجابت دعا حاجت کو پورا کر دینے کا نام نہیں
کیونکہ اجابت دعا کے تو یہ معنی ہیں کہ بندہ "یارب" کہ کے پکے اور خداے تعالیٰ اس
کے پکارنے پر لبّیک کہے اور یہ امر ہر حالت میں ہر ایک مومن کے لئے موعود ہے
اور حاجت کے پورا کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ داعی کو اس کا مطلوب دیا جائے اور مطلوب
کا دیا جانا کبھی تو فی الفور وقوع میں آتا ہے اور کبھی کچھ مدت کے بعد اور کبھی آخرت
کے ثواب میں داخل کر دیا جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مطلوب کے علاوہ
کوئی اور شے مناسب اس کو دی جاتی ہے۔

دُعَا کی فضیلت اور ترغیب کی بابت
دُعَا کی فضیلت اور ترغیب کی بابت

میں فرمایا۔ "ان سر تکد حیّ کسریم" لیستحی من عبده اذا سرفع اليه يديه ان
يردّهما مصفاً خائبين" یعنی خداے تعالیٰ صاحب حیا و کرم ہے اور وہ اس
بات سے شرماتا ہے کہ بندہ اس کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے اور وہ انہیں خالی اور
ناکام لے کر دے۔ پھر فرمایا "لیس شیئ اکرم علی اللہ من الدعاء یعنی خداے
تعالیٰ کے ہاں دعا سے زیادہ بڑھ کر کسی چیز کی عزت نہیں۔ اور پھر فرمایا "الدعاء
مخ العبادة" یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں یوں آیا
ہے۔ "من فتح له باب من الدعاء ففتح له ابواب الرحمة وما سئل الله
شيئاً احب اليه من ان يسئل العافية وان الدعاء ينفع مماتزل ومات
لمينزل"۔ یعنی جس شخص کے لئے دعا کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے تو سمجھ لو کہ اس
کے لئے رحمت کے دروازے کھل گئے اور عافیت و اپین سے بڑھ کر خداے تعالیٰ

کو کوئی چیز زیادہ محبوب نہیں جو اس سے طلب کی جائے اور دُعا بلائے نازلہ اور غیر نازلہ ہر دو کے لیے نافع ہے۔ اور ایک حدیث میں یوں بھی وارد ہوا ہے "لا یرد القضاء الا بالقضاء" یعنی دعا ہی ایک ایسی چیز ہے جو قضاءً معلق اکو روک سکتی ہے ۛ

آدابِ دعا جب آدمی کو کسی قسم کی ضرورت یا مہم پیش آئے یا کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اسے لازم ہے کہ جہاں تک ہو سکے کثرتِ دُعا سے کام لے جب دُعا کے بے تیار ہو تو چاہے کہ پہلے مخفی طور پر کچھ صدقہ کرے اور کسی ایسی جگہ جہاں کوئی غیر نہ ہو پہلے وضو کرے اور تہتہ الوضوء ادا کرنے کے بعد دو رکعت بنیت قضا کے حاجت اُس طریق پر پچالائے جو کتب احادیث میں مذکور ہے بعد فراغت دُعا کے ماثورہ نہایت اخلاص اور تضرع کے ساتھ پڑھے اور بار بار اسی کو دہرائے کیونکہ خدائے تعالیٰ دعائیں امر کر کرنے کو دوست رکھتا ہے مگر اول و آخر و رد و شریف کو لازم سمجھے اور حصولِ مطلوب تک اس عمل کو بدستور جاری رکھے انشاء اللہ تعالیٰ داعی اپنے مطلوب کو پالے گا۔ اور جہاں تک ہو سکے تضرع اور ناری سے کام لے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مومن کے لیے حصولِ مطلوب کا موجب ہے۔ اور جو بار بار تجربہ میں آچکا ہے۔ مگر ہر ایک صحیح العقیدہ مسلمان کے دوسرا آدمی فائدہ نہیں اٹھا سکتا "وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ اِلَّا فِي ضَلٰلٍ" ۛ

لہ دو گانہ کے بعد جو دُعا کے ماثورہ کی جاتی ہے وہ یہ ہے :-

لا الہ الا اللہ الحلیم الکرم سبحان اللہ رب العرش العظیم والحمد للہ رب العالمین استلث موجبات رحمتک وعزائم مخفک تلث والغنیمة من کل بوالسلامة من کل اثم لا تدع لی ذنباً الا غفرته ولاهما الا فرجته ولا حاجة من خواج الدنيا والاخرة علیک رضا لا تنقض یا ارحم الراحمین ۛ

یہ بھی ضروری ہے کہ دُعا الفاظِ ماثورہ میں ہونی چاہئے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف میں دُعاؤں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اور ہر ایک دُعا کے الفاظ میں شانِ الوہیت اور شانِ عبودیت ہر دو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اپنے تجویز کردہ الفاظ میں ممکن ہے کہ پاس اوپ نہ ہے۔ کثرتِ استغفار اور حمد و ثناء استجابِ دُعا کے لئے نہایت ضروری ہیں بلکہ غور کرو تو معلوم ہو گا کہ یہی چیزیں حقیقت دُعا ہے۔ قرآن مجید میں مختلف حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی دُعاؤں میں غور کرو تو ان میں سب حمد و ثناء و استغفار کے اور کچھ نہ پائے گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دُعا میں خداوندی عظمت و جلال کا اظہار اور اپنی عبودیت کا اقرار جو غایتِ تصریح و ابہتال پر مبنی ہو مقصود بالذات ہے یہی وجہ ہے کہ دُعا کرتے وقت ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے جاتے ہیں کیونکہ آسمان محلِ نزولِ رحمت ہے اور قرآن مجید میں صریح اشارہ موجود ہے۔ "وَنُفِثَ السَّمَاءُ رِزْقًا وَمَا تَوَعَّدُونَ" حدیث "لَا يَرُدُّ الْقَضَاءُ إِلَّا الدُّعَاءُ" کا پہلے ذکر آچکا ہے اس لئے ہر ایک ایماندار کو لازم ہے کہ وہ اوقاتِ مخصوصہ میں دُعا کو اپنا شعار بنائے بالخصوص کسی آٹے وقت میں کیونکہ رفعِ مصائب کے لئے توبہ۔ انابت۔ استغفار۔ صدقاتِ مخفیہ اور دُعا کے برابر کوئی اور حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ کسی صاحبِ دل نے کیا خوب کہا ہے۔

سرنوشت و اثرگوں را بازگرداند نیاد نقش ملکوں نگین از سجده میگردود دست
 محققین نے بالاتفاق اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ دُعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھانے میں خالص عبودیت کا اظہار مقصود ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ کیونکہ خدا نے تعالیٰ کے لئے کسی مکان کی تخصیص کرنا جائز نہیں۔ اور آیت "الرحمن علی العرش استوی" آیاتِ تشابہات میں داخل ہے جن کی نسبت سلفِ صالحین کا یہ فیصلہ ہے کہ ایسے آیات کے ظاہر الفاظ پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور تاویل کرنا صحیح نہیں اور ان کی کیفیت پر بحث کرنا نہیں چاہئے۔ خدا نے تعالیٰ بہتر جانتا ہے *

اجابت دُعا و حقیقت اس تعلق کا نتیجہ ہے جو مخلوق کو اپنے خالق سے حاصل ہے
یہ تعلق ایسا مضبوط و مستحکم ہے کہ جب تک خالق خالق اور مخلوق مخلوق ہے کبھی منقطع نہیں
ہو سکتا۔ جب عاجز مخلوق بے بس ہو جاتا ہے اور انانیت کے تمام لوازم اٹھ جاتے ہیں
اور جلال و جبروت انہی کی سیئت و سطوت غالب کیا جاتی ہے تو آثار رحمت کا ظہور ہوتے
لگتا ہے۔ الغرض کمال عبودیت کے مقام میں استجاب دُعا ایک یقینی امر ہے مگر اعتقاد
صحیح جو دُعا و شکر سے پاک ہو شرط استجاب ہے۔ مقبولان بارگاہ تو ہر وقت مقام
عبودیت میں رہتے ہیں اس لئے انہیں بارگاہ رب العزت میں عرض حاجت کی ضرورت
نہیں ہوتی۔ کیونکہ مقام شاہدہ میں القاطع عرض حاجت کرنا ایک امر نایب ہے وہ ہو
یتولی الصالحین کی حقیقت کو خوب سمجھے ہوتے ہیں۔ مگر جن لوگوں کو یہ مقام حاصل نہیں
انہیں مذکورہ بالا طریق پر بارگاہ رب العزت میں حاضر ہونا ضروری ہے۔ ہر صورت کثرت
دُعا باتفاق جمیع علماء حصول مطلوب کی شیرھی ہے۔ ہر ایک ایماندار کو لازم ہے کہ وہ
روزِ حلال کا پابند رہے اور جھوٹ وغیرہ سے اپنی زبان کو آلودہ نہ ہونے دے
ایسا شخص یقیناً کبھی انعام رحمت سے محروم نہیں رہ سکتا۔ واللہ ولی التوفیق *

آسیبِ نظر حق ہے

مادہ پرستوں کا قاعدہ ہے کہ وہ محسوسات مادیہ کے آثار کی علت صرف مادی
اشیاء تک محدود سمجھتے ہیں یا یوں سمجھو کہ انسان اور حیوان کے مددکات میں کوئی بابِ الٰہی
قائم نہیں کرتے اور رُو حانی تاثرات کو تسلیم نہیں کرتے۔ عنوان مذکورہ بالا کے متعلق
بھی یہ لوگ غور و فکر نہ کیا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک ایک جسم

دوسرے حجم سے جس نے دوسرے حجم میں کسی قسم کا تاثیر پیدا نہیں ہو سکتا لیکن ان کا یہ خیال بالکل باطل ہے کیونکہ رُوح انسانی میں کئی ایک امور عجیبہ کی قابلیت موجود ہے۔ مگر ایسے امور عجیبہ صرف ان لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں جو ریاضت و مجاہدات کے مقام میں استقامت حاصل کر چکے ہوں۔ تمام لوگ ان کی کیفیت سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں یہ ایک امر واقع ہے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونے سے اس کا مدوم ہونا کبھی کوئی عقلمند تجویز نہیں کر سکتا۔ اور تعجب کی بات ہے کہ یہ لوگ مادہ کی تحقیقات میں انرجی کی حقیقت تو بلا حجت مان لیں مگر مذہبی پہلو میں اگر روحانی تاثیر کا عقیدہ پیش کیا جائے تو منہ بنا کر انکار کر دیں۔ ہمسر نرم کا ذکر آئے تو امانا و صدقنا "اور اگر آسیب نظر کا کوئی ذکر کر دے تو اسے دہم پستی کہہ دیتے ہیں مغرب کی طرف سے گوزشتہ کی بوئے بد ان لوگوں کے صانع تک پہنچ جائے تو ان کے لئے مشک و عنبر کی بوئے خوش سے کہیں زیادہ نیشاک انگیز ثابت ہوتی ہے +

اگر ہم میں بالخصوص غور کرنا چاہئے کہ جو اس رُوح انسانی کے زیر اثر اپنا عمل کرتے ہیں خوش الحانی کی تاثیر کا ہر ایک شخص قائل ہے حالانکہ یہ قوتہ ناطقہ کا ایک فعل ہے جس کا اثر قوتہ سامعہ پر ہوتا ہے جس کا نتیجہ اب اوقات یہ ہوتا ہے کہ سننے والا بخود ہو کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو گالیاں دیتا ہے تو گالیاں کھانے والے شخص کی طبیعت میں جو اثر اشتعال پیدا ہوتا ہے اسے سب لوگ جانتے ہیں۔ جب قوتہ ناطقہ اور سامعہ میں تاثیر و تاثر کا یہ ربط قائم ہے تو قوتہ باصرہ اور اشیائے مبصرات میں انکار کرنے کی کیا وجہ ہے؟ قوتہ باصرہ انرجی کے ذریعہ کسی مبصر چیز پر ایسے غیر محسوس الیکٹرونز کا اگر ایصال کرتی ہو تو یہ کیا محل تعجب ہے؟ علاوہ انہیں ہم صرف اس مکان عقلی کو وجہ جواز قرار نہیں دیتے بلکہ ہزار ہا لوگوں کے تجربہ و مشاہدہ کو بطور تائید حجت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اور ہر ایک شخص کا ذاتی تجربہ بارہا آسیب نظر کا قائل ہونے کے لئے

کافی ہے۔ قرآن مجید میں آیہ ”وَانْكِارِ الذِّنِّ كَفْرًا وَالَّذِينَ لَقُوْنَا بِالْبَصَارِ هُمْ لَمَّا
 سَمِعُوا الذِّكْرَ“ کی دلیل میں بعض مفسرین نے آسیب نظر کو تسلیم کیا ہے۔ اور ایک حدیث
 میں وارد ہے ”الْعَيْنُ حَقٌّ“ یعنی آسیب نظر حق ہے۔ اور سچ فرمایا ”العين تدخل الجمل
 القبر والجمل القدو“ یعنی نظر پر آدمی کو قبر تک اور اوٹ کو ہنڈ یا تک پہنچا دیتی ہے۔
 ہاں یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ خاصیت ہر ایک انسانی رُوح میں موجود نہیں ہوتی بلکہ خاص
 خاص لوگوں کی ترکیب مزاج ایسی ہوتی ہے کہ ان کی نظریں یہ تاثیر پانی جاتی ہے۔
 کیونکہ رُوح انسانی کو مزاج انسانی کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہوتی ہے۔ عام طور پر
 یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو تعجب و حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو
 اس کا اثر اس دوسری چیز میں ظاہر ہوتا ہے۔

ایک اسلامی فلاسفر نے آسیب نظر کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک کیفیت نفسانیہ
 ہے جو کسی شے کو دیکھ کر تعجب کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا انکار وہی لوگ کرتے
 ہیں جو روحانی تاثیرات کے قائل نہیں اور صرف مادی تاثیرات کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر چونکہ
 آسیب نظر کا انکار ناممکن ہے اس لیے منکرین اپنی تسلی کے لیے اس کی کچھ نہ کچھ توجیہ
 کر لیتے ہیں۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ دیکھنے والے کے قلب سے ایک نفس خارج ہو کر
 تیر کی طرح جا لگتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی ہی حالت ہے جیسی مقناطیس سے
 نہایت باریک تاریں نکل کر لپے سے جا ملتی ہیں اور اسے اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور
 بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک کیفیت مرحلہ ہوتی ہے جیسے کہ آگ کو جسم لیمید کے گرم
 کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جسم قریب کو گرم کرے۔ مگر محقق مذکور ان سب توجیہات
 کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک آسیب نظر کی علت نفس کی ایک قوتہ مخصوصہ
 ہے جس سے وہ اشیائے منصریہ میں تصرف کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اگر وہ نفس
 پاک ہوگا تو وہ شخص نبی یا ولی کہلاتا ہے جس کے ہاتھ پر خوارق ظاہر ہوتے ہیں اور اگر

خبیث ہو گا تو اسے ساحر کہتے ہیں۔ لہذا وہ خوارق جو قوت نفس کی تاثیر سے حاصل ہوتے ہیں معجزہ یا کرامت یا سحر کہلاتے ہیں۔ اور اگر قوت عنصریہ کے اثر سے ظاہر ہوں مثلاً کشش مقناطیسی تو انہیں نیرنجات بولتے ہیں اور اگر اجرام سماویہ کی تاثیر سے ظاہر ہوں تو انہیں طلسمات کہتے ہیں۔ غیر محقق لوگ جو حقائق علوم میں جہالت نہیں رکھتے ایسے خوارق امور کا انکار کر دیتے ہیں جس سے ان کی عرض یہ ہوتی ہے کہ عوام الناس کے سامنے ایسے امور کا انکار کر کے اپنے آپ کو محقق ثابت کریں۔ مگر ایسی چیز کے امکان کا انکار جو دلیل سے ثابت ہو اس چیز کے اعتراف سے جس کا ثبوت کسی دلیل سے ممکن نہ ہو سراسر حماقت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ تو اہل فلسفہ کی توجہات ہیں مگر ہمیں جس امر کی صداقت کتاب و سنت سے پایہ ثبوت تک پہنچ جائے اس کے متعلق ہم فلسفی استدلال کو ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ وہ یقینی ہے اور یقینی اور یقین بقائدین زیادہ قابل محبت ہے۔

جہنم

اکثر اہل فلسفہ اس بات کے قائل ہیں کہ جہنم و جہنم کی حقیقت تو بجائے خود مسلم ہے مگر اس کی کیفیت جہانی کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ثواب و عذاب ایک قسم کی روحانی خوشی اور رنج کا نام ہے۔ اور کتاب سماویہ میں ثواب و عذاب کے متعلق جو کچھ آچکا ہے۔ ان سے وہی چیزیں مراد نہیں بلکہ ان کی تمثیلی صورت دکھائی گئی ہے اور یہ خیال محض حشر جہانی کے انکار کا نتیجہ ہے۔ مگر لصوص آیات و احادیث اس خیال کو باطل ثابت کرتے ہیں کیونکہ ان لصوص میں بظاہر تاویل کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

جلد قرآن مجید کے الفاظ اذا بعثنا فی القبور اور بلی قادسین علی ان نُسویہم
 بنادہ اور من یحیی العظام وہی رمیدہ قل یحییہا الذی انشاء ما اول مرة وہو
 بکل خلق حلیم وغیرہ ذلک میں کوئی کیسا دلیل کر سکتا ہے۔ سو جب حشر جہانی کا
 انکار کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتا تو جنت و جہنم کے صحیح ہونے میں کیا شک باقی رہ جاتا
 ہے البتہ ہم یہ بیان سکتے ہیں کہ عالم اخروی میں انسانی جسم و دنیا کے کیفیت جسم سے مختلف
 نوعیت کا ہو گا۔ اور اسکی کیفیت ثواب و عذاب کی کیفیت بھی دنیوی خوشی و رنج کی
 صورتوں سے مختلف ہوگی کلام وحی میں ثواب و عذاب کے لئے ایسے ایسے الفاظ
 استعمال کئے گئے ہیں جن سے کوتاہ فہم لوگوں کو دنیاوی اجسام کی کیفیت پر محمول
 کرنے کا دھوکا لگتا ہے مگر عالم آخرت کی کیفیات خوشی و رنج بیشک جہانی تو ہونگے
 مگر چونکہ اس جسم کی فطرت دنیوی جسم کی فطرت نہیں ہوگی اس لئے وہ کیفیات بھی دنیوی
 کیفیات سے بالکل مختلف نوعیت کی ہوگی اس لئے جنت و جہنم کی کیفیات کے متعلق
 جو کچھ کلام وحی میں آچکا ہے بالکل صحیح اور درست ہے۔ ہم ان کیفیات کو انہیں الفاظ
 میں بیان کر سکتے ہیں جو ہمارے لئے اقرب الی الفہم ہیں اسی بنا پر بعض محققین نے لکھا ہے
 کہ عالم آخرت کے ثواب و عذاب کی کیفیات کا علم آیات تشابہات کا سا ہے جن کی
 حقیقی صورت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ مگر ہم ان پر ایمان لانے کے لئے مجبور ہیں۔
 واضح ہو کہ جو لوگ مسئلہ صفات ذات باری کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ بسا اوقات
 جہالت کی وجہ سے جنت و جہنم کے ثواب و عذاب کو اس عالم مادی کی حقیقت پر محمول
 کر کے کسی قسم کی مکتہ چینیاں کیا کرتے ہیں مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ جنت و جہنم کی کیفیات
 ایسے خالق ہیں۔ جو انسان کے اعمال ہی کی ایک مناسب صورت میں محسوس ہونگی یعنی
 انسان کے اعمال کو ایک جہانی صورت میں متحمل کیا جائیگا۔ چنانچہ ایک حدیث میں
 وارد ہوا ہے۔ انما ہی اعمالکم ترد الیکم یعنی جنت و جہنم کا ثواب و عذاب تمہارے اعمال

ہی میں جو تہیں پیش آئینگے اور ایک دوسری حدیث میں وارد ہوئے۔ ان ارض الجنة جہان
نورسما سبحان اللہ والحمد للہ یعنی جنت کی زمین وسیع میدان ہیں جس کے لودے تسبیح
وحمد ذات باری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے بندوں کے اعمال نیک و بد
کے مطابق ثواب و عذاب کی ایسی صورتیں مقرر کر دی ہیں جو قیامت کے دن مجسم ہو کر ہمارے
سامنے آئیں گی گواہ کی جہانیت کی نوعیت کچھ ہی ہو مگر میں ان کے جہانی ہونے میں انکار
نہیں ہو سکتا۔

جن لوگوں کی طبیعت میں انکار کا مادہ و ولایت رکھا ہوتا ہے۔ وہی حشر جہانی کے
منکر ہیں۔ اور ان کل کے نیا چہرہ نے بھی یہ خیال نہیں سے اخذ کیا ہے۔ ان اہل فلسفہ
کو اہل عقل بولا کرتے ہیں لیکن ان جہال نیا چہرہ نے ہمیں آج تک اس امر کا پتہ نہیں دیا
کہ الفاظ قرآن مجید کو وہ جس بنا پر ان کے مقصودہ معانی سے پھیر کر اپنے فرضی معانی کی
طرف لے جاتے ہیں۔ کردہ اپنی ناقص عقل کی رو سے حشر جہانی کو محال باور کرتے
ہوں تو یہ امر کسی طرح دوسروں کے لئے حجت نہیں ہو سکتا۔ اور نہ حقیقت قدرت
باری ان کے دائرہ عقل میں محدود ہو سکتی ہے اور اگر الفاظ قرآن کے معنی حقیقی کو
ترک کر کے وہ اپنا مذہب قائم کرتے ہیں تو انہیں کوئی دلیل قطعی پیش کرنی چاہئے
تعجب ہے کہ عالم دنیا میں ہر ایک قسم کی لذیذ اشیاء کا خالق تو ذات باری کو تسلیم
کیا جائے اور عالم آخرت میں اس کی نفی کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں حق تو یہ ہے
کہ عالم آخرت کے متعلق کوئی شخص اپنی عقل کے رو سے کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا۔
اور اگر ایسا ہوتا ممکن ہوتا تو شارع علیہ السلام کی بعثت غیر ضروری تھی باوجود کی زندگی
کے متفق بجز تعلیم وحی کے کسی اور امر کو حجت تسلیم نہیں کرنا چاہئے یہ بالکل حق ہے۔ کہ اگر
حشر جہانی ثابت ہو جائے۔ تو عذاب و ثواب سب جہانی تسلیم کرنے پڑیں گے۔ مگر الفاظ
قرآنیہ حشر جہانی کو پڑے زور و شور سے ثابت کرتے ہیں۔ لہذا عذاب و ثواب سب

جسمانی ہتھیار ہونگی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے۔ کہ جنت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں پر قیاس نہیں کیجا
 سکتیں۔ کیونکہ وہ صرف نام میں دنیا کی نعمتوں سے ملتی جلتی ہیں ورنہ ان کی نوعیت ان سے
 بالکل الگ تھلک کی چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جنت کی نعمتوں سے ہمارے پاس دنیا میں صرف الفاظ
 موجود ہیں نہ ہم انکی حقیقت کو دنیا کی نعمتوں پر ہرگز قیاس نہیں کر سکتے گریبا انہمہ تمام اکابر عظامت میں امر پر متفق ہیں کہ وہ
 جسمانی ہی ہیں بعض لوگ انہیں اپنی موجودہ حالتِ زندگی پر قیاس کے انکار کر دیا کرتے ہیں۔ مگر جی یہ
 ہے کہ اگر کوئی شخص ان نعمتوں کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے تو اسے چاہئے کہ ان پر ایمان لانے
 سے انکار نہ کرے اور تاویلات و اہسیہ سے برطرف رہے اور آج کل کے اکثر ملحدین کی
 بکواس پر کان نہ لگائے کیونکہ صحیح العقیدہ ہونا روحانی ترقی کی پہلی سیڑھی ہے۔
 مسئلہ حشرِ جسمانی پر ہم اس سے پہلے دوسرے باب میں ایک طویل بحث لکھ چکے ہیں
 مگر نظرِ بوضاحت اس کے متعلق کچھ مزید بحث کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ہمارے موجود
 مسلمانوں میں الحاد و دہریت کے خیالات عام طور پر شائع ہو رہے ہیں۔ اور وہ لوگ جو تعلیم
 وحی سے ناواقف ہیں عموماً شلوک و دساوس کی دلدل میں پھنسے نظر آتے ہیں۔
 اہل تخیل کہتے ہیں کہ نیک و بد اعمال کی جزا و سزا ضرور دی جائیگی۔ اگرچہ اس سزا کی
 حالت سوائے تمثیل کے ہم نہیں سمجھ سکتے فطرت اللہ اس کی مقتضی ہے کہ جن جرائم کی
 سزا کبھی کوئی قانون نہیں دے سکتا۔ ان کی باز پرس ہو۔ بہت سے جرائم ایسے ہیں
 کہ ان کی سزا دنیا میں لمبائی ہے۔ اور بہت سے جرائم ایسے ہیں جو نہ ظاہر ہو سکتے ہیں نہ ان
 کی سزا کوئی قانون تجویز کر سکتا ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ انسان کا بلند مرتبہ اس امر کا متقاضی
 ہے کہ وہ ایک پائدار زندگی کا مالک ہو۔ یہ عقل قبول نہیں کرتی۔ کہ ادنیٰ اقسام کے جانداروں
 کی طرح یہ بھی چند ہی یوم زندگی بسر کر کے پھر نیست و نابود ہو جائے۔ ان کا یہ بھی خیال
 ہے۔ کہ قرآن مجید میں جہاں جنت و دوزخ کا ذکر آیا ہے۔ اس سے حقیقی معنی سمجھ لینے اور
 یہ خیال کر لینا کہ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ عین حقیقت ہے سخت غلطی ہے۔

القصہ جنت و جہنم کو یہ نوب صرف روحانی خوشی و رنج خیال کہئے ہوئے ہیں اور وہاں کی طرح طرح کی نعمتوں کو محض تمثیل کی صورت میں مانتے ہیں۔ جو انسانی فطرت پر خوف اور جاگو پیدا کرنے کے واسطے تجویز کی گئی ہیں۔

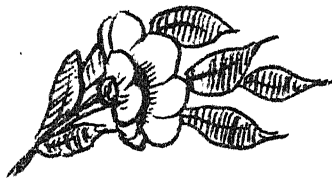
جنت و دوزخ کا جو نقشہ ان لوگوں نے کھینچا ہے۔ وہ ہو بہو قرآن اور حدیث صحیح کے مطابق ہے۔ مگر آخر پر ان مختلف اشیا کو حقیقت پر محمول کرنے سے بالکل عاری ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر ان مختلف نعمتوں اور عذابوں کی مثالیں نہ دی جاتیں اور صرف اس قدر بتلایا جاتا کہ نیکوں کو خداوند تعالیٰ کی حضوری میں دوامی راحت ہوگی۔ اور بدکاروں کو خداوند تعالیٰ کی مہجوری پر دوامی حسرت ہوگی تو بہت کم طبائع اس کو سمجھ سکتیں یا سلام کو اس بات پر اور ادیان سے فخر ہے کہ خدا نے جنت و دوزخ کو ایسے رنگ میں پیش کیا۔ کہ آدمیوں اس دین کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

معاذ اللہ خدا تعالیٰ بھی لڈ و پٹے دینے کا پہا نہ کر کے اپنی طرف انسانوں کو پھیل لیتا ہے اور ہوسے اور ڈان سے ڈرا کر بُرے کاموں سے ہٹا لیتا ہے جس خدا تعالیٰ نے انسان کو بوجہ عقل ملنے کے نیک اور بد افعال کا ذمہ دار ٹھہرایا اور دنیا کی چند روزہ زندگی میں ہزاروں نعمتیں اس کے سامنے رکھ دیں وہ دار آخرت کی دوامی زندگی میں ایسا خالی ہاتھ ہو بیٹھا ہے۔ کہ وہاں جب انسان جائینگے۔ تو ان کو یہ کہہ دیگا کہ دنیا میں جو کچھ تم نے مجھ سے لینا تھا۔ میرے پاس صرف اسی قدر تھا۔ یہاں تو محض خشک روحانی زندگی ہی ہے تم مجھ کو دیکھو میں تم کو دیکھا کروں۔ لینے دینے کا نام نہ لو میں نے تو صرف آبا جہن کی طرح مٹھائی اور ہوسے کے نام سے ایک مقصد نکالتا تھا۔ بھلا اس جہان میں بھی یہ چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ محبت اولیٰ چیز ہے۔ لینے دینے کے سر پر چاک ڈالو۔ سبحان اللہ وہ خداوند تعالیٰ جو انسان کو تو یہ حکم دے کہ وعدہ خلافی سے ڈرو اس کی باز پرس ضرور ہوگی۔ آپ سی میں نہایت قاصر ہو۔ قرآن شریف میں بار بار یقین دلانے کی خاطر وعدہ اللہ حقاً۔ دان اللہ

لا یمخلف الیعاد کی منادی سنا لے پھر عین وقت پر ان وعدہ کردہ چیزوں کے دینے سے انکار ہی ہو جائے۔ گویا انسان سے سبھی محفل کرتا رہا۔ اب اس طریق سے قافروں کو جہنم کی عظمت پر جو وصیہ لکھا ہے۔ اس کا خیال منکرین کو ہرگز نہ آیا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا میں مسعد رخصتیں اور تکلیفیں جو ہیں وہ کہاں سے ظہور پذیر ہو گئیں۔ اگر اصل نہیں تو فرع کہاں سے آئیگا۔ ہاں دنیا عالم ناسوت کی طاقت آلود ہے۔ یہاں کی اشیاء بھی دینی کیفیت اور فانی ہیں اور عالم آخرت چونکہ جاودانی اور نہایت لطیف ہے۔ اس کی اشیاء بھی اعلیٰ درجہ کی لطیف ہیں اور لطافت کے ایسے اعلیٰ رتبہ پر پہنچی ہوئی ہیں کہ نہ کانوں نے سنا۔ اور نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ دل پر اس کی اصلی کیفیت کھل سکتی ہے وہاں نہ بول نہ پران نہ نیت وغیرہ اگر ایک روح مال جنت کا دنیا میں لایا جائے تو آفتاب کی روشنی اس کے سامنے ماتہ پر جائے۔ شراب ایسی جس سے نہ سرمیں درد پیدا ہو نہ بکواس نکلے دل کو مسرور کرنے والی راحت پہنچانے والی۔ مگر دیدار خداوند تعالیٰ ان سب سے زیادہ نعمت روحانی ہے اس کے حصول کی کیفیت سرور بیان سے یاہر ہے۔ اب بہشت اور دوزخ میں جہانی اور روحانی دونوں طرح کی نعمتیں اور عذاب ہیں۔ مگر لطافت کے اعلیٰ رنگ میں۔ عیسائیوں کے بہشت کی طرح محض روحانی ہی نہیں بلکہ اس میں حسب اعمال طرح طرح کی لطیف نعمتیں بھی ہیں اگر منکرین خدا تعالیٰ کی عین فطرت کا مطالعہ کرتے تو ان کو ضرور یقین آجاتا کہ آخرت میں بھی قرآنی نعمتوں اور عذابوں کا انہیں صورتوں میں ہونا ہرگز محال اور غیر ممکن نہیں جن کا بیان قرآن اور احادیث میں درج ہے کیونکہ جب حشر اجساد کا مسئلہ مسلم اور یقینی ہے تو کونسی دلیل یا فلسفہ اس امر کا نفع ہو سکتا ہے کہ نیکی اور بدی کی سزا و جزا میں روح اور جسم دونوں شریک ہوں۔ نیکی اور بدی تو روح اور جسم دونوں مل کر کریں۔ مگر سزا و جزا کے وقت جسم کے حقوق اور مقتضیات کو بالکل نظر انداز کر دیا

یہ خدا تعالیٰ کے انصاف اور قانون کے برخلاف ہے۔ یہی خدا تعالیٰ کے انصاف کی اعلیٰ دلیل ہے کہ قیامت میں روح اور جسم دونوں حاضر ہو کر اپنا ثمرہ پائیں یعنی جس طرح نیکی اور بدی میں دونوں شامل ہے اسی طرح جزا اور سزا میں بھی دونوں شریک ہوں۔ جس طرح اسلام اور امور میں فضیلت رکھتا ہے۔ اسی طرح جنت اور دوزخ کی کیفیت کو جو سابقہ ادیان میں بالکل مبہم اور تاریکی میں تھی صاف صاف ظاہر کرتا ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے شاگردوں سے صرف اس قدر فرمایا کہ تم میرے ساتھ بہشت میں انگور کا شجرہ پیو گے۔ زیادہ کیفیت شاید ان کے شاگردوں کے عقول کو بتلانی نہ سکا معلوم نہ ہوئی۔ اب عیسائی محض روحانی بہشت بنالیں تو ان کی اپنی مرضی۔ انگور کا شجرہ پینا تو ان کے ہاں بھی ثابت ہو چکا ہے اور دوزخ ایسی چیزیں نہیں پیا کرتی بلکہ جسم۔ اب انصاف کرنا چاہیے کہ جنت و دوزخ کا فلسفہ یوں طے ہوتا ہے یا جس طرح منکرین محض فرضی لٹ و پیڑے بنائے بیٹھے ہیں۔ اور معاذ اللہ خدا تعالیٰ کو آخرت میں محض خالی بات سمجھ چکے ہیں۔ حشر اجساد کا مسئلہ انہوں نے غور سے مطالعہ نہیں کیا۔ اور نہ اس کے عمیق فلسفہ پر غفل خرچ کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں جنت اور دوزخ کی کیفیت کا اللہ تعالیٰ نے معائنہ کرایا اور صحیح احادیث میں مفصل کیفیت درج ہے اور پارہ ۱۵ رکوع اول میں بھی اس کی کیفیت مجمل طور پر مذکور ہے (النزہ من آیاتنا) یعنی اس کو اپنی نشانیں اور قدرتوں کو دکھانے کے واسطے معراج کرایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کل عجائبات بہشت و دوزخ دیکھ کر کیا اصحاب کے روپر و معاذ اللہ خلاف واقعہ کہہ دیا کہ میں نے بہشت میں فلاں فلاں چیز دیکھی اور دوزخ میں فلاں فلاں۔ دیکھا محض روحانی بہشت اور دوزخ اور جلا دیا کچھ کا کچھ۔ اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں کی تکذیب کر کے محض روحانی بہشت اور دوزخ کا قائل ہونا ایک مسلمان کی شانِ ایمان سے بعید ہے وہ آیات پھر کیا ہو جس کے

معائنہ عینی کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاتم المرسلین کو محرابِ کرائی اس امت کے اکثر
 بزرگوں نے بھی اسکی کشف کے رُوسے تہجدی معائنہ و وزخ اور بہشت کا کیا جیسا معتبر
 سیر کی کتب میں مذکور ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ خواب میں ایک
 ایسا چمچ لکھایا جس کی حلاوت اور خوشبود و دوسرے دن شام تک میرے لبوں اور دماغ
 میں قائم رہی۔ حالانکہ رات کو کوئی اس قسم کی چیز بوقت بیداری نہ دیکھی نہ کھائی تھی۔ اور
 اس کی خوشبود اور حلاوت کو کسی دنیا کی چیز سے میں تشبیہ نہیں دے سکتا۔ البتہ خوشبود تو
 سیب سے ملتی جلتی تھی مگر بدرجہا غالب اور فائق۔ حلاوت شہد کی سی تھی مگر اعلیٰ
 درجہ کی لطیف۔ چنانچہ بعد بیداری کے میرے ہونٹ اس حلاوت کا ذائقہ لیکر بل بل
 جاتے تھے اس امر میں میرا وہ خدا تعالیٰ گواہ ہے۔ جس نے کاذب کے واسطے لعنت
 فرمائی ہے۔ عالم خواب میں بھی عالم آخرت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے ہم خواب میں
 روحانی رنج اور راحت دونوں محسوس کرتے ہیں اور ہو بہو جہانی بہت میں ایک اور
 لطیف جسم چلتا پھرتا بولتا دیکھتا سب طرح رنج و راحت محسوس کرتا ہے۔ اگر ان سب
 گذشتہ سطور پر غور کیا جائے تو ضرور ناظرین کو یقین آجائے گا کہ وزخ اور بہشت خالی
 روحانی رنج و راحت ہی کا نام نہیں بلکہ حقیقت میں بھی طرح طرح کی نہایت لطیف نعمتیں
 اور عذاب آخرت میں موجود ہیں۔ جن کی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور آنحضرت صلعم نے
 احادیث میں خبر دی ہے۔ و لکن فیہا ما تشہی انفسکم اور بہشت میں جو تہذیب و دل
 چاہے موجود ہے اس آیت نے تو قطعی فیصلہ ہی کر دیا کہ ہر چیز جس کی خواہش ہو جنت
 میں موجود پاوے گی *



میزان

منجملہ عقائد اسلام کے ایمان بالمیزان بھی ہے جس سے لوگوں کے اعمال نیک و بد کا اندازہ لگایا جائیگا۔ چنانکہ عالم آخرت کے تمام امور ہمارے حواس کی دسترس سے بالاتر ہیں اور ہمارے عالم مجاہوسی کے تجربات مشاہدات ان امور کی حقیقت کے ادراک کے لئے مجاہوسی قرار نہیں پاسکتے اس لئے ہمیں بحر تعلیم وحی کی طرف رجوع کرنے کے کوئی چارہ نہیں۔ اس لئے اسلام اور اصوب طریق یہ ہے کہ معتقدات کے بارے میں بحر تعلیم وحی کے کسی شخص کی تحقیق کو عقائد کا معیار قرار نہ دیا جائے کیونکہ عقائد کا معاملہ سخت نازک ہے۔ میزان کے بارے میں بعض ملاحدہ فلاسفہ نے تو باطل انکار کر دیا ہے اور بعض نے اس کو محض ایک تشرینی صورت میں پیش کیا ہے اور بعض نے اسے ہمارے مروجہ عالم دنیا کی میزانون پر قیاس کر کے یہ کہا ہے کہ عالم آخرت کی میزان دُنڈی اور دو پلوں پر مشتمل ہوگی اور سونے سے بنی ہوگی مگر ہر سہ فریق اپنی اپنی رائے اور قیاس سے کہتے ہیں اور اس لئے تینوں مخالف حق ہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ہرگز ہٹ کر کچھ نہیں ملتا۔ اور جو بات کتاب اللہ اور سنت صحیحہ میں دوبارہ عقائد مذکور نہیں ہم اسے مانتا تو درکنار سنتا بھی گوارا نہیں کرتے۔ "قتل المحترصون"۔ یعنی اُنکھل سے بات کہنے والے ہلاک ہو گئے۔

میزان کے بارے میں احادیث صحیحہ میں جہاں تک ہمیں تحقیق ہوئی ہے کوئی ایسی تفصیل نہیں دی گئی جس سے اس کی حقیقت اور کیفیت کا پتہ لگ سکے۔ اور حق یہ ہے کہ ایسے عقائد کے بارے میں جن کی حقیقت کا انکشاف مابعدی زندگی پر ملتوی ہے شارع علیہ السلام کی طرف سے اجمال ہی کافی ہے کیونکہ ایمان کے لئے اسی قدر کافی ہے۔ البتہ قرآن مجید میں

جا بجا وزن اعمال کا ذکر اچکا ہے۔ آیاتِ ذیل میں غور کرتا چاہئے۔

(۱) وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ بِالْحَقِّ "یعنی قیامت کے دن اعمال کا موازنہ امر حق ہے جس میں کچھ شک نہیں۔"

(ب) وَلَنُضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ "یعنی قیامت کے دن ہم عدل کے لیے میزانیں قائم کرینگے۔"

(ج) فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ "یعنی جس شخص کے اعمال (نیک) کا پلہ بھاری ہوگا وہ ایک عمدہ زندگی بسر کرے گا اور جس کے اعمال (نیک) کا پلہ ہلکا ہوگا وہ جہنم میں ہوگا۔"

(د) وَهِيَ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدِينَ "یعنی جن لوگوں کے اعمال کا پلہ ہلکا ہوگا سو وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے تئیں زبیاں میں ڈالا اور جو ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑے رہینگے۔"

ان آیات سے صاف اور واضح طور پر میزان کے وجود کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جس میں کسی کو کلام نہیں مگر گفتگو یہ ہے کہ حقیقتِ میزان کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب خیر صادق نے اللہ تعالیٰ سے قطعی طور پر مطلع ہو کر یہیں اطلاع دیدی تو ہمیں اس پر ایمان لانا واجب ہو گیا اور اس کی حقیقت کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ عالمِ آخرت کے تمام پیش آنے والے امور پر کوئی شخص خیرِ تعلیم و وحی کے مطلع نہیں ہو سکتا اور مصلحت بھی اسی میں ہے اور یہی حق ہے۔ امام ابن حزم ظاہری اس مقام پر لکھتے ہیں: "وَلَقَطَعَ عَلَىٰ أَنْ تِلْكَ الْمَوَازِينُ أَشْيَاءُ يَبِينُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ بِهَا عِبَادَهُ مَقَادِيرَ أَعْمَالِهِمْ مِنْ خَيْرٍ وَشَرٍّ مِنْ مَقْدَارِ الذِّمَّةِ الَّتِي لَا تَحْسَبُ وَذَنْهَا فِي مَوَازِينِنَا أَصْلًا فَمَا زَادَ وَلَا نَدَرَ كَيْفَ تِلْكَ الْمَوَازِينُ إِلَّا أَنْتَ نَدَرِي أَنَّهَا مَخْلُوفٌ مَوَازِينُ الدُّنْيَا "یعنی ہم یقین رکھتے

ہیں کہ میزان ایک ایسی شے ہوگی جس سے اللہ تعالیٰ لوگوں کے نیک و بد اعمال کی مقدار ان پر ظاہر کر دے گا۔ اور خفیت سے خفیت مقدار بھی مخفی نہ رہ سکیگی۔ مگر ہم اس میزان کی کیفیت سے بالکل بے خبر ہیں۔ یہاں یہ جانتے ہیں کہ وہ دنیا کی مروجہ میزان کے بالکل برخلاف ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ امر کہ ہم کیفیت سے بالکل بے خبر ہیں صرف میزان ہی سے مخصوص نہیں بلکہ عالم غیبی کی ہر ایک شے کے متعلق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم ان کی کیفیت سے ناواقف ہیں۔ سو جو لوگ معاوضہ جہانی یعنی قیامت کی مروجہ کازندہ ہونا مانتے ہیں وہ ان اشیاء کو جہانی تسلیم کرتے ہیں اور جو معاوضہ جہانی کے قائل نہیں بلکہ صرف روحانی خدایاں و ثواب کو مانتے ہیں وہ عالم آخرت کی ہر ایک شے کو صرف تمثیلی وجود میں تسلیم کرتے ہیں مگر یہ خیال نہ تو آیات قرآنیہ سے ثابت ہو سکتا ہے نہ احادیث صحیحہ سے بلکہ اس کے ماننے والا بذریعہ تاویل باطل نصوص کا منکر ہے کیونکہ حاجی آیات و احادیث حشر جہانی پر ناطق ہیں۔ سو منکر جب تک شارع کے قول سے اپنی باطل تاویل کو ثابت نہ کرے اس کا قول ہرگز قابل تسلیم نہیں۔ مع ہذا اہل عرب دوبارہ مردوں کے جی اٹھنے کا انکار کرتے تھے نہ روحانی یا تمثیلی طور پر زندہ ہونے کا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آیات احادیث میں ان کے اسی خیال کا بطلان ثابت کیا جاتا یعنی جہانی حشر کا ثبوت دیا جاتا۔ چنانچہ ان کے اشعار سے بایں حشر جہانی کا انکار ثابت ہوتا ہے مثلاً

حَيَوَةُ ثُمَّ مَوْتُ ثُمَّ نَشْرٌ حَدِيثُ خُرَافَةٍ يَا أُمَّ عَمْرُو

ایک اور کا شعر ہے
يُخْبِرُنَا الرَّسُولُ بِأَنَّ سَهْنِي وَكَيْفَ حَيَوَةُ اصْدَاءِ دَهَامِ

لے زندگی کے بعد موت اور موت کے بعد پھر جی اٹھنا یہ باتیں لے ام عمرو خرافات ہیں جو ماننے کے قابل نہیں۔ ۱۲۰۰ مہ ہیں رسول یہ خبر سناتے ہیں کہ ہم پھر جی اٹھیں گے۔ جلاہم مروجہ ادب کی مروجہ پڑیاں

الغرض قرآن مجید سے حشرِ حجابی کا ثبوت ملتا ہے ایسی ہی تمام اہل اسلام کا ایمان ہے
 سید صاحب نے پریچہ تہذیب الاخلاق عبرۃ کلیم بصریہ کی صبح الاول ۱۳۱۶ھ میں بعنوان "کتابۃ
 الاعمال والمیتران والموازنة" ایک مضمون لکھا ہے جس میں امام غزالی علیہ الرحمۃ
 کی کتاب "المترقۃ بین الاسلام والنزہۃ" سے ایک حوالہ بلا نقل عبارت پیش
 کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وجود کی پانچ قسمیں ہیں۔ (۱) حقیقی۔ (۲) حسی۔
 (۳) خیالی (۴) عقلی۔ (۵) شہی۔ سو جس شخص نے شارع کے اقوال کی ان قسموں میں سے
 کسی قسم کو تسلیم کر لیا تو وہ شمس کے اقوال کی تصدیق کرنے والا ہے نہ تکذیب کرنے والا۔
 سید صاحب نے امام موصوف کے اس قول سے اس لئے استشہاد کیا ہے کہ نہیں
 میزان و صراط وغیرہ امور کا صرف وجود مثالی تسلیم کرنے میں تقویت ہو جائے مگر افسوس یہ
 ہے کہ امام صاحب کا یہ ہرگز متناہی نہیں ہے کہ میزان و صراط وغیرہ امور صرف بطور مثال
 بیان کئے گئے ہیں بلکہ انہوں نے اشیاء کے وجود کی تقسیم کی ہے اور لکھا ہے کہ ہر ایک
 شے کے اس وجود پر ایمان لانا ضروری جو اس کو حاصل ہے خواہ مذکورہ بالا میں سے کوئی وجود
 اس کو حاصل ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر ایک چیز کو جس طرح چاہو ایمان لو۔ یہ سید صاحب کی
 مغالطہ ہی ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہو سکتے ہیں اور اگر بالفرض امام صاحب
 کا وہی مطلب ہو جو سید صاحب نے سمجھا ہے تو کم کہیں گے کہ مذکورہ بالا تقسیم کا کتاب و سنت
 میں کہاں فرمایا ہے ظہور امام صاحب نے کیونکر معلوم کیا کہ کوئی شخص خواہ کسی وجود میں کسی
 کسی شے پر ایمان لے آئے تو وہ صحیح ہو گا۔ اور اگر ہم امور شرعیہ کے متعلق اسی قسم کی
 نحو اور لچر تاویلات سے کام لیں گے تو ایمان اٹھ جائیگی۔ اور کسی چیز کی حقیقت واقعہ

بقیہ ماسبقہ کیونکر زندہ رہے۔ - مداد اور ہامہ سے مراد وہ فرضی پرند ہیں جس کی بابت اہل عرب یہ
 نغمہ کیا کرتے تھے کہ بتول کے سر کے بل کی ٹہیوں سے ایک دربن جاتا ہے اور جس کا حدیث میں مذکور کیا گیا ہے اور

مسلم نہیں ہوگی کہ ممکن ہے کہ حقائق آخری محض فرضی اشیا قرار پائیں۔ اس کے بعد آپ کہتے ہیں کہ صحابہؓ اور بدوی لوگ بخوبی ان پر ایمان رکھتے تھے اور انہیں زیادہ تفصیل کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ مگر اب جبکہ علوم جدیدہ نے ترقی کر لی ہے اور ہر ایک کو یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ جب خدا نے تعالیٰ عالم الغیب ہے اور تمام اشیا پر اس کا علم محیط ہے اور وہ نیماں سے پاک ہے تو کراما کا تبیین کے کیا معنی؟ انتہیٰ مختصرًا۔

یہ بات جس کو سید صاحب نے علوم جدیدہ کا نتیجہ قرار دیا ہے کوئی ایسی بات نہیں جو اہل عرب کو معلوم نہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ اس بات کا علم علوم جدیدہ پر کیوں ملتا تو تھا؟ اصول سائنس وغیرہ کو بظاہر اس سے کوئی تعلق نہیں۔ علم کلام کی کتابوں میں ایسے ہزاروں اعتراضات موجود ہیں جن کے جواب بھی علمائے نے دیے ہیں۔ شاید سید صاحب کے علم میں علمائے سلف کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ جب اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے تو کراما کا تبیین کے کیا معنی؟ سچ پوچھو تو یہ اسی قسم کی تقریر ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کو خود مرید سے رہنمائی پر چلا سکتا تھا تو نبشت انبیاء علیہم السلام کی کیا ضرورت پڑی؟ جو جواب اس نحو اعتراض کا ہو گا وہی سید صاحب کے مذکورہ بالا فرضی اعتراض کا سمجھنا چاہیے۔ سید صاحب بہیب و مستب کے سلسلہ کے اس قد پابند ہو کر سچی کراما کا تبیین کی علت کے سمجھنے سے محذور ہے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اجراض اتمام حجت کتابت اعمال کے لئے ملائکہ کو مامور فرما رکھا ہے۔ گو اس کی نوعیت کچھ ہی ہو مگر ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں ہم سید صاحب کی طرح یہ نہیں مانتے کہ محض بطور تشبیل جن امور کا ذکر کیا گیا ہے سید صاحب اپنے خیال کی تائید میں آئیے "وليضرب الله الامثال للناس" کو پیش کرتے ہیں مگر واضح ہے کہ یہ آیت ان معتقدات کی بابت نہیں جو عالم آخرت سے متعلق رکھتے ہیں بلکہ احکام شرعیہ یا مظاہر قدرت کی حقیقت ظاہر کرنے کے متعلق یہ آیت مذکور ہے۔

سید صاحب نے میزان کی حقیقت بیان کرنے میں امام غزالیؒ کی کتاب المفسون
 بہ علی غیر اھلہ سے ایک ہی عبارت نقل کی ہے جس کا ایک ٹکڑہ یہ ہے:-
 ”قال میزان الحقیقی اذا مثلہ اللہ عز وجل للحواس مثلہ بہا شاء من ہذہ
 الامثلہ او غیرہا فحقیقۃ المیزان وحده موجود فی جمیع ذلک وهو ما
 یعرف بہ الثریاۃ من النقصان وصورتہ لیکون مقدراً لکمحس عند التمثیل
 والتمثیل۔“ اس کا ترجمہ آپ یوں لکھتے ہیں: پس خدا کو اختیار ہے کہ اعمال کے اندازہ
 کے طریق کو تمثیل کرے جس سے زیادتی و کمی اعمال کی معلوم ہو اور اس کی صورت محسوس
 موجود ہو۔ یا صرف خیال میں تمثیل ہو اور خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس کی ایسی صورت پیدا کرے گا
 جو محسوس ہو یا ایسی پیدا کرے گا جو تمثیل خیالی ہو۔

عربی دان جانتے ہیں کہ یہ ترجمہ غلط ہے۔ یا تو سید صاحب نے عبارت کا مطلب
 نہیں سمجھا اور یا عمدہ اپنے مطلب کے مطابق الفاظ کو موڑ توڑ دیا ہے جو ان کی عادت
 ہے۔ غرض آپ کی یہ ہے کہ امام موصوف کے کلام سے اپنے دعویٰ کی تائید کی جائے
 تاکہ عوام الناس کو معلوم ہو کہ صرف سید صاحب ہی اس دعویٰ کو پیش نہیں کرتے بلکہ بعض
 اکابر اسلام نے بھی اس کو مانا ہے مگر افسوس کہ امام صاحب کی ایک دوسری عبارت
 آپ کے دعویٰ کا کافی رد کر رہی ہے جس کو سید صاحب نے امام صاحب کے بتلائی
 معتقدات پر محمول کر کے ٹال دیا ہے۔ امام صاحب اپنی کتاب ”الاقتصاد فی الاعتقاد“
 میں لکھتے ہیں ”قد سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ہذا افعال
 یوزن معالفت الاعمال فان کما ما کاتبین یکتبون الاعمال فی معالفت من
 اجسامہ فاذا وضعت فی المیزان خلق اللہ تعالیٰ فی کفیتھا میلًا یقدر رتبۃ
 الطاعات وهو علی ما یشاء قد یؤ۔“ یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ اعمال کے کلمے
 چٹے تولے جائینگے کیونکہ کرنا کاتبین ہر ایک انسان کے اعمال کا چٹھا لکھتے ہیں اور

وہ سب چیزیں پھر چپ ان چیزوں کو میزان کے پلٹے میں رکھ دینگے تو اللہ تعالیٰ اسکے پلٹوں میں ہلکان یا بھاری پن اعمال کے رتبہ کے مطابق پیدا کر دے گا اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۔

سید صاحب نے امام صاحب کے اس خیال کو ان کا ابتدائی اعتقاد کہ کفر غیر مستبشر قرار دیا ہے اور مذکورہ بالا دوسرے قول کو ان کا صحیح مذہب قرار دیا ہے اور جب ذیل نتیجہ نکلا ہے کہ :-

اس آخر بیان میں امام صاحب نے میزان کے وجود کو حقیقی تسلیم نہیں کیا بلکہ وہ جو مثالی یعنی خیالی یا عقلی یا شہسی کو تسلیم کیا ہے اور جبکہ میزان کا وجود حقیقی ان کے نزدیک نہیں رہا تو موازنہ اعمال کا وجود بھی مثالی ہوا اور حقیقی نہ رہا اور جب اعمال کا وجود حقیقی نہ رہا تو کرامات میں کا لکھنا بھی حقیقی نہ رہا اور اس لئے جو کچھ ان آیتوں میں مذکور ہے وہ سب مثالی ہو گیا ۔

آپ کو امام صاحب کے کلام سے اپنا مطلب نکالنے میں اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت تھی ۔ کیونکہ امام صاحب کا قول خدا اور خدا کے رسول کا قول تو ہے ہی نہیں کہ کسی غیر کے لئے حجت ہو اور اگر آپ ان کے قول کو حجت ہی تسلیم کرتے ہیں تو نیچے ہم ثابت کرتے ہیں کہ آپ نے امام صاحب پر اتہام کیا ہے کہ وہ میزان مثالی کے قائل ہیں ۔ دیکھئے احیاء العلوم جلد اول جو ان کی آخری اور سب سے مشہور اور مشہر کتاب ہے ۔ ”المیزان وهو حق قال اللہ تعالیٰ ولنفع الموازن القسط لیوم القیامۃ وقال تعالیٰ فمن ثقلت موازینہ فاولئک هم المفلون ومن خفت موازینہ الا لایۃ ووجہ ان اللہ تعالیٰ یحدث فی صحائف الاعمال وزناً بحسب درجات الاعمال عند اللہ تعالیٰ فتقیر مقادیر اعمال العباد معلومة للعباد حتی یتظہر لہم العدل فی العقاب او الفضل

فی الحساب و تصنیف الثواب۔ اس عبارت سے صاف طور پر واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ صحیفہ اعمال میں اعمال کی قدر و منزلت کے مطابق وزن پیدا کرے گا جس سے لوگوں کو اعمال کی مقدار کا پتہ لگ جائیگا۔ اس عبارت سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میزان اور صحیفہ اعمال وغیرہ امور حقائق جسمانیہ نہ ہوں گے۔ ہاں ایسے ہی ہونگے مگر ہمیں ان کی نوعیت کا کچھ علم نہیں اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ ہمارے لئے شائع حال اسلام کا کلام حجتِ ناطقہ ہے جس کے مقابلہ میں آپ کی فلاسفی کی کوئی عزت و وقعت نہیں کیونکہ معتزلہ لوگ آپ سے پہلے ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں آپ بھی انہیں کے چھوٹے بھائی ہیں جیسے آپ نے امام صاحب کے کلام سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے (جو اگر غلط ہے) کہ مخالفِ اعمال و میزان وغیرہ کا وجود مثالی ہے اسی طرح ہم امام صاحب کی عبارت سے یہ نتیجہ صحیح اخذ کرتے ہیں کہ امام صاحب حشرِ جسمانی کے قائل ہیں چنانچہ جابجا ان کی کتابوں میں مذکور ہے اس لئے جو شخص حشرِ جسمانی کا قائل ہوگا وہ تمام اشیائے عالمِ اخروی کو جسمانی تسلیم کر لے گا پس ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ امام صاحب عالمِ اخروی کی اشیاء کو جسمانی تسلیم کرتے ہیں اور اس لئے وہ میزانِ موازنہ اعمال کے جسمانی ہونے کو بھی بلا تاویل مانتے ہیں۔ سو جب تک آپ قرآن و حدیث صحیحہ سے حشرِ جسمانی کی نفی کر کے حشرِ مثالی یا عقلی ثابت نہ کریں آپ

نے کسی چیز کے اندازہ کرنے کیلئے مختلف قسم کے طریق دیئے ہیں اور ہر ایک چیز کے وزن کیلئے میزان کی حقیقت بھی ایک ہی نہیں ہو سکتی۔ دیکھو کہ علمِ عروض میں شکر کا وزن قواعداً کیفیاً بقدریہ تقطیع کیا جاتا ہے اور اس کے غلط یا صحیح ہونے کا اندازہ علمِ عروض کے قواعد سے لگایا جاتا ہے۔ وزن مؤزن اور میزان کے الفاظ تو ہم استعمال میں لاتے ہیں مگر کیا ان کی حقیقت کسی بنیئے کے ترازو اور یا ٹ کی سی ہے؟ اسی طرح ہم عالمِ آخرت کی میزان کو میزانِ تکوینیہ کہیں کی نوعیت اور دنیا کی میزان کی سی نہیں ہو سکتی۔ واللہ اعلم بحقیقۃ۔ ۱۲۰

کا دعویٰ قابلِ سماعت نہیں۔ ورنہ خراط الفناؤں

صراط

صراطِ الٰہی حقیقت ہے جس کی کیفیت ایک حدیث میں بالفاظِ ادق من البشر
ولحد من التبیان بیان کی گئی ہے یعنی ہال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ
تیز ہوگی۔ یہ الفاظ محض بغرضِ تفہیم وارد ہوئے ہیں ورنہ اس کی حقیقت ہے ہم جیسے
ہی بخیر ہیں جیسے عالمِ آخرت کے دیگر حقائق سے۔ اور صراط کی اس وقت اور حدت
بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ چونکہ اعمال و اخلاق و عقائد میں افراط و تفرط اور اعتدال
حقیقی کی نگہداشت انسان کے لئے ایک امر دشوار ہے اس لئے صراط کو بھی ایسا ہی
دشوار گزار نام کر دیا گیا۔ سوچ لوگوں کے اعمال و عقائد جس قدر مائل الی الحق ہونگے اسی
قدر ان کو صراط پر سے گذرنا آسان ہوگا۔ برخلاف اس کے جو لوگ عقائد و اعمال میں
افراط و تفرط کی طرف مائل ہونگے اسی قدر ان کے لئے صراط پر سے گذرنا دشوار
ہوگا۔ گویا صراط درحقیقت انسان کے عقائد و اعمال کی ہی ایک جمالی صورت ہوگی
نہ کچھ اور۔ *

مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ میزانِ دصراط وغیرہ ایسی ہی
مثالی صورتیں ہونگی جنہیں انسان خواب میں محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا وجود محض عالمِ خیال
میں ہوتا ہے نہ خارج میں۔ ہم عالمِ آخرت کی تمام کیفیات کو انسانی وجود سے خارج
بجائے خود متحقق الوجود تسلیم کرتے ہیں اور یہی جمہور اہل اسلام کا مذہب ہے۔ *

اسلامی توبہ و عفو

ہر شخص جانتا ہے کہ توبہ اور انجیل جو اس وقت محض تراجم کی صورت میں موجود ہیں وہ اصلی آسمانی کتب نہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں یہ ہر دو کتب کورہ انبیاء کے بعد تیار کی گئیں جیسا کہ خود نصاریٰ کے محقق بھی تسلیم کرتے ہیں۔ باوجود اس قدر تحریف و تبدیل کے ہر دوس جو تعلیم و روح ہے اس سے توبہ اور اعمال صالحہ کے ذریعہ انسان کو نجات کا راستہ بتلایا جانا بخوبی ثابت ہو رہا ہے۔ توبہ کے دس احکام میں تثلیث اور کفارہ کا مطلق ذکر تک نہیں۔ توبہ میں ہر نبی کی تعلیم میں جایا توبہ اور اعمال صالحہ کی تعلیم کا سراغ ملتا ہے مسیحؑ نے بارہا انجیل میں توبہ اور اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اکثر واقعات انجیل سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیحؑ نے کبھی تو محض دولت کو خدا کی محبت میں خرچ کر دینا موجب نجات بتلایا ہے اور کبھی دل کی غریبی سے ہی آسمانی بادشاہی حاصل جانا تعلیم کیا ہے۔ کبھی شرابخوروں کو آسمانی بادشاہی کی وراثت سے محروم کر دیا ہے۔ لفظ اس قسم کی تعلیم کا ثبوت انجیل میں اس کثرت سے ملتا ہے کہ کفارہ اور تثلیث کی پوچھ بپوچھ کی تعلیم کی اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رہتی۔ فطرت میں کفارہ کا ثبوت نہیں مل سکتا نہ انسانی عقل اس کی صداقت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ سرکارِ دو تو بکر کو ہوا اور زید کے سر پھوڑ دینے سے وہ درد اچھا ہو جائے۔ ایسے اصول کی قانون قدرت ہرگز تائید نہیں کرتا بلکہ جس کے سر میں صوبہ ہو وہی علاج کرائے تو درد کے دور ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ اس اصول کو عقل اور قانونِ قدرت ہر دو قبول کرتے ہیں۔ جس کو گناہ کا مرض لاحق ہو وہی اپنا علاج کرائے تو فائدہ ہے۔ ایک شخص نے کسی وقت زہر کھالی اب ڈاکٹر کیا ایک اور

بے زہر کھلے انسان کو قتل کر ڈالے تاکہ وہ شخص صحت یاب ہو جائے جس نے زہر کھائی ہے؛
 ہرگز نہیں جب ایک ڈاکٹر بھی اسی طاقت اور نادانی کا علاج پتہ نہیں کرتا تو خدائے تعالیٰ جو
 سب سے بڑھ کر دانا ہے بھلا کیونکر پند کر سکتا ہے کہ ایک بے گناہ کو پکڑ کر پھانسی پر لٹکا
 دیوے تاکہ گنہگار بیچ جائے۔ جو قصور کرے وہی سزا پائے تو عدل قائم رہ سکتا ہے ورنہ
 عدل سکھاتا ہی عدل کہلائیگا۔ توبہ گناہ کے زہر سے بچنے کے لیے علاج تو ہے
 بشرطیکہ گناہ رُوح پر استقدر غالب نہ ہو گیا ہو کہ ہلاکت کے آثار نمایاں طور پر ظاہر ہو رہے
 ہوں۔ ایک شخص نے زہر کھالی اگر جھٹ پٹ تدارک ہو گیا تو بچنے کی امید ہو سکتی ہے
 ورنہ جوں جوں توقت ہوگا مرض کی موت یقینی ہوتی جائیگی۔ اسی طرح توبہ بھی ہوش میں
 کی قائمی میں مفید ہو سکتی ہے نزع کے وقت بے سود ہے۔ اسلام نے توبہ زبان سے
 نہیں فرمائی بلکہ توبہ سچے دل سے فرمائی ہے جس میں آئندہ ہمیشہ کیواسطے گناہ سے
 نفرت کرنے کا وعدہ ہو۔ اور سابقہ بدکرداری کا افسوس ہمیشہ دل میں قائم رہے جو اس
 کو آئندہ گناہ کرنے سے روک رکھے مخالفین کا اسلامی توبہ پر اعتراض محض غلط فہمی پر
 مبنی ہے چنانچہ سورہ تحریم پارہ ۲۸ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (اے ایمان والو! اللہ
 کی طرف خالص توبہ کرو ممکن ہے کہ اللہ تمہاری برائیاں دُور کر دیگا وغیرہ.....) پھر
 چوتھے پارہ کے اخیر میں فرمایا (ایسے لوگوں کی توبہ کوئی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں
 حتیٰ کہ موت آجاتی ہے تو پھر وہ شخص کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی
 توبہ قابل پذیرائی ہے جو کفر کی حالت میں مر جاتے ہیں) اب اس قسم کی توبہ سے چونکہ
 کوئی اصلاح ظہور میں نہیں آ سکتی اور نہ اس میں آئندہ اصلاح کا دوامی عہد قائم ہو سکتا
 ہے اس لیے ایسی توبہ کو اسلام نے مردود اور باطل قرار دیا ہے۔ اب توبہ کی امید پر
 گناہ میں دلیر ہونے کا اعتراض صاف اُڑ جاتا ہے۔ خالص توبہ اسلام میں دی ہے
 جو بے قائمی ہوش و حواس ہوا و جس میں آئندہ ہمیشہ کے لیے اصلاح کا عہد قائم ہو اور

جب تک انسان زندہ ہے اپنے گذشتہ گناہوں کو یاد کر کے نادوم اور شرمندہ ہے۔ اور
تلافی لغات کیا کرے جو ایک قسم کی روحانی سزا ہے۔ اب بدول اس قسم کی سزا کے خدا تعالیٰ
معافی نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کا عدل قائم نہیں رہتا۔ کیا یہ کم سزا ہے کہ ساری آئندہ عمر میں
گذشتہ اعمال بد کا افسوس اور رنج انسان سے ایک لمحہ تک بھی جدا نہ ہو؟ اب ہا اس
اعتراض کا جواب کہ محدود نیک اعمال سے غیر محدود وقت تک نجات کا ملنا انصاف کے
خلاف ہے سو اس کا جواب عین انصاف اور قانون قدرت الہی کے اصول کے مطابق
بیان کیا جاتا ہے جس کو مخالفین تعصب کے باعث سمجھنے سے محروم ہے ہیں۔ اول
توجیب تو یہ ہیں دوا می اصلاح کا عہد شامل ہے تو اعمال محدود نہ ہے کیونکہ دوا می عہد
یہی معنی رکھتا ہے کہ اگر تائب کو غیر محدود زندگی مل جائے تو وہ بھی اس عہد پر عمل درآمد
کرنے کا پختہ ارادہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ دوم قانون قدرت میں صاف ثابت ہو رہا
ہے کہ زمیندار محدود بیج سے غیر محدود پھل بطور نتیجہ کے حاصل کر سکتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ
کا عمل بھی بدستور قائم رہتا ہے اور اس غیر محدود عطیہ سے خدائے تعالیٰ کا بچید رحم
ثابت ہوتا ہے جس نے محدود سے غیر محدود پھل عنایت کر دیا۔ اگر ضعیف انسان کی
محدود کوشش سے اس طرح پر بے حد فہر نابی کرنے کا ثبوت فطرت میں خدا پیش کر تا
تو البتہ محترم کو اعتراض کی گنجائش ہوتی مگر اب یہ معاملہ صاف طور پر قرآن مجید کی صحت
پر اعلیٰ شہادت ہے کیونکہ فطرت خدا کا فعل ہے اور قرآن مجید خدا کا کلام ہے۔ جب فعل
مطابق کلام کے ثابت ہو گیا تو مخالفین کے پاس سوائے شرمندگی کے اور کچھ باقی نہ رہا
اسی باریک حکمت کو نہ سمجھنے کے باعث جو عین انصاف اور فطرت کے مطابق ہے
بعض نے نجات کو دوا می تسلیم نہیں کیا۔ اور تنازع کے چکر میں نجات یافتہ روح کو بھی
بار بار پھنسا دیا ہے۔ اسی باریک حکمت کو نہ سمجھنے سے پلوں کو کفارہ کا مسئلہ گھڑنا پڑا
ہے جب ہم انسان کے اعلیٰ ترین رتبہ پر غور کرتے ہیں تو ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب

خدا اس پر ایک دفعہ راضی ہو کر اس کو متحق نجات قرار دے چکے تو شانِ خداوندی سے بہت
 لیبید ہے کہ پھر اس کو آرام کی مقفص جگہ (مکتی خانہ یا بہشت) سے نکال کر دنیا جیسے بے آرام
 مکان میں واپس بھیج دے۔ اور ایک دفعہ نہیں بلکہ ہمیشہ اس سے ایسا ہی سلوک جاری
 رکھے۔ اگر خدائے تعالیٰ بھی ایسے ہی محدود و اور تنگدلی سے انجام و اکرام دیا کرے تو کس امید
 پر کوئی اس کی عبادت کیا کرے۔ اور جب خدائے تعالیٰ صاوقِ توبہ سے بھی جس کی تشریح
 ہو چکی انسان سے راضی نہ ہو تو خدا اور بندہ کے درمیان کتنی خفت و سلسلہ کیونکر قائم ہو
 سکتا ہے؟ ایسے فاسد عقیدہ سے صاوقِ محبت و کوشش کا کوئی حظ یا لطف انسانی رُوح
 میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب عینِ اور مرتبی سے کسی دوامی عطیہ کی اُمید ہی نہیں تو وہ حقیقی
 محسن اور مرتبی ہی نہیں۔ دنیاوی بادشاہ بھی محدود خدمت سے خوش ہو کر اپنے ماتحت
 کو دوامی جاگیر عطا کر دیتا ہے تو کیا خدائے تعالیٰ اس سے بڑھ کر قدر و انِ شاہنشاہ
 نہیں ہے؟ ایسے فاسد عقیدہ والوں کو خدائے تعالیٰ کی معرفت میں بھاری مغالطہ ہوا
 ہے۔ اگر خدائے تعالیٰ بدون سچی توبہ کے معافی دیدیتا تو بے شک اس صورت میں اس
 کا عدل ٹوٹ جاتا۔ لیکن اگر وہ سچی توبہ سے بھی معافی نہیں دیتا تو معاذ اللہ واقعی نہایت
 بے رحم خدا ہے اور یہ امر شانِ خدائی کے منافی ہے۔ جب ستیا رتھ پر کاش کے ص ۱۱۹ دفعہ
 میں مخالف تسلیم کرتا ہے کہ نیک عمل دوسرے گناہ کا عوض اور کفارہ ہو سکتا ہے تو صاوق
 توبہ اور نیک اعمال سے گزشتہ گناہوں کی تلافی اسلام میں کیوں ناممکن ہے؟ قدرت نے
 ضعف اور نسیان صرف انسانی واسطے انسان میں ودلیت کر رکھا ہے کہ وہ اپنے مالک اور
 خالق کے حضور میں ہمیشہ تائب رہے اور سرسجود ہو کر عبودیت کے رنگ سے رنگین
 ہو۔ جو انسان خدا کو مان کر عمداً گناہ کرتا ہے وہ خدا کی معرفت میں ابھی ناقص ہے۔ جو
 خدائے تعالیٰ حقوقِ عباد کے بارہ میں تجاوز کرنے پر ہرگز معافی نہیں دیتا بلکہ فرماتا
 ہے کہ مومن وہ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی مقرر کردہ سزا کے جاری کرنے میں

نہم نہ آوے۔ وہ خدا ہے حق میں تجاوز کرنے پر اس سے سخت گرفت کر سکتا ہے ایسے خدا کے سامنے گناہ کی صرف وہی شخص جرات کر سکتا ہے جس کو اس کی معرفت کا علم نہیں ہم مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم کر رہے ہیں کہ جنہوں نے کفار کا دوزخ کے عذاب سے نجات کا پڑا نہ خیال کر رکھا ہے وہ اس دنیا میں طرح طرح کی بیماریوں اور دکھوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ اور کفارہ کی بدولت جب دنیا میں ان سے کوئی رعایت نہیں کی جاتی تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ دوسری زندگی میں ان سے رعایت کی کیا سنگی؟ اپنی اصلاح کئے بغیر انسان نہ پاک ہو سکتا ہے نہ خالق کو راضی کر سکتا ہے۔ یہ ہے اسلامی توبہ اور معافی کا فلسفہ۔ اگر کوئی اسے دوبارہ و سہ بارہ مطالعہ کرے تو امید ہے کہ فاسد عقائد سے نجات پائے +

مسئلہ شفاعت

مسئلہ شفاعت کے متعلق قدیم الایام سے اہل اسلام کے دو فریق چلے آتے ہیں۔ معتزلہ اور خوارج تو مطلقاً انکار کرتے ہیں اور اہل سنت والجماعہ اور اکثر امامیہ اس کے قائل ہیں۔ اور یہی حق ہے مسئلہ مذکورہ چونکہ عقائد اسلام میں داخل ہے اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اس کو کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے پورے طور پر واضح کر کے آجکل کے خیریہ اور دیگر ملاحدہ کے اس باطل عقیدہ کا رد کیا جائے۔ کیونکہ نوجوان تعلیم یافتہ اصحاب کو قرآن مجید کے مختلف آیات اور احادیث صحیحہ میں مطابقت پیدا کرنے کی استعداد نہیں ہوتی اور نہ ہی انہیں علماء سے استفسار کا موقع ملتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اعتقاد سے آیۃ ولا تخذکم بعہما رافۃ فی دین اللہ کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۶ منہ +

صحیح سے محروم رہ جاتے ہیں اور منکرین کی باتوں پر مطمئن ہو کر انہیں اپنے لئے کافی سمجھ لیتے ہیں اور یہ ایک سخت خطرناک غلطی ہے جس کا ازالہ ہر ایک طرح پر واجب ہے *

نبی علیہ السلام نبی اللہ کی جو تبلیغ شریعہ کے لئے خدا نے تمنا کی طرف سے مبعوث ہوتا ہے تسلیم کر کے اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ رابطہ محبت قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں نبی اللہ کے ساتھ ایک نسبت حاصل ہو جاتی ہے جس کے رُوسے ہمیں کمالات روحانیہ کا رتبہ حاصل ہوتا ہے اور یہ نسبت جو قدر زیادہ مستحکم ہوتی ہے اسی قدر کمالات روحانیہ کا افادہ زیادہ ہوتا ہے چنانچہ اسی نسبت کے قوت و ضعت پر کمال باطنی کا انحصار ہے اور یہ نسبت موقوف ہے کمال اتباع نبی اللہ پر۔ یہ اتباع مراتب علمی و علمی ہر دو میں ضروری ہے۔ اسی علمی اور علمی اتباع پر حقیقت قرآنیہ کا انکشاف منحصر ہے۔ جس قدر کسی شخص پر حقیقت قرآنیہ کا انکشاف زیادہ ہوگا اسی قدر وہ دوسروں کی نسبت زیادہ صاحب کمال ہوگا۔ اور چونکہ علمی اور علمی مراتب تک بروہ کمال بہت کم افزو ترقی کر سکتے ہیں (بلکہ اکثر تو کچھ بھی نہیں کرتے۔ صرف ایک نسبت بعیدہ بوجہ تعین نبوت کے انہیں حاصل ہوتی ہے) اس لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لائنا ہی نعیم آخری کے استحقاق کے لئے ان کی کمی کو پورا کیا جائے کیونکہ اہل جنت صرف وہی لوگ ہونگے جو ہر ایک طرح سے پاک و صاف اور کمال و مکمل ہوں پس انہوں پر جو واسطہ انکشاف حقیقت قرآنی ہے مذکورہ بالا نسبت کے رُوسے علمی اختلاف الاستعداد ہر ایک امتی پر تاباں ہوگا اور اسی نور کے تاباں ہونے پر بحضور رب العالمین اسے استحقاق مقبولیت پیدا ہوگا۔ یہ استحقاق صرف نسبت مذکورہ بالا پر مبنی ہے اور یہی مقبولیت جو بواسطہ جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام باذن حضرت رب العزت ہر ایک عامی کو حاصل ہوگی اصطلاح شریعت میں شفاعت کہلاتی ہے۔ اس موقع پر کوئی شخص یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید میں لیس لانا انسان اکاماسعی“ وارد ہو چکا ہے اور شفاعت اس کے اپنے

اعمال میں داخل نہیں پھر اس کو شفاعت کا کیونکر حق حاصل ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بالکل سرسری نظر میں عائد ہوتا ہے ورنہ اس کی تہ میں کچھ بھی نہیں رکھا کیونکہ یہ کہتا کہ شفاعت انسان کے اپنے اعمال میں داخل نہیں گونطا ہر صحیح ہے مگر حقیقتاً غلط ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ نسبت جو اس نے تصدیقِ نبوت سے اپنے اور نبی اللہ کے درمیان قائم کی ہے۔ انسان کے اعمال کا جزو اعظم ہے جس پر استحقاقِ شفاعت مرتب ہے۔ یہ اعتراض صرف منکرینِ شفاعت کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

مخالفین انکارِ شفاعت میں آیاتِ ذیل کو پیش کیا کرتے ہیں :-

(۱) "فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ" یعنی انہیں شفاعت کرنے والوں کی شفاعت مفید نہ ہوگی۔

(ب) "يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ لِلَّهِ" یعنی قیامت کے دن کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے لئے کسی چیز کا مالک نہ ہوگا۔ اور اس دن حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہوگا۔

(ج) "قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا"۔ یعنی اے پیغمبر! انہیں کہ دو کہیں تہاے لئے نقصان اور رشید یعنی راستی راہ کا مالک نہیں ہوں۔

(د) "وَالْتَقُوا يَوْمَ لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ" یعنی دُور اس دن سے جس میں کوئی نفس کسی دوسرے نفس کے لئے کچھ کفایت نہیں کرے گی اور نہ ہی اس سے شفاعت قبول کی جائیگی۔

(هـ) "لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خِلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ" یعنی اس دن سے پہلے جس میں خرید و فروخت اور دوستی اور شفاعت نہیں ہوگی۔

(و) "فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ" نہیں ہیں ہمارے لئے کوئی شفاعت کرنے والے لوگ۔

(ز) "وَلَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ" یعنی اُس کو شفاعت سودمند نہ ہوگی۔

مذکورہ بالا آیات ایسے ہیں جو مخالفین کی طرف سے انکار شفاعت کے متعلق پیش کئے جاتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ ان آیات سے نفی شفاعت کا مفہوم اخذ کرنا محض حماقت ہے قرآن مجید کے آیات مختلفہ کو جب تک بالمقابل نہ دیکھا جائے اور مطلق و مقید اور عام اور خاص کو علیحدہ علیحدہ اصول کے رُوسے موازنہ نہ کیا جائے حکم صحیح کا اخذ کرنا ناممکن ہے۔ اب ہم ذیل میں ان آیات کا ذکر کرتے ہیں جو اثبات شفاعت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر دو قسم کے آیات کو قلمبند کرنے کے بعد ناظرین کے لئے تصحیح حکم کا اخذ کر لینا آسان ہو جائیگا اور معلوم ہو جائیگا کہ جن آیات میں نفی شفاعت کا ذکر ہے وہ ان آیات سے جو اثبات شفاعت پر دلالت کرتے ہیں ہرگز متخالف نہیں بلکہ یقینی کامور و اثبات کے مورد سے علیحدہ ہے۔

(۱) لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا "یعنی شفاعت کے مالک نہیں ہونگے مگر وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بارہ میں عہد لے لیا ہے۔"

(ب) "يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ شَفَاعَةُ إِلَّا لِمَنِ اِذْنُ لَدِ الرَّحْمَنِ" یعنی اس دن کوئی شفاعت سو مند نہ ہوگی مگر اس شخص کی شفاعت جس کو اللہ تعالیٰ حکم دیگا۔
 (ج) "وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنِ اِذْنُ لَدِ" یعنی اس شخص کی شفاعت سو مند نہ ہوگی جس کو اللہ تعالیٰ حکم دیگا۔

(د) "مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِاِذْنِهِ" یعنی کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے پاس بجز اس کے اذن کے شفاعت کرے؟

(هـ) "وَكَمِ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تَقْبَلُ شَفَاعَتَهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِّنْ بَعْدِ اَنْ يَّاذِنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى" یعنی آسمانوں میں کئی ایک ایسے ملائکہ ہیں جن کی شفاعت کچھ مفید نہیں ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کے اذن کے بعد جس کے لئے وہ چاہے اور جس سے راضی ہو۔

(و) وَلَا يَهْتَدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ الشَّفَاعَةِ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ
وَهُمْ يَعْلَمُونَ یعنی جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں یا جن کی عبادت کرتے ہیں وہ ان کی
شفاعت کے مالک نہیں ہونگے مگر وہ لوگ جو حق کی شہادت دیتے ہیں بجا لیکہ وہ جانتے ہیں +
(ز) مِمَّنْ شَفَعَ الْإِمَامُ بَعْدَ إِذْنِهِ کوئی شفیع نہیں ہوگا مگر اللہ تعالیٰ کے اور یہ
ان آیات سے صاف طور پر بلا کسی قسم کی تاویل کے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ قیامت
کے روز شفاعت ہوگی مگر وہی لوگ شفاعت کریں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت
حاصل ہوگی اور انہیں لوگوں کی نسبت ہوگی جن کی بابت حکم دیا جائیگا۔ چونکہ دلائل عقل و نقل
سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا کردہ تمام نبی آدم سے افضل ہے جن میں جناب
پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سب سے افضل مانے گئے ہیں اس لئے انبیاء علیہم السلام
اللہ تعالیٰ سے عاصیان امت کے لئے اجازت شفاعت حاصل کریں گے اور یہی حق ہے
مذکورہ بالا نصوص کا نکار بجز ایک سنا دلچ فطرت کے کوئی نہیں کر سکتا۔ البتہ اس امر کا
جائزہ لایا ہے کہ ہر دو قسم کے آیات میں جو بظاہر تناقض نظر آتا ہے کیونکر دور کیا جاسکتا
ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ آیات نفی شفاعت کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے
بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں صرف ان کفار کے لئے شفاعت کی نفی کی گئی
ہے جو مخلد فی النار ہیں اور کفر ہی پر مہر ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر تصدیق نبوت
سے اپنے لئے نبی اللہ کے ساتھ وہ نسبت قائم نہیں کرتا جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا
ہے اور جس سے استحقاق شفاعت پیدا ہوتا ہے۔ اور چونکہ کفار غیر اللہ کی پرستش کرتے
اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ان کے معبود قیامت کے دن ان کی شفاعت کریں گے
اور انہیں دوزخ کی آگ سے بچا لیں گے اس لئے ان کے اس باطل خیال کا رد کیا گیا۔
کہ ان کو ہرگز کسی کی بھی شفاعت مفید نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی کوئی ان کے لئے شفاعت
کر سکیگا۔ آیات نفی شفاعت سے مطلق شفاعت کی نفی کرنا بجا لیکہ اس کے اثبات کے

۱۔ حضرت امینؑ کے مضمون میں غور کرئیے معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیمؑ سے پاک اور غریبی حجت اللہ ہیں اس لیے جس شخص کو یہ مقام
حاصل ہو وہ تمام شفاعت میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ۱۲۰ منہ +

مستحقِ مذکورہ بالا آیات صراحتاً مذکور ہیں سخت کج فہمی ہے مسئلہ شفاعت مجملہ معتقدات اسلام کے ایک زبردست مسئلہ ہے جس پر ایمان لانا ایک صحیح الایمان آدمی کا فرض ہے اور اس سے انکار کرنا موجبِ خسارِ آخرت ہے۔ "واللہ یمدٰی من یشاء الی صراط مستقیم" آثارِ صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شفاعت صرف انبیاء تک ہی محدود نہیں بلکہ خاص خاص اہل ایمان کو بھی بعض تعلقاتِ دینی کی بناء پر یہ منصب عطا ہوگا کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مومن کی شانِ بہت بلند ظاہر کی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وللہ العزۃ ولسہولہ وللمؤمنین اتباع بنی اللہ سے نسبت مذکورہ جو کسی نتیجہ کو حاصل ہوتی ہے وہ درحقیقت ایک قسم کا عہد و پیمان ہے جو کسی اُمتی اور بنی اللہ میں قائم ہوتا ہے آیہ ان الذین میبایعونک انما میبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدہم کے معارف و حقائق پر خود کر دہتیں مسئلہ شفاعت کی حقیقت کا یقین حاصل ہو جائیگا۔ اور یہی عہد و پیمان سلسلہ وار حضورؐ سے لے کر رسالتِ کاملین اُمتِ آج تک جاری ہے اور جاری رہے گا۔

ہنوز ان ابر رحمتِ رفشان است مئے و مئے خانہ باہر و نشان است

علاماتِ قیامت

بیانِ اشرارِ الساعۃ میں حکمت

واضح ہو کہ علاماتِ قربِ قیامت کچھ تو

قرآن مجید میں وار و پوائے ہیں اور کچھ احادیث

اور آثارِ نبویہ میں اور ان ہر دو اقسامِ اشرار میں بڑی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو رجوع الی اللہ کا موقع دیا جائے اور غافلین کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے۔ دیکھو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بار بار وقوعِ قیامت کے ہول کی خبر دی ہے چنانچہ فرمایا اقترَب

لنّاس حسابه و هم فی عقله معرّفون۔“ چونکہ وقوع قیامت کے وقت کا پتہ صاف صاف الفاظ میں نہیں دیا گیا بلکہ اس کے امارات و علامات کی تفصیل وارد ہوئی ہے جو حکمت تبلیغ ایمان بالغیب کے مقتضی کو ظاہر کرتی ہے اس لئے خود جناب پیغمبرؐ اور حضرات علمائے کرام ہر ایک زمانہ میں عامہ ناس کو تحذیر و تحویل کرتے چلے آئے ہیں کیونکہ جب یہ معلوم نہیں کہ وہ آنے والا کُل وقت کب آئے گا اس لئے ہر ایک مومن بالآخرۃ کا فرض ہے کہ اس وقت کے آنے کے لئے ہر آن مشطرب ہے اور توبہ کر کے قبل از موت زمرہ عبادِ صالحین میں داخل ہو جائے قال اللہ تعالیٰ ”فہل یبظرون الا الساعۃ ان تأتیہم بغتۃ فقد جاء استراطھا“ یعنی لوگ اب اس نے والی ساعت کے منتظر ہیں جو ناگہاں آجائیگی کیونکہ اس کے امارات اور علامات نمودار ہو چکے ہیں *

اشراط الساعۃ کے اقسام

اشراط الساعۃ کے مختلف اقسام ہیں اول وہ

اشراط جو اماراتِ صغریٰ کہلاتے ہیں۔ یہ تو گذر

لئے۔ دوم وہ اشراط جو اماراتِ متوسط کہلاتے ہیں جو کچھ تو گذرے اور کچھ پیدا ہو رہے

ہیں۔ سوم وہ اشراط جو اماراتِ کبریٰ کہلاتے ہیں اور جو عنقریب پیدا ہونے والے ہیں

عوام الناس ایسی باتوں کو سرسری سمجھ کر توجہ نہیں دیا کرتے حالانکہ علوم نبوت کا ایک

معتبر حصہ ان اشراطِ ساعتہ کی حقیقت کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے

کہ آیاتِ احادیث میں بعض امارات تو بالترتیب بتلائے گئے ہیں اور بعض دیگر میں اجمال

اور اختصار کو مد نظر رکھا گیا ہے اور اس کی وجہ وہ لوگ جو کلام وحی کی خصوصیات کا

علم رکھتے ہیں بخوبی جانتے ہیں محققین کتاب و سنت نے فیصلہ کر دیا ہے کہ حضور

علیہ السلام نے قیامت کے آنے والے تمام بڑے بڑے امور عظیمہ اور انقلابات کی خبر

دے دی ہے جن میں اکثر تو ہو چکے اور اکثر کا وقت آگیا ہے۔ اس میں

ابن حجر عسقلانی اور حافظ جلال الدین سیوطی کے تصانیف مثلاً فتح الباری شرح صحیح بخاری۔
در مشور خصائص کبریٰ۔ جمع الجوامع۔ اور امام شریف نور الدین علی سہودی کی تاریخ مدینہ
اور جابر العقیدین اور محقق علی متقی کی کتابیں قابل مطالعہ ہیں۔ اور تخریج المصانیح حافظ
مناوی اور الصناعة حافظ سخاوی میں بھی اس موضوع پر کچھ بحث موجود ہے۔ اور ان
سب مباحث مختلفہ سے مقصود اصلی صرف غافلوں کو تنبیہ کرنا ہے کیونکہ ہر ایک شخص
کے لئے توبہ کی ضرورت ہے اور ساعت مقررہ کے وقوع پر توبہ قبول نہیں ہوگی۔

واضح ہو کہ امارات صغریٰ زمانہ رسالت سے شروع ہو چکے تھے اور تہذیب و فروع پذیر
ہوتے رہے چونکہ وہ گزر چکے ہیں اس لئے ناظرین کو ان سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں ہوگی
اس لئے ہم صرف بطور اختصار ان کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ مخبر
صادق علیہ السلام نے جس طرح ارشاد فرمایا جیسے وقوع میں آتا رہا اور اب امارات متوسطہ
بھی شروع ہو کر ختم ہو رہے ہیں اور امارات کبریٰ کا وقت قریب آ گیا ہے جس پر تمام
سلسلہ اخبار بالغیب کی تکمیل ہو رہے گی۔

امارات صغریٰ (۱) حضور علیہ السلام کی رحلت مجیدہ امارات قیامت کے شمار
اک کی گئی ہے کیونکہ یہ ایک وہ مصیبت عظمیٰ تھی جس کے برابر

اسلام میں کوئی اور مصیبت شمار نہیں کی گئی چنانچہ ابن سعد بروایت عطاء بن ابی رباح اور
بروایت امام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا لکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "اذا
أصیب احدکم بمصیبة فایذکر مصیبتہ فی فانہا اعظم المصائب" یعنی جب تم
میں سے کسی کو کوئی مصیبت پہنچے تو اسے چاہئے کہ میری رحلت کی مصیبت کو یاد کرے
جو سب مصائب سے بڑی مصیبت ہے۔ اور عوف بن مالک مرفوعاً راوی ہیں کہ
حضور علیہ السلام نے فرمایا "اعدوا دستابین یدی الساعة موتی ثم فتح بیت المقدس
الی اخر الحدیث" یعنی قیامت کے آنے سے پہلے چھ حوادث وقوع پذیر ہونگے

جن میں میری رحلت پہلا حادثہ ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور علیہ السلام کی رحلت سے ان اختلافات کا دروازہ کھل گیا تھا جو آج تک ترقی کر رہے ہیں اور جو اسلام کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوئے ہیں۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ابو لؤ لؤ عجمی کے ہاتھوں قتل ہونا جس کی تفصیل کتب سیر و تاریخ میں کی گئی ہے۔ آپ کا واقعہ قتل بھی اسلام کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوا۔ اسی خیال پر ابوذر رضی اللہ عنہ نے آپ کو قتل الفتنہ کا لقب دیا جس میں یہ اشارہ ہے کہ آپ کا وجود مختلف قسم کے فتنوں کو روکے ہوئے تھا جو نہی آپ کی رحلت ہو گئی فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ غلط فہمی نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت عمر کی وفات پر اطراف عالم میں تاریکی چھا گئی اور آفتاب سیاہ ہو گیا۔

(۳) واقعہ قتل عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ایک نہایت دردناک واقعہ ہے اور جس کی خبر حضور علیہ السلام نے پہلے ہی دیدی تھی۔ چنانچہ فرمایا: "ستكون فتنه و اختلاف قلنا في نايها رسول الله قال عليكم بالامير واصحابه واثار الى عثمان (رواه الحاكم) یعنی عنقریب فتنے اور اختلافات پیدا ہونگے ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلعم آپ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ فرمایا کہ نہیں لازم ہے کہ اپنے امیر اور اس کے ساتھیوں کو نہ چھوڑنا۔ یہ فرماتے ہوئے آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا۔

(۴) واقعہ جمل جس میں طرفین اکابر صحابہ اہل ایمان کی اولادیں تھیں۔ ایک جانب تو علیؑ اور دوسری طرف ام المومنین عائشہ اور طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم اجمعین تھے اس واقعہ کی خبر بھی جناب پیغمبر علیہ السلام نے دیدی تھی چنانچہ ابن ابی شیبہ اور بزرار بن عباس اور محدث حاکم قیس بن ابی حازم سے راوی ہیں ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لئلا ياتنك صاحبك الاجمل الا ذنبك تسير وتخرج حتى تنجها كلاب الحوآب

يُقْتَلُ عَنْ يَمِينِهِمَا وَعَنْ شِمَالِهَا كَثِيرَةٌ وَتَجْرُلُ عِدَاكَ دُونَكَ“ یعنی حضور علیہ السلام نے ازواج مطہرات کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کون صاحبۃ الجمل (اوت واپس) ہے جو شتر سوار ہو کر نکلے گی حتیٰ کہ مقام حوٰب کے کتے (اس کی سواری کو دیکھ کر) بھونکنے اور اس کے دائیں بائیں بہت سے مقتول ہونگے۔ اور نجات پا جائیگی بداندان کردہ نجات نہ پانے کے قریب پہنچ جائیگی۔ چنانچہ ام المؤمنین نے خروج کیا اور حضور علیہ السلام کی پیشگوئی حوت بہ حوت پوری ہو گئی اس واقعہ کا جو اثر مسلمانوں پر پڑا وہ واقفان تاریخ پر مخفی نہیں۔

(۵) واقعہ صفین - یہ وہ واقعہ ہے جس کے ضمن میں ہزاروں قتلہ و فساد کی تاریخ لکھنی پڑتی ہے۔ اور سچ بولچھ تو اسلام کی فرقہ بندی کا پہلا ہی واقعہ تھا۔ اس کی خبر بھی حضور علیہ السلام نے پہلے دیدی تھی۔ چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے ”لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى تَقَاتِلَ فِتْنَانِ عَظِيمَتَانِ يَكُونُ بَيْنَهُمَا مَقْتَلَةٌ عَظِيمَةٌ دَعَا هُمَا وَاحِدَةً“ یعنی قیامت نہیں ہوگی جب تک وڈ بڑے گروہ (مسلمانوں کے) نہیں لڑینگے۔ جن کا دعویٰ (خلافت) ایک ہی ہوگا۔ طرانی بروایت شداد بن ادس راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ”اِذَا رَأَيْتُمَا مَعَاوِيَةَ وَعُمَرُ بْنُ عَاصٍ جَمِيعًا فَقَوَّيْنِي“ یعنی جب تم معاویہ اور عمرو بن عاص کو یک جا بیٹھے پاؤ تو ہر دو میں تفریق کر دو۔ چنانچہ شداد جب کبھی ان ہر دو حضرات کو یکجا بیٹھے دیکھتے تو آپ ان ہر دو کے درمیان ہوبھیتے حضور علیہ السلام کے الفاظ میں نہایت بازیک اشارہ ہے ان ہر دو صاحب کے اس اتفاق کی طرف جو خلافت علی رضی اللہ عنہ میں ہر دو نے ان کے برخلاف کر لیا تھا واضح ہو کہ جنگ صفین میں جو علیؑ اور معاویہؓ کے درمیان واقع ہوئی تیس ہزار مسلمان عرصۂ تیغ ہوئے۔

اور ابن عساکر بروایت عمرو بن رؤیم راوی ہیں کہ ایک اعرابی حضور علیہ السلام کے

ہاں حاضر ہو کر کہنے لگا کہ آپ مجھ سے کشتی لڑیں۔ معاویہ پاس بیٹھے تھے کہنے لگے کہ میں تجھ سے کشتی لڑتا ہوں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا "لا یغلب معاویۃ ابدًا" یعنی معاویہ کبھی بھی مغلوب نہیں ہونگے۔ چنانچہ معاویہ اعرابی مذکور سے کشتی لڑے اور عربی کو پچھاڑ دیا۔ جنگ صفین کے ختم ہونے پر علیؑ نے یہ حدیث سن کر فرمایا کہ اگر مجھے اس حدیث کا علم ہوتا تو میں کبھی معاویہ سے جنگ نہ کرتا۔

(۶) واقعہ نہروان - یہ وہ مشہور واقعہ ہے جو علیؑ اور خوارج میں واقعہ ہوا۔ اور جس سے سینکڑوں قسم کے فسادات دینی اور دنیوی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور حضور علیہ السلام نے اس واقعہ کی بھی خبر دیدی تھی۔ چنانچہ مخنف بن سلیم سے مروی ہے کہ ہم ابوالیوب الضاری کے پاس گئے اور پوچھا کہ آپ جناب رسول اکرم صلیم کے ساتھ ہو کر مشرکین سے لڑتے ہے پھر آپ مسلمانوں سے بھی لڑتے ہیں (حضرت علیؑ کے ساتھ ہو کر) آپ نے فرمایا کہ میں جناب پیغمبر علیہ السلام نے تین گروہوں کے ساتھ لڑے کا حکم دیا تھا ناکثین یعنی ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے عہدِ بیعت کو توڑا۔ قاسطین یعنی ان لوگوں سے جنہوں نے جور و ظلم کیا۔ مارقین یعنی ان لوگوں کے ساتھ جو دین سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ سومیں ناکثین اور قاسطین سے تو لڑ چکا ہوں مگر ابھی مارقین سے لڑنا باقی ہے ان ہر تہ الفاط سے علیحدہ علیحدہ جنگ چل۔ جنگ صفین اور جنگ نہروان مراد ہیں (ابن ہشام اور عبد اللہ بن عمرو راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "مخرج ناس من المشرق لیترون القرآن لا تجاوزوا اقصاه" یعنی مشرق سے ایسے لوگ نکلیں گے جو قرآن مجید پڑھیں گے مگر ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ چنانچہ خوارج نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس فرمان کی تصدیق کر دی۔

(۷) امام حسن بن علیؑ کا امیر معاویہ سے دربارہ خلافت سمجھوتہ کر کے علیحدہ ہو جانا یہ واقعہ آئندہ کسی ایک مفاسد کا مبداء ثابت ہوا ہے اور اس کی خبر بھی جناب پیغمبر علیہ السلام

نے دیدی تھی چنانچہ دلیلی امام حسن بن علی سے راوی ہیں کہ علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے کہ میں نے حضور علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا۔ کہ تذهب الایام واللیالی حتیٰ بھلاک معاویہ یعنی بہت زمانہ نہیں گزرے گا کہ معاویہ (خلافت کے) مالک ہو جائیگے *

(۸) امام حسینؑ کا مظلوم ہو کر میدانِ کربلا میں شہید ہونا جس نے اسلامی تاریخ کے اوراق کو خون سے رنگین کر دیا۔ اور جس کے نتائج اسلامی شیرازہ جمعیت کے فشر کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھے۔ اس واقعہ کی خبر بھی حضور علیہ السلام نے پہلے ہی دیدی تھی۔ چنانچہ محدثِ حاکم نے مختلف طریق سے روایت کیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام حضور صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ قتلِ حسینؑ کی خبر دی اور اس زمین کی مٹی آپ کو دکھلائی جہاں وہ مقتول ہونے والے تھے۔ وہ مٹی حضور علیہ السلام ام المؤمنین ام سلمہؓ کے حوالہ کر دی اور فرمایا یتحول دماً یعنی حسینؑ کے قتل پر یہ خاک خون بن جائیگی چنانچہ ایسا ہی ہوا *

(۹) واقعہ حرہ۔ یہ وہ واقعہ ہے جو نیرید بن معاویہ کے زمانہ میں پیش آیا جس میں ہزار ہا صالحین کے خون مدینہ منورہ کی گلیوں میں بہا دیے گئے اس واقعہ کی خبر بھی جناب رسول اکرم صلعم نے دیدی تھی۔ چنانچہ بروایت ایوب بن بشیر مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا یتقتل فی ہذا الحرۃ خیبار امتی لجلد اصحابی یعنی اس حرہ کے حدود میں میری امت میں سے صحابہ کی جماعت سے بعد میں آنے والے صالحین مقتول ہونگے۔ چنانچہ سات سو اکابر قریش اور دس ہزار دیگر اہل اسلام زن مروی بچے تر تیخ ہو گئے۔ اور ہزاروں پابہ زنجیر ہوئے اور مستورات کی بے حرمتی اور پردہ کی گئی گئی اور مسجد نبویؐ میں ستونوں سے گھوڑے باندھے گئے جہاں لہر اور پریشاب کی وجہ سے تین دن تک اذانِ صلوٰۃ منقطع رہی۔ اور بیت اللہ کو آگ لگائی گئی *

(۱۰) حجاج بن یوسف جیسے ظالم کا بیت اللہ کا منہمک کرنا اور ایک لاکھ تیس ہزار

مسلمانوں کا بیدار بننے کا زمانہ اور چار ہزار آدمی کو سگینا ہر ماہ اڈالنا اور صحابہ کی ایک جماعت کی اہانت کرنا۔ اس واقعہ کی خبر بھی آثار میں وارد ہو چکی تھی چنانچہ حدیث میں پیسیر بنی ثقیف (بنی ثقیف کا ہلاک کنندہ) کے لفظ سے حجاج بن یوسف ثقفی ہی مراد ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ایک حدیث میں جس کو بیہقی نے حبیب بن ابی ثابت سے روایت کیا ہے اس ظالم ثقفی کا زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر آچکا ہے +

(۱۱) زمانہ حکومت بنی عباس میں بعض حوادث کا ظہور مثلاً محمد بن قسیر نے طوسی اور ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ اور سادات کی ایک جماعت کثیرہ کا قتل اور منصور عباسی کے زمانہ میں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا محبوس ہونا اور زمانہ رشید عباسی میں امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کا زندان میں رحلت کرنا اور فلسفہ یونان کا اسلام میں داخل ہونا اور مختلف عقاید بدعیہ کا رواج پذیر ہونا اور زمانہ ماموں میں معتزلہ کا زور پکڑ جانا اور خلقِ قرآن پر بڑے بڑے علما کا مارا جانا۔ غیر ذلک من الحوادث۔ ان متفرق حوادث کے متعلق بھی آثار اور اخبار موجود ہیں جن کو یہ نظر اختصار قلمبند نہیں کیا جاتا +

(۱۲) خلفائے فاطمیہ کا مصر پر غالب آنا اور حد و شرعیہ کو محو کرنا اور حلال و حرام شرعی کا امتیاز اٹھا دینا وغیرہ +

(۱۳) ترکوں کا غالب آنا اور انواع و اقسام کے ظلم و ستم کا رواج دینا اس واقعہ کی خبر بھی آثار میں وارد ہو چکی ہے چنانچہ بخاری راوی ہیں لا تقوم الساعة حتی تقتلوا اخوز وکمرمان قوماً من الاعاجم حملاً لوجوه“ سوان علامت کے ساتھ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں پیدا ہو کر اپنے کارنامے صفحہ تاریخ پر چھوڑ گئے جن پر لوگ آج تک لعنت بھیجتے ہیں۔ ترکوں کے بارہ میں اور بھی بہت سی روایات ہیں جنکو مجموعاً دیکھنے

سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق رسالت کی چاہتی ہے چنانچہ نووی کہتے ہیں
 "ما رواه احمد بن حنبل في مسنده من قول النبي صلى الله عليه وسلم قال اللهم اسلمون
 منات" یعنی ہر سب احادیث حضور علیہ السلام کی تصدیق رسالت کرتی ہیں کیونکہ بعینہ
 ہی حال ترکوں کے مشاہدہ میں آئے ہو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمائے
 تھے۔ تاج سبکی طبقات میں کہتے ہیں کہ فقہ ثنائی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی پر مشتبہ
 واقعہ شروع آفرینش سے آج تک نہیں ہوا ہوگا۔ جن میں صحیحین پر یا دیگر کتب شاہد اور
 قرآن مجید جلا دیئے گئے اور پٹے سے ہٹے علماء اسلام تھے اور ہزاروں بیگناہ مقتول
 و شہید ہو گئے۔

۴۴۰) تاریخ حجاز۔ یہ وہ آگ ہے جس کی خیر بھول مقبول علیہ السلام نے پہلے ہی دیدی
 تھی۔ چنانچہ بخاری اور حاکم پر روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایتی ہیں ولا تقوم الساعة
 حتی یتخرج نار من ارض الحجاز تضيء اعناق الابل ببصرى یعنی قیامت نہیں آئے گی
 جب تک کہ ایک آگ سرزمین حجاز سے نہ نکلے گی جس سے بصری (علاقہ شام) میں
 اونٹوں کی گردنیں روشن ہو جائیں گی اس واقعہ کے متعلق اور بھی احادیث وارد ہیں جنکو
 بہ نظر اختصار قلمبند نہیں کیا جاتا۔ یہ آگ عجلانہ میں ظاہر ہو چکی ہے چنانچہ نور الدین
 سیوطی سمودوی تاریخ مدینہ میں لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا آگ مدینہ میں ظاہر ہو چکی ہے اور
 دور دراز ممالک تک اس کا شہرہ ہو گیا۔ اس آگ سے پہلے بہت سے خطرناک زلزلے
 آئے ہیں جن سے اہل مدینہ سخت گھبرائے اور جمع ہو کر وضعہ سمطہرہ جناب نبوی کے
 سامنے تضرع و ابتهال کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوئے۔ جمعہ کے
 دن نصف النہار کے وقت ایک سمیت ناک دھواں اُٹھا جو تمام آفاق پر محیط ہو گیا
 رات کے وقت آگ کے شعلے قرطیبہ میں حد و حدہ میں سرنگام ہو کر نظر آنے لگے
 اور یہ آگ حرکت کرتی تھی اور جس راستہ پہاڑ یا درخت پر سے گزرتی تھی سب کو خاک

سیاہ کر جاتی تھی۔ اور سُرخ نیلگوئی شعلے ایک سخت مہیب آواز کے ساتھ مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تھے مگر بایں ہمہ مدینہ میں نسیم بار وعلتی محسوس ہوتی تھی بعض دیات میں لکھلکے کے مقام بصری کے پہاڑوں تک اس کی روشنی پہنچ گئی۔ امیر مدینہ غزالی مدینہ اہل مدینہ کے مسجد نبوی میں ہفتہ کی رات عجز و زاری میں مشغول رہا اور حجرہ شریفہ نبوی کی طرف متوجہ ہو کر توبہ استغفار کرتے رہے بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس گنگ کو بایں جانب منتقل کر دیا۔ جس کو اہل مدینہ تین ماہ برابر دیکھا کئے۔ اس آگ کے مطلق اور بھی واقعات ہیں جن کو ہم نے نظر انداز کر دیا ہے۔ اس آگ کے بعد خلافت بغداد کی تباہی ترکوں کے ہاتھ سے ایک ایسا ہولناک منظر ہے جس کی نظیر عالم میں نہیں مل سکتی کتب خانے جلا دیئے گئے۔ مساجد ویران کر دی گئیں۔ اور ایک عام وبا پڑی جس سے بغداد اچڑا دیا رہ گیا اور بنی عباس کی خلافت کا چراغ ہمیشہ کیلئے گل ہو گیا۔

(۱۵) اظہور و افضل جنہوں نے سب و شتم اور لعن و طعن کا ایک عام دروازہ کھول دیا۔ ان لوگوں نے سنت نبویہ کے آثار کے محو کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا اس واقعہ کی خبر بھی جناب پیغمبر علیہ السلام نے پہلے سے ہی دیدی تھی چنانچہ وارقطنی بروایت فضیل بن مزروق عن زینب بنت علی بن ابی طالب عن فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے علی کرم اللہ وجہہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے ابوالحسن کہ تو اور میرے پیروان تو جنت میں ہونگے اور وہ لوگ جو تجھ سے محبت کا دعویٰ کریں گے وہ اسلام کی اہانت کریں گے۔ اور وہ اسلام سے الگ تھلک ہو جائیں گے جس طرح تیر شکار کو لگ کر اس سے پار ہو جاتا ہے۔ اور وہ رافضیہ کے لقب سے مشہور ہونگے۔ اگر تو انہیں پالے قتل کیجو کیونکہ وہ مشرک ہونگے۔ اور ایک دوسری حدیث میں جو امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آیا ہے کہ حضور علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ کن کی علامت کیا ہوگی؟ فرمایا کہ وہ لوگ جمعہ اور جماعت میں شریک نہیں ہونگے اور

سلف صالحین کے حق میں طعن کیا کرتے تھے۔ اسی مضمون میں اور بہت سی روایات ہیں جو بہ نظر احتساب نظر انداز کی گئیں *

(۱۶) خروج و جلالین۔ یعنی جھوٹے مدعیان نبوت کا پیدا ہونا۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی حضور علیہ السلام نے صاف سے صاف الفاظ میں خبر دیدی ہے چنانچہ ابو داؤد ترمذی ابن حبان بروایت ثوبان راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ”سیکون فی امتی کذا ہون ثلاثون کلہم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی“ اور بخاری کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ ”وحتی یبعث و جالون قریب من ثلاثین ینزعہم اندہ رسول اللہ“۔ اور سند امام احمد اور ابو نعیم میں روایت عبداللہ بن عمرو یہ الفاظ ہیں۔ ”بین یدی الساعة ثلاثون و جالا کذا ابا“ علی ہذا اس موضوع میں اور بھی احادیث انہیں معنی میں بدتیر الفاظ وارد ہوئی ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ قرب قیامت میں تیس جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہونے اور ہر ایک ان میں سے بنی اللہ یا رسول اللہ کہلائیگا حالانکہ نبوت اور رسالت مجھ پر ختم ہو چکی۔ اور ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں ”فاذا ہر ایتموہم فاجتنبوہم“ یعنی جب تم انہیں پاؤ تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ چنانچہ اسود غنی ہنعا (مین) میں اور مسلمہ کذاب علاقہ یمامہ میں طلحہ بن اسد میں مختار ثقفی ایام عبدالملک میں اور یہود ایام محمد بائند میں اور یحییٰ بن زکریہ قرطبی ایام مکفی بائند میں اور اس کے بعد اس کا بجائی حسین ایام مقتدہ بائند میں ابوطاہر قرطبی ایام راضی بائند میں محمد بن علی سلطانی المعروف بابن ابی العراق منتظر بائند میں ایک شخص جس نے اپنا نام کا مقرر کیا دعویٰ کیا کہ لا نبی بعدی سے میری نبوت کی طرف اشارہ ہے اور خازادی ساحر کا مائتہ (اندس) میں اور علی محمد باب کا ایران میں پیدا ہونا مذکورہ بالا فرمان نبوی کی تصدیق کرتا ہے۔ بعض محققین نے تائیس مدعیان نبوت کو نام بنام گنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ملک ہندوستان میں بھی بعض بے علم

لوگ اخیر زمانہ میں جھوٹے مدعی نبوت پیدا ہو کر مدعیانِ کذب کے سلسلہ پر چڑھ گئے ہیں اور مسیح علیہ السلام کے اس قول کی تصدیق کر گئے ہیں کہ میرے بعد میرے نام پر جو بھی نبی آئینگے۔ ان لوگوں نے سینکڑوں پیشگوئیاں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ہر ایک میں انہیں جھوٹا ثابت کر کے اہلِ دُش کو ان کے دھول و غریب سے آگاہ کر دیا۔ ان کے علاوہ اور مدعیانِ مہدویت جو آج تک پیدا ہو چکے ہیں شمارِ قصہ سے خارج ہیں۔

(۱۷) بیت المقدس کا فتح ہونا جس کی بابت ایک حدیثِ مرفوعہ میں بڑا بیتِ عوف بن مالک یوں وارد ہوا ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے چھ امور واقع ہونگے۔ ان چھ میں حضور علیہ السلام نے فتحِ بیت المقدس کا ذکر بھی فرمایا چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتح ہو کر مدتوں مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہا بعد ازاں کچھ عرصہ کے لئے نصاریٰ اس پر غالب آ گئے مگر پھر مشہور فاتح اسلام صلاح الدین الیوبی رحمہ اللہ نے نصاریٰ سے واپس لے لیا۔ مگر پھر نصاریٰ کچھ عرصہ تک غالب آئے مگر اس کے پوتے داؤد ملکِ ناصر نے پھر واپس لیا جو آج سے کچھ عرصہ پہلے تک دائرہ حکومت اسلام میں داخل تھا مگر بد قسمتی سے اب اس پر فرانسیسی حکومت کا تصرف ہو چکا ہے۔

(۱۸) فتحِ مدائن حضور علیہ السلام نے اس کی تصریح بھی دیدی تھی۔ چنانچہ بروایت عدی بن حاتم مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت نہیں ہوگی حتیٰ کہ قصرِ ابیض جو مدائن میں ہے مفتوح نہ ہو جائے۔ چنانچہ زمانہ خلافتِ عمرؓ جنگِ قادسیہ میں مدائن مفتوح ہو کر اسلامی حکومت کا ایک صوبہ قرار پایا۔

(۱۹) اہل عرب کی ہلاکت یعنی زوالِ سلطنت۔ محدثِ ترمذی بروایت طلحہ بن مالک راوی ہیں کہ قربِ قیامت کی علامات میں سے اہل عرب کا ہلاک ہونا ہے چنانچہ بنی عباس کے زوالِ حکومت پر اہل عرب کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور دوسری اہلِ عجم کی اسلامی حکومتیں

قرآنہ اہو گئیں *

(۲۰) کثرت مال۔ اس امر کی نسبت بھی صحیحین میں بروایت ابو ہریرہ مروی ہے کہ قیامت نہیں ہوگی حتیٰ کہ مال مقتدر نہ بڑھ جائے کہ صدقات سینے کا کوئی مستحق نہیں ملیگا۔ یہ امر بھی بزمانہ عثمان پورا ہو گیا۔ اور بعد ان عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں یہ حال تھا کہ اگر کسی کو کہا جاتا کہ صدقہ لے تو وہ کہتا کہ مجھے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں *

(۲۱) پہاڑوں کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا۔ اس کے متعلق طبرانی نے بروایت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ روایت کیا ہے کہ قیامت نہیں ہوگی حتیٰ کہ پہاڑ اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں گے۔ علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ متوکل عباسی کے زمانہ میں علاقہ یمن میں ایک پہاڑ جس پر کچھ زراعت بھی تھی اپنی جگہ سے متحرک ہو کر ایک بعید فاصلہ پر جا بیٹھا۔ اور یہ واقعہ شہر منہجری کا ہے۔ اسی کے قریب قریب ایک واقعہ مقتدر عباسی کے زمانہ میں بھی ہوا *

(۲۲) وقوع خسوف ثلاثہ۔ چنانچہ بروایت طبرانی ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے بعد تین خسوف واقع ہونگے۔ ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں اور تیسرا جزیرہ عرب میں عرض کیا گیا کہ آیا صالحین کے ہوتے ہوئے بھی خسف ہوگا۔ فرمایا کہ ہاں جب نبیؐ زیادہ ہو جائیگا اور ان خسوف ثلاثہ کا ذکر ایک دوسری حدیث میں بھی آیا ہے جو حذیفہ بن اسیدؓ سے مروی ہے۔ مؤرخین نے ان ہر تہ خسوف کے واقعہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ سلیمان بن عبد الملک اموی کے زمانہ میں ابن ہبیرہ نے خلیفہ کی طرف یوں واقعہ نکاسی کی کہ شہر بخارا میں پچھلی رات کے وقت ایک سخت ہیب کرمک سنی گئی جس سے حاملہ عورتوں کے حمل وضع ہو گئے اور آسمان میں ایک وسیع شگاف نظر آیا۔ ادنیٰ ہایت مہیت ناک اشکال کے آدمی نازل ہوتے دیکھے گئے جب صبح ہوئی تو زمین کا ایک وسیع حصہ ایسا اندر کو وھس گیا کہ اس کی تہ کا کچھ تہ نہیں لگتا

سقا اور وہاں سے ایک بڑا دھواں اُٹھتا نظر آتا تھا۔ قاضی بخارا نے چالیس متبرہ شخص کی شہادت ثبت کر کے اس واقعہ کو قلمبند کر لیا۔ اور ۲۳۰ھ میں سرزمین مغرب میں ایک خفت ہوا جس میں تیرہ بستیاں زمین میں غرق ہو گئیں اور ۲۳۱ھ ہجری میں غرناطہ (اندلس) میں ایک عظیم الشان زلزلہ آیا جس سے بہت سے بلاد و امصار کو نقصان پہنچا۔ اور ۲۳۲ھ ہجری میں ملک سے میں ایک ایسا زلزلہ آیا جس میں شہر طالقان کے سب لوگ ہلاک ہو گئے اور صرف تیس آدمی بچے اور ایک سو پچاس بلاد و امصار زمین میں دھس گئے اور اس زلزلہ کا اثر شہر حلوان تک چاہنچا مورخین لکھتے ہیں کہ قبور کے اندر سے ہڈیاں باہر نکل پڑیں اور ایک بہار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اُڑ گیا۔ اور ایک سی کا یہ حال ہوا کہ قریباً آدھے دن تک خلا میں محلق رہ کر سنگوں گرادی گئی اور دور دور تک زمین میں بڑے بڑے شگاف پیدا ہو گئے جس سے دھواں اُٹھتا نظر آتا تھا۔ ان واقعات کو سیوطی نے جزئی سے نقل کیا ہے۔ تاریخ میں اور بھی کئی ایک ہولناک خفت مذکور ہیں جن کو ہم بنظر اختصار نقل نہ کرنے پر مجبور ہیں *

(۲۳۱ھ) کثرت زلزل۔ اس کے متعلق صحیح بخاری میں ایک حدیث بروایت ابوہریرہ مروی ہے جس میں الفاظ "تکثر الزلازل" وارد ہیں۔ اور ابن عساکر بروایت عروہ بن زکیم راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میری امت میں ایک زلزلہ آئے گا جس میں دس ہزار بیت ہزار تیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس زلزلہ کو اللہ تعالیٰ متیقن کے لئے جنت اور مومنین کے لئے رحمت اور کفار کے لئے موجب عذاب بنایا گیا۔ چنانچہ یہ خوفناک زلزلہ متوکل عباسی کے زمانہ ۲۳۱ھ ہجری میں واقع ہوا جس سے شہر دمشق تباہ ہوا۔ مکانات گر گئے اور لوگ ہلاک ہو گئے۔ اس زلزلہ کا اثر شہر انطاکیہ اور موصل تک محسوس ہوا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ صرف اہل موصل میں سے پچاس ہزار جانیں تلف ہو گئیں ۲۳۲ھ میں یونٹس سے لیکر خراسان اور طبرستان واقعہ ایشیا تک ایک ہولناک زلزلہ آیا جس

سے بعض پہاڑ چٹ گئے اور زمین میں جا بجا ٹکڑے آگئے۔ شہر اب ہجری اس قدر زلزلے آئے کہ مختلف بلاد میں اس کا رثر محسوس ہوا جس سے بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ خلیفہ مصنف کے زمانہ میں شہر ہجری میں ایک ایسا زلزلہ آیا جس سے کئی ایک شہر پریند خاک ہو گئے۔ اور قریب لاکھ کے قریب مردہ آدمیوں کی لاشیں وہی ہوئی نکلی تھیں۔ اور شہر ہجری میں شہر رمل میں ایک بولناک زلزلہ آیا جس سے وہ شہر تباہ ہو گیا اور پانی زمین کے اندر سے جوش مار کر سطح زمین پر پھیل گیا اور پچیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے اور سمندر کا پانی اپنے ساحل سے ایک دن بھر کے فاصلہ پر دوڑ چلا گیا۔ لوگ سمندر کی تہ سے اشیاء چن رہے تھے کہ سمندر کا پانی اُمد کر واپس آ گیا اور ان لوگوں کو فضشہم من الیمہ ما غشیہم کا مصداق کر دیا۔ مرنے والے کئی ایک اور بڑے بڑے زلزلوں کا بھی ذکر کیا ہے مگر ہم نے بطور تمثیل صرف چند ایک کا ذکر کر دیا ہے جن سے قرآن نبوی کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔

(۶۴) مسخ و خسف و قذف۔ امام احمد بروایت ابن مسعود مرفوعاً مادی ہیں "لیکون فی امتی خسف و قذف" یعنی میری امت میں خسف و قذف ہو گا۔ اس حدیث کو مسلم اور حاکم بھی روایت کرتے ہیں اور ابن ماجہ بروایت ابن مسعود مادی ہیں۔ "بین یدعی الساعة مسخ و خسف و قذف" خسف کی مثالیں تو اوپر (۶۲) مذکور ہوئیں مسخ کے متعلق بروایت صحیح مروی ہے کہ خلفائے فاطمیہ مصر کے زمانہ میں لوگ عاشوراء کے دن سیدنا عباسؓ کے قبہ میں جمع ہو کر حضرات شیخین اور دیگر صحابہؓ کے حق میں سب قتل کیا کرتے تھے۔ ایک سائل نے حضرت صدیق اکبرؓ کی محبت کا اظہار کیا اور کچھ کھانے کو مانگا۔ ایک بوڑھا پھر آیا اور اس سائل کو اپنے ساتھ گھر پر لایا۔ اس نابالغ بوڑھے نے اس سائل کی زبان کاٹ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی اور کہا جاؤ تمہیں ابو بکرؓ کی محبت کا ثمر مل گیا۔ وہ پیارہ مصیبت زدہ ہو کر مسجد نبویؐ میں آیا اور وہناک حالت

میں روئے مغربہ جناب نبوی کے سامنے کھڑا ہو کر حضور علیہ السلام اور شیخین کی خدمت میں سلام عرض کیا اور بادل درمند و رازہ مسجد پر بیٹھا۔ اور اس پرانی کی حالت میں اسے نیندا گئی۔ خواب میں حضور علیہ السلام صبح صیدیں اکبر تشریف لائے حضور علیہ السلام نے صدیق اکبر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تھوڑی دیر میں اس شخص کی زبان کٹ گئی اس کی زبان واپس کر دو۔ صدیق اکبر نے اس شخص کے ہاتھ سے زبان ایکہ اس کے منہ میں رکھ دی جب وہ شیخین پیدا ہوئے تو وہ بالکل بیچ انسان تھا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ اپنے شہر کو چل آیا اور کہی اگر اس پر عقیدہ طبع نہ کیا۔ اس کے بعد آئندہ سال کو عاشورا کے دن جب وہ شخص پھر قہر عباس میں آکر ساکن ہوا تو ایک نوجوان باہر آیا اور اس شخص کو اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اور اس کے ساتھ نہایت عزت و احترام سے پیش آیا۔ سائل یہ دیکھ کر کہ یہ وہی گھر ہے جس میں اس کی زبان کٹا دی گئی تھی حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ اس سلوک کی کیا وجہ ہے۔ اس نوجوان نے سارا ماجرایا بیان کیا اور کہا کہ میرا باپ مسخ ہو کر بندگی شکل میں منقلب ہو گیا ہے۔ چنانچہ گھر کی ایک جانب اسے ایک بندر دکھایا جو بندھا ہوا تھا۔ اور کہا کہ میں نے تو اسی روز سے توبہ کر لی ہے۔ تم اس واقعہ کا کسی کے سامنے اظہار نہ کرنا۔ کیونکہ اس میں میری ہتک ہے۔ اس واقعہ کو سید پھو دی۔ ابن حجر قسطلانی جب معتبر علمائے نقل کیا ہے۔ نیز ابن حجر زواجر میں لکھتے ہیں کہ حلب میں ایک شخص حضرات شیخین کو سب و شتم کیا کرتا تھا جب اسے قبر میں رکھا گیا تو اس کا چہرہ خضر رہا ہو گیا۔ لوگوں نے اسے قبر سے نکال کر جلا دیا۔ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ شہزادہ میں بڑا نہ متوکل عباسی ایک شخص نے امام ناز کے ساتھ نماز کی حالت میں کوئی ناشائستہ حرکت کی۔ مگر امام نے نماز کو نہ توڑا۔ جب نماز ختم ہو چکی تو لوگوں نے دیکھا کہ شخص زندہ کو کا چہرہ خضر رہا ہو گیا۔ اس واقعہ کو حاضرین کے تحفظوں سے لکھ لیا گیا تاکہ پڑھنے والوں کے

لئے عبرت ہو +

قدف کے متعلق اہل تاریخ نے کئی ایک واقعات کا ذکر کیا ہے۔ سیوطی تاریخ الخلفائیں لکھتے ہیں کہ ۲۸۰ھ ہجری میں بصرہ میں سیاہ اور سفید پتھروں کی باریش ہوئی اور ۳۰۰ھ میں قرہ سیدرا پر پتھروں کی باریش ہوئی اور بستی تباہ ہو گئی۔ ہر ایک پتھر کا وزن قریباً پانچ سیر کے برابر تھا۔ ۳۰۰ھ کے قریب علاقہ کروستان میں پتھروں کی باریش ہوئی۔ آسمان بالکل صاف تھا اور کوئی آثار بر نمایاں نہ تھے +

(۲۵) یح حمزہ۔ (سرخ آندھی یا سخت تندہوا)۔ ترمذی بروایت علی بن ابی طالب والوہریرہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب علم دین کی خاطر حاصل نہیں کیا جائیگا اور مردانہ بیوی کی اطاعت کرنے لگے گا اور اولاد ماں باپ کی ناسپاسی کرے گی اور دوست کو اذیت پہنچائیگا اور باپ کو فوڑ کیا جائیگا اور سجدوں میں لوگ آواز سے پیٹنے لگیں اور فاسق و فاجر رئیس بن جائیں گے اور لوگ اُمر کی بُرائی سے بچنے کے خیال پر ان کی تعظیم کرنے لگ جائیں گے اور ناچ اور رنگ اور طبلہ اور سازنگی کی مجلسیں قائم ہوں گی اور شر بخوری جاری ہو جائیگی اور اُنے والی نسلیں گذشتہ بزرگان پر لعنت بھیجا کریں گے تو اس وقت ایک سخت آندھی اور زلزلہ اور خوف اور مسخ اور قدف واقع ہوئے اور ابو داؤد اور محدث حاکم بروایت عبداللہ بن حوالہ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تم بیت المقدس میں خلافت کو نازل ہوتے دیکھو گے تو زلزلے اور حوادث اور عظیمہ واقع ہوئے اور قیامت اس وقت اس قدر قریب ہوگی جس قدر میرا ہاتھ تمہارے سر سے قریب ہے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ خلافت متوکل کے زمانہ میں ایسی تیز زہریلی

۷ خلافت سے مراد اگر بنی اُمیہ کی خلافت ہے تو وہ گذر چکی اور اگر خلافت عباسی مراد ہے تو ابھی اسکا انتظار ہے اور صحیح یہ ہے کہ خلافت عباسی مراد ہے کیونکہ بنی اُمیہ کی خلافت نہ تھی بلکہ سلطنت + ۱۲۰ھ

ہوا چلی جس سے کوفہ و بصرہ۔ بغداد کی زراعتیں جل گئیں اور راہ چلتے مسافرین ہلاک ہو گئے یہ
ہوا پچاس دن تک برابر چلا کی اور اس کا ہمدن، موصل، سنجار تک اثر پہنچ گیا۔ اور لوگ کار و بار
سے رُک گئے اور ۲۸۵ھ کے ماہ شوال میں بزمانہ خلافت معتضد دنیا ایک سخت سیاہ
اندھیری سے تارک ہو گئی اور ویرانہ طواف عالم پر محیط رہی اور بعد میں ایک سخت زلزلہ آیا۔
اور ۲۸۵ھ میں ایک زرد آندھی آئی جو بعد میں سبز اور پھر سیاہ ہو گئی اور دُور دُور دشت
و بلاؤں تک پھیل گئی۔ اور خلافت مقتدر میں ایک ایسی آندھی آئی جس سے لوگوں کو قیامت
کا گمان ہو گیا۔ کتب تاریخ میں کئی ایک اور ریاہ شدیدہ کا ذکر ہے جن کو بہ نظر اختصار نظر انداز
کر دیا گیا ہے۔

(۲۶) رفع حجر اسود۔ النقطاء طریق حج۔ محدث حاکم بروایت ابوسعیدؓ راوی ہیں کہ
حضور علیہ السلام نے فرمایا لا تقوم الساعة حتی لا یحج البیت یعنی قیامت نہیں ہوگی
جب تک حج کے راستے لوگوں پر سدود نہ ہو جائیں۔ اور بروایت ابن عمرؓ مروی ہے۔
لا تقوم الساعة حتی یرفع الحجر یعنی قیامت سے پہلے حجر اسود اپنی جگہ سے اٹھایا
جائیگا۔ واضح ہو کہ یہ ہر دو واقعات وقوع میں آچکے ہیں چنانچہ ۳۲۰ھ ہجری سے ۳۲۶ھ
تک فتنہ قرمطی وجہ سے بغداد وغیرہ بلاد کے لوگ حج نہیں کر سکتے تھے اور ۳۲۵ھ
میں بنو سلیم نے اہل مصر وغیرہ پر حج کا راستہ روک دیا اور حجاج غارت ہو کر محلوں میں ہلاک
ہو گئے۔ ۳۲۶ھ میں بنو ہلال نے حجاج کا ایک قتل عام کیا۔ اور ہجر معدودے چند کے
کسی کو حج کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں سال بسال ایسے
واقعات کا شمار کیا ہے جس کو تفصیل منظور ہو تو کتاب مذکور کا مطالعہ کرے۔

رفع حجر کے متعلق جو چین نے لکھا ہے کہ مقتدر عباسی کے زمانہ میں ابو طاهر قرمطی نے
جو باطنیہ فرقہ کا مجدد و زندق تھا مسجد حرام میں حجاج کا قتل عام کیا اور مقتولین کو چاہ زفرم
میں پھینک دیا اور حجر اسود کو اپنی گرز کی ضرب سے توڑا اور اس کو اس کی جگہ سے اکھاڑ لیا اور

گیا رہ جن تک کشت و خون اور فتنہ و فارت کے بعد وہ متحد چلتے وقت بیت اللہ سے
 حجر اسود کو اٹھا کر لے گیا اور بیس سال تک ان ملاحہ کے قبضہ میں رہا۔ مسلمانوں نے
 پچاس ہزار دنیا کے عوض ان سے واپس لگا لگا کر اس نے نکال کر دیا۔ بالآخر مطیع عباسی کی خلافت
 میں بیت اللہ میں واپس لایا گیا۔ محمد بن زبج بن عثمان کہتے ہیں کہ میں فتنہ قرامطہ کے دنوں
 میں مکہ معظمہ میں تھا۔ ملاحہ میں سے ایک شخص میزاب کعبہ اکھڑنے کی خاطر اوپر چڑھا
 نے دل میں کہا کہ خدایا! تیرے علم کا کیا ٹھکانا ہے! میں یہی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں
 اس نا بجا رکاوٹوں پھسلا اور گر کر واصل جہنم ہو گیا۔ ابوطاہر زبید نے خود چڑھا اور منہ سے
 یہ کہتا تھا۔

اَنَا بِاللّٰهِ وَ بِاللّٰهِ اَنَا يَخْلُقُ الْخَلْقُ وَ يَنْفِيْهِمْ اَنَا
 مؤرخین لکھتے ہیں کہ ابوطاہر کا جسم ایک قسم کے زخموں سے ایسا پارہ پارہ ہوا کہ بالآخر
 مر رہا ہو گیا *

(۲۷) کوکب سماویہ سے لوگوں کا ہلاک ہونا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "لا
 تقوم الساعة حتى ترفع رؤس اقوام بكوكب من السموات باستحلالهم على
 قوم لوط" (رواہ الدیلمی) یعنی قیامت نہیں ہوگی حتیٰ کہ اقوام کے سر آسمانی ستاروں
 سے کھل دیئے جائیں جبکہ وہ قوم لوط کے عمل کو حلال خیال کرنے لگیں گی۔ چنانچہ ۵۹۳ھ
 اور ۶۲۳ھ اور ۶۲۳ھ میں ایسے کوکب سماویہ کا گرنا از روئے تاریخ ثابت ہے جن
 سے لوگ ہلاک ہو گئے *

(۲۸) قدارتیارہ کا ظہور۔ ابن مردویہ بروایت ابن عباس راوی ہیں کہ حضور
 علیہ السلام نے فرمایا کہ جب سلاطین و ملوک بطور تفریح و سیاحت اور اغنیاء بخرن تجارت
 اور مسکن بخرن گدا اور قاریان بطور بیا و نمود فریضہ حج بجا لائیں گے تو اس وقت و مدار
 ستیارہ طلوع کر لگا۔ از روئے تاریخ ثابت ہے کہ قدارتیارہ کئی بار طلوع کر چکا ہے *

(۲۹) کثرت موت۔ صحیح بخاری میں بروایت عوف بن مالک مروی ہے کہ
 مَوْتَانَا كَمَقَاعِ الْعَتَمَةِ یعنی ایک عام مرگامرگی ہوگی جیسے بکریوں کو قعاص (ایک
 بیماری ہے) ہلاک کر ڈالتی ہے۔ طاعون عمواس میں ایک عام مرگامرگی نہرمانہ خلافت
 حضرت عمرؓ واقع ہو چکی ہے۔ مدائنی لکھتے ہیں کہ اسلام میں پانچ مشہور طاعونیں واقع
 ہوئی ہیں۔ طاعون شیرازیہ۔ طاعون عمواس۔ طاعون جارف۔ طاعون الفیات۔
 طاعون الاشراف۔ طاعون جارف کی نسبت مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ بصرہ میں
 پہلے دن ستر ہزار اور دوسرے دن اکتھرتیرا اور تیسرے دن تہتر ہزار لوگ مے
 اور چوتھے دن شہر میں بجز معدودے چند آدمیوں کے کوئی زندہ نہ رہا۔ والی بصرہ
 کی والدہ مر گئی اور کسی نے اس کا جنازہ تک نہیں اٹھایا۔ ان پانچوں طاعون کا
 ذکر حافظ ابن کثیر کی کتاب تاریخ میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا گیا ہے
 اعادنا اللہ منها *

امارات متوسطہ واضح ہو کہ امارات متوسطہ روز بروز رُوبہ ترقی میں اور امارات
 کُمرانی سے قریب ہو گئی ہیں۔ ذیل میں ہم ان احادیث
 کا ذکر کرتے ہیں جن میں ان کا ذکر آچکا ہے *

(۱) احمد و ترمذی بروایت حذیفہ عن علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ تقوم
 الساعة حتی یکون اسعد الناس لکح بن کح یعنی قیامت سے پہلے فرومایہ اور یتیم
 لوگ رؤسا ہونگے *

(۲) ترمذی بروایت النسائی راوی ہیں۔ یاتی علی الناس زمان الصابر علی
 دینہ کا لقب علی الجہت۔ یعنی ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ دین پر جارہے والا اس شخص

لہ لفظ جارف اصل میں سیلاب کی تصریح میں آتا ہے۔ ۱۲ منہ *

کی طرح ہوگا جو آگ کا چنگاڑا ہاتھ میں دبائے ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ دین کا کوئی شخص حامی و مددگار نہیں ہوگا اور دین پر قائم رہنا سخت دشوار ہو جائیگا۔

(۳) ابو نعیم اور حاکم بروایت انسؓ راوی ہیں "یکون فی اخر الزمان عباد جہال و فساد فسقة" یعنی قرب قیامت میں ایسے لوگ عبادت کیا کریں گے جو جاہل مطلق ہوں گے اور قاری لوگ فاسق ہوں گے۔

(۴) احمد اور ابو داؤد اور ابن ماجہ اور ابن حبان بروایت انسؓ راوی ہیں "لا تقصرو الساعة حتی یتباہی الناس فی الساجد" یعنی قیامت سے پہلے لوگ مسجدوں میں فخر و مباہات کیا کریں گے۔

(۵) طبرانی بروایت انسؓ راوی ہیں "من اشتراط الساعة الغش والغش و قطیعة الرحم و تحوین الامین و استئمان الخائن" یعنی قرب قیامت میں غش اور قطع رحم اور امانت سپا کرنا اور خائن کو امانت سپارنا عام ہو جائیگا۔

(۶) طبرانی ابن مسعودؓ اور انسؓ سے راوی ہیں "من اقترب الساعة انتفاخ الاهل" یعنی قرب قیامت میں ہلال (پہلی رات کا چاند) ایسے نظر آیا کریں گے جیسے دوسری یا تیسری رات کا ہوتا ہے۔

(۷) "من اقترب الساعة كثرة قلة النبات وكثرة القراء وقلة الفقهاء وكثرة الامراء وقلة الامناء" یعنی قرب قیامت میں بارش بہت ہونگی اور سبزی کم اور جاہل عابد بڑھ جائیں گے اور اہل فقہ کم ہو جائیں گے اور اکثر لوگ مال و دولت والے ہوں گے مگر امانت سپار بہت کم ہوں گے۔

(۸) احمد و بخاری بروایت مرداس سلمیٰ راوی ہیں "یذهب الصالحون الاول فالاول و تبقى خثالة كخثالة الشجر و التما" یعنی یکے بعد دیگرے صالحین ختم ہو جائیں گے اور مٹا پھوس رہی یعنی جاہلان فرومایہ باقی رہ جائیں گے۔

(۹) ابو نعیم حلیہ میں بروایت ابو ہریرہؓ راوی ہیں "لا تقوم الساعة حتى يكون الزهد رواية والوسع تصنعاً" یعنی قرب قیامت میں زہد صرف زبانی روایات تک محدود ہوگا اور پرہیزگاری محض بناوٹ پر مبنی ہوگی۔

(۱۰) طبرانی بروایت ابن مسعودؓ راوی ہیں "ان من اعلام الساعة واشراطها ان يكون الولد غيظاً وان يكون المطر قيظاً وان تفيض الاشرار فيظاً" یعنی علامت قرب میں سے یہ بھی ہے کہ اولاد اپنے والدین کے حق میں موجب غضب یعنی نا اہل و ناپسند ہوگی اور موسم گرما میں بارشیں ہوا کر نیگی (مگر سبزی بہت کم ہو کر نیگی) اور بد ذات لوگ بڑھ جائیں گے۔

(۱۱) طبرانی بروایت ابن مسعودؓ راوی ہیں "ان من اعلام الساعة واشراطها ان يصدق الكاذب وان يكذب الصادق" یعنی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا بنایا جائیگا۔

(۱۲) طبرانی بروایت ابن مسعودؓ راوی ہیں "من اعلام الساعة واشراطها ان يكون المؤمن في القبيلة اذل من النكد" یعنی منجملہ علامات قیامت کے یہ ہے کہ مومن قبیلہ میں بکری سے زیادہ ذلیل سمجھا جائیگا۔

(۱۳) طبرانی راوی ہیں "ان من اعلام الساعة واشراط الساعة ان تزخر الحماير وان تخرب القلوب" یعنی منجملہ علامات قیامت کے یہ ہے کہ محرابیں مزمین و منقش کی جائیں گی اور قلوب فاسد ہونگے۔

(۱۴) طبرانی راوی ہیں "ان من اعلام الساعة واشراطها ان يلتقي الرجال بالرجال والنساء بالنساء" یعنی منجملہ علامات قیامت کے یہ بھی ہے کہ مردوں میں لواطت پھیل جائیگی اور عورتیں مساحت کیا کر نیگی۔

مساحت۔ عورتوں میں ایک کا مصنوعی طور پر مرد بن کر دوسری سے جماعت کرنا۔ ۱۲ منہ۔

(۱۵) طبرانی اور ابن عساکر راوی ہیں "ان من اعلام الساعة واشترطها ان یحمر حناب
الدنیا ویخرب عمرها بقا" یعنی منجملہ علامات قیامت کے یہ بھی ہے کہ اُجڑی جگہ آباد اور
آباد جگہ اُجڑا دیار بنادی جائیگی *

(۱۶) طبرانی راوی ہیں "ان من اعلام الساعة واشترطها ان تظهر المعانن وتشراب
الخنزور" یعنی منجملہ علامات قیامت کے یہ بھی ہے کہ دف (آلات موسیقی) عام ہو جائیگی
اور شرابخوری بڑھ جائیگی *

(۱۷) طبرانی بروایت ابن مسعود راوی ہیں "ان من اعلام الساعة واشترطها ان
تكثر النشط والهمازون والتماذون وان تكثر الاولاد والبنات" یعنی منجملہ علامات قیامت
کے یہ بھی ہے کہ والیان ظالم کے معاونین اور عیب چیٹیوں اور چلی کھانے والوں اور
حرامزادہ اولاد کی تعداد بڑھ جائیگی *

(۱۸) احمد و بخاری و مسلم بروایت ابن مسعود راوی ہیں "ان من ایلای الساعة فتش
التجارة حتى تعین المرأة زوجها علی التجارة وقطع الارحام وفتشوا القلم وظهر السها
بالسرو وکتمان شهادة الحق" یعنی منجملہ علامات قیامت کے یہ بھی ہے کہ تجارت عام
طور پر پھیل جائیگی حتیٰ کہ بیوی اپنے خاوند کی تجارت میں اعانت کر لگی اور رشتہ داری کے
تعلقات قطع ہو جائیگی اور فن کتابت عام ہو جائیگا اور جھوٹی شہادت کا اظہار اور سچی شہادت
کا انکار کیا جائیگا *

شراحین نے لکھا ہے کہ فن کتابت کے عام ہو جانے پر علماء حق کا شمار بھی کم ہو
جائیگا۔ چنانچہ ہم سے زمانہ میں یہ سب باتیں مشاہدہ میں آچکی ہیں *

(۱۹) اور بسلسلہ مذکورہ بالا وارو ہوا ہے کہ مسلمان نبیؐ کا نام لے کر شراب کو

جائز بنا لینے اور بیع و تجارت کی صورت میں سود و خوارمی کے جواز کے لئے حیلے تراشنے
لگینگے۔ اور رشوت کو ہدیہ کے نام پر قبول کیا جائیگا اور زکوٰۃ میں کوئی منفعت نہ نظر نہ ہوگی *

(۲۰) طبرانی اور حاکم بروایت ابو ذرؓ طویل الفاظ میں راوی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ لوگ کئے پائینگے۔ بڑوں کا ادب اٹھ جائیگا۔ چھوٹوں پر شفقت نہیں ہوگی۔ اور حراز اور اولادیں بڑھ جائیں گی۔ اور حکم کھلا راستوں پر نہا ہوگا۔ لوگ بظاہر متواضع اور اندر سے ظالم ہونگے۔

(۲۱) احمد اور ابن ماجہ بروایت انسؓ راوی ہیں کہ بڑوں میں زنا پھیل جائیگا اور چھوٹے حکومت کے مالک ہو جائیں گے اور فرومایہ لوگ اہل علم ہونگے اور خوشامد پرستی عام ہو جائیگی جو شعبہ نفاق ہے

(۲۲) بخاری و مسلم بروایت عمرؓ راوی ہیں کہ قرب قیامت میں لوگ دیکھا دیکھی عمارت عالیہ تعمیر کرنے لگیں گے۔ اس کی شرح میں لکھا ہے کہ مال و دولت کے بڑھ جانے سے لوگوں کی توجہ علم و عبادت و جہاد کی طرف سے ہٹ کر فضول مشغلوں میں لگ جائیگی۔

(۲۳) احمد و ابو داؤد بروایت سلامہ بنت حرانؓ راوی ہیں کہ قرب قیامت میں اہل مسجد کو پیش امام نہیں ملیگا۔

(۲۴) طبرانی ابی ایتہ سے راوی ہیں کہ قرب قیامت میں چھوٹے درجہ کے اہل علم ہو کر نیچے مطلب یہ کہ بڑے لوگ دنیا طلبی کے پیچھے لگ جائیں گے اور اراذل لوگ اہل علم ہونگے اور وہی فتویٰ دیا کریں گے۔

(۲۵) حاکم بروایت ابو موسیٰؓ راوی ہیں کہ قرب قیامت میں ایک بھائی اپنے بھائی کو بلا وجہ قتل کرے گا۔

(۲۶) دیلمی بروایت علی بن ابی طالبؓ راوی ہیں کہ قرب قیامت میں منبروں پر خطیب (لکچرار) بہت ہو جائیں گے اور علماء و الیاء حکومت کی طرف جھٹک پڑیں گے۔ اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینگے یعنی امر کی خویش کو ملحوظ رکھ کر فتویٰ دیا کریں گے۔

(۲۷) بروایت مذکورہ بالا وار ہے کہ قرب قیامت میں علماء و دہم و ونیاء کی خاطر

علم سکھا کرئیے اور قرآن مجید سے تجارت کی جائیگی یعنی قرآن مجید پر تجارت لی جائیگی ۛ
 (۲۸) نیز سلسلہ مذکورہ بالا میں وارث کے کہ قرب قیامت میں لوگ فرومایہ اور مالدار
 عورتوں سے نکاح کیا کرئیے اور اپنی چچا زاد لڑکی سے بوجہ اس کی مغربی کے باز رہیئے نیز
 اہل قرابت سے مروت نہیں کرئیے اور سائین کو محروم رکھا جائیگا ۛ

(۲۹) ابن ابی الدنیا اور بطرانی اور ابونصر بخاری اور ابن عساکر بروایت ابو موسیٰ سند
 صحیح کے ساتھ راوی ہیں کہ قرب قیامت میں کتاب اللہ سے عابہوگی اسلام کس میں پرس
 ہو جائیگا۔ دلوں میں نفخ و عداوت قائم ہوگا۔ علم اٹھ جائیگا۔ عمریں کم ہو جائیگی۔ سال بہت
 جلد گزر جائیئے۔ پیداوار کم ہو جائیگی۔ امین خائن امین بنائے جائیئے اور کاذب کو
 صادق اور صادق کو کاذب قرار دیا جائیگا۔ اور کشت و خون زیادہ ہوگا۔ عمارات عالیہ تعمیر
 ہونگی اولادیں کثیر ہونگی اور بغاوت و حسد و کتل بڑھ جائیگا۔ جھوٹ پھیل جائیگا۔ سچ
 بولنا نا پدید ہوگا۔ خود کشی نفس کی پیروی ہوگی۔ ظن باطل پر فیصلہ دیا جائیگا۔ بارش بہت
 اور پھل کم ہونگے۔ خطیب (لکچرار) جھوٹ سنائیے ۛ

(۳۰) احمد و تراطی بروایت سمید بن ابی وقاص راوی ہیں کہ قرب قیامت میں
 ایسے لوگ پیدا ہونگے جو زبانوں کے ساتھ کھایا کرئیے جیسے گائے زبان سے کھاتی ہے
 اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ تعلق و خوشامد اور جھوٹ سے روزی پیدا کیا کرئیے ۛ
 (۳۱) حاکم بروایت ابو ہریرہ راوی ہیں کہ کھلم کھلا راستوں پر عورتوں سے مجامعت
 کی جائیگی اور بڑے سے بڑا صاحب حیاء ہوگا جو یہ کہے گا کہ ذرا ایک طرف ہو کہ شغل کرو
 اور اولادیں اپنے والدین کے دین کو چھوڑ دیں گی ۛ

(۳۲) دیلمی بروایت حذیفہ راوی ہیں کہ تین چیزیں نایاب ہو جائیگی۔ درہم حلال
 علم دین۔ الحب للہ ۛ

(۳۳) بزار بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ راوی ہیں کہ دالیان حکومت ظالم ہونگے

اور نجوم کی تصدیق اور تقدیر کی تکذیب کی جائیگی اور جب کبھی کسی مجمع میں بیٹے یا بیٹی سے زیادہ لوگ جمع ہونگے تو ان میں ایک کے دل میں بھی خدا کا خوف نہیں ہوگا اور مسجد سے ہو کر گزر جائینگے مگر تحیتہ المسجد اور انہیں کریں گے۔

(۳۴) قرب قیامت میں لوگ بیوی سے دُور میں مجاہدت کیا کریں گے حالانکہ اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا ہے اور وہ موجب غضب الہی ہے اور صرف جان پہچان والوں سے لوگ سلام کہا کریں گے اور لوگوں پر ایک ایسا وقت بھی آئیگا کہ کوئی شخص مجلس سے بدیں خوف اٹھ کر جانا پسند نہیں کریگا کہ اس کے چلے جانے پر اہل مجلس اس کی غیبت اور عیب جوئی کریں گے۔

اور یہی مسئلہ راوی ہیں کہ لوگ مساجد میں معاملات دنیا کے متعلق گفتگو کیا کریں گے اور مومن اس طرح مخفی رہیں گے جیسے تم (صحابہ) میں منافق۔

(۳۵) سلمیٰ بروایت علیؑ راوی ہیں کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ بھی آئیگا کہ وہ شکم پڑی اور مال و متاع کی فکر میں متفرق رہا کریں گے اور عورتوں کی اطاعت کرنے لگیں گے۔ اور وہ ہم دو دنیا داران کا دین ہوگا یہی وہ لوگ ہونگے جو بدترین خلائق ہونگے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے کچھ حصہ نہیں ہوگا۔

(۳۶) دیلمی اور ابن عساکر بروایت علیؑ راوی ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی ہوگا کہ علماء کتوں کی طرح ذبح کئے جائیں گے۔ اے کاش! کہ علماء ایسے وقت میں دیدہ و دانستہ جاہل بن جائیں۔

(۳۷) پھر فرمایا کہ بید نہیں کہ لوگوں کے دلوں میں قرآن مجید پوشیدہ ہو جائیگا جس طرح کپڑا پڑنا ہو جاتا ہے۔ اور دنیوی اشیاء پر دلدادہ ہونگے۔ طمع غالب آجائیگی۔ اور حقوق اللہ میں تقصیر کرنے پر دلوں میں خوف نہیں آئیگا بلکہ ممنوعات پر بے باکانہ جرأت کیا کریں گے۔

(۳۸) اور ابن عباسؓ کی ایک حدیث میں وارد ہے کہ اسلام صرف نام کو رہ جائیگا۔ قرآن مجید کو مٹا دیا جائیگا اور لوٹے منبروں پر خطیب (لکچرار) ہونگے۔ مسجدیں منقش کی جائیں گی۔ ایک ہی صفت میں نماز پڑھیں گے مگر ان کے قلوب میں نفاق ہو گا۔ اور اپنی عورتوں سے خطاب کیا جائیگا اور موٹے موٹے جسموں کے لوگ ہونگے اور بہت سی صفوف نماز قائم ہو کر رہیں گی (حکم ہے کہ پہلی صف کو پورا کر کے پھر دوسری قائم کی جائے مگر آج کل عام طور پر حتمال پہلی صف کو نامکمل چھوڑ کر دوسری صف قائم کر لیتے ہیں اور اسی طرح دوسری کو نامکمل چھوڑ کر تیسری قائم کر لیتے ہیں۔ اور یہی مراد ہے کثرتِ صفوف سے) اور طلاق زوجہ ایک معمولی یا تہمت بھی جائیگی اور طلاق کی لوگ قسم کھا یا کرینگے۔ حدود شرعیہ معطل چھوڑ دی جائیں گی یعنی زانیہ سابقہ وغیرہ پر حد نہیں لگائی جائیگی خطبہ خوانی (لکچرارسی) کی ہوس عام ہو جائیگی اور اس کے ذریعہ سے شہرت و ناموسی حاصل کی جائیگی۔ نمازی ضائع کی جائیں گی اور آلات موسیقی عام طور پر مروج ہو جائیں گے علوم شرعیہ سے کنارہ کشی جائیگی (اسکی شرح میں لکھا ہے کہ علوم فلسفہ اور فنونِ حکمیر پر لوگ زیادہ جھک پڑیں گے اور کتابِ سنت سے جاہل ہو جائیں گے)۔

(۳۹) مسند امام احمد میں لکھا ہے کہ غیر قوموں کے وہاں سے نہاری ہیبت و شمت اٹھ جائیگی۔ تم کمزور ہو جاؤ گے۔ اور غیر تم پر اس طرح جھک پڑیں گے جیسے ایک دسترخوان پر کئی ہاتھ۔ صحابہ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم تعداد میں کم ہو جائیں گے؟ فرمایا نہیں قیام میں آج سے زیادہ ہو گے مگر دین تمہارے اندر نہیں رہیگا۔

مذکورہ بالا آثار میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں فرمانِ نبویؐ کے تمام وہ امور نمودار ہو چکے ہیں جن کا ذکر بطور پیشگوئی کے ان آثار میں آچکا ہے جن سے اہل ایمان قربِ قیامت کا صحیح استدلال اور مخالفین اسلام حضور صلعم کی صداقت کا صحیح موازنہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کسی مذہب میں کسی پیشوا نے ایسے صاف اور صریح الفاظ میں آئندہ کے واقعات کو گاہ و بیگاہ بیان نہیں کیا۔ خود کہ وہ کس جاہلیت سے اور وضاحت کے ساتھ کہنے

والے واقعات کو حضور علیہ السلام ارشاد فرمایا گئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے واقعات کا نقشہ حضور علیہ السلام کی نظر میں جلوہ گر تھا۔ اللہ صلی علی محمد وعلیٰ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم اب امارت کبریٰ (بڑے بڑے علامات) کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا وقت آپ ہی ہے اور اب کوئی بعید حالت منتظرہ باقی نہیں رہ گئی۔ والعلوم عند اللہ •

امارات کبریٰ | قرب قیامت کے بڑے بڑے علامات بعض تو قرآن مجید میں اور بعض دیگر احادیث صحیحہ میں وارد ہو چکے ہیں ہم ذیل میں بطور اختصار ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ قلمبند کرتے ہیں :-

(۱) ظہور مہدی علیہ السلام۔ مہدی علیہ السلام کا ظہور سب سے مشہور نشان ہے جو قرب قیامت میں ہوگا۔ اہل اسلام کے ہر دو فریق سنی اور شیعہ ظہور مہدی کے منتظر ہیں گو ان میں بوجہ چند اختلاف ہے شیعہ لوگ کہتے ہیں کہ مہدی پیدا ہو کر غائب ہو چکے ہیں اور ستر من رائے (علاقہ شام) کی غار میں مستور ہیں اہل سنت والجماعہ اس امر کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کے نزدیک وہ ابھی پیدا ہونگے اور چالیس سال کی عمر میں ملک عرب یا سرزمین مغرب سے ظاہر ہونگے۔ ہمیں یہاں ہر دو فریق کے دلائل سے کوئی غرض نہیں کیونکہ ان کے ظہور میں ہر دو فریق متفق ہیں اور ہمیں صرف اسی قدر یہاں بحث کرنا مقصود ہے۔ ظہور مہدی کے احادیث اس قدر وسیع اور مختلف وارد ہوئے ہیں کہ ان میں تطبیق بہت مشکل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی ہاشم اور بنی امیہ کی مخالفت کے زمانہ میں اہل غرض لوگوں نے اصلی واقعہ پر بہت کچھ حواشی اچڑھائے اور رفتہ رفتہ ان روایات میں ایسا خلط ہوا کہ بحر علمائے محدثین کے دوسروں کیلئے ان کی تنقید محال ہے۔ اسی کثرت اختلاف کی وجہ سے مؤرخ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں ظہور مہدی کے احادیث کو مجروح قرار دے کر ان کے ظہور سے انکار کر دیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ انکار صحیح نہیں کیونکہ معتبر علمائے حدیث نے مرفوعاً بعض

احادیث کو نقل کیا ہے جو ظہور مہدیؑ پر حجت قاطعہ ہیں ۔

ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ اس اختلاف عظیم سے ہر ایک زمانہ میں بعض ہونساں لوگوں کو یہ موقع ملتا رہا ہے کہ وہ مہدی موعودؑ بن کر جاہلوں کو اپنے پیچھے لگاتے رہے ہیں مگر تا حال جس قدر لوگ اس منصب کے مدعی اٹھے ہیں وہ سب کے سب کاذب تھے کیونکہ وہ ان علامات کے ساتھ ہرگز ظاہر نہیں ہوئے جو اخبار و آثار میں وارد ہیں۔ چنانچہ آئندہ سطور سے واضح ہو گا۔ علامہ ابن خلدون نے ظہور مہدی فاطمی کے متعلق اکثر احادیث و اخبار کو نقل کر کے ان پر جرح کی ہے مگر محمد بن حسن اسنوی اپنی کتاب مناقب شافعی میں لکھتے ہیں: "قد تواترت الاخبار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بذکر المہدی و انہ من اہل بیتہ صلعم انتہی" یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بذریعہ تواتر ثابت ہو چکا ہے کہ مہدیؑ ظاہر ہونگے اور وہ خاندان نبوت میں سے ہونگے ۔

مہدی موعود کا نسب و ولادت وغیرہ	اکثر روایات میں وارد ہوا ہے کہ آپ کا اصلی نام محمدؑ ہو گا اور بعض روایات میں احمدؑ بھی آیا ہے اور صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آپ کے باپ کا نام عبد اللہؑ ہو گا
---------------------------------	--

اور آپ حضرت سیدۃ النساء فاطمہ الزہراءؑ کی اولاد میں ہونگے۔ اور یہ اقطع اونیق ہے اس کا خلاف کسی صورت میں جائز نہیں۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضور علیہ السلام نے امیر المؤمنین علیؑ کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا "کہ اس کی پشت سے" یعنی مہدیؑ حضرت علیؑ کی اولاد سے ہونگے۔ اس سے تمام جھوٹے مدعیان مہدیت کے دعویٰ باطل ہو جاتے ہیں اس میں علمائے اختلاف کیا ہے کہ مہدیؑ امام حسینؑ کی اولاد میں ہونگے یا امام حسنؑ کی ؟ مگر صحیح یہی ہے کہ آپ امام حسینؑ کی اولاد میں ہونگے۔ تذکرہ قرطبی میں لکھا ہے کہ آپ سرزمین مغرب سے آکر عرب میں ظاہر ہونگے

اور مکہ معظمہ میں آپ لوگوں سے بیعت لینے اور بیت المقدس کی طرف ہجرت کرینگے
 آپ کے حلیہ میں لکھا ہے کہ گندم گون۔ بدن کے چمپرے۔ میاں قد کشادہ پیشانی
 بلند بینی کشیدہ ابرو۔ سر پہ گین چٹم۔ درختاں دندان۔ خال بر عارض راست۔ روٹیں چہرہ
 گنجان ریش۔ فرخ گام۔ ثقیل اللسان۔ متواضع اور متکسر المزاج ہونگے۔ اور آپ کی
 عمر چالیس سال سے کم ہوگی یا پوری چالیس۔ دوسفید چادریں آپ پہنے ہونگے
 اور اخلاق نبوت سے متصف ہونگے۔

امام ہمدی کیا کچھ کرینگے؟ | آپ کے ظہورِ ظلم و ظم موقوف ہو جائیگا اور خیرِ نبوی

مسدود ہو جائیگی۔ نزکِ سنت پر آپ جنگ
 کرینگے۔ چنانچہ ہر ایک قسم کی بدعت کا قلع و قمع کرینگے۔ اور دین کو آخر زمانہ میں خوب
 رونق دینگے۔ اور بعینہ وہی نقشہ دین کا ہو جائیگا جو حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک
 میں تھا۔ دنیا کے اطراف ممالک پر آپ قابض ہونگے اور مسیح علیہ السلام کی طرح صلیب
 کو توڑینگے اور خنزیروں کو ہلاک کرینگے۔ اہل ایمان میں محبت و الفت پیدا کرینگے اور
 نورِ عدل سے دنیا معمور ہو جائیگی اور مال و دولت بڑھ جائینگے اور تمام لوگ آپ سے
 خوش ہونگے حتیٰ کہ جنگل کے وحشی اور دریا کی مچھلیاں اور اڑنے والے جانور بھی آپ
 کے ظہور کے خیرات و برکات کو محسوس کرینگے۔ اور ہر ایک قسم کی خیرات و برکات اس
 قدر کثیر ہو جائیگی کہ اس کی نظیر دنیا میں ناپید ہوگی یعنی زمین و آسمان ہر دو سے
 رحمت کے آثار نمایاں ہونگے۔ تمام لوگ آپ کی طرف آکر پناہ لینگے جیسے شہر
 کی مکھیاں شاہ گس کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر اترینگے

لے ان الفاظ کے یہی ظاہری معنی مراد ہیں اور خنزیروں کا ہلاک کرنا بعینہ ایسا ہے جیسا حضور کا سیاہ کتوں کی
 مرواؤ لے کا حکم دینا بعض محدثین نے ان الفاظ سے یہ مراد لی ہے کہ وہ کفر کے آثار کو بدیعہ دلائل مطیع کرینگے۔

اور سانپ اور بچھو بچوں سے بازی کریں گے اور وہ انہیں کچھ ضرر نہیں دینگے۔ سو وہ خواہی۔
 شترخوڑی۔ زنا کاری اور باویہاری آپ کے زمانہ میں مرتفع ہو جائیگی۔ امانت
 سپاری اور دیانت داری کی گرم بازاری ہو جائیگی اور شریہ ہلاک ہو جائیگی۔ اور
 کتب انبیاء علیہم السلام میں لکھا ہے کہ آپ کے حکم میں ظلم اور عیب نہیں ہوگا *

علامات و امارات ظہور مہدیؑ

تو آپ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا
 قمیض پہنے ہونگے اور آپ کے پاس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلوار اور علم بھی ہوگا
 اور اس علم پر لکھا ہوگا "البیعة للہ" آپ کے سر پر عمامہ ہوگا اور ایک عام آدمی کی
 جاسیگی کہ یہ مہدی خلیفۃ اللہ ہیں ان کا اتباع کرو۔ اگر آپ سے معجزہ یا کوئی نشان طلب
 کیا جائیگا تو آپ نشان دکھائیں گے چنانچہ اڑتے جانور کو اشارہ کریں گے تو وہ آپ کے
 ہاتھ پر بیٹھیں گے۔ مخالفین کا ایک لشکر مکہ اور مدینہ کے درمیان آپ کی دعا سے زمین
 میں دھس جائیگا بیت اللہ کا مدفون خزانہ نکالا جائیگا اور آپ اسے فی سبیل اللہ
 تقسیم کریں گے۔ تابوت سکینہ جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے غار اٹاکیہ یا بحیرہ طبریہ
 سے برآمد ہوگا اور بیت المقدس میں آپ کے سامنے رکھا جائیگا۔ تب یہود آپ پر ایمان
 لائیں گے اور آپ کے لئے انفلاق بحر ہوگا جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہوا تھا۔
 آپ مسیح علیہ السلام سے ملاقات کریں گے۔ اویس علیہ السلام آپ کے پیچھے نماز ادا کریں گے *
 آپ کے زمانہ ظہور کے قرب میں دریائے فرات سے سونے کا ایک پہاڑ
 نمودار ہوگا اور ماہ رمضان کی پہلی تاریخ کو ہلال میں خسوف ظاہر ہوگا اور وسط ماہ رمضان

لے بعض جاہلان نے اس اثر کو حدیث نبوی قرار دیا ہے جو مزید غلط ہے کیونکہ کسی حدیث کی کتاب میں
 اس قول کو حدیث نبوی نہیں کہا گیا۔ بلکہ یہ امام محمد بن علی باقر کا قول ہے *

میں آفتاب کو کسوف لگے گا اور یہ ہر دو مجموعی نشان شروع عالم سے کبھی وقوع میں نہیں آئے۔
بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ ماہ رمضان میں قمر و دھندہ مختف ہوگا۔ ایک قسم کی آگ کا
ظہور شرق میں ہوگا اور علاقہ شام میں ایک بستی زمین میں دھس جائیگی اور آپ کے ظہور سے پہلے
بہت جنگ و جدل شروع ہو جائیگی *

ایک حدیث میں وارد ہے "اذا سمعتمہ برایات سورۃ اقبلت من خراسان قالوا ہا
ولو جئتوا علی الثلج" یعنی جب تم سنو کہ خراسان سے سیاہ جھنڈے آئے ہیں تو تم ان سے
مل جاؤ اگرچہ بہت پر گھصنوں کے بل نہیں چلنا ہو *

اور ایک روایت میں وارد ہوا ہے "فان فیہا خلیفۃ اللہ المہدی" یعنی ان
جھنڈوں میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ مہدی ہوگا یعنی وہ آپ کی جماعت ہوگی ورنہ وہ خود تو اس
وقت مکہ معظمہ میں ہونگے۔ امام حسینؑ سے مروی ہے کہ صاحب الامر یعنی مہدیؑ آخر الزمان
ظاہر ہو کر پھر کچھ عرصہ تک بے نام و نشان ہو جائیگی حتیٰ کہ لوگ یہ خیال کرنے لگیں گے
کہ آپ رحلت کر گئے *

آپ کے سال خروج میں لوگ بلا امیر حاج حج کریں گے اور مقام منیٰ میں لڑائی ہوگی
اور حمزہؑ الحقیہ پر کشت و خون ہوگا اور اطراف ممالک کے سات علماء مکہ معظمہ میں جمع ہو کر
یہ کہیں گے کہ ہم ایسے شخص کی تلاش میں آئے ہیں جن کے ہاتھ پر تمام قتلہ و فساد دور ہو جائیگی
اور جو قسطنطنیہ کو فتح کریں گے۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کو تلاش کریں گے اور آپ کو پہچانیں گے مگر
آپ مدینہ منورہ کو چلے جائیں گے اور پھر مکہ مطہرہ کو واپس ہوں گے۔ اور لوگ آپ کو رکن کے
پاس پائیں گے اور آپ سے التجا کریں گے کہ آج دین اور مال کا بوجھ آپ کے ذمہ ہے چنانچہ
لوگ آپ سے بیعت کریں گے اور نماز عشاء کے وقت آپ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی قمیض و
سیف کے ساتھ ظاہر ہوں گے اور مقام ابراہیمؑ میں دو گناہ ادا کر کے منبر پر کھڑے ہوں گے
اور ایک طویل خطبہ کہیں گے جس میں احیائے سنت اور امانت بدعت پر لوگوں کو متوجہ کریں گے۔

پھر آپ علاقہ شام کے ابدال اور اکابر عیون مصر کی ایک جماعت کے ساتھ جن کی تعداد تین سو تیرہ ہوگی مدینہ کی طرف خروج کریں گے اور مخالفین سے جنگ کر کے مدینہ کو ان کے ہاتھ سے چھڑا لیں گے۔ اس کے بعد بیت سے جنگ و جدل ہونگے جن میں سلمان بالآخر فتح پائیں گے اور مہدی تمام ممالک دنیا پر قابض ہو جائیں گے۔ پھر خروج و قبال ہوگا اور پھر مسیح آسمان پر سے نزول فرمائیں گے۔

اس حدیث کو طویل الفاظ میں سیوطی نے جامع کبیر میں نقل فرمایا ہے۔ جب مہدی نصاریٰ کی طویل جنگ سے فارغ ہو کر بیت المقدس میں تشریف لائیں گے تو وہاں پہنچ کر دجال کے اصفہان میں خروج کرنے کی خبر سنیں گے۔ اور اسی اثنا میں صحابہ کہتے ہیں آپ کی ادب و پرہیزگاری سے لیں گے۔ بعض علمائے مکہ نے لکھا ہے کہ ان لوگوں کے اب تک بحالت خواب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بالآخر وہ مہدی کے ساتھ ہو کر امت محمدی میں داخل ہونے کا شرف حاصل کریں۔ ترک ظہور مہدی سے پہلے رومۃ الکبریٰ (اطالیہ) والوں سے صلح کیجئے ہونگے اور مہدی سب سے پہلے ترکوں کو پیغام کریں گے اور وہ آپ سے لیں گے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ مکرہ عظیم اور فتح قسطنطنیہ اور خروج و قبال بیسٹ ماہ یا سات سال کا عرصہ ہوگا۔ آپ کی مدت سلطنت میں بہت اختلاف ہے مگر اقویٰ یہ ہے کہ آپ چالیس سال تک حکومت کریں گے۔ اور اس عرصہ میں آپ مختلف حصص دنیا میں مساجد تعمیر کریں گے اور بیت المقدس کو رونق دیں گے۔ فتح ممالک میں بلاد شرفیہ کا عموماً ذکر آیا ہے۔ بعض روایات میں مدت سلطنت سات یا نو سال بھی آئی ہے اس کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ یہ عرصہ آپ کی فتوحات کا ہوگا۔

شیخ اکبر محمد بن ابی عربی اپنی کتاب فتوحات مکیہ کے باب ۳۶۶ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنا ایک خلیفہ مبعوث فرمائے گا جبکہ دنیا جو رستم اور شرک و محیبت

شیخ اکبر صاحب فتوحات کی تحقیق دربارہ خروج مہدی

سے پُر ہو چکی ہوگی اور اس کے ہاتھ پر دین و عدل سے دنیا کو بھر دیگا۔ وہ یا کل جناب مقبول صلح کے قدم بقدم چلیگا۔ یعنی ضیافت کی حمایت اور مالوں کی ضیافت اور دین کی اشاعت میں کامل الاتباع ہوگا اور وہ اسلام میں از سر نو روح ڈال دیگا۔ جہاں اس کے برکات علم سے علماء ہو جائیں گے۔ وہ کفار پر جزیہ لگائیگا اور اپنی قوت و شوکت سے انہیں لگائیگا جو شخص اس کے مقابلہ پر آئیگا ذلیل ہوگا۔ تمام اختلافات دُور ہو جائیں گے اور فقط دین خالص باقی رہ جائیگا بعض علماء حب اپنے طریق کو اس کے طریق سے مخالفت پائیں گے تو اختلاف کریں گے مگر اس کی خدا و سطوت کے خوف سے بالآخر اطاعت قبول کر لیں گے اور اگر وہ سلطنت کا مالک ہو تو علماء اس کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیتے اہل کوفہ سب سے زیادہ اس کے ہم خیال ہونگے اور بڑے بڑے اویہائے کرام اس کی بیعت میں داخل ہونگے اور اس کے ناصر و وزیر بن جائیں گے اور ان کی تعداد نو ہوگی اور وہ صحابہ کبار کی روش پر چلیں گے اور وہ سب بھی ہونگے عربی ایک بھی نہ ہوگا مگر ان کی زبان عربی ہوگی اور ایک شخص جو باطل محصوم ہوگا اور جو پاکبازی اور امانت سپاہی میں بے نظیر ہوگا اور مذکورہ بالا نو سے الگ ہوگا ان سب کا سردار ہوگا (یعنی حبیب السلام سے مراد ہے) اور وہ اخضر الوزر سمجھا جائیگا۔ اس موقع پر شیخ رحمہ اللہ نے مندرجہ ذیل اشعار لکھے ہیں۔

الا ان ختم الاولیاء شہید	وعین امام العالمین فقید
هو السید المہدی من آل احمد	هو السارم الہندی حین یبید
هو الشمس محیلو کل غیب ظلمة	هو الوابل الوسی حین یجود

یعنی جدی آخر الزمان جو ختم الاولیاء ہیں شہید اور جناب امام العالمین (رسول مقبول صلح) کے قدم بقدم چلنے والے بے مثل امام ہونگے۔ اور وہ سردار ہیں جو خاندان نبوت میں سے ہونگے اور ہندی تلوار کی طرح اعدائے دین کو ہلاک کریں گے۔ وہ آفتاب کی طرح ظلمت کو اٹھا دیں گے اور باران بہار کی طرح فیاض ہوں گے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ امام برحق جانوروں کی زبانوں کو جانتا ہوگا اور ان کے انوارِ علم حجت و انش تک پہنچ جائینگے۔ اور اس کے وزراء آیۃ رجال صدقوا ما عاهدوا اللہ علیہ "سکا مصداق ہونگے۔ اور سیفِ سطوت کے ساتھ اپنے مخالفین کو اس بیت کی تصدیق کرا دیں گے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مہدی مفضلہ ذیل نو امور میں امتیاز رکھی رہیں گے۔

نفوذ البصر یعنی دعوة اللہ علی وجہ البصیرۃ کریں گے۔ قال اللہ تعالیٰ "علی البصیرۃ انام من اتبعنی" چونکہ حضور علیہ السلام دعوت الی الحق میں صاحب بصیرت کاملہ ہیں اس لئے آپ کا متبع بھی ایسا ہی ہوگا *

معرفتِ خطاب الہی یعنی الفار ربانی کی شناخت۔ قال اللہ تعالیٰ "ما کان لیشیر ان یکلمہ اللہ الا وحیا ومن وراء حجاب اور یہ سب سرسولا *۔

علم التمرینۃ عن اللہ تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کے خطاب کو بصورت الفاظ بصیر کرنا *۔
رحمت فی الغضب یعنی حدود و تغزیراتِ شریعہ میں نہ کسی دوسرے امر میں *۔
علم الرزاق یعنی تربیتِ اجسام و ذرعیہ *۔

علم تداخل امور یعنی علوم میں محارف و حقائق کا تعلق اور محسوسات میں الباطن اشیا کا جاننا *۔
تیین المراتب یعنی ہر ایک والی امر کو اس کے استحقاق کے مطابق مصالح اہل اسلام کے لئے مقرر کرنا *۔

قضاء الحاجج یعنی مصالحِ عباد اور ان کی حاجت روائی میں پوری کوشش کرنا *۔
اطلاع بمعنیات یعنی قبل از وقتِ حوادث پر مطلع ہونا۔ اس صورت میں امام برحق بصورتِ اطلاع تیر شاگرد بنے اور بصورتِ اطلاع نزولِ شریعت و انتہال کیا کریں گے اور ان کی دعواتِ عذاب اٹا کریں گے *۔

اس کے بعد صاحبِ فتوحات لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا نو صفات مجموعی طور پر رسول اللہ علیہ السلام کے بعد اب تک بجز مہدیؑ کے کسی حقیقتہ اللہ کے لئے ثابت نہیں ہوئے پھر

لکھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام مسجد دمشق کے مشرقی منارہ بیضا پر نازل ہو گئے اور لوگ مہدی
 کے ساتھ نماز میں ہو گئے۔ مہدی علیہ السلام مسیح موعود کے نزول کی خبر سن کر صاف
 مقتدیان میں آنا چاہیں گے تاکہ مسیح علیہ السلام امام ہو کر غزاؤ کریں۔ مگر مسیح اشارہ سے
 انہیں پیچھے آتے سے روک دیئے اور خود مقتدی ہو کر آپ کے پیچھے نماز ادا کر گئے۔
 علمائے اہل سنت والجماعہ اس امر پر متفق ہیں کہ خروج مہدی آخر الزمان کا جو
 حضرت سیدہ فاطمہؑ کی اولاد میں ہو گئے حد تو اتر منویٰ تک پہنچ چکا ہے یعنی الفاظ روایات
 کے مختلف ہیں مگر معنی سب کے ایک ہی ہیں۔ اس لئے کسی صورت میں انکار جائز نہیں
 ابوبکر اسکا فوائد الاخبار میں ایک روایت یوں لائے ہیں۔ ”من کذب بالرجال
 فقد کفر ومن کذب بالہمدی فقد کفر“ یعنی منکر و جال و منکر خروج مہدیؑ کا فر ہے۔
 بعض آثار میں یوں وارد ہوا ہے۔ ”انہ لا مہدی الا عیسیٰ بن
 مریمؑ۔ یعنی مہدیؑ بجز عیسیٰ ابن مریم کے کوئی شخص علیہ السلام نہیں
 ہو گئے۔ اس اثر پر بعض ناواقفوں نے بعض مدعیان کے دعویٰ مہدویت و مسیحیت کو ثابت
 کرنا چاہا ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ یہ استدلال تو بجائے خود را
 دیگر بینتوں علامات و امارات ایسے موجود ہیں جو ایسے مدعی کے دعویٰ کو بے بنیاد
 ثابت کر رہے ہیں کیونکہ اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ استدلال صحیح ہے تو ایسے شخص کے لئے
 ضروری ہے کہ ان نشانات و علامات کے ساتھ ظاہر ہو جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور
 اس میں وہ سب اوصاف موجود ہوں جو اس منصب جلیل القدر کے لئے ضروری ہیں اور
 جن کی تصریح آثار مضمومہ میں وارد ہو چکی ہے مگر ثابت ہے کہ کسی مدعی کو کوئی
 ایک ہی ایسی بات حاصل نہ تھی جس سے انکا منصب مہدویت و مسیحیت پر مبعوث ہونا
 تسلیم کیا جاسکے۔ سب سے اول اور اہم امر یہ ہے کہ اسلام میں جو فرقہ بندیوں ہو رہی
 ہیں ظہور مہدیؑ پر دور ہو جائیگی مگر یہاں زلاد فی الطنبور کا معاملہ ہے اور اختلافات کی

کوئی حد نہیں ہے۔ دوم ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ صاحب سلطنت ہو اور
اپنی سطوتِ قوت سے کفار کو مغلوب کرے جس پر وہ یا تو اسلام لے آئیں یا جزیرہ قبول
کریں کیونکہ حضور علیہ السلام کا یہی شیوہ تھا مگر ظاہر ہے کہ مدعیان کو اس پہلو میں بھی ہم
عاری دیکھتے ہیں۔ صاحب سلطنت ہو کر استیلا علی الکفار تو درکنار کسی غیر مذہب
کا ایک شخص بھی ان مدعیان کی تعلیم سے مشرف بہ اسلام نہ ہوا۔ اگر قلعی قوت پر کفار
کو مغلوب کرنا مراد ہو تو یہ لوگ ہمیں بتلائیں کہ کس قدر غیر مذاہب کے لوگوں نے اسلامی
صدافت کے دلائل کو اس طرح قبول کر لیا؟ مدعیان کے متبعین اس الزام کے جواب
میں یوں کہتے رہے ہیں کہ خونی ہمدی اور ڈاکو ہمدی نہیں آئیگا۔ اس کے جواب میں ہم
یہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی پیمانی اور بے شرمی کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ جس سے
یورپین مصنفین کے خیال کے مطابق جناب پیغمبر علیہ السلام کا بھی (معاذ اللہ) خونی
اور ڈاکو ہونا لازم آتا ہے جبکہ صریح طور پر آثارِ صحیحہ سے آئو اے ہمدی کا صاحب سلطنت
ہونا ضروری ہے تو ہم کیونکر اس قسم کی لغو گوئی پر توجہ کر سکتے ہیں۔ سو ہم ہمدی کیلئے
ضروری ہے کہ وہ حضرت سیدہ کی اولاد سے ہو اور یہ امر حد تو اترا محتوی تک پہنچ چکا
ہے۔ حتیٰ کہ سنی اور شیعہ ہر دو اس مرکب بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں مگر یہ مدعیان اس وصف
سے بھی بے بہرہ ہیں۔ ایک دفعہ کسی مدعی نے اپنی ایک تحریر میں اس اعتراض کا جواب
یہ دیا تھا کہ اس کے بزرگوں میں سے بعض نے سید زاولوں سے نکاح کر لیا تھا اس لحاظ
سے میں بھی سید ہوں۔ مگر اقل تو اس امر کی تصدیق کہ ایسا ہوا تھا کون کر سکتا ہے؟ ثانیاً
نسب تو سلسلہ پدری کے رد سے معتبر ہوتا ہے نہ کہ سلسلہ ماوری کے رو سے؟ سلسلہ
ماوری کے رو سے آج تک کسی قوم نے نسب کو معتبر نہیں رکھا۔ بوجہ حکم "الا سماء
من قریش" بھی ضروری ہے کہ ہمدی عربی الاصل ہو۔ چہاں۔ ہمدی کا بیت اللہ میں
ظاہر ہونا اور عامۃ اہل اسلام کا ان کی معیت کرنا۔ اس وصف سے بھی سب مدعیان ما شاء اللہ

بے بہرہ رہے انہیں تو زیارت بیت اللہ بھی نصیب نہیں ہوئی۔ پتھم۔ اطلاع بر مغیبات۔
 اس پہلو میں بعض مدعیان نے بہت کچھ لپٹا کر بیان دکھائیں مگر شان ایزدی کہ کبھی ایک بات بھی
 پوری نہ ہوئی بلکہ جو کچھ بھی کبھی کہا اللہ تعالیٰ نے اس کا الٹ ظاہر کیا اور انہیں انواع
 و اقسام کی یہود و تاویلات سے کام لینا پڑا۔ ششم مہدی کے زمانہ میں دنیا عدل و
 دین سے چر ہو جائیگی اور مال و دولت کی اتنی کثرت ہو جائیگی کہ کوئی شخص محتاج نہیں سکا
 مگر آج تک معاملہ برعکس رہا ہے کیونکہ مغربی تعلیم نے ممالک دنیا پر ایسا تسلط کیا کہ علم و عمل کی
 بنیاد کھو چکی ہو گئی اور فسق و فجور کو وہ ترقی ہوئی اور ہو رہی ہے جس کی نظیر پہلے کبھی نہیں
 دیکھی گئی اور مال و دولت کی یہ حالت ہوئی کہ چاروں طرف سے مسلمانوں کے اویار و
 افلاس کی ناخوش آوازیں کانوں میں آ رہی ہیں۔ مہدی کے لئے تو ضروری ہے کہ وہ ہر ایک
 حاجتمند کو مستغنی کر دے کیونکہ مدعیان تمام عمر خود ہی انواع و اقسام کی حیلہ جویوں سے
 دنیا فراہم کرنے کی فکر میں لگے رہے۔ انہیں حالات کے رُو سے کوئی شخص اگر ذرا بھی
 دینی کتب سے واقف ہو گا ایسے مدعیان ایک آن کے لئے مہدی تو کجا ایک صابن اور
 مومن بھی تسلیم نہیں کریگا اور اگر ان لوگوں کو بوجہ کور باطنی اور شقاوت انہی کے ہماری مذکورہ
 بالا وجوہ سے اتفاق نہ ہو تو ہم انہیں کہیں گے ”موتوا بغیظکم“
 مدعی اگر مکند فہم سخن گو سر و خشت آج تک جس قدر بھی ایسے لوگ ہم نے دیکھے ان
 میں کوئی بھی کتاب و سنت کا واقف نظر نہ آیا یہی وجہ ہے کہ وہ اہل حق کے دلائل کو
 دیدہ و دانستہ نظر انداز کر جایا کرتے رہے *

لامہدی الاعلیٰ بن مریم | حدیث کا مہدی الاعلیٰ بن مریم کہ حفاظ
 حدیث نے قابل استدلال نہیں سمجھا۔ بلکہ مختلف وجوہ

سے اس کو ضعیف قرار دیا ہے مگر مدعی کو اپنے مطلب کے لئے قوی و ضعیف سے
 کوئی تعلق نہیں اس حدیث سے استدلال کرنا خواہ وہ کیسی ہی ضعیف ہے ان

لوگوں کے لئے ابر رحمت سے کم نہیں بالخصوص جبکہ علامہ تفتازانی نے بھی شرح مقاصد کے آخر میں اس سے استدلال کر کے خروج مہدی کو مطمئن قرار دیا ہے مگر یہ لوگ گوش ہوش سے سن لیں کہ ماہرانِ حدیث نے اس حدیث کو کیا پایہ تجتہا ہے :-

”قال الحافظ ابن القيم في المناہج الحديث لا مہدی الا عیسیٰ بن مرید زواہ ابن ماحمة من طریق محمد بن خالد الجنادی عن ابان بن صالح عن الحسن بن انس بن مالک عن النبی صلعم وهو ما تنہد بہ عن محمد بن خالد هذا غیر معروف عند اهل الصناعة من اهل العام والنقل وقد تواترت الاخبار عن رسول الله صلعم بذكر المہدی واقراء من اهل بیتہ وقال البيهقی تنہد بہ محمد بن خالد هذا وقد قال الحاكم ابو عبد الله هو مجهول وقد اختلف عليه في استاده فروى عنه عن ابان بن ابی عیاش عن الحسن بن النبی صلعم قال فرجع الحديث الى رواية محمد بن خالد وهو مجهول عن ابان بن ابی عیاش وهو مشرک عن الحسن وهو منقطع والا حادوث الدالة على خروج المہدی اصح اسناداً كحديث ابن مسعود لولم یبق من الدنيا الا يوم یطول الله ذلك اليوم حتی یبعث رجل منی او من اهل بیتی الحديث رواه ابو داود والترمذی - وقال حسن صحیح وفي الباب عن علی وابی سعید وام سلمة وابی ہريرة ثم روى حديث ابی ہريرة وقال صحیح انتہی - وقال ابن القيم وفي الباب عن حذيفة بن یمان وابی امامة الباهلی وعبد الرحمن بن عوف وعبد الله بن عمر وابن العاص وثوبان والسن بن مالک وجابر وابن عباس وغيرهم انتہی - والله اعلم :-

ہم ان باطل پرستوں کی طرح ہرگز جائز نہیں رکھتے کہ بلا اسناد اور بلا تنقید حدیث کو نقل کر کے لوگوں کو دھوکا دیں کیونکہ عوام الناس حدیث کی جبرج و تعدیل سے بے خبر

ہوتے ہیں۔ جہاں حدیث کا نام سنا جھٹ مان لیا کہ ہاں یوں ہی ہوگا۔ مذکورہ بالا طویل عبارت کا حاصل یہ ہے کہ اس حدیث کا مدار محمد بن خالد پر ہے جو ثقہ ابن حدیث کے نزدیک مجہول ہے اور چونکہ اسناد حدیث میں اختلاف ہے اور ابن عباس دوسرے اسناد میں داخل ہے اور وہ محدثین کے نزدیک مترک الحدیث قرار دیا گیا ہے اسلئے یہ حدیث نہ صرف ضعیف بلکہ اصحف ہے اور دوسرے اسناد میں حسن تابعی تک پہنچ کر حدیث منقطع ہو جاتی ہے اس لیے اس کا درجہ اصحف سے بھی کہیں زیادہ نیچا ہے۔ غور کرو کہ ایک نثر ادبی مجہول ہے دوسرے مترک الحدیث اور تیسرے منقطع۔ پھر یہ لوگ کس بہتے پر اس حدیث سے استدلال کر سکتے ہیں؟ اور تعجب یہ ہے کہ صحیح سے صحیح اور قوی سے قوی حدیث کو تو مخالف مدعا ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں جانتے مگر سہارا لینے کے لیے کسی ضعیف سے ضعیف قول کو بھی آیت قرآنی سے کم نہیں جانتے۔ چنانچہ کسوف و خسوف والے قول کو جو درحقیقت ان کی تلمذ کا نشان ہے یہ لوگ نہایت روز سے پیش کیا کرتے ہیں۔

اور مفضلہ ذیل روایت میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہے یوں وارد ہوا ہے کہ جب پکارنے والا آسمان سے یوں پکارا "ان الحق فی آل محمد" تو اس وقت ظہور مہدی ہوگا۔ اور وہ ان لوگوں کے دلوں میں محبوب سمجھے جائینگے اور بجز ان کے کسی کا ذکر نہیں کرینگے (رواہ البیہقی) اور پھر انہیں ان کی روایت سے مروی ہے کہ جب ماہ رمضان کی شب جمعہ کو آواز سنائی دے گی تو اس آواز کی اطاعت کرو۔ اور اسی طرح ایک دوسری روایت میں وارد ہوا ہے کہ جب ایسا فتنہ برپا ہوگا کہ لوگ اس میں ہلاک ہونگے تو آسمان سے ایک آواز آئیگی "علیکم بفلان" (رواہ البیہقی)۔ ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں کہ خروج مہدی علیہ السلام کا مسئلہ غلطی نہیں بلکہ نقل

صحیح پر مبنی ہے۔ لہٰذا ہمیں نقل صحیح سے سُرّو تفاوت نہیں کرنا چاہئے۔ اور ملائکہ اہل بدعت وہو ان کے بکواس کی طرف مطلقاً توجہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان لوگوں کو یقین چکا ہے کہ جب ہمارے دعاوی سراسر باطل اور منافی اسلام ہیں تو نقل صحیح کے رُوس سے ہم کبھی بھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے عقلی دُھوکو سلیں اور دھوکا بازئیں سے کام لینا ان کا معمولی شیوہ ہے۔

تَحْمَدُ لِلّٰہِ اللّٰہِ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ وَقَطَعَ اللّٰہُ دَیْرَہِمَہٗ وَادْفَعَہٗ عَذَابَ الْیَمِیْنِ
اللّٰہُ تَعَالٰی انہیں دنیا اور آخرت میں نازل کرے اور ان کی جڑ کاٹ دے اور انہیں دُشکاب چھپائے
”و یرحمہ اللّٰہُ عِیداً قَالِ اٰمِیْنَا“

اور جو شخص ہماری اس دعا پر آمین کہے۔ خدائے تعالیٰ اس پر رحم کرے۔ آمین۔

فتنۃ و جال | مجملہ آیات قیامت کے خروج و جال کا فتنہ ہے جس کے متعلق

بکثرت احادیث وارد ہو چکی ہیں۔ اور سب اس واقعہ کے اُنیکے مثبت ہیں۔ بعض علمائے اس موضوع پر نقل کتابیں لکھی ہیں۔ صحیح مسلم میں بروایت عمران بن حصین وارد ہے لیس ما بین خلق ادم الی قیام الساعة امرا اکبر من الدجال یعنی آدم علیہ السلام سے بیکر قیامت تک کے زمانہ پر کوئی واقعہ فتنۃ و جال سے زیادہ اہم نہیں۔

اور ترمذی بروایت ابو ہریرہؓ راوی ہیں۔ ”ثَلَاثٌ اِذَا حُجِبَ لِمَنْ یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا

لَمْ تَكُنْ اَمْنًا مِنْ قَبْلِ الدَّجَالِ وَالْاَدَابَةِ وَطُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِہَا“ یعنی ان تین چیزوں کا جب ظہور ہوگا تو کسی شخص کو جو پہلے ایمان نہ لایا ہوگا ایمان مفید نہ ہوگا۔ دَجَالِ دَابَّةٌ۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع کرنا۔ اور حضور علیہ السلام کی دعائے ماثورہ میں وارد ہوا ہے۔ اللّٰہُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَالِ“ اور ترمذی اور ابو داؤد

میں بروایت ابو عبیدہ وارد ہے۔ ”لَمْ یَكُنْ نَبِیٌّ بَعْدَ نُوْحٍ اِلَّا وَقَدْ اَنْذَرْتَهُ قَوْمَهُ الدَّجَالِ“ یعنی نوح علیہ السلام کے بعد تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قوم کو دَجَالِ

سے مڑاتے چلے آتے ہیں *

دجال کون ہے؟ [دجال شقی ہے دجل سے جس کے معنی غلط، گھس، خدع، دفریب اور دھوکا کے ہیں۔ چونکہ وہ شخص دین میں

فتنہ عظیم کا باعث ہوگا اس لیے اس کو دجال کہا گیا اور اس کا لقب مسیح ہوگا اور اس کے اس لقب کی وجہ یہ تھی کہ اس کے چہرہ کی ایک جانب مس آٹھ کے مستوی یعنی یہ نشان ہوگی اور یہ کہ وہ حدود زمین کو فتح کرے گا۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب بھی مسیح ہے اس لیے غرض تفریق حضور علیہ السلام سے فرمایا الدجال مسیح الضلالة یعنی لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام مسیح المہدایۃ "مہدیوں کے اور آپ کے اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ آپ جس ہمارے کو مس فرمائے وہ تندرست ہو جاتا۔ بعض نے اور وجہ بھی تلمیذ کئے ہیں *

بعض لوگوں نے ابن حنیڈ کو جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں تھا دجال قرار دیا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ غلط ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں اس موضوع پر خوب بحث کی ہے اور مذکورہ بالا اسے کو غلط قرار دیا ہے چنانچہ یہ لکھتے ہیں کہ ابن حنیڈ کے دجال ہونے پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو بروایت جابر بن عبد اللہ صحیح بخاری میں آچکی ہے چنانچہ وہ حلف کے ساتھ فرمایا کرتے کہ ابن حنیڈ ہی دجال ہے اور اس کی وجہ یہ بتلایا کرتے کہ میں نے عمرؓ کو حضور علیہ السلام کے سامنے حلفاً فرماتے سنا کہ ابن حنیڈ دجال ہے اور حضور علیہ السلام نے عمرؓ کے قول پر انکار نہیں فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے حدیث ابن عمرؓ کا ذکر کیا ہے جس میں ابن حنیڈ سے ان کی ملاقات کرنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر اس حدیث مسلم کا ذکر کیا ہے جس میں ابن حنیڈ اور ابوسید خدریؓ کا قصہ مذکور ہے اور ان احادیث کے بعد لکھتے ہیں کہ ان احادیث میں کوئی نقص نہیں کہ ابن حنیڈ دجال تھا کیونکہ حضور علیہ السلام نے بطور و کے فرمایا "ان یکن صر".....

(اگر بن صیاد ہی وصال ہے تو.....) اور یہ رو بھی اذائلِ حیرت میں تھا۔ بعد میں تمیم داری نے
 اپنے واقعہ کی خبر دی کہ انہوں نے اسے قلالِ جزیرہ میں مجوس دیکھا ہے تو آپ نے
 ان کی خبر کی تصدیق فرمائی۔ رہا حضرت عمر کا حلفاً بیان کرنا سو یہ شخص ان کا اپنا اجتہاد تھا
 کیونکہ حضور علیہ السلام کے سکوت سے انہیں یہ خیال ہو گیا کہ واقعی ابن صیاد وصال ہے اور
 جابر کا حلفاً بیان کرنا حضرت عمر کی حلف پر مبنی تھا۔ رہا ابو سعید خدریؓ کی حدیث کا
 واقعہ سو اس کا جواب یہ ہے کہ ابن صیاد بھی منجملہ ایسے لوگوں کے تھا جو وصال کی سی
 روش رکھتے ہیں (چنانچہ ہمارے زمانہ میں بھی بعض لوگ ایسے ہوئے ہیں جو وصال سے
 کسی صورت میں کم نہیں)۔ اور ابو داؤد کی حدیث جو بروایت ابو بکر مروی ہے جس میں
 لکھا ہے کہ وصال کے والدین تیس سال تک بے اولاد رہینگے۔ پھر ان کے ہاں ایک
 بچہ پیدا ہوگا جو یک سو چھ سو چار سال تک زندہ رہے گا۔ یہ حدیث صحیح ہے کیونکہ
 اور تصدیق کی۔ سو اس کی نسبت یہی کہتے ہیں کہ صرف علی بن زید کی روایت سے مروی
 ہے اور قوی نہیں۔ اور یہی حدیث جابر کی نسبت لکھتے ہیں کہ اس میں بجز سکوت جناب
 پیغمبر صلعم کے کوئی حجت نہیں مگر آپ کا سکوت اوایل میں تھا۔ بعد میں تمیم داری کے واقعہ
 کو سن کر آپ کا تردد جاتا رہا۔ اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ حدیث تمیم داری کی تقدیریت
 مختلف طریق سے کرتے ہیں۔ صحیح مسلم میں یہ حدیث اس طرح پر مذکور ہوئی ہے کہ حضور صلعم
 کے مناد ہی نے نماز کے لئے ندا کی جب نماز ہو چکی تو حضور علیہ السلام بر سر منبر تشریف
 لائے اور فرمایا کہ کیا تم لوگ جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں جمع کیا ہے؟ صحابہ نے عرض
 کیا اللہ اور اللہ کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں کسی ترغیب
 ترہیب کے لئے جمع نہیں کیا بلکہ اس امر پر آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ تمیم داری ایک عیسائی
 شخص تھا جس نے اسلام قبول کیا۔ اس نے مجھے ایک ایسا واقعہ سنایا ہے جس کی
 بابت میں تمہیں خبر دینا ضرور مسیح وصال کا واقعہ (چنانچہ اس نے ذکر کیا کہ میں بنی النعم اور

بنی جذام کے تین آدمیوں کے ساتھ جہاز پر سوار ہوا۔ سمندر کی موجیں ایک جہینہ بھرتک جہاز کو اُدھر اُدھر لیجاتی تھیں۔ آخر یہ لوگ ایک جزیرہ کی طرف غروب آفتاب کے قریب پہنچ گئے اور چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر اس جزیرہ میں داخل ہوئے۔ وہاں انہیں ایک داتہ (حیوان) نظر آیا جس کے بال بڑے موٹے اور گھسنے سے انہوں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں جُتاسہ ہوں (عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں واقعہ ہوا ہے کہ یہی داتہ الارض ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور قرب قیامت میں خرد و رخ کر لگیا اور لوگوں سے ہمکلام ہوگا) تب اس نے کہا کہ اُداس شخص کی طرف جو دیر میں بیٹھا ہے چلیں کیونکہ وہ تمہارے حالات دریافت کرنا چاہتا ہے۔ جب اس نے اس آدمی کا ذکر کیا تو یہ لوگ ڈر گئے کہ مبادا (داتہ) کوئی شیطان ہو۔ آخر یہ لوگ بہت جلد اس کے ساتھ دیر کی طرف گئے۔ وہاں انہوں نے ایک بڑا مضبوط آدمی دیکھا جس کے ہاتھ گردن کی طرف زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے یہم نے اُسے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں تم مجھے خبر دو کہ تم کون لوگ ہو؟ ہم نے کہا کہ ہم اہل عرب ہیں جہاز میں سوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ پھر اس نے پوچھا کہ تخیل بینان (شام میں ایک بستی ہے) کا کیا حال ہے؟ کیا وہ پھل دیتا ہے؟ ہم نے کہا ہاں۔ اس نے کہا کہ عنقریب وہ پھل نہیں دیگا۔ پھر اُس نے پوچھا کہ بحیرہ طبریہ کا کیا حال ہے؟ آیا اس میں پانی موجود ہے؟ پھر خود ہی کہا کہ عنقریب اس میں پانی نہیں ملیگا۔ پھر اس نے زُعرلیستی کا نام ہے اکی بابت پوچھا کہ وہاں زراعت ہوتی ہے؟ ہم نے کہا کہ ہاں نہایت اچھی طرح سے۔ پھر اس نے پوچھا کہ نبی اُمتی کی بابت خبر دو اس کا ظہور ہو گیا ہے یا نہیں؟ ہم نے کہا ہاں مکہ میں ظاہر ہو گیا اور اب وہ یثرب (مدینہ) میں ہے۔ پھر اُس نے پوچھا کہ آیا اہل عرب اس سے لڑتے ہیں؟ ہم نے کہا کہ ہاں وہ گرد و نواح کے قبائل پر غالب آیا ہے۔ تب اس نے کہا کہ ان لوگوں کے حق میں بہتر ہے کہ اس کی اطاعت کر لیں۔

میں تئیں خبر دیتا ہوں کہ میں مسیح (دجال) ہوں اور مغرب مجھے خروج کا حکم ہوگا اور میں بحر
مکہ و مدینہ کے تمام بلاد میں پھر جاؤں گا کیونکہ ان میں داخل ہونے سے خدا تعالیٰ کا ملک
مجھے مانع ہوگا۔ جب حضور علیہ السلام یہ فرما چکے تو آپ نے چھڑی سے اشارہ فرمایا
کہ یہ ہے طیبہ (مدینہ) اور میں تئیں پہلے ہی خبر سنا چکا ہوں حاضرین نے عرض کیا کہ
ہم آپ سے یہ خبر پہلے ہی سُن چکے ہیں۔

محدث سیمنی فرماتے ہیں کہ دجال اکبر جو آخر زمانہ میں خروج کرے گا وہ ابن صیاد نہیں بلکہ
ابن صیاد و نجلہ دجالین کے ایک دجال تھا حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے ابن صیاد
کو دجال گمان کیا ہے انہیں متم داری کی حدیث جو پیشتر مذکور ہو چکی نہیں پہنچی ورنہ ابن
صیاد والی اور متم داری والی حدیث میں تطبیق دشوار ہے۔ ایک حدیث میں بروایت
انس و وارد ہے کہ دجال بصفہاں کے قریہ یہودیہ سے خروج کرے گا۔ حافظ ابن حجر
کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال مہود ابن صیاد کے علاوہ ہے اور ابن صیاد کے
دجال ہونے کے احادیث نص صریح نہیں بلکہ متم داری والی حدیث سے جتناسہ
کا دجال ہونا زیادہ صحیح ہے کیونکہ حدیث متم ابن صیاد کے قصہ سے متاخر ہے لہذا
متم داری والی حدیث ابن صیاد والی حدیث کی ناخ ہوگی جس سے صاف ظاہر ہے کہ
ابن صیاد و دجال اکبر نہیں ہو سکتا۔ مع ہذا صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام
دجال کو قتل کریں گے۔ یہ خیال کہ دجال انسان ہوگا یا شیطان علمائے اسلام میں
مختلف فیہ ہے۔

اکثر علماء کا خیال ہے کہ دجال شیطان ہوگا جو انواع و اقسام کے خرق عادت
سے لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ یہ خیال بھی اس امر کا مؤید ہے کہ ابن صیاد و دجال نہیں بلکہ
اسے صرف الحاد اور بیدینی کی وجہ سے دجال کہا گیا ہے۔ چونکہ وہ ربوبیت یا
نبوت کا مدعی ہوا تھا اس لئے باوجود اس کے اسلام لانے کے اسے دجال کا لقب

دیگیا جس طرح بعد کے بعض لوگوں کو بوجہ الحاد کے دجال کے نام سے پکارا جاتا ہے +
 نازل مسیح علیہ السلام اہل اسلام میں نزول مسیح کا مسئلہ کتب عقائد میں داخل
 ہے چونکہ آپ سی حم عفری کے ساتھ آسمان پر گئے ہیں اس لیے جسم عفری کے ساتھ
 ہی آسمان سے نازل ہونگے اس مسلم اور جمع علیہ سک کا انکار الحاد ہے سلف و خلف
 میں کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ ہاں گویا مسیح اسلامی سے ظاہر ہوتا ہے کہ
 بحق مدعیان نبوت نے تمام محدثین و مجتہدین اور اکابر علمائے اسلام کی مخالفت کی مگر
 بجز غل غبارہ اور بے سود جنگ و جدل کے کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے۔ فقہ اکبر میں
 جو علم عقائد میں علمائے اہل سنت والجماعہ کی ہدایت مقرب کتاب ہے حضرت امام ہمام
 ابو حنیفہ فرماتے ہیں "ونزل عیسیٰ علیہ السلام من السماء و سائر علامات یوم القیامۃ
 علی ماوردت بہ الاخبار الصحیحۃ حق کائن"۔ اس عبارت میں لفظ من السماء سے
 صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مجتہد عفری آسمان سے نازل ہونگے۔ چونکہ امام ہمام
 کے عقائد میں قرآن و سنت پر مبنی تھے اور آپ صحابہ کی روش سے سر موٹا و
 جائزہ دیتے تھے اس لیے مسیح علیہ السلام کے نزول مجتہد عفری کا عقیدہ جمیع
 اہل سنت والجماعہ کا عقیدہ ہے۔ مع ہذا قرآن مجید کی بعض آیات آپ کے نزول
 مجتہد عفری پر دال ہیں۔ قال اللہ "وانہ لعلمہ للساعۃ" یعنی عیسیٰ علیہ السلام (کا نزول)
 مجتہد علامات قرب قیامت کے ہے اس آیت میں ضمیر اندہ کا صحیح مرجع بلحاظ بیاق
 و سباق کے مسیح علیہ السلام ہیں اور اس ضمیر کے مرجع کی تفسیر آیہ "ان من اهل
 الكتاب الا لیومنون بہ قبل موتہ" سے بھی ہو ہی ہے۔ اس کی شرح میں
 علی قاری حنفی لکھتے ہیں۔ "اسی قبل موت عیسیٰ علیہ السلام بعد نزولہ
 عند قیام الساعۃ"۔ یہ الفاظ صاف طور پر اس امر پر دال ہیں کہ ابھی مسیح فوت
 نہیں ہوئے اور قرب قیامت میں وہ نازل ہونگے۔ اس سے آگے چل کر لکھتے ہیں

فانه يذوب كالمخ في الماء عند نزول عليه السلام من السماء فيجتمع
 عيسى عليه السلام مريم المهدى رضى الله عنه وقد اقيمت الصلوة فيشير
 المهدى لعيسى بالتقدم - يعني وقبال نكاح كل طرح يحصل جاكما جبرئيل آسمان
 پر سے نازل ہونگے اور مسیح علیہ السلام مہدی علیہ السلام کے پیچھے مقتدی ہو کر
 نماز ادا کریں گے۔ ان الفاظ سے صاف صاف یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مسیح علیہ السلام
 ابھی تک زندہ ہیں اور وہ آسمان پر سے نازل ہونگے اور مسجد غصری نازل ہونگے
 اور مسیح اور مہدی دو علیحدہ شخص ہیں۔ مدعی کا لفظ قرآن مجید "انی متوفيت" اور
 فلما توفيتی سے وفات مسیح علیہ السلام کا استدلال کرنا عوام الناس کو دھوکا
 دینا ہے کیونکہ لفظ توفی لنت میں قبض روح اور قبض جسم اور قبض روح معالجہ ہر
 معنی میں مستعمل ہوا ہے پھر کیسی فاش غلطی ہے کہ معانی لنت کو بلا قرینہ محدود کیا
 جاتا ہے۔ مذکورہ بالا ہر دو آیات میں قبض روح مع الجسم پر یہ لفظ بولا گیا ہے نہ صرف
 قبض روح پر۔ آیہ "ان من اهل الكتاب الا ليموتن به قبل موته" میں الفاظ
 قبل موته پر غور کرو کیونکہ سیغہ موکد بلام ولون ثقیلہ صاف ظہور پر شہادت
 دے رہے ہیں کہ ہر ایک اہل کتاب کا مسیح پر ایمان لانا زمانہ مستقبل میں واقع ہوگا
 کیونکہ اگر یہ امر زمانہ ماضی میں واقع ہو چکا ہوتا تو صیغہ ماضی کا استعمال کیا جاتا
 اور ہر ایک اہل کتاب مسیح علیہ السلام پر ایمان لے آیا ہوتا چو تک یہ امر واقع نہیں
 ہوا لہذا بالضرورة میں قائل ہوتا ہوتا ہے کہ مسیح یعنی خود عیسیٰ علیہ السلام بن مریم
 قرب قیامت میں تشریف لائیں گے۔ یہ کہنا کہ عیسیٰ بن مریم خود نہیں آئیں گے بلکہ کوئی
 اور شخص ہوگا۔ آیات واحادیث میں تحریف کرنا ہے۔ کیونکہ عیسیٰ بن مریم کا لفظ علم
 ہم جس سے بحر ذات معین کے اور کوئی شخص مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ علم کو جب نکرہ
 کیا جاتا ہے تو بحر قرینہ صاف نہ کے معنی تکثیر غیر مقصود ہیں۔ منکرین سے ہمارے ہوال

ہے کہ لفظ عیسیٰ ابن مریم کو جو قرآن و حدیث میں ایک خاص شخص کے لئے معین طور پر استعمال کیا گیا ہے معنی محبت سے ہٹا کر دوسرے معنی کی طرف لیجائے پر کونسا قرینہ دل ہے اگر بلا قرینہ صافہ عیسیٰ ابن مریم سے کوئی اور شخص مراد ہے تو کیوں ہم زید سے بکر مراد نہیں لے سکتے؟

بخاری اور مسلم میں بروایت ابوہریرہؓ وارد ہوا ہے "والذی لفتی بیدہ لیوشکس ان ینزل فیکہ ابن مرید حکما عدلا فیکسر الصلیب ولقیل الخنزیر ویضع الجنہ" یعنی بخدا کہ بہت جلد تم میں ابن مریم نازل ہونگے..... الخ اس صحیح حدیث میں جس سے کبھی انکار نہیں ہو سکتا۔ ابن مریم سے وہی مسیح مراد ہے جنکو عیسیٰ ابن مریم کہا جاتا ہے اور جن کا ذکر بمقابلہ یہود بار بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ کوئی دوسرا شخص مراد نہیں کیونکہ قرینہ لفظی یا معنوی ایسا موجود نہیں جس سے اصلی معنی سے انحراف کیا جاسکے۔ اور اگر کوئی جاہل محدثوں کہنے لگے کہ اس حدیث میں صرف ابن مریم مذکور ہے نہ عیسیٰ ابن مریم تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث جائزہ میں یہ الفاظ آئے ہیں "لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاہرین الی یوم القیامۃ قال فینزل عیسیٰ بن مریم" (رواہ مسلم) کیا اب بھی کسی مدعی کو یہ جرأت ہے کہ آنے والے مسیح سے کوئی اور شخص مراد لے۔ میرا خیال ہے کہ کسی صحیح الایمان مسلمان کو ہرگز ہمارے مذکورہ بالا دلیل کی صداقت سے انکار کا موقع نہیں ہو سکتا۔ ہاں قحط اور شقاوت کا کوئی چارہ نہیں اور غل غبارہ کرنے کا میدان بہت وسیع ہے۔

یہ لوگ عوام الناس کو جو علوم عربیہ اور قرآن و سنت سے بیخبر محض ہوتے ہیں قرآن مجید کے الفاظ متوفیلٹ اور توفیتی سن کر مدعی کی محبت کا ثبوت دیا کرتے ہیں مگر ایک واقف علوم ان کے دام ترویج میں کبھی نہیں آسکتا۔ کیونکہ اول تو ان ہر دو الفاظ کے وہ معنی نہیں جو یہ لوگ پیش کرتے ہیں۔ دوم اگر بالفرض ہم

مسیح کی وفات کا اعتراف کر بھی لینی کسی دوسرے شخص کا مسیح ہونا کیونکر ثابت ہوا؟
عوام الناس کو نہ تو استدلال کی خبر ہوتی ہے اور نہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرنا جانتے
ہیں اس لئے چلتی پھرتی تقریروں اور فلسفیانہ لکچروں کے پھندے میں مبتلا ہو کر
ایمان ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ خسرا الدنیا والاخرۃ۔

بہر صورت مسیح علیہ السلام کا بجد عنصری نازل ہونا لصوص شرمیہ سے ثابت ہے
اور منجملہ علامات قرب قیامت ہے اور اس کا منکر صبح الایمان نہیں +

عیسیٰ کا علیہ در سیرت | حدیث بخاری میں بروایت عقیل ابن خالد مروی ہے کہ گندم

اگون سُرخ مائل سیانہ قد۔ وسیع الصدہ ہونے اور ان
کے بال کھلے چھوڑے ہونگے۔ پانی کے قطرات ان کے سر پر سے ٹپکتے ہوئے جیسے
کوئی شخص ہام سے نکلتا ہے۔ وہ دُور درنگ کی چادریں پہنے ہونگے۔ ان کے
انفاس قدسیہ سے کافر جا ئیگے اور وہ صلیب کو ٹوڑیں گے اور خنزیروں کو ہلاک کر دیں گے
اور بجز اسلام کے کسی دین کو قبول نہیں کریں گے۔ اور خدائے وحدہ لا شریک کے سوا
کسی کی عبادت نہیں کی جائیگی۔ مال بہت ہوگا۔ اور لوگ صدقات کے محتاج نہیں
رہیں گے۔ خزانے مخفیہ ظاہر ہونگے اور بعض عداوت مرتفع ہو جائیں گے۔ ہر ایک ہر دُور
حضور کا ہر دُور ہو جائیگا اور زمین بہت سی پیداوار نکالیگی +

آپ کے نزول کا وقت محل | آپ شہر دمشق کے مشرقی جانب میں منارہ بیضا

کے پاس جو آج تک موجود ہے اس حال میں نازل ہونگے
کہ دُور دمشق کے بازوؤں پر آپ ہاتھ رکھے ہونگے اور دن سے چھ ساعت گذر
جائے پر آپ کا نزول ہوگا۔ پھر آپ مسجد دمشق میں تشریف لاکر منبر پر جلوہ افروز
ہونگے اور اہل اسلام اور یہود و نصاریٰ کا جم غفیر آپ کے پاس جمع ہوگا اور مسلمانوں
کا مؤذن اور یہود کا صاحب بوق اور نصاریٰ کا صاحب ناقوس قرع اندازی کریں گے۔

اور اہل اسلام کے مؤذن کے نام قرعہ پڑھ لیا اور وہ اذان کہیگا۔ اذان سن کر یہود و نصاریٰ مسجد سے نکل جائیں گے تب آپ پہمانوں کے ساتھ مل کر نماز عصر ادا کریں گے۔ اور پھر آپ اہل دمشق کے ساتھ وصال کی تلاش میں نکلیں گے۔ کفار ہلاک ہونے لگیں گے۔ اور آپ بیت المقدس میں وارد ہوئے اور نماز صبح ادا کریں گے۔

آپ کا عرصہ قیام اور وفات | طبرانی اور ابن عساکر بروایت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "یتزل عیسیٰ

بن مریم فی مکث فی الناس اربعین سنۃ" یعنی عیسیٰ بن مریم نازل ہونگے اور اہل دنیا میں چالیس سال تک ٹھہریں گے اور طبرانی کی ایک دوسری روایت میں یوں وارد ہے کہ وصال کے خروج کرنے پر عیسیٰ بن مریم نازل ہونگے اور وصال کو قتل کریں گے پھر وہ چالیس سال تک امام عادل ہو کر دنیا میں ٹھہریں گے اور ابن ابی شیبہ اور احمد اور ابوداؤد اور ابن جریر اور ابن حبان بروایت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ عیسیٰ بن مریم چالیس سال تک قیام کر کے وفات پائیں گے اور اہل اسلام آپ کا جنازہ پڑھیں گے اور حجاب پنجہبر صلعم کے متصل آپ کو دفن کریں گے اور محدث احمد الزہدیٰ میں بروایت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ عیسیٰ بن مریم زمین پر چالیس سال تک قیام کریں گے۔ اگر وہ کسی پانی کے نالہ کو کہیں گے کہ شہد ہو کر تھل تو وہ شہد بن کر چلیگا اور احمد ابن جریر وابن عساکر بروایت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم نازل ہو کر خنزیر کو قتل اور صلیب کو بے نشان کریں گے۔ ان کے بے صلوة جمع کیا جائیگی اور وہ مال تقسیم کریں گے حتیٰ کہ کوئی قبول نہیں کریگا اور خراج اٹھاویں گے اور مقام روحاء میں نازل ہونگے پھر وہ حج کریں گے یا عمرہ بجالائیں گے یا ہر دو کو اٹھا کر لیں گے۔ اور مسلم کی روایت

صلعم دینیہ سے کہہ کر جاتے ہوئے ایک مقام کا نام ہے۔ ۱۲ منہ +

میں وارد ہوا ہے کہ عیسیٰ بن مریم مقام روحانی میں حج یا عمرہ بجالاتے ہوئے اہلال کرینگے
یعنی بتیک پکارینگے اور حاکم و ابن عساکر کی روایت میں وارد ہوا ہے کہ عیسیٰ بن مریم
علیہ السلام میری قبر پر آکر مجھے سلام کہینگے اور میں ان کے سلام کا جواب دوں گا۔ اور
حاکم بروایت انس راوی ہیں کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص عیسیٰ کو پاۓ
وہ میری طرف سے اسے سلام کہے اور نیز بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ عیسیٰ بن مریم
نازل ہونے کے بعد نکاح کرینگے اور ان کے ہاں اولاد بھی ہوگی اور پھر وہ مدینہ میں
فوت ہونگے۔ غالباً حج یا زیارت قبر حضور صلعم کے وقت ایسا ہوگا ورنہ نزول کے بعد
آپ کا بیت المقدس میں قیام کرنا ثابت ہے ۛ

ابن عساکر بروایت عبد اللہ بن سلام راوی ہیں کہ تواریخ میں حضور صلعم کی تعریف
میں مرقوم ہے کہ عیسیٰ بن مریم آپ کے ساتھ قبر میں مدفون ہونگے۔ نیز بخاری تاریخ
میں اور طبرانی اور ابن عساکر راوی ہیں کہ عیسیٰ بن مریم جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے
ساتھ ایک ہی جگہ مدفون ہونگے اس طرح آپ کی قبر معہ حضرات شیخین کی قبروں کے
چوتھی قبر ہوگی۔ اس موضوع پر اب بھی کئی روایات صحیحہ وارد ہوئی ہیں۔ مگر ہم نے مختصراً
انہیں چند روایات پر اکتفا لازم سمجھا ہے ۛ

کیا کوئی منکر مدعی مذکورہ بالا احادیث کو اپنی نسبت منطبق کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔
خروج یا جوج یا جوج | منجملہ امارات عظیمہ کے جو عین قرب قیامت میں
وقوع پذیر ہونگے یا جوج و ما جوج کا خروج ہے۔ اور یہ قوم بھی ظاہر ہونے کے
بعد حرج عظیم کا موجب ہوگی۔ قرآن مجید میں ان کے ظہور کا اشارہ کیا گیا ہے جیت قل
عز وجل قالوا یاذا القرنین ان یا جوج و ما جوج معندون فی الارض اور دوسری
جگہ ارشاد فرمایا ہے حتی اذا فتحت یا جوج و ما جوج و هم من کل حدب یسلون۔
ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ لا تقوم الساعة حتی یکون عشاء یا یطلع الشمس

من مضاربها والدخان والدابة ويا جوج وما جوج ونزول عيسى بن مريم۔ وثلاث
خسوفات و نار تخرج من قعر عدن رواہ ابن ماجہ۔

یہ لوگ کون ہونگے؟ اکثر متاخرین محققین کا خیال ہے کہ یا جوج و ما جوج بنی آدم
ہیں اور یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ بعض نے لکھا

ہے کہ ترکوں کی ایک قوم کا نام ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یا جوج و ما جوج آدم کی
اولاد ہیں مگر حقاً علیہ السلام کے پیٹ سے نہیں۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں بحر کعب الاحبار
کے کسی سلف سے یہ مذہب مروی نہیں اور ایک حدیث مرفوع اس کے رو میں موجود
ہے جس میں تصریح مذکور ہے کہ یا جوج و ما جوج نوح کی اولاد میں سے ہیں اور نوح
اس اولاد کے سلسلہ میں پیدا ہوئے تھے جو تواءمیںہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے
بہر صورت بعض اور بھی آثار ایسے وارد ہوئے ہیں جن سے یا جوج و ما جوج کا ترکوں
میں سے ہونا ثابت ہے۔ ہاں یہ بھی ثابت ہے کہ یہ مفسد قوم علاقہ شمالی سے
اُٹھ کر دنیا کے مختلف حصص میں فتنہ و فساد برپا کر گئی اور اطراف عالم کو تباہ کر دیگی
قرآن مجید کے الفاظ من کل حدب سے بھی ایک خفیہ سا اشارہ اس امر کی طرف
پایا جاتا ہے کہ یہ قوم شمالی علاقوں سے اُٹھ کر ادھر ادھر دنیا میں پھیل جائیگی اور لفظ
مفسدون سے ثابت ہے کہ وہ عالم کو تباہ کر لگی۔

اس قوم کی صورت اور سیرت | بروایت ابن ابی حاتم مروی ہے کہ یا جوج و ما جوج
تین قسم کے لوگ ہونگے اول تو بڑے درخت

کے مشابہ ہونگے یعنی بڑے بڑے قد اور قوی ہیکل۔ دوم وہ لوگ جو بڑے چوڑے پھلے
ہونگے اور جاڑ ہاتھ ان کا عرض ہوگا۔ غالباً اس سے ان کا جسم ہونا مراد ہے۔ سوم
ایک وحشی شکل کے لوگ ہونگے جن کے کان اور وابت لمبے لمبے ہونگے اور قنارہ
سے مروی ہے کہ یا جوج و ما جوج بائیس فرقوں پر منقسم ہیں جن میں سے اکیس فرقہ

کو ذوالقرنین نے ایک خاص حد میں محدود کر دیا اور ایک فرقہ اس حد سے خارج رہا۔
 کیونکہ وہ لوگ کہیں اپنے علاقہ سے باہر جنگ پر گئے ہوئے تھے۔ اور سندی سے
 مروی ہے کہ یا جوج و ما جوج ترکوں کا ایک لشکر ہے اور احمد و طبرانی خالہ
 بن عبد اللہ بن حرمہ اپنی خالہ سے مرفوعاً راوی ہیں کہ تم ہمیشہ دشمنوں سے لڑتے
 رہو گے جن کے منہ ہونگے جیسے ڈھالیں۔ آنکھیں باریک اور رنگ سُرخ ہوگا اور
 بلند پشتوں پر سے اُٹھ کر دنیا میں پھیل جائیں گے۔

نسائی عمرو بن اوس سے راوی ہیں کہ یا جوج و ما جوج بلا محابا عورتوں سے
 جماع کیا کرتے ہیں۔ اور جب ان سے کوئی مر جاتا ہے تو ہزار ہا نفر تک اپنی
 ذریات باقی چھوڑ جاتا ہے غالباً اس سے ان کے کثیر الزنا ہونے کی طرف اشارہ
 ہے، یہی معنی ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کی روایت میں وارد ہوئے ہیں۔ بعض
 روایات میں وارد ہوا ہے کہ یا جوج و ما جوج تین گروہ پر منقسم ہیں۔ اور ان کے
 نام حسب ذیل ہیں۔ تاول۔ طالس۔ منک اور ابن ابی حاتم بروایت عبد اللہ
 بن عمرو راوی ہیں کہ دیگر ان ان بمقابلہ یا جوج و ما جوج کے تعداد میں و سویں
 حصہ کے برابر ہو سکتے ہیں۔ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ یا جوج و ما جوج اپنے
 نکلنے کے لئے ہمیشہ دیوار کو کھودتے رہتے ہیں مگر تاحال کامیاب نہیں ہوئے
 جب اللہ تعالیٰ چاہیگا تو وہ دیوار کو پھاڑ کر دنیا میں پھیل جائیں گے۔

محدث مسلم بروایت نواس بن سمان ذکر و حال کے بعد یوں روایت کرتے ہیں
 کہ اللہ تعالیٰ یا جوج و ما جوج کو مبعوث کرے گا۔ یہ لوگ دنیا میں پھیل جائیں گے اور لوگ
 ان سے ڈر کر پوشیدہ ہوں گے۔ وریاؤں کے پانی کو جذب کر لیں گے اور بعض روایات
 میں یوں وارد ہوا ہے کہ یا جوج و ما جوج یوں کہیں گے کہ ہم نے اہل زمین کو تو قتل
 کر ڈالا ہے اب آؤ آسمان کے باشندوں کو قتل کریں تب وہ اپنا حرمہ آسمان کی

طرف پھینکیں گے اور وہ خون آلودہ ان کی طرف گرے گا جو لوگوں کیلئے موجب فتنہ ہوگا۔
 مسیح علیہ السلام مع اہل ایمان یہ حال دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیلئے
 اور اس فتنہ کے مٹا دینے کی بابت ہاتھ اٹھا ئیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں
 میں ایک قسم کا کڑا پیدا کر دے گا جس سے وہ ہلاک ہونے لگیں گے۔ جب اہل ایمان دیکھ
 لیں گے کہ یہ قوم ہلاک ہو چکی تو امن و عافیت کے ساتھ اپنے کاروبار میں پھر مشغول
 ہونگے۔ مسیح علیہ السلام مع اپنے ساتھیوں کے ان لوگوں کی نعشوں سے زمین
 کو پُر دیکھیں گے۔ جن کی بدبو لوگوں کو پریشان کر رہی ہوگی۔ اہل ایمان دعا کر لیں گے
 جس سے یمن کی جانب سے ایک ہوا چلیں گی اور تین دن تک ان نعشوں کو سمندر
 میں ڈال دیں اور زمین باطل صاف ہو جائیگی۔

نزول مسیح پر بعض ضروری امور | احمد و ابو داؤد اور حاکم ابن حوالہ سے سلوی
 ہیں کہ جب تم خلافت کو بیت المقدس میں
 پاؤ گے تو اس وقت بہت سے زلزلے اور دیگر امور عظیمہ ظہور پذیر ہونگے۔ اس حدیث
 کے رد سے اگر اسلامی حکومت ہی کو خلافت قرار دیا جائے تو وہ بنی امیہ کے زمانہ
 میں ہے مگر صحیح یہ ہے کہ خلافت کا لفظ بنی امیہ کی حکومت پر اطلاق نہیں کیا جاسکتا
 اس لئے خلافت سے مکمل خلافت عیسیٰ بن مریم اور مہدیؑ مراد ہے اور امور عظیمہ سے
 مراد دابة الارض، طلوع الشمس من مغربہا، خروج النار وغیرہ ہونگے۔
 بروایت شیخین مروی ہے کہ قبل از قیامت مال اس قدر کثیر ہو جائیگا کہ زکوٰۃ کو قبول
 کرنے والا کوئی نہیں ملے گا اور سرزمین عرب سرسبز و شاداب ہو جائیگی اور نہرس
 بکثرت جاری ہونگی۔ آپ کے زمانہ میں بیل کی قیمت گراں ہو جائیگی غالباً
 اس سے یہ اشارہ ہے کہ زمین بہت جوتی جائیگی اور مویشی کم ملیں گے۔ قرب
 قیامت سے چالیس سال پہلے مدینہ منورہ ویران ہو جائیگا اور لوگ شہر کو چھوڑ کر

جگ چائینگے بیت المقدس کی آبادی اور رونق بڑھ جائیگی۔ ابن زبائہ ادا بن بخار
ہر دو نے روایت کیا ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے میری اس مسجد
پر کتے۔ بھیرے۔ لکڑ بگڑ غالب آجائیں گے۔ شخص مسلم گذرتے وقت اس میں نماز پڑھنا
چاہیگا مگر نہیں پڑھ سکیگا۔

اور بروایت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ قیامت سے پہلے منبر نبویؐ پر بومری آکر
بیٹھیں گی اور اسے کوئی نہیں اٹھا سکیگا۔ مدینہ منورہ کی حرابی کی توجیہ بعض شارحین نے
یوں کی ہے کہ اہل ایمان سب جہاد پر بیت المقدس کی طرف ہجرت کر جائیں گے اور شہر
خالی رہ جائیگا۔ چنانچہ بعض آثار میں وارد ہوا ہے "ستكون هجرة بعد هجرة" سو ایک
ہجرت تو ہو چکی دوسری باقی ہے۔

۴۔ چانی بروایت جابرؓ مروی ہیں کہ حضور صلعم نے فرمایا کہ دین آخر کار
مدینہ میں رہ جائیگا اور جس طرح یہاں سے اسکا آغاز ہوا تھا اسی طرح یہیں اس کا
خاتمہ ہوگا۔

۵۔ ثانی بروایت ابو ہریرہؓ مروی ہیں کہ اسلامی شہروں میں سب سے آخر
شہر مدینہ ویران ہوگا۔

ترندی نے بھی اس موضوع پر ایک حدیث کو نقل کیا ہے اور ایک دوسری
حدیث میں وارد ہوا ہے کہ دین مدینہ کی طرف سکر کر آجائیں گے جس طرح سانپ اپنے
بل میں آگھستا ہے۔ ان روایات اور سابقہ روایات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے
کہ جب فتنہ و فساد تمام اطراف عالم میں پھیل جائیگا تو اس وقت مہدیؑ ظہور
کریں گے اور اہل مدینہ آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور دین سمٹ کر مدینہ کی طرف کھچ
آئیگا کیونکہ اس وقت بھی اہل مدینہ خلیفۃ اللہ یعنی مہدیؑ کے نام و یاد رہون گے
اور یہی امام وقت کی تعیین کریں گے اور حقدار منافقین ہون گے اس سے اسی طرح

یا ہر ہو جائیگے جس طرح آگ سے بجٹی میں لوہے کی میل کچل دور ہو جاتی ہے اور صرف اہل ایمان باقی رہ جائیگے مگر بیت المقدس میں ہر ایک مذہب کے لوگ ہونگے کیونکہ وہ حضرت نزول عیسیٰ بن مریم پر ایمان لائیں گے یہ تو حدیث جابرہ کا مفہوم ہے ۔
 بعد ازاں ایک ہوا ملک شام یا ملک یمن کی طرف سے آئیگی جس سے تمام اہل ایمان مرنے لگیں گے اور سب سے آخر اہل مدینہ ہلاک ہونگے اور اس وقت مدینہ میں صرف اہل ایمان ہونگے کیونکہ زمانہ و جال میں وہ غیروں سے پاک و صاف ہو چکا ہوگا۔ اہل مدینہ کی موت پر باقی دنیا آباد ہوگی مگر وہ خالص الایمان نہیں ہونگے اور انہیں پر قیامت قائم ہوگی۔ یہ توجیہ حدیث ابو ہریرہ کے مطابق ہے ۔

داخلہ نمبر	۳۳۳۳۳۳
فن نمبر	۱۴۱۵
تخت نمبر	

